اسلام کی رُوحانی قدریں

موت نہیں زندگی

محمد حنیف رامے

''اللہ تمھیں امن اور سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے''۔

قرآنِ حکیم (10:25)

''اے ایمان والو! اللہ اور رسُول کی دعوت پر لبیک کہو کیونکہ رسول تمھیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے''۔

قرآنِ حکیم (8:24)

''خدا ہر غیب اور ظاہر حقیقت کا علم رکھتا ہے ۔ وہ زبردست قوتوں کا مالک ہے اور اپنی مخلوق پر ہمیشہ رحمت کرتا رہتا ہے ۔ اُس نے جو کچھ بنایا، خوب ہی بنایا۔ اُس نے انسان کی تخلیق کا آغاز گُندھی ہوئی مٹی سے کیا اور گو اس کی افزائشِ نسل ایک معمولی سے سیّال سے کی لیکن اس کی شکل و صورت کو خُوب بنایا سنوارا اور پھر اس کے اندر اپنی رُوح پھونک دی''۔

قرآنِ حکیم (32:6-9)

''خدا نے فرشتوں سے کہا، میں گُندھی ہوئی مٹی سے ایک بشر بنانے لگا ہوں۔ جب میں اس کی شکل و صورت کو خوب بنا سنوار لوں اور اس کے اندر اپنی رُوح پھُونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا''۔

قرآنِ حکیم (15:29/38:72)

''بے شک انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا موجود ہے کہ جب وہ اچھا ہو تو سارا بدن اچھا ہو جاتا ہے اور جب وہ بُرا ہو تو سارا بدن بُرا ہو جاتا ہے ۔ اُسے دل کہتے ہیں''۔

محمد رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم

''کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ خیر کیا اور شر کیا ہے؟ یہ سوال ایک بار اپنے دل سے پوچھو، دوسری بار اپنے دل سے پوچھو، تیسری بار اپنے دل سے پوچھو۔ خیر تمھارا وہ عمل ہے جس سے تمھارے دل کو تقویت کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی نصیب ہو۔ شر تمھارا وہ عمل ہے جس سے تمھارے دل میں شک و شبہہ اور بے اطمینانی پیدا ہو خواہ لوگ تمھارے اس عمل کو درست ہی قرار دیں''۔

محمد رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم

''اُس شخص نے کیا کمایا جس نے ساری دُنیا فتح کر لی لیکن اپنی رُوح گنوا بیٹھا''۔

عیسیٰ ابن مریم، علیہ السلام

''دنیا میں دو ہی طاقتیں ہیں، تلوار اور رُوح۔ آخر کار تلوار کے مقابلے میں رُوح ہمیشہ فتحیاب ثابت ہوگی''۔

نپولین بونا پارٹ

''جنگوں کا آغاز بھی چونکہ انسانی دل و دماغ میں ہوتا ہے اس لیے امن کی فصیلیں بھی انسان کے دل و دماغ ہی میں تعمیر ہونی چاہئیں''۔

اقوام متحدہ کے ادارے ''یونیسکو'' کا آئین

اسلام کی رُوحانی قدریں

موت نہیں، زندگی

محمد حنیف رامے

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Marfat.com

297.4 Ramay, Muhammad Haneef
Islam Ki Roohani Qadrain: Mout Nahi, Zindigi/ Muhammad Haneef Ramay.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2006.
478pp.
1. Islam. 2. Sufism - Mysticism. 3. Spirituality. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

باراول 2005ء
باردوم 2006ء
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1784-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore, Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اپنی پوتی ، نور رامے
اپنے پوتوں ، طٰہٰ رامے ، یوسف رامے ، داؤد رامے
اور اپنے نواسوں ، مرتضٰی مراد ، حمزہ مراد
کے نام

Marfat.com

Marfat.com

میرے دِل کے اندر

یارب! مجھے اب پتا چلا ہے کہ میرے دِل کے اندر کون رہتا ہے

اے میرے محبوب! ساری دُنیا سے کٹ کر، ہر کسی سے چھپ کر

میری زبان نے تجھ سے کچھ باتیں کی ہیں

یوں ایک طرح سے ہم میں وصال ہے، ہم ایک ہیں

اور دوسری طرح دیکھیں تو فراق ہمارا دائمی حال ہے

کیونکہ تیرے جلال کے باعث

تیرا چہرہ میری نگاہِ تیز سے اوجھل رہتا ہے

حالانکہ عالمِ جذب وشوق میں محسوس کرتا ہوں کہ تو میرے دِل و جود کو چھو رہا ہے۔

(جنید بغدادیؒ)

جدائیوں کی شکایت

غور سے سُن، بانسری کیا کہہ رہی ہے، وہ جدائیوں کی شکایت کر رہی ہے:

''جب سے مجھے بانس کے جنگل سے کاٹا گیا ہے

میرے درد بھرے نالے سُن کر مرد وزن رو رہے ہیں

لیکن میں غمِ عشق کو کھول کھول کر سنانے کے لیے کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں

جس کا دِل فراق کے درد سے پارہ پارہ ہو چکا ہو''۔

(جلال الدین رومیؒ)

جو مرنے سے نہیں مرتا

جو کوئی دوسروں کو جانتا ہے وہ صرف ہوشیار ہے

جو کوئی اپنے آپ کو جانتا ہے وہ دانش مند ہے

جو کوئی دوسروں کو فتح کرتا ہے وہ صرف طاقتور ہے

جو کوئی اپنے آپ کو فتح کرتا ہے وہ بہادر ہے

جو کوئی اپنا مقام نہیں کھوتا وہ صرف مضبوط ہے

Marfat.com

جو کوئی مرنے سے مرنہیں جاتا وہ زندہ ہے

(لاؤ ترو)

خدا کا ٹھکانا

رحمت، دردمندی، امن اور محبت
یہی تو وہ نعمتیں ہیں جن کے لیے دُکھی انسان خدا سے دعا کرتا ہے
اور یہی تو وہ خوشیوں بھری نیکیاں ہیں
کہ حاصل ہو جائیں تو انسان خدا کا شکر بجالاتا ہے

رحمت، دردمندی، امن اور محبت
اصل میں خدا ہی کا دوسرا نام ہیں
اور رحمت، دردمندی، امن اور محبت
خدا کے پیارے بندوں کا کام ہیں

رحمت انسان کا دل ہے
دردمندی انسان کا چہرہ ہے
محبت انسان کی الوہی شکل ہے
اور امن انسان کا اوڑھنا بچھونا ہے

گویا ہر زمان و مکاں کا انسان
جو اپنی بے چارگی میں خدا سے دعا کرتا ہے
وہ انسان کی الوہی شکل ہی سے
رحمت، دردمندی، امن اور محبت مانگتا ہے

اس لیے سب کو چاہیے کہ انسانی شکل سے محبت کریں

خواہ یہ شکل کسی کافر کی ہو یا مومن کی
کیونکہ جہاں پر رحمت، دردمندی، امن اور محبت ہوں گے
وہیں پر خدا کا ٹھکانا بھی ہوگا (ولیم بلیک)

خدا کے محبت نامے

خدا جس طرح مجھے آج نظر آرہا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس سے بہتر شکل میں نظر آسکتا ہے
میں تو دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر گھڑی اور ہر پل
خدا کو کسی نہ کسی روپ میں دیکھتا رہتا ہوں
بلکہ ایسا تو کوئی لمحہ نہیں جب میں اُسے
مردوں اور عورتوں کے چہروں میں جلوہ افروز نہ پاؤں
یا آئینے میں خود اپنے چہرے میں نہ دیکھوں
مجھے تو گلی گلی میں خدا کے محبت نامے بکھرے نظر آتے ہیں
اور ہر محبت نامے پر خدا کے نام کی مہر لگی ہوتی ہے

(والٹ وِھٹ مین)

خدا کہاں نہیں ہے؟

خدایا، میں تجھے کہاں ڈھونڈوں، تیرا ٹھکانا تو بہت بلند اور پُر اسرار ہے!
اور خدایا، میں تجھے کہاں نہ ڈھونڈوں؟
وہ کون سی جگہ ہے جہاں تُو نہیں ہے؟
یہ ساری زمین تو تیرے ہی نور سے جگمگا رہی ہے
تُو انسان کے نہاں خانہء دل میں جاگزیں ہے
جب تُو اپنے بلند و بالا عرش بریں پر فائز ہوتا ہے
اس وقت بھی تُو ہم سے، ہمارے جسموں اور ہماری روحوں سے قریب تر ہوتا ہے۔

(یُوده حلوی)

Marfat.com

کہیں نہیں، یہیں

میں نے رسول اکرم، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا،
یارسولؐ اللہ! خدا کو کہاں ڈھونڈوں؟
آپؐ نے فرمایا، خدا کو ''کہیں'' نہیں ''یہیں'' ڈھونڈو :
وہ تو تمھاری شہ رگ سے بھی قریب تر موجود ہے۔

(بے نام مسلمان)

Marfat.com

ترتیب

پیش لفظ، 1

پہلا حصہ: روحانیت کے قرآنی سرچشمے

پہلا باب: روحانیت اور تصوف کی قرآنی بنیادیں، 11

خدا کی روح اور ناموس کا علم، 12

تکریمِ انسانیت، 13

خدا کا رنگ، 14

کتاب وحکمت سے پہلے تزکیۂ نفس، 17

خدا ربّ العالمین بھی ہے اور ربّ الناس بھی، 24

خدا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، 28

شریعت سے بالا طریقت، 32

دوسرا باب: شریعت اور طریقت، 37

وحدث الوجود اور وحدث الشہود، 40

تیسرا باب: روحانیت اور تصوف کا رشتہ اور فرق، 51

بیعت، 53

تصورِ شیخ، 53

دوسرا حصہ: تصوف کی مختصر تاریخ

چوتھا باب: عالمِ اسلام کے تین بڑے صوفی، 59

جنیدؒ بغدادی، 60

ابن عربیؒ، 62

عبدالقادرؒ جیلانی، 65

پانچواں باب: برصغیر پاک و ہند کے صوفی سلسلے، 69
سہروردیہ سلسلۂ تصوف، 73
چشتیہ سلسلۂ تصوف، 78
قادریہ سلسلۂ تصوف، 83
قلندریہ سلسلۂ تصوف، 89
شطاریہ سلسلۂ تصوف، 90
ملامتی اور مجذوب صوفی، 91
اصفہانی سلسلۂ تصوف و فلسفہ، 93
(ابنِ سیناؒ، 94 شہاب الدین سہروردیؒ، 95 مُلا صدراؒ، 96)
نقشبندیہ سلسلۂ تصوف، 97
(خواجہ بہاءُالدین نقشبندؒ، 101 خواجہ عبیداللہ احرارؒ، 102
عبدالرحمٰن جامیؒ، 105 خواجہ باقی باللہؒ، 106
شیخ احمد سرہندیؒ، مجدد الف ثانی، 107 شاہ ولی اللہؒ، 112)
چھٹا باب: شریعت اور طریقت کو جمع کرنے والی دو ہستیاں، 117
غزالیؒ، 117
رومیؒ، 119

تیسرا حصہ: روحانی جواں مردی

ساتواں باب: روحانی جواں مردی کا تعارف، 129
فتوت ناموں کے مندرجات، 133
حضرت علیؓ اور رُوحانی جواں مردی، 139
ابن عربیؒ اور رُوحانی جواں مردی، 141
آٹھواں باب: جوانی، جواں مردی اور ہم، 145
نواں باب : اقبال کی شاعری کا بنیادی پیغام، 149
اقبالؒ اور قرآنِ حکیم، 149
اقبالؒ اور عشقِ رسولؐ، 150

اقبالؒ اور رومیؒ، 153
اقبالؒ اور تصوف، 153
دسواں باب: روحانی جواں مردی کی مثالیں، پیغمبرانِ کرام، 177
ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ، 178
یوسفؑ اور برادرانِ یوسف، 180
موسیٰؑ اور فرعون، 182
عیسیٰؑ ابنِ مریم، 184
تاریخ انسانیت کے عظیم ترین روحانی جواں مرد، محمد رسُول اللہ، 192
گیارھواں باب: روحانی جواں مردی کی مثالیں، رسُولِ خدا کے چند پیروکار، 209
ابوبکر صدیقؓ، 209
عمر فاروقِ اعظمؓ، 214
علی حیدر کرارؓ، 221
حسینؓ ابن علیؓ، 224
طارق بن زیاد اور یوسف بن تاشفین، 227
صلاح الدین ایوبی، 231
ظہیر الدین بابر، 234
جلال الدین اکبرِ اعظم، 238
بارھواں باب: عہدِ حاضر کے چند مسلمان روحانی جواں مرد، 241
سر سید احمد خانؒ، 241
علامہ سر محمد اقبالؒ، 245
قائداعظم، محمد علی جناحؒ، 249
قائدعوام، ذوالفقار علی بھٹو، 252
تیرھواں باب: عہدِ حاضر کے چند غیر مسلم روحانی جواں مرد، 257
مہاتما گاندھی، 257
ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ (جونیئر)، 262

Marfat.com

پوپ جان پال (دوم)، 266
نیلسن منڈیلا، 270

چوتھا حصہ: روحانیت اور روحانی قدریں

چودھواں باب: روحانیت کیا ہوتی ہے؟ 277
روحانی سفر کی چار منزلیں، 280
محبت اور قانون، 282
تقدس، شکایت اور شکریہ، 287
ایمان، امید اور آزادی، 289
روحانیت اور اعتماد، 291
مسرت، گناہ اور معافی، 295
ہمت وحوصلہ، جہاد اور اجتہاد، 298
روحانیت اور ہماری ذاتی وحدت، 304
روحانیت اور انسانی وحدت، 309
روحانیت اور دینی وحدت، 311
روحانیت اور ہماری دُنیا، 314
روحانیت اور عالمی امن، 317
روحانیت اور خدا کی رفاقت، 320
روحانیت اور ہماری رُوح، 324
پندرھواں باب: روحانیت اور خواتین، 331
حضرت مریمؑ، 335
حضرت موسیٰؑ کی والدۂ محترمہ، 336
حضرت موسیٰؑ کو پالنے والی فرعون کی بیوی، 338
امت کی مائیں، 340
(حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، 340 حضرت عائشہ صدیقہؓ، 342)
حضرت فاطمۃ الزہراؓ، 347

Marfat.com

رابعہ العدویہؒ، 349
ہارون الرشید کی بیوی زبیدہؒ، 351
سولھواں باب: خدا، شریعت، طریقت، حقیقت، روحانیت، 355
خدا اور شریعت، 355
خدا اور طریقت، 357
خدا اور حقیقت، 361
خدا اور روحانیت، 367
سترھواں باب: اسلام کی پانچ روحانی قدریں، 383
اسلام اور انسانیت، 383
ایمان، 384
محبت، 385
خیر، 390
صداقت، 391
امن، 395
اٹھارھواں باب: اسلام کے پانچ ستون، 401
کلمہ، 401
نماز، 401
روزہ، 402
زکوٰۃ، 403
حج، 403

پانچواں حصہ: دین اور دُنیا، ایک ساتھ

انیسواں باب: روحانیت اور دُنیوی کامیابی، 413
بیسواں باب: باعمل دیدہ وری، 421
اکیسواں باب: آخرت کے پیشِ نظر آغاز، 425
بائیسواں باب: ترجیحات کا تعین، 431

Marfat.com

باہمی قیادت کے اصول، 434

تیسواں باب: سب کی جیت، 441

سب کی جیت کی پانچ سمتیں، 444

کردار، 445

تعلقات، 447

معاہدے، 447

مددگار نظام، 449

مقاصد اور طریق کار کی ہم آہنگی، 450

چوبیسواں باب: پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ، 453

کردار اور ابلاغ، 454

ہم نفس سماعت، 455

تشخیص کے بعد تجویز، 458

سمجھ اور ادراک، 459

براہِ راست ملاقات، 462

پچیسواں باب: تخلیقی تعاون، 465

فرق کی قدر، 469

چھبیسواں باب: روحانی تازگی، 471

دُعا، 478

پیش لفظ

آج کے مسلمان ایک خلجان کا شکار ہیں۔ وہ دُنیا کی طرف لپکتے ہیں تو دین کا دامن چُھٹ جاتا ہے۔ دین کی راہ پر چلتے ہیں تو دُنیا ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ اپنے ساتھ ظلم، ناانصافی اور دھوکا کرنے والے مغرب کی پیروی کرتے ہیں تو ضمیر کچوکے لگاتا ہے۔ مغرب سے دشمنی پالتے ہیں تو دُنیا میں اکیلے رہ جاتے ہیں۔ خود ان کی اپنی حکومتیں اور قیادتیں ان کا ساتھ نہیں دیتیں کیونکہ اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہیں اور مغرب کی تائید کے بغیر اپنے کمزور قدموں پر کھڑی بھی نہیں ہو سکتیں۔

چھوٹے بڑے 57 مسلمان مُلکوں کی نا اہل، غیر نمائندہ، بددیانت اور بے حوصلہ حکومتوں اور قیادتوں کے خلاف شدید غم و غصے نے مسلمانوں کو عمل کے بجائے ردِّ عمل کا خوگر بنادیا ہے اور وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے مُڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مگر تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ نہیں ہو رہا۔ اقبالؔ نے بہت پہلے کہا تھا کہ ''مسلمانوں نے اسلام کی خدمت نہیں کی، اسلام ہی ہر مشکل وقت میں اُن کے کام آیا ہے''۔ اگر اب بھی مسلمان الحمدُ للہ اسلام ہی میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں تو اس میں قباحت نہیں، خیر و خوبی ہے۔ البتہ ہمارے علماء اُنھیں اسلام کی جو شکل دکھا رہے ہیں اس پر جہاد کے مقدس نام سے نفرت کے لبادے اور ایک لہولہان نقاب پڑا ہُوا ہے۔ اسلام کی طرف رجوع کرنے والوں کو خدا کا یہ فیصلہ نہیں بتایا جاتا کہ ''ایک بھی بے گناہ انسان کو جان سے مار دینے کا مطلب ہے گویا ہم نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا''۔ الٹا انھیں نہ صرف غیر مسلموں کو قتل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے بلکہ اپنے مخصوص فرقے سے الگ فرقے کے مسلمانوں کو بھی واجب القتل قرار دے کر مسجدوں اور امام بارگاہوں میں بھیجا جاتا ہے تا کہ خدا کے سامنے جُھکے ہوئے بے گناہ نمازیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ یہ قاتلانہ اور خودکُش حملے اُس خدا کے بندوں پر کیے جاتے ہیں جو اپنے بندوں کے ساتھ ماں باپ سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ یہی نہیں، توقع کی جاتی ہے کہ جب یہ قاتل اتنا بڑا ظلم ڈھانے کے بعد خدا کے پاس جائیں گے اور اُسے خوشی خوشی بتائیں گے کہ ہم نے آپ کے اِتنے معصوم بندوں کو گولیوں یا بموں کا نشانہ بنادیا ہے تو وہ انعام کے طور پر اُن پر اپنی جنت کے دروازے کھول دے گا۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ مسلمان اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے ہاتھوں مر جائیں، مسلمانوں کے دشمنوں کو اور کیا چاہیے۔ انھیں تو صرف یہ شکایت ہے کہ یہ لوگ ہمیں کیوں مارتے ہیں۔

اقبالؔ نے اپنی مشہورِ زمانہ نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' (1936ء) کے آخر میں ابلیس کے منہ سے یہ الہامی الفاظ کہلوائے تھے: ''مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے''۔ مزدکیت سوشلزم کو کہتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد تقریباً نصف صدی تک امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داری نظام (کیپٹلزم) اور سوویٹ یونین کی مزدکیت (سوشلزم) کے درمیان ایک سرد جنگ جاری رہی۔ مگر سوویٹ یونین کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد اب ایک نئی جنگ، سرمایہ داری نظام اور اسلام کے درمیان، شروع ہوگئی ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس جنگ کی پیش گوئی سب سے پہلے 1993ء میں سیموئل ہَنٹِنگٹن (Samuel Huntington) نے تہذیبوں کے تصادم (The Clash of Civilizations) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کی تھی حالانکہ اقبالؔ پورے 57 سال پہلے واضح کر چکا تھا کہ سرمایہ داری کے ابلیسی نظام کا خالق اپنا اصل دشمن یا حریف سوشلزم کو نہیں، اسلام کو سمجھتا ہے کیونکہ اسلام ہی وہ قوت ہے جو مساوات کی تعلیم کے ہتھوڑے سے سرمایہ داری کے بُت کو پاش پاش کر سکتی ہے۔

مسلمانوں کی ایک پرانی عادت اب ان کی خصلت بلکہ فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ وہ حالات کی پیش بینی کر کے حالات کے دھارے کو اپنے حق میں موڑنے کے بجائے اِس پر اُس وقت توجہ دیتے ہیں جب یہ دھارا اُنھیں اچھا خاصا نقصان پہنچا چکا ہوتا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مسلمان ممالک، حکومتیں، حکمران طبقے، دانشور، بیدار مغز صحافی اور باشعور عوام مغرب اور اسلام کے درمیان تصادم کے امکان پر بَروقت تدبّر کر لیتے۔ مگر کہاں! اگر وہ اپنی صفیں سیدھی کر کے باہم سرجوڑ کر بیٹھ جاتے اور خدا نے جس فراوانی سے انھیں تیل جیسے قدرتی اور محنت جیسے انسانی وسائل دیے تھے انھیں بے حسی، بددیانتی، بدنظمی اور عیاشی کی نذر نہ کر دیتے تو آج وہ امریکہ کے دباؤ کو بڑی حد تک رد کر سکتے تھے۔

خدا نے انسان کو ''علم'' اور ''رُوح'' کی صورت میں دو عظیم ترین نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ یہ علم اور رُوح کا امتزاج ہی تو تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے صدیوں تک قوموں کی قیادت کا کردار خوبصورتی اور ذمہ داری سے نبا ہا۔ آج مسلمانوں کا دامن علم سے خالی ہے جبکہ سرمایہ داری نظام کے علمبرداروں نے عِلم پر تسلط قائم کر رکھا ہے جس کی بنا پر وہ دُنیا کے مالک بن بیٹھے ہیں اور مسلمان ممالک، قومیں اور قیادتیں ان کے تلوے چاٹ رہی ہیں۔

مغرب کے پاس علم ہے، روح نہیں ہے۔ وہ علم سے دوسروں کے استحصال (لُوٹنے) اور استبداد (دبانے) کا کام لیتا ہے۔ کاش علم کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کے پاس خدا کی وہ رُوح تو ہوتی جو اُس نے تخلیقِ آدم کے وقت انسان میں پھونکی تھی (وَنَفَختُ فِیهِ مِن رُّوحی)۔ کبھی اس روح نے مسلمانوں کو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی روحانی قدروں کا امین بنایا تھا۔ ان قدروں کے زور پر وہ مغرب کی بدی کو اپنی نیکی سے شکست دے سکتے تھے

Marfat.com

(ادفع بالتي هِيَ اَحسَن) ۔ پھر جیسا کہ قرآنِ حکیم نے بتایا ہے، ہمارا جانی دشمن ہمارا جگری دوست بن سکتا تھا۔ مگر آج سارے عالمِ اسلام میں ان قدروں کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ بس لے دے کر ایک جُملہ (جی ہاں، صرف ایک زبانی جُملہ) ہے جو مسلمان علماء کی نوک برزبان رہتا ہے...... ''اسلام کے پانچ ستون ہیں......نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ''۔

سر آنکھوں پر۔ لیکن یہ ستون ہوا میں کھڑے ہیں یا ان کے نیچے کوئی مضبوط اور پائیدار بنیاد بھی ہے؟ پھر ستون تو اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ اُن کے اوپر کوئی شاندار عمارت تعمیر کی جائے گی۔ وہ بنیاد کیا ہے؟ وہ عمارت کیا ہے؟ نہ کوئی پوچھ رہا ہے، نہ کوئی بتا رہا ہے۔ بس یہ پانچ ستون ہوا میں کھڑے ہیں اور ان سے وابستہ مسلمانوں کا مقدّر بھی ہوا میں لٹکا ہُوا ہے۔ نہ ان کے پیروں تلے ٹھوس زمین ہے، نہ ان کے سر پر مضبوط چھت ہے۔ علم اور رُوح، دونوں سے محرومی کے باعث ہوا میں لٹکے لٹکے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دعا کر رہے ہیں، ''ربّ العزت! ہمیں نیک موت عطا فرما''۔

یہ کتاب مسلمانوں کو اُس حیات افروز اسلام سے متعارف کرانے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے جو موت نہیں، زندگی ہے۔ مایوسی نہیں، امید ہے۔ تباہی نہیں تعمیر ہے۔ ناکامی نہیں، کامیابی ہے۔ خالی جواں مردی نہیں، روحانی جواں مردی ہے۔ ذلت آمیز شکست نہیں، فتحِ مبین ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ دورِ حاضر کے مضطرب، پریشاں حال لیکن دردمند مسلمانوں پر کچھ بھولی اور بھلائی ہوئی سچائیاں بے نقاب ہو جائیں۔ یہ سچائیاں ایک تو انھیں اپنا اسلامی تشخص (Identity) قائم رکھتے ہوئے آج کی دُنیا میں امن اور سلامتی بخش سکتی ہیں۔ دوسرے یہ انھیں اس قابل بنا سکتی ہیں کہ وہ انسان کو درپیش دیرینہ اور پیچیدہ مسائل کو اسلام کی روحانی قدروں...... ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی روشنی میں حل کر کے پوری انسانیت کے لیے روشن مثال بن جائیں۔ پھر یہ جو دنیا میں رسم چلی ہے کہ مسلمان سر اٹھا کر نہ چلیں، اِن قدروں پر صدقِ دل سے عمل انھیں اقوامِ عالم میں سربلند کر سکتا ہے۔

سال ہا سال سے مسلمان مفکر اِصرار کرتے آئے ہیں کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ تلوار سے پھیلا ہوتا تو کم از کم برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے دور کے دوران ایک اہم حفاظتی تدبیر کے طور پر دارالحکومتوں کے اردگرد کے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت پیدا کر دی جاتی اور آج دِلّی اپنے لال قلعے سمیت اور آگرہ اپنے تاج محل سمیت پاکستان کا حصہ ہوتے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ہندوستان کے سیاسی مرکزوں میں تو نہ بنی، دلّی اور آگرہ سے دُور شمال مغرب (موجودہ پاکستان) اور جنوب مشرق (موجودہ بنگلہ دیش) میں جا بنی۔ وجہ سیدھی ہے، اسلام تلوار سے نہیں، تلقین سے پھیلا تھا۔ اور اِن علاقوں میں تلقین کی توفیق خدا نے رُوحانی بزرگوں یا صوفیائے کرام کو عطا کی تھی، کفر کا فتویٰ بیچنے والے اور حکومتِ وقت سے اقتدار اور دولت میں حصّہ مانگنے والے علماء کو (اِلّا ماشاءاللہ) نہیں دی تھی۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں فتحِ مکّہ سے بڑی کوئی کامیابی نہیں۔ خدا نے سورہ الفتح میں اسے ''فتحِ مبین'' کہا ہے۔ اور یہ بھولنے یا بھلانے والی بات نہیں کہ اس فتحِ مبین میں تلوار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اور نہ ہی یہ بھولنے یا بھلانے والی حقیقت ہے کہ خدا نے وَمَآ اَرسَلنٰکَ اِلّا رَحمۃً لِلعَالَمِین کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ رسُولِ خدا کی تا قیامت

Marfat.com

قائم و دائم رہنے والی حیثیت صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ تمام قوموں، زمانوں اور جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین کا کلمہ پڑھنے والوں کا دوسری قوموں سے کوئی تعارف جائز ہے تو وہ صرف اور صرف رحمت کے علمبرداروں ہی کے طور پر ہونا چاہیے۔ بے شک اسلام میں جہاد اور جنگ کا ایک اہم اور طے شدہ مقام ہے مگر مسلمانوں کے لیے جہاد اور جنگ کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ فساد مٹ جائے اور امن قائم ہو جائے۔ افسوس، آج ہمارے علماء جہاد کو فساد مٹانے کے بجائے فساد مچانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جن معاشروں کو تباہ ہونا ہوتا ہے وہاں پہلے فساد مچتا یا مچایا جاتا ہے۔

اسلام پھیلانے والے بزرگانِ دین کے ''دِل'' میں اسلام تھا، علمائے کرام کے ''مُنہ'' میں اسلام ہے۔ بزرگانِ دین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی تھی جو ہر اچھے بُرے انسان کو قریب آنے کی دعوت دیتی تھی، علمائے کرام کے ماتھے پر تیوری چڑھی رہتی ہے جو اچھے سے اچھے انسان کو بھی دُور بھگاتی ہے۔ اگر آج مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر اسلام کی پناہ درکار ہے تو انھیں دکھاوے کے بجائے دِل سے اسلام لانے کے لیے روحانیت کے پُر تپاک سرچشموں سے فیضیاب ہونا پڑے گا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جس طرح علمائے کرام نے حکومتوں اور حکمرانوں کی قربت میں شریعت کی دُکان چمکا رکھی ہے اسی طرح بزرگانِ دین کی نکمی، عیاش اور اسلام کی روحانی قدروں سے یکسر بے خبر اور بے نیاز اولاد نے (اِلاّ ماشاء اللہ) تصوف کے نام پر پیری فقیری کی دُکان کھول رکھی ہے۔
نتیجہ: بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے، مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے۔

1- یہ کتاب روحانیت اور تصوف کی قرآنی بنیادوں کا کھوج لگاتی ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے شریعت اور طریقت کے صحیح رشتے کی نشاندہی کرتی ہے۔

2- برصغیر کے مسلمانوں کو جو غیر اسلامی اور غیر عوامی تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے وہ صرف بادشاہوں، فاتحین اور غاصبوں (Kings, Conquerors and Usurpers) کے جنگجو یانہ کارناموں تک محدود ہے۔ آج کے مسلمان اُن ہستیوں کے بارے میں بمشکل کچھ جانتے ہیں جنھوں نے اس خطے میں دراصل اسلام پھیلایا تھا یا جن کے کردار و افکار سے متاثر ہو کر یہاں کے عوام نے اسلام کو سینوں سے لگایا تھا۔ اس کتاب کا ایک اہم حصہ روحانی بزرگوں اور تصوف کے چیدہ چیدہ سلسلوں کی مستند تاریخ، تعارف اور تلقین پر مبنی ہے۔

3- آج کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت تعلیم اور اس کے حاصل: ''علم'' سے قریب قریب بے بہرہ ہے۔ مغرب کی پیروی ہو یا مغرب سے دشمنی، آج کے مسلمان ٹیکنالوجی (Technology) کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور انھوں نے یہ حقیقت نظر انداز کر دی ہے کہ کھیل کے جس میدان میں وہ مغرب کا مقابلہ کرنے چل دیے ہیں وہ سراسر مغرب کے مفاد اور مسلمانوں کے نقصان میں بنایا گیا ہے۔ ٹیکنالوجی تو علم کا ایک شاخسانہ (By-product) ہے۔ علم کے بغیر ٹیکنالوجی کا حصول مسلمانوں کو کبھی مغرب کے استحصال اور استبداد سے نہیں بچا سکتا کیونکہ جب بھی کوئی ٹیکنالوجی بالآخر

مسلمانوں تک پہنچے گی، مغرب، علم کی طاقت پر اس سے کہیں بہتر اور موثر ٹیکنالوجی ایجاد کر چکا ہوگا۔ یہ کتاب یہ راز کھولتی ہے کہ خدا نے مسلمانوں کو انسان ہونے کے ناتے صبح ازل ہی سے علم کے سرچشموں تک رسائی دے رکھی ہے۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو نام رکھنے کی صلاحیت دے کر معاملات اور چیزوں کی حقیقت تک پہنچنے کا علم (علم الاسماء) (The Knowledge of the Reality of Matters and Things) سکھا دیا تھا۔ علم کے بغیر ٹیکنالوجی کا وہی حال ہوتا ہے جو پٹرول کے بغیر موٹر کار کا یا ڈور کے بغیر پتنگ کا۔ کٹی ہوئی پتنگ کے ساتھ ڈور کا جو ٹوٹا ہاتھ آتا ہے اس سے کسی ماہر پتنگ باز سے پیچ نہیں لڑایا جا سکتا، ہاں اپنے ہی کسی جانِ جگر کے گلے پر پھیر کر اس کی جان ضرور لی جا سکتی ہے۔

4- جب تک ہم اندر سے نہیں بدلتے اور اپنا تزکیۂ نفس نہیں کرتے، کتاب وحکمت کی تعلیم ہمارے اندر ہرگز ہرگز رچ بس نہیں سکتی۔ کسی چکنے گھڑے پر سمندر بھی انڈیل دیے جائیں تو پانی کا ایک قطرہ اس کے اندر داخل نہیں ہو پاتا۔ یہ کتاب اُس نسخۂ کیمیا کا انکشاف کرتی ہے جس سے اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پایا جا سکتا اور قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کیا جا سکتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اپنے اندر اور باہر ایک ایمان افروز، محبت انگیز، خیر اندیش، صداقت بداماں اور امن آفریں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

5- جس طرح انفرادی سطح پر جہاد صرف اپنے نفس ہی کے خلاف کیا جاتا ہے اسی طرح اجتماعی جہاد کے لیے قوم اور ریاست ہی کی سطح پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ آج کی دنیا کا نیا مالک، امریکہ دباؤ اور لالچ سے مسلمان ممالک کے تعلیمی نصابوں سے جہاد کی ترغیب تو کیا اس کا ذکر بھی نکلوا دینا چاہتا ہے۔ اپنے نفس اور باطل کے خلاف جہاد اسلام کی بنیادی تعلیم کا حصہ ہے۔ آج بھی جہاد اور اجتہاد دونوں ساتھ ساتھ چلیں تو اسلام تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں بخوبی اور بآسانی پھیل، پھول اور پھل سکتا ہے۔ مگر امریکہ چاہتا ہے کہ مسلمان ہاتھ پاؤں توڑ کر تصوف کے نام پر واپس خانقاہیت میں قید ہو جائیں اور ''نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری'' کے قابل نہ رہیں۔ کیا ہم بھی یہی چاہتے ہیں؟ اگر نہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ یہ کتاب خانقاہیت سے پاک عملی روحانیت کا راستہ دکھاتی ہے۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ آج کے مسلمان ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی روحانی قدروں کو اپنائے بغیر موت کے گڑھے میں تو گر جائیں گے، زندگی کی معراج کو نہ پا سکیں گے۔ لیکن ہمیں ان قدروں کو اُس خانقاہیت میں بھی تبدیل نہیں کرنا ہمیں جس سے نکالنے کے لیے ایک طرف سرسید احمد خانؒ، سید امیر علیؒ، علامہ محمد اقبالؒ اور غلام احمد پرویزؒ نے اور دوسری طرف شاہ ولی اللہؒ، عبیداللہ سندھیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے برسوں سرتوڑ کوشش کی تھی۔

مغرب نے سالہا سال تک عالمِ اسلام میں اپنی سیاسی اور اقتصادی نوآبادیاں قائم کیے رکھیں۔ پھر اس نے اپنے چکاچوند کر دینے والے علم اور ہمارے ذہنوں پر پڑے ہوئے تقلید کے تالوں کی بدولت اِن نوآبادیوں کو اپنا ذہنی قیدی بھی بنا لیا۔ ایک عرصے سے ہم سوچ کے سانچے بھی مغرب سے درآمد کرتے آئے ہیں۔ کیا اب ہم اپنے دل اور

Marfat.com

اپنی روحیں بھی مغرب کے پاس گروی رکھ دیں گے؟ آج کے مسلمان کو جس روحانیت کے بل پر دُنیا میں سر اٹھا کر چلنا ہے وہ مغرب اور جمہوریت کے خدائی فوجدار امریکہ کے دباؤ اور لالچ سے نہیں، خود ہمارے اپنے محاسبے ہی سے وجود میں آنی چاہیے۔ یہ کتاب اسی محاسبے کا حاصل ہے۔

6- بے رُوح اقتدار کے بھوکے بادشاہوں، فاتحین اور غاصبوں کی تاریخ و تعریف پڑھتے پڑھتے مسلمان عوام جواں مردی کے تصور سے تو خوب واقف ہو گئے ہیں لیکن بتانے والوں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ اگر اسلام تلوار سے نہیں، تلقین سے پھیلا تھا تو تلقین کرنے والوں کے راستے میں کیا کیا مشکل مقامات آئے تھے اور انھوں نے کس صبر و ثبات اور جواں مردی سے اپنے اوپر ٹوٹنے والے ظلم و ستم، تشدد اور مصائب و آلام کو برداشت کیا تھا۔ یہ نری جواں مردی نہ تھی جو زیادہ سے زیادہ جسموں پر دھاک بٹھاتی ہے، یہ روحانی جواں مردی تھی جس سے دل و دماغ پر دھاک بیٹھتی ہے۔ جواں مردی کا کیا ہے، وہ تو چنگیز خاں، ہلاکو، نپولین اور ہٹلر ہی نہیں، ہر بڑے غنڈے، چور، ڈاکو اور بدمعاش میں بھی ہوتی ہے۔ اسلام کی اصل طاقت جسمانی جواں مردی نہیں، روحانی جواں مردی تھی جس کی طویل روایت حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے اور حضرت علی حیدر کرارؓ سے چلتی ہوئی تا قیامت جاری رہے گی۔ اس کتاب کا ایک بڑا حصہ روحانی جواں مردی کی تصویر کشی کرتا ہے۔

7- اگر اسلام کی گم گشتہ روحانی قدروں کی تلاش میں آج کے مسلمانوں کو تصوف تک جانا پڑے اور ان کا واسطہ دورِ حاضر کے پیر زادوں، صاحب زادوں اور گدی نشینوں سے پڑے جنھوں نے تصوف کے نام پر دھوکا منڈی قائم کر رکھی ہے تو اس تلاش کے نتیجے میں وہ لامحالہ کہہ اٹھیں گے: خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں، کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری۔

تو کیا آج کے مسلمان کو تصوف کی بھول بھلیاں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے چھوڑ دیا جائے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ کتاب تصوف کو اسلامی روحانیت کا سرچشمہ تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کے سامنے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی وہ پانچ روحانی قدریں رکھتی ہے جن کی مدد سے اُن پر دین اور دنیا، دونوں کو سنوارنے کی راہ کھل سکتی ہے۔ یہی نہیں، یہ کتاب زندگی کے ہر مشکل موڑ پر خدا سے ہم کلام ہونے اور اس سے رہنمائی چاہنے کی جرأت بھی بخشتی ہے۔

8- کیا واقعی ان روحانی قدروں کو اپنا کر ہم اپنی اس بندر بانٹ اور چوہا دوڑ والی دُنیا میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ اس کتاب کا آخری حصہ اسی اہم ترین سوال کا مثبت اور تسلی بخش جواب ہے۔

9- 1993ء سے دُنیا بھر کے دانشور "تہذیبوں کے تصادم" پر بحث کر رہے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ کوئی علمی، نظریاتی یا فلسفیانہ بحث نہیں، زندگی اور موت کا معاملہ بن چکا ہے۔ اس تصادم میں مسلمانوں کی حیثیت ظالم شکاری کی نہیں، مظلوم شکار کی ہے۔ دو مسلمان ملک، افغانستان اور عراق اس صورتِ حال کی دردناک مثال بن چکے ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا سفینۂ غمِ دل کب اور کہاں جا کر رُکے گا۔ اوّل تو ہمارے علماء ہمیں دُنیائے

Marfat.com

انسانیت میں اکیلا کر چکے ہیں اور اب رہی سہی کسر ہم پر امریکہ کی سرکردگی میں مغرب کی یلغار نے نکال دی ہے۔ بے شک مغرب کے بعض درد مند دانشور اور لاکھوں باشعور عوام اس ظلم کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں لیکن شب سُست موج کا ساحل دُور دُور دکھائی نہیں دے رہا اور نہ ہی داغ داغ اُجالا کسی صبح پُرنور میں بدلتا نظر آتا ہے۔ ہماری آج کی حالت کو ہمارے آج کے شاعر افتخار عارف نے یوں بیان کیا ہے:

شکست و فتح کے سب فیصلے ہوئے کہیں اور

مثالِ مالِ غنیمت لٹا دیے گئے ہم

''تہذیبوں کے تصادم'' کے زہر کے خلاف اہلِ درد ''مذاہب کے درمیان مکالمے'' کو تریاق کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ مکالمہ تہذیبوں کے درمیان کوئی پائیدار امن قائم نہیں کر سکتا جب تک کہ تمام تہذیبوں اور مذاہب کی اُس قدرِ مشترک کو جھاڑ پونچھ کر اور چوم چاٹ کر سینے سے نہیں لگایا جاتا جسے ''روحانیت'' کہتے ہیں۔ ظاہری اختلافات کو ایک حقیقت جانتے ہوئے کالی، گوری، لال اور پیلی نسلوں کو اور یہودیت، مسیحیت، اسلام، بدھ مت اور ہندو مت جیسے مذاہب کو اگر کوئی ایک طاقت ''جیو اور جینے دو'' کا بنیادی اصول خوش دِلی سے اپنانے پر راضی کر سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف روحانیت ہے۔ یہ کتاب ہمیں انسانی وحدت کی خاطر تہذیبوں اور مذاہب کی اسی قدرِ مشترک کی جانب آگے سے آگے بڑھنے کے لیے تیار کرتی ہے۔

میرے معزز اور محترم ہمعصر، ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی سوانح عمری...... ''اپنا گریباں چاک''...... میں اپنے والدِ گرامی قدر، علامہ اقبالؒ سے کچھ پُچھتے ہوئے سوال پوچھتے وقت اپنے آپ کو ''یکے از فرزندانِ اقبال'' قرار دیا ہے۔ یہ اُن کی عظمت ہے کہ اقبالؒ کے نسب سے ہوتے ہوئے انھوں نے مجھ جیسے خاکساروں کو یہ حوصلہ دے دیا ہے کہ میں بھی اپنے آپ کو ''یکے از فرزندانِ اقبال'' سمجھ لوں۔ اگر ممکن ہو تو از راہِ کرم آپ بھی میری بابت یہی تصور کر لیجیے۔ یہ گذارش اس لیے ضروری تھی کہ جب آپ اس کتاب میں اقبالؒ کا کثرت سے ذکر دیکھیں تو مجھے معاف کر سکیں۔

اقبالؒ کے تتبع میں، 1961ء سے 1963ء تک کے عرصے میں، ایک مختصر سے کنبے کے سوا، دُنیا کی ہر چیز سے کٹ کر، اور کوئٹہ کی ایک کُٹیا میں گوشہ نشین ہو کر میں نے قرآنِ حکیم کو اسی طرح پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی جیسے یہ مجھی پر نازل ہو رہا ہے۔ سورہ الحشر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قرآن اگر کسی پہاڑ پر نازل کر دیا جاتا تو وہ پہاڑ اس کی ہیبت سے پھٹ جاتا۔ میرے مطالعے نے میری بھی ہڈیاں گلا دیں اور دل موم کر دیا۔ میرا یہ مطالعہ 1967ء سے 1975ء تک پاکستان پیپلز پارٹی کے کام آیا۔ وہ سوشلزم جو پہلے چائے خانوں کی پیالیوں میں انقلاب لایا کرتی تھی، اس مطالعے کی بدولت اسلام کی تعلیمِ مساوات میں ڈھل کر گلی گلی، گاؤں گاؤں اور شہر شہر کے باسیوں اور کھیتوں، کھلیانوں، دکانوں، دفتروں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کے دل کی آواز بن گئی۔ لیکن مجھ پر قرآنِ حکیم کا جو قرض تھا وہ ادا نہ ہُوا تھا۔ آج دنیا بھر

Marfat.com

کے مسلمان کچھ کچھ اُسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں کبھی الطاف حسین حالیؒ نے "مسدّس" لکھی تھی اور اقبالؒ نے خدا سے "شکوہ" کیا تھا۔ میں اسی مقام سے لیکن اپنی ناچیز سطح پر یہ کتاب مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور دست بہ دعا ہوں کہ موت کے مُنہ میں آئے ہوئے مسلمانوں کو زندگی کے صراطِ مستقیم پر ڈالنے میں یہ ان کی مددگار ثابت ہو۔

روحانیت کے بارے میں اتنے وثوق اور حوصلے سے بات کرنے کی جرأت عطا کرنے پر میں اپنے مرشد، نور والے بابا حضرت فضل شاہ صاحبؒ (مرحوم) اور عہدِ حاضر کے دانائے راز حضرت واصف علی واصفؒ (مرحوم) کا شکر گزار ہوں۔ انسان ہونے کے ناتے کتاب میں نادانستہ کئی غلطیاں اور کوتاہیاں رہ سکتی ہیں۔ اہلِ علم اور اہلِ دِل سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ازراہِ کرم میری اصلاح فرمادیں گے۔

محمد حنیف رامے
345-K، ڈیفنس، لاہور
haneeframay@gmail.com

Marfat.com

پہلا حصہ

روحانیت کے قرآنی سرچشمے

Marfat.com

Marfat.com

پہلا باب

روحانیت اور تصوف کی قرآنی بنیادیں

اسلام وہ صراطِ مستقیم ہے جو انسان کو اُس مقام تک لے جاتا ہے جہاں کائنات انسان کے سامنے اور انسان خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو۔

اسلام سلامتی کا وہ عہد نامہ ہے جس کی بدولت انسان ہر طرح کی تباہی و بربادی سے بچ سکتا ہے اور خدا کی تمام تر مخلوق اس کے ہاتھوں محفوظ رہ سکتی ہے۔ اسلام موت نہیں، زندگی ہے۔

اسلام وہ منشور ہے جو انسان کو ذاتی سطح پر بھی امن و سلامتی اور صلح و آشتی سے ہمکنار کرتا ہے اور اُسے ساری دنیا اور پوری انسانیت میں بھی امن و سلامتی قائم کرنے کا شرف عطا کرتا ہے۔

اسلام رسوم و قیود میں الجھا ہوا کوئی جامد اور محدود مذہب نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر دین ہے جس کی روشنی انسان کی جسمانی، جذباتی، ذہنی، مادی، اخلاقی، روحانی اور تخلیقی زندگی اور انسان کے امکانات تک پھیلی ہوئی ہے۔

اسلام دُنیا سے فرار نہیں سکھاتا، وہ دنیا کو جنت بنانے کا راستہ دکھاتا ہے۔

اسلام وہ طرزِ فکر و عمل ہے جس سے انسان کی تمام مثبت صلاحیتیں بہترین انداز سے نشوونما پاتی ہیں اور وہ ارتقائی منزلیں طے کرتا ہُوا، نت نئی بلندیوں کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اسلام کوئی بندھا ٹکا ضابطۂ قوانین (Dogma) نہیں بلکہ زمانے کی گردش کا ہمقدم انقلاب ہے جو انسان کو یہ اہلیت بخشتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے تقاضوں سے اعتدال، توازن اور خوبصورتی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے۔

اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمے کے پانچ ستونوں سے اُوپر اٹھ کر ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی اس عظیم الشان اور حیات افروز عمارت کا نام ہے جو اِن ستونوں پر کھڑی ہے۔ یہ ستون اسلام کا چہرہ تو ہیں مگر دل و جان نہیں۔ اسلام کا دل اور اس کی جان ایمان ہے، محبت ہے، خیر ہے، صداقت ہے، امن ہے۔

اسلام کو علی الاعلان اور دل کی گہرائیوں سے قبول کرنے اور خدا کے احکام کے سامنے کسی جبر کے بغیر سر جھکانے والے انسان کو مسلمان کہتے ہیں۔

اسلام اور انسانیت کا گہرا تعلق ہے۔ انسانیت وہ پودا ہے جس پر اسلام کا پیوند لگایا جاتا ہے۔ اس لیے جب تک ہم اچھے انسان نہیں بنتے، ہم اچھے مسلمان بن ہی نہیں سکتے۔

مسلمان زندگی کے سفر میں اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ اس کی ذاتی، گھریلو اور سماجی زندگی فتنہ و فساد اور

Marfat.com

انتشار و بدامنی سے پاک ہو۔

مسلمان خدا کی زمین پر خدا کے نمائندے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح خدا اپنی ساری مخلوق سے مہربان والدین کا سلوک کرتا ہے اسی طرح مسلمان خدا کی ساری مخلوق کے ساتھ محبت کرنے والے بھائی بہن اور دوست کا تعلق رکھتا ہے۔ ایک سچے مسلمان کی زندگی پیغمبرِ انسانیت، رحمۃ للعالمین، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں رحمت کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتی ہے۔

انسانیت کے دو مآخذ ہیں: روح اور علم۔

خدا کی روح اور ناموں کا علم

خدا نے آدم کو تخلیق کیا تو اس میں اپنی روح پھونک دی۔ کائناتوں کے خالق و مالک خدا نے یہ شرف اپنی اَن گنت مخلوقات میں سے کسی اور مخلوق کو عطا نہیں کیا۔ انسان کے اس شرف نے اسے اشرف المخلوقات ٹھہرایا اور یہ وہ شرف تھا جس نے اسے مسجودِ ملائک بنایا۔

قرآنِ حکیم میں رُوح کا چوبیس (24) مختلف مقامات پر ذکر آیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے حوالے سے ہمیں بتایا گیا ہے:

''تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا، ''میں مٹی کے گارے (گُندھی ہوئی مٹی) سے ایک بشر (انسان) بنانے لگا ہوں۔ جب میں اسے بنا سنوار لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدے میں گر جانا''۔ چنانچہ سب کے سب فرشتے سجدہ ریز ہو گئے'' (15:28-30)۔

سجدے کا مطلب ہے اطاعت کا اظہار۔ فرشتوں سے مراد ہے کائنات میں کارفرما اصول یا خدائی قوتیں۔ جب خدا نے انسان میں اپنی روح پھونک دی تو خدائی قوتوں کے لیے آسان ہو گیا کہ وہ انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اسے اپنی اطاعت اور حکم برداری کا یقین دلا دیں۔ انسان کے اندر خدا کی روح موجود ہونے کے باعث فرشتے ایک طرح سے اس روح ہی کے سامنے جھکے تھے۔

لیکن انسان کے اس خصوصی امتیاز کے علاوہ اس کا ایک شرف اور بھی تھا۔ انسان چیزوں کی حقیقت اور معاملات کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا اور ان کا نام اور عنوان طے کر سکتا تھا۔

ذرا دیکھیے، قرآنِ حکیم نے زمین و آسمان اور انسان کی تخلیق کا کیا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے:

''اے انسانو! خدا ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر زمین سے باہر توجہ کی اور سات آسمان (طبقات) قائم کیے۔ اور خدا ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔ پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا، ''میں (انسان کو) زمین پر خلیفہ (نمائندہ، ناظم الامور) بنانے لگا ہوں'' تو انھوں نے عرض کی تھی،

Marfat.com

''کیا آپ زمین پر ایک ایسی مخلوق کا تقرر کرنے والے ہیں جو فساد پھیلائے اور خون بہائے گی، جب کہ ہم حمد وثناء کے ساتھ آپ کی تسبیح (حکم برداری) اور تقدیس (عزت افزائی) کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے''۔ خدا نے فرمایا، ''میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔ پھر خدا نے آدم کو تمام اشیاء کے نام (The Knowledge of the Nature of Things) سکھا دیے اور ان اشیاء کو فرشتوں کے سامنے رکھ کر کہا، ''اگر تمھاری رائے درست ہے تو ذرا ان کے نام تو بتاؤ''۔ اس پر فرشتوں نے عرض کی، ''آپ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے، ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے بتا رکھا ہے۔ درحقیقت صرف آپ ہی تمام تر علم ودانش کے حامل ہیں''۔ پھر خدا نے آدم سے کہا، ''تم انھیں ان اشیاء کے نام بتاؤ''۔ جب آدم نے ان سب کے نام بتا دیے تو خدا نے فرشتوں سے کہا، ''میں نے تمھیں بتایا تو تھا کہ میں زمین وآسمان کے سارے بھید جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہوں''۔ اور جب خدا نے فرشتوں سے کہا، ''آدم کے سامنے سجدہ بجالاؤ'' تو وہ سب کے سب سجدے میں گر گئے، سوائے ابلیس کے، جس نے تکبر کیا اور نافرمانوں میں شامل ہوگیا'' (2:30-34)۔

خدا نے انسان کے اندر اپنی روح پھونک کر اور اُسے چیزوں کی حقیقت کا علم عطا کر کے دراصل اپنی تمام دوسری مخلوقات پر فضیلت بخش دی تھی۔ انسان کی اس فضیلت کی جتنی بھی اہمیت اور معنویت بیان کی جائے، وہ کم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے احساس اور شعور میں جتنا اضافہ ہوتا جائے گا، اس اہمیت اور معنویت میں مزید وسعت اور گہرائی آتی جائے گی۔

بے پایاں روحِ خداوندی اور بے پایاں علمی صلاحیت کے علاوہ انسان کی تین اور صفات کا بھی ذکر ضروری ہے:

تکریمِ انسانیت

قرآنِ حکیم میں خدا فرماتا ہے:

''اور ہم نے اولادِ آدم (نوعِ انسانی) کو واضح طور پر تکریم (بزرگی اور عزت) عطا کی اور انھیں خشکی اور تری میں ذرائعِ سفر مہیا کیے، پاکیزہ رزق دیا اور اپنی بے شمار مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی'' (17:30)۔

اس مقام پر اس تکریم کی صرف ایک اہمیت کا بیان کافی ہوگا۔ قرآنِ حکیم کی یہ آیت دیکھیے:

''جس نے کسی ایک بھی انسان کو بلا جواز قتل کر دیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک بھی انسان کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی'' (5:32)۔

انسانی جان کی حرمت کا اس سے زیادہ جاندار اور شاندار اظہار آج تک انسانی حقوق کے کسی بڑے سے بڑے علمبردار کو بھی نصیب نہیں ہُوا، اور نہ ہوگا۔

Marfat.com

خدا کا رنگ

قرآنِ حکیم نے توراتِ مقدس کی طرح یہ تو نہیں کہا کہ ''جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا تو اسے اپنی شبیہ (Image) پر بنایا'' (پیدائش-5:1)۔ لیکن اس نے اس پسندیدہ امکان کی طرف یہ واضح اشارہ ضرور کیا ہے کہ انسان خدا کے رنگ میں رنگا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

''خدا کا رنگ (صبغۃ اللہ) اختیار کرو۔ اس کے رنگ سے اچھا رنگ اور کس کا ہو سکتا ہے'' (2:138)۔

خدا کے کونسے رنگ ہیں؟ یہ خدا کی وہ صفات ہیں جنھیں خدا نے اپنے خوبصورت نام (اسمائے حسنیٰ) قرار دیا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کے ننانوے اسمائے حسنیٰ ہیں جنھیں اس کے صفاتی نام سمجھنا چاہیے جب کہ اس کا ذاتی نام صرف ''اللہ'' یا ''خدا'' ہے۔ انسان کی پہنچ خدا کی صفات تک ہے اور یہ اس کا خصوصی امتیاز ہے کہ وہ خدا کی صفات میں رنگا جا سکتا ہے اور اس امتیاز کی بنیاد صرف یہ ہے کہ انسان کے اندر خدا کی روح موجزن ہے جو انسان کے لیے خدا کے رنگ میں رنگے جانے میں اس کی مدد کرتی ہے۔ اسمائے حسنیٰ کے سلسلے میں قرآنِ حکیم کی یہ بے بدل اور بے نظیر آیات ملاحظہ کیجیے:

''یہ خدا ہی ہے جس کے سوا کوئی اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت (بندگی یا پرستش) کی جائے۔ وہی نہاں اور عیاں حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ وہی بروقت رحمت کرنے والا (الرحمان) اور وہی ہمیشہ رحم کرنے والا (الرحیم) ہے۔ (ایک مرتبہ اور) یہ خدا ہی ہے جس کے سوا کوئی اس لائق نہیں کہ اس کی عبادت (بندگی یا پرستش) کی جائے۔ وہی مطلق حکمران (الملک) ہے، وہی بزرگی کی انتہا (القدوس) ہے، وہی سلامتی کا ضامن (السلام) ہے، وہی امن و ایمان کا منبع (المومن) ہے، وہی پناہ دینے والا (المہیمن) ہے۔ وہی سب پر غالب (العزیز) ہے۔ وہی اپنا حکم منوانے کی طاقت رکھنے والا (الجبار) ہے اور وہی بڑائی کا واحد مستحق (المتکبر) ہے۔ یہ وہ خدا ہے جس کی خدائی میں کوئی حصہ دار نہیں۔ یہ وہ خدا ہے جو پیدا کرنے والا (الخالق)، چیزوں اور حقیقتوں کی ابتداء کرنے والا (الباری)، اور ان کی صورت گری کرنے والا (المصور) ہے۔ سب اچھے نام (الاسماء الحسنیٰ) اسی کو زیب دیتے ہیں۔ زمین اور آسمانوں کی ہر مخلوق اس کی حکم برداری (تسبیح) کر رہی ہے۔ وہی تمام تر قوت کا مالک (العزیز) اور تمام تر دانش و حکمت کا حامل (الحکیم) ہے'' (59:21-24)۔

ذرا سوچیے، اس عظیم و برتر خدا کے رنگ میں رنگے جانے والے انسان کی اپنی کیا شان ہو گی! روحِ خداوندی سے سرافراز اور خدا کی گوناگوں صفات میں رنگے جانے والے اس انسان کو اقبال نے مسلمان کا نام دیا تھا:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مناسب ہو گا کہ اس مقام پر تھوڑا رک کر سوچا جائے کہ جب خدا نے فرشتوں کو یہ بتایا کہ وہ انسان کو زمین پر

Marfat.com

ناظم الامور مقرر کرنے والا ہے اور اس پر فرشتوں نے رائے دی کہ وہ تو وہاں فساد مچائے گا اور خون بہائے گا تو اس رائے کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا نے انسان کی اس صلاحیت کا ذکر کیوں کیا کہ وہ تمام چیزوں کا نام رکھ سکتا ہے؟ کہاں فساد مچانا اور خون بہانا اور کہاں چیزوں کے نام رکھنا۔ دونوں میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ حیرت ہے کہ فرشتے بھی انسان کی اس صلاحیت کا مظاہرہ دیکھنے کے بعد لاجواب ہو گئے۔ یہ چیزوں کو نام دینے یا ان کا عنوان مقرر کرنے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

فرض کیجیے، آپ نے ایک مضمون، کہانی یا کتاب لکھی ہے اور پھر اس کا ایک نام یا عنوان طے کر دیا ہے۔ اگر یہ نام اور عنوان واقعی درست ہے تو اس میں اس مضمون، کہانی یا کتاب کا مفہوم اس طرح موجود ہو گا جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا جائے۔ چلیے کچھ علمی اور ادبی کتابوں کی مثال لے لیتے ہیں: داتا گنج بخشؒ کی ''کشف المحجوب''، علامہ شبلی نعمانیؒ کی ''الفاروق''، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ''تفہیم القرآن''، ٹالسٹائی کی ''جنگ اور امن'' (War and Peace)، دوستوایفسکی کی ''جرم و سزا'' (Crime and Punishment)، ایملی برونٹے کی ''تکبر اور تعصب'' (Pride & Prejudice)، اقبالؒ کی ''اسلامی فکر کی تشکیلِ نو'' (The Reconstruction of Religious Thought in Islam)، فیض احمد فیض کی ''زنداں نامہ''، انتظار حسین کی ''گلی کوچے''، اشفاق احمد کی ''ایک محبت سو افسانے''۔ خود اس کتاب کا عنوان دیکھ لیں: ''اسلام کی روحانی قدریں: موت نہیں، زندگی''۔ ان کتابوں کے ناموں یا عنوانوں میں ان کے تمام تر مواد کا بنیادی مفہوم موجود ہے۔

جب ہم کسی چیز، کیفیت، واقعے، عمل یا سوچ کو نام دیتے ہیں تو ہمیں اس کی تمام خصوصیات (Characteristics) یا خاصیتوں (Properties) اور اس کے بنیادی عناصر یا اجزائے ترکیبی (Elements) کا پورا پورا علم ہونا چاہیے۔ جب فرشتوں نے انسان کے اس امکانی کردار کا ذکر کیا کہ وہ فساد پھیلائے اور خون بہائے گا تو اپنی جگہ وہ غلط نہیں تھے۔ جب انسان اپنی خداداد علمی صلاحیت کو مثبت کے بجائے منفی انداز سے استعمال کرتے ہوئے انسانیت کی فلاح کے بجائے اس کی بربادی کا سامان کرتا ہے یا اپنے اندر خدا کی روح سے غافل ہو کر صرف اپنی گھٹیا خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اپنے اعمال کا آگا پیچھا نہیں دیکھتا تو یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ وہ خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیتا ہے اور دوسرے انسانوں کا بے دریغ خون بہاتا چلا جاتا ہے۔ خدا نے فرشتوں کو بتایا کہ انسان کو سوچنے سمجھنے، غور و فکر کرنے کی صلاحیت دے کر اور اس کے اندر اپنی روح پھونک کر اسے اس لائق بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنی روحانی بنیاد اور اپنے وسیع تر علم کی بدولت اپنی جبلتوں اور سفلی خواہشات پر قابو پا سکتا ہے اور اپنی ذات سے بالا ہو کر خلقِ خدا سے محبت اور اس کی خدمت کر سکتا ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جس انسان کے آگے فرشتوں (کائنات میں کارفرما خدائی قوتوں) نے سجدہ کر کے اظہارِ اطاعت کیا تھا اس میں خدا کی روح جلوہ گر تھی اور علم الاسماء کی بدولت اُسے ہر شے، کیفیت، واقعے، عمل اور

Marfat.com

سوچ کے نتائج کی خبر تھی۔ جیسے ہی یہ انسان اپنی روحانی بنیاد کو نظر انداز کر کے قومی، نسلی، قبائلی، نظریاتی، فرقہ وارانہ، علاقائی، ثقافتی اور جنسی فرق کے پیش نظر فساد مچاتا اور خون بہاتا ہے یا غور و فکر کر کے اپنے عہد میں تمام تر خلق خدا کی سلامتی اور انسانی اور روحانی قدروں کے فروغ کا سامان نہیں کرتا تو کائنات میں کارفرما خدائی قوتیں اس کے سامنے جھکنے کے بجائے اس کی مخالفت میں ڈٹ جاتی ہیں۔

اس ضمن میں ذرا اس صورت حال پر بھی توجہ فرمایئے جسے غالبؔ نے اس شعر کی صورت میں واضح کیا تھا:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں؟

شاید غالبؔ کے عہد میں یہ سوال جواب طلب ہو لیکن آج کے انسانوں، خصوصاً مسلمانوں نے اپنا جو حال بنا رکھا ہے اس میں اس سوال کا یہ جواب ہر روز ہمارے مُنہ پر ایک زوردار طمانچے کی صورت میں نازل ہوتا رہتا ہے: ہم اس لیے ذلیل و خوار ہیں کہ اپنی روحانی بنیاد کو یکسر نظر انداز کرنے کے علاوہ تدبر اور تفکر سے بھی بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ہم نے مذہب کے ظاہری خول کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے اور جب اس خول سے ہماری تسکین نہیں ہوتی تو ہم اس سے بھی سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ پھر ہمارا نطشے (Nietzsche) جیسا کوئی مُنہ پھٹ ترجمان ہماری طرف سے اعلان کر دیتا ہے کہ ''خدا مر چکا ہے'' حالانکہ خالق و مالکِ کائنات تو ہمیشہ زندہ و پائندہ ہی ہوتا ہے، صرف ہم جیتے جی روحانی طور پر مر جاتے ہیں۔ مگر مسئلہ صرف ہماری ذلت و خواری کا نہیں، اُس خدا کی شرمساری کا بھی ہے جس نے ہمیں بہترین تناسب و اجزا کے ساتھ پیدا کیا (لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، 95:4) اور ہم پر اعتماد کرتے ہوئے ہمیں انتہائی فخر کے ساتھ فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ یہاں تک کہ جب اُس ابلیس نے، جسے فرشتوں کا استاد گردانا جاتا تھا، اور جس نے مختلف روایات کے مطابق کائنات کے چپے چپے پر خدا کو سجدہ کر رکھا تھا اور جسے بعض اہلِ دل عظیم ترین مواحد (خدا کی ذات کے سوا کسی کو لائق اطاعت نہ سمجھنے والی شخصیت) قرار دیتے ہیں، خدا کے حکم کے باوجود غیر اللہ (انسان) کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو خدا نے اسے مردود ٹھہرا دیا۔ آئے دن یہ دیکھ کر کہ جس انسان کی خاطر فرشتوں کے استاد، ابلیس کی گستاخی پر خدا نے اسے دفع دور (Get out) کہہ دیا تھا وہ انسان خدا کو چھوڑ کر اسی مردود کے پیچھے چل نکلا ہے، کیا خدا کی آنکھیں نیچی نہ ہو جاتی ہونگی؟ اقبالؔ نے غلط نہیں کہا تھا:

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

لیکن افسوس کہ غالبؔ نے بھی اپنی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان کے بارے میں درست ہی کہا تھا:

شرم تم کو مگر نہیں آتی

آیئے آگے بڑھیں اور روحانیت کی ایک اور قرآنی بنیاد پر غور کریں۔

کتاب وحکمت سے پہلے تزکیۂ نفس

جب حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے (رسولِؐ خدا کے جدامجد) حضرت اسماعیلؑ عرب کے مرکز مکّے میں خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ان دونوں نے خدا سے دعا کی تھی:

''اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر (خانہ کعبہ) کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جا رہے تھے: ''اے ہمارے رب! ہماری یہ خدمت قبول فرما لے کہ تو سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا حکم برداز (مسلم) بنا اور ہماری اولاد سے ایک ایسی قوم پیدا کر جو تیری اطاعت گزار ہو۔ اور ہمیں اپنی عبادت کے طور طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما کہ تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے ہمارے رب! (یہاں آباد ہونے والی) ہماری اولاد میں، خود انھی کے اندر سے ایک رسول مقرر فرما جو انھیں تیری آیات سنائے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ (پاکیزگیءِ نفس) کرے۔ یقیناً تو سب پر غالب اور تمام تر دانش کا حامل ہے'' (2:127-129)۔

قرآنِ حکیم کی اسی سورہ (البقرہ) میں ذرا آگے چل کر خدا نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کے حوالے سے رسولِؐ خدا کے پیروکاروں کو جتلایا ہے:

''اپنے مخالفین سے نہ ڈرو، صرف مجھی سے ڈرو۔ میرے حکم کی پیروی سے تم اسی طرح فلاح (نجات، کامیابی) حاصل کرو گے جس طرح اس بات سے تمھارے لیے فلاح کا راستہ کھل گیا ہے کہ ہم نے (ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی دعا قبول کرتے ہوئے) تمھارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیج دیا ہے جو تمھیں ہماری آیات سناتا ہے، تمھارا تزکیہ کرتا ہے، تمھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ باتیں بتاتا ہے جو تمھیں معلوم نہ تھیں'' (2:150-151)۔

بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دُعا حرف بہ حرف قبول فرمائی تھی۔ لیکن غور سے دیکھیں تو ایک فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ خدا نے دونوں عظیم ومحترم پیغمبروں کی دعا کی بدولت ان کی عرب میں آباد اولاد کے اندر سے رسولِؐ خدا حضرت محمدؐ کو نبوت سے تو نواز دیا۔ لیکن آپؐ کے فرائض کی ترتیب بدل دی۔ دونوں بزرگ نبیوں نے کہا تھا کہ یہ رسول لوگوں کو (پہلے) کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور (اس کے بعد) ان کا تزکیۂ نفس کرے۔ خدا نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے تزکیۂ نفس کو پہلی اور کتاب وحکمت کی تعلیم کو دوسری حیثیت دے دی۔ اس بنیادی تبدیلی کی ایک انتہائی اہم نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ جب تک انسان کا دل آمادہ نہیں ہوتا اس پر کتاب وحکمت کی تعلیم کچھ اثر نہیں کرتی۔ اور یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہو چکی تھی۔ قرآنِ حکیم سے پہلے کئی اور الہامی کتابیں نازل ہو چکی تھیں اور انسانی رویے واضح ہو چکے تھے۔ چنانچہ خدا رسولِؐ خدا کے پیروکاروں کو بتاتا ہے:

''یہ خدا ہی تو ہے جس نے اُمّیوں (ام القریٰ مکّے میں اور اس کے آس پاس آباد لوگوں) کے اپنے اندر سے

Marfat.com

ایک رسول مُقرر کر دیا جوان کا تزکیہ کرتا اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور یقیناً یہ لوگ پہلے کھلی گمراہی کا شکار تھے۔ اور اس رسول کی رسالت ان لوگوں کے لیے بھی ہے جن سے یہ لوگ کبھی نہیں ملے (دوسری قوموں اور آنے والی نسلوں کی طرف اشارہ ہے) اور خدا ہی سب پر غالب اور تمام تر دانش کا حامل ہے۔ یہ خدا کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے سو دیتا ہے اور خدا بہت ہی فضل کرنے والا (حق سے بھی زیادہ دینے والا) ہے۔ جن لوگوں کو تورات مقدس عطا کی گئی تھی اور انھوں نے اس کا حق ادا نہ کیا (اسے دل سے تسلیم نہ کیا) ان کی مثال اس گدھے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔ بُری ہے اس قوم کی مثال (جو اس بات پر تو فخر کرے کہ اس پر خدا کی کتاب اُتری ہے) لیکن عملاً اس کو جھٹلائے اور قانونِ خداوندی یہ ہے کہ ایسے ظالم (حد سے گزرنے والے) لوگ ہدایت نہیں پاتے'' (62:2-5)۔

قرآنِ حکیم کے سنجیدہ طالب علموں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسُولِ خدا پر سب سے پہلے یہ آیات نازل ہوئی تھیں:

''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا کیا اور جس نے جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو کہ تمھارا رب لائقِ تعظیم ہے اور اس نے (انسان کو) قلم کے ذریعے سے علم سکھایا ہے'' (96:1-4)۔

اسی طرح اس بات پر بھی تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ اس اوّلین وحی کے بعد کافی عرصے تک دوسری وحی نازل نہ ہوئی۔ اڑھائی تین سال کا یہ عرصہ رسُولِ خدا کے لیے انتہائی آزمائش کا تھا۔ ذرا سوچیے، آپ نبوت کا اعلان کر چکے ہیں، خواتین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، بالغ مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور نوجوانوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ جیسے کچھ لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں مگر وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ دن، ہفتے، مہینے، سال اس تذبذب میں گزر رہے ہیں کہ کہیں خداوند تعالیٰ آپؐ سے ناراض تو نہیں ہو گیا اور اس نے آپ کو ترک تو نہیں کر دیا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ چنانچہ آخرِ کار وحی کا سلسلہ جاری ہو گیا اور خدا نے روح کی اندھیری رات (The Dark Night of the Soul) میں آپؐ کو پکارا:

''قسم ہے روزِ روشن کی اور اس رات کی جس پر سکوت طاری ہو جائے، تمھارے رب نے تم سے ہرگز ترکِ تعلق نہیں کیا اور نہ ہی وہ تم سے ناراض ہے۔ اور آنے والا وقت تمھارے لیے پہلے وقت سے یقیناً بہتر ہوگا۔ اور عنقریب تمھارا رب تمھیں وہ کچھ عطا کرے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے'' (93:1-5)۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور دوسری وحی کے درمیان کے تیس پینتیس مہینوں کے دوران رسُولِ خدا عملاً کیا کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اداس اور پریشان تو تھے، اپنوں کی آنکھوں میں اور غیروں کی زبانوں پر یہ سوال موجود تھا کہ آپؐ نے دعوئ نبوت تو کر دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپؐ پر سورہ علق کی چار آیات نازل ہو چکی ہیں تو اب آپ پر وحی کیوں نہیں آ رہی؟ لیکن خدا نے آپ کو ساری انسانیت کی نبوت کچھ سوچ سمجھ کر ہی دی تھی۔ آپؐ نے لازماً یہ عرصہ اُن گنے چنے افراد کے تزکیہ نفس پر صرف کیا جو آپ کو صادق و امین سمجھ کر آپؐ کے ہاتھوں مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ خدائے

Marfat.com

علیم وحکیم جس نے رسولِ خدا کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا کی ترتیب بدل دی تھی اور آپؐ کے فرائض میں کتاب وحکمت کی تعلیم کے بجائے تزکیۂ نفس کو پہلا فریضہ قرار دے دیا تھا، اس نے وحی کا سلسلہ کچھ عرصے تک معطل رکھ کر آپ کو موقع دیا کہ آپؐ جس مسلمان امت کی بنیادیں رکھنے والے تھے اس کے ابتدائی ارکان کی کردار سازی کر سکیں تاکہ جوں جوں قرآنِ کریم کے ذریعے سے کتاب وحکمت (شریعت یا قانون) نازل ہوتی جائے، اہلِ اسلام اس کی تعلیم پر صدقِ دل سے نہ صرف ایمان لائیں بلکہ عمل بھی کریں۔ یہ اسی تزکیۂ نفس اور کردار سازی کا نتیجہ تھا کہ اونٹنی کا دودھ پینے اور جَو کی روٹی کھانے والے ابتدائی مسلمانوں کے سامنے فارس اور روم کی عظیم الشان سلطنتیں (The Persian and Roman Empires) یوں ڈھیر ہو گئیں جیسے ریت کی دیواریں ہوں۔

اس تزکیے اور کردار سازی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

1- ابوبکر صدیقؓ خلیفہ بنے تو آپ نے اپنی تنخواہ مدینے کے ایک عام مزدور کے برابر مقرر کی۔

2- عمر فاروقؓ خلیفہ بنے تو آپ نے کہا، اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو میں سمجھتا ہوں کہ روزِ قیامت مجھے خدا کو اس کا بھی حساب دینا ہوگا۔

3- عثمان غنیؓ نے اسلام قبول کیا تو آپ نے رسولِ خدا کو اختیار دیا کہ آپؐ اُن کی دولت میں سے جو چاہیں غریب اور کمزور مسلمانوں کی بہبود پر اور غلام مسلمانوں کی رہائی پر خرچ کر ڈالیں۔

4- علی کرم اللہ وجہہٗ نے ایک جنگ کے دوران اپنے حریف کو زیر کر لیا اور جب آپ اس کے سینے پر سوار ہو کر اسے قتل کرنے لگے تو اس بدبخت نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا۔ طیش میں آنے کے بجائے آپ اس کے سینے سے اتر گئے اور وہ شخص بچ گیا۔ اس شخص نے پوچھا، ''آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا''۔ فرمایا، ''جب تم نے میرے مُنہ پر تھوکا تو میں نے سوچا، کیا اب میں تمھیں خدا کی خاطر قتل کر رہا ہوں یا اپنی ہتک کا بدلہ لینے کے لیے؟ بس میں نے اسی تذبذب میں تمھیں چھوڑ دیا''۔

اس سلسلے میں اول وآخر خود رسولِ خدا کا رویہ بھی چشم کشا ہوگا:

آپ کی شادی عرب کی ایک مالدار ترین خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے ہوئی تھی۔ رسولِ خدا سے شادی کے بعد انھوں نے اپنی دولت کسی اور کے نام تو نہیں کر دی تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ تاریخ اسلام کے مطابق آپؐ کے گھر میں اکثر فاقہ ہوتا تھا۔ آپ کی یہ ساری دولت کہاں گئی؟ ظاہر ہے کہ حاجت مندوں پر صَرف ہو گئی۔ کیونکہ ہر روز شام کے وقت رسولِ خدا آواز دیتے تھے، خدیجہ، فاطمہ! دیکھو گھر میں ہماری ضرورت سے زائد کوئی چیز نہ پڑی رہ جائے جو گھر سے باہر کسی ضرورت مند کے کام آ سکتی ہو۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ آپؐ نے کبھی دوسرے مسلمانوں کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا جس پر آپؐ نے خود دوسروں سے بڑھ کر عمل نہ کیا ہو۔ نماز ہی کو لے لیجیے۔ رات بھر جاگ کر آپ اتنی عبادت

Marfat.com

کرتے تھے کہ آپ کے پاؤں سُوج جاتے تھے حتیٰ کہ خود خدا کو کہنا پڑا کہ میرے پیارے، رات کو تھوڑا آرام بھی کر لیا کرو۔ خندق کی تعمیر میں دوسروں نے ایک ایک پتھر اٹھایا تو آپؐ کے پیٹ پر دو دو پتھر بندھے پائے گئے۔ لیکن دوسروں کو زکوٰۃ کا حکم سنایا تو تاریخ ہمیں ایک مثال بھی مہیا نہیں کرتی کہ آپؐ نے زندگی بھر کبھی خود بھی زکوٰۃ دی ہو۔ زکوٰۃ کیونکر دیتے، آپؐ کے پاس کبھی اتنا مال جمع ہی نہ ہُوا کہ زکوٰۃ واجب آتی۔ آپؐ نے زکوٰۃ سے آگے بڑھ کر قرآنِ حکیم کے اس حکم کو پیشِ نظر رکھا کہ اپنی ضرورت کا رکھ کر باقی سب کچھ خدا کی راہ میں (حاجت مندوں پر) خرچ کر دو (یَسئلُونَکَ ماذا یُنفقون. قل العفو، 2:219)۔

یہ تو تھیں تزکیۂ نفس کی مثالیں لیکن تزکیے اور کردار سازی کے بغیر کیا ہوتا ہے اس کی صرف دو مثالیں کافی ہیں۔

(1) حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر وادیٔ سینا میں لے آتے ہیں۔ خدا نے عظیم ترین اور مہیب ترین معجزوں سے صدیوں کی جان لیوا اور تحقیر آمیز غلامی کے بعد بنی اسرائیل کی آزادی ممکن بنائی ہے۔ مصریوں پر ایک کے بعد ایک عذاب نازل کیا گیا یہاں تک کہ طاعون نے مصریوں کے پہلوٹھی کے بچے ہلاک کر دیے، سمندر خون آلود ہو گیا اور بالآخر سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو اس کے اندر سے محفوظ گزار دیا گیا۔ مگر جب فرعون کے لشکر ان کے تعاقب میں سمندر کی تہہ میں اترے تو سمندر کا پانی واپس آ گیا اور فرعون اور اس کے لشکر غرق ہو گئے۔ اب ذرا بنی اسرائیل کا رویہ دیکھیے کہ خدا ان کے لیے آسمان سے من وسلویٰ نازل کر رہا ہے مگر وہ مسور کی دال اور پیاز مانگ رہے ہیں۔ ان کے لیے حضرت موسیٰؑ ''کتاب وحکمت'' (شریعت) لینے کے لیے کوہِ طور پر چالیس دن اور چالیس راتیں قیام کرتے ہیں اور بنی اسرائیل کی تعلیم کے لیے خدا اپنی انگلی سے پتھر کی لوحوں پر اپنے دس احکام لکھ دیتا ہے۔ مگر جب حضرت موسیٰؑ واپس آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی ناشکر گزار قوم مصریوں کی پیروی میں سامری کے بنائے ہوئے سنہری بچھڑے کو پوج رہی ہے اور اس خواہش کا اظہار کر رہی ہے کہ ہم واپس مصریوں کی غلامی میں چلے جائیں۔ حضرت موسیٰؑ دل برداشتہ ہو کر مقدس لوحوں کو توڑ دیتے ہیں اور قرآن کریم کے مطابق اپنے بھائی ہارونؑ کو ان کی ڈاڑھی اور سر کے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہیں کہ میرے بعد یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے؟ (20:94)۔

(2) حضرت عیسیٰؑ کو آپؑ کے ایک ممتاز حواری (صحابی، شاگرد) یہوداہ (Judas) نے چاندی کے تیس سکوں کے عوض آپؑ کے قاتلوں کے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ ایک اور زبردست ساتھی پطرس (St. Peter) جس نے حضرت عیسیٰؑ سے محبت کا یہ دعویٰ کیا تھا کہ، ''اگر تیرے ساتھ مجھے مرنا بھی پڑے تو بھی تیرا انکار ہرگز نہ کروں گا'' (متی کی انجیل مقدس، 26:35) مگر جب حضرت عیسیٰؑ گرفتار کر لیے گئے تو اس رات پطرس نے تین مختلف موقعوں پر یہ کہا کہ میرا عیسیٰؑ سے کوئی تعلق نہیں۔ جب رومن سپاہیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکایا تو اس وقت آپؑ کے پاس صرف آپؑ کی والدہ محترمہ حضرت مریم، حضرت مریم کی ایک بہن، اور بی بی مریم مگدلینی (Mary Magdalene) جس کے حوالے سے ''پہلا پتھر'' مارنے کا مشہور واقعہ ظہور میں آیا تھا) موجود تھیں اور بارہ حواریوں میں سے صرف ایک نوعمر یوحنا (St. John)

Marfat.com

رہ گئے تھے اور دوسرے سب حواری وہاں سے چل دیے تھے۔

ہم نے اس سوال پر غور کرنا شروع کیا تھا کہ جب پہلی وحی کے بعد تیس پینتیس ماہ تک وحی نہ آئی تو اس پریشان کُن عرصے میں رسولِ خدا عملاً کیا کرتے رہے؟ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ آپ کتاب وحکمت (شریعت) کے نازل ہونے سے پہلے اس عرصے میں اپنے رفقاء کا تزکیہ یا دوسرے لفظوں میں ان کی کردار سازی کرتے رہے۔ لیکن اس عظیم اور اہم کام کے علاوہ آپؐ نے ایک اور نہایت ضروری کام بھی کیا۔

آیئے ذرا پہلی وحی کی عبارت کو غور سے دیکھیں۔ اس وحی کا پہلا لفظ ایک حُکم (صیغہء امر) کی حیثیت رکھتا ہے...... اقراء، پڑھ یا پڑھو! بظاہر اس حکم کی تعمیل کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ آپ پڑھے لکھے (Literate) ہوتے۔ وحی لانے والا فرشتہ (جبرائیل) خدا کا یہ حکم بہ آواز سنا رہا تھا اور آپ بھی آواز ہی کے ساتھ اسے دہرا سکتے تھے اور آپؐ نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ لیکن اس مختصری وحی کا آخری جملہ اس حکم کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: پڑھو کہ تمھارا رب لائقِ تعظیم ہے اور اس نے (انسان کو) قلم کے ذریعے سے علم سکھایا ہے۔ غور فرمایئے کہ پہلی وحی کے نزول کے ہیبت بھرے (Awesome) تجربے کے بعد جب اڑھائی تین سال تک دوسری وحی نہیں آئی تو رسولِ خدا نے اس مختصر وحی کو اپنے دل میں اور اپنی زبان سے کتنی لا تعداد بار دہرایا ہوگا اور اس وحی کے اندر واضح اور غیر واضح احکامات کے ایک ایک پہلو پر کتنا بے شمار غور کیا ہوگا۔ کیا رسولِ خدا کے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس پہلی وحی میں قلم کے ذریعے سے علم سکھانے کا ذکر کر کے خدا چاہتا ہے کہ آپؐ بھی قلم کے ذریعے سے علم حاصل کریں؟ دوسری مرتبہ ''پڑھو'' کا حکم دیتے ہوئے قلم کے ذریعے سے علم سکھانے کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ بے شک آپ آواز سے وحی کو دہرا سکتے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ آپؐ قلم سے بھی علم حاصل کر لیں۔

ایسا کرنا کیوں ضروری تھا؟ قلم کے ذریعے سے علم (Literacy) سیکھ کر آپؐ بہ نفسِ نفیس یہ اطمینان کر سکتے تھے کہ قرآنِ حکیم کو درست طور پر محفوظ کیا جا رہا ہے۔ خدا جانتا تھا کہ قرآنِ کریم سے پہلے نازل ہونے والی وحی کو حتمی طور پر صحیح محفوظ نہیں کیا گیا اور الہامی کتابوں میں بے احتیاطی سے تبدیلی، اور شعوری طور پر تحریف ہو چکی ہے۔ جیسا کہ بعد میں اس نے قرآنِ حکیم میں خود بھی کہا کہ ''ہم ہی نے یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اسے ضرور بالضرور محفوظ رکھیں گے'' تو اس کے لیے خدا نے پہلا کام تو یہ کیا کہ جس ہستی کو نبوت کے لیے چنا وہ روزِ اوّل سے ''امین'' تھی، لوگ اپنی امانتیں اسؐ کے پاس رکھ دیتے تھے۔ اوّل تو اس سلسلے میں بھی تھوڑی بہت لکھت پڑھت درکار تھی کہ کس کی کتنی امانت ہے اور کتنے عرصے کے لیے ہے۔ پھر رسولِ خدا نوجوانی میں اپنے چچا ابو طالبؓ کے ہمراہ تجارتی سامان لے کر دوسرے ملکوں کا سفر بھی کرتے رہے تھے۔ تجارت میں بھی حساب کتاب کے لیے لکھنا پڑھنا سیکھنا ہی پڑتا ہے اور آپؐ تو اس معاملے میں پیسے پیسے کی حد تک دیانت برتنے کی شہرت رکھتے تھے۔ اسی شہرت نے تو عرب کی ایک مالدار بیوہ بی بی خدیجہ کو ترغیب دی کہ وہ اپنے تجارتی قافلے کے سردار کے طور پر آپ کا انتخاب کرے۔ ایک شخص جو سرے سے لکھنا پڑھنا ہی نہ جانتا ہو وہ اتنی بڑی

Marfat.com

ذمہ داری کو کسی صورت بھی اچھے طریقے سے نباہ نہیں سکتا۔ اور جب آپؐ نے سفر سے واپس آ کر بی بی خدیجہ کو حساب کتاب دیا تو وہ اتنی زیادہ متاثر ہوئیں کہ انھوں نے آپ کو شادی کا پیغام بھیج دیا۔

شادی کے وقت آپؐ کی عمر پچیس سال تھی۔ آپؐ پندرہ سال بعد، چالیس سال کی عمر میں نبوت سے سرفراز ہوئے۔ بیچ کے پندرہ سالوں میں آپ کو پورا موقع ملا ہوگا کہ آپ لکھنے پڑھنے کی اہلیت کو مزید بڑھا لیں۔ حضرت علیؓ کے بارے میں تمام تاریخ دان متفق ہیں کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور ان کی تصنیف ''نہج البلاغہ'' جس کی دینی اور تاریخی اہمیت کے علاوہ ادبی حیثیت بھی مستند ہے اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ابو طالبؓ کے فرزند حضرت علیؓ نے رسولِ خدا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔ کیا انھیں لکھنے پڑھنے کی ترغیب دینے میں رسولِ خدا کا کوئی ہاتھ نہ تھا اور کیا آپؐ نے حضرت علیؓ کو تو لکھنے پڑھنے پر راغب کیا تھا لیکن خود اس طرف کوئی توجہ نہ فرمائی تھی؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپؐ ایک کام کو فریضہ قرار دے کر اپنے چچا زاد کو تو اسے اپنانے کا مشورہ دیں اور خود اس کام سے گریز یا پرہیز کریں۔

جب آپؐ پر پہلی وحی آئی اور اس میں پڑھنے کے حکم کے ساتھ قلم سے علم حاصل کرنے کا خصوصی ذکر آیا تو رسولِ خدا نے اپنی پڑھنے لکھنے کی اہلیت میں لازماً مزید اضافہ کیا ہوگا۔ لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا آپؐ کے لیے اس لیے ضروری تھا کہ آپؐ پورا پورا اطمینان حاصل کر سکیں کہ قرآنِ حکیم حرف بحرف درست لکھا جا رہا ہے۔ آپ کی لکھنے پڑھنے کی اہلیت کا تاریخی ثبوت: جب صلحِ حدیبیہ کا اہم واقعہ پیش آیا تو قریش نے آپ کو ہمراہیوں سمیت مکّے میں داخل ہو کر حج کرنے سے روک دیا۔ اس کے بعد باہم یہ طے پایا کہ آپؐ بعض شرائط کے ساتھ آئندہ سال حج کر سکیں گے چنانچہ ایک معاہدہ لکھا گیا جس کے ایک فریق کے طور آپؐ کا نام یوں لکھا گیا: محمدؐ رسول اللہ۔ جب اس معاہدے پر دستخط کرنے کا موقع آیا تو قریش (اہلِ مکّہ) نے یہ اعتراض کر کے کہ ہم محمد کو اللہ کا رسول نہیں سمجھتے، دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ جیسے کئی پر جوش مسلمانوں نے اس معاہدے کو سرے سے رد کر دینے کا مشورہ دیا۔ لیکن رسولِ خدا نے معاہدے پر لکھے ہوئے یہ الفاظ..... محمدؐ رسول اللہ...... کاٹ کر، ان کی جگہ اپنے دستِ مبارک سے (بقلمِ خود) محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھ دیے۔

ان واضح شہادتوں کی موجودگی میں رسولِ خدا کی بابت یہ کیوں مشہور ہو گیا کہ آپؐ خدانخواستہ لکھنے پڑھنے کی اہلیت سے عاری تھے؟ اس کی دو وجہیں تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ یہودی اور مسیحی علماء یہ اعتراض کرتے تھے کہ آپؐ تورات اور انجیل پڑھ کر، اُن مختلف واقعات کو جو ان الہامی کتابوں میں درج ہیں اپنی طرف سے تھوڑی بہت تبدیلی کر کے سناتے رہتے ہیں۔ مسلمان اس اعتراض کے جواب میں یہ کہنے میں آسانی محسوس کر سکتے تھے کہ آپؐ تو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہیں اس لیے آپؐ وحی کے طور پر صرف وہی کچھ بتاتے ہیں جو آپؐ پر خدا کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود قرآنِ حکیم نے سورہ الاعراف کی دو متصل آیتوں 157 اور 158 میں آپؐ کا ذکر امّی نبی کے طور پر کیا ہے۔ لیکن امّی کا مطلب ان پڑھ ہرگز نہیں۔ یہ لفظ یہودی اور مسیحی علماء اہلِ مکّہ کے لیے حقارت کے طور پر استعمال کرتے تھے کہ ہم پر تو الہامی کتابیں نازل ہوئی ہیں لیکن اہلِ مکّہ اس اعزاز سے محروم ہونے کی بناء پر جاہل اور بے علم ہیں۔ لیکن یہ اعتراض حقیقتاً

Marfat.com

تو اسی وقت بے وزن ہو گیا جب مکّے میں پیدا ہونے والے محمدؐ پر قرآنِ حکیم نازل ہونا شروع ہو گیا۔ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا کہ یہ لوگ دعویٰ کریں کہ آپ پر وحی نہیں آتی بلکہ آپؐ اپنی طرف سے گھڑ کر وہ واقعات سناتے رہتے ہیں جو دراصل تورات اور انجیل میں آئے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے آپ کو اُمّی ایک تو اس لیے کہا کہ آپؐ مکّے میں پیدا ہوئے تھے، یہیں پلے پڑھے تھے، یہیں آپ کو نبوت ملی تھی اور تیرہ سال تک آپؐ یہیں پیغامِ حق سناتے رہے تھے۔ مکّے کو عرب میں اس کی مرکزی حیثیت کے باعث اُمّ القریٰ (قریوں یا قصبوں یا شہروں کی ماں) کہا جاتا تھا اور اس اعتبار سے مکّے کے رہنے والوں کو اُمّی کہا جاتا تھا۔ یہودیوں اور مسیحیوں کو اہلِ کتاب کہا جاتا تھا لیکن وہ اہلِ مکّہ جو یہودی اور مسیحی نہیں تھے قرآنِ حکیم نے ان کا ذکر اُمّیّون کہہ کر کیا ہے (2:78)۔

روحانیت اور تصوف کی قرآنی بنیادوں کی بحث میں رسولِ خدا کے پڑھے لکھے ہونے کا یہ مفصل ذکر بعض قارئین کو غیر ضروری محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ غیر ضروری نہیں ہے۔ آج قرآنِ حکیم کی تعلیم کے اصل مقصد اور مفہوم سے مسلمانوں کی غفلت نے انھیں خدا کی طرف سے بے شمار نعمتیں عطا ہونے کے باوجود، سیاسی، اقتصادی اور سماجی طور پر عموماً اور علمی، اخلاقی اور روحانی طور پر خصوصاً جس ذلت آمیز پستی میں گرا دیا ہے اس کے پیچھے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے دنیا کی پسماندہ ترین قوموں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب تک مسلمان عَلَّمَ بِالْقَلَم کی معنویت کو سمجھ کر اسے اپنا معمول بنائے رہے وہ نہ صرف دنیا کے حاکم رہے بلکہ علمی اعتبار سے اس حد تک ممتاز رہے کہ وہ مغربی دنیا جسے آج اپنی سیاسی، اقتصادی اور علمی قیادت پر ناز ہے اس کی احیائے علوم کی تحریک (Renaissance) نے اُس عظیم علمی خزانے سے فیض حاصل کیا جو مسلمانوں کے عروج کے اس دور کی پیداوار تھا جب یورپ پر جہالت کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے۔ آج یہ صورت حال الٹ ہو گئی ہے اور دنیا کے 57 مسلمان ملک مغربی ممالک کی طرف سے کی جانے والی بڑی سے بڑی ہتک پر چُوں کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ نہ ان کے پاس دنیا کا علم ہے اور نہ دین کا۔ دین کے علم کی یہ حالت ہے کہ ان کی اکثریت قرآنِ حکیم ناظرہ (معنی سمجھے بغیر) بھی نہیں پڑھ سکتی۔ جو معنی کے بغیر الفاظ پڑھ سکتے ہیں ان کی بات چھوڑیے، جن کی اپنی زبان عربی ہے یا جنھوں نے ایک آدھ مرتبہ اپنی زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ بھی پڑھا ہو انھوں نے شاید ہی اس کے مفہوم اور اپنی زندگی کے معاملات میں اس کی اخلاقی اور روحانی اہمیت پر سوچ بچار یا تدبر اور تفکر کیا ہو۔ عوام کو ایک طرف رہنے دیں، ہماری مساجد کے نوے فیصد امام پکی روٹی اور بہت ہُوا تو درسِ نظامی، جو کئی صدی پہلے مرتب ہُوا تھا، سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ نتیجہ؟ جہاں مسلمان کے ہاتھ سے دنیا گئی، وہاں وہ اخلاقی، روحانی بلکہ انسانی قدروں سے بھی بے بہرہ ہو گیا۔

حیرت کی بات ہے کہ ہم مسلمان رسولِ خدا کو تمام تر انسانی خوبیوں کا مجموعہ سمجھنے اور آپ کو انسانِ کامل تسلیم کرنے کے باوجود اس بات پر خواہ مخواہ اصرار کرتے ہیں کہ آپؐ پڑھنے لکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ ذرا سوچیے، انسان کو جن دو باتوں نے فرشتوں سمیت خدا کی تمام مخلوقات سے افضل بنایا ہو، ان میں سے ایک علم ہو اور خدا یہ کہے کہ میں اس

Marfat.com

لیے لائق تعظیم ہوں کہ میں نے انسان کو قلم کے ذریعے سے علم سکھایا ہے اور مسلمان اپنے مُنہ سے رسُولِ خدا کے بارے میں یہ کہیں کہ آپؐ نے قلم سے علم نہیں سیکھا تھا۔ پھر ہم رسُولِ خدا کا یہ قول تو دہرائیں کہ ''علم کا حصول ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت پر فرض ہے'' اور آپؐ کے بارے میں یہ بھی کہیں کہ آپؐ پڑھنے لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ غور فرمایئے، کہیں یہ کہہ کر ہم رسُولِ خدا کے بارے میں یہ بدتمیزانہ گستاخی تو نہیں کر رہے کہ آپ مومن نہیں تھے؟

خدا ''ربّ العالمین'' بھی ہے اور ''ربّ النّاس'' بھی

خدا کے بارے میں فلسفۂ دین یا دینیات میں ازل سے یہ بحث چل رہی ہے کہ کیا وہ ہماری زندگیوں اور زمان ومکاں (Time and Space) سے تشکیل پانے والی ہماری دنیا سے بہت دور، کہیں اوپر، عالم بالا میں رہنے والی کوئی (Transcendental) ہستی ہے یا ہمارے آس پاس اور ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا اور ہماری روزمرہ زندگی میں جلوہ گر (Immanent) ہے۔ اس بحث نے تلاشِ حق میں نکلے ہوئے انسانوں کی مدد کم کی ہے اور انھیں گمراہ زیادہ کیا ہے۔ علمائے دین اور سکہ بند مذاہب (Established Religions) نے خدا کو ہم سے اتنا دور کر دیا کہ مذہبی رہنماؤں اور اداروں (مثلاً مسیحی چرچ) کے وسیلے، واسطے یا ذریعے کے بغیر انسانوں کو اپنی بات خدا تک پہنچانی مشکل ہوگئی۔ چنانچہ ردِ عمل کے طور پر اقبالؔ کو خدا کا یہ فرمان سنانا پڑا:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

خدا کی ماورائیت (Transcendentalism) کے مطابق خدا ہر شے کا مالک و خالق تو ہے لیکن وہ ہماری زمین اور ہم سے بہت دور، عالم بالا میں عرش پر مقیم ہے، ہم اسے کبھی نہیں پا سکتے البتہ اس سے ہدایت (Guidance) ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ علمائے دین کے اس اصرار اور تعلیم ہی کا نتیجہ ہے کہ جب بھی ہم خدا کا ذکر کرتے ہیں تو اُوپر آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ عوام کی زبان میں تو اسے کہا ہی ''اُوپر والا'' جاتا ہے۔ ہمارے کئی مقبول ترین گیتوں میں خدا سے کہا جاتا ہے کہ اے اوپر والے! ذرا نیچے آ کر دیکھ، زمین پر بسنے والی تیری بے بس مخلوق کو کیسے کیسے روگ اور دکھ لاحق ہیں۔

رسُولِ خدا سے پہلے ابراہیمی دین کی تاریخ میں خدا کی ماورائیت کا یہ نظریہ زیادہ تر یہودیوں میں مقبول تھا جنھوں نے شریعت یا خدائی قوانین کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ خدا کا خوف بہت آگے آ گیا اور اس کی محبت بہت پیچھے چلی گئی۔ حضرت عیسیٰؑ نے اگرچہ خود کوئی نیا مذہب تو قائم نہیں کیا تھا چنانچہ آپؑ اپنے آپ کو یہودی سمجھتے اور کہتے تھے (مسیحیت تو ایک طرح سے سینٹ پال سے شروع ہوئی) لیکن آپؑ نے خدا کے خوف کے برعکس اس کی رحیمی اور کریمی کو اس حد تک اُجاگر کیا کہ جس طرح مسلمانوں میں ''اللہ اکبر'' کا مختصر جملہ زبان زدِ عام ہے اسی طرح مسیحیوں میں ''خدا محبت ہے''

(God is Love) کے الفاظ مقبولِ عام ہیں۔ مسیحیت نے یہ عقیدہ پیش کیا کہ حضرت عیسیٰؑ نہ صرف خدا کے بیٹے ہیں بلکہ خدا (باپ) اور روح القدس (Holy Spirit) کے ساتھ ''خدائیت'' (Godhood) کے تیسرے رکن ہیں۔اس عقیدے نے مسیحیت کو یہودیت سے الگ اپنا جداگانہ تشخص دے دیا۔اپنی جگہ یہ انسانوں کے دکھ درد سے بالاعرش پر بیٹھے ہوئے خدا کو زمین پر لانے اور اسے انسانی قالب دینے (Humanize کرنے) کے لیے بڑا مؤثر قدم تھا۔کہاں وہ خدا جو عرش پر فائز ہے، ہمیں پتلیوں کی طرح نچا رہا ہے اور ہمارے دکھ درد سے بے نیاز اپنے آپ میں مگن بیٹھا ہے اور کہاں وہ خدا جو حضرت عیسیٰؑ کی صورت میں اندھوں اور کوڑھیوں کا دستگیر ہے اور انسانوں کے گناہوں کا کفارہ دینے کے لیے اس حالت میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے کہ آپؑ کے عزیز ترین ساتھی آپؑ کو چھوڑ گئے ہیں، کوڑے مار مار کر آپؑ کا مبارک بدن لہولہان کر دیا گیا ہے اور آپؑ کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھ کر آپؑ کا مذاق اڑایا جا رہا ہے کہ یہ ہے یہودیوں کا بادشاہ۔

بہتر تو یہ ہوگا کہ دنیا کے عظیم ترین مصوروں نے آپؑ کی صلیب برداری (Carrying of the Cross) اور تصلیب (Crucifixion) کی جو یادگار تصاویر بنائی ہیں انھیں احترام اور غور سے دیکھا جائے۔اور نہیں تو کم از کم میل گبسن (Mel Gibson) کی بنائی ہوئی فلم (The Passion of Christ) تو ضرور دیکھ لی جائے جس سے یہ اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ انسانوں کی خاطر اتنی زیادہ تکلیف برداشت کرنے والے خدا یا خدا کے بیٹے کے حوالے سے بننے والا مذہب کیوں اتنا مقبول ہُوا کہ آج اسلام، ہندومت اور بدھ مت جیسے بڑے بڑے مذاہب کے مقابلے میں اس کی نفری سب سے زیادہ ہے۔

انسان کو پتلیوں کی طرح نچانے کا تصور دوسرے مذاہب میں بھی مل جائے گا۔ ہندومت میں ایشور کی لیلا (God's Play) اس کی ایک جانی پہچانی مثال ہے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں جو پہلی پنجابی فلم ''چن وے'' بنی تھی اس میں ڈائرکٹر سید شوکت حسین رضوی نے مادام نور جہاں کی آواز میں استاد دامن کا لکھا ہُوا یہ مقبولِ عام گانا فلمبند کیا تھا جس میں خدا سے خطاب کر کے کہا گیا ہے:

چنگا بنایا ای سانوں کھڈونا
آپے بناؤنا تے آپے مٹاؤنا

(اے خدا، تو نے ہمیں خوب کھلونا بنایا ہے، آپ ہی بناتے ہو اور پھر آپ ہی توڑ پھوڑ دیتے ہو)۔

خود یہودیت کے اپنے اندر بھی خدا کی دوری سے تنگ آئے ہوئے اہلِ دل نے کبالا (Kabbala) اور حسیدیت (Hasidism) جیسی روحانی تحریکیں شروع کر دیں اور سکینہ (Schechina) کا دلکش تصور پیش کیا جس کے مطابق خدا کی روح (سکینہ) انسانوں کے درمیان رہتی ہے اور ہر دکھی کے ساتھ دکھ اٹھاتی، ہر پیاسے کے ساتھ پانی کو ترستی، ہر بھوکے کے ساتھ بھوک سے بے دم ہوتی، ہر بے گناہ قیدی کے ساتھ قید کاٹتی، ہر مظلوم کے ساتھ ظلم سہتی اور ہر غمزدہ کے ساتھ آنسو بہاتی ہے۔سکینہ اور ابوسعید خدریؓ کی بیان کردہ رسولِ خداؐ کی حدیثِ قدسی میں گہری مماثلت ہے جس کے

مطابق حشر کے روز خدا انسان سے کہے گا، میں پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہ دیا، میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا نہ دیا، میں ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا نہ دیا اور انسان حیران ہوگا کہ خدا کب اس کے پاس آیا تھا اور خدا وضاحت کرے گا کہ فلاں وقت جس سوالی نے تم سے پانی، کھانا، کپڑا مانگا تھا وہ دراصل میں تھا۔

قرآنِ حکیم نے اپنے مزاج کے مطابق بتایا ہے کہ خدا دور بھی ہے اور نزدیک بھی بلکہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود (Omnipresent) ہے۔ چنانچہ ہم سورہ النور میں یہ جگمگاتی ہوئی آیت دیکھتے ہیں:

اللّٰہُ نُورُ السمٰوٰتِ وَالاَرضِ (خدا آسمانوں اور زمین کا نور ہے، 34:35)۔

اس ارشاد خداوندی سے واضح ہے کہ خدا دور کہیں آسمانوں ہی میں نہیں رہتا، وہ یہاں قریب ہی زمین پر بھی موجود ہے۔ اگر اس سے بھی خدا کی دوری ونزدیکی کا مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تو قرآنِ حکیم کی ایک اور آیت دیکھیے جس میں خدا یہ کہتا ہے کہ میں تو انسان کی شہ رگ (حبل الورید) سے بھی قریب تر ہوں (50:16)۔

لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ ان کے علمائے کرام نے خدا اور انسان کے درمیان قربت کو اُجاگر کرنے کے بجائے دوریاں ہی پیدا کیں۔ انھوں نے یہودیوں کی طرح خدا کے خوف اور اس کے قانون کی پکڑ کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ خدا کہیں بہت دور، سات آسمانوں سے پرے، علمائے کرام کے لیے جنت بسائے اور عوام الناس کے لیے دوزخ دہکائے بیٹھا نظر آنے لگا۔ رسولِ خدا کے معراج کی جو تفاصیل سامنے لائی گئی ہیں، ان کے مطابق بھی خدا اتنی دور بیٹھا ہے کہ اس تک پہنچنے میں جبرائیل جیسے جلیل القدر فرشتے (Archangel) کے بھی پَر جلتے ہیں۔ اس بحث کو چھوڑیے کہ جب خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب تر موجود تھا تو رسولِ خدا کو ملاقات کے لیے اتنی دور کیوں بلایا گیا۔ اس بحث میں بھی نہ پڑیے کہ معراج ایک روحانی تجربہ تھا یا رسولِ خدا جسمانی طور پر ایک رات کے کسی لمحے میں پہلے بیت المقدس اور پھر وہاں سے سات آسمان دور تشریف لے گئے تھے۔ آیئے خدا شناس اور عاشقِ رسولؐ اقبالؔ سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس واقعے یا واردات کو کس نظر سے دیکھتا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردُوں

اقبالؔ نے یہ مسئلہ اس طرح حل کیا کہ اگر خدا انسان تک پہنچ سکتا ہے تو انسان کی بھی اس تک رسائی ہے۔ (یاد رہے کہ رسولِ خدا پہلے بشر اور پھر رسول ہیں: عبدہٗ و رسولہٗ)۔ گویا علمائے کرام کچھ بھی کہیں، خدا اور انسان کے درمیان آنا جانا (Two Way Traffic) ممکن ہے۔ صوفیائے کرام خدا کی دوری کے بجائے اس تک رسائی کے قائل ہیں اور یہ رسائی یا پہنچ تصوف یا صوفی ازم کی ایک اہم ترین بنیاد ہے۔ اسی پہنچ کے حوالے سے نہایت نیک افراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت ''پہنچے ہوئے'' بزرگ ہیں۔

خدا دور ہے یا نزدیک یا پھر دور بھی ہے اور نزدیک بھی، یہ بحث تقاضا کرتی ہے کہ اس پر قرآنِ حکیم کے آغاز اور

Marfat.com

اس کے اختتام کی روشنی میں بھی غور کیا جائے۔ وہ خدا جسے قرآن حکیم کے بارے میں دعویٰ ہے کہ دنیا بھر کے دماغ مل کر بھی اس کی ایک سورت (باب یا Chapter) جیسی سورت بنا کر نہیں لا سکتے (2:9) اس نے اپنی اس بے مثال اور لا جواب کتاب کا آغاز اور انجام بھی معنی و حکمت سے خالی نہ رہنے دیا ہوگا۔ چنانچہ قرآن حکیم کی پہلی سورت ''الحمدُ لِلّٰہِ ربِّ العالمین '' کی مشہور آیت سے شروع ہوتی ہے جس میں خدا نے اپنا تعارف ''رب العالمین'' (سب جہانوں کا رب) کی حیثیت سے کرایا ہے۔ لیکن یہی رب العالمین قرآن حکیم کی آخری سورت میں اپنے آپ کو ''رب الناس'' (عوام الناس کا رب) کا نام دیتا ہے بلکہ اس سورت اور قرآن حکیم کا آخری لفظ بھی ''الناس'' ہی ہے۔

رب العالمین کے طور پر خدا نہ صرف ایک ہماری کائنات بلکہ تمام موجود اور ممکن کائناتوں کا ربّ (پالنہار اور نگہدار) ہے۔ ہماری کائنات (Universe) کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے ہماری اپنی کہکشاں (Milky Way) کی مثال کافی ہوگی۔ ہمارا نظامِ شمسی اس کہکشاں کے ایک سرے پر ایک مختصر سا گوشہ ہے۔ اس کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے ان گنت ستارے ہیں۔ اس سورج کے گرد گھومنے والے سیاروں میں سے ایک چھوٹا سا سیارہ ہماری یہ دنیا (ارض یا زمین) ہے۔ یہ زمین سورج کے گرد ایک چکر لگانے میں پورا ایک سال لگاتی ہے لیکن نظام شمسی کا آخری سیارہ پلوٹو (Pluto) سورج کے گرد اپنا چکر مکمل کرنے میں ہمارے وقت کے مطابق 248 سال اور چھ مہینے لگاتا ہے۔ ہم (اہلِ زمین) سورج سے نو کروڑ اٹھائیس لاکھ اور ساٹھ ہزار میل دور ہیں جبکہ پلوٹو اس سے تین ارب اور ساٹھ کروڑ میل کے فاصلے پر ہے جو ہمارے مقابلے میں تقریباً ایک سو گنا زیادہ فاصلہ ہے۔ یہ محض ایک کہکشاں کے ہزاروں میں سے ایک شمسی نظام کی وسعت کا حال ہے اور اب تو پلوٹو کے چاند بھی دریافت ہو گئے ہیں جنھوں نے ہمارے نظام شمسی کی وسعت میں بے تحاشا اضافہ کر دیا ہے۔ ذرا سوچیے کہ رب العالمین کی خدائی جو لاتعداد کہکشاؤں پر مشتمل کائناتوں تک پھیلی ہوئی ہے اس کی وسعت کیا ہوگی؟ یاد رہے کہ آئن شٹائن کے نظریۂ اضافیت کے بعد یہ بھی دریافت ہو گیا ہے کہ کائنات میں لحظہ بہ لحظہ نئی وسعتوں اور جہتوں (Dimensions) کا اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اقبالؔ نے بھی یہ کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے ''کن فیکون''

اس سارے کارخانۂ قدرت کو چلانے والے خدا کے بارے میں اگر یہ سمجھ لیا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اسے اپنی اتنی بڑی خدائی میں، صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرے، یا بحرِ اوقیانوس میں پانی کے ایک قطرے کے برابر زمین، اور اُس کے پانچوں حصے (خشکی) پر آباد انسانوں پر توجہ دینے کے لیے اور پھر ان اربوں انسانوں میں سے ہر ایک انسان کی ضروریات، امیدوں، دعاؤں اور تکلیفوں کا احساس کرنے کے لیے کہاں وقت ملتا ہوگا۔ لیکن ایسا سوچنا اس خدا کی توہین کرنے کے مترادف ہے جسے ایک عام مسلمان تقریباً ہر کام کا آغاز کرتے ہوئے بسم اللہ پڑھنے کے دوران بروقت

رحمت کرنے والے ''الرحمان'' اور ہمیشہ رحم کرنے والے ''الرحیم'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور جو اپنے آپ کو سب کی سننے والا ''السمیع'' اور سب کو رزق دینے والا ''الرزاق'' کہتا ہے اور اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اول تو وہ کسی بندہ بشر کو بھولتا ہی نہیں لیکن جو اسے یاد کرتا ہے اسے تو وہ ضرور ہی یاد کرتا ہے (فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ، 2:152)۔

ایسے مہربان خدا کو انسانوں سے اور انسانوں کو ایسے مہربان خدا سے دور کرنے والوں نے دنیا کو دکھوں، نا آسودگیوں، محرومیوں اور ناچاریوں سے بھر دیا ہے۔ بے شک خدا تمام تر قوت کا مالک ہے اور نافرمانوں کو بڑی سے بڑی سزا دے سکتا ہے لیکن وہ اول و آخر محبت ہی محبت ہے اور اس کی رحمت ہر شے پر چھائی ہوئی ہے (7:156)۔ اس نے آدم اور آدم کی اولاد کے لیے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا ہے اور تلقین کی ہے کہ میری رحمت سے مایوس کبھی نہ ہونا کہ میں تمام گناہ بخشنے والا بخشنہار ہوں (39:53)۔

خدا کی یہ تلقین اس کے رب العالمین ہونے کے ساتھ ساتھ ربّ الناس ہونے کا ثبوت اور یاد دہانی ہے اور یہ تلقین روحانیت کی ایک عظیم الشان قرآنی بنیاد ہے۔

خدا ''ظاہر'' بھی ہے اور ''باطن'' بھی

خدا کے رنگ میں رنگے جانے کے حوالے سے ہم خدا کے خوبصورت ناموں (اسمائے حسنٰی) کی اہمیت جان چکے ہیں۔ ان ناموں سے ہمیں خدا کی صفات کا پتا چلتا ہے اور ہم اندازہ کر چکے ہیں کہ خدا کے رنگ میں رنگے جانے کے لیے ہمیں اپنے اندر خدا کی یہ صفات پیدا کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔

روحانیت کی قرآنی بنیادوں کا سراغ پانے کے لیے یہاں خدا کی دو خصوصی صفات (یا دو اسمائے حسنٰی) کا ذکر ضروری ہے۔ قرآنِ حکیم کے مطابق خدا جہاں اور بہت کچھ ہے وہاں ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ خدا کا ظاہر اس کی بنائی اور سجائی ہوئی یہ کائنات ہے جس میں ہم بھی جسمانی طور پر موجود ہیں۔ خدا کا باطن ہر شے کی اور خود ہماری اصل حقیقت، اہمیت اور معنویت ہے۔ چھوٹی سی مثال کے طور پر فرض کریں کہ آپ کے ہاتھ میں قرآنِ حکیم کا ایک دیدہ زیب نسخہ ہے۔ عربی متن کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ آپ یہ نسخہ اپنے ایک انگریز دوست کو پیش کرتے ہیں جو نہ تو عربی جانتا ہے اور نہ اردو۔ وہ اس نسخے کی ظاہری خوبصورتی تو دیکھ رہا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس میں کہا کیا گیا ہے۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو عربی جانتے ہیں اور جنھیں قرآنِ حکیم کے انگریزی، اردو، یا کسی بھی اور زبان میں ترجمے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی قرآنِ حکیم کو پوری طرح سمجھنے کے لیے تفسیروں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ ابنِ کثیرؒ سے لے کر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور علامہ محمد اسدؒ تک عربی، اردو اور انگریزی میں قرآنِ حکیم کی بیسیوں تفسیریں کیوں لکھی گئیں؟ صرف اس لیے کہ جو ظاہر ہے وہ سب کچھ نہیں ہے۔

خدا نے انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں، سننے کے لیے کان، سونگھنے کے لیے ناک، ذائقے کے لیے زبان اور

Marfat.com

چھونے کے لیے ہاتھ دیے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ انسان کے یہ پانچ حواس (حواسِ خمسہ) اسے بار ہا دھوکا دے جاتے ہیں۔ ہم اکثر کہتے ہیں، ''میں کانوں سنی نہیں، آنکھوں دیکھی کہتا ہوں''۔ گویا کانوں سنی غلط ہوسکتی ہے، آنکھوں دیکھی غلط نہیں ہوسکتی۔ لیکن آنکھوں دیکھی بھی ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ ہم صحرا میں چمکتی ہوئی ریت کو بہتا ہوا دریا سمجھ لیتے ہیں، ریل کی متوازی پٹریاں ہمیں دور افق پر آپس میں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہاتھی کو چھو کر دیکھنے والے اندھوں نے اس کے بارے میں کیا رائے دی تھی، وہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ جو لوگ ظاہر میں کچھ، اور باطن میں کچھ اور ہوتے ہیں، قرآن انھیں منافق قرار دے کر بتاتا ہے کہ وہ کافروں سے بھی بدتر ہیں۔ شاعروں نے منافقوں کے مقابلے میں کوے کی تعریف کی ہے کیونکہ ''اس کا باہر بھیتر ایک'' ہوتا ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو ظاہر اور باطن کہہ کر ہمیں بتایا ہے کہ وہ ان دوغلے انسانوں کی طرح نہیں جو کہتے کچھ اور کرتے کچھ اور ہیں بلکہ وہ وہی کہتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔

خدا نے قرآنِ حکیم کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے کہا تھا:

''عنقریب ہم قرآن کو خدا کا کلام تسلیم نہ کرنے والوں کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفوس (انفس) میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے'' (41:53)۔

آفاق کا مطلب ہے ظاہر۔ انفس کا مطلب ہے باطن۔ آفاق (Horizons, Outer Space) سے مراد ہے انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا، بلکہ کہکشاؤں، شمسی نظاموں، ستاروں اور سیاروں سے مزین یہ ساری کائنات۔ انفس (Self, Soul, Inner Space) سے مراد ہے چیزوں اور واقعات کی ظاہری شکل وصورت سے آگے، پیچھے، نیچے، اوپر چھپی ہوئی حقیقتیں اور خود انسان کے دل میں موجزن جذبے اور کیفیتیں۔ آفاق میں خدا کی نشانیاں تلاش کرنے والوں کو ہم فلکیات، جغرافیہ، ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات اور قانون جیسے علوم کے ماہروں اور طالب علموں یا سائنس دانوں اور علمائے کرام کا نام دیتے ہیں۔ انفس میں خدا کی نشانیاں تلاش کرنے والوں کو ہم نفسیات دان، بزرگانِ دین یا صوفیائے کرام (Mystics) کا نام دیتے ہیں۔ اقبالؔ کی زبان میں انفس کی خبر رکھنے والے انسانوں کو ''دانائے راز'' کہا گیا تھا:

دگر دانائے راز آید نہ آید

اقبالؔ حواس اور عقل وخرد کی پہنچ کو بہت محدود اور ناکافی قرار دیتا تھا اور ان کے برعکس عشق کی برتری کا قائل تھا جس کا مطلب ہے اندرونی لگن اور سچی اور گہری محبت۔ وہ ظاہر اور باطن کے معنی میں آفاق وانفس کے علاوہ ایک اور جہت (Dimension) اور ایک اور پہلو (Aspect) کا اضافہ کرتے ہوئے ظاہر کو ''تن کی دنیا'' اور باطن کو ''من کی دنیا'' کا عنوان دیتا ہے اور ان کا تقابل کرتے ہوئے کہتا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی، جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سُود و سودا، مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا اب صرف صوفیائے کرام کے لیے مخصوص نہیں رہی۔ گذشتہ ایک صدی سے نفسیات دانوں نے بھی انسان کے دل اور اُس کی روح میں جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ فرائیڈ نے اگر چہ جنسی جذبے کو انسانی رویوں کے تعین میں ذرا زیادہ ہی مرکزی جگہ دے رکھی ہے لیکن اُس نے انسانی خوابوں کی تعبیر کا جو راستہ دکھایا تھا وہ اس کا انتہائی قابلِ قدر کارنامہ تھا اور اُسے اس کے ہم عصر اور ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر نفسیات دان کارل ژنگ (Carl Jung) نے بہت اعلیٰ انداز سے آگے بڑھایا ہے۔ اگر اسماء کو صرف نام (Nouns) ہی نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے معنی کو علامات (Symbols) تک پھیلایا جائے تو ژنگ اور اس کے چیدہ چیدہ شاگردوں اور خوشہ چینوں (مثلاً جوزف کیمبل) نے ان کی اہمیت اور معنویت کو بڑی وضاحت اور خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ روح کی دیکھ بھال (Care) اور اس کی شفا (Cure) کے لیے خواب اس لیے بھی اہم ہیں کیونکہ انسان اپنے اندر کے ہیجانوں، تضادوں، خوفوں، نا امیدیوں، اداسیوں، نا آسودگیوں، افسردگیوں اور رنجیدگیوں کے بارے میں بیداری کی حالت میں بے تکلف بات کرنے سے اکثر گریز کرتا ہے لیکن اس کے خوابوں میں وہ سب کچھ بلا روک ٹوک سامنے آجاتا ہے جس نے اس کی روح کو بیمار کر رکھا اور اس کی زندگی میں زہر بھر دیا ہوتا ہے۔

خدا کے رنگ میں رسُولِ خدا سے بڑھ کر کوئی کیا رنگا ہُوا ہوگا۔ اگر خدا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو رسُولِ خدا کی یہ دونوں حیثیتیں بھی جانی پہچانی ہیں۔ ظاہر کے طور پر آپ ایک ریاست کے بانی اور اس کے پہلے حکمران تھے، اس ریاست کے منصفِ اعلیٰ (چیف جسٹس) تھے، جنگوں میں سپہ سالار تھے اور اس کے علاوہ خاوند اور باپ کے طور پر ایک بھرپور اور مثالی عائلی زندگی گزار رہے تھے۔ ان تمام فرائض اور منصبوں سے بڑھ کر آپؐ پر نبوت کی گراں قدر اور گراں بار ذمہ داری تھی۔ لیکن باطن کے طور پر تاریخ آپ کو غارِ حرا میں بیٹھے بھی دیکھ رہی ہے جہاں آپ کئی کئی روز مراقبہ (Meditation) کرتے رہتے تھے۔ اسی طرح قرآنِ حکیم شاہد ہے کہ المزّمل اور المدثر کے طور پر آپ رات رات بھر جاگ کر خدا کے حضور میں کھڑے رہتے تھے۔ دن بھر کی سخت اور اہم مصروفیات کے بعد جب انسان تھک کر سو جانا چاہتا ہے، رسُولِ خدا چادر اوڑھ لپیٹ کر، ساری دنیا سے کٹ کر، اپنی روح کو روحِ خداوندی کے حضور میں یوں پیش کر دیتے تھے کہ خالق و مخلوق میں حائل سارے پردے چاک ہو جاتے تھے۔ برصغیر کے مسلمان عوام رسُولِ خدا کی اس کیفیت کو "کملی والے" کے محبت بھرے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اقبالؒ جیسا جید عالم اور عاشقِ رسولؐ بھی آپؐ کو یاد کرتا ہے تو کہتا ہے:

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا

Marfat.com

دنیا بھر کے مسلمان آپ کی ظاہری اور باطنی یا دُنیوی اور روحانی حیثیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کو سرکار دو عالمؐ تسلیم کرتے ہیں۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دین مکمل ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنی ظاہری یا دُنیوی زندگی کے علاوہ اپنی باطنی یا روحانی زندگی میں خدا کے سامنے جھکے ہوں۔ ہماری سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کو دین کا جو حصہ سنوارتا اور نکھارتا ہے اُسے شریعت کہا جاتا ہے۔ شریعت خدا کے قانون سے تشکیل پاتی ہے۔ ہماری ذاتی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو دین کا جو حصہ سنوارتا اور نکھارتا ہے اسے طریقت کہا جاتا ہے۔ طریقت خدا سے محبت کی بنا پر تشکیل پاتی ہے۔ رسُولِؐ خدا کی ذات میں ہمیں شریعت اور طریقت کا حسین ترین امتزاج اور توازن ملتا ہے۔ اگر ایک طرف آپؐ دنیوی معاملات میں ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں تو دوسری طرف آپؐ ہی ہمارے لیے روحانیت کا سب سے اعلیٰ اور مستند ترین سرچشمہ ہیں۔ اہلِ طریقت آپ کو مدینۃ العلم (شہرِ علم) اور حضرت علیؓ کو اس شہر کا دروازہ قرار دیتے ہیں۔ ذرا رُک کر حضرت علیؓ کے مرتبہ و مقام پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جہاں ہر مسلمان سپاہی جنگ میں اور ہر مسلمان پہلوان اکھاڑے میں کودتے ہوئے ''یا علی'' یا ''یا علی مدد'' کا نعرہ لگاتا ہے وہاں حضرت علیؓ ہی اکثر و بیشتر روحانی سلسلوں کے مطابق رسُولِؐ خدا تک رسائی کی آخری کڑی گردانے جاتے ہیں۔ رسُولِؐ خدا کی طرح حضرت علیؓ کی ذات میں بھی ظاہری اور باطنی کمال جمع ہو گیا ہے۔

مسلمانوں کی بدقسمتی تھی کہ شریعت اور طریقت کو انسانی زندگی میں جمع کرنے کے بجائے دو ایسے شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا جن میں دوستی اور قربت کے برعکس دشمنی اور دُوری پیدا ہو گئی۔ جنھوں نے شریعت پر زور دیا وہ علمائے کرام ٹھہرے۔ جنھوں نے طریقت پر زور دیا وہ صوفیائے کرام کہلائے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بھی اسلام کو کسی نے اپنے عہد کے لوگوں کے لیے بامعنی بنایا اس نے شریعت اور طریقت کو باہم بے تعلق شعبوں (Watertight Compartments) کے بجائے ایک دوسرے کا رفیق قرار دیا۔ چنانچہ رسُولِؐ خدا اور خلفائے راشدہ کے دور کے بعد یہ شرف کسی کو حاصل ہُوا تو وہ (ابو حامد ابن محمد) غزالیؒ یا (مولانا جلال الدین) رومیؒ تھے۔ پھر جب ''نرگس ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رو چکی'' تو برصغیر میں اقبالؒ نام کا ایک دیدہ وَر پیدا ہُوا تھا۔ غزالی، ''رومیؒ اور اقبالؒ، تینوں نے شریعت اور طریقت کو جمع کر کے اسلام کی حیاتِ نو کا اہتمام کیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے کہ دینی تاریخ میں حضرت موسیٰؑ اور آپ کے پیروکاروں (بنی اسرائیل یا یہودیوں) نے شریعت یا قانون پر خصوصی زور دیا اور پھر حضرت عیسیٰؑ اور آپؑ کے پیروکار مسیحیوں نے (ہمارے مسیحی اہلِ وطن عیسائی کے بجائے مسیحی کہلوانا پسند کرتے ہیں) طریقت یا محبت پر خصوصی توجہ دی۔ دینی تاریخ میں حضرت موسیٰؑ کو خدا کے جلال اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کے جمال کا مظہر گردانا جاتا رہا ہے۔ رسُولِؐ خدا اس لیے بھی سرکارِ دو عالم کہلاتے ہیں کہ آپ کی ذات میں خدا کا جلال و جمال باہم شیر و شکر ہو گئے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آپؐ کے

Marfat.com

پیروکاروں کا بھی یہی رنگ ہوتا لیکن آج ''ظاہرو باطن کی خلافت کے سزاوار'' مسلمانوں میں نہ خدا کے جلال کا رنگ ہے نہ اس کے جمال کا۔ ''وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا'' اور ''کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا''۔

شریعت سے بالا طریقت

آیئے اب اپنے دلِ ناشاد کو قرآنِ حکیم کی ایک ایسی زبردست اور معنی خیز حکایت سے گونا تسلی دیں جو روحانیت کی اہمیت اور معنویت کے ساتھ ساتھ شریعت اور طریقت کے باہمی تعلق اور حفظِ مراتب کو واضح تر کرتی ہے۔ یہ حکایت قرآنِ حکیم کی اٹھارویں سورہ ''الکہف'' میں (60ویں سے 82ویں آیات تک) بیان ہوئی ہے۔ تمام بنیادی اجزاء کو برقرار رکھتے ہوئے، چند وضاحتوں کے اضافے سے، یہ حکایت کچھ یوں چلتی ہے:

حضرت موسیٰؑ نے خدا سے کہا، اس کی کیا وجہ ہے کہ تیری دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان میں سے کچھ کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے لیکن کچھ کی نہیں آتی اور وہ راز ہی بنے رہتے ہیں؟ خدا نے آپؑ سے کہا، ایسا کرو کہ جہاں دو دریا (مصر میں دریائے نیل کے دو دھارے، نیل اَبیض یا سفید نیل اور نیل ارزق یا نیلا نیل) آپس میں ملیں وہاں سے آگے چلتے چلے جاؤ یہاں تک کہ تمھیں ہمارا ایک خاص بندہ مل جائے۔ تم اُس کے شریکِ سفر بن جانا اور دیکھتے رہنا کہ وہ کیا کرتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا، یا خدا! دریا تو بہت لمبا ہے، مجھے کوئی نشانی عطا کر دے جس سے مجھے پتا چل جائے کہ تیرا وہ بندہ مجھے کہاں ملے گا؟ خدا نے کہا، جہاں تمھاری مچھلی اُچھل کر دریا میں گر جائے، بس وہیں وہ بندہ تمھیں مل جائے گا۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنا ایک خادم ہمراہ لیا اور خدا کی ہدایت کے مطابق ایک مچھلی بھی ساتھ رکھ لی۔ جب آپؑ دریاؤں کے سنگھم پر پہنچے تو مچھلی پر نگاہ رکھنا بھول گئے اور مچھلی ان کی بے دھیانی میں ان کے تھیلے سے نکل کر دریا میں یوں جا گھسی جیسے تھیلے میں کوئی سُرنگ بنی ہوئی تھی۔ جب چلتے چلتے دُور نکل گئے اور تھک کر چُور ہو گئے تو حضرت موسیٰؑ نے خادم سے کہا، تھیلے سے مچھلی نکالو، بہت بھوک لگی ہے، کچھ کھا پی لیں۔ خادم نے دیکھا کہ تھیلا تو صحیح سلامت ہے لیکن مچھلی غائب ہے۔ اس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا، جناب میں مسلسل تھیلے اور مچھلی کا خیال رکھ رہا تھا لیکن دیکھیے، کیسی عجیب بات ہوئی ہے کہ جب ہم پیچھے ایک چٹان کے قریب رُک کر تھوڑا استا رہے تھے تو شیطان نے مجھے غافل کر دیا اور راستے میں مچھلی نکل کر دریا میں گھس گئی اور میں آپ کو بھی اس واقعے سے آگاہ نہ کر سکا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا، اوہو، یہی تو وہ نشانی تھی جس سے ہمیں اُس بندۂ خدا کا پتا چلنا تھا جس کی تلاش میں ہم یہاں آئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے نقشِ قدم پر واپس اسی جگہ پہنچے جہاں مچھلی غائب ہوئی تھی اور وہاں انھیں وہ مردِ خدا مل گیا جسے خدا نے اپنی خصوصی رحمت سے براہِ راست باطنی علم عطا فرمایا تھا اور جسے احادیث رسولؐ اور اسلامی روایات کے مطابق خواجہ خضرؑ کا نام دیا جاتا ہے۔ روایات کے مطابق خضر علیہ السلام پانی میں رہتے ہیں، سمندروں کے سبز رنگ کے باعث انھیں جو علامتی نام دیا گیا ہے اس کا لغوی مطلب ''سبز'' ہے۔ خدا کے اس باطنی پیغمبر کا کام بھولے بھٹکے مسافروں کو راہ بتانا اور تلاشِ حق میں نکلے ہوئے طالبوں،

Marfat.com

سالکوں اور درویشوں کو خدا کا راستہ دکھاتا ہے۔

جب موسیٰؑ نے انھیں پہچان لیا تو خضرؑ سے کہا، "کیا میں آپ کے پیچھے پیچھے (آپ کا اتباع کرتے ہوئے) آ سکتا ہوں تا کہ آپ کو جو اعلیٰ تر علم (رُشد) عطا ہُوا ہے آپ ازراہِ کرم مجھے بھی وہ سکھا دیں"۔ خضرؑ نے کہا، "بخوشی میرے شریکِ سفر بن جایئے لیکن راستے میں جو کچھ آپؑ مجھے کرتا ہُوا دیکھیں گے آپؑ اُسے برداشت نہ کر سکیں گے۔ ویسے بھی جس چیز کا آپ کو علم ہی نہیں دیا گیا آپ اُسے کیونکر قبول کر سکتے ہیں"؟ موسیٰؑ نے کہا، "ان شاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ میں نہ صرف صبر و تحمل سے کام لوں گا بلکہ کسی طرح بھی آپ کی حکم عدولی نہ کروں گا"۔ اس پر خضرؑ نے یہ شرط رکھ دی کہ "اگر آپؑ میرے پیچھے آئیں گے تو جب تک میں خود اپنے اعمال کی وضاحت نہ کروں آپ کسی بات کی بابت سوال یا اعتراض نہیں کریں گے۔ اور اگر آپ باز نہ آئے تو ہماری راہیں الگ ہو جائیں گی"۔

چنانچہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیے۔ سفر کے ایک مرحلے پر وہ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کنارے پر پہنچ کر خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ موسیٰؑ رہ نہ سکے اور کہہ اُٹھے، "یہ تو آپ نے بہت بُرا کیا، کیا آپ اس میں سفر کرنے والوں کو ڈبونا چاہتے ہیں؟" خضرؑ نے موسیٰؑ کو یاد دلایا کہ میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ میری رفاقت کی تاب نہ لا سکیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اپنا راستہ لیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔

موسیٰؑ نے پشیمان ہو کر کہا، "آپ ناراض نہ ہوں، مجھ سے بھول ہو گئی، مجھے اپنے ساتھ چلنے دیں البتہ میرے ساتھ ہاتھ ذرا نرم رکھیں۔ میں بھی آپ کے معاملات میں دخل نہ دوں گا"۔

پھر وہ دونوں آگے چلے۔ یہاں تک کہ انھیں ایک لڑکا ملا جسے خضرؑ نے دیکھتے ہی قتل کر دیا۔ موسیٰؑ نے تڑپ کر کہا، "آپ نے ایک بے گناہ کی جان لے لی حالانکہ اُس نے کسی کا خون نہ کیا تھا۔ یہ تو آپ نے بہت ہی بُرا کیا"۔ خضرؑ نے کہا، "آپ نے پھر وعدہ خلافی کی ہے۔ میں نے آپ سے کہا تو تھا کہ آپ میرا ساتھ نہ دے سکیں گے، بے صبر ہو جائیں گے، بے چین ہو جائیں گے۔ بہتر ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں"۔ موسیٰؑ نے کہا، "بس اس ایک مرتبہ اور مجھے معاف کر دیں۔ اس کے بعد اگر میں کسی بات پر اعتراض کروں تو پھر آپ مجھے اپنے سے الگ کر دینے میں حق بجانب ہوں گے"۔

چلتے چلتے وہ ایک قصبے میں پہنچے اور وہاں آباد لوگوں سے کھانے کے لیے کچھ مانگا لیکن اُن سخت دل لوگوں نے انھیں پیٹ کی آگ بجھانے کو کچھ بھی نہ دیا۔ اُس قصبے میں انھوں نے ایک مکان کی دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی۔ خضرؑ نے موسیٰؑ کی مدد سے گارا بنا کر وہ دیوار دوبارہ استوار کر دی۔ موسیٰؑ نے کہا، "اس قصبے کے لوگوں نے ہماری درخواست پر پیٹ بھرنے کو دو سوکھی روٹیاں بھی نہیں دیں اور آپ نے ان کی یہ دیوار مفت میں مرمت کر دی ہے، یہ لوگ اس کے مستحق نہ تھے، آپ کو ان سے اس کام کی اُجرت لینی چاہیے تھی"۔ اس پر خضرؑ نے کہا، "بہت ہو چکا۔ یہاں میرا اور آپ کا ساتھ ختم ہُوا۔ البتہ اب میں آپ کو ان تینوں واقعات کی حقیقت بتاتا ہوں جن کی وجہ سے بے صبر ہو کر آپ حسبِ وعدہ خاموش نہ رہ سکے۔

Marfat.com

''کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت غریب اور مسکین کنبے کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ تھی۔ میں نے اُس میں سوراخ ڈال کر ڈبو دیا۔ اُس علاقے کا حکمران جنگی تیاری کے لیے لوگوں کی ذاتی کشتیاں زبردستی چھین رہا تھا۔ جب اُس کے کارندے اِس علاقے کی کشتیاں ضبط کرنے آئیں گے تو یہ ڈوبی ہوئی کشتی انھیں نظر نہ آئے گی اور آ بھی گئی تو پیندے میں سوراخ کے باعث وہ اسے بے کار سمجھ کر چھوڑ دیں گے۔ چند روز بعد گدلا پانی شفاف ہو جائے گا اور کشتی نظر آنے لگ جائے گی۔ کشتی کے مالک غریب لوگ اس کی مرمت کر لیں گے اور یوں اپنے ذریعۂ معاش سے محروم نہیں ہوں گے۔

''جس لڑکے کو میں نے قتل کر دیا اُس کے ماں باپ خدا کے ایماندار اور اطاعت گزار بندے ہیں۔ جس انداز سے وہ لڑکا پَر پُرزے نکال رہا تھا اس سے اہلِ نظر پر واضح تھا کہ وہ اپنی سرکشی اور بد چلنی کے باعث اپنے ماں باپ کی جان عذاب میں ڈال دے گا۔ اس لیے یہ طے پایا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار کر خدا اس کی جگہ انھیں ایک ایسا لڑکا (نعم البدل) عطا کر دے جو نیک، خوش اخلاق اور رحم دل ہو۔

''اِس قصبے میں ہم نے جو دیوار مرمت کی ہے وہ اُس گھر کی ہے جو دو یتیم بچوں کی وراثت ہے۔ ان دونوں کا باپ بہت نیک اطوار تھا اور اس نے مرنے سے پہلے اس دیوار میں ایک خزانہ دفن کر دیا تھا تا کہ جب یہ بچے جوان ہوں تو ان کے کام آئے۔ آپ نے بستی والوں کی سفاکی تو دیکھ ہی لی ہے کہ ہمیں کسی نے دو نوالے بھی نہیں دیے۔ یہ دیوار اس حد تک گر چکی تھی کہ خطرہ تھا کہ اس میں مدفون خزانہ بستی والوں کے ہاتھ لگ جاتا۔ ہم نے دیوار کی مرمت کر دی ہے تا کہ جب تک اس خزانے کے حقدار جوان ہوں یہ ان سفاک لوگوں کی پہنچ سے بچا رہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے آپ کے ربّ کی رحمت کی بناء پر کیا ہے۔ لیجیے میں نے تینوں واقعات کی تہہ میں پوشیدہ مشیتِ خداوندی واضح کر دی ہے جس سے لاعلم ہونے کے باعث آپ بے صبر اور بے چین ہو کر اعتراض کرنے لگ جاتے تھے۔ اب آپ اپنی راہ پکڑیں اور مجھے اپنی راہ پر چلنے دیں۔ خدا حافظ!''

قرآنِ حکیم کی اس حکایت سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ (1) اگر دین کا ظاہری حصہ ''شریعت'' اہم ہے تو اس کا باطنی یا روحانی حصہ ''طریقت'' بھی بے حد اہم ہے۔ (2) دین کی روح کے نمائندے خضرؑ کے سامنے، دین کے ظاہر کے نمائندے موسیٰؑ کی حیثیت ایک شاگرد کی سی ہے۔

بہتر ہو گا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں جو کچھ پڑھا ہے، اس کا ایک خلاصہ بیان کر دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے جو چیدہ چیدہ نتائج سمجھ میں آتے ہیں انھیں بھی لفظی جامہ پہنا دیا جائے:

(1) انسان اس لیے اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک ہے کہ اُسے خدا کی طرف سے یہ اہلیت دی گئی ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر بات کی تہہ تک پہنچ کر اُس کا نام یا عنوان مقرر کر سکے۔ اس کے علاوہ خدا نے جہاں انسان کو دیکھنے، سننے، چکھنے،

Marfat.com

چھونے اور سونگھنے کے لیے حواس دیے، محسوس کرنے کے لیے دل دیا اور سوچنے کے لیے دماغ دیا وہاں اُسے تمام تر مخلوقات سے اس طرح ممتاز کر دیا کہ پہلے تو اسے بہترین تناسب وتوازن سے بنا سنوار کر پیدا کیا اور پھر اُس میں اپنی روح پھونک دی۔ گویا انسان کا شرف اور امتیاز صرف یہ نہیں کہ وہ چیزوں کی حقیقت جان کر انھیں اپنی اور اپنے پیاروں کی بھلائی کے لیے استعمال کر سکتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر خدا کی روح موجود ہے۔

(2) انسان کے اندر خدا کی روح موجود ہونے کے باعث اسے نہایت زبردست تکریم حاصل ہے یہاں تک کہ کسی ایک انسان کو ناحق قتل کر دینے کا مطلب ہے کہ گویا ساری انسانیت کو قتل کر ڈالا گیا اور کسی ایک انسان کی جان بچالی گئی تو گویا ساری انسانیت کو بچا لیا گیا۔

(3) انسان کے لیے ممکن ہے کہ اس کے اندر خدائی صفات پیدا ہو جائیں۔ یہ صفات خدا کے خوبصورت ناموں (اسمائے حسنیٰ) کی صورت میں قرآنِ حکیم میں واضح کر دی گئی ہیں۔

(4) خدا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ ظاہر سے مراد ہے، آفاق یا ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات اور اس میں کارفرما اصول اور قوتیں۔ باطن سے مراد ہے، انفس یا ہمارے نفس، دل اور روح میں مچلنے والے جذبات، واہمے اور حقیقتیں۔ ظاہر کو سنوارنے کے لیے خدا نے ہمیں حواس اور دماغ دیا ہے۔ باطن کو سنوارنے کے لیے خدا نے ہمیں دل اور رُوح عطا کی ہے۔

(5) ظاہری یا دُنیوی زندگی کے لیے دِین ہمیں شریعت یا قانون دیتا ہے۔ باطنی یا روحانی زندگی کے لیے دین ہمارا تزکیہ یا کردار سازی کرتا ہے۔

(6) شریعت کو دل سے قبول کرنے اور شریعت کے ظاہری پہلو پر عمل کرنے کے بجائے اس کے اصل مقصد کو پیشِ نظر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دل کو خیر قبول کرنے کے لیے آمادہ کیا جائے۔ گویا شریعت سے پہلے تزکیہ ضروری ہے۔ اگر دل کو بدلے بغیر شریعت کسی پر مسلط یا نافذ کی جائے گی تو قرآنِ حکیم کے اس بنیادی اصول کی سراسر نفی ہو جائے گی کہ دین میں ہرگز کوئی جبر نہیں (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ، 2:256)۔

(7) قرآن میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ اتنی تفصیل سے بیان کر کے خدا نے ہمیں بتایا ہے کہ شریعت کے حامل پیغمبر (موسیٰؑ) باطنی علم کے حامل پیغمبر (خضرؑ) کو کچھ سکھا نہیں رہے بلکہ اُن سے نہایت ادب کے ساتھ کچھ سیکھ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ رسُولِ خدا کی ذات میں دین کے ظاہری اور باطنی پہلو کو اور خدا کے جلال و جمال کو ایک خوبصورت ترین سیرت کی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں خدا بار بار یہ حکم دیتا ہے کہ دین کو پورے کا پورا قبول کیا جائے گویا دین کے ظاہری اور باطنی، دونوں پہلوؤں کو قبول کرنا اور اپنانا لازم ہے۔ اس سلسلے میں رسُولِ خدا سے بہتر کوئی مثال نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے آپؐ کی سیرت کو خدا نے قرآنِ حکیم کی شکل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ حکیم، جس کی حفاظت

Marfat.com

کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے، رسولؑ خدا کی بہترین سوانح عمری ہے۔

اس تمام بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ روحانیت کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا اور ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسی روحانی قدروں پر صدقِ دل سے عمل کے بغیر اسلامی معاشرہ پیدا نہیں ہوتا۔ روحانیت اور روحانی قدروں کے بغیر ہم ایک ایسا ہی بے جان اور بے روح معاشرہ بنا سکیں گے جیسا کہ ہم نے آج بنا رکھا ہے۔

Marfat.com

دوسرا باب

شریعت اور طریقت

مسلمانوں کے تمام فرقوں کا کسی ایک بات پر اتفاق ہے تو وہ یہ ہے کہ خدا ہر شے کا خالق و مالک ہے اور قرآن حکیم اُس کی کتاب ہے جو محمد رسول اللہؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہوئی اور جس کے بیانات اور احکام سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس اتفاق رائے کی برکت سے مسلمانوں کے درمیان فکر و عمل کا اتحاد پیدا ہو جاتا لیکن انھوں نے قرآنِ حکیم کے بارے میں مثبت کے بجائے منفی رویہ اپنا لیا۔ اقبالؔ نے اس منفی رویے کو یہ الفاظ دیئے تھے:
''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں''۔

انسانیت کی خوش قسمتی سے خدا نے قرآنِ حکیم کی حفاظت کا ذمہ خود لے رکھا ہے اس لیے اس کے متن میں تو زیر زبر کا فرق نہیں آیا البتہ غرض مندوں نے اس کے مفہوم کو اپنی اغراض کے تحت ضرور بدلنے کی جسارت کی ہے۔ اس رویئے نے یہ دن دکھایا ہے کہ ایک ارب اور بیس کروڑ مسلمانوں نے سیاسی سطح پر کسی مثبت اقدام کے لیے کبھی مل کر آواز نہیں اٹھائی۔ کشمیر ہو، فلسطین ہو، بوسنیا ہو یا چیچنیا، دنیا کے 57 مسلمان ملکوں کی حکومتوں نے خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے اور تفرقے سے بچنے (3:103) کے بجائے ہر اہم مسئلے پر نا اتفاقی، انتشار، بلکہ بے حسی کے سوا کسی اور کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔

مذہبی سطح پر مسلمانوں کے علماء اور صوفیاء نے اس عدم اتحاد میں یوں اضافہ کیا کہ قرآنِ حکیم سے یہ جاننے کے لیے کہ کسی مسئلے یا صورتِ حال میں خدا ہم سے کیا چاہتا ہے، دونوں گروہوں نے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے قرآنِ حکیم سے اپنے مطلب کی آیات ڈھونڈ لیں اور یوں خدا کی کتاب جو ہر شک و شبہہ سے پاک ہے، مسلمان عوام کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کا ذریعہ بنا دی گئی۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے سُنّیوں، وہابیوں اور شیعوں کا الگ الگ خدا اور الگ الگ قرآن ہے۔ جس طرح خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والی قومیں خدا ہی کے نام پر خدا کے بندوں کا قتل، بلکہ قتلِ عام کرتی رہی ہیں اور آج بھی کر رہی ہیں اسی طرح قرآنِ حکیم کے حوالے سے شریعت پرستوں اور طریقت پسندوں کے درمیان کھینچا تانی ہونے لگی جو آہستہ آہستہ ایک اچھی خاصی جنگ بن گئی۔ چنانچہ جہاں ہمارے علماء نے قرآنِ حکیم ہی کی بنیاد پر شریعت، قانون، ریاست، امورِ مملکت، جزا اور سزا، جنت و جہنم اور عبادات...... نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، کلمہ پر خود راستانہ (Self Righteous) انداز سے زور دیا وہاں صوفیاء نے قرآنِ حکیم ہی کی بنیاد پر طریقت، تزکیۂ نفس یا دل کی صفائی، خدا پر کامل ایمان، ''تمام تر نیک و بد خلقِ خدا'' سے بے غرضانہ محبت، انسانی تعلقات میں محبت، ہمدردی، برداشت اور عفو و درگزر (معافی) اور معاملات میں خیر، صداقت اور امن کی تلقین کی۔

Marfat.com

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، خدا نے قرآنِ حکیم میں حکم دیا تھا کہ دین قبول کرو تو پورے کا پورا قبول کرو۔ (ادخلوا فی السلم کافۃ، 2:208) درست رویہ یہی تھا کہ ہر مسلمان اسلام کی شریعت اور طریقت، دونوں کو یکساں قبول کرتا۔ شریعت اسلام کا مکان ہے۔ طریقت اس مکان کو گھر میں تبدیل کرتی ہے۔ مکان اینٹ گارے، سیمنٹ سریے سے بن جاتا ہے۔ گھر اپنے مکینوں اور ان کی باہمی محبت، ہمدردی، ایثار اور اتفاق کے بغیر نہیں بنتا۔ شریعت دین کا جسم ہے۔ طریقتِ دین کی روح ہے۔ جسم روح کا ٹھکانا ہے۔ جسم نہ ہو تو روح کا ہماری دُنیا میں کیا کام؟ اُسے یہاں سے پرواز کر جانا پڑتا ہے۔ روح پرواز کر جائے تو جسم جسدِ خاکی بن کر رہ جاتا ہے جسے جتنی جلدی دفنا دیا جائے بہتر ہے ورنہ وہ گلنے سڑنے لگ جاتا ہے اور اس کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ ہماری زندگی کے لیے جسم و روح، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یہی مقام دین کی زندگی میں شریعت اور طریقت کا ہے۔ طریقت دین کے مقاصد کی محافظ ہے، شریعت ان مقاصد کے حصول کے قواعد و ضوابط کا نام ہے۔ طریقت تلاشِ حق میں نکلا ہُوا عشق ہے، شریعت اس عشق کی باگ ڈور ہے۔

جب تک رسُولِ خدا زندہ رہے اور جب تک آپ کی تربیت یافتہ قیادت برسرِ اقتدار رہی قرآنِ حکیم کی تعلیم اور تلقین کے عین مطابق شریعت اور طریقت ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ چھوٹی موٹی کمی بیشی سے خلفائے راشدہ......ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے کردار میں دین کے یہ دونوں پہلو شیر و شکر ہو گئے تھے۔ لیکن جب پانچویں خلیفہ، امیر معاویہ نے حکومت سنبھالی تو شریعت اور طریقت میں فاصلہ پیدا ہو گیا۔ جب امیر معاویہ نے خلافت کو ملوکیت یا بادشاہت میں بدل دیا تو یہ فاصلہ تیزی سے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ علماء جو عموماً حکمرانِ وقت اور حکمران طبقے سے قریب، بلکہ اس میں شامل ہوتے تھے اور صوفیاء جو خدا اور خلقِ خدا سے قریب تر تھے، ایک دوسرے کے دشمن نہیں تو حریف و رقیب ضرور بن گئے۔ بیچ بیچ میں یہ فاصلہ اس حد تک بھی بڑھ جاتا رہا کہ علماء کے اصرار پر حلاجؒ اور سرمدؒ جیسے صوفیوں کو جو عشقِ الٰہی میں فنا ہو چکے تھے بدعت (Heresy) کے نام پر بے دردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ البتہ ایسا بھی ہُوا کہ غزالیؒ اور رومیؒ جیسی عظیم ہستیوں میں شریعت اور طریقت دوبارہ شیر و شکر ہو گئیں۔

رومی کو صوفیوں کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔ ذرا اس کے اپنے نام اور اس کی مثنوی کے نام پر غور فرمائیے۔ مصنف کا نام ہے: مولانا جلال الدین رُومیؒ، تصنیف کا نام ہے: مثنوی مولوی معنوی۔ گویا رومیؒ ایسا صوفی ہے جو ساتھ ہی مولانا مولوی بھی ہے اور ''مثنوی'' جو تصوف کی مشہور اور مستند ترین شاعرانہ تفسیر ہے اِس مولانا مولوی سے منسوب ہے۔ مولویت اور تصوف، جن میں آگ اور پانی کا بیر ہے وہ رومی کی ذات میں اس طرح گھل مل گئے کہ رومیؒ کے حوالے سے رُشد و ہدایت کا جو دبستان قائم ہُوا وہ ''مولوی سلسلۂ تصوف'' (Maulavi Order of Islamic Mysticism) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ علماء کو صوفیاء پر موسیقی یا سماع کے حوالے سے اعتراض رہا ہے لیکن رومیؒ جو علماء کی طرح مولانا کہلاتا ہے اس کے یہاں موسیقی ہی نہیں رقص بھی روا ہے۔ چنانچہ مولوی سلسلۂ تصوف سے وابستہ ''مولوی حضرات'' تو موسیقی کی ایک مخصوص تال پر رقص بھی کرتے ہیں جنھیں دنیا محوِ رقص درویشوں (Whirling Darvishes) کے نام سے

Marfat.com

پکارتی ہے۔اس سلسلۂ تصوف میں رقص کا یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ (بلکہ ایٹم ایٹم) محوِ رقص ہے، سیارے ہوں یا ستارے، چاند ہوں یا سورج، جھرمٹ ہوں یا کہکشائیں سب اپنے اپنے مدار میں اپنے اپنے محور کے گرد محوِ رقص ہیں۔انسان کا محور خدا ہے جو اس کے دل میں موجود ہے۔پھر وہ اپنے محور کے گرد کیوں رقص نہ کرے۔

یہاں ایک وضاحت کرنی مناسب ہوگی۔خدا کے پیغمبروں کے ذریعے سے خدائے واحد کی طرف سے آنے والے تمام الہامی مذاہب بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔لیکن زمانے کی گرد و گردش اور مذہب کے ٹھانے داروں نے ان کی شریعتوں کے درمیان بڑی مضبوط اور بلند دیواریں کھڑی کردی ہیں۔اس کے باوجود صوفیوں کی بدولت ان دیواروں میں ایسی کھڑکیاں آج بھی کھلی ہیں جن سے یہ مذاہب اوپر اوپر سے تو بہت مختلف نظر آتے ہیں لیکن اندر ہی اندر ان میں بہت سی مشترک باتیں مل جاتی ہیں۔مسلمانوں کی مسجدوں، مسیحیوں کے گرجاؤں، یہودیوں کے سناگوگوں، ہندوؤں کے مندروں، سکھوں کے گوردواروں اور پارسیوں کے آتشکدوں کے طرزِ تعمیر میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔یہی فرق ان مذاہب کی شریعتوں اور فقہوں (Jurisprudences) میں بھی پایا جاتا ہے۔لیکن دنیا بھر کے مذاہب، خصوصاً ابراہیمی سلسلے کے تین اہم مذاہب......اسلام، مسیحیت اور یہودیت کی طریقت (Mysticism) میں بڑی حد تک مماثلت آج بھی موجود ہے۔ تہذیبوں کے تصادم (The Clash of Civilizations) جیسے نظریات نے مذاہب کے درمیان جو دُوری پیدا کردی ہے وہ ہمیشہ اتنی شدید نہیں تھی۔اسلام کا رویہ مسیحیت اور یہودیت کے بارے میں خصوصاً بہت مصالحانہ چلا آتا ہے۔ قرآنِ حکیم مسیحیوں اور یہودیوں کو ''اہلِ کتاب'' کے نام سے یاد کرتا ہے اور اسلام مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان شادی کرنے، ان کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عبادت گاہوں میں عبادت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

جب عراق اور خصوصاً شام فتح ہوئے تو مسلمان فاتحین مسیحی مفتوحین کے گرجاؤں میں تقریباً پچاس سال تک نماز ادا کرتے رہے۔اسی طرح جب 1453ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) فتح کیا تو وہاں بھی مساجد نہیں تھیں۔چنانچہ ایا صوفیہ کے مشہور گرجے کے ایک حصے میں مسلمان نماز پڑھتے تھے اور بقیہ حصے مسیحیوں کے لیے کھلے رکھے گئے تھے۔آج بھی استنبول جائیں تو آوے صوفیہ کا ''مسلمان حصہ'' بطور عجائب گاہ اسی طرح قائم و دائم ہے۔مسلمانوں کو ایا صوفیہ کا طرزِ تعمیر اتنا پسند آیا کہ باوجودیکہ انھوں نے اپنے لیے مسجد سلیمانیہ بنالی تھی، پھر بھی انھوں نے مشہور نیلی مسجد ہو بہو (واقعی ہو بہو) اسی کے نقشے پر بنالی۔آج بھی ایا صوفیہ اور نیلی مسجد کی جڑواں عمارتیں پہلو بہ پہلو یوں کھڑی نظر آتی ہیں کہ دُور سے یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ گرجا کونسا اور مسجد کونسی ہے۔

رسولِ خدا کی وفات سے کوئی سو، ڈیڑھ سو سال بعد آٹھویں صدی عیسوی میں دمشق (شام) اور بغداد (عراق) کے آس پاس آباد کچھ عبادت گزار خداترس منکسر المزاج مسلمانوں کو ''صوفی'' کہہ کر پکارا جانے لگا۔انھیں یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ وہ مسیحی راہبوں (تارکینِ دُنیا) کی طرح ''کھردری اُون'' سے بُنا ہُوا لباس پہنتے تھے جو صوف کہلاتا تھا۔یہ لوگ اسلام کے ظاہر یا عبادات یا شریعت کے مقابلے میں اس کے باطن یا روحانیت یا طریقت پر زیادہ زور دیتے تھے۔

Marfat.com

آپ اس کتاب کے پہلے باب: ''روحانیت اور تصوف کی قرآنی بنیادیں'' میں دیکھ چکے ہیں کہ روحانیت اور تصوف اسلام کی روح اور اس کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور بعض علماء کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ روحانیت اور تصوف غیر اسلامی ہیں۔ البتہ یہ ضرور تسلیم کرنا چاہیے کہ بعض صوفیوں نے قرآنِ حکیم کی تعلیم اور رسُولِ خدا کی سیرت کے بعض پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور دیا جو خود قرآنِ حکیم اور رسُولِ خدا نے نہیں دیا تھا۔ مگر یہ بھی افسوس ناک حقیقت ہے کہ علماء کی اکثریت نے خدا اور انسان کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلے پیدا کر دیے تھے۔ انھوں نے خدا کے اپنے ارشاد کے باوجود کہ وہ انسان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہے خدا کی انسان سے قربت (Immanence) کو یکسر نظر انداز کیا چنانچہ ان کا خدا ہم سے دور، بہت دور، کہیں عرش پر ایک طرف علماء کے چہیتوں کے لیے جنت بسائے اور دوسری طرف علماء کے ناپسندیدہ لوگوں کے لیے دوزخ دہکائے، اپنے بندوں کے دکھوں، دردوں، خوشیوں، امیدوں، حسرتوں، محرومیوں اور مایوسیوں سے بے نیاز بیٹھا نظر آتا ہے۔

یہ خدا کوئی بہت ہی بڑا کاریگر (Mechanic) معلوم ہوتا ہے جس نے ہماری کائنات کو ایک بندھے ٹکے نظام (Mechanical System) سے رواں دواں کر دیا ہے اور یہ نظام کسی بہت بڑے کارخانے کی طرح طے شدہ رفتار سے از خود (Automatically) چل رہا ہے۔ البتہ جس طرح اچھی بھلی بلکہ قیمتی سے قیمتی گھڑی میں بھی کبھی کبھار کوئی نقص پڑ جاتا ہے اور گھڑی ساز اس کی مرمت کر دیتا ہے اسی طرح اوّل تو خدا کے کارخانے میں کوئی نقص پڑتا ہی نہیں اور اگر پڑ ہی جائے تو خدا خصوصی توجہ دے کر اسے درست کر دیتا ہے اور کارخانہ قدرت پھر سے ایک اچھی گھڑی کی طرح چل پڑتا ہے۔

صوفیوں نے اس بڑے کاریگر یا ماہر گھڑی ساز کو آسمانوں سے اتار کر نیچے زمین پر انسانوں کے درمیان لا کھڑا کیا اور خدا کے وجود کو گھڑی کی ٹک ٹک کے بجائے دل کی دھڑکن کے ذریعے محسوس کرنا شروع کر دیا۔ جس طرح علماء نے خدا کی قربت کو نظر انداز کیا تھا، اُسی طرح صوفیاء نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ خدا خلقِ خدا سے بہت دور، انسانوں سے ماوراء اور بے نیاز (Transcendent) بیٹھا ہے۔

''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود''

روحانیت کے سلسلے میں خدا کی قربت اور اس کی دوری کی یہ بحث اس لیے ضروری ہے کہ صدیوں سے ہمارے علماء اور صوفیاء دو اصطلاحوں کے ہیر پھیر میں الجھے ہوئے ہیں۔ خدا چونکہ ہر جگہ موجود ہے اس لیے وہ دُور بھی ہے اور قریب بھی۔ علماء اسے ہر شے پر محیط لیکن کہیں دور، بہت اوپر، عرش بریں پر مقیم سمجھتے ہیں۔ وہ غلط نہیں کہتے۔ ان کے برعکس صوفیاء اُسے آسمانوں ہی میں نہیں، زمین پر یہیں انسانوں کے درمیان بلکہ رُوح کے حوالے سے ہر انسان کے اندر موجود سمجھتے ہیں۔ وہ بھی غلط نہیں کہتے۔ علماء کہتے ہیں کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے اور اپنی مخلوق سے الگ وجود رکھتا ہے۔ ان کا یہ نظریہ ''وحدت الشہود'' کہلاتا ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں، بے شک خدا ہمارا خالق ہے لیکن روحانی طور پر خدا اور ہم میں کوئی دُوری

Marfat.com

نہیں کیونکہ ہمارے اندر اسی کی رُوح موجود ہے۔ روح کے حوالے سے ہمارے اور اس کے وجود میں وحدت ہے۔ ان کے اس نظریے کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ ان کی کیفیت کو ہمارے عہد کے غزل خواں، ناصر کاظمی نے یہ الفاظ دیے تھے:

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سُن

اسلام جو ایک مکمل دین ہے (الیوم اکملت لکم دینکم ...... آج کے دن ہم (خدا) نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، 5:3) خدا یا حقیقت مطلق (Absolute Reality) کی شہودی اور وجودی، دونوں حیثیتوں کو تسلیم کرتا ہے۔ امکانات کے اعتبار سے خدا نے انسان کو بھی ایک مکمل مخلوق بنایا ہے اور اس کی تکمیل کی خاطر اُسے دو عظیم نعمتیں عطا کی ہیں۔ (1) خدا نے اُسے تمام چیزوں کی حقیقت کا علم سکھا کر یا دوسرے لفظوں میں افق تا افق ظاہر میں پھیلی ہوئی کائنات میں خدا کی نشانیاں دکھا کر بتایا کہ خدا ہی اس ساری کائنات کا نور ہے اور انسان اپنی عقل اور اپنے شعور سے اس کا بخوبی مشاہدہ کر سکتا اور ان کے برحق ہونے کی شہادت دے سکتا ہے۔ یہ کائنات اور ہم انسان ایک وحدت ہیں لیکن خدا اس وحدت کا خالق ہے۔ وہ اس میں موجود تو ہے لیکن اُس کا وجود اس وحدت سے بالا بھی ہے۔ جو ذات کسی چیز کو بناتی ہے، خواہ وہ چیز کائنات ہی کیوں نہ ہو، وہ اس چیز سے بڑی ہوتی ہے۔ اس شعور کو وحدت الشہود کہتے ہیں۔

جس خدا نے انسان کو چیزوں کی حقیقت کا علم سکھایا ہے اور اسے کائنات میں خدا کی نشانیاں دیکھنے اور ان کے برحق ہونے کی شہادت دینے کا شعور عطا کیا ہے اُسی خدا نے انسان کے اندر اپنی روح بھی پھونک رکھی ہے۔ جب انسان اس روح کو اپنے وجود میں جلوہ گر دیکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا سے اور خدا کو اپنے آپ سے جدا محسوس نہیں کرتا۔ اس احساس کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ رسُولِ خدا کی ذات علم الاسماء کے حوالے سے وحدت الشہود اور اپنے اندر خدا کی روح موجزن ہونے کے لحاظ سے وحدت الوجود، دونوں کی مظہر ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا علم اُسے وحدت الشہود کا شعور دیتا ہے اور اس کی روح اسے وحدت الوجود کا احساس دلاتی ہے۔ یا پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آفاق میں خدا کی نشانیاں تلاش کرنے سے وحدت الشہود کا تصور صحیح دکھائی دیتا ہے اور انفس میں خدا کی نشانیاں ڈھونڈنے سے وحدت الوجود کا نظریہ قرین حقیقت محسوس ہوتا ہے۔

انسان اپنے شعور سے آفاق یا افلاک پر نظر ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کائنات بڑے نظم و ضبط کے ساتھ چل رہی ہے، سورج اپنے وقت پر نکلتا اور ڈوبتا ہے، چاند اپنے حساب سے بڑھتا اور گھٹتا ہے۔ اسی طرح موسم بھی شروع ہوتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں۔ سورہ یٰسین میں خدا کہتا ہے:

> ہماری ایک اور نشانی رات ہے۔ ہم (زمین کے اوپر سے) دن کو ہٹا دیتے ہیں تو انسانوں پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ زبردست علم رکھنے والے خدا کا باندھا ہُوا حساب (نظام) ہے۔ اور ہم نے چاند کے لیے بھی منزلیں مقرر

Marfat.com

کردی ہیں یہاں تک کہ وہ یہ منزلیں طے کرتا کرتا کھجور کی سوکھی ٹہنی کی طرح باریک ہو جاتا ہے۔
نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن پر حاوی ہو سکتی ہے۔ سب اپنے اپنے مدار (Orbit) میں تیر رہے ہیں (36:37-40)۔

آفاق، افلاک یا کائنات کے اعلیٰ ترین نظام کے حوالے سے پوری کی پوری سورہ الروم ایک جاندار اور شاندار مثال ہے۔ قرآنِ حکیم کی اس مرکزی سورہ کی چیدہ چیدہ آیات ملاحظہ فرمائیں:

شام ہو جائے یا تم صبح کو جاگو تو خدا کی تسبیح (فرمانبرداری کا اقرار) کیا کرو کہ اس وقت سارے آسمان اور ساری زمین بھی خدا کی حمد (تعریف) کر رہے ہوتے ہیں...... جس طرح خدا زندہ کو مردہ کر دیتا ہے اسی طرح وہ مردہ کو زندہ کر دیتا ہے۔ ذرا دیکھو، وہ کیسے مردہ (بنجر) زمین کو نئی زندگی بخش دیتا ہے۔ اے انسانو! جب تم موت کی حالت میں ہو گے تو اسی طرح وہ تمھیں بھی پھر زندہ کر دے گا۔ خدا کی ایک اہم نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور پھر تم لوگ زمین پر پھیل گئے۔ اور خدا کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمھاری جنس ہی سے تمھارے لیے زوجین (میاں اور بیوی، Spouses) پیدا کر دیے تاکہ تم ایک دوسرے سے تسکین پاؤ۔ اور خدا نے تمھارے درمیان محبت اور رحم دلی پیدا کر دی۔ یقیناً یہ خدا کی وہ واضح نشانیاں ہیں جن پر اہلِ فکر کو غور کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کی نشانیوں میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور انسانوں کے درمیان زبانوں اور رنگوں کا فرق بھی دانش مندوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ تمھارا رات کو سونا اور دن میں خدا کا فضل (رزق) تلاش کرنا بھی اس کی زبردست نشانی ہے۔ پھر جب آسمانی بجلی (Lightening) چمکتی ہے تو تم خوفزدہ بھی ہوتے ہو کہ یہ کہیں گر گئی تو تباہی مچا دے گی اور ساتھ ہی تم اس بات پر خوش بھی ہوتے ہو کہ اب شاید بارش برسے گی اور مردہ پڑی ہوئی بنجر زمین پھر زندہ ہو جائے گی (اور تمھاری کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی)۔ خدا کی ایک اور عظیم نشانی یہ ہے کہ اُس کے حکم سے آسمان اور زمین اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ اور جب تم مر جاؤ گے اور خدا تمھیں زمین کے اندر سے پکارے گا تو تم ایک ہی پکار میں یکا یک زمین سے برآمد ہو جاؤ گے۔ آسمانوں میں اور زمین پر جو بھی مخلوق ہے سب کی سب اس کی حکم بردار ہے۔ پہلے بھی خدا ہی نے ہر کسی کو پیدا کیا تھا اور اس کے لیے یہ بات نہایت آسان ہے کہ وہ سب کو دوبارہ پیدا کر دے۔

اور اب قرآنِ حکیم کی وہ آیت ملاحظہ فرمائیں جو اس مرکزی سورت کے دل کی حیثیت رکھتی ہے اور اس اعتبار سے خود قرآنِ حکیم کی روح کہلا سکتی ہے:

بس (اے نبیؐ) اپنا رُخ دینِ حنیف (حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ ہے جنھیں

Marfat.com

قرآنِ حکیم نے اکثر ابراہیم حنیف کہہ کر یاد کیا ہے۔حنیف کا لغوی مطلب ہے "یک سُو" جو سب جھوٹے خداؤں سے کٹ کر ایک سچے خدا کا ہو رہے اور ہر جھوٹ اور برائی کے خلاف سینہ سپر ہو جائے) کی طرف کر لو۔یہ دین اُسی قانونِ فطرت (Natural Law Operative in the Universe) پر قائم ہے جس پر ہم نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور یاد رکھو کہ خدا نے سب کچھ قانونِ فطرت کے مطابق پیدا کیا ہے اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی......(30:30)۔

رسُولِ خدا کی نبوت چونکہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔اس لیے آپؐ کے حوالے سے خدا تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے،"اپنا رُخ اسی قائم و دائم رہنے والے مضبوط و مستحکم دین کی طرف جما دو"(30:42-43)۔

سورہ الروم ہی میں آگے چلتے ہوئے خدا اپنی مزید نشانیوں کا ذکر کرتا ہے:

خدا تمھیں بشارت دینے کے لیے ہوائیں بھیجتا ہے۔یہ ہوائیں تمھیں خدا کی رحمت سے فیضیاب کرتی ہیں اور خدا کے حکم سے چلنے والی انھی ہواؤں کی بدولت بادبانی کشتیاں اور سفینے چلتے ہیں جن کے ذریعے سے تم خدا کا فضل تلاش کرتے ہو اور اُس کے عطا کردہ رزق کے لیے اس کا شکریہ ادا کرتے ہو۔اور یہ خدا ہی ہے جو وہ ہوائیں بھیجتا ہے جو بادل اٹھاتی ہیں اور یہ بھی خدا ہی ہے جو ان بادلوں کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے مختلف علاقوں میں پھیلا دیتا ہے اور پھر تم دیکھتے ہو کہ انھی بادلوں سے بارش برسنے لگتی ہے۔خدا یہ بارش اپنی مرضی سے اپنے بندوں میں سے کچھ لوگوں پر برساتا ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ پہلے وہ مایوس تھے کہ پتا نہیں، بارش ہو گی یا نہیں(30:46-49)۔

کون بدبخت ہو گا جو خدا کی ان نشانیوں پر غور و فکر نہ کرے اور اس نتیجے پر نہ پہنچے کہ "کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے، وہی خدا ہے"۔لیکن خدا کی یہ ساری نشانیاں وہ ہیں جو انسان کے اردگرد، زمین پر اور آسمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور جنھیں ہم اپنے حواس، عقل اور شعور سے اپنے تجربے میں لا سکتے ہیں۔ہم ان نشانیوں پر جتنا بھی غور کریں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کائنات، قدرت یا فطرت کا یہ کارخانہ نہ تو از خود وجود میں آ سکتا تھا اور نہ ہی یہ اپنے آپ چل رہا ہے۔دوسرے لفظوں میں خدا اور کائنات ایک نہیں ہیں، خدا اس کائنات کا خالق ہے اور اس سے الگ وجود رکھتا ہے۔یہ وہ نتیجہ ہے جو "وحدت الشہود" ہی کو تمام تر حقیقت سمجھنے والے درست تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن قرآنِ حکیم حقیقت کے صرف اس پہلو کو تمام تر حقیقت نہیں سمجھتا۔حقیقت صرف حواس، عقل اور شعور کے دائرۂ کار تک محدود نہیں۔حقیقت کے اس حصے کو انسان اپنی اُس صلاحیت کے ذریعے سے جان سکتا ہے جسے خدا نے "آدم کو چیزوں کا نام رکھنے کا علم" عطا کرنے کے حوالے سے بیان کیا تھا۔جب سورہ الحشر کے آخری رکوع میں خدا نے اپنے

Marfat.com

خوبصورت ناموں کا ذکر کیا تو فرمایا کہ خدا جہاں ان حقیقتوں کو جانتا ہے جن کا مشاہدہ ہم شعوری طور پر اپنے حواس سے کرسکتے ہیں وہاں وہ ان حقیقتوں کو بھی جانتا ہے جو حواس اور عقل و شعور سے پوشیدہ ہیں (عالم الغیب والشہادۃ) خدا کے اس اعلان کے پیچھے یہ سچائی کارفرما ہے کہ حقیقت صرف افلاک اور کائنات (آفاق) کے مظاہر ہی تک محدود نہیں بلکہ حقیقت کا ایک پورا جہان خود انسان کے اندر اس کے نفس، دل اور روح (انفس) میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ خدا نے انسان کو بتایا کہ آفاق کے علاوہ انفس میں بھی اس کی نشانیاں موجود ہیں۔ اپنے اندر کے جہان (Inner Space) میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں کو انسان اپنی اس صلاحیت کے ذریعے سے جان سکتا ہے جسے خدا نے ''پھر ہم نے انسان کے اندر اپنی روح پھونک دی'' کے حوالے سے بیان کیا تھا۔ ''وحدت الشہود'' پر اصرار کرنے والے دراصل حقیقت کے اسی دائرے سے غفلت کے باعث ''وحدت الوجود'' کے نظریے کو غلط قرار دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا نے انسان کو صرف آفاق ہی کا علم نہیں دیا جس کے ذریعے سے وہ خدا کو ظاہری کائنات میں جلوہ گر دیکھ سکتا ہے بلکہ اُس نے اسے اپنی روح عطا کر کے یہ صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ باطنی کائنات میں بھی خدا کا دیدار کرسکتا ہے۔

آیئے ایک مرتبہ پھر سورہ الروم سے رہنمائی حاصل کریں۔ اس سورت کی جو آیات آپ دیکھ چکے ہیں ان کے آغاز میں خدا نے ایک اہم بات یہ کی تھی کہ:

> لوگ دُنیا کی زندگی کا صرف ظاہری پہلو دیکھتے ہیں اور اس آخرت سے جو ان کی نظروں سے پوشیدہ ہے غافل ہو جاتے ہیں۔ کیا انھوں نے کبھی اپنے نفسوں (Inner Space) پر غور نہیں کیا؟ خدا نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے ایک جانی پہچانی حقیقت ہی کے طور پر پیدا کیا ہے لیکن یہ سب کچھ صرف ایک مدت تک کے لیے ہے (ہمیشہ کے لیے نہیں ہے) اور یقیناً لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے انکار کرتی رہتی ہے کہ بالآخر ہر کسی کی اپنے رب سے ملاقات ہونے والی ہے (30:7-8)۔

وحدت الوجود کے قائل لوگ صرف یہ کہتے ہیں کہ بے شک ظاہری کائنات کا ذرہ ذرہ خدا کا آئینہ دار ہے، ''جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے'' لیکن انسان کے باطن میں بھی خدا اسی طرح جلوہ گر ہے جیسے باہر اور خدا کی روح کا حامل انسان اپنی روح کے آئینے میں بھی خدا کا دیدار کرسکتا ہے اور اس کے لیے اسے آخرت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بے شک خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ پاؤ گے اور جب انھوں نے اصرار کیا اور خدا نے سامنے کے پہاڑ پر اپنا عکس ڈالا تو وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ لیکن وحدت الوجود کو ماننے والے کہتے ہیں کہ گو موسیٰؑ بے ہوش ہو گئے اور خدا کے اس مختصر سے جلوے کی تاب نہ لا سکے لیکن انھوں نے اس تجلی کی ایک جھلک تو ضرور ہی دیکھی ہوگی، اسے دیکھے بغیر وہ کیسے بے ہوش ہو سکتے تھے۔ اسی طرح جب خدا نے پہلی مرتبہ اپنے نور سے جگمگاتے ہوئے ایک درخت کے اندر سے ان سے بہ آواز خطاب کیا تو ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس درخت میں جلوہ گر خدا کا نور اپنی آنکھوں سے دیکھا

Marfat.com

ہی تو ہوگا اور خدا کی آواز اپنے کانوں سے سنی ہی تو ہوگی۔ پھر سورہ الاعراف کی 155 ویں آیت بتاتی ہے کہ ایک موقع پر حضرت موسیٰؑ اپنی قوم میں سے 70 لوگوں کو لے کر اس جگہ پہنچے جہاں ان کی خدا کے سامنے حاضری طے تھی۔ وہاں انھیں ایک شدید ترین زلزلے نے آلیا۔ یہاں خدا نے تجلی کے بجائے زلزلے کی صورت میں اپنی قوت کی ایک جھلک دکھائی تھی۔

خدا کے خوبصورت ناموں میں ایک نام الحی بھی ہے جس سے جانا پہچانا لفظ ''حیات'' اور جانا پہچانا اسلامی نام ''محی الدین'' (دین کو نئی زندگی دینے والا) بنا ہے۔ اس اعتبار سے خدا نہ صرف زندگی دینے والا بلکہ خود ''زندگی'' بھی ہے اور یہ خدا ایسا ہے جو ہر جگہ موجود (Omnipresent) ہے۔ گویا وہ صرف ظاہر ہی میں نہیں، باطن میں بھی موجود ہے۔ بلکہ کون سی چیز ہے جس میں وہ موجود نہیں۔ کیا وہ اس قلم میں موجود نہیں جس سے یہ سطریں لکھی جارہی ہیں۔ اور اگر وہ اس قلم میں موجود ہے تو کیا اس کا صرف کوئی ایک حصہ اس میں موجود ہے یا وہ اس میں سارے کا سارا موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا ہر جگہ سارے کا سارا موجود ہوتا ہے۔ تو کیا وہ انسان کے دل میں موجود نہیں۔ اگر اُسے ہم ''درخت'' میں دیکھ سکتے اور تسلیم کرسکتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہونے کے لحاظ سے اس قلم میں بھی موجود ہے اور ہمارا شعور اس کی موجودگی سے باخبر ہوسکتا ہے تو کیا ہمارا نفس، ہمارا دل اور ہماری وہ روح جو ہے ہی خدا کی، اس کی موجودگی سے بے خبر ہی رہے گی؟

خدا سے جیتے جی ملاقات اگر کائنات کے چپے چپے پر پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں کے حوالے سے ہوسکتی ہے تو خوابوں میں، دل کی دھڑکنوں میں، وجدان، کشف، چھٹی حس اور بصیرت کے ذریعے کیوں نہیں ہوسکتی؟ یہودیوں کو خدا کی بلند و بالا حیثیت اور اس کے خوف پر اس حد تک اصرار تھا کہ وہ اسے ایک ایسی ہستی قرار دیتے تھے جس کا کوئی نام ہی نہیں۔ وہ کہتے تھے، جب کسی چیز کو نام دے دیا جائے تو وہ ایک طرح سے محدود اور متعین (Defined) ہوجاتی ہے۔ چنانچہ صدیوں تک یہودی خدا کو ''وہ جو بے نام ہے'' کہہ کر پکارتے رہے۔ لیکن اب جس طرح مسلمان خدا کے ننانوے صفاتی اور ایک ذاتی نام (اللہ) کا ذکر کرتے ہیں، یہودی بھی خدا کے ستر صفاتی اور ایک ذاتی نام یہواہ (Jehova) لینے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ خدا کے صفاتی ناموں کی وساطت سے انسان اور خدا کے درمیان فاصلے میں بہت کمی ہوجاتی ہے اور انسان کے لیے ممکن ہوجاتا ہے کہ گو وہ خدا کو جان تو نہیں سکتا لیکن اسے محسوس (Experience) ضرور کرسکتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ہم بحرِ ہند (Indian Ocean) کے کسی ساحل پر کھڑے، جھک کر اس کے پانی کو چھولیں اور کہیں کہ یہ بحرِ ہند ہے۔ گویا ہم اس سمندر کے محض ایک انتہائی مختصر سے حصے کو دیکھ اور چھو کر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بحر ہند کو دیکھا ہے۔ خدا اور انسان کا بھی کچھ یہی رشتہ ہے، خدا ہمارے وجود کے کسی ایک سیل (Cell) کو چھو جائے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم نے خدا کو دیکھا ہے۔ آنکھوں سے نہیں، بصارت سے نہیں، دل میں، بصیرت سے دیکھا ہے۔ کروڑوں، اربوں، کھربوں سال بعد برپا ہونے والے یومِ حشر میں نہیں، خدا کو کائنات میں، دنیا میں، اپنی زندگی میں دیکھنے کا امکان روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے۔ چنانچہ ہمارے اپنے دور کے بڑے شاعر، فیض احمد فیض کہتے ہیں:

Marfat.com

ہر اک اُولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمع سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے
جزا، سزا، سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

بہرحال قرآنِ حکیم خدا کے دیدار کی بات ایک سے زیادہ مرتبہ کرتا ہے۔ سورہ الکہف کی آخری آیت یہ کہتی ہے:

''خدا سے ملاقات کی امید رکھنے والے انسان کو چاہیے کہ نیک عمل کرے اور بندگی میں کسی کو خدا کا حصے دار نہ ٹھہرائے'' (18:110)۔

اسی طرح خدا فرماتا ہے:

''اُس روز خدا کے دیدار کی بناء پر چہرے جگمگا رہے ہوں گے'' (75:22-23)۔

یہی نہیں، قرآنِ حکیم خدا کے اپنے چہرے کی بات بھی کرتا ہے:

''وہ پرہیزگار انسان جہنم کی آگ سے محفوظ رکھا جائے گا جو دل کی صفائی (تزکیہ) کی خاطر اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتا ہے۔ وہ کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا چہرہ دیکھنے (خدا کا دیدار کرنے) کے لیے ایسا کرتا ہے'' (92:18-20)۔

خدا کو ہماری دنیا اور ہماری زندگی سے بلند و بالا (Transcendent) قرار دینے والے، صرف اور صرف وحدت الشہود کے قائل علماء، ابن رشد جیسے عقلیت پسند (Rationalists) اور تاریخ اسلام میں ''معتزلہ'' کے نام سے پہچانے جانے والے فلسفی کہتے ہیں کہ انسان خدا کا دیدار نہیں کرسکتا۔ معتزلہ تو جنت میں بھی خدا کے دیدار کی تردید کرتے ہیں حالانکہ قرآنِ حکیم کی مندرجہ بالا آیات کے علاوہ مستند احادیث کے اعتبار سے رسُولِ خدا کا موقف تھا کہ انسان جنت میں خدا کا دیدار کرسکے گا۔ آپؐ نے یہ وضاحت بھی فرمائی تھی کہ اس دیدار کی کیفیت یہ ہوگی جیسے ہم ماہِ کامل (Full Moon) کو دیکھتے ہیں جو اپنے نور کے بجائے سورج کے نور کو منعکس کررہا ہوتا ہے۔

معتزلہ کا اصرار تھا کہ قرآنِ حکیم کی جن آیات میں خدا کے دیدار یا اس کے چہرے کا ذکر آیا ہے انہیں لفظی یا

Marfat.com

لغوی (Literal) معنی پہنانے کے بجائے ان کی تشریح علامتی طور پر (Symbolically) کرنی چاہیے۔اس کے برعکس معتزلہ کے تصورات سے بغاوت اور توبہ کرنے والے مشہور فلسفی 'الاشعری' جنھیں اسلامی دینیات (کلام) کے بارے میں سند کا مقام حاصل ہے، یہ کہتے تھے کہ" خدا کا دیدار ہی تو وہ سب سے بڑا انعام ہے جس سے اہلِ جنت کو نوازا جائے گا"۔

روحانیت اور وحدت الوجود کے قائل صوفیوں کی سوچ اور رویے (Approach) میں چونکہ اچھی خاصی مماثلت ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے فرق کا اندازہ کرنے کے بعد تھوڑی مزید وضاحت کے ساتھ دیکھ لیں کہ وحدت الوجود ہے کیا۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ روحانیت کا جس ایک صداقت اور حقیقت پر انحصار ہے وہ یہ ہے کہ خدا انسان اور اس کی زندگی سے قریب (Immanent) ہے۔ وحدت الوجود کا تصور بھی اسی قربت کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

وحدت الوجود کے تصور کو ابن عربیؒ نے لفظی جامہ پہنایا تھا۔ اس تصور کے مطابق صرف خدا ہی کی ذات (Self) وجود رکھتی ہے۔اس ذات نے اپنے اظہار یا ظہور کے لیے موجودات، نباتات، انسانوں، اور ہر طرح کی مخلوقات کی صورت اختیار کرلی۔لیکن اس تمام تر کثرت (Diversity) کے پیچھے چھپی ہوئی صرف خدائے واحد کی ذات ہی ہے جو معبود بھی ہے اور اوّل و آخر حقیقت بھی ہے۔ یہ ذات جوں جوں زیادہ سے زیادہ کثرت اختیار کرتی چلی جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ چھپتی چلی جاتی ہے اور اس پر کثرت کے پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔صوفیاء کا یہ تصور حضرت داتا گنج بخشؒ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" کے نام سے بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔"المحجوب" خدا کی وہ ذات ہے جو حجابات (پردوں) میں چھپی ہے اور "کشف" سے مراد ہے کہ ان پردوں کو اتار یا ہٹا کر اس چھپی ہوئی ذات کا انکشاف کردیا جائے تاکہ اس کا دیدار کیا جاسکے۔

انسان کے اندر چونکہ خدا نے اپنی روح پھونک رکھی ہے اس لیے وہ وجود کی تمام تر کثرت کے باوجود، خدا کے اس ارشاد کے مطابق کہ ہم (خدا) انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں، اپنے آپ کو خدا سے جدا نہیں سمجھتا۔لیکن انسان کے اندر "انا" (Ego) بھی موجود ہے جس کے باعث وہ اپنا الگ اور جدا تشخص (Identity) قائم کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو خدا سے بھی الگ اور جدا کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ انا وہی جذبہ یا خصوصیت ہے جس کا مظاہرہ ابلیس نے اپنے جداگانہ تشخص پر اصرار اور تکبر کی صورت میں کیا تھا اور خدا نے اسے مردود قرار دے دیا تھا۔اقبالؔ کے زیادہ تر مفسروں نے انسان کی خودی کو اس کے اندر پھونکی ہوئی روحِ خداوندی سمجھنے کے بجائے اس کی "انا" سمجھ کر بہت بڑی غلطی اور زیادتی کی ہے۔ بے شک اقبالؔ نٹشے (Nietzsche) سے نہ صرف واقف بلکہ متاثر بھی ہے اور اس کے مردِ مومن اور نٹشے کے "سپر مین" (Superman) میں مماثلت ہے لیکن یہ مماثلت صرف ظاہری ہے۔اقبالؔ کی خودی انسان کی روحانی بنیاد کے حوالے سے اُسے اپنے اندر خدائی صلاحیتیں پیدا کرنے اور خدا کے رنگ میں رنگے جانے کی

Marfat.com

دعوت دیتی ہے جب کہ نطشے کے سپرمین (فوق البشر) کا "خدا تو مر چکا ہے"۔ رُوح کے رشتے سے انسان اپنے خالق خدا سے جدا نہیں البتہ انا کے رشتے سے وہ ضرور خدا سے نہ صرف دُور بلکہ جدا ہو جاتا ہے اور روحانی طور پر مر جاتا ہے۔

جب انسان اپنی روح کو نظر انداز کر کے دیر تک اپنی انا کے پیچھے چلتے چلتے خدا سے بہت دُور چلا جاتا ہے تو اس کے اپنے لیے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ خدا تک یا خدا کے قریب جا پہنچے۔ ایسے میں خدا خود مہربانی فرماتا اور وحی کے ذریعے سے انسان کے ساتھ اپنا رشتہ دوبارہ استوار کر لیتا ہے۔ خدا خود تو کسی بھی وقت انسان تک پہنچ سکتا ہے لیکن وحی کے حوالے سے انسان کے لیے بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ خدا تک پہنچ جائے۔ جو وحی نبیوں اور پیغمبروں پر آتی ہے وہ وحی کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ اس وحی کے ذریعے سے خدا نے نبیوں کو اپنی اپنی قوموں کے لیے اور رسُولِ خدا کو ساری انسانیت کے لیے ہدایات دیں۔ یہاں تک کہ رسُولِ خدا پر نبوت تمام کر دی اور قرآنِ حکیم کا حرف حرف ہمیشہ کے لیے محفوظ کر کے اسے رہتی دنیا تک ہدایت کا سرچشمہ (ذکرٌ للعالمین) بنا دیا۔

لیکن قرآن نے ایک اور طرح کی وحی کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا نے شہد کی مکھی پر بھی وحی نازل فرمائی تھی (16:68)۔ پھر وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں سے بھی وحی کے ذریعے خطاب کیا تھا (وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیِّیْنَ، 5:111)۔ خدا نے ایسے افراد پر بھی وحی بھیجی جو نبی نہیں تھے، مثلاً حضرت موسیٰؑ کی والدہ صاحبہ کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انھیں وحی کے ذریعے سے ہدایت دی کہ وہ اپنے نوزائیدہ بچے موسیٰؑ کو ایک صندوق میں ڈال کر دریا کے سپرد کر دیں۔ یہاں خدا اصرار کے ساتھ فرماتا ہے کہ ایسی ہدایت وحی ہی کے ذریعے دی جا سکتی تھی (20:38)۔ قرآنِ حکیم آسمانوں (41:111) اور زمین (99:5) پر بھی وحی نازل کرنے کی بات کرتا ہے۔ پھر ذرا سورہ الحشر کی اس آیت کو دیکھیے جس میں خدا کہتا ہے کہ "اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا تو وہ خدا کے خوف سے کانپ اٹھتا اور پھٹ جاتا" (59:21)۔

سوچیے، اگر خدا آسمانوں، زمین اور پہاڑ کے علاوہ شہد کی مکھی اور حضرت موسیٰؑ کی والدہ صاحبہ (جو خود نبی نہیں تھیں) پر وحی نازل کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تو کیا اس نے قیامت تک کے لیے کسی چیز اور کسی انسان سے خطاب کرنے کی قسم تو نہیں کھالی۔ یقیناً وحی کی وہ صورت جو نبیوں کے ذریعے سے شریعت لانے سے مخصوص ہے رسُولِ خدا پر ختم ہو گئی۔ لیکن کشف، الہام، وجدان اور چھٹی حس (Sixth Sense) کی صورت میں وہ غیر نبی انسانوں سے پہلے بھی خطاب کرتا رہا ہے، آج بھی کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔

اقبالؔ کی زندگی کا ایک واقعہ سنیے۔ لاہور کے ایف سی کالج کے بانی ڈاکٹر یونگ نے، جن کے نام پر نیلا گنبد چوک میں یونگ ہال تعمیر ہُوا تھا، ایک محفل میں گفتگو کی تان اس بیان پر توڑی کہ قرآن خدا کی کتاب نہیں ہو سکتی بلکہ یہ حضرت محمدؐ کی اپنی تصنیف ہے۔ اقبالؔ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ ڈاکٹر یونگ نے اپنی تائید کی امید میں ان سے مخاطب ہو کر پوچھا، کیوں ڈاکٹر اقبال! کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ قرآن حضرت محمدؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہُوا تھا؟ اقبالؔ نے

Marfat.com

یہ خوب صورت جواب دیا، ''ڈاکٹر یونگ! اگر مجھ پر شعر نازل ہو سکتے ہیں تو حضرت محمدؐ پر قرآن کیوں نازل نہیں ہو سکتا تھا''۔

اقبالؔ کے اس جواب میں جہاں قرآنِ حکیم کی حقانیت کا اقرار ہے وہاں یہ دعویٰ بھی موجود ہے کہ خود ان پر بھی الہام کی صورت میں شعر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے مشہور مجموعے کا نام ''بالِ جبریل''، ان کے اس دعوے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اقبالؔ سے بہت پہلے غالبؔ نے بھی کہا تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غالبؔ کو اپنے قلم کی صرصر میں وحی لانے والے فرشتے کی آواز سنائی دیتی تھی اور اس کے پیش کردہ شاعرانہ خیالات اس پر غیب سے نازل ہوتے تھے۔ غالبؔ ہی کا ایک فارسی شعر بھی اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے:

شعرِ غالبؔ نبود وحی و نگویم ولے
تو و یزداں، نتواں گفت کہ الہامے ہست

(غالب کے شعر وحی تو نہیں ہیں اور ہم یہ کہتے بھی نہیں۔ لیکن تجھے خدا کی قسم، کیا یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ الہام ہیں)

ہمارے زمانے میں اِس کیفیت کو اُردو کے قادرُ الکلام اور صاحبِ اسلوب شاعر، ظفر اقبال نے الہامی لہجے میں یہ دِل میں اُتر جانے والے الفاظ دیے ہیں:

یہ بھی درست ہے کہ پیمبر نہیں ہوں میں
ہے یہ بھی سچ کہ میرا کہا ہونے والا ہے

یہ بھی دیکھیے کہ اردو کے ایک معتبر، لیکن بڑی حد تک نظر انداز ہو جانے والے، شاعر حفیظ ہوشیار پوری (حفیظ جالندھری نہیں) نے کس سادگی اور پُرکاری سے، ایک سوال کی صورت میں، کشف والہام کی انسانی صلاحیت کو اجاگر کیا ہے:

دِل سے آتی ہے بات لب پہ حفیظؔ
بات دِل میں کہاں سے آتی ہے؟

صوفیوں، قلندروں اور فقیروں کے حالاتِ زندگی تو کشف والہام اور کرامات سے بھرے پڑے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روحانی سطح پر خدا کی ذات میں اپنی ذات کو فنا کر دینے کے مقام پر ان بزرگوں میں سے چند نے ایسی ایسی بڑ ہانکی ہے جس سے دین کی عمارت میں شگاف پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے دعووں کو ''شطحیات'' کہا جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ جس طرح شاعری میں شاعر اپنی تعریف میں حد سے گزر جاتا ہے اور اسے شاعرانہ تعلّی قرار دے کر نظر اندار کر دیا جاتا ہے اسی طرح تصوف میں خدا سے قربت کی سرشاری و مستی میں صوفی بھی صوفیانہ تعلّی کے مرتکب

Marfat.com

ہو جاتے ہیں جسے فراخ دلی سے معاف کر دینا چاہیے کیونکہ انھیں بنیاد بنا کر انسان کی روحانی صلاحیتوں سے انکار کر دینا مناسب نہ ہوگا۔

آیئے، وحدت الوجود اور کشف والہام کا انکار کرنے والوں کو ایک ایسی ہستی کی مثال دیں جسے وہ رسولؐ خدا کے بعد دین کا ایک اہم ترین ستون سمجھتے ہیں۔ خلیفۂ دوم، حضرت عمرؓ بن خطاب مسجد نبوی میں منبرِ رسولؐ پر کھڑے اہلِ مدینہ سے خطاب کر رہے ہیں۔ اچانک وہ گفتگو کے لہجے کو بدل کر، اور سیاق وسباق سے یکسر ہٹ کر، پوری آواز سے پکار اٹھتے ہیں، ''پہاڑ کی طرف دیکھو، پہاڑ کی طرف دیکھو''۔

حاضرین نے ایک دوسرے کی طرف تعجب سے دیکھا لیکن کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ عمرؓ کیا کہنا چاہتے تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علیؓ نے پوچھا، ''اے عمرؓ! آپ نے پہاڑ کی طرف دیکھنے کا مشورہ کس کو اور کیوں دیا تھا''؟

عمرؓ نے وضاحت کی، ''مجھے الہام ہُوا کہ مشرکین نے ہماری فوج پر غلبہ پا لیا ہے۔ ہماری فوج ایک پہاڑ کے پاس سے گزر رہی تھی۔ اگر وہ اس پہاڑ کی طرف رخ کر لیتی تو اُسے فتح حاصل ہو جاتی ورنہ وہ ہلاک ہو جاتی۔ لہٰذا میری زبان سے بے اختیار وہ کلمات نکل گئے جو آپ سب نے بھی سن لیے''۔

ایک مہینے بعد قاصد فتح کی خوشخبری لے کر آیا تو اس نے بتایا، ''ہم لوگوں نے اسی دن اور اسی گھڑی حضرت عمرؓ کی آواز سنی تھی۔ ہم پہاڑ سے گزر چکے تھے مگر یہ آواز سن کر اس کی طرف چل دیے اور اللہ نے ہمیں فتح دے دی''۔

یہ واقعہ طنطاوی جیسے مستند مؤرخ نے عمرؓ بن خطاب کی سوانح عمری میں درج کیا ہے۔

تیسرا باب

روحانیت اور تصوف کا رشتہ اور فرق

شریعت جینے کا حکم دیتی ہے۔ طریقت جینے کا مقصد اور طریقہ سمجھاتی ہے۔ روحانیت جو اسلام اور تمام خدائی مذاہب کی قدر مشترک ہے، جینا اور مرنا اور مر کر زندۂ جاوید ہو جانے کا راستہ دکھاتی ہے۔ روحانیت کے روشن چراغ ہر دور میں موجود رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت بیج کی سی ہے چنانچہ ایک چراغ سے صد ہزار چراغ جل سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں روحانیت کی ابتدائی نشوونما تصوف کی گود میں ہوئی اس لیے روحانیت اور تصوف کے باہمی رشتے اور ان کے درمیان فرق کی وضاحت بہت مناسب ہے۔ خصوصاً اس سوال کا جواب تلاش کرنا بہت اہم ہے کہ تصوف کے ہوتے ہوئے روحانیت کی الگ پہچان کیوں ضروری ہے؟

اسلام کے اوّلیں دور میں ریاست، شریعت اور طریقت ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ لیکن جب خلافت ملوکیت یا بادشاہت میں بدل گئی تو ریاست اور شریعت میں قربت بڑھ گئی مگر ریاست اور طریقت کا فاصلہ بڑھ گیا۔ اہلِ شریعت یا علمائے کرام چونکہ ریاست سے قریب تر ہو گئے تھے اس لیے شریعت اور طریقت کے درمیان بھی تعلق کمزور پڑتے پڑتے مخالفت اور رقابت میں بدل گیا۔ پھر جب ریاست چھن گئی تو علماء بے یار و مددگار ہو گئے اور شریعت کی حیثیت یہ ہو گئی کہ "رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی"۔ دوسری طرف طریقت یا تصوف خانقاہیت میں بدل گیا اور یوں "عشقِ باشعور" "عشقِ بےشعور" ہو کر رہ گیا۔

بے شک آج بھی تزکیۂ نفس کے اعتبار سے کئی قابلِ قدر صوفیاء موجود ہیں لیکن جس طرح اہلِ شریعت آہستہ آہستہ فتویٰ فروشوں میں بدل گئے ہیں اسی طرح تصوف کے نام پر بھی دُکان داری شروع ہو گئی ہے۔ بڑے بڑے گدی نشین زیادہ تر ایسے ہیں کہ جن کے بزرگوں کو تو خدا دوستی اور عوام دوستی کے حوالے سے واقعی بزرگ کہا جا سکتا تھا لیکن جنھیں خود خدا دوستی اور عوام دوستی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ گدی نشین اپنی اپنی جگہ سیکڑوں اور ہزاروں ایکڑ زمین کے وارث ہیں، جدّی پشتی مرید حسبِ توفیق نقد نذر و نیاز بھی پیش کرتے رہتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر سالانہ عرس کے موقع پر غریب اور مسکین لوگ عموماً اور مزاروں کے ملحقہ زمینوں کے مزارعین خصوصاً چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ حکومت نے زرعی اصلاحات اور اوقاف کا قانون بنا کر ان گدی نشینوں کی اقتصادی طاقت کسی حد تک کم کر دی ہے لیکن جس طرح دوسرے جاگیردار اور بڑے زمیندار "بے نامی" کا حربہ استعمال کر کے اِن قوانین سے بڑی حد تک محفوظ رہنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اسی طرح یہ گدی نشین بھی قانون کی زد سے بچے ہوئے ہیں۔

اس کی دو اہم وجوہات ہیں۔ ایک تو ہماری اسمبلیوں اور حکومتوں میں اب بھی جاگیرداروں، بڑے زمینداروں

Marfat.com

اور گدی نشینوں کو قریب قریب فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے ان لوگوں نے اپنے اپنے حلقۂ انتخاب کے عوام کو سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور تعلیمی اعتبار سے اس حد تک پسماندہ رکھا ہے کہ وہ ابھی تک دوسروں کی محنت پر پلنے والے ان نواب زادوں، صاحب زادوں اور پیرزادوں کے خلاف مؤثر آواز اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

جہاں تک اُن برگزیدہ اور محترم ہستیوں کا تعلق ہے جو رسُولِ خدا سے لے کر آج تک تصوف کی روحانی تحریک کی جائز وارث ہیں ان کی خدمت میں حاضر ہونے والے اکثر لوگ، خواتین ہوں یا حضرات، تزکیۂ نفس یا راہِ ہدایت پانے کی بہ نسبت دنیوی فوائد حاصل کرنے کے زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان کی مثال وارث شاہ کے رانجھے کی سی ہے جو خود مسلمان ہونے کے باوجود، ہیر کے حصول کے لیے بالناتھ جوگی کا چیلا بن گیا تھا اور سر کے بال اور مونچھ ڈاڑھی منڈوا کر، کانوں میں بالے ڈال کر اور بدن پر راکھ مل کر ہیر کے سسرالی گاؤں کے پاس دھونی رما کر بیٹھ گیا تھا تاکہ موقع پا کر ہیر کو اغوا کر کے لے جائے۔ اور تو اور غرض مند عوام و خواص نے صوفیوں، درویشوں اور قلندروں کو جوتشیوں کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ سچے فقیروں اور مردانِ خدا کی بات چھوڑیے، دُنیادار لوگ تو دُنیا حاصل کرنے کے لیے ایسے ایسے مجذوبوں اور پیروں کے پاس، پتھر ہی نہیں گالیاں کھانے اور چھڑیوں سے پٹنے کے لیے پہنچ جاتے ہیں جنھیں رسُولِ خدا سے شروع ہونے والی تصوف کی عظیم روایات سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

شریعت اور طریقت کی چپقلش نے اہلِ طریقت کو قریب قریب تارکِ دُنیا بنا دیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ شریعت کے علمبردار علماء تو حکومتِ وقت کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے اور ایک طرح سے حکمران طبقے کا حصہ بن گئے تھے۔ ایسے میں اہلِ طریقت یا صوفیاء نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی خانقاہوں میں قلعہ بند ہو جائیں۔ اس طرح یہ تصور پیدا ہو گیا کہ تصوف کا دُنیا اور روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور صوفیاء دنیا سے کٹ کر خدا کی یاد میں مگن رہتے ہیں۔ آج جب ہم اپنی دُنیا اور اپنی زندگی میں روحانی قدروں کی شدید کمی محسوس کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہماری مسجدوں میں ہمارے علماء ہماری انفرادی اور معاشرتی زندگی میں روحانی اور اخلاقی قدروں کی نشو و نماء پر زور دینے کے بجائے صرف اور صرف مذہب کے ظاہری لبادے یعنی عبادات (نماز، روزہ وغیرہ) یا پھر عبادات سے غفلت کی بناء پر ملنے والی سزاؤں کی بات کرتے ہیں تو ہم صوفیاء کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ تزکیۂ نفس، دل کی پاکیزگی، کردار سازی اور زندگی میں محبت، رحمدلی، برداشت، درگزر اور حسنِ سلوک جیسی قدروں کا تصور صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین ہی سے وابستہ رہا ہے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جنھیں واقعی کوئی ایسا مردِ خدا مل جائے جو صرف اور صرف خدا کی خاطر (فی سبیل اللہ) انھیں ایسے راستے پر ڈال دے جو انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ بے شک ایسے مردانِ خدا سے زمین کبھی خالی نہیں ہوئی اور نہ آج خالی ہے۔ لیکن تصوف کے نام پر آج اسی طرح کی دکانداری ہو رہی ہے جیسے ہمارے علماء شریعت کے نام پر سیاسی جماعتیں بنا کر اقتدار کے حصول کے لیے جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ایسے ہی موقع پر اقبال نے کہا تھا:

Marfat.com

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

چلیے تصور کر لیتے ہیں کہ ہم خدا کی خصوصی مہربانی سے کسی مردِ خدا تک پہنچ گئے ہیں۔ اگر یہ مردِ خدا تصوف کے کسی روایتی سلسلے سے وابستہ ہے تو پھر یہاں بھی ہمیں کچھ ایسے مرحلے اور تقاضے درپیش ہوں گے جنھیں آج کا وہ انسان پورا کرنے سے قاصر ہے جسے دنیا میں رہتے ہوئے اقتصادی، معاشرتی، اور گھریلو ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ یہاں ہم تصوف کے روایتی سلسلوں کے صرف دو ایک تقاضوں کا ذکر کریں گے:

بیعت

جب کوئی شخص کسی مردِ خدا کی پیروی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے پہلا تقاضا یہ کیا جاتا ہے کہ وہ بیعت کی رسم ادا کرے۔ تصوف کے مختلف سلسلوں میں بیعت کے مختلف طریقے ہیں۔ بہرحال بیعت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ حق کا متلاشی انسان اپنا ہاتھ اُس شخصیت کے ہاتھ میں دے دے جس سے وہ ہدایت کا امیدوار اور طلب گار ہے۔ جس شخصیت کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جاتا ہے اب اسے شیخ یا مُرشد کہا جائے گا اور جو شخص اس شیخ یا مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے اُسے مُرید کہیں گے۔ مرید سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مرشد کی مکمل اطاعت کرے گا اور مرشد سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مرید کی روحانی تربیت کرے گا۔ اکثر اوقات یہ تربیت بہت طویل ہو جاتی ہے اور مرید اپنی روزمرہ زندگی سے کٹ کر مُرشد کی خانقاہ یا ڈیرے پر غلامانہ خدمت گزاری پر مامور ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی خدمت گزاری ایک ایسے شخص کے بس کی بات نہیں جو رزقِ حلال کما کر ایک مناسب معیارِ زندگی کے مطابق اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش کرنا چاہتا ہے۔

روحانی ذوق رکھنے والے لوگوں میں اس طرح کے واقعات کا عام ذکر ہوتا رہتا ہے کہ علی احمد صابرؒ (کلیر شریف) نے بزرگی حاصل کرنے کے لیے اپنے مرشد بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے ڈیرے پر آنے جانے والوں میں عرصۂ دراز تک لنگر تقسیم کیا اور جب مرشد نے پوچھا کہ تم نے خود بھی روٹی کھائی کہ نہیں تو مرید نے کہا، حضور آپ نے روٹی کھلانے کا حکم دیا تھا، روٹی کھانے کا ذکر نہیں کیا تھا اس لیے میں روٹی کھلاتا تو رہا لیکن کھاتا نہیں رہا۔

تصورِ شیخ

جب مرید اپنے مرشد کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا یا بیعت کرتا ہے تو اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف مُرشد کی حکم برداری کرے گا بلکہ یہ تصور بھی کرے گا کہ اُس کا مرشد رسولِ خدا کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا وہ اسی عزت و احترام کا مستحق ہے جو ہر سچے مسلمان کے دل میں حضرت محمدؐ کے لیے موجود ہوتی ہے۔ کوئی غیر مسلم اس محبت کا تصور بھی نہیں کر سکتا، گنہگار سے گنہگار مسلمان بھی رسولِ خدا کے نام پر نہ صرف لڑنے بلکہ مرنے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ آپ مسلمان ہیں تو ذرا سوچیے

Marfat.com

کہ اگر آپ کو رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل جائے تو کون سا ایسا حکم ہے جسے بجالانے کے لیے آپ تن، من، دھن کی بازی نہ لگا دیں گے اور کون سی ایسی عزت اور احترام ہے جس کا اظہار آپ زبانی اور عملی سطح پر نہیں کریں گے؟

جس طرح مرید سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ مرشد کو رسولِ خدا کی حیثیت سے دیکھے اسی طرح مرشد اپنا فرض سمجھتا ہے کہ مرید کی روحانی تربیت کو اس مقام پر پہنچا دے کہ وہ مرید کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے بجائے خود رسولِ خدا کے مبارک ہاتھ میں دے دے۔ اس تربیتی عرصے میں مرشد اپنے مرید پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور اس کے احوال و اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔ اس دوطرفہ تصور کو تصوف کی دُنیا میں تصورِ شیخ کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے۔ تصورِ شیخ مرید اور مرشد کی زندگی میں کیا طوفان مچا سکتا ہے، اردو ادب میں اس کی بہترین تصویر کشی عظیم افسانہ و ناول نگار اور اسلامی سکالر عزیز احمد نے اپنے افسانے ''تصورِ شیخ'' میں کی ہے جو اُن کے افسانوں کے مجموعے ''بیکار دن، بیکار راتیں'' میں شامل ہے۔ اس افسانے کے پیچھے اردو کے دو مشہور شاعروں کی زندگی کا ایک عجیب و غریب اور دردناک واقعہ کارفرما ہے۔ اصغر گونڈوی اپنے وقت کے اونچے شاعر ہی نہیں، پہنچے ہوئے پیرِ طریقت ہیں اور ''شعلۂ طور'' کے مصنف اور اس شعر کے خالق......

گلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

جگر مراد آبادی ان کے مرید ہیں۔ جگر صاحب کی بیوی بہت حسین و جمیل ہے اور جگر صاحب کو ان سے اس قدر محبت ہے کہ دلی، ممبئی یا لاہور جیسے برصغیر کے بڑے بڑے شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعرے پڑھنے اور لُوٹنے کے بعد ساری رقم اپنی بیگم صاحبہ کے لیے خوبصورت اور قیمتی ملبوسات خریدنے پر خرچ کر دیتے ہیں۔ اچانک مرشدِ کامل کی طرف سے مریدِ باصفا کو حکم ملتا ہے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ جگر صاحب کلیجے پر (یعنی جگر پر) پتھر رکھ کر حکم کی تعمیل تو کر دیتے ہیں لیکن مرشد کی مہربانی سے زندگی کے اندھیرے دُور ہونے کے بجائے زندگی کی روشنی بھی چھن جاتی ہے۔ جگر صاحب شراب میں تسکین ڈھونڈتے ڈھونڈتے جگر چھلنی کر بیٹھتے ہیں لیکن مُنہ سے اُف نہیں کرتے۔ مُرشدِ کامل کو تو نہیں خدائے عزیز و برتر کو اُن پر ترس آجاتا ہے اور وہ اصغر گونڈوی صاحب کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ جگر صاحب اب بیوہ ہو جانے والی اپنی سابقہ بیگم سے دوبارہ شادی کر لیتے ہیں اور ان کی زندگی میں ایک مرتبہ پھر روشنی لوٹ آتی ہے۔

عزیز احمد نے اپنے افسانے میں اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی کا نام استعمال نہیں کیا تھا لیکن ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے ان کے افسانے کے اصل کرداروں کو پہچان لینے میں کوئی مشکل حائل نہ تھی۔

اس مثال سے یہ مراد ہرگز نہیں لینی چاہیے کہ ہر مرشد لازماً اپنے مریدوں کو اسی طرح کے امتحانوں سے گزارتا

Marfat.com

ہے لیکن اس سے یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی ایسا انسان جو اقتصادی، معاشرتی اور گھریلو ذمہ داریوں میں پھنسا ہو، تصورِ شیخ کے تقاضے بمشکل ہی پورے کرسکتا ہے۔

اگر فتویٰ فروش اور اقتدار پرست علماء کی طرح طریقت یا تصوف کے روایتی سلسلے بھی دکانداری ہی بن چکے ہیں اور اکثر حقیقی بزرگانِ دین کی نالائق، عیاش اور فقر و زہد سے بے نیاز اولاد بزرگوں کے مزاروں اور مزاروں سے ملحقہ جائیدادوں کے بل بوتے پر سادہ لوح مریدوں کے نوٹ اور ووٹ سمیٹنے میں مصروف ہے تو وہ لوگ کہاں جائیں جو آج کی زندگی میں انسانی، اخلاقی اور روحانی قدروں کی شدید کمی محسوس کرتے ہیں؟

ایسے لوگوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے: شریعت کے مقابلے میں طریقت یا تصوف نے چونکہ روحانی، اخلاقی اور انسانی قدروں پر زیادہ زور دیا ہے اس لیے روحانیت اور تصوف کی مشترکہ قرآنی بنیادوں پر، شریعت اور طریقت کے جھگڑوں میں پڑے بغیر، روحانیت کی عمارت استوار کرلی جائے۔ یہ کتاب اسی عمارت کی تعمیر کی ایک ابتدائی لیکن مخلصانہ کوشش ہے۔ رب العالمین ہونے کے ناتے خدا ابد سے ازل تک زندہ و موجود ہے۔ خدا کی کتاب، ذِکرٌ للعالمین ہوتے ہوئے زیر زبر کے فرق کے بغیر، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کردی گئی ہے۔ پھر اُس خدا نے جو 'رب الناس' بھی ہے، انسان پر خصوصی کرم کرتے ہوئے رحمۃ للعالمین، رسولِ خدا کی رسالت کو تمام انسانوں، قوموں، زمانوں اور جہانوں تک پھیلا دیا ہے اس لیے آیئے، زندہ و پائندہ خدا سے مدد مانگتے ہوئے، قرآنِ حکیم سے ہدایت تلاش کرتے ہوئے اور انسانی تاریخ کی شاہراہوں پر رسولِ خدا کے مبارک قدموں کے روشن نشانوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے رُوحانیت کی ایسی عمارت بنالیں جس سے آج کے انسان عموماً اور مسلمان خصوصاً اپنی بے معنی، بے رس اور بے کار زندگیوں میں خدا کا رنگ بھر سکیں تاکہ ہماری یہ دنیا اور اس میں آباد خلقِ خدا، خدا کے نور سے جگمگا اُٹھے۔

روحانیت کی یہ عمارت چونکہ تصوف ہی کے اینٹ گارے اور سیمنٹ سریے سے تعمیر ہوگی اس لیے ہمارے لیے تصوف کی مختصر تاریخ سے واقف ہونا اشد ضروری ہے۔

تصوف کی تاریخ سے واقفیت اس لیے بھی ضروری ہے کہ برصغیر میں اسلام نہ تو فاتحین کی تلوار سے پھیلا اور نہ ہی علمائے کرام کے کرخت رویّے نے پھیلایا۔ فاتحین کو تو غیر مسلموں سے جزیہ (حفاظتی ٹیکس) لینے کی ضرورت ہوتی تھی اور وہ اس مقصد کے تحت غیر مسلموں کو مسلمان بننے کی ترغیب دیتے ہی نہیں تھے۔ رہے علمائے کرام تو وہ اچھے بھلے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے رہتے ہیں، ان کے بس میں ہوتا تو آج خود ان کے سوا دنیا میں کوئی مسلمان ہی نہ ہوتا۔ یہ تو صوفیائے کرام ہی تھے جنھوں نے برصغیر کے ہر چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب، شودر اور اچھوت کو محبت کے ساتھ سینے سے لگایا اور ان کے سینے خدا کے نور سے روشن کر دیے۔ آج شریعت کے نام پر تشدد کے دلدادہ علمائے کرام اچھے بھلے

Marfat.com

مسلمانوں پر اسلام نافذ کرنے چل دیے ہیں حالانکہ دین کے معاملے میں جبری نفاذ کی گنجائش ہی نہیں۔ اس لیے ہم مسلمانوں کے لیے بے حد ضروری ہے کہ اسلام کی جڑوں کو پہچاننے کے لیے اُن صوفیائے کرام کے حالات اور تعلیم سے بخوبی واقف ہو جائیں جن کی تلقین سے ہم نے یا ہمارے آباؤ اجداد نے اسلام قبول کیا تھا۔ جن انسانی، اخلاقی اور روحانی قدروں کی کمی آج ہم اپنی منتشر صفوں میں محسوس کر رہے ہیں وہ ہمیں فاتحین یا علمائے کرام سے نہیں صرف صوفیائے کرام ہی کی زندگی اور تعلیم و تلقین میں مل سکتی ہیں۔

Marfat.com

دوسرا حصہ

تصوف کی مختصر تاریخ

Marfat.com

Marfat.com

چوتھا باب

عالمِ اسلام کے تین بڑے صوفی

اسلام صرف قرآنِ حکیم نہیں۔ اسلام کا پہلا ازلی وابدی سرچشمہ خدائے زندہ و پائندہ ہے جس سے اس کا ہر بندہ آج بھی مدد اور رہنمائی مانگ سکتا اور حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا دوسرا اہم رکن رسولِؐ خدا کی مبارک ذات اور سیرتِ پاک ہے۔ قرآنِ حکیم اس کا تیسرا رکن ہے۔ جب خدا نے رسولِؐ خدا کی زندگی کے آخری دنوں میں اسلام کو مکمل کر دینے کا اعلان کیا تو اس وقت صرف اور صرف یہی تین رکن تھے جن کی بدولت اسلام کی تکمیل ہو گئی تھی۔ یاد رہے کہ اس وقت تک نہ تو احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب ہوا تھا، نہ کوئی فقہ وجود میں آئی تھی، اور نہ ہی کوئی سلسلۂ تصوف قائم ہُوا تھا۔

اس وضاحت کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم تصوف کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں مختلف سلسلوں کے درمیان فرق سے کوئی پریشانی لاحق نہ ہو۔ یہ فرق اگر خدا، رسولؐ اور قرآن کی تعلیمات سے ٹکراتا نہ ہو تو اس سے بدکنے کے بجائے ہمیں اس پر ٹھنڈے سبھاؤ غور وفکر کرنا چاہیے۔

تصوف کی تاریخ دو طرح سے بیان کی جا سکتی ہے۔ تصوف کی اسلامی بنیادوں کے باوجود اس کے رشتے دوسرے مذاہب کی روحانی تحریکوں سے بھی جا ملتے ہیں۔ اس لیے ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی توبہ سے شروع ہو کر تمام مذاہب کی بلکہ مذاہب کے علاوہ ہمہ مذہبی (Secular) روحانی تحریکوں مثلاً سُبود (Subud) اور ٹرانسنڈینٹل میڈی ٹیشن (Transcendental Meditation) یا (TM) وغیرہ کا جائزہ لیا جائے۔ لیکن یہ اس کتاب کے دائرۂ کار (Terms of Reference) سے باہر کی بات ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ تصوف کے مشہور سلسلوں اور ان سے تعلق رکھنے والی چیدہ چیدہ ہستیوں کا ذکر کر دیا جائے جو پورے عالمِ اسلام اور برصغیر پاک و ہند میں نمایاں ترین مقام رکھتی ہیں اور ساتھ ہی اُن چند شخصیات کا بھی ذکر آ جائے جنھوں نے شریعت اور طریقت میں دیواریں کھینچنے کے بجائے صحیح اسلامی رویے کے عین مطابق انھیں شیر و شکر (Synthesize) کرنے کا اہم اور ضروری کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کتاب میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

جو قارئین تصوف کے بارے میں زیادہ تفصیل اور گہرائی میں جانا چاہتے ہیں ان کے لیے ابتدائی کتابوں میں سید علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کی تصنیف: ''کشف المحجوب'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ اقبال کے اُستاد پروفیسر نکلسن نے اور اُردو ترجمہ جماعت اسلامی پاکستان کے سابق امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے کر رکھا ہے اور دونوں ترجمے آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ حالیہ کتابوں میں سید حسین نصر کی دو جلدوں میں مرتبہ انگریزی کتاب Islamic Spirituality (اسلامی روحانیت) خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ پاکستان کے قابلِ قدر دانش ور سید قاسم محمود

اپنے جریدے ''احیائے علوم'' میں اس اہم کتاب کا قسط وار ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔

تصوف کی کوئی بھی تاریخ خود رسولؐ خدا اور آپؐ کے بعد حضرت علیؓ کے ذکر کے بغیر شروع اور مکمل نہیں ہوسکتی۔ ان دونوں عظیم الشان شخصیتوں کا مختصر ذکر چونکہ اس کتاب کے ایک باب: ''روحانیت اور تصوف کی قرآنی بنیادیں'' میں پہلے ہو چکا ہے۔ تفصیلی ذکر خصوصاً روحانی جواں مردی کے باب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لیے ہم آگے چلتے ہیں اور تصوف کے حوالے سے عالم اسلام کی تین ایسی ہستیوں کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں جو برصغیر کے علمی اور روحانی حلقوں میں بھی معروف و مشہور ہیں۔

جُنیدؒ بغدادی

آپ کا پورا نام ابوالقاسم ابن محمد الجنید تھا۔ آپ اندازاً 830ء میں پیدا ہُوئے اور 910ء میں فوت ہوئے۔ آپ صوفیائے کرام کی پہلی صف کے ممتاز ترین رکن سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے بغداد میں اپنی تعلیم و تلقین کا چراغ مدتوں روشن رکھا۔ اپنے عہد سے پہلے حسن بصریؒ اور اپنے دور کے بعد امام شاذلیؒ کی طرح آپ نے صوفی طرزِ فکر کی نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ دوسرے صوفیاء کے لیے آپ سند اور مثال کی حیثیت رکھتے تھے جس کی بنا پر آپ کو ''سلطان العارفین'' کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

جنیدؒ نے تصوف کا جو نظریہ پیش کیا وہ بہت منظم اور متوازن ہے۔ آپ نے تصوف اور انسان کی روزمرہ زندگی کے درمیان تعلق کو بہت اہمیت دی اور اسے خاص طور پر واضح کیا۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ صوفیوں کو ذمہ دارانہ سماجی اور گھریلو زندگی گزارنی چاہیے اور مسیحی فقیروں (Christian Friars) کی طرح در بدر بھیک نہیں مانگتے پھرنا چاہیے۔ آپ فرماتے تھے کہ اس دُنیا میں رہتے ہوئے اور دنیوی زندگی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے بھی انسانی روح میں خدا کی معرفت (Divine Knowledge) اپنا پائیدار گھر بنا سکتی ہے۔ تصوف کی زبان میں اس رویے یا واردات کو صحو یا بیداری (Soberiety) اور اس سے الٹ رویے کو سکر یا سرمستی (Ecstacy) کہتے ہیں۔ اقبالؔ نے صحو کو ''جُنونِ باشعور'' اور سکر کو ''جنونِ بےشعور'' کا نام دیا ہے:

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

اپنے پہلے ایک سو سال میں اسلام کو بہت سے بیرونی اثرات کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ اس عرصے میں اسلام جزیرہ نما عرب سے نکل کر عراق، شام، ایران اور مصر تک پھیل گیا تھا۔ خاص طور پر جب ایران کے قدیم مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اسلام قبول کیا تو وہ اپنے ساتھ یہ تصور بھی لائے کہ دین کی مرکزی شخصیات میں نہ صرف خدائی صفات موجود ہوتی ہیں بلکہ وہ خدا ہی کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس تصور نے مسلمانوں میں بایزید بسطامیؒ اور منصور حلاجؒ جیسے

Marfat.com

سرمست صُوفیوں (Drunken Sufis) کو متاثر کیا جنھوں نے اپنی سرمستی میں یہ اعلان کیا کہ خدا اوران کی اپنی ذات میں کوئی فرق نہیں اور دونوں ایک ہی ہیں۔ اس تصور کو رد کرتے ہوئے جنیدؒ ایک ایسے تصوّر کے علمبردار بن کر ابھرے جو دنیوی زندگی میں شریعت کے احکامات پر کاربند رہنے کی تلقین کرتا تھا اور اسلام کی راسخ العقیدہ (Orthodox) تشریح سے قریب تر تھا۔

سُکر یا سرمستی کا مفہوم یہ تھا کہ آپ خدا کی محبت میں سب کچھ بُھلا دیں خصوصاً اپنی ذات کو تو بالکل ہی مٹا دیں یہاں تک کہ آپ کو خدا کے سوا کسی ذات یا چیز کا ہوش نہ رہے۔ اس کے برعکس صحو، شعور یا ہوش سے مراد تھی کہ خدا کی قربت کے نتیجے میں آپ کے اندر خدائی صفات پیدا ہو جائیں اور جس طرح خدا اپنی تمام مخلوق سے محبت کرتا ہے، آپ بھی اسی طرح سب سے محبت کریں اور رحم دلی، برداشت، درگزر اور معافی جیسی صفات آپ کا وتیرہ بن جائیں۔ سُکر میں صراطِ مستقیم کی تلاش کو فضول اور فالتو سمجھا جاتا ہے۔ صحو میں خدا سے صراطِ مستقیم دکھانے بلکہ ہاتھ پکڑ کر صراطِ مستقیم پر ڈال دینے کی التجا کی جاتی ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک خدا انسان سے اسی دوسرے رویے کی توقع کرتا ہے:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، راہرو منزل ہی نہیں

بایزید بسطامیؒ اور ان کے پیروکار سرمستی یا مجذوبی کو خدا کی قربتِ باشعور سے افضل و برتر قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اپنی ذات کا خدا کی ذات سے الگ شعور ہی تو خدا اور بندے کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ (حجاب) ہے۔ لیکن جنیدؒ اور آپ کے پیروکار یہ کہتے تھے کہ سرمستی و مجذوبی (سُکر) تو بچوں کا کھیل (بازیچۂ اطفال) ہے جبکہ قربتِ باشعور (صحو) مردانِ خدا کا میدانِ جنگ ہے۔

جنیدؒ نے رزقِ حلال کے حصول کی خاطر تجارت کا پیشہ اپنا رکھا تھا اور بغداد میں آپ کی باقاعدہ دکان تھی۔ جنیدؒ نے حلاجؒ کو اپنے صوفی حلقے سے یہ کہہ کر خارج کر دیا تھا کہ ''مجھے دِیوانے قبول نہیں''۔ جب حلاجؒ نے انا الحق کہہ کر یہ اعلان کیا کہ ''میں حق (دوسرے معنی میں خدا) ہوں'' تو جنیدؒ نے کہا، ''تم حق نہیں ہو بلکہ حق کی بدولت ہو''۔

خدا کی پہچان (معرفت) کے سلسلے میں جنیدؒ شعور یا شہادت (گواہی) پر زور دیتے تھے۔ آپ کا اصرار تھا کہ معرفت کی بدولت ہم خدا کے وجود کی گواہی دیتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ جو کچھ ہے وہ خدائے واحد کی تخلیق ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدائے واحد کا عمل ہے۔ ہماری یہی شہادت یا گواہی خدا کی وحدانیت کا ثبوت ہے۔ جنیدؒ کے اس طرزِ فکر یا فلسفے کو تصوف کی تاریخ میں ''وحدت الشہود'' (Panentheism) کا نام دیا جاتا ہے۔ برصغیر میں اس طرزِ فکر کے سب سے بڑے علمبردار شیخ احمد سرہندیؒ تھے جنھیں تاریخ مجدد الف ثانی (دوسرے ہزار سالہ دور میں دین کو نئی زندگی دینے والا) کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اس طرزِ فکر کے مطابق وقت کے ساتھ مٹ جانے والی مخلوق کو ہر شے کی خالق، قائم و دائم ذاتِ خداوندی سے

Marfat.com

الگ سمجھنے کے سوا ہم خدا کے احترام کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ''وحدت الشہود'' کے اس نظریے سے الٹ ''وحدت الوجود'' (Unity of Being) یا ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کا نظریہ ہے جس کے مطابق ''درحقیقت خدا کے سوا کوئی اور ذات یا چیز وجود نہیں رکھتی اور یوں خدا اور دُنیا کی ہر شے ایک ہی وحدت ہیں''۔

مناسب ہوگا کہ اب ہم تصوف کی تاریخ کے ایک اور اہم ستون: ابن عربیؒ کی شخصیت اور افکار کا مختصر جائزہ لیں کیونکہ ''وحدت الوجود'' کے نظریے کو اُنھی نے سب سے پہلے لفظی جامہ پہنایا تھا۔

ابنِ عربیؒ

آپ کا اصل نام ابو بکر محمد محی الدین تھا۔ آپ 1165ء میں پیدا ہُوئے اور 75 سال کی عمر پا کر 1240ء میں فوت ہُوئے۔ تصوف کی دنیا میں آپ کو شیخ الاکبر (The Greatest Teacher) کہا جاتا ہے۔ آپ کی ایک تصنیف: زرِ خالص (Pure Gold) کے حوالے سے آپ الکبریت الاحمر (The Red Sulphur) بھی کہلاتے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ آپ جہالت کے اندر سے علم کا نور اس طرح کشید کر سکتے ہیں جس طرح گندھک، سکے (Lead) کے اندر سے سونا۔ آپ کا طرزِ تحریر اور طرزِ فکر زیادہ واضح نہیں تھا جس کی وجہ سے ہر طرح کے پریشاں خیال لوگوں کو آپ کی تحریروں میں اپنے اُلٹے پُلٹے گنجلک نظریات کا جواز مل جاتا تھا۔ آپ کی تحریروں کا مجموعی تاثر تو یہی ہے کہ آپ ''ہمہ اوست'' (Pantheism) کے نظریے کے قائل تھے۔ اس نظریے کے مطابق خدا چونکہ بیک وقت ہر جگہ موجود ہے یعنی وہ پانی میں بھی ہے اور مٹی میں بھی، آگ میں بھی ہے اور ہوا میں بھی، اس لیے دنیا کی ہر چیز خدا ہی کی طرح مقدس اور محترم ہے یا دوسرے لفظوں میں ''خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ خدا ہی ہے''۔ یہ بات البتہ قابلِ ذکر ہے کہ آپ کے کئی پیروکار آپ کو ''ہمہ اوست'' کے نظریے کا قائل قرار نہیں دیتے۔

ابن عربیؒ سپین (اندلس) میں مرسیہ کے مقام پر پیدا ہُوئے تھے۔ آپ نے سپین ہی میں تعلیم پائی لیکن بعد میں مکہ اور بغداد تشریف لے گئے اور بالآخر دمشق میں رہائش پذیر ہو گئے۔ تصوف کے حوالے سے آپ کی مفصل ترین کتاب: فتوحاتِ المکیہ (مکی الہامات) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اسی طرح فُصوص الحِکم (دانش و حکمت کے جواہر پارے) بھی خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ روحانی واردات (Religious Experience) نے آپ پر یہ واضح کیا کہ گو یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے الہامی مذاہب میں اوپر ہی اوپر، ظاہری طور پر، بہت فرق ہے لیکن اندر ہی اندر یا باطن میں یہ ایک ہی ہیں۔ (ہمارے عہد میں روحانی طور پر بیدار لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اب واضح طور پر اس احساس کی قائل ہوتی جارہی ہے۔ اس سلسلے میں آلڈس ہکسلی (Aldous Huxley) کی 1946ء شائع ہونے والی شاندار کتاب (The Perennial Philosophy) پہلے اہم ترین سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔)

ابن عربیؒ نے روحانی واردات کو ''حال'' کا نام دیا تھا۔ ایک کیفیتِ حال میں انھیں حضرت عیسیٰؑ کی طرح

Marfat.com

خدائے محبت (God of Love) کا تجربہ (Experience) ہُوا چنانچہ اپنی عشقیہ شاعری کے مجموعے: ترجمان الاشواق (اشواق شوق کی جمع ہے) کے ایک مشہور بند میں فرماتے ہیں:

میرا دل ہر صورت کی پذیرائی کے لیے کھلا ہے
یہ غزالوں (ہرنوں) کی چراگاہ ہے
اور مسیحی راہبوں کی خانقاہ ہے
یہ بتوں کے لیے مندر ہے
اور حاجیوں کے لیے کعبہ ہے
اس میں تورات کی لوحیں
اور قرآن کے اوراق ایک ساتھ موجود ہیں
محبت میرا مذہب ہے
زندگی کی ناقہ (اونٹنی) مجھے جہاں بھی لے جائے
محبت ہی میرا دین
اور محبت ہی میرا ایمان ہوگی

ابن عربی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ اپنے جداگانہ طرزِ فکر کے باعث ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جنھیں اہلِ تصوف جرأت مندانہ لیکن اہلِ شریعت گستاخانہ قرار دیتے تھے۔ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں ھُو (وہ۔ مذکر) بھی شامل ہے (ھُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا ھُو 59:23)۔ ابن عربیؒ نے کہا کہ خدا کا ایک باطنی نام ھیا (وہ۔ مونث) بھی ہے۔ علماء کے نزدیک یہ ایک بدعت تھی البتہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عربیؒ دوسرے مذاہب سے بھی فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ وہ سپین میں قیام کے دوران دو معمر اور برگزیدہ خواتین: شمس (عربی میں ''شمس'' مونث ہے) اور فاطمہ کے نظریات سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اپنی دو کتابوں: ''رُوح القدس'' اور ''الدُّرات الفاخرہ'' میں ان دونوں خواتین کے بارے میں ابن عربیؒ نے لکھا ہے کہ وہ ان کے لیے مثال کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی طرح جب وہ مکّے میں آئے تو ان کے ایک دوست ظاہر ابن رستم کی نوجوان اور حسین وجمیل لیکن عالم فاضل بیٹی ''عین الشمس'' سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ ان کی ''ترجمان الاشواق'' میں شامل نظموں کی روحِ رواں یہی خاتون سمجھی جاتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبالؔ کی زندگیوں میں یہی کردار محترمہ ''عطیہ فیضی'' نے ادا کیا تھا۔ اہلِ ذوق اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب: ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' اور پروفیسر محمد عثمان کی کتاب: ''حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور'' ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ بہرحال عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ چنانچہ اس سفر کو ابن عربیؒ کی زندگی میں ایک مثبت قدم ہی سمجھنا چاہیے اور جہاں تک خدا کے ایک مؤنث نام کا تعلق ہے یہ بھی سوچنے والی بات ہے۔

Marfat.com

خدا کی مکمل وحدت کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس میں نہ صرف مذکر (Male Principle: Animus) بلکہ مؤنث (Female Principle: Anima) سب کچھ شامل ہو۔

اگرچہ ابن عربیؒ کو صوفیوں میں سب سے بڑا دانشور تسلیم کیا جاتا ہے لیکن خود ان کے نزدیک تصوف کی معراج دانش و حکمت یا علم و معرفت نہیں بلکہ صرف اور صرف محبت ہے کیونکہ خدا محبت ہی سے ملتا ہے اور محبت ہی خدا اور انسان کو یکجان کرتی ہے۔ ابن عربیؒ نے ''وحدت الوجود'' (Unity of Being) کے نظریے کو الفاظ میں ڈھالا۔ اس نظریے کے مطابق خدا کے ہوتے ہوئے اور کوئی چیز وجود رکھ ہی نہیں سکتی اور اگر اس چیز کے وجود کو تسلیم کیا جائے گا تو خدا کی وحدت کی نفی ہو جائے گی۔ یہ وہی نظریہ ہے جو ہندو فلسفۂ مذہب میں ویدانت (Vedanta) اور چینی فلسفۂ مذہب میں تاؤ (Tao جدید تر تلفظ داؤ ہوگا) کہلاتا ہے۔ ان تینوں نظریات کا بنیادی مفہوم یہی ہے کہ خدا (برہمن یا داؤ) کے سوا سب کچھ فانی ہے، بقا صرف خدا کو ہے۔ جب کچھ بھی نہیں تھا تو خدا تھا، جب کچھ بھی نہیں ہوگا تب بھی خدا ہی ہوگا اس لیے جو ہے اُس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں، حقیقت صرف خدا ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہے وہ خدا ہی ہے۔

غالبؔ نے اس دلیل کو یہ الفاظ دیے تھے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ابن عربیؒ کے ایک مشہور پیروکار، ابن عطاءُ اللہ نے اس نظریے کی یوں تشریح کی ہے:

''خبردار، تمام تر قوت کا مالک خدا یہ بھی تو کر سکتا ہے کہ تم سے چھپنے کے لیے وہ اُس سب کچھ کے پیچھے چھپ جائے جس کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے''۔

یہ حقیقت ہے کہ ''وحدت الوجود'' کا نظریہ ابن عربیؒ سے ایک عرصۂ دراز پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اسلامی تصوف میں ابن عربیؒ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ جو نظریہ مرشدوں سے مریدوں تک سینہ بہ سینہ، زبانی طور پر منتقل ہو رہا تھا انھوں نے اسے ایک منضبط اور مفصل شکل دے دی۔ اس کارنامے کے علاوہ ابن عربیؒ نے سپین اور مراکو کی ''مغربی'' صوفیانہ روایات کو مشرقی دنیائے اسلام، خصوصاً مصر اور شام کی صوفیانہ روایات سے ہم آہنگ کر دیا۔

یہی نہیں، ابن عربیؒ نے ایرانی صوفیوں کو بھی متاثر کیا چنانچہ وہ عبدالکریم الجیلیؒ، امام شاذلیؒ اور ایک حد تک جلال الدین رومیؒ جیسے جید صوفیوں پر بھی اثر انداز ہوئے اور یوں اُن کا دائرۂ اثر سارے عالم اسلام تک پھیل گیا۔ جب انڈونیشیا میں آچے (یہ وہی علاقہ ہے جہاں 26 دسمبر 2004ء کو ''سنامی'' نام کا سمندری طوفان آیا تھا) جیسے اسلامی مرکزوں میں دانشوری کا دور دورہ تھا تو وہاں ابن عربیؒ اور ان کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے صوفیاء مثلاً ابن عطاءُ اللہ کا نام زبان زدِ عام تھا۔

حالیہ دور میں ابن عربیؒ کے پیروکاروں میں الجیریا کے عظیم مجاہد، امیر عبدالقادر بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

Marfat.com

یوں کہیے کہ وہ الجیریا کے قائد اعظم تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی میں فرانسیسی قبضے کے خلاف زبردست جدوجہد کی تھی۔ وہ ایک ہزار سال کے وقفے کے باوجود ابن عربی کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوت ہُوئے تو انھیں دمشق میں ابن عربیؒ کے مزار میں اُن کے پہلو بہ پہلو دفن کیا گیا۔

آج بھی وحدت الوجود کے نظریے کو اگر صحیح رنگ میں پیش کیا جائے تو کم از کم ماحولیات (Environment) کے اعتبار سے جو خرابی پیدا ہوگئی ہے اول تو وہ پیدا ہی نہ ہوتی، نہیں تو اس کا بخوبی تدارک ہوسکتا ہے۔ انسان نے زمین اور اس کے ماحول کو نہایت بے دردی سے تباہ و برباد کیا ہے یہاں تک کہ خود انسانوں کے لیے اس آلودگی (Pollution) میں جینا محال ہوتا جا رہا ہے۔ اگر انسان فطرت کو تسخیر کرنے کے چکر میں فطرت کو تباہ کرنے کے بجائے اس کے مظاہر کو مقدس سمجھتا تو سائنسی ایجادات کی بدولت زمین جنت نظیر بن جاتی۔

عبدالقادرؒ جیلانی

حضرت عبدالقادرؒ جیلانی 1077ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے 89 سال کی عمر پائی اور 1166ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا شمار اسلام کے ممتاز ترین صوفیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرت امام حسنؓ کی وساطت سے حضرت علیؓ تک جا پہنچتا ہے۔ آپ کے نام، عبدالقادر سے منسوب صوفی ''سلسلۂ قادریہ'' پورے عالم اسلام میں عموماً اور برصغیر پاک و ہند میں خصوصاً بے حد مقبول ہے۔ آپ شمالی ایران کے علاقے ''جیلان'' میں پیدا ہُوئے لیکن آپ کی زیادہ تر عمر بغداد میں کٹی جہاں آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

آپ کے بارے میں ایک کہانی اب کردار سازی کی ایک عالمگیر مثال بن چکی ہے۔ لڑکپن میں جب آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے بغداد روانہ ہونے لگے تو آپ کی والدہ محترمہ نے تاکید کی کہ بیٹا جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ بغداد میں گزر اوقات کے لیے والدہ نے آپ کے کُرتے کی اندرونی جیب میں کچھ اشرفیاں سی دیں جو باہر سے کسی کو نظر نہیں آتی تھیں۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے، اس پر ایک ویران مقام پر کچھ ڈاکوؤں نے حملہ کردیا۔ آپ کی عمر اور سادہ لباس کو دیکھ کر ڈاکوؤں نے آپ پر زیادہ توجہ نہ دی بس ویسے ہی ضمناً پوچھ لیا، ''لڑکے، تمھارے پاس کچھ ہے''؟ آپ چاہتے تو کہہ دیتے کہ میرے پاس کچھ نہیں اور آسانی سے بچ جاتے۔ مگر آپ نے بتایا کہ میری ماں نے کچھ اشرفیاں کُرتے کی خفیہ جیب میں سی رکھی ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار نے آپ کی صدق بیانی پر حیران ہو کر پوچھا، ''تمھیں ڈر محسوس نہیں ہُوا کہ ہم یہ اشرفیاں چھین لیں گے''؟ آپ نے کہا، ''جھوٹ بولتے ہوئے مجھے تم سے زیادہ خدا کا ڈر محسوس ہُوا تھا''۔ آپ کی اس بات نے ڈاکوؤں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ سب ڈاکا زنی سے تائب ہوگئے۔

آپ کے بارے میں دو اور کہانیاں بھی مشہور ہیں۔ ان دونوں کہانیوں کی حقیقت پر نہیں، ان کی معنویت پر توجہ دینی چاہیے۔ ایک مرتبہ ایک بے حد کمزور بوڑھے شخص نے جو زمین پر گرا پڑا تھا آپ کو پکارا کہ مجھے اٹھنے میں مدد دو۔ آپؒ

Marfat.com

نے آگے بڑھ کر اُسے سہارا دیا اور اس کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔ اچانک وہ شخص بڑا ہوتے ہوتے زمین سے آسمان تک بلند ہو گیا اور اس نے کہا، "عبدالقادر! میں دینِ اسلام ہوں۔ میں نڈھال پڑا تھا، تمھارا شکریہ کہ تم نے مجھے دوبارہ کھڑا کر دیا۔"

دوسری کہانی زیادہ تر برصغیر پاک و ہند میں مشہور ہے اور اہلِ سنت والجماعت (سُنّیوں) کے بریلوی فرقے میں زبان زدِ عام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک بڑھیا کھڑی رو رو کر خدا سے فریاد کر رہی ہے کہ برسوں پہلے دریا پار کرتے ہوئے اس کے بیٹے کی برات میں شامل تمام لوگ جس کشتی کے الٹ جانے سے دریا بُرد ہو گئے تھے وہ اس کشتی کو تمام براتیوں سمیت پار لگا دے۔ آپ اس بڑھیا کے قریب گئے تو اُس نے آپ کو پہچان لیا اور کہا، اے پیروں کے پیر، دعا کر کہ خدا میری مراد پوری کر دے۔ آپ نے دعا فرمائی اور دیکھتے ہی دیکھتے برسوں کی ڈوبی ہوئی کشتی ہنستی کھیلتی برات کے ساتھ دریا سے برآمد ہو کر پار لگ گئی۔ اس کہانی کے مطابق یہ واقعہ چاند کی گیارھویں تاریخ کو پیش آیا تھا۔ پورے برصغیر میں آپ کے پیروکار گیارھویں تاریخ کو خصوصی طور پر کچھ پکا کر ختم دلاتے ہیں اور غریبوں میں کھانا تقسیم کرتے ہیں۔ گوالے اس روز ایک وقت کا دُودھ آپ کے نام پر وقف کر دیتے ہیں۔ عوام الناس میں آپ کو کہا ہی "گیارھویں والے پیر صاحب" جاتا ہے۔ اسی کہانی کے حوالے سے ہماری زبان میں بیڑا پار لگانے کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ کہانی خدا کی مہربانی سے غرق شدہ بیڑے کو پار لگانے کی ایک عام فہم تلمیح (Allegory) ہے۔ جو عوام کو دکھوں اور تکلیفوں سے بھری زندگی کے باوجود خدا کی رحمت سے ناامید نہیں ہونے دیتی۔

عبدالقادرؒ جیلانی نے پچاس سال کی عمر کو پہنچ کر عوامی سطح پر تلقین کا آغاز کیا۔ آپ نے قادریہ طریقہء تصوف کی بنیاد شریعت کی پوری پوری پیروی پر رکھی۔ آپ اپنے مریدوں کو بھی شریعت پر کاربند رہنے کا حکم دیتے تھے اور خود بھی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں قانونِ شریعت کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک کہانی اور سن لیجیے۔ ایک روز آپ فجر کی نماز وقت پر نہ پڑھ سکے۔ آپ کو اس بات کا اتنا رنج ہُوا کہ آپ دیر تک روتے رہے اور خدا کے حضور میں گڑ گڑا کر معافی مانگتے رہے۔ جب شیطان نے یہ دیکھا کہ ایک وقت کی نماز قضا ہو جانے سے آپ کی یہ کیفیت ہو گئی ہے اور "خطرہ" ہے کہ خدا آپ کی گریہ زاری سے متاثر ہو کر آپ کے درجات مزید بلند نہ کر دے تو اُس نے اپنے دل میں یہ ٹھانی کہ عبدالقادرؒ کو فجر کے وقت سوتا رکھنے کے بجائے آئندہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح وقت پر جگا دیا کرے۔ یہ کہانی جہاں نماز کی پابندی کی اہمیت کو واضح کرتی ہے وہاں عبادت پر فخر کرنے کے مقابلے میں اپنی کوتاہی پر خدا سے معافی چاہنے کو بھی برتر قرار دیتی ہے۔

اس کہانی سے ایک اور کہانی یاد آ گئی ہے اور وہ شریعت کے سلسلے میں عبدالقادرؒ جیلانی کی احتیاط کو مزید واضح کرتی ہے۔ ایک روز آپ کو ایک خاتون کا خط ملا کہ وہ ایک عالمِ دین کی بیوہ ہیں اور گزر اوقات کے لیے ایک گھرانے میں ملازمہ کی حیثیت سے رہتی ہیں۔ جب گھر کے تمام کام ختم ہو جاتے اور تمام گھر والے سو جاتے ہیں تو وہ قریب کے ایک گھر

کے روشن دان سے آنے والی روشنی کی ایک شعاع تلے بیٹھ کر قرآنِ حکیم یا کوئی دینی کتاب پڑھتی ہیں۔ لیکن مطالعے کے دوران انھیں مسلسل ایک احساس ستاتا رہتا ہے کہ اس روشنی میں انھیں مطالعہ کرنا چاہیے یا نہیں کیونکہ اس گھر سے آنے والی آوازوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں رنگ رلیاں منائی جارہی ہیں۔ خط کے آخر میں خاتون نے آپؒ سے اس مسئلے میں رہنمائی کی درخواست کی تھی کہ اُسے مطالعہ جاری رکھنا چاہیے یا ترک کر دینا چاہیے۔ آپؒ نے جواب میں لکھا کہ "بی بی، آپ کے نفس نے جو پاکیزگی حاصل کر لی ہے اُس کا تقاضا ہے کہ آپ اس روشنی میں مطالعہ نہ کیا کریں"۔

آپ کو اپنے زمانے کا قطب بلکہ غوث الاعظم کہا جاتا تھا کیونکہ آپؒ کے مریدوں کو یقین تھا کہ وہ جب بھی آپ کو رہنمائی کے لیے پکاریں گے، آپ ان کی روحانی مدد کے لیے خواجہ خضرؑ کی طرح غیب سے نمودار ہو جائیں گے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے "فتوح الغیب" سب سے زیادہ مشہور ہے۔

عبدالقادرؒ جیلانی سے صوفی سلسلوں (Sufi Orders) کی روایت چلی جس کے مطابق کوئی عظیم شخصیت یا وَلی اللہ سلسلے کا سربراہ یا بانی ہوتا ہے اور اسی کے نام سے سلسلہ آگے چلتا ہے۔ تصوف کی تاریخ میں عبدالقادرؒ کے حوالے سے قائم ہونے والا قادریہ سلسلہ اولیت رکھتا ہے۔ جب قادریہ سلسلہ قائم ہُوا تو اسے "طریقہ" (Method یا Path) کہا گیا۔ چونکہ ایسا پہلی مرتبہ ہُوا تھا اسی لیے تصوف اور اس کے سلسلوں کو طریقت کہا جانے لگا۔

عبدالقادرؒ جیلانی نے اپنے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے "فتوح الغیب" میں لکھا ہے:

> خدا کی رضا سے تم، لوگوں سے اس حد تک کنارہ کش ہو جاؤ جیسے تم اُن کے لیے مر گئے ہو۔ اور خدا ہی کے حکم سے تم اپنی خواہشات اور جذبات کو اسی طرح خیر باد کہہ دو جیسے تم ان کے لیے بھی مر گئے ہو۔ تب تمھارا وجود خدا کی معرفت کا گھر بننے کے لائق سمجھا جائے گا۔ لوگوں کی حد تک مر جانے کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم ان سے بے نیاز ہو جاؤ اور ان سے کسی چیز کی توقع نہ کرو۔ خواہشات اور جذبات کی حد تک مر جانے کی نشانی یہ ہوگی کہ تم کوئی ذاتی فائدہ نہ چاہو، کوئی دُکھ یا نقصان تمھیں متاثر نہ کرے اور تم اپنے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دو کیونکہ تم نے سب کچھ خدا کے سپرد کر دیا ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ تمھاری رضا (Will) خدا کی رضا میں جذب ہو گئی ہے یہی ہے کہ تم اپنے آپ سے اور اپنے لیے کوئی توقع نہ رکھو اور تمھاری زندگی میں تمھاری نہیں، صرف اور صرف خدا کی رضا کارفرما ہو۔ اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں میں اس طرح دے دو جیسے تم پولو کا گیند ہو اور خدا پولو کا کھلاڑی جو اپنے کھونٹے (Mallet) سے چوٹ لگا کر تمھیں جدھر اس کی مرضی ہو لڑھکا دے۔ یا تمھاری مثال غسال (لاش کو غسل دینے والے) کے ہاتھ میں مردہ لاش کی ہو یا پھر ماں کی گود میں اس کی ممتا پر پورا بھروسا کرنے والے بچے کی۔

خدا نے شیخ عبدالقادرؒ جیلانی کو نہایت فراوانی سے خوش بیانی کا جوہر عطا کیا تھا۔ آپ کی دلیلیں اور مثالیں سننے

Marfat.com

والے کے دل میں اتر جاتی تھیں۔ آپ نے اپنی اس صلاحیت کو دنیاداری اور مادہ پرستی میں ڈوبے ہوئے انسانوں کے اندر روحانی احساسات جگانے کے لیے استعمال کیا۔ آپ نے عمر بھر یہ تلقین کی کہ انسان کی حقیقی مسرت اور شادمانی کا صرف ایک ذریعہ ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی قدروں کو اپنائے۔ آپ کے بھرپور اسلامی طرز زندگی، آپ کے پیغام کی صداقت اور آپ کے اخلاص (Sincerety) کی گہرائی نے آپ کے ہمعصروں کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ کیا خاص اور کیا عام، ہر کوئی آپ کا گرویدہ ہوگیا۔ چونکہ آپ قانونِ شریعت پر سختی سے کاربند تھے اس لیے شریعت پر زور دینے اور تصوف پر تنقید کرنے والے علماء بھی آپ کی بہت عزت کرتے تھے۔

Marfat.com

پانچواں باب

برصغیر پاک و ہند کے صوفی سلسلے

ہندوستان میں تصوف کی ہندوانہ شکل تو اپنشدوں (Upanishads) سے شروع ہوتی ہے جو ویدوں کی شریعت کے مقابلے میں طریقت کا مقام رکھتے ہیں۔ اپنشد 800 سے 200 قبل از مسیح میں لکھے گئے۔ ان کے بنیادی نظریے کے مطابق انسانی روح (آتما) اور رُوحِ خداوندی (پرماتما) ایک ہی ہیں (تم وہ ہو، وہ تم ہے)۔ اپنشدوں کا پہلا فارسی ترجمہ اورنگ زیب عالمگیر کے بڑے بھائی داراشکوہ نے کیا تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلامی تصوف پر اس نظریے کی خاصی گہری چھاپ ہے۔ بے شک اسلامی تصوف نے جسے تصوف (Mysticism) کی عالمگیر تاریخ میں جداگانہ حیثیت دینے کے لیے ''صوفیت'' (Sufism) کہا جائے تو بہتر ہوگا، اپنا جواز قرآنِ حکیم کی تعلیم اور رسُولِ خدا کی سیرت اور ارشادات ہی میں ڈھونڈا لیکن اس پر دوسرے مذہبوں اور ثقافتوں کا اثر ایک فطری امر تھا۔ اسلام جزیرہ نما عرب سے نکل کر ایشیاء اور افریقہ ہی نہیں، یورپ تک جا پہنچا تھا۔ یورپ کے ایک اہم ملک سپین میں، جسے مسلمان تاریخ دان اندلس کے نام سے یاد کرتے ہیں، تقریباً پانچ سوسال تک مسلمانوں کی ایک مثالی حکومت قائم رہی۔ اس صورتِ حال میں ناممکن تھا کہ غیر مسلم قومیں اسلام اور مسلمانوں سے اور مسلمان غیر مسلم نظریات اور روایات سے متاثر نہ ہوں۔

یہ ایک جانی، پہچانی اور مانی ہوئی حقیقت ہے کہ جب 1492ء میں سپین کی مسلمان حکومت ختم ہوئی تو وہاں سے اسلامی دور میں پیدا ہونے والے علوم وفنون یورپ پہنچے اور یوں اِن علوم وفنون کی بدولت یورپ میں تحریکِ احیائے علوم (Renaissance) شروع ہوئی جس نے بالآخر یورپ کو تازہ دریافت شدہ امریکہ اور آسٹریلیا سمیت ساری دنیا کا حاکم بنا دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خود مسلمان مفکر ابتداء میں یونانی فلسفیوں، خصوصاً افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) سے متاثر ہوئے تھے۔ آج دنیائے علوم وفنون میں مسلمانوں کی زبوں حالی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے رسُولِ خدا کی یہ تلقین بھلا دی ہے کہ ''علم مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے'' اور ''علم حاصل کرنے کے لیے چین (یا کسی دور دراز ملک میں بھی) جانا پڑے تو جانا چاہیے''۔ انھیں رسُولِ خدا کی یہ قرآنی دعا زبانی تو یاد رہی لیکن عملاً بھول گئی کہ رَبِّ زِدنی علما (اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرمادے)۔ جس طرح ایک فرد سے دوسرا فرد سیکھتا آیا ہے اسی طرح ایک قوم سے دوسری قوم سیکھتی آئی ہے۔ اس لیے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ ہمارے کسی مفکر، عالم یا صوفی بزرگ پر کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے شخص یا نظریے کا سایہ پڑ گیا ہے تو زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہماری طرح اپنا دماغ بند نہیں کیا ہُوا تھا کیونکہ انھیں اپنے ایمان پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ ذہن کی تمام کھڑکیاں کھلی رکھنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتے تھے۔

Marfat.com

برصغیر میں مسلمان 711ء میں اُس وقت آئے جب محمد بن قاسم کی فوج نے پہلے سندھ اور پھر ملتان تک کا علاقہ فتح کیا۔ اُس وقت اس علاقے میں بدھ مت اور ہندو مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت تھی۔ مشہور ماہرِ مشرقیات، محترمہ اینا ماری شمل کی تحقیق کے مطابق محمد بن قاسم نے اس بدھ اور ہندو آبادی کو مسیحیوں اور یہودیوں کی طرح "اہلِ کتاب" کا مرتبہ دیا۔ اس کے اس حُسنِ سلوک کے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو اس علاقے میں اسلام نہایت تیزی سے پھیلنے لگا۔ دوسرے، بغداد کے نئے خلیفہ کو محمد بن قاسم کی مقبولیت اچھی نہ لگی چنانچہ اُسے واپس بلا کر انتہائی بدسلوکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ بلا امتیازِ مذہب و نسل ہمدردی اور کشادہ دلی سے پیش آنے والا محمد بن قاسم برصغیر کا پہلا مسلمان فاتح ہی نہیں پہلا مثالی صوفی بھی تھا۔

سندھ اور ملتان کو اب ایک ایسے پُل کی حیثیت حاصل ہوگئی جہاں سے ریاضی، فلکیات اور طِب (Medicine) جیسے ہندوستانی علوم اسلامی دنیا کے مرکزوں تک پہنچنے لگے۔ مسلمان عالم سندھ اور ملتان سے یہ علوم سیکھتے اور پھر بغداد اور دمشق جیسے شہروں تک لے جاتے۔ سندھ کی تاریخ میں جس پہلے اہم اور ممتاز صوفی کا حوالہ ملتا ہے وہ حسین ابن منصور الحلاجؒ ہیں جنھوں نے دسویں صدی عیسوی کے شروع میں سندھ، گجرات (بھارت) اور شاید کشمیر کا دورہ کیا۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ان کے طرزِ فکر نے برصغیر کے مسلمانوں پر کیا اثرات چھوڑے، بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ ان کے "انا الحق" کے اعلان کے پیچھے اپنشدوں کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے انسان اور خدا کے درمیان محبت کی جو تشریح کی وہ انھیں بہت مہنگی پڑی۔ ان کے بارے میں بغداد کی مسلمان حکومت کو یہ شبہہ بھی تھا کہ ان کے کارمیتھیوں (Karmathians) سے روابط ہیں جو اُس وقت ملتان کے حکمران تھے اور جنھیں عباسی خلفاء اپنا دشمنِ خاص قرار دیتے تھے۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ سندھ اور ملتان، اور بعد میں پنجاب میں، بلکہ بنگال اور حیدر آباد دکن میں بھی، منصور حلاجؒ کے نام نے عشقِ الٰہی کی علامت (Symbol) کے طور پر بہت شہرت پائی۔ یوں تو منصورؒ کو سارے عالمِ اسلام میں جانا پہچانا جاتا ہے لیکن شہیدِ عشق کے طور پر وہ سب سے زیادہ سندھ اور پنجاب میں مشہور ہیں۔ خصوصاً سندھی اور پنجابی زبان کی عوامی اور صوفیانہ شاعری میں، جو قوالی کی صورت میں صوفیوں کے مزاروں پر گائی جاتی ہے، وہ ایک روحانی ہیرو کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس شاعری میں ان کے قتل کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عشق تو راز کی بات ہے، منصورؒ نے یہ راز عام کر دیا اس لیے وہ سولی پر لٹکا دیئے گئے۔ برصغیر، خصوصاً پاکستان کے صوفی صفت لوگوں میں منصور کا سولی پر لٹکنا جرم نہیں، خدا کے ساتھ عشق کی معراج ہے۔ اُن کے اس انجام کا رشتہ اہلِ دِل کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ اور حضرت امام حسینؓ کے انجام سے جا ملتا ہے۔ اس سلسلے میں پنجابی شاعری کا ایک مقبولِ عام مصرع سنیے:

جنھاں نوں تانگھ سجناں دی او حق دے دار تے چڑھیاں

(جنھیں محبوب کی سچی اور گہری آرزو ہوتی ہے وہ حق کی سولی پر چڑھ جاتے ہیں)

سندھی اور پنجابی کی عوامی اور تصوف کی زبان میں عاشقانہ شاعری میں حلاجؒ کو ان کے ذاتی نام منصور سے یاد کیا

Marfat.com

جاتا ہے اور اُن کے سولی پر لٹک جانے کو شادی کے موقع پر محبوب کی سیج پر اُس کے ساتھ ہم آغوش ہونے کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تصور تصوف کی اُس عالمگیر روایت سے ہم آہنگ ہے جس کے مطابق موت وہ پُل ہے جو عاشقِ صادق کو محبوب سے ملا دیتا ہے۔ یہ تصور خود حلاج کے اپنے جذبۂ دل کا بھی عکاس ہے۔ حلاج اکثر فرماتے تھے: اِقتلونی یا ثقاتی...... ''اے میرے قابلِ اعتماد دوستو، مجھے قتل کر دو کیونکہ میری موت ہی میں میری زندگی ہے''۔

حلاجؒ نے سندھ اور پنجاب میں عشقِ الٰہی کے جو بیج بوئے تھے وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمستؒ، شہباز قلندرؒ، شاہ حسینؒ، خواجہ فریدؒ، بلھے شاہؒ اور سلطان باہوؒ جیسے پیرانِ طریقت اور صوفی شاعروں کی صورت میں رنگ لائے۔ لیکن پہلے اس دھرتی پر غزنہ کے علاقے ہجویر سے وارد ہونے والے اور پھر یہیں کے ہو رہنے والے ابوالحسن علی الہجویریؒ (پیدائش 1009ء، وفات 1071ء) کا تذکرہ مناسب ہوگا جو محمود غزنوی کی فتوحات کے آس پاس پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں تشریف لائے اور ''گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا...... ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہ نما'' کا مقام و مرتبہ پایا۔ کاملوں کے لیے راہنما ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ گو داتا صاحب کے اپنے نام سے کوئی صوفی سلسلہ نہیں چلا لیکن برصغیر کے ایک مقبول ترین صوفی سلسلے: چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کے مزار پر چالیس روز تک چلہ کشی (Highly Concentrated Meditation) کی۔ آج بھی وہ مقام جہاں خواجہ صاحبؒ چلہ کش رہے بڑے اہتمام سے محفوظ کیا ہُوا ملتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ پورے برصغیر ہی میں نہیں، پورے عالمِ اسلام میں اپنی بزرگی کے علاوہ اپنی زندۂ جاوید تصنیف: کشف المحجوب لِارباب القلوب (اہلِ دل کے لیے اس حقیقت کا انکشاف جو حجابوں یا پردوں میں چھپی ہے) کی وجہ سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ گو داتا صاحبؒ نے منصور حلاجؒ کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جو کھو گئی لیکن کشف المحجوب فارسی زبان میں اسلامی تصوف کے بنیادی اصولوں اور اس وقت تک کے تمام ممتاز صوفی سلسلوں اور ان کے چیدہ چیدہ رہنماؤں کا پہلا مفصل اور تجزیاتی تذکرہ ہے۔ اہلِ لاہور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ ''داتا نگری'' کے رہنے والے ہیں۔ صدیوں تک یہ رسم جاری رہی کہ جو صوفی بزرگ بھی شمال مغرب سے برصغیر میں داخل ہُوا اُس نے پہلے داتا صاحب کے مزار پر حاضری دی تاکہ آپ کی ''اجازت'' یا خوشنودی سے وہ کسی خاص مقام پر جاگزیں ہو کر خلقِ خدا کی روحانی رہنمائی کر سکے۔ یہ روایت پاکستان کی سیاست میں بھی در آئی ہے، نئے حکمران بھی داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دینے کا اہتمام کرتے ہیں۔

داتا صاحبؒ سے پہلے بھی کئی صوفی برصغیر میں تشریف لا چکے تھے۔ خود آپ ہی کے مرشد محمد ابن الحسن ختلیؒ نے جو جنید بغدادیؒ کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے اپنے ایک مرید حسین زنجانیؒ کو لاہور بھیج رکھا تھا۔ غلط یا صحیح، کہا جاتا ہے کہ 1035ء میں جس روز داتا صاحبؒ لاہور وارد ہوئے، حسین زنجانیؒ اسی روز فوت ہو گئے۔ اسی طرح راوی روڈ پر داتا صاحبؒ کے مزار سے قریب ہی حضرت عزیز الدینؒ، پیر مکی کا مزار ہے۔ وہ بھی داتا صاحب کی لاہور تشریف آوری سے

پہلے یہاں آ چکے تھے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ داتا صاحبؒ کی آمد سے پہلے برصغیر میں مقیم صوفیوں کے قول و فعل میں نہ صرف اختلاف بلکہ انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ کچھ صوفی ہندوانہ روایات سے بے حد متاثر ہو چکے تھے۔ کچھ یہ کہتے تھے کہ بقا کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا میں اور خدا انسان میں باقی رہتا ہے۔ لاہور میں آباد کچھ صوفی معرفت اور وحی میں فرق نہیں کرتے تھے یا دوسرے لفظوں میں وہ اپنے کشف والہام کو وحی کا درجہ دیتے تھے۔ کچھ صوفی، ولیوں کو پیغمبروں سے برتر قرار دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ولی کو خدا مل جائے تو پھر وہ اُسی کا ہو رہتا ہے اور پیغمبر کو خدا مل جائے تو وہ واپس دنیا میں آ کر دنیا کے دھندوں میں پڑ جاتا ہے۔

داتا صاحبؒ چونکہ جنیدؒ کے طرزِ فکر و عمل کے قائل تھے جس کے مطابق اہلِ طریقت کے لیے احکام شریعت کی مکمل پیروی ضروری ہے، اس لیے انھیں صوفیوں کو قرآنِ حکیم کی تعلیم اور رسولِ خدا کے نقشِ قدم پر واپس لانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی۔ وہ انھی معنوں میں ''ناقصاں را پیر کامل اور کاملاں را رہ نما'' تھے۔ اس جدوجہد میں ان کی تصنیف ''کشف المحجوب'' نے بہت اہم کردار ادا کیا جس میں انھوں نے تصوف کے مقاصد، اس کی تاریخ اور اس کے اصولوں کو ایسے دل نشین انداز سے واضح کیا کہ اس کی بدولت نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ ایران اور وسط ایشیا (Central Asia) میں بھی صوفی سلسلوں کو راہِ اعتدال پر لانے میں بہت مدد ملی۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک کہانی سن لیجیے۔ جس طرح رسولِ خدا مکے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے اور آپؐ نے فیصلہ کیا کہ آپ اُس جگہ اور اُس شخص کے یہاں قیام فرمائیں گے جس کے گھر کے سامنے آپ کی اونٹنی جا رُکے گی اسی طرح ایران میں شیراز اور خلیج فارس کے درمیان کزرون میں مقیم شیخ ابوالاسحاق ابراہیم ابن شہریارؒ نے اپنے بھتیجے شیخ صفی الدینؒ کو حکم دیا کہ وہ ایک اونٹنی پر سوار ہو جائیں اور اونٹنی انھیں جہاں بھی لے جا کر آگے جانے سے انکار کر دے آپ وہیں ڈیرا ڈال دیں۔

شیخ صفی الدینؒ کی اونٹنی انھیں پاکستان کے ضلع رحیم یار خان کے شہر ''اُچ'' تک لے آئی اور وہیں رُک گئی۔ آپ نے وہاں اپنی خانقاہ بنائی اور وہیں وفات پائی۔ اُچ آپ کی وجہ سے اب اُچ شریف کہلاتا ہے۔ آپ کو اپنے علاقے میں اس قدر عزت حاصل تھی کہ پورے پنجاب میں ''اُچ دا پیر'' ایک محاورہ بن گیا جو کسی شخص کے ممتاز سماجی مرتبے کی علامت کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مثلاً جب کوئی شخص بلا جواز یہ چاہے کہ اُس کی خصوصی عزت کی جائے تو اس کے مطالبے کو چیلنج کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ تم کون سے ''اُچ کے پیر'' ہو کہ ہم تمھاری عزت کریں۔

شیخ صفی الدینؒ (اُچ شریف) کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ قریب قریب انھی دنوں میں برصغیر میں آئے جب داتا صاحبؒ لاہور پہنچے۔

Marfat.com

سہروردیہ سلسلۂ تصوف

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سہروردیہ سلسلۂ تصوف کے بانی شیخ شہاب الدین عمرؒ (پیدائش: 1145ء، وفات: 1234ء) اوران کی کتاب ''عوارف المعارف'' کا ذکر بھی آجائے جو برصغیر میں مقبولیت اوراثر انگیزی کے اعتبار سے داتا گنج بخشؒ کی تصنیف: کشف المحجوب کی ہم پلہ سمجھی جاتی ہے۔ شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ کو عباسی خلیفہ ناصرالدین اللہ نے اپنے عہد کی اہم حکومتوں کے لیے اپنا سفیر مقرر کر رکھا تھا۔ اس نے شیخ عمر سہروردیؒ کے لیے بغداد میں ایک عالیشان خانقاہ بھی تعمیر کرائی تھی جس میں آرام دہ حمام (غسل خانے) اور دلکش باغات بنائے گئے تھے۔ دُنیا بھر سے صوفی حضرات وہاں پہنچتے، قیام کرتے اور شیخ سہروردیؒ سے فیض حاصل کرتے۔

برصغیر کے حوالے سے یہ تفصیلات اس لیے ضروری ہیں کہ ایک تو سہروردیہ سلسلہ یہاں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرے، ملتان شہر میں مدفون مشہور صوفی بزرگ شیخ بہاءُالدین زکریاؒ بھی مختلف اسلامی مرکزوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بالآخر حصولِ فیض کے لیے شیخ عمر سہروردیؒ ہی کی خانقاہ پر حاضر ہوئے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ صرف سترہ (17) دن زیرِ تربیت رہے اور شیخ عمر سہروردیؒ نے آپ کو اپنی خلافت عطا کردی۔ یہ بات شیخؒ کے دیرینہ مریدوں اور طالب علموں کو بہت ناگوار گزری۔ اس پر شیخؒ نے فرمایا، ''جب تم لوگ میرے پاس آئے تھے تو تمھاری حیثیت درخت کی سبز شاخوں کی تھی جو آگ نہیں پکڑتیں۔ لیکن جب بہاءالدینؒ میرے پاس آیا تو وہ سوکھی لکڑی کی طرح تھا جس نے ایک ہی پھونک میں آگ پکڑ لی''۔

بہاءُالدین زکریاؒ 1182ء میں ملتان کے قریبی قصبے ''کوٹ کروڑ'' میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ حصولِ تعلیم اور حصولِ فیض کے بعد آپ ملتان واپس تشریف لے آئے۔ یہاں آپ کو ممتاز علماء کے علاوہ معزز صوفیاء کی مخالفت درپیش آئی لیکن آپ کے علم وفضل کے علاوہ شیخ عمر سہروردیؒ کے مریدوں میں خصوصی مقام نے آپ کو ملتان کی معتبر ترین ہستی بنادیا۔ عراق اور خراسان سے تجارت پیشہ لوگ ملتان آتے تو بڑی تعداد میں آپ کے پاس حاضر ہوکر آداب بجالاتے۔ آپ نے اپنے مرشد شیخ عمر سہروردیؒ کی خانقاہ کی طرح ملتان میں ایک بہت بڑی خانقاہ بنوائی۔ آپ کو اس علاقے میں اتنا اہم سماجی مرتبہ حاصل تھا کہ آپ نے ملتان کے حاکم قباچہ کی کھلم کھلا مخالفت اور دِلّی کے سلطان التتمش کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی یہاں تک کہ التتمش نے 1236ء میں ملتان پر قبضہ کرلیا۔ جب منگولوں نے ملتان پر بار بار چڑھائی کی اور وہاں کے عوام کی جان عذاب میں آگئی تو یہ شیخ بہاءُالدین زکریاؒ کی نیک نامی ہی تھی جس کی بدولت منگول حملہ آوروں کے ساتھ کامیاب مذاکرات ہوسکے۔

بہاءُالدین زکریاؒ صوفیوں کو تلقین کرتے تھے کہ وہ متعدد پیروں کی درگاہوں پر حاضری دینے کے بجائے کسی ایک چوکھٹ کے ہوجائیں۔ وہ یہ بھی زور دیتے تھے کہ ذِکر اور نوافل سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فرض نمازیں ادا کی

Marfat.com

جائیں۔فرض نمازوں کی قیمت پر ذکر اور نوافل کافی نہیں ہوتے۔وہ فاقہ کشی جیسی سخت ریاضت سے بھی منع کرتے تھے۔ آپ نے 1262ء میں ملتان ہی میں وفات پائی اور آپ کا مزار آج تک ہر خاص و عام کے لیے باعثِ کشش ہے۔اب آپ ہی کے نام پر ملتان میں بہاءُالدین زکریا یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔آپ کی وفات کے بعد آپ کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح نے آپ کی شہرت میں مزید اضافہ کیا، جو پہلے ہی برصغیر سے باہر شام، عراق اور ترکی تک پھیلی ہوئی تھی اور آپ کی سیاسی، سماجی اور روحانی شان کو از سرِ نو بحال کر دیا۔

علاءُالدین خلجی سے محمد بن تغلق تک، دِلّی کے تمام سلاطین نے شیخ رُکن الدینؒ کا بے حد احترام کیا۔جب آپ سلطانِ دہلی سے ملنے روانہ ہوتے تو تمام تر سفر کے دوران عوام سلطان کے نام درخواستیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے جاتے۔شیخ رکن الدینؒ کے احترام کے باعث سلطان ہر درخواست کو بغور پڑھتا اور عوام کی دادرسی کرتا۔آپ کا شہرہ اسکندریہ (ترکی) تک جا پہنچا تو مشہور سیاح ابنِ بطوطہ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ آپ سے ضرور ملے۔آپ کے نزدیک صوفیوں کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ بے مال و زر ہوں ورنہ انھیں زندہ رہنے کے لیے کسی نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑ جاتا ہے۔ آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ روحانی بالیدگی کے لیے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

سہروردی بزرگوں میں سفر کا بہت ذوق و شوق پایا جاتا تھا۔مخدوم جہانیاںؒ کا نام ان کے لقب ''جہاں گشت'' ہی کی پنجابی شکل ہے۔اس سلسلے کے ایک بزرگ شیخ جمالیؒ نے عرب کے علاوہ ایران اور عراق کا سفر بھی کیا یہاں تک کہ آپ افریقہ کے مسلمان ملکوں تک بھی جا پہنچے، جنھیں تاریخ اسلام میں ''مغرب'' کہا جاتا ہے۔شیخ جمالیؒ نے اپنے لمبے سفر کے دوران جمع کردہ معلومات کی بناء پر ''سیار العارفین'' کے عنوان سے چشتی اور سہروردی بزرگوں کا ایک جامع تذکرہ بھی مرتب کیا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے صوفیائے کرام میں عموماً اور سہروردی بزرگوں میں خصوصاً ایک روایت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ روایت آج تک پورے اہتمام سے زندہ چلی آ رہی ہے۔جس طرح مغل بادشاہوں نے اپنے نام کے ساتھ ''جہانگیر''، ''شاہجہان'' اور ''عالمگیر'' جیسے القابات کا اضافہ کر رکھا تھا اسی طرح صوفی بزرگوں نے خود یا ان کے نیاز مندوں نے ان کے ناموں کے ساتھ ہو بہو بادشاہوں جیسے القابات شامل کر دیئے تھے۔مخدوم جہانیاںؒ کے ایک پوتے کو جو بھارتی شہر احمد آباد میں جا بسے تھے، ''قطب عالم'' کہا جاتا تھا اور جب وہ 1453ء میں فوت ہوئے تو ان کے بیٹے ''شاہِ عالم'' کہلائے۔پاکستان کے مشہور (اور ایک حلقے میں متنازعہ) تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب ''مغل دربار'' میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ جس طرح مادّی دنیا میں اقتدار کے خواہش مندوں نے اپنے لیے اونچے سے اونچے القابات طے کر رکھے تھے، اسی طرح تصوف کی دنیا میں صوفیاء نے بھی ''مقامات'' کے عنوان سے اپنا دربار سجا رکھا تھا۔صوفیاء کے اس رویے نے عوام میں یہ تصور عام کر دیا ہے کہ مادی، سیاسی یا سماجی مرتبوں کا تعین دراصل روحانی دنیا میں اونچا مقام رکھنے والے بزرگ کرتے ہیں۔روحانی مقامات کے حوالے سے اقبالؒ نے بھی صوفیوں کی اس روایت پر خاصی

Marfat.com

شوخ تنقید کی ہے:

تمدن ، تصوف ، شریعت ، کلام
بتانِ عجم کے پُجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا ، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

سہروردی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ ابوالنجیب کے مریدوں کے مرید شیخ نجم الدین کُبریٰؒ نے کُبراوی سلسلۂ تصوف کی بنیاد رکھی جس کی ایک شاخ ''فردوسی'' نے برصغیر میں قدم جمائے۔ فردوسی سلسلے کو خواجہ نجیب الدین خلیفہؒ نے چار چاند لگائے۔ وہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ محمد بن تغلق کے عہد میں صوبہ بہار کے شہر پٹنہ کے قریب آباد رہے۔ انھوں نے بہار اور بنگال میں اسلام کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی تعلیمات آپ کے اُن خطوط میں محفوظ ہیں جو آپ نے اپنے صوفی اور عالم مریدوں کو لکھے۔ وہ اکثر حکومتی اہلکاروں بلکہ خود فیروز تغلق کو بھی خط لکھتے رہتے تھے۔ آپ کے ملفوظات سے آپ کی روحانی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ قرآنی آیات، احادیث، کہانیوں، اور کہاوتوں کے علاوہ مستند اور محترم صوفیاء کے واقعاتِ زندگی کی مدد سے آپ نے اسلام کے مذہبی اور روحانی فرائض کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی انفرادی سطح پر سماجی اور اخلاقی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالی۔ آپ خاص طور پر قرآنِ حکیم کی مشہور آیت: لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ (خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہُوا کرو) کے حوالے سے فرماتے تھے کہ مایوسی کی گہری جڑوں اور نا امیدی کی ہری شاخوں کا خدا کی رحمت نے خاتمہ کر دیا ہے۔ آپ کی تلقین تھی کہ معرفت (روحانی علم) دراصل محبت کا بیج ہے۔ جو لوگ معرفت کے پانیوں میں گہرے اتر جاتے ہیں انھیں خدا کی رحمت اور محبت اپنے بازوؤں میں لے لیتی ہے اور وہ محبوب کے دیدار سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور عزت بھی پاتے ہیں۔

اگرچہ خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ اپنے مریدوں کو شرع کی پابندی کرنے کی تاکید کرتے تھے لیکن انھوں نے کبھی کھلم کھلا یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ علماء کو صوفیاء پر فوقیت حاصل ہے۔ انھیں اس بات کا بہت رنج تھا کہ سلطان فیروز تغلق نے علماء کے کہنے پر شیخ عزّ کاکوی اور شیخ احمد بہاری جیسے مجذوب صوفیوں کو قتل کروا دیا تھا۔ اگر مخدوم جہانیاںؒ بروقت مداخلت نہ

Marfat.com

کرتے تو شاید خواجہ نجیب الدین فردوسیؒ بھی اسی انجام کو پہنچتے۔ مگر پھر بہار اور بنگال میں اسلام کی تاریخ بھی بدل جاتی۔

کبرادیہ سلسلے کو کشمیر میں میر سید علی ہمدانیؒ نے متعارف کرایا۔ اگر چہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح وحدت الشہود کے قائل نہیں تھے لیکن ان کی طرح اسلام کی اشاعت اور سماجی ذمہ داریوں کو دل وجان سے نباتے تھے۔ وہ 1381ء کو ایک بڑے جتھے کے ساتھ سری نگر پہنچے۔ اشاعت اسلام کے جوش میں انھوں نے کئی مندر گرا دیے اور بہت سے ہندوؤں کو بزور مسلمان بنالیا۔ میر علی ہمدانیؒ نے تقریباً 170 کتابچے تصنیف کیے جن میں سے 50 کے قریب محفوظ رہ سکے ہیں۔ انھوں نے ابن عربیؒ کی کتاب ''فصوص الحکم'' کا فارسی ترجمہ کیا اور ایک سیاسی کتاب ذخیرۃ الملوک (بادشاہوں کا زادِراہ) بھی لکھی۔ اسلامی اخلاقیات اور روحانیت کے بارے میں انھوں نے جس فصیح اور پرزور انداز میں دلائل دیے ہیں وہ قابلِ ذکر ہیں۔ وحدت الوجود کے تصور کو انھوں نے ''انسانِ کامل کی حقیقت'' کے حوالے سے بیان کیا ہے جسے انھوں نے ''حقیقتِ محمدیہؐ'' قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک رسولِ خدا کی ذات میں وجود کی تمام صفات ایک وحدت کی صورت میں جمع ہوگئی ہیں۔ میر علی ہمدانیؒ یقین رکھتے تھے کہ وہ روحانی شخصیت جو اپنی دُنیوی زندگی یا حیاتِ ارضی سے بے نیاز ہو کر توحید (Oneness of Reality) کے سمندر میں غوطہ زن ہو جائے اور فضائے نُور میں اڑنے لگے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مافوق الفطرت ہو جاتی ہے۔ پھر وہ چاہے تو دُنیا کے معاملات میں دلچسپی لے اور چاہے تو نہ لے۔ لیکن کچھ مافوق الفطرت ہستیاں روحانی جواں مردی (فتوت) کے تقاضوں کے تحت مخلوقِ خدا کے دُکھ درد مٹانے کی خاطر خاک نشینوں کے درمیان رہنا پسند کرتی ہیں۔

یہاں ایک تاریخی عمل کی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔

انسان کے لیے بہت آسان ہے کہ وہ ہر برائی اور بدی کا الزام اپنے مخالف پر تھوپ دے۔ ہندو مسلم فسادات ہوں یا شیعہ سنی فسادات، زیادتی ہماری کبھی نہیں ہوتی، ہمیشہ ہمارے مخالف ہی کی ہوتی ہے۔ بھارت میں بابری مسجد شہید کردی جائے تو کیا بھارتی اور کیا پاکستانی، تمام مسلمانوں کا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور ہم بجا طور پر اس کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ لیکن ہم اگر دُنیا میں باعزت امن اور خود اپنی صفوں میں اتحاد چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماضی اور حال کے رویوں پر بھی دیانتدارانہ اور منصفانہ نظر ڈالنی ہوگی۔ جب تک ہم تاریخ کا قرض نہیں چکاتے، وہ ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیتی اور ہم اس کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ نہ ہم فرشتے تھے اور نہ ہمارے مخالف۔ ہم اپنے مخالفوں کی تقدیر تو نہیں بدل سکتے لیکن اپنے سابقہ اور حالیہ رویوں کا معروضی جائزہ لے کر اور ان کی اصلاح کر کے اپنا مقدر ضرور بدل سکتے ہیں۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ جانبداری کا اظہار زیادہ تر علماء ہی کرتے ہیں اور ان کے برعکس صوفیاء مذہبی طور پر کشادہ دل اور فرقہ واریت سے پاک ہوتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں، اور اگلے صفحات میں مزید دیکھیں گے کہ بعض صوفیاء نے بھی مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ جانبداری کا مظاہرہ کیا۔ لوگوں کو یہ تو یاد ہے کہ

Marfat.com

محمود غزنوی نے سومنات کا مندر ڈھایا تھا لیکن انھیں یہ یاد نہیں کہ شاہ ہمدان نے کشمیر میں یہی کچھ کیا تھا۔ تاریخ کے طالب علم یہ بھی جانتے ہیں کہ جب ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہ ایران چلا گیا اور پھر ایران کی عملی مدد سے دوبارہ اپنا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہُوا۔ یہ فطری بات تھی کہ اب اس کے دربار میں ایران سے آنے والے شیعہ امراء اور علماء کو کاروبارِ سلطنت میں زیادہ رسوخ حاصل ہو جاتا۔ اس صورتِ حال سے سُنّی امراء اور علماء کو بہت پریشانی لاحق ہوئی۔ اکبرِ اعظم کے دور میں اس پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ اب شیعہ اثر و رسوخ میں ہندو اثر و رسوخ بھی شامل ہو گیا۔ اوپر سے اکبر نے دینِ الٰہی کا شوشہ کھڑا کر دیا۔ یہ بھی جانی پہچانی بات ہے کہ اکبر کا جانشین جہانگیر اس کی ایک ہندو بیوی کی اولاد تھا اور جہانگیر کی ایرانی نژاد شیعہ بیوی ''نور جہاں'' کو جہانگیر کے عہد میں خصوصی عمل دخل حاصل تھا۔ یاد رہے کہ شاہجہان کی چہیتی ملکہ (تاج محل کی وجہِ تخلیق) ممتاز محل، نور جہاں کے بھائی آصف الدولہ کی بیٹی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اب سُنّی امراء اور علماء کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی، جنھیں سُنّی علماء کی کھلی اور سُنّی امراء کی در پردہ تائید حاصل تھی بغاوت کا علم بلند کر دیتے ہیں اور جہانگیر انھیں قید میں ڈال دیتا ہے۔ یہ کشمکش بالآخر شاہجہان کے وارثوں تک پہنچتے پہنچتے اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ سُنّی علماء اور امراء کا نمائندہ شہزادہ محی الدین اورنگ زیب اپنے معتدل مزاج اور صاحب ذوق باپ، شاہجہان کو قید کر دیتا ہے اور اکبرِ اعظم کی طرح ہندو مسلم یکجہتی کے قائل اور وحدت الوجود کو ماننے والے صوفی بزرگ میاں میرؒ کے مرید، اپنے بھائی شہزادہ داراشکوہ کو قتل کر ڈالتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی صورت میں سُنّی امراء اور علماء کو کُھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ برداشت، قبولیت اور رواداری جیسی قدریں پیچھے چلی جاتی ہیں، ہندو اور شیعہ دوسرے درجے کے شہری بن جاتے ہیں اور یوں مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔

یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ جو چپقلش امراء اور علماء کے درمیان چلی آ رہی تھی، اکثر صوفیاء بھی اُس میں ملوث رہے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سید علی ہمدانیؒ کشمیر چھوڑ کر واپس ایران چلے گئے تو ان کے فرزند میر سید محمد کشمیر منتقل ہو گئے۔ سلطان سکندر ان کا مرید ہو گیا اور اس کا برہمن وزیر سُوہا بھٹہ، میر صاحب کے ہاتھوں مسلمان ہو گیا۔ تب ہندوؤں کے متعدد قدیم اور مقدس مندر ڈھا دیے گئے۔ چنانچہ سلطان سکندر کو بُت شکن کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اب پہلی مرتبہ کشمیر میں زاہدانہ اور جانبدارانہ قوانین نافذ کر دیے گئے۔ بد اچھا، بدنام بُرا...... نتیجہ یہ نکلا کہ ناکردہ گناہوں کا الزام بھی کُبراوی بزرگوں کے سر لگ گیا۔ اِن ایرانی نژاد کبراوی سیدوں کے زیرِ اثر کشمیری مسلمانوں میں حضرت علیؓ بن ابی طالب اور آپؓ کے اہلِ بیت کے لیے خصوصی محبت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بعد میں یہ محبت اثناء عشری شیعیت میں بدل گئی جس کی مخالفت سہروردی اور نقشبندی صوفیاء نے کی لیکن کبراوی بزرگوں، خصوصاً میر سید علی ہمدانی کی تلقین کے مطابق، کشمیری مسلمانوں میں حضرت علیؓ بن ابی طالب کے ایک مرید کُمیل ابن زیاد کی اچھی خاصی طویل ''دعائے کمیل'' کا ورد آج بھی مقبول ہے۔

Marfat.com

میر سید علی ہمدانی کا ذکر ہو رہا ہے تو ایک کہانی بھی سُن لیجیے جسے اُردو کے ایک باکمال (لیکن زیادہ تر نظر انداز شدہ) شاعر جعفر طاہر نے اپنے ایک کینٹو (Canto): ''للہ عارفہ'' میں بیان کیا ہے۔ للہ ایک ہندو خاتون ہے۔ اس کی ساس اسے بے انتہا ستاتی ہے اور للہ جب بھی اپنے بزدل شوہر سے اس بدسلوکی کا ذکر کرتی ہے تو وہ جانتے بوجھتے ہوئے چُپ سادھ لیتا ہے اور اسے اپنی ماں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ رشتہ داروں اور شہرداروں کا بھی یہی رویہ ہے۔ آخر للہ تن کے سارے کپڑے اتار کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ گھر والے اس کی اس حرکت پر مزید ناراض ہو جاتے ہیں۔ جب کبھی لوگ بازاروں میں برہنہ پھرتی ہوئی اس خوبصورت خاتون کو پکڑ دھکڑ کر گھر پہنچاتے ہیں تو گھر والے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ نہ للہ وہاں جانا چاہتی ہے، نہ وہ اُسے واپس لینے کو تیار ہیں۔ للہ انسان کی سفاکی اور شہر کی بے حسی کا خاموش لیکن برہنہ ماتم کرتی ہوئی دن گزار رہی ہے۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا دیتا ہے تو لے لیتی لیکن کوئی اسے کپڑا یا چادر دینے کی کوشش کرتا ہے تو صاف انکار کر دیتی ہے اور بہ آواز بلند کہتی ہے، ''جب میرے گھر میں اور اس شہر میں کوئی مرد ہی نہیں تو میں کس کے لیے ستر ڈھانپوں''۔

اور پھر ایک دن اعلان ہوتا ہے کہ میر سید علی ہمدانیؒ کا (جنھیں کشمیر میں شاہ ہمدان کہا جاتا تھا) جلوس آرہا ہے تو اچانک للہ چیخ چیخ کر لوگوں سے التجا کرنے لگتی ہے کہ خدا کے لیے کوئی مجھے ایک چادر دے دے کیونکہ آج شہر میں ایک مرد آرہا ہے، ایک جواں مرد آرہا ہے۔ لوگ اس کی فریاد پر کوئی توجہ نہیں دیتے کیونکہ وہ بار بار دیکھ چکے ہیں کہ للہ نے تو کبھی کپڑا لتا قبول ہی نہیں کیا۔ جب شاہ ہمدانؒ کی سواری قریب آجاتی ہے اور للہ کو ستر ڈھانپنے کے لیے کچھ بھی میسر نہیں آتا تو وہ یہ کہتے ہوئے کہ ''ایک مرد آرہا ہے، ایک جواں مرد آرہا ہے، مجھے چھپالو، مجھے چھپالو'' اپنا ستر ڈھانپنے کے لیے ایک نانبائی کے دہکتے ہوئے تنور میں اُتر جاتی ہے اور جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ یہ راکھ ان سفاک افراد اور بے حس معاشروں کے ماتھے پر لگے ہوئے کلنک کے ٹیکے کی صورت میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہے جو عورت کو اس کے جائز حقوق دینے اور اس کی عزت کرنے کے روادار نہیں۔

چشتیہ سلسلۂ تصوف

سہروردیہ سلسلے کے ساتھ ساتھ برصغیر میں چشتیہ سلسلۂ تصوف بھی پروان چڑھتا رہا۔ یہ سلسلہ اپنے مقامِ قیام ''چشت'' کے حوالے سے چشتیہ کہلاتا ہے۔ چشت موجودہ افغانستان میں ہرات سے ایک سو کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ اسے شہرت حضرت خواجہ معین الدین محمد چشتیؒ کی ذات بابرکات سے ملی جو 1142ء کو سیستان میں پیدا اور 1236ء کو برصغیر میں 94 برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ بھارت کے شہر اجمیر میں آپ کا مزار، کیا ہندو، سکھ اور کیا مسلمان، عوام الناس سے آج بھی کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔

چشتیہ سلسلہ اپنا تعلق حضرت علیؓ کے مرید حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے ملاتا ہے۔ اس سلسلے کو شہرت دوام صرف

Marfat.com

برصغیر ہی میں ملی۔ اس کی وہ شاخیں جو خراسان اور وسط ایشیا میں قائم ہوئی تھیں آگے نہ چل سکیں۔ اس سلسلے میں زاہدانہ عبادات، اپنے مرشد کی غلامانہ اطاعت، اپنی مذمت اور خلقِ خدا کی خدمت کی روایات بہت اہم ہیں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ 15 سال کی عمر میں اپنے دور کے عظیم چشتی بزرگ خواجہ عثمان ہارونیؒ کے مرید ہو گئے۔ بیس سال تک آپ اپنے مرشد کے ہمراہ سفر پر رہے۔ اس کے بعد خود بغداد گئے اور وہاں قادریہ سلسلے کے بانی حضرت عبدالقادرؒ جیلانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر عراق سے ایران پہنچے اور 52 سال کی عمر میں واپس افغانستان آئے جہاں غزنی کے مقام پر آپ کی اپنے مرشد عثمان ہارونیؒ سے دوبارہ ملاقات ہوئی جنھوں نے آپ کو برصغیر جانے کی تلقین کی جہاں اس وقت تک تصوف نے پنجاب اور سندھ میں خاصی جڑیں پکڑ لی تھیں۔ چنانچہ آپ غزنی سے لاہور آئے، داتا گنج بخشؒ کے دربار پر چلہ کشی کی اور پھر دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بے شمار کرامات مشہور ہیں لیکن اس کتاب کے مقصد کو سامنے رکھیں تو آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ہندو تہذیب پر لعنت اور نحوست کے طور پر چھائی ہوئی چھوت چھات (Untouchability) کے خلاف زبردست جہاد کیا۔ تلوار سے نہیں، اپنے کردار سے انھوں نے اجمیر میں ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ کیا امیر اور کیا غریب، کیا برہمن اور کیا شودر سب کے سب آپ کی درگاہ میں ایک ساتھ کھاتے پیتے اور اٹھتے بیٹھتے نظر آئے۔

آپ نے روحانی ترقی کے مندرجہ ذیل اصول اور ضابطے مقرر کیے:

(1) دولت جمع نہیں کرنی چاہیے۔

(2) کسی سے روپیہ قرض نہیں لینا چاہیے۔

(3) بے شک ہفتے بھر کا فاقہ ہو جائے لیکن نہ تو کسی سے اس کا ذکر کرنا چاہیے اور نہ ہی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔

(4) اگر لوگ از خود آپ کے پاس خوراک، روپیہ پیسہ، کپڑا یا اناج چھوڑ جائیں تو اپنی ضرورت کے مطابق اپنے پاس رکھ کر، اگلا دن چڑھنے سے پہلے پہلے، اسے دوسرے حاجت مندوں تک پہنچا دینا چاہیے۔

(5) کسی کو بددعا نہیں دینی چاہیے۔ اگر کسی کے ہاتھوں آپ کو بہت تکلیف یا نقصان پہنچ جائے تو خداوند کریم سے التجا کرنی چاہیے کہ وہ آپ کے اس مخالف یا دشمن کو راہِ راست پر ڈال دے۔

(6) اگر آپ کے اپنے کسی قول یا فعل سے کوئی نیکی وجود میں آ جائے تو اسے اپنے مرشد کی مہربانی یا رسولِ خداؐ کی شفاعت یا پھر خداوند کریم کی کرم نوازی قرار دینا چاہیے۔

(7) اگر آپ سے کوئی بُرا کام سرزد ہو جائے تو کسی دوسرے کے بجائے اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھنا

Marfat.com

چاہیے اور ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ آپ آئندہ نہ صرف اس غلطی سے بچیں بلکہ کوئی بھی ایسا کام نہ کریں جس سے خدا ناراض ہو۔

(8) آپ کو دن بھر کا روزہ رکھنا چاہیے اور رات بھر عبادت کرنی چاہیے۔

(9) آپ کو فالتو باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ خاموش رہنا بہتر ہے لیکن جب آپ سے کوئی کچھ پوچھے تو حسب ضرورت بولنا بھی ضروری ہے۔ نہ چپ سادھو، نہ بولتے چلے جاؤ۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مشہور ترین مریدوں میں قطب الدین بختیار کاکی کا نام نمایاں ہے۔ بختیار کاکیؒ نے خواجہ صاحبؒ سے بغداد میں اُس وقت رشتہ جوڑا جب آپؒ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ یاد رہے کہ اُس وقت وہاں غوث الاعظم شیخ عبدالقادرؒ جیلانی (بانی سلسلۂ قادریہ) اور شہاب الدین عمر سہروردیؒ (بانی سلسلۂ سہروردیہ) جیسے نامور بزرگ موجود تھے۔ طویل سفر کے بعد بختیار کاکیؒ دہلی پہنچے جہاں آپ نے زبردست مقبولیت حاصل کی۔ چشتیہ سلسلے میں سماع (روحانی موسیقی اور ''حال'' کی کیفیت میں والہانہ رقص) پر خصوصی زور دیا جاتا ہے چنانچہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ پر قوالوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس وقت کے علماء نے سلطان شمس الدین التمش پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ آپ کی محفلِ سماع بند کرا دے لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ بختیار کاکیؒ کی وفات سماع کی ایک محفل کے دوران، سرمستی کی حالت میں ہوئی جو فارسی کے اس شعر سے پیدا ہوئی تھی:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

(تسلیم و رضا کے خنجر سے مر جانے والے ہر لحظہ عالمِ غیب سے حیاتِ نو پاتے ہیں)

دہلی میں آپ کے مزار پر آج بھی ''تسلیم'' کا سکوت چھایا رہتا ہے۔ بختیار کاکیؒ کی شمع، تسلیم کی نذر ہوئی تو آپ کے خلیفۂ خاص (Successor) فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کا چراغ روشن ہُوا۔ آپ کا مزار پاکستانی پنجاب کے شہر پاک پتن میں ہے اور عوام آپ کو بابا فریدؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ 1175ء میں ملتان کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پاک باز والدۂ محترمہ نے بچپن ہی سے آپ کو روحانی ذوق عطا کر دیا تھا۔ بختیار کاکیؒ کی بیعت کرنے کے بعد آپ نے انتہائی شدید نوعیت کی روحانی مشقیں یا مجاہدے کرنے شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ آپ چالیس شب و روز تک ایک کنویں میں سر کے بل اُلٹک کر ذکر کرتے رہے۔ چشتیہ سلسلے میں اس مجاہدے کو چلۂ معکوس (الٹا چلہ۔ چلہ کا مطلب ہے چالیس روزہ مجاہدہ) کہتے ہیں۔ آپ عربی، فارسی اور مقامی زبان پنجابی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ آپ کے کئی شعر سکھوں کی مقدس کتاب: ''گرنتھ صاحب'' میں بھی شامل ہیں۔ آپ نے 17 اکتوبر 1265ء میں وفات پائی۔

بابا فرید گنج شکرؒ کے ممتاز ترین خلیفہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ تھے جنھوں نے اپنے ''دادا پیر'' بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب دہلی میں قیام کیا اور وہیں آپ کا مزار ہے۔ برصغیر کے نابغۂ روزگار (Genius) ''امیر خسروؒ'' آپ کے خاص

مرید تھے جو اپنی عظیم شاعری، مثنویوں، غزلوں، کہاوتوں اور پہیلیوں کے علاوہ موسیقی کے دلنواز ساز ''ستار'' کے موجد کے طور پر تاریخی حیثیت کے مالک ہیں۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے شمالی ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کو معراج تک پہنچایا۔ آپ کو انسانی نفسیات پر اس حد تک عبور حاصل تھا کہ عام سے عام آدمی کے علاوہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والا ہر عام و خاص، صوفی، درویش، عالم، فاضل اور حکمران آپ سے یکساں فیض یاب ہوتا تھا۔ جو حضرات روحانی روشن ضمیری (Spiritual Enlightenment) کے لیے آتے وہ آپ سے باطنی روشنی لے کر جاتے۔ وہ علماء بھی جو صوفیاء کے کھلے دشمن تھے آپ کے حسنِ کلام کے ہاتھوں دم بخود تھے۔ آپ کو کہاوتوں اور سچے واقعات کے ذریعے بڑی بڑی دینی اور روحانی گتھیاں سلجھانے کا عجب دل کش ملکہ حاصل تھا۔ جب آپ نے اپریل 1325ء میں وفات پائی تو امیر خسرو نے اپنے خاص انداز میں یہ یادگار شعر کہا:

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو گھر آپنے، سانجھ بھئی چوندیس

(محبوبؒ تو چہرے پر زلفیں بکھیرے ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے، اے خسرو (وہ شمع تو بجھ گئی جس سے تیری دنیا روشن تھی۔ اُس کی عدم موجودگی سے) چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام، جا، اپنے گھر جا)

یہاں رُک کر ایک اہم تاریخی حقیقت کا تذکرہ ہو جانا چاہیے۔ سہروردیہ سلسلے کے ممتاز بزرگ شیخ رکن الدینؒ (ملتان) کے ساتھ دہلی کے سلاطین مثلاً علاء الدین خلجی، التتمش اور محمد بن تغلق نہایت عزت و تکریم سے پیش آتے تھے۔ اس کے برعکس جب دہلی میں چشتی بزرگ نظام الدین اولیاءؒ نے عوام و خواص میں زبردست مقبولیت حاصل کر لی تو وقت کے بادشاہ محمد بن تغلق کو یہ وہم ہو گیا کہ آپؒ کہیں اُس سے زیادہ طاقت حاصل نہ کر جائیں۔ اُس نے نظام الدین اولیاءؒ سے پرخاش رکھنی شروع کر دی۔ چنانچہ اقتدار پرست لوگ بادشاہ کے خوف سے نظام الدین اولیاءؒ سے کترانے لگے۔ لیکن شیخ رکن الدین سہروردیؒ جب بھی محمد بن تغلق سے ملنے دہلی جاتے تو یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ وہ نظام الدین اولیاءؒ کو پسند نہیں کرتا، ہر مرتبہ انؒ سے ملنے لازماً تشریف لے جاتے۔ اس بات سے جہاں شیخ رکن الدینؒ کی جرأت کا اظہار ہوتا ہے وہاں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی عظمت بھی واضح ہوتی ہے۔

ابتدائی چشتی اور سہروردی بزرگوں نے برصغیر کے مختلف علاقوں کو اپنے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا تاکہ ایک دوسرے کے دائرۂ اثر (Sphere of Influence) میں مداخلت سے بچا جا سکے۔ پھر بھی مناسب ہوگا کہ دونوں سلسلوں کے طرزِ فکر کے علاوہ طرزِ عمل میں جو فرق موجود تھا اُس کا ایک بے لاگ تجزیہ کر لیا جائے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ برصغیر میں جس حد تک بھی اسلام پھیلا وہ صوفیائے کرام ہی کی بدولت تھا جنھوں نے افکار سے زیادہ اپنے کردار سے کام لیتے ہوئے رنگ، نسل اور مذہب کے امتیاز سے بالا ہو کر، کمزور سے کمزور، غریب سے غریب اور گناہ گار سے گناہ گار انسان کے ساتھ بھی محبت اور بھائی چارے کا سلوک کر کے اسے دعوتِ اسلام دی۔ اس ضمن میں چشتی سلسلے کا

Marfat.com

رویہ تصوف کے دوسرے سلسلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عوامی تھا۔ البتہ بنگال میں مسلمان اکثریت کے وجود کے پیچھے سہروردی بزرگوں، خصوصاً جلال الدین تبریزیؒ کا ہاتھ تھا۔

چشتی بزرگ ذاتی طور پر تکبّر سے پاک تھے بلکہ اپنی کمیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں پر کھلم کھلا اپنی مذمت بھی کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ حیرت کا مقام ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو اپنے مرشد کی انتہائی (قریب قریب غلامانہ) تکریم کی ترغیب دیتے تھے یہاں تک کہ مرید کو مرشد کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے بھی نہیں روکا جاتا تھا۔ اس کے برعکس سہروردی بزرگ، خصوصاً شیخ بہاءُالدین زکریاؒ اپنے مریدوں سے کہتے تھے کہ جب مجھ سے ملنے آؤ تو صرف ''السلام علیکم'' کہا کرو۔ وہ تلقین کرتے تھے کہ جب مرید خانقاہ میں آئے اور نماز کا وقت ہو تو پہلے نماز ادا کرے، اس کے بعد مرشد کی خدمت میں حاضر ہُوا کرے۔

دونوں سلسلوں میں دوسرا بڑا فرق حکومت کے ساتھ تعلق کے بارے میں ہے۔ چشتی بزرگ حکومت سے فاصلے پر رہنا بہتر سمجھتے تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور بادشاہِ وقت محمد بن تغلق کے درمیان ناہموار تعلق اس کی واضح مثال ہے۔ محمد بن تغلق بار بار خواجہ صاحبؒ کو اپنے دربار میں طلب کرتا تا کہ رسم کے مطابق تمام دوسرے لوگوں کی طرح انھیں بھی بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہونا پڑے۔ اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اُس کا مقام خواجہ صاحبؒ سے برتر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خواجہ صاحبؒ وہاں جانے سے گریز کرتے تھے۔ اس کے برعکس سہروردی بزرگوں کا یہ نظریہ تھا کہ حکومت سے اچھے تعلقات کے باعث آپ عوام الناس کے مسائل حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔ لیکن اس نظریے کا نقصان یہ ہُوا کہ ''اچھے تعلقات'' اونچے درجے کے سُنّی اُمراء تک محدود ہو کر رہ گئے۔ جبکہ شیعہ اور ہندو صرف یہ حق رکھتے تھے کہ نچلے درجے کے محروم طبقے کے طور پر زندہ رہ سکیں۔

دونوں سلسلوں میں تیسرا فرق یہ تھا کہ سہروردی بزرگ، جیسا کہ بنگال میں جلال الدین تبریزیؒ اور پنجاب میں سید جلال الدین بخاری المعروف مخدوم جہانیاںؒ کے رویے سے ظاہر ہے، لوگوں کو اسلام کی طرف بڑے جوش و خروش اور اصرار کے ساتھ بلاتے تھے۔ اس سلسلے میں مخدوم صاحبؒ کے بھائی اور خلیفہ، صدر الدین خصوصاً قابلِ ذکر ہیں جنھیں اسلام کی ''مجاہدانہ'' (Militant) اشاعت کا اس حد تک جنون تھا کہ لوگ انھیں ''راجو قتال'' کہنے لگے تھے۔ اس کے برعکس چشتی بزرگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ لوگوں کو دباؤ کے بجائے اپنے مثالی کردار اور حسنِ سلوک سے اسلام کی طرف مائل کرنا چاہیے۔ آسانی کے لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سہروردی بزرگ لوگوں کو تشدد آمیز دلیل سے قائل کرتے تھے جب کہ چشتی بزرگ انھیں محبت و مروّت سے مائل کرتے تھے۔

ایک اور فرق یہ تھا کہ سہروردی بزرگ، خصوصاً مخدوم جہانیاںؒ، مسلمانوں کو بڑی شدت کے ساتھ مقامی ہندوانہ رسم و رواج سے منع کرتے تھے۔ آپؒ درویشوں، صوفیوں اور علماء کو پرزور تلقین کرتے تھے کہ وہ غریب مسلمانوں کی مدد کی خاطر بار بار اہلِ حکومت سے ملتے رہیں۔ لیکن غریب ہندوؤں کے لیے ان کے یہاں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس کے

Marfat.com

برعکس چشتی بزرگوں نے ایسی مقامی روایات اور موسمی تہواروں سے کوئی پرہیز نہ کیا جن کا اسلام کے بنیادی اصولوں سے کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں سماع (روحانی موسیقی اور عشقِ الٰہی میں ڈوب کر "حال" یا والہانہ رقص) خصوصاً اہم ہے جو چشتی بزرگوں کی درگاہوں اور مزاروں پر عوام الناس کی کشش کا باعث بنا۔ اس کے علاوہ ان کی بارگاہ میں غیر مسلموں کا بھی پُر تپاک خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج بھی اجمیر شریف میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر عام دنوں میں بھی مسلمانوں سے زیادہ ہندو اور سکھوں کی تعداد موجود ہوتی ہے جو وہاں پکنے والی روایتی دیگ میں اپنی طرف سے اناج وغیرہ بھی دان کرتے ہیں اور پکی ہوئی خوراک (لنگر) سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

قادریہ سلسلہ تصوف

اگرچہ قادریہ سلسلے کے بانی غوث الاعظم عبدالقادرؒ جیلانی کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن برصغیر میں تصوف کی تاریخ تقاضا کرتی ہے کہ یہاں نشوونما پانے والے اس اہم سلسلے کی دو ایک اور شخصیتوں کا تعارف اور اس سلسلے کی تعلیم اور خصوصیات کا تھوڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

عبدالقادرؒ جیلانی کی ذات میں "عالم" اور "صوفی" جمع ہوگئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ایک بیٹے عبدالوہاب نے ان کا مدرسہ سنبھال لیا اور دوسرے بیٹے عبدالرزاق نے ان کی خانقاہ پر توجہ مرکوز کردی۔ مگر جب ہلاکو خاں نے 1258ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو نہ مدرسہ باقی رہا نہ خانقاہ۔ اور آپ کا خاندان اور آپ کے مرید دنیا کے مختلف علاقوں میں جا آباد ہُوئے۔

برصغیر میں قادریہ سلسلے نے قدم تو چودھویں صدی ہی میں رکھ دیا تھا لیکن اس نے یہاں جڑ کہیں سولھویں صدی میں پکڑی۔ اس سلسلے کے دو بہت قابلِ ذکر صوفی حضرت میاں میرؒ (جو لاہور میں دفن ہیں) اور اُن کے مرید، مغل بادشاہ شاہجہان کے بیٹے اور اورنگ زیب عالمگیر کے بھائی شہزادہ دارا شکوہ تھے۔ اقبالؔ نے میاں میرؒ کو نغمۂ محبت قرار دیا تھا۔ آپؒ سے دارا شکوہ نے وحدت الوجود کا نظریہ سمجھا اور پھر اپنی مشہور کتاب "مجمع البحرین" (دو دریاؤں کا ملاپ) میں اُس کی اس طرح تشریح کی کہ یہ کتاب ہندومت اور اسلام کے درمیان ایک پُل بن گئی۔ دارا کے دادا، اکبر اعظم نے تو دین الٰہی کے عنوان سے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا جوڑ کر مختلف مذہبوں کا ایک ملغوبہ سا بنا دیا تھا لیکن دارا نے تقابلِ مذاہب (Comparative Religion) کے ایک انتہائی سنجیدہ طالب علم کی طرح ہندومت اور اسلام کی جداگانہ حیثیتوں کو قائم رکھتے ہوئے دونوں مذاہب کی مشترکہ روحانی اور اخلاقی قدروں کی اُسی طرح تشریح کی جیسے آج کل اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے سنجیدہ طالب علم، ان تینوں ابراہیمی مذاہب کی مشترکہ تعلیم کو واضح کر کے خدا کے نام پر خدا کے بندوں کے قتل، بلکہ قتلِ عام سے بچنے کی راہیں تلاش کر رہے ہیں۔ دارا نے بعض عالم فاضل پنڈتوں کی مدد سے

Marfat.com

ہندو تصوف کے سرچشمے اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام اور ہندومت دو الگ الگ دریاؤں کی طرح ساتھ ساتھ بہہ سکتے ہیں۔ لیکن وقت کے چیدہ چیدہ مسلمان علماء نے اُس کی ان کوششوں کو بدعت قرار دیا اور بالآخر ان علماء کے پشت پناہ اورنگ زیب عالمگیر نے اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس روز داراشکوہ قتل ہُوا اسی روز مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم کے عمل کا آغاز بھی ہو گیا۔

قادریہ سلسلے کی بنیادی تعلیم کے بارے میں عبدالقادرؒ جیلانی ہی ہماری بہترین رہنمائی کر سکتے ہیں۔ بے شک تصوّف کے سلسلوں سے مختلف وقتوں میں منسلک ہونے والے بزرگ اپنے اپنے فطری رجحان کے مطابق سلسلے کی بنیادی تعلیم میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کر لیتے ہیں لیکن اس کے بانی کی تعلیم ہمیشہ ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح شریعت سے وابستگی اہلِ طریقت کو بے لگام ہونے سے بچاتی ہے اسی طرح بعد میں آنے والے صوفیاء کو سلسلے کے بانی کے افکار بھٹکنے سے بچاتے ہیں۔ یوں سلسلے کی تعلیم ہر لحظہ بدلتے ہوئے وقت اور زندگی کے ساتھ ساتھ نئے برگ و بار بھی لاتی رہتی ہے لیکن اس کا رُخ ہمیشہ مقصد اور منزل ہی کی طرف رہتا ہے۔

عبدالقادرؒ جیلانی کی روحانیت کا سرچشمہ ان کا تصورِ خدا ہے۔ ان کے نزدیک خدا نہ تو دینیات کا کوئی من گھڑت افسانہ ہے اور نہ توحید کی کوئی منطقی دلیل۔ خدا تو انسان کی قلبی، ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی زندگی پر چھائی ہوئی ایک ہمہ گیر ہستی ہے۔ اس ہستی کی ہمہ وقت موجودگی کا شعور انسان کی عملی زندگی کے لیے ایک مہمیز اور رہبر کا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی ذات سے بلند ہو کر ایک بڑے مقصد کے لیے تیار کرتا رہتا ہے۔ عبدالقادرؒ جیلانی کے لیے رسولِ خدا کا یہ ارشاد ایک رہنما اصول (Motto) کی حیثیت رکھتا تھا کہ ''جب تم نماز پڑھو یا دُعا کرو تو یوں سمجھو جیسے تم خُدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم خدا کو نہ دیکھ سکو تو کم از کم یہ محسوس کرو کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے''۔ ان کی ساری زندگی اس اصول کی عملی شکل تھی۔ لیکن وہ یہ احتیاط خود بھی کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے کہ خدا کی قربت سے کبھی یہ مراد نہیں لینی چاہیے کہ خالق و مخلوق یا خدا اور بندۂ خدا ایک ہی ہیں۔ وہ فنا اور بقا کے نظریے کی تشریح کرتے ہوئے بھی یہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ اس کے ڈانڈے ہمہ اوست (Pantheism) کے تصور سے نہ جا ملیں۔ البتہ بعد میں آنے والے بعض قادری بزرگوں، مثلاً برصغیر میں میاں میر صاحبؒ نے اس احتیاط کو زیادہ ملحوظِ خاطر نہ رکھا۔

فنا اور بقا کی تشریح عبدالقادرؒ جیلانی نے یوں کی تھی کہ ''فنا ایسی موت ہے جس میں کوئی زندگی نہیں ہوتی اور بقا ایسی زندگی ہے جس میں کوئی موت نہیں ہوتی۔ وہ موت جس میں کوئی زندگی نہ ہو انسان کے دوسرے انسانوں کے درمیان سے اُٹھ جانے سے واقع ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے اور دوسرے اس کے لیے مر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ زندگی جس میں کوئی موت نہ ہو انسان کی وہ زندگی ہے جو وہ مرنے کے بعد اپنے خالق کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس صورت حال کی معرفت کو میں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں'' (فتوح الغیب)۔

عبدالقادرؒ جیلانی کے عقائد کے بارے میں زیادہ تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں، البتہ ان کے دو

عقیدوں کا ذکر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ رسُولِ خدا کی ایک مشہور حدیث کے مطابق آپؒ کا عمل اور تلقین یہ تھی کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے گویا خدا کو پہچان لیا (مَن عرَف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ)۔ چنانچہ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہر مخلوق اپنے خالق کے وجود کی جانب اشارہ کرتی ہے''۔ آپ کا ایک اور اہم عقیدہ یہ تھا کہ جس طرح خدا کی رضا کا پتا صرف اور صرف رسُولِ خدا کے قول و فعل کی مخلصانہ پیروی سے چل سکتا ہے اسی طرح خدا کی اطاعت کا حق ادا کرنے کا بھی یہی طریقہ ہے۔ آپ کے اسی عقیدے کو اقبالؔ نے خدا کے مُنہ سے ''جوابِ شکوہ'' کے اس آخری شعر کی صورت میں لفظی جامہ پہنایا تھا:

کی محمدؐ سے وفا تو نے ، تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا ، لوح و قلم تیرے ہیں

آپؒ اپنے اس عقیدے کے ایک اور پہلو کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔ قرآنِ حکیم کی اس مشہور آیت کے مطابق کہ ''خدا نے تمھارے لیے زمین و آسمان کی تمام چیزیں کو تسخیر کر رکھا ہے'' (31:20)، انسان کو کائنات کی ہر شے پر ایک ہی صورت میں قدرت حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی رضا کو مکمل طور پر خدا کی رضا کے تابع کر دے۔ اور خدا کی رضا جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے اس حکم پر صدقِ دل سے عمل کیا جائے کہ ''جو کچھ خدا کا رسول تمھیں دے، وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تمھیں روک دے، اُس سے رُک جاؤ'' (59:7)۔

آیئے، اب اُن دس اصولوں پر ایک نظر ڈالیں جو عبدالقادرؒ جیلانی نے اپنی کتاب ''غنیۃ الطالبین'' میں روحانی زندگی گزارنے کے خواہش مندوں کے لیے مقرر فرمائے تھے:

(1) کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی (غیبت) نہ کرو۔
(2) کسی شخص کے بارے میں بلا جواز شک و شبہہ میں مبتلا نہ ہُوا کرو۔
(3) کانا پھوسی اور گپ بازی سے باز رہو۔
(4) جن باتوں اور چیزوں سے خدا اور رسولؐ نے منع کیا ہے ان کی طرف دیکھو بھی نہیں۔
(5) ہمیشہ سچ بولو۔
(6) ہمیشہ خدا کا شکر ادا کرتے رہو۔
(7) جو لوگ مدد کے مستحق ہیں ان کی مالی امداد کرو۔
(8) دُنیوی اقتدار اور مقام و مرتبہ کے پیچھے نہ بھاگو۔
(9) پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتے رہو۔
(10) رسُولِ خدا کی سُنت کی پیروی اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرتے رہو۔

روحانی ترقی کے راستے پر چلنے کے لیے آپؒ نے مرشد کے اہم کردار پر بھی بہت زور دیا ہے۔ اپنی کتاب

Marfat.com

''فتوح الغیب'' میں آپؒ نے مرشد کو وہ مقام دیا ہے جو رسولِ خدا کی زندگی میں حضورؐ کو دودھ پلانے والی خاتون دائی حلیمہؓ کو حاصل ہے۔ البتہ آپ فرماتے تھے کہ مرشد کی ضرورت صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک انسان سفلی خواہشات اور مقاصد سے آزاد نہیں ہو جاتا۔ جس طرح ایک خاص عمر کو پہنچ کر بچے کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے اسی طرح نفسِ امارہ (برے کاموں پر اکسانے والے نفس) پر قابو پانے کے بعد مرشد کی ضرورت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

قادریہ سلسلے میں ''ذکر'' پر خصوصی زور دیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی یہ آیت اس خصوصیت کی بنیاد ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (تم مجھے یاد کرو گے تو میں تمھیں یاد کروں گا، 2:152)۔ اور انسان کے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ خدا اُسے یاد کرے۔ اب یہ انسان پر ہے کہ وہ خدا کو کتنا یاد کرتا ہے اور کتنی محبت سے یاد کرتا ہے۔ چنانچہ قادریہ سلسلے میں نہ صرف انفرادی طور پر بلکہ گروہی یا جماعتی سطح پر بھی ذکر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مرشد اپنے مریدوں کو ان کی روحانی ترقی کے لحاظ سے ذکر کا طریقہ سکھاتا ہے۔ ذکر کے علاوہ ''پاسِ انفاس'' بھی سکھایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سانس کی آمد و رفت کو اس طرح منظم کیا جائے کہ اللہ کا اسم مبارک انسان کے سارے وجود میں خود بخود گردش کرتا رہے۔ عام الفاظ میں اس صورتِ حال کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اب ذکر انسان کے دل کی دھڑکن کی طرح از خود جاری و ساری ہو گیا ہے۔

انسان کو درپیش مصائب و آلام کے بارے میں عبدالقادرؒ جیلانی کا نظریہ یہ تھا کہ خدا اپنے نیک بندوں کو ان کے ذریعے سے آزمائش سے گزارتا ہے۔ جس طرح آگ میں پگھلانے سے سونا آلائشوں سے پاک ہوتے ہوتے کُندن بن جاتا ہے اسی طرح خدا کے نیک بندے آزمائشوں سے گزر کر خوب سے خوب تر ہو جاتے ہیں۔ البتہ مصائب و آلام گناہ گاروں اور خطا کاروں کے لیے سزا کے طور پر بھی نازل ہو جاتے ہیں۔ آپؒ فرماتے تھے کہ اگر مصائب و آلام کو مِن جانب اللہ تسلیم کر کے انسان انھیں صبر و ثبات سے برداشت کرے تو خداوند کریم اُس کے کردار کی خامیوں کو دُور کر کے اُسے صراطِ مستقیم پر ڈال دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان مصائب و آلام کو خدا پر کامل ایمان کے بغیر برداشت کرنے کی کوشش کرے تو نتیجہ احساسِ نامرادی اور قنوطیت کی شکل میں نکلے گا۔

عبدالقادرؒ جیلانی اپنے پیروکاروں کو مال و دولت کے پیچھے بھاگنے سے تو منع کرتے تھے لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ انسان دوسروں کی کمائی پر طفیلی بن کر رہے۔ وہ رزقِ حلال کمانے کی ترغیب دیتے اور اسے حاجت مندوں پر خرچ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ آپؒ حکمرانوں پر تنقید کرتے تھے کہ انھوں نے ناجائز وسائل سے دولت جمع کر رکھی ہے۔ اگرچہ عباسی خلفاء آپ کا قُرب چاہتے تھے لیکن آپ خود اُن سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حکمرانوں پر تنقید کے باوجود آپ کا عقیدہ تھا کہ جس طرح کے لوگ خود ہوتے ہیں اسی طرح کے حکمران اُنھیں ملتے ہیں۔ جب لوگ حکمرانوں کی شکایت کرتے تو آپ فرماتے، ''جیسے تم، ویسے تمھارے حکمران''۔

تصوّف کے زیادہ تر سلسلوں میں خدمتِ خلق کا تصور اور جذبہ موجود ہوتا ہے جو طریقت کو انسانی اعتبار سے

Marfat.com

شریعت کے مقابلے میں زیادہ پرکشش بنادیتا ہے۔اس وقت چونکہ ہم قادریہ سلسلے کی تعلیمات ،اس کے بانی عبدالقادرؒ جیلانی کی زبانی بیان کررہے ہیں تو آپؒ ہی کے حوالے سے تصوّف اور خدمتِ خلق کے باہمی تعلق کا مختصر سا جائزہ بھی لے لیتے ہیں۔البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دوسرے سلسلوں، خصوصاً ''چشتیہ'' میں بھی یہ تصور اور جذبہ اہم اور عام ہے۔

مسلمانوں کے درمیان گیارھویں صدی سے نہ صرف فرقہ وارانہ تقسیم گہری سے گہری ہونے لگی تھی بلکہ وہ سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے تھے۔عبدالقادرؒ جیلانی کو مسلمانوں کے اس مذہبی انتشار اور اخلاقی زوال کا بے حد رنج تھا۔وہ اپنے ماحول سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔آپ کا ایمان تھا کہ اس صورتِ حال کو صرف اور صرف ایک روحانی حیاتِ نو ہی بدل سکتی ہے چنانچہ آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اسی مقصد کے حصول پر مرکوز کردیں۔

اپنی کتاب ''فتوح الربانی'' میں آپ نے فرمایا تھا کہ ''زمانہ ایک حاملہ عورت کی طرح ہوتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اُس کے پیٹ میں کیا ہے''۔آپ نے اس جملے کی تشریح یوں کی تھی کہ ہر انسانی عمل اور رویے کا بالآخر ایک ٹھوس نتیجہ نکلتا ہے اور انسان اس نتیجے سے بچ نہیں سکتا۔انسان پر جب کوئی آفت آتی ہے تو وہ کہتا ہے، اب کیا ہوگا۔اُسے یاد رکھنا چاہیے کہ اب وہ وہی کاٹے گا جو اُس نے بویا تھا۔اپنے بُرے عمل کے نتیجے سے اُسے صرف مخلصانہ توبہ ہی بچا سکتی ہے۔لیکن توبہ کوئی زبانی وعدہ نہیں ہوتی، اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ انسان اپنے غلط عمل اور رویے کو ہمیشہ کے لیے ترک کردے۔

عبدالقادرؒ جیلانی تاکید کیا کرتے تھے کہ معاشرے کی اصلاح اور فلاح ہر مسلمان کی مذہبی اور روحانی ذمہ داری ہے۔آپ نے روحانی ترقی کا دائرہ یہ کہہ کر وسیع تر کردیا کہ انسانیت کی خدمت (صرف مسلمانوں کی نہیں، تمام تر انسانیت کی خدمت) سب سے اہم اور اعلیٰ روحانی عمل ہے۔آپ فرماتے تھے کہ عوام الناس ''زمین پر آباد خدا کے بچوں'' کے مانند ہیں اور غریبوں اور کمزوروں کی مدد مذہب کی اصل روح ہے۔آپ نے ''فتوح الربانی'' میں فرمایا، ''ہر اُس شخص کا ایمان ناقص ہے جو پیٹ بھر کر کھاتا ہے جبکہ اُس کا ہمسایہ (صرف مسلمان ہمسایہ نہیں، کوئی بھی ہمسایہ) بھوکے پیٹ سوتا ہے۔آپ کے اس ارشاد اور تلقین کے پیچھے ایک تو قرآنِ حکیم کی یہ آیت تھی کہ ''خدا یقیناً اُن نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے جو دوسروں سے بھلائی کرتے ہیں (وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ 3:134) اور دوسرے رسولِ خدا کی یہ حدیث تھی کہ ''لوگو، کھانا کھانے لگو تو دیکھ لو، تمھارے دائیں اور بائیں طرف رہنے والے ہمسایوں نے بھی کھا لیا ہے یا نہیں اور اگر نہیں کھایا تو کھانے میں انھیں بھی شریک کرلو''۔ہمارے کچھ خوش نصیب لوگوں اور گھرانوں میں آج بھی یہ رسم موجود ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے تمام حاضرین کو کھانے میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

انسانیت سے عبدالقادرؒ جیلانی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ آپؒ اکثر فرماتے، ''میرا بس چلے تو میں ہر کسی پر دوزخ کے دروازے بند کرکے جنت کے دروازے کھول دوں''۔آپ کے اس رویے کا موازنہ اگر ہر دور، خصوصاً آج کے دور

Marfat.com

کے مسلمان علماء کے ارشادات سے کیا جائے تو شریعت اور طریقت کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ علماء حضرات بت پرستوں اور مشرکوں ہی کو نہیں اہلِ کتاب کو بھی کافر قرار دے کر جہنم رسید کرتے رہتے ہیں اور جب ان کا اس سے دل نہیں بھرتا تو مسلمانوں کے ایک فرقے سے تعلق رکھنے والے علماء دوسرے فرقے کے مسلمانوں کو بھی جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کے ان دشمنوں کی اس مسلسل کوشش کا بہت جلد یہ نتیجہ نکلنے والا ہے کہ جہنم اتنا بھر جائے گا کہ وہاں جگہ حاصل کرنے کے لیے بھی رشوت اور سفارش ضروری ہو جائے گی۔ اس صورتِ حال کی طرف بیسویں صدی کے ایک منفرد شاعر، استاد امام دین گجراتی نے اپنے اس بے بدل مصرعے میں کیا ہے:

ٹوں چھیتی نال دوزخ وچ وڑ مام دینا

اپنی کتاب ''غنیۃ الطالبین'' میں عبدالقادرؒ جیلانی نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ خدا شرک کے سوا ہر گناہ بخش دے گا لیکن دوسرے انسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے والوں اور ان پر جبری تسلط حاصل کرنے والوں کی بخشش کے لیے اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں آپؒ اپنی حمایت میں رسولِ خدا کی یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے کہ ''انسانی گناہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ (1) اپنے ضمیر اور اپنی رُوح کے تقاضوں سے الٹ عمل کرنے کا گناہ...... خدا یہ گناہ معاف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ (2) خدا کے ساتھ کسی کو اس کی خدائی میں شریک قرار دینے کا گناہ...... خدا یہ گناہ معاف نہیں کرے گا۔ (3) ظلم اور جبر کرنے کا گناہ...... خدا اس گناہ کا کوئی معمولی سے معمولی حصہ بھی معاف نہیں کرے گا''۔

آفرین ہے رسولِ خدا کی محبت اور حرمت کی قسم کھانے والے دورِ حاضر کے ایک ارب بیس کروڑ مسلمانوں پر جن کے 57 ملکوں پر ظالموں، جابروں اور آمروں کی حکومت ہے اور وہ اس شرم ناک صورتِ حال کو شرمائے بغیر سہے چلے جاتے ہیں۔ خود ہماری پاک سرزمین پر یہ نعرہ لگانے والے بہت ہیں کہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ''۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کسی نے یہ سوچنے کی زحمت کی ہو کہ لا الہ الا اللہ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لا الہ الا اللہ کے ایک کلمے نے تو انسان کو خدا کے سوا ہر جھوٹے خدا، ہر فرعون، ہر شدّاد، ہر نمرود، ہر یزید، ہر جابر، ہر قاہر اور ہر آمر کے سامنے جھکنے سے نجات دلا دی تھی اور ہم مسلمان ہیں کہ اس کلمے پر مرمٹنے کی بات تو کرتے ہیں لیکن وقت کے جابر بادشاہوں اور آمروں کے سامنے نہ صرف جھکتے چلے جاتے ہیں بلکہ اکثر و بیشتر اُن کے درباروں اور ایوانوں میں اونچا مقام حاصل کرنے کی سرتوڑ کوششیں اور گڑگڑاتی ہوئی دعائیں بھی کرتے ہیں۔

''غنیۃ الطالبین'' میں عبدالقادرؒ جیلانی نے منافقت کو شرک کے مترادف قرار دیا ہے۔ آپؒ فرماتے تھے، ''جو لوگ کہتے کچھ، اور کرتے کچھ اور ہیں وہ خدا کی ناراضی مول لے رہے ہوتے ہیں اور وہ عالم بھی جو اپنے علم سے الٹ عمل کرتا ہے، منافقت کا مرتکب ہوتا ہے''۔ آپؒ لوگوں کو تلقین کرتے کہ وہ ایسے عالموں سے پرہیز کریں۔ آپؒ اُن لوگوں کی علانیہ مذمت کرتے تھے جو بھیڑ کے لباس میں بھیڑیے کا کردار ادا کرتے ہوئے خلقِ خدا کو دھوکا دیتے ہیں۔

قلندریہ سلسلۂ تصوف

پاکستان کے حوالے سے ''قلندریہ'' سلسلے کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے سے وہ درویش منسلک رہے ہیں جو نہ تو شریعت کو مانتے ہیں اور نہ ہی طریقت کو۔ وہ کسی مذہبی یا معاشرتی نظم وضبط کے نہ تو قائل ہوتے ہیں اور نہ ہی اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ درویش جنھیں قلندر کہا جاتا ہے، پیرانِ طریقت کے جاہ وجلال کو تصوف کی توہین سمجھتے ہیں اور خاص طور پر ''سہروردیہ'' سلسلے کو نشانہ تنقید بناتے ہیں۔ اسی طرح سہروردیہ سلسلے کے بزرگ بھی ان آزادہ منش یا ''بے شرع'' قلندروں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ لیکن سہروردیہ سلسلے کے عظیم صوفی بہاء الدین زکریاؒ نے اپنے مشہور ترین مرید، میر سید عثمان سیستانیؒ جو''لال شہباز قلندر'' کہلاتے ہیں، کے بارے میں یہ رویہ اختیار نہ کیا اور ان کے لیے سندھ میں سہون کے مقام پر خود خانقاہ بنوائی۔ کہتے ہیں کہ جس جگہ یہ خانقاہ بنی ہے وہاں پہلے شِو کا مندر ہوتا تھا۔ لال شہباز قلندرؒ اور آپ کے مصاحبوں کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ حضرت علیؓ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے اور منصور حلاجؒ کی طرح عشقِ الٰہی کی سرمستی میں اپنی روح اور روحِ خداوندی کے درمیان کوئی تمیز نہیں کرتے تھے۔ آپ کے مریدوں میں، جو ملنگ کہلاتے تھے''بے شرع'' یا غیر شرعی ریاضتیں عام تھیں۔ شوال (اسلامی کیلنڈر کے مطابق رمضان کے بعد آنے والے مہینے) میں آپ کی درگاہ پر ہر سال ایک عظیم الشان عُرس منعقد ہوتا ہے جس میں پاکستان بھر سے لوگ جوق در جوق شامل ہوتے ہیں۔ اس موقع پر خوب دھمال (والہانہ رقص) ڈالی جاتی ہے۔

قلندر حضرات قریہ بہ قریہ، شہر بہ شہر پھرتے رہتے تھے۔ ان کے عشقِ الٰہی سے لبریز دعوے، نعرے اور بول عوام کے لیے بہت دلچسپی کا باعث تھے۔ خصوصاً جب وہ جلتے ہوئے کوئلوں پر چلتے یا دہکتے ہوئے انگارے مُنہ میں ڈال لیتے تو وہ ہندو جو تازہ تازہ مسلمان ہُوئے تھے انھیں یہ کرامات بہت متاثر کرتیں کیونکہ یہ انھیں اپنے پرانے مذہب سے منسلک جوگیوں اور سادھوؤں کی یاد دلاتیں اور انھیں محسوس ہوتا کہ اسلام کوئی انوکھا مذہب نہیں ہے۔

جس طرح سہروردیہ سلسلے نے کچھ قلندروں، مثلاً لال شہباز قلندرؒ، کو قبول کر رکھا تھا اسی طرح چشتیہ سلسلے نے بھی اپنی قلندری شاخ بنا رکھی تھی۔ یوں بھی قلندر حضرات جو سہروردی بزرگوں کی حکمرانوں سے قربت اور ان کی اپنی شان وشوکت سے متنفر تھے، چشتی بزرگوں کے حکمرانوں سے اجتناب اور ان کی اپنی سادگی اور انکسار کی وجہ سے انھیں مقابلتاً زیادہ پسند کرتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ چشتیہ سلسلے میں قلندروں اور ملنگوں کی تعداد سہروردیہ سلسلے سے کہیں زیادہ ہے۔ چشتیہ سلسلے کے مشہور ترین قلندر بُوعلیؒ ہیں (اصل نام ابوعلی ہے جو عرفِ عام میں بوعلی بن گیا۔ پنجاب کے ایک عظیم ترین صوفی اور شاعر بلھے شاہؒ کا نام بھی ابوعلی ہی کی پنجابی شکل ہے)۔ بوعلی قلندرؒ کے خطوط اور ان کی شاعری سے غزالیؒ اور تصوف کی مشہور کتاب ''لمعات'' (لمحات نہیں، لمعات یعنی نور کی کرنیں) کے مصنف ''عراقی'' کے افکار کی خوشبو آتی ہے۔

Marfat.com

مناسب ہوگا کہ یہاں لاہور کی شادمان کالونی میں مدفون حضرت شاہ جمالؒ کا ذکر بھی آجائے جو سہروردیہ سلسلے کے قلندر تھے۔ آپ کے بارے میں اس طرح کی کہانی مشہور ہے کہ آپ نے جس ٹیلے پر اپنی کُٹیا بنا رکھی تھی اُس کے بالمقابل ایک چوبارے پر ایک ہندو خاندان رہتا تھا جس نے شکایت کی کہ شاہ جمالؒ کی کُٹیا سے تاک جھانک ہوتی ہے۔ جب یہ شکایت پہنچی تو شاہ جمالؒ دھمال ڈال رہے تھے۔ آپ نے دھمال جاری رکھی اور ٹیلا آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگا یہاں تک کہ موجودہ سطح پر پہنچ گیا اور ہندو خاندان کی شکایت دُور ہوگئی۔ ویسے آپ کے مزار تک پہنچنے کے لیے آج بھی اچھی خاصی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔

شطاریہ سلسلۂ تصوف

برصغیر میں تصوف کی مختصر سے مختصر تاریخ بھی شطاریہ سلسلے کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ قیام پاکستان کے بعد اس سلسلے کی زیادہ تر شاخیں بھارت میں رہ گئیں لیکن لاہور میں لارنس روڈ اور شاہراہِ فاطمہ (سابقہ کوئنز روڈ) کے نکّڑ پر حضرت شاہ عنایت قادری شطاریؒ کا مزار اس سلسلے کی ایک یادگار ہے۔ یہ سلسلہ چھٹے شیعہ امام حضرت جعفر صادقؓ اور مشہور صوفی بایزید بسطامیؒ کے روحانی کمالات اور ارشادات سے فیضیاب ہوتا ہے۔ دنیائے اسلام خصوصاً ترکی اور ایران میں اسے بسطامیہ یا اسحاقیہ کہا جاتا ہے۔ برصغیر میں اس سلسلے کی شاخ کے بانی شاہ عبداللہ نے اسے شطاریہ کا نام دیا جس کے لغوی معنی ''تیز رفتار'' ہیں۔ تصوف میں وحدت اور کثرت کا مسئلہ بہت گنجلک سمجھا جاتا ہے لیکن اس سلسلے کے صوفیاء اس مسئلے کو چند اشاروں میں حل کر دیتے تھے اور یہی تیز رفتاری اس سلسلے کی پہچان اور نام بن گئی۔ مسئلے کی مشکل کو غالبؔ نے یوں بیان کیا تھا:

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اور یہ دیکھنے کے لیے کہ شطاری صوفی اسے کیسے چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے، ہم پنجابی کے باکمال صوفی شاعر بلھے شاہؒ کی زندگی کا ایک ورق پلٹتے ہیں۔ قصور شہر کا عالم فاضل سید ابوعلی (اصل نام) وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی گتھیاں سلجھانے کے لیے لاہور کے ارائیں صوفی شاہ عنایت قادری شطاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے جو اُس وقت کیاری میں پیاز بو رہے تھے۔ جب بلھے شاہؒ ایک طول طویل سوال کی شکل میں مسئلے کی الجھنیں اور تضادات بیان کر چکا تو شاہ عنایتؒ اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر پیاز کی پنیری میں سے ایک چھوٹا سا پودا لے کر اُسے کیاری میں بو دیا اور فرمایا، ''سیدھی سی بات ہے، اُدھر سے اُکھاڑنا ہے اور اِدھر کو گاڑنا ہے''۔ بس نُور کی ایک کرن (لمعہ) الجھنوں اور تضادات کے سارے اندھیروں کو اس طرح نگل گئی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا فرعون کے جادوگروں کے تمام تر فریبوں کو نگل گیا تھا۔ اس کیفیت کو رسولِ خدا کی شان میں کہی ہوئی ظفر علی خاں کی نعت کا یہ شعر یوں بیان کرتا ہے:

Marfat.com

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہُوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

ملامتی اور مجذوب صوفی

ملامتی صوفی اپنی روحانی صلاحیتوں کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا یہ رویہ دراصل بڑے بڑے القابوں کے شائقین اور سہروردیہ سلسلے کے بزرگوں کی طرح بڑی بڑی خانقاہوں میں طمطراق سے رہنے والے، شاندار جلوسوں کی صورت میں سفر کرنے والے، اور حکمرانوں سے روابط رکھنے والے صوفیوں کے طرز زندگی کا ردِّعمل تھا۔ اپنے اعلیٰ روحانی مقامات کا ڈھنڈورا پیٹنے کے بجائے ملامتی صوفی اپنی بدتعریفی اور مذمت کرتے رہتے تھے۔ ایک چھوٹی سی مثال شاید انسان اور زندگی کے بارے میں ان کے رویے کو واضح کر سکے: کچھ عقیدت مندوں نے جب ایک ملامتی صوفی کے مُنہ پر اُس کی تعریف کے پُل باندھے تو اس نے ہاتھ سے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''میں اپنی حقیقت بخوبی جانتا ہوں۔ ہر روز جب میں غسل خانے میں رفعِ حاجت کے لیے جاتا ہوں تو یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو جاتی ہے کہ میں دراصل ایک ایسی مشین ہوں جس میں دُنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتیں ڈالی جاتی ہیں اور وہ انھیں پیشاب اور پاخانے میں بدل دیتی ہے''۔ اشرف المخلوقات انسان کا یہ تعارف واقعی بصیرت افروز ہے۔

ملامتی صوفی کس طرح سوچتا ہے۔ آیئے یہ جاننے کے لیے بلھے شاہؒ کی یہ نظم پڑھتے ہیں:

بازی لے گئے کُتے

راتیں جاگیں کریں عبادت
راتیں جاگن کُتے
تیتھوں اُتے

بھونکوں بند مُول نہ ہوندے
جا رڑی تے ستے
تیتھوں اُتے

کھسم اپنے دا دَر نہ چھڈدے
بھانویں وجن جُتے
تیتھوں اُتے

Marfat.com

بلھے شاہ کوئی وخت وہاج لے

نہیں تے بازی لے گئے کُتّے

تیتھوں اُتّے

(تم رات کو جاگ کر عبادت کرتے ہو۔ رات کو تو کُتّے بھی جاگتے ہیں۔ تم سے وہ بہتر ہیں۔ بھونکنے کی ڈیوٹی دیتے ہوئے وہ ذرا دیر کے لیے بھی دَم نہیں لیتے اور دن کو سونے کے لیے چٹیل زمین پر لیٹ جاتے ہیں۔ تم سے وہ بہتر ہیں۔ اپنے مالک کا دروازہ نہیں چھوڑتے خواہ وہاں انھیں جوتے ہی پڑیں۔ تم سے وہ بہتر ہیں۔ اے بلھے شاہ! کوئی مشکل کام کر دکھاؤ ورنہ کتے بازی لے جائیں گے۔ تم سے وہ بہتر ہیں)۔

چشتیوں، قادریوں اور سہروردیوں کے برعکس ملامتی صوفیوں نے کسی باقاعدہ سلسلے کی بنیاد نہیں رکھی۔ اپنے آپ کو چھپانے کے باوجود عقیدت مند انھیں سو پردوں کے پیچھے سے بھی پہچان لیتے تھے اور اکیلا نہ چھوڑتے تھے۔ یہی حال عشقِ الٰہی میں سرمست مجذوب صوفیوں کا تھا۔ کچھ صوفیوں کی زندگی میں مجذوبیت (Continuous Ecstacy) عارضی ہوتی تھی اور کچھ اس حالت سے کبھی باہر نہ آتے تھے۔ ہمارے عہد کے سراپا نُور صوفی، نُور والے بابا، حضرت فضل شاہؒ تقریباً بارہ سال تک سرمست رہے اور اس تمام عرصے میں آپ نے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ البتہ جب اس کیفیت سے باہر آئے تو آپ کے حسنِ کلام کا یہ عالم تھا کہ پاکستان کی کتنی ہی علمی، ادبی، سیاسی اور روحانی ہستیاں لاہور کی انفنٹری روڈ پر نور والوں کے ڈیرے پر آپ کا بیان سننے کے لیے حاضر ہوتی تھیں۔ آپ قادریہ اور چشتیہ سلسلوں سے فیضیاب تھے۔ آپ کے حسنِ بیان کی ایک جھلک اشفاق احمد کے ان ٹیلی وژن ڈراموں میں نظر آتی ہے جو انھوں نے ''بابا نور باف'' کے حوالے سے لکھے تھے۔ جن خوش نصیبوں نے اشفاق احمد کی گفتگو سُنی ہے وہ اس صاحبِ طرز، خوش بیان، صوفی منش داستان گو کے لفظوں میں رچی ہوئی محبت کی خوشبو کا سراغ لگانا چاہیں تو اُنھیں نور والے مجذوب و بیدار باباؒ تک جانا پڑے گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اشفاق احمد نے ہمارے دور کے سب سے ممتاز شاعر فیض احمد فیض کو بھی ملامتی صوفی کا خطاب دیا تھا۔

نور والے باباؒ نے اپنی زندگی میں قرآنِ حکیم کی تفسیر لکھوانی شروع کر دی تھی جسے ان کے لائق اور معنوی و روحانی خلیفہ جناب اشرف فاضلی نے قریب قریب انھی کے الفاظ میں مکمل کر کے ''تفسیرِ فاضلی'' کے عنوان سے سات جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔

سعید سرمدؒ

مجذوبوں کا ذکر ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سرمد شہیدؒ کا ذکر نہ آئے۔ کسی بھی عہد میں مجذوبوں کی کمی نہیں رہی اور ان کی بابت صوفیاء کے تذکروں میں کہانیاں اور حقائق عام مل جاتے ہیں۔ اکبرِ اعظم کے دور میں پنجابی زبان کے مشہور صوفی شاعر شاہ حسینؒ (لاہور) کو اُن کی شاعری کے علاوہ ان کی ایک ہندو بچے ''مادھو لال'' سے محبت نے عوامی شہرت بخشی

تھی۔شاہ حسینؒ اصرار کرتے کہ ان کے نام سے پہلے مادھولال کا نام لیا جائے یعنی انھیں ''مادھولال حسین'' کہہ کر پکارا جائے۔ بالکل اسی طرح اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں محمد سعید سرمدؒ کو اس کی دلچسپ صوفیانہ زندگی اور پر جوش عشقیہ شاعری کی بناء پر زبردست شہرت نصیب ہوئی۔ وہ آرمینیا کا یہودی تھا اور کاشان سے آکر مُلّا صدرہؒ کے زیرِ اثر اسلام لے آیا تھا۔ وہ وحدت الوجود کی چلتی پھرتی اور مُنہ بولتی تصویر تھا۔ بین الاقوامی تجارت کی وجہ سے اس نے اچھا خاصا منافع کما رکھا تھا اور مالی طور پر کسی کا محتاج نہیں تھا۔ 1632ء میں وہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ آیا اور مادھولال حسینؒ کی طرح ایک ہندو لڑکے ''ابھی چند'' کے عشق میں سرتاپا ڈوب گیا۔ دو تین سال بعد وہ لاہور آیا اور پھر وہاں سے حیدرآباد دکن چلا گیا۔ 1654ء میں وہ دِلّی پہنچا جہاں شہزادہ دارا شکوہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کے قطعات اور رباعیاں عشقِ الٰہی کے اسرار و رموز کو کمالِ خوبصورتی سے آشکارا کرتی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ اُس دور کے راسخ العقیدہ لوگوں کو عموماً اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے زیرِ اثر علماء کو خصوصاً قابلِ اعتراض نظر آتی تھیں۔

1661-1660ء میں جب اورنگ زیب عالمگیر کو یہ دُھن سمائی کہ اپنے صوفی منش بڑے بھائی دارا شکوہ سے ہمدردی رکھنے والے عناصر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے تو اُس نے سرمدؒ کے قتل کے احکامات جاری کر دیئے۔ جب سرمد کو تختۂ دار کی طرف لے جایا گیا اور جلاد نے دستور کے مطابق اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنی چاہی تو سرمدؒ نے اس پر ایک نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے کہا، ''تُو کسی بھی روپ میں آ میرے پیارے (خدا) میں تجھے خوب پہچانتا ہوں''۔ پھر اس نے ایک فارسی رباعی پڑھی جو یوں شروع ہوتی ہے: شوری شد و از خوابِ عدم کشودیم۔ پوری رباعی کا ترجمہ یوں ہے:

(زبردست شور مچا ہُوا تھا اور ہم نے ابدی نیند سے آنکھیں کھولیں، دیکھا تو جھوٹ اور مکاری کی رات ابھی باقی تھی چنانچہ ہم پھر سو گئے۔ تم نے بادشاہ دیکھے ہیں، درویش دیکھے ہیں اور قلندر دیکھے ہیں، اب آؤ عشقِ الٰہی میں ڈوبے ہوئے سرمد کا سر قلم ہوتے ہوئے بھی دیکھو)

سرمد کی ذات اور اس کی شاعری کے حوالے سے عجیب و غریب کہانیاں، تصوف کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں جن کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند میں سرمد کو عوامی سطح پر قریب قریب وہی مقام حاصل ہو چکا ہے جو منصور حلاجؒ کو عالمِ اسلام میں حاصل ہے۔ ایک چھوٹی سی روایت سُن لیجیے۔ سرمدؒ کے بارے میں بڑا اعتراض یہ تھا وہ کلمۂ توحید کا صرف پہلا حصہ ''لا الٰہ'' پڑھتا تھا اور ''اِلّا اللہ'' نہیں کہتا تھا۔ جب جلاد نے تلوار سے سرمدؒ کا سر اُڑا دیا تو اس کا سر ایک گیند کی طرح دور تک لڑھکتا گیا اور اس کے اندر سے تین مرتبہ پورا کلمہ لا الٰہ الا اللہ نکلتا ہُوا سنائی دیا۔ وہ جسے توحید کا منکر قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا، پتا چلا کہ اُس کے خون کے ایک ایک قطرے میں خدا کی توحید موجزن تھی۔

اصفہانی سلسلۂ تصوف و فلسفہ

یہ ناانصافی ہوگی کہ اہلِ سنت والجماعت سے تعلق رکھنے والے صوفیاء کا ذکر تو تفصیل سے کیا جائے اور، جیسا کہ

ہمارے یہاں سنیوں کی واضح اکثریت کی بناء پر اکثر ہوتا ہے، ایک ابن سینا کو چھوڑ کر ایران کے دیگر فلسفیوں اور صوفیوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مختصر ہی سہی اور خواہ چیدہ چیدہ ہستیوں ہی کا تعارف ہو سکے لیکن ہونا ضرور چاہیے۔ ان میں سے کئی ہستیوں کا کسی نہ کسی حوالے سے چونکہ ایران کے شہر اصفہان سے تعلق رہا ہے اس لیے اصفہانی مکتبۂ فکر کی کسی نمائندہ شخصیت کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔

اس کتاب کے دائرۂ کار میں فلسفیوں کا ذکر بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے لیکن مغربی فلسفے اور اسلامی فلسفے میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مغربی فلسفے کے برعکس اسلامی فلسفے میں عقل اور رُوح آپس میں اس حد تک قریب ہیں کہ انھیں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی عقلیات کو اسلامی روحانیات سے جدا نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ان دونوں سے تعلق رکھنے والے فلسفی اور صوفی ایک ہی ''خاندان'' کے افراد گردانے جاتے ہیں۔ اسلامی فلسفے کا بنیادی مقصد صداقت (Truth) تھا اور صداقت ہی اسلامی تصوف کا بھی مقصد تھا۔ البتہ یہ فرق ضرور تھا کہ فلسفی جسے صداقت کہتے تھے، صوفی اسے حقیقت، حق یا خدا کا نام دیتے تھے۔ اس سلسلے میں اسلامی فلسفے کے جدِ امجد، ابو یعقوب الکندی کا، جو 873ء میں فوت ہوئے، ایک بیان ملاحظہ کیجیے جو اس لائق ہے کہ آج کے مسلمان دانشوروں کو اسے جلی قلم سے اپنی پیشانیوں پر لکھ لینا چاہیے:

> ''ہمیں کسی بھی صداقت کو قبول کرتے ہوئے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ صداقت خواہ کسی بھی سرچشمے سے ہم تک پہنچے ہمیں اُسے اپنے اندر سمو لینا چاہیے۔ ہمیں اس سے غرض نہ ہونی چاہیے کہ وہ گزشتہ نسلوں سے آئی ہے یا دوسری قوموں سے۔ جسے صداقت کی تلاش ہو اس کے لیے صداقت سے بڑھ کر اور کوئی چیز اہم نہیں ہو سکتی۔ صداقت کے لیے کسی کا بھی احسان لینے سے ہم نہ تو کمتر ہوتے ہیں اور نہ حقیر، بلکہ ہمارا یہ رویہ ہمیں عزت و توقیر عطا کر دیتا ہے۔''

اسلامی فلسفے اور اسلامی تصوف کے یکساں مقصد، صداقت، کے حوالے سے یہ کہنا قرینِ حقیقت ہے کہ فارابی جیسے فلسفیوں کو ''فلسفی صوفی'' اور ابن عربیؒ جیسے صوفیوں کو ''صوفی فلسفی'' کہنا بہتر ہوگا۔ چنانچہ اسلامی فلسفے کی روح تک پہنچنے کے لیے ہمیں مغربی دانشوروں کے اس تاثر سے آگے جانا پڑے گا کہ اسلامی فلسفہ الکندی سے شروع ہُوا، ابن رُشد پر ختم ہو گیا اور ابن خلدون کا ''مقدمہ'' اس کا تتمہ ہے۔ بے شک یہ تینوں عظیم فلسفی نسلاً عرب تھے لیکن اسلامی فلسفہ محض عربی فلسفہ نہیں بلکہ اس میدان کے زیادہ تر سوار، مثلاً ابن سینا اور مُلّا صدرہ، ایرانی تھے۔ خصوصاً پہلی تین ہجری صدیاں چھوڑ کر بعد کے ایک طویل عرصے تک اسلامی فلسفے کا گڑھ بڑی حد تک ایران کے صفوی حکمرانوں کا دارالحکومت اصفہان بن گیا تھا۔

ابنِ سینا

اسلامی فلسفے کا مشہور ترین مکتبۂ فکر ''مشائی'' (Peripatetic) جو الکندی سے شروع ہُوا، فارابی سے ہوتا ہُوا ابن سینا (پیدائش: 980ء، وفات: 1037ء) تک پہنچا جس نے اسے معراج تک پہنچا دیا۔ یہ مکتبۂ فکر وحی الٰہی کے بنیادی

اصولوں، ارسطو کے فلسفے اور نو افلاطونی نظریات کے امتزاج (Synthesis) سے وجود میں آیا تھا۔ یہ امتزاج ابن سینا کی مشہور تصنیف ''شفا'' میں اس خوش اُسلوبی سے بیان ہُوا کہ اسلامی دنیائے فکر میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ابن سینا خود آخری عمر میں اس مشائی فلسفے سے بیزار ہو گیا اور اس نے کہا کہ یہ فلسفہ عام لوگوں کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن اہلِ فکر کے لیے ''حکمت المشرقیہ'' ہی مناسب ہے۔ یہاں مشرق سے مراد کوئی جغرافیائی علاقہ نہیں بلکہ اشراق یا نور ہے۔ اس کی دو بنیادیں ہیں ایک تو نورِ روحانی اور دوسری عقلِ ربانی۔ ان دو بنیادوں کو ذکر اور فکر کا اجتماع یا انسان میں پھونکی ہوئی روح خداوندی اور انسان کو عطا کردہ خداداد علمی صلاحیت کا اجتماع بھی کہہ سکتے ہیں۔

شہاب الدین سہروردیؒ

ابن سینا کی ''حکمت المشرقیہ'' کوئی ڈیڑھ سو سال بعد شہاب الدین سہروردیؒ نے ''حکمت الاشراق'' کے عنوان سے اس کی منطقی اور روحانی انتہا تک پہنچایا۔ ''الاشراق'' کی صورت میں اسلامی فلسفہ اور اسلامی روحانیت کا مکمل امتزاج ہو گیا۔ یہ شہاب الدین سہروردیؒ، سہروردیہ سلسلۂ تصوف کے بانی شہاب الدین عمر سہروردیؒ سے مختلف ہیں۔ وہ 1153ء میں ایران کے مغربی حصے کے ایک چھوٹے سے گاؤں سہرورد میں پیدا ہوئے، زنجان اور اصفہان میں تعلیم پائی اور تصوف میں قدم رکھا۔ بعد میں وہ ترکی اور شام گئے اور شام کے شہر حلب میں آباد ہو گئے۔ وہاں بعض فقیہوں (Jurists) کی مخالفت کے نتیجے میں صرف 38 سال کی عمر میں قتل کر دیے گئے۔

شہاب سہروردیؒ ایک عظیم صوفی اور فلسفی تھے جنھوں نے اسلام کے دامن میں اُس دائمی دانش کے لیے جگہ بنائی جسے وہ الحکمۃ العتیقہ کا نام دیتے تھے اور خدا کی ذات کو اس کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ دائمی دانش، فلسفے کے ذریعے تربیت پانے والے نظریاتی ذہن اور تصوف کے ذریعے حاصل ہونے والی پاکیزگی قلب کے ملاپ سے وجود میں آتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جب دانش اور تزکیہ یکجان ہو جائیں تو علم کی وہ اعلیٰ ترین صورت پیدا ہو جاتی ہے جو نہ صرف روح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے بلکہ جو کائنات کو انسان کے لیے ویسے ہی جھکا دے جیسے فرشتے اُس وقت آدم کے سامنے جھک گئے تھے جب خدا نے اُسے ایک طرف علم الاسما سکھا کر دانش دی تھی اور دوسری طرف اس میں اپنی روح پھونک کر تزکیے کی صلاحیت عطا کی تھی۔

اپنی مختصر سی زندگی میں سہروردیؒ نے چالیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ فلسفیانہ نظریات کے لیے انھوں نے عربی زبان چُنی اور شاعرانہ خیالات کے لیے فارسی۔ ان کی تمام تحریریں اسلامی فلسفے اور اسلامی تصوف کے ادبی شہکار ہیں۔ ابن سینا کے مشائی نظریات کی تشریح اور ان کی درجہ بہ درجہ نشوونما کے لیے ان کی ''حکمت الاشراق'' حرفِ آخر سمجھی جاتی ہے۔ ان کی دو فارسی کتابیں ''حقیقت العشق'' اور ''آوازِ پرِ جبریل''...... فارسی زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ''آوازِ پرِ جبریل'' سے اقبالؔ کی 'بالِ جبریل' یاد آ جائے تو کچھ عجب نہیں۔ اقبالؔ سے پہلے شہاب سہروردیؒ ہی ایک ایسی ہستی ہیں جو بیک وقت اعلیٰ ترین فلسفیانہ سوچ اور حسین ترین شاعرانہ سوچ کی مالک تھی۔

Marfat.com

اتنا کہہ کر ہم آگے چلتے ہیں کہ شہاب سہروردیؒ نے اسلام کی پہلی چھ صدیوں کے ذکر وفکر کو اپنی ذات میں اس طرح جمع کر لیا تھا کہ اُس کے بعد وہ اہلِ علم اور اہلِ دل کے لیے ایسی مثال اور معیار بن گئی جس میں نہ صرف علم کے نئے پرانے آفاق سمٹ آئے ہوں بلکہ جس کے علم کی صداقت اس کی پاکیزہ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے عمل سے واضح ہوتی چلی جائے۔ ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد ایران اور برصغیر میں ہم اُن اشراقی فلسفیوں کی ایک لمبی قطار دیکھتے ہیں جو شہاب سہروردیؒ کے نظریات کے خوشہ چین ہیں۔

مُلّا صدرہؒ

اصفہانی مکتبہ فکر کے اس ممتاز ترین نمائندے کا اصل نام ''محمد ابن ابراہیم صدر الدین شیرازی'' تھا۔ وہ 1571ء میں پیدا اور 1640ء میں فوت ہوئے۔ شیعہ فلسفیوں میں وہ اہم ترین مقام کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے تصوّف، فلسفہ اور دینیات کو اپنے افکار میں اس طرح سمویا کہ یہ بظاہر مختلف اور متضاد شعبے یکجان ہو گئے۔ ملّا صدرہؒ نے ارسطو، ابن سینا، اشراقی فلسفی اور صوفی شہاب سہروردیؒ، اور شیعہ عقائد کو ایک یگانہ و یکتا دانشورانہ امتزاج کی صورت دے دی۔ مُلّا صدرہ کے افکار میں ''وجود کے درجات'' کا تعین خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے اس تصور کے مطابق مختلف مخلوقات میں وجود کے مختلف درجات پائے جاتے ہیں۔ کچھ کو وجود کا اعلیٰ اور کچھ کو کمتر درجہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کا یہ تصور نفس یا روح کے اُن درجات سے مطابقت رکھتا ہے جنھیں قرآنِ حکیم نفسِ امارہ، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ کا نام دیتا ہے۔

''نفسِ امارہ'' سب سے کمتر درجہ ہے جس میں انسان اپنی خود غرضانہ خواہشوں، خوراک اور جنسی جذبے کی تسکین کے دائرے کا قیدی ہوتا ہے اور اسے نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ ''نفسِ لوّامہ'' درمیانی درجہ ہے جب انسان یہ تو جانتا ہے کہ اُسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے لیکن وہ اکثر و بیشتر وہی کچھ کرتا رہتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ یوں اُس کی روحانی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ نفس یا روح کی اعلیٰ ترین صورت ''نفسِ مطمئنہ'' ہے جس کے بارے میں قرآنِ حکیم کی ایک خوبصورت ترین آیت ہمیں بتاتی ہے کہ روحانی ترقی کے اس مقام تک پہنچی ہوئی روح جب اس دنیا سے واپس جائے گی تو خدا اس کا یہ کہہ کر استقبال کرے گا، ''اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی طرف اس حال میں آ کہ تو اپنے نیک انجام سے خوش ہو اور خدا تجھ سے خوش ہو۔ آ اور میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا اور میری خاص الخاص جنت میں داخل ہو جا''۔ نفسِ مطمئنہ اُس انسان کو نصیب ہوتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہیے اور وہ کسی جبر سے نہیں، اپنی رضا سے، وہی کچھ کرتا ہے اور کر کے خوش ہوتا ہے۔

ملا صدرہؒ نے وجود کے درجات مقرر کر کے یہ واضح کر دیا کہ گو ہر شخص میں روح تو موجود ہوتی ہے لیکن اس روح کی پرورش اور نگہداشت کے لیے ایمان، علم اور عمل کی ضرورت ہے۔ روحانی ترقی از خود (Automatically) نہیں ہو جاتی، اس کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ کتاب بھی جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اسی سوچ کا نتیجہ اور اسی مقصد کی جانب ایک دعوت ہے۔

Marfat.com

ملاّ صدرہؒ کی اہم، مشہور اور زندۂ جاوید تصنیف ''اسفار الاربعہ'' (چار سفر) بھی روح کے ان چار سفروں یا مدارج سے بحث کرتی ہے جو (1) وہ ماں کے پیٹ سے چلتے ہوئے (2) خدا کے حکم سے اس دنیا میں (3) موت کے ذائقے سے گزر کر (4) ایک نئی زندگی پا کر خدا کے حضور میں پہنچنے تک، طے کرتی ہے۔ مادی دنیا اور خالص روحانی دنیا کے درمیان ایک تخیلی دنیا بھی ہے، جس کی جانب شہاب سہروردیؒ اور ابن عربیؒ پہلے توجہ دلا چکے تھے۔ البتہ یہ ملاّ صدرہؒ ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے انسان کی زندگی میں تخیلی دُنیا کا صحیح صحیح مقام متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ بے شک ہندومت اور اور بدھ مت میں انسان کے مقدر اور موت کے بعد روح کی کیفیات پر بہت مواد مل جاتا ہے لیکن مسلمان مفکروں میں ملاصدرہ ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے روح کے بحرِ بے کنار کا، خصوصاً اس کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کے امکانات کا اتنی گہرائی اور دانائی سے احاطہ کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب قرآنِ حکیم، رسُولِ خدا اور شیعہ اماموں کی اُس روحانی تعلیم کو یکجا کر دیتی ہے جو علم کے ان تینوں اہم سرچشموں نے انسان کے انجام کے بارے میں دے رکھی ہے۔

نقشبندیہ سلسلۂ تصوف

اسلامی تصوف کی تاریخ میں اپنی ہمہ گیر مقبولیت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے نقشبندیہ سلسلے کو واضح امتیاز حاصل ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس کے بارے میں ذرا وضاحت سے کام لیا جائے۔ اس سلسلے کے بانی خواجہ محمد بہاءُالدین نقشبندیؒ تھے جو بخارا میں 1317ء کو پیدا اور وہیں 1389ء میں فوت ہوئے۔ اس سلسلے نے وسط ایشیا میں جڑ پکڑی اور پھر ترکستان، شام، افغانستان اور برصغیر پاک و ہند تک پھیل گیا۔ وسط ایشیا میں تو اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ نہ صرف بڑے بڑے شہروں یا قصبوں میں، بلکہ چھوٹے چھوٹے دیہات میں بھی نقشبندی خانقاہیں اور تکیے موجود تھے۔

برصغیر میں نقشبندی سلسلہ سولھویں صدی میں پہنچا اور یہاں سے اس کے روحانی سفر نے پہلے خواجہ باقی باللہؒ اور پھر ان کے مرید شیخ احمد سرہندیؒ (جو مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہیں) کے زیرِ قیادت نئے ولولے اور دم خم کے ساتھ نئی منزلیں طے کرنی شروع کر دیں۔ سرہند (سابقہ مشرقی پنجاب اور موجودہ صوبہ ہریانہ میں، دہلی کے قرب و جوار میں واقع ایک قصبہ) کے نقشبندی مرکز نے وسط ایشیا کے مرکزوں کو بھی مات کر دیا۔ مغل شہنشاہ جہانگیر نے اپنی تزک (Autobiography، آپ بیتی) میں لکھا ہے کہ ''مغل سلطنت کے شہر شہر اور قریے قریے میں نقشبندی خانقاہیں بن چکی ہیں اور اب اس سلسلے کا اثر برصغیر سے واپس وسط ایشیا میں پہنچنا شروع ہو گیا ہے''۔ 19ویں صدی میں اس سلسلے کے ایک دہلوی صوفی، شاہ غلام علیؒ کے مرید تو ترکی، شام، عراق، مصر، چین اور حبشہ (Ethiopia) تک پھیل چکے تھے۔ نقشبندی خانقاہیں متعدد براعظموں میں کام کر رہی تھیں اور بڑے بڑے نقشبندی بزرگ نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر سرگرمِ عمل تھے۔

اس سلسلے کا اثر یورپ تک بھی جا پہنچا چنانچہ بیسویں صدی کے دو مشہور روسی صوفی اور فلسفی گرڈ جیف

Marfat.com

(Gurdjieff)اوراوسپنسکی (Ouspensky) تصوّف کی حد تک اسی سلسلے کے خوشہ چین تھے۔ گرڈ جیف (1877-1949ء) نے اپنی کتاب ''قابل قدر ہستیوں سے ملاقات'' (Meeting with the Remarkable Men) میں خود اس کا اقرار کیا ہے۔ اوسپنسکی تک یہ اثر گرڈ جیف کے ذریعے سے پہنچا۔ جب روس میں کمیونسٹ انقلاب آ گیا تو اوسپنسکی لندن منتقل ہو گیا اور یوں یورپ کے چیدہ چیدہ لوگ بعض نقشبندی خیالات اور عملیات (Practices) سے بالواسطہ طور پر واقف ہو گئے۔ اوسپنسکی کی کتاب "Tertium Organum" کا حوالہ اقبال نے بھی اپنے خطبات میں دے رکھا ہے۔ جو اہلِ ذوق گرڈ جیف کے افکار کو زیادہ گہرائی میں جاننا چاہیں انھیں اوسپنسکی کی دو کتابیں In Search of the Miraculous (معجزے کی تلاش میں) اور The Fourth Way (چوتھا راستہ) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان دونوں کتابوں میں اوسپنسکی نے اپنے نہیں بلکہ گرڈ جیف کے خیالات اور وہ تعلیمات قلمبند کی ہیں جو گرڈ جیف نے زیادہ تر وسط ایشیا کے نقشبندی بزرگوں اور خانقاہوں سے سیکھی تھیں۔ اوسپنسکی کے اپنے نظریات A New Model of the Universe (کائنات کا ایک نیا نمونہ) میں بیان ہوئے ہیں۔ اُردو قارئین ہمارے عہد کے منفرد شاعر اور نفسیات دان شہزاد احمد کی تصنیف ''گرڈ جیف: معجزے کی تلاش میں'' میں گرڈ جیف کے حالات اور افکار کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جس طرح اسلامی تصوف کی تاریخ میں شمسؒ اور رُومیؒ کی دوستی نے ایک اہم اور دلچسپ باب کا اضافہ کیا تھا اسی طرح جدید مغربی تصوف میں گرڈ جیف اور اوسپنسکی کی دوستی نے بھی خاصے نئے رنگ بھرے ہیں۔

مغرب تو اپنی مادی ترقی کے زور پر مشرق کے اوپر پَر پھیلا رہا تھا لیکن مشرق سے اگر کچھ مغرب کی جانب جا رہا تھا تو وہ نقشبندی سلسلے کی سرگرمیاں ہی تھیں۔ ترکی اور وسط ایشیا کی بحالی ء دین کی تحریکوں (The Revivalist Movements) کے پیچھے بھی نقشبندیہ ہی کی اخلاقی مدد کارفرما تھی۔ برصغیر میں مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور میں مجدد الف ثانیؒ نے بہت کھل کر مذہبی ''بے اعتدالیوں'' خصوصاً شیعہ علماء کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ پر تنقید کی اور اس کی پاداش میں قید و بند کی سختیاں برداشت کیں۔ یہی نہیں، نقشبندیہ سلسلے نے برطانوی عہد میں تحریکِ مجاہدین کے زیرِ عنوان عملی جہاد کا آغاز کر دیا۔ اس تحریک کے قائد سید احمد بریلویؒ تھے جو 1831ء میں سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے صوبہ سرحد کے قصبے بالاکوٹ میں شہید ہو گئے۔ مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک کے پیچھے بھی نقشبندی طرزِ فکر و عمل موجزن دیکھا جا سکتا ہے۔ مشہور مصری مصلح (Reformer) محمد رشید رضا بھی نقشبندیہ سے متاثر ہوئے تھے۔

اپنی پوری تاریخ میں دو باتیں نقشبندی سلسلے کی پہچان بنی رہی ہیں۔ ایک تو شریعت اور رسولِ خدا کی سنت کی پوری پوری پیروی اور دوسری، حکمران طبقے کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو متاثر کرنے کی سنجیدہ اور انتھک کوشش یہاں تک کہ ریاست اور مذہب قریب سے قریب تر آ جائیں۔ ان کی اس کوشش کے پیچھے جو عقیدہ کام کر رہا تھا، اقبال نے اُسے، '' جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' کے الفاظ دیے تھے۔ نقشبندیہ کا یہ عقیدہ آج بھی پورے عالم اسلام میں

جمہوریت کے مسلہ اور بنیادی طور پر سیکولر تصور کی عملدر آمد کے راستے میں سب سے اہم رکاوٹ بنا ہُوا ہے اور اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس سلسلۂ تصوف نے مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی کو بلا واسطہ اور بالواسطہ کتنے وسیع پیانے پر متاثر کر رکھا ہے۔ اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں اسلامی تحریکیں اور جماعتیں علی الاعلان سیاست میں کودی ہوئی ہیں اور قریب قریب ہر مسلمان ملک میں ان کا جمہوریت کے سیکولر (دین اور سیاست کو الگ الگ رکھنے اور تمام مذاہب کو یکساں اہمیت دینے والے) خیالات کی حامل حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کے ساتھ تصادم ہو رہا ہے۔

آج پوری دنیائے اسلام میں ایسی انتہاپسند جماعتیں، گروہ اور افراد موجود ہیں جو اپنے حکمرانوں کی تبدیلی کے لیے تشدد اور جبر کو جائز سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قادریہ سلسلے کے بانی حضرت عبدالقادرؒ جیلانی بھی حکمرانوں کی بدعنوانی اور بے لگامی سے نالاں تھے۔ لیکن ان کا عقیدہ تھا، ''جیسے عوام ویسے ان کے حکمران''۔ اس عقیدے کے مطابق دوسروں پر تنقید کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکنا ضروری تھا۔ جب اس کے برعکس یہ عقیدہ سامنے آیا کہ ''الناسُ علی دِینِ مُلو کِھم'' (عوام تو اپنے حکمرانوں کے نقش قدم پر چلتے ہیں) تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ حکمران بُرا ہو تو معاشرہ بھی بُرا ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کو پہلے پہل خارجی فرقے نے اپنایا۔ یہ لوگ حکمرانوں کو اس حد تک نشانہ تنقید بناتے تھے کہ انھیں حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی ذات بابرکات میں بھی اتنے نقص نظر آئے کہ انھوں ''اسلام کے صحیح نفاذ'' کے نام پر انھیں بے دردی سے شہید کر دیا۔

نقشبندی بزرگ خارجیوں جیسے سخت گیر تو نہیں تھے لیکن انھوں نے اپنے زیرِ اثر پوری دنیائے اسلام میں حاکم اور حکومت کے لیے اتنا اونچا معیار مقرر کر دیا جس پر رسُولِؐ خدا کے بعد خلفائے راشدہ کے سوا کوئی بھی پورا نہ اتر سکتا تھا۔ مصر میں انور سادات کا قتل ہو یا پاکستان میں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے پہلے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک ہو، ان سب کے پیچھے یہی تصور کام کرتا نظر آتا ہے کہ ایک خاص حکمران کو نکال باہر کر دیا گیا تو بس اسلام یا نظامِ مصطفیٰؐ نافذ ہو جائے گا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دُودھ اور شہد کی نہریں بہہ نکلیں گی۔

برصغیر میں نقشبندیہ کے بانی، امامِ ربانی شیخ سید احمد سرہندیؒ اکثر فرماتے تھے: ''بادشاہ روح ہوتا ہے اور عوام جسم۔ اگر بادشاہ گمراہ ہو جائے تو لوگ بھی گمراہ ہو جائیں گے''۔ اس تعلیم میں جتنی بھی صداقت ہو اس کا نتیجہ بہر حال یہ نکلا کہ معاشرے کی ہر سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور فکری کمی، کوتاہی اور کج روی کی تمام تر ذمہ داری بادشاہ، صدر یا وزیرِ اعظم پر ڈال دینا بہت آسان ہو گیا اور اب بس ایک ہی کام کرنے کے لائق رہ گیا کہ کسی نہ کسی طرح اس حکمران کو بدل دیا جائے، اللہ اللہ خیر صلا۔

اسلامی تصوف کے زیادہ تر سلسلے رسُولِؐ خدا سے اپنا تعلق حضرت علیؓ کے وسیلے سے قائم کرتے ہیں لیکن نقشبندیہ آپؐ سے اپنا تعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حوالے سے جوڑتے ہیں۔ یاد رہے کہ خلفائے راشدہ (رسُولِؐ خدا کی وفات کے بعد پہلے چار خلیفوں) میں سے صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی ہیں جنھوں نے قدرتی وفات پائی ورنہ حضرت عمرؓ،

Marfat.com

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت قتل کے ذریعے ہوئی۔ جن اہلِ ذوق کو اس صورت حال کے ساتھ زیادہ گہری دلچسپی ہو وہ مصری مصنف، طٰہٰ حسین کی کتاب ''الفِتنۃُ الکُبریٰ'' ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

نقشبندیہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ سلسلہ دُنیوی درجات کی طرح روحانی درجات (احوال و مقامات) کا بڑی وضاحت کے ساتھ تعین کرتا ہے۔ اتنی عرق ریزی اور تفصیل سے یہ کام کسی اور سلسلۂ تصوف نے نہیں کیا۔ اسی طرح نقشبندی بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھا کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ انھیں ایمان کی حد تک یقین تھا کہ خدا نے انھیں انسانوں کے درمیان کسی اہم اور تاریخی کام کے لیے بھیجا ہے۔ خواجہ بہاء الدین نقشبندیؒ سے لے کر شاہ غلام علی دہلویؒ تک، مجدد، قیوم، قائم اور مہدی جیسے القابات سے ان بزرگوں کے مقصدِ حیات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں شیخ احمد سرہندیؒ کا لقب مجدد الف ثانی خصوصاً اہم ہے۔

مجدد سے مراد ہے کہ دین اسلام میں وقت کی گردش اور حکمرانوں کی ذاتی اغراض کے باعث جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں انھیں دُور کر کے اُسے اس کی اصل صورت میں بحال کرنے والی شخصیت۔ روایات کے مطابق اس غرض سے خدا ہر صدی کے آغاز میں اپنے کسی نیک بندے کو مامور کرتا رہتا ہے۔ اور اب جو صدی آ رہی تھی اس سے تو ایک ہزار سالہ دور شروع ہونے والا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب عیسوی کیلنڈر کے مطابق 2000ء کا آغاز ہو رہا تھا تو ساری دُنیا میں کیسے ایک غلغلہ مچا ہُوا تھا۔ چنانچہ جب ہجری کیلنڈر کے مطابق 1000ھ شروع ہُوا تو عالم اسلام میں بھی اسی طرح کا جوش و خروش اور ایک نئی امید پیدا ہو گئی۔ یاد رہے کہ عربی میں الف ''ہزار'' کو کہتے ہیں۔ مثلاً الف لیلہ ولیلہ کا مطلب ہوگا ''ایک ہزار اور ایک راتیں''۔ الف ثانی کا مطلب تھا: دوسرا ہزار سالہ دور۔ گویا اس طرح شیخ احمد سرہندیؒ کا مقصد حیات دوسرے ہزار سالہ دور میں دین کو نئی زندگی دینا تھا۔

نقشبندی بزرگوں کے انفرادی رویے کے بارے میں ایک وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ نقشبندی اعتقاد رکھنے والے لوگ اپنے پیر و مرشد کی عقیدت میں کسی دوسرے سلسلۂ تصوف کے معتقدوں سے کسی طور پر کم نہ تھے لیکن خود نقشبندی بزرگ اپنے سے پہلے بزرگوں کی روش سے ہٹ کر نئی روش اپنانے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ اس آزادانہ رویے کے پیچھے ہر بزرگ کا اپنا اپنا مقصدِ حیات ہوتا تھا جس کی تکمیل کے لیے وہ حسبِ ضرورت اپنے سے پہلے بزرگوں سے مختلف نظریہ یا طریقہ اختیار کر لیتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے علاوہ اُن سے پہلے کے بہت سے بزرگوں سے ''وحدت الوجود'' کے مسئلے پر انحراف کرتے ہوئے ''وحدت الشہود'' کا نظریہ پیش کیا۔ مگر بعد میں شاہ ولی اللہؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ نے مجدد الف ثانیؒ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے ایک بار پھر ''وحدت الوجود'' کو ترجیح دی۔ اسی طرح مظہر جانِ جاناںؒ نے نہ صرف ہندومت کے ویدوں کو تورات، زبور، انجیل اور قرآن حکیم کی طرح الہامی کتابیں تسلیم کیا بلکہ ہندوؤں کی بُت پرستی کا جواز بھی پیش کیا، اگرچہ ان کے اپنے مرید شاہ غلام علیؒ نے ان خیالات کی تردید کی۔

Marfat.com

نقشبندیوں میں ''تصورِ شیخ'' کا عقیدہ بھی بہت مقبول تھا لیکن مجدد الف ثانی نے اسے رد کردیا۔ ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو نقشبندیہ کی یہ آزادیٔ فکر و عمل ایک طرح کا اجتہاد تھا جس سے اسلامی شریعت کے علمبردار بڑی حد تک محروم رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہُوا کہ نقشبندی سلسلۂ تصوف کسی تالاب یا کسی ایسی جھیل کے بجائے جس میں تازہ پانی کی آمد اور باسی پانی کے اخراج کا بندوبست نہ ہو، ہر موسم میں بہتا ہُوا تازہ پانی کا دریا بن گیا۔

خواجہ بہاءُالدین نقشبندؒ

نقشبندی سلسلے کے بانی خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ کے بارے میں تین باتیں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی بات، آپ نے تصوف کی تربیت کے ایک اہم جُز کے طور پر سات سال تک مویشی چرائے اور پھر سات سال تک سڑکوں کی مرمت کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ایک عام مزدور کے طور پر کام کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ اس طرح کی تربیت سے صوفی کے دل میں موجود خدا اور خلقِ خدا کی محبت کو پھولنے پھلنے کا موقع ملتا ہے اور اس کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ پختہ ہوجاتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ آپ کے خیال میں توحید کے علم کی انتہا کو پہنچنا آسان ہے لیکن اس کی معرفت مشکل ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ روحانی علم (Divine Knowledge) اور روحانی واردات (Spiritual Experience) کے درمیان فرق کرتے تھے۔ گویا آپ کے نزدیک توحید کا علم ہمارے ذہن میں اور ہماری زبان پر تو موجود ہوتا ہے لیکن ہمارے دل اور ہمارے عمل کا حصہ اسی وقت بنتا ہے جب وہ ایک واردات کے طور پر ہمارے خون اور سانسوں میں رچ بس جائے۔ آج اگر ہم عالمِ اسلام کی سیاسی، معاشی، سماجی اور اخلاقی بے بسی پر نظر ڈالیں تو یہی راز کھلے گا کہ ہم مسائل کا حل جانتے تو ہیں لیکن ہمارا دل ہمیں اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

تیسری قابلِ توجہ بات یہ تھی کہ آپ اپنے مریدوں اور مصاحبوں کو ایک دوسرے سے رقابت، حسد، بدخوئی اور غیبت کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کے ایک مرید نے کسی دوسرے شخص کی کردار کُشی کی تو آپ نے اپنے مریدوں کو سبق سکھانے کے لیے اُس شخص کے گھر جا کر اُس کے دروازے پر اپنی پیشانی رگڑ رگڑ کر اپنے مرید کی طرف سے معافی چاہی۔ کیا سیاست اور کیا درس و تدریس، ذرا رُک کر زندگی کے کسی بھی شعبے میں جھانک کر دیکھیے کہ ''تقسیم کرو اور راج کرو'' (Divide and Rule) کے روایتی رویے کے مطابق حکمران اور قائدین کیسے ایک انتھک کوشش کرتے نظر آئیں گے کہ اپنی کرسی یا مسند بچانے کے لیے، ایک کو دوسرے کے خلاف شہ دے کر، خاص طور پر اپنی جگہ لینے کے قابل ''جوہر'' کو پنپنے نہ دیا جائے۔

خواجہ بہاءالدین نقشبندؒ کے خلفاء میں علاءُالدین عطارؒ (فریدالدین عطار نہیں) اور خواجہ محمد پارساؒ زیادہ اہم ہیں۔ عطارؒ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے مرشد کے نئے حلقہ بگوشوں کی روحانی تربیت کریں۔ انھوں نے اپنے مدلل اور دلنشین اندازِ تدریس کے باعث سلسلے کے ابتدائی دور میں اسے مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں زبردست خدمات انجام دیں۔

Marfat.com

خواجہ محمد پارساؒ نے ایک تو اپنے مرشد کی مختلف محفلوں میں گفتگو کو قلمبند کر کے سلسلے کی روحانی تعلیم کے عملی پہلو کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا اور دوسرے انھوں نے نقشبندیوں میں مولانا روم (رومیؒ) کی مثنوی سے دلچسپی پیدا کی۔ آپ کی دو اور باتوں کا ذکر کر کے ہم آگے چلیں گے۔ ایک تو آپ فرماتے تھے کہ روحانی ترقی کے اگر دس درجے ہوں تو نو درجے اپنے ہاتھ سے کمائے ہوئے رزقِ حلال سے طے ہو جاتے ہیں۔ آپ کی اس تلقین کے حوالے سے ذرا برصغیر، خصوصاً پاکستان کے پیروں کی اُس اولاد پر نظر ڈالیے جسے ورثے میں کروڑوں کی جائیداد ملی ہوئی ہے اور جنھوں نے کبھی اپنے ہاتھ سے تنکا بھی نہیں توڑا ہوتا۔ دوسرے، آپ کا ارشاد تھا کہ خدا سے دعا اس طرح مانگو جیسے بسترِ مرگ پر پڑا ہُوا کوئی مریض پورے خضوع وخشوع سے، ایمان اور آخری امید کے ساتھ اپنے لیے شفا مانگتا ہے۔

خواجہ عبیداللہ احرارؒ

نقشبندیہ میں خواجہ عبیداللہ احرارؒ کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس سلسلے کے غالباً سب سے زبردست ولی تھے۔ وہ تاشقند میں 1403ء کو پیدا اور 1490ء میں فوت ہوئے۔ آپ کا بچپن اور لڑکپن تو سخت غربت و افلاس میں گزرا البتہ بعد میں آپ اپنے ہاتھوں سے کاشت کاری کر کے آہستہ آہستہ بہت امیر کبیر ہو گئے۔ لیکن پھر بھی ان کا طریق ''امیری نہیں فقیری'' ہی رہا اور وہ عمر بھر خدا کے حکم کے مطابق دل و جان سے ''اپنے مال میں ہر سائل و محروم کا جانا پہچانا حق'' تسلیم کرتے رہے۔

اپنے لڑکپن میں خواجہ احرارؒ نے خواب میں حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا اور ان کے قدموں میں گر گئے۔ عیسیٰؑ نے آپ کو اٹھایا اور فرمایا، ''پریشان مت ہو، ہم تمھاری تربیت کریں گے''۔ خواجہ صاحبؒ نے اس خواب کی یہ تعبیر کی کہ جس طرح حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، خدا انھیں بھی شرف عطا کرے گا کہ وہ مردہ دلوں کو زندہ کر دیں۔ آپ کی زندگی کے اس روحانی تجربے کے ذکر سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ تصوف کی روح کو سمجھنے والے صوفی جس طرح خدا کی وحدت کے قائل ہوتے ہیں اُسی طرح وہ خدا کی ساری مخلوق اور اس کے سارے پیغمبروں کی وحدت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

جس طرح خواجہ احرارؒ کی دولت بے حساب تھی اسی طرح ان کے انکسار اور سخاوت کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ آپ غرور کو برائیوں کی جڑ قرار دیتے تھے کہ اسی نے تو ابلیس کو ''راندۂ درگاہِ خدا'' بنا دیا تھا۔ عقیدت مندوں کو غرور سے بچانے کے لیے آپ اکثر انھیں مشہور صوفی بزرگ بایزید بسطامیؒ کی زندگی کا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک روز بایزیدؒ بازار میں جا رہے تھے کہ آپ نے دیکھا ایک کتا پانی میں بھیگا قریب سے گزر رہا ہے۔ آپ نے اپنی قباء کا دامن سمیٹ لیا کہ کہیں اس پر کوئی چھینٹ نہ پڑ جائے۔ کتے نے کہا، ''صوفی صاحب، اگر آپ کا لباس میرے بدن سے چھو جاتا تو تھوڑا سا پانی اُسے دھو کر پاک کر دیتا۔ لیکن اُس غلاظت کا کیا علاج جو آپ نے اپنے آپ کو مجھ سے پاک تر سمجھ کر اپنے ہاتھوں سے اپنے لباس پر ڈال لی ہے؟ اسے کون سا پانی دھوئے گا؟''

Marfat.com

خواجہ صاحبؒ کا ایمان اور پیغام یہی تھا کہ غرور اور حقارت انسان کے اخلاقی اور روحانی قد و قامت کو گھٹا دیتے ہیں جب کہ ہر اچھے بُرے انسان کی، انسان ہونے کے ناتے تکریم اور انسانیت کی بے غرضانہ خدمت سب سے اعلیٰ روحانی قدر ہے۔ غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور افراد کے ساتھ حسنِ سلوک اور حتی الامکان ان کی مدد آپؒ کے ایمان اور پیغام کا عملی ثبوت تھا۔ یہی نہیں، آپ تو جانوروں سے بھی انسانوں کی طرح ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ آج ہم اپنے اردگرد کے اکثر و بیشتر پیروں اور پیرزادوں کو اس معیار پر تولیں کہ کیا وہ جانوروں سے انسانی قدروں کے مطابق پیش آتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ نہیں، وہ تو انسانوں کے ساتھ بھی جانوروں جیسا سلوک کرتے ہیں۔

خواجہ احرارؒ اکثر کہتے، ''لوگ طرح طرح کے دروازوں سے اپنی روحانی منزل تک پہنچتے ہیں۔ میں نے اپنی منزل خدمتِ خلق کے دروازے سے حاصل کی ہے۔ میرے نزدیک وہ شخص ظالم اور بے رحم ہے جس کا دل مظلوموں اور محروموں کی حالت پر نہ پگھلے۔ انسان کا دل تو جانوروں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر بھی موم ہو جانا چاہیے''۔ خواجہ صاحب پر ابن عربیؒ کے نظریات کی گہری چھاپ تو تھی ہی، سونے پر سہاگا، رومیؒ کی مثنوی نے آپ کی روحانی عظمت کو پر لگا دیے۔ آپ نے پورے وسط ایشیا میں مثنوی مولانا رومؒ کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

خواجہ احرارؒ کے دو جداگانہ تصورات خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ ایک، موت کے بعد انسان ہمیشہ کے لیے کسی ایک ہی حالت پر نہیں ٹھہرا رہتا بلکہ اس کی ذہنی، قلبی اور روحانی ترقی جاری رہتی ہے۔ آپ اپنے اس تصور کو ''ترقی بعد الموت'' کا نام دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''موت انسان کے سفر کا محض ایک سنگِ میل ہے''۔ میر تقی میرؔ نے اس تصور کو یہ الفاظ دیے تھے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
گویا آگے چلیں گے دم لے کر

خواجہ صاحبؒ کا دوسرا تصور یہ تھا کہ جمادات (مٹی، دھاتوں، پتھروں) میں بھی زندگی موجود ہے اور وہ انسان کے عمل پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتے رہتے ہیں، یہ الگ بات کہ انسان اس ردِ عمل کو دیکھ نہ پائے۔ غالبؔ نے اس تصور کو یہ الفاظ دیے تھے:

ہُوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بے تاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

وہ حقیقتیں جو سائنس دانوں پر صدیوں بعد منکشف ہوئیں، صوفیوں نے انھیں ان سے بہت پہلے سادہ لفظوں میں بیان کر ڈالا تھا۔ آج جوہری دور میں مادے کے اندر نور اور قوت (Energy) دریافت ہو چکی ہے لیکن ابھی سائنس یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ مادے میں احساس بھی موجود ہے یا نہیں۔ نباتات میں تو جذباتی ردِ عمل کی صلاحیت ڈھونڈی جا چکی ہے لیکن ابھی سائنس دان خواجہ احرارؒ اور غالبؔ کی طرح یہ کہنے کو تیار نہیں کہ غالبؔ کے پاؤں کی زنجیر بنانے کے لیے جس

Marfat.com

لوہے کی ضرورت تھی اُسے جوہر کی جنبش (ایٹمی سرگرمی) نے کان (Mine) کے اندر ہی بے تاب کر دیا۔ غور فرمائیے کہ یہ حضرات نہ صرف لوہے کے ایٹموں کی گردش ہی سے واقف ہیں بلکہ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ادھر یہ فیصلہ ہُوا کہ غالبؔ کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی جائے، اُدھر اُس لوہے میں بے تابی پیدا ہوگئی جس سے یہ زنجیر ڈھالی جانی تھی۔ غالبؔ تک تو یہ تصور شاید خواجہ احرارؒ سے آیا ہو لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خواجہ صاحبؒ تک یہ ابن عربیؒ اور رُومیؒ سے آیا تھا۔ آج اکیسویں صدی میں امریکہ جیسے ''ترقی یافتہ'' ملک میں یہ بحث چل رہی ہے کہ سکولوں میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء (Evolution) پڑھایا جائے یا نہیں لیکن تیرھویں صدی میں رُومیؒ ''دیوانِ شمس'' میں یہی نظریہ پیش کرتے ہیں اور عالمِ اسلام میں کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ ذرا سنیے وہ کیا کہتے ہیں:

تمھاری پیدائش کے لمحے ہی سے تمھارے لیے
ایک سیڑھی مہیا کر دی گئی تھی
پہلے تم ایک دھات تھے، ایک پودا تھے، ایک جانور تھے
تمھارے ارتقاء کے بارے میں کوئی شبہ نہیں
پھر تم انسان بن گئے
تمھیں علم، ایمان اور دانش سے نوازا گیا
ذرا اپنے جسم پر نظر ڈالو
فطرت کے کوڑے دان سے نکل کر تم کس کمال کو پہنچ گئے ہو
اپنے انسانی قالب کو ترک کر کے، موت کے دروازے سے گزر کر
تم ایک فرشتہ بن جاؤ گے
زمین پیچھے رہ جائے گی اور تم جنت کی جانب چل دو گے
فرشتے کی منزل طے ہوگی تو تم وہ بحرِ بے کنار بن جاؤ گے
جس کا ہر قطرہ ان گنت سمندروں سے بڑا ہوگا

خواجہ عبیداللہ احرارؒ کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت شخصیت کے ذکر کو مختصر کرنا بہت مشکل ہے۔ یوں کرتے ہیں کہ آپ کی یہ تین باتیں ذہن نشین کر کے آگے چل دیتے ہیں:

(1) آپ اپنے مریدوں کو تلقین کرتے تھے کہ صاف ستھرے رہیں اور صاف ستھرا لباس پہنیں۔ آپ کی اس تلقین کے پیچھے خدا کا رسُولؐ خدا کو دیا ہُوا یہ حکم تھا، ''اے کملی والے، اُٹھ اور لوگوں کو خبردار کر اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر اور اپنے کپڑے پاک رکھ اور گندگی سے گریز کر'' (73:1-5)۔

Marfat.com

(2) آپ کی تلقین یہ تھی کہ جب ہم کسی کو اپنا مرشد تسلیم کرلیں تو اس کی پوری پوری عزت اور اطاعت کریں۔ عام طور پر تصوف میں مرشد کا مقام نہ صرف اہم بلکہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس اہمیت اور ضرورت کو بُلھے شاہؒ نے یہ الفاظ دیے تھے:

بناں مُرشداں راہ نہ ہتھ آندے
دُدھاں باجھ نہ پکدی کھیر میاں
(مرشد کے بغیر صراطِ مستقیم ہاتھ نہیں آتا جیسے دودھ کے بغیر کھیر نہیں پک سکتی)

لیکن خواجہ عبید اللہ احرارؒ فرماتے تھے کہ جب خدا نے رسُولِ خدا کی زندگی ہی میں ہم پر ہمارا دین مکمل کردیا (3:5) تو اصولاً قرآنِ حکیم اور رسُولِ خدا کی سنت کے علاوہ روحانی ہدایت کے لیے کسی مرشد کی ضرورت لازمی قرار نہیں دی جاسکتی۔

(3) خواجہ احرارؒ فرماتے تھے کہ روحانی مراقبے اور مجاہدے اسی وقت تک کرنے چاہئیں کہ ہم ان کے دوران تکلیف میں مبتلا نہ ہوجائیں اور وہ تکرار کے باعث بے معنی اور بے لطف ہوکر اپنی تازگی نہ کھودیں۔ آپ ابتدائی دورِ اسلام کی مشہور صوفی خاتون رابعہؒ کی طرح اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ روحانیت کے متلاشی اپنے دل سے جنت کی خواہش اور دوزخ کا خوف نکال کر صرف اور صرف خدا سے محبت کو پیشِ نظر رکھیں۔

آخری بات، آپ عوام کے ساتھ ساتھ خواص سے بھی میل جول رکھتے تھے۔ کئی تیموری شہزادے، شہنشاہ بابر کے والد عمر شیخ مرزا اور خود بابر آپ کے معتقدوں میں شامل تھے۔ بلکہ بابر نے اس پکے یقین کے ساتھ آپ کی واحد تصنیف ''رسالۂ والدیہ'' کا فارسی میں ترجمہ کیا کہ اس نیک کام کی بدولت خدا اُسے بیماری سے شفا بخش دے گا۔ بہت بعد میں بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کی شدید علالت کے دوران اُس کے پلنگ کے گرد چکر بھی اس طرح کے عقیدے کے تحت لگائے تھے کہ خدا ہمایوں کی جگہ اس کی جان لے لے۔ ایک مرتبہ اپنی بیماری سے شفا پاکر اور دوسری مرتبہ بیٹے کی بیماری کے عوض اپنی جان قربان کرکے بابر نے جس قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کیا تھا وہ اُسے خواجہ عبید اللہ احرارؒ ہی سے ملی تھی۔

عبدالرحمٰن جامیؒ

نقشبندیہ کی ادبی اور روحانی تاریخ میں عبدالرحمٰن جامیؒ کا بہت اونچا مقام ہے۔ آپ 1414ء کو پیدا اور 1492ء میں فوت ہوئے۔ جامیؒ نے خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے روحانی تعلیم کی تکمیل کی چنانچہ ان کی ایک مشہور مثنوی کا نام ''تحفۃ الاحرار'' ہے۔ جس طرح خواجہ احرارؒ نے اپنی کتاب ''رسالۂ والدیہ'' اپنے والد سے منسوب کی تھی اسی طرح جامیؒ نے اپنی مثنوی خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کردی۔ جامیؒ کے مقام کا اندازہ ان کے مرشد ہی کے بیان سے کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ جامیؒ کو ابن عربیؒ کے افکار کا بہترین ترجمان سمجھا جاتا ہے لیکن خود جامیؒ نے ابن عربیؒ کے مشکل ترین تصورات کی گتھیاں خواجہ احرارؒ ہی کی مدد سے سلجھائیں۔ ابن عربیؒ پر خود سند ہونے کے باوجود جامیؒ

Marfat.com

علم و عرفان کے پیاسوں کو خراسان سے خواجہ احرار ؒ کی خدمت میں تاشقند بھیجا کرتے تھے۔ ان کی اس روش پر خواجہ صاحب ؒ فرماتے، ''بھلے لوگو، جب وہاں مولانا جامیؒ موجود تھے تو آپ نے اتنی دُور آنے کی زحمت کیوں کی۔ عجیب بات ہے کہ خراسان میں نور کا دریا بہہ رہا تھا اور تم ایک موم بتی سے روشنی لینے تاشقند چل دیئے''۔ یہ صورت حال جامیؒ اور خواجہ احرارؒ...... دونوں کے انکسار کی مُنہ بولتی مثال ہے۔

جامیؒ نے ابن عربیؒ کے تصورات کے پیچیدہ اور مُبہم حصوں کو عام فہم بنانے میں بہت اہم حصہ لیا۔ ابن عربیؒ کے علاوہ انھوں نے رومیؒ اور پارساؒ کو بھی خوب شہرت بخشی۔ اس تمام تر کوشش کا مجموعی نتیجہ ''وحدت الوجود'' کی مقبولیت کی صورت میں نکلا۔ جامیؒ کے روحانی رویے پر اُن کے جمالیاتی ذوق کا بہت اثر تھا۔ وہ روحانی نشوونما کے لیے ''عشق'' اور ''عشقِ الٰہی'' کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی انسان سے عشق (عشقِ مجازی) خدا سے عشق (عشقِ حقیقی) کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ عشق انسان کے لیے ایک جذباتی محور مہیا کر دیتا ہے اور اس کی شخصیت میں مرکزیت اور وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو مرید عشقِ مجازی میں مبتلا ہو چکا ہو اُس کے مرشد کے لیے آسان ہو جاتا ہے کہ اس کے جذبے کو مجاز کی سطح سے اوپر اٹھا کر حقیقت کی سطح پر لے جائے۔ جن قارئین کو سرائیکی، پنجابی، سندھی اُردو اور فارسی شاعری سے لگاؤ ہے وہ آسانی سے پہچان سکتے ہیں کہ ہمارے شاعروں پر جامیؒ کے اس تصور نے کتنا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ یہ بھی جانی بوجھی بات ہے کہ صوفیوں کے ذریعے سے اسلام قبول کرنے والے اور شاعری سے لطف اندوز ہونے والے ہمارے عوام میں بھی یہ تصور عام ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہیر رانجھا جیسی مقبولِ عام عشقیہ کہانیوں کی بھی روحانی تشریح کی جاتی ہے۔ چنانچہ وارث شاہ ''ہیر'' کا آغاز یوں کرتے ہیں کہ سب سے پہلا عاشق تو خدا ہے جس نے رسُولِ خدا سے عشق کیا اور اختتام یہ کہہ کر کرتے کہ یہ ساری کہانی دراصل روح اور جسم یا خدا اور بندے کے باہمی تعلق کی بابت تھی۔

سولھویں صدی کے اواخر میں نقشبندیہ کا مرکز وسط ایشیا سے برصغیر پاک و ہند کی طرف منتقل ہونے لگا۔ خواجہ باقی باللہؒ جو افغانستان میں 1563ء کو پیدا ہوئے، سمرقند اور بخارا سے ہوتے ہوئے کشمیر کے راستے ہندوستان میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کے اپنے الفاظ میں اس آمد کے معنی یہ تھے، ''ہم اپنے سلسلۂ تصوف کے مقدس بیج سمرقند و بخارا سے لائے اور انھیں ہندوستان کی زرخیز زمین میں بو دیا''۔ انھیں یہاں ان بیجوں کو پھولتا پھلتا دیکھنے کا صرف پانچ سال کا مختصر عرصہ میسر آیا کیونکہ وہ 1603ء میں صرف چالیس سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ لیکن اپنی بے پناہ انتظامی صلاحیت، پُرکشش شخصیت اور ملنسار طبیعت کی بناء پر انھوں نے ہندوستان کے علماء، صوفیاء، زمینداروں اور منصب داروں (Officials) تک اپنا پیغام کمال حُسن و خوبی کے ساتھ پہنچا دیا۔

خواجہ باقی باللہؒ

خواجہ باقی باللہؒ ''وحدت الوجود'' کے تصور کے تحت سے قائل تھے۔ آپ کی شاعری بھی زیادہ تر اس تصور ہی کی وضاحت کرتی ہے۔ آپ کی خانقاہ بہت وسیع تھی جہاں لوگوں کے لیے طعام اور قیام کا اچھا انتظام ہوتا تھا۔ لیکن آپ کسی کو

Marfat.com

وہاں تین دن سے زیادہ مہمان نہیں رکھتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی ہی بہترین رزقِ حلال ہے۔ آج ہم مسلمان معاشروں میں جو اخلاقی انحطاط دیکھتے ہیں اُس کی بڑی وجہ علماء کے علاوہ صوفیاء کے کردار کا انحطاط ہے۔ ہمارے علماء تو پہلے بھی صرف شرعی قوانین کی پابندی پر زور دیتے تھے اور ان قوانین کے پیچھے جو اخلاقی قدریں کارفرما تھیں انھیں نظرانداز کر دیتے تھے۔ یہ صوفیاء ہی تھے جن کی خانقاہوں اور درگاہوں پر نیک اور بد، امیر اور غریب کو نہ صرف زبانی خوش آمدید کہا جاتا تھا بلکہ سینے سے لگایا جاتا تھا اور انھیں محض رسمی عبادات ہی کی تلقین نہیں کی جاتی تھی بلکہ پوری زندگی کو عبادت بنانا سکھایا جاتا تھا۔ مگر اب بیشتر علماء سیاست دان بن کر رہ گئے ہیں اور بیشتر صوفیاء قسمت کا حال بتانے والے جوتشی۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ہم خواجہ باقی باللہؒ کی ایک محفلِ ارشاد نقل کر کے اندازہ کریں کہ بلند پایہ صوفی، اپنے عقیدت مندوں کو کیا کیا سکھاتے تھے۔ آپ کے ایک گمنام مرید نے اپنی کتاب ''کلماتِ طیبات'' میں 17 مئی 1601ء کی ایک محفل کا یوں تذکرہ کیا ہے:

> ''جب مجھے آداب بجالانے کا شرف حاصل ہُوا تو محفل میں گفتگو کھانے پینے کے معاملات میں احتیاط برتنے کی بابت ہو رہی تھی۔ حضرت الیشان، خواجہ باقی باللہؒ نے ارشاد فرمایا:
> ''ہمیں صرف یہی نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہم جو غذا کھانے لگے ہیں وہ حلال ہے یا حرام۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جو کچھ پکایا گیا ہے وہ، اس کے علاوہ وہ جن برتنوں میں پکایا گیا ہے اور چولھے میں ایندھن کے طور پر جو لکڑی استعمال ہوئی ہے وہ بھی حلال کی کمائی سے حاصل ہوئی ہے یا نہیں۔ باورچی بھی خدا دوست انسان ہونا چاہیے۔ کھانا محبت سے پکایا جانا چاہیے اور پکاتے ہوئے باورچی کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ خدا حاضر و ناظر ہے۔ جو کھانا محبت سے نہ پکایا جائے یوں سمجھ لیں کہ اُسے دھواں لگ گیا ہے اور اب اس پر خدا کی برکت نازل نہ ہوگی۔ کمزور دل و دماغ کے لوگوں کو نرم اور زُود ہضم غذا کھانی چاہیے جو جزوِ بدن بن کر انھیں تقویت پہنچائے۔ فرض کریں کوئی ایسا شخص جَو کی روٹی کھانا شروع کر دے تو وہ دماغ کی خشکی کا شکار ہو سکتا ہے اور یوں وہ خدا کی برکت سے محروم رہ جائے گا کیونکہ خدا کی ایک خاص برکت ہے جس کا تعلق ہمارے دماغ سے ہے۔ اس لیے بہتر اور ضروری ہے کہ ہم ایسی غذا نہ کھائیں جو ہماری طبیعت کے موافق نہ ہو۔ نفلی روزوں کے سلسلے میں بھی حد سے نہیں گزرنا چاہیے۔ طویل روزہ داری سے بھی دماغی خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے کشف کی صلاحیت سے نوازا ہو انھیں خصوصی طور پر احتیاط کرنی چاہیے کیونکہ دماغی خشکی کے باعث روحانی کشف بھی خلط ملط ہو جاتا ہے''۔

شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانیؒ

اگرچہ مجدد صاحبؒ کے نام اور ان کے آبائی قصبے سرہند کے بارے میں کچھ وضاحتیں پہلے ہو چکی ہیں لیکن

Marfat.com

برصغیر میں نقشبندی سلسلے کے اہم ترین اور مشہور ترین بزرگ کے طور پر دو وجہ سے آپ کا تفصیلی ذکر ضروری ہے۔ ایک ''وحدت الوجود'' کی نفی اور ''وحدت الشہود'' کا پرچار۔ دوسری، اکبر اعظم کے دین الٰہی کی مخالفت، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں شیعہ اُمراء اور علماء کی مخالفت، اور اورنگ زیب اور داراشکوہ کے درمیان تخت نشینی کی کشمکش میں نقشبندی بزرگوں کی طرف سے اورنگ زیب کی کھلی حمایت۔

وحدت الشہود

نقشبندی سلسلے کی عملی اور روحانی تاریخ میں مجدد صاحبؒ کا یہ جداگانہ مقام ہے کہ آپ نے اپنے سلسلے کے دوسرے اصولوں کی پوری پوری پابندی تو کی لیکن اس کے عقیدے کو ''وحدت الوجود'' کی نفی کر کے اور ''وحدت الشہود'' کا پرچار کر کے ایک نئے رُخ پر ڈال دیا۔ یاد رہے کہ سلسلے کے بانی خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ اور اُن کے بعد خواجہ عبیداللہ احرارؒ اور مولانا جامیؒ جیسے جید بزرگ، یہاں تک کہ مجدد صاحبؒ کے اپنے پیرومرشد خواجہ باقی باللہؒ، سب کے سب ابن عربیؒ کے پیش کردہ ''وحدت الوجود'' کے تصور کے قائل تھے۔ یہی نہیں، ان سب بزرگوں کی اعلیٰ تر روحانی تعلیم اور تلقین کا سرچشمہ بھی ابن عربیؒ کی ''فُصُوص الحِکَم'' اور ''فتوحات المکیہ'' جیسی کتابیں تھیں۔ مگر مجدد صاحبؒ نے علی الاعلان فرمایا، ''ہمیں ''فتوحات المکیہ'' (مکی دور کی آیاتِ قرآنی) کی نہیں، ''فتوحات المدینہ'' (مدنی دور کی آیاتِ قرآنی) کی ضرورت ہے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ مکی دور کی آیات کا مزاج اور موضوع انقلابی ہے اور ان کا بنیادی مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ مدنی دور کی آیات میں قانون اور معاشرت کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ آج قرآنِ حکیم کے سنجیدہ طالب علم بحث کر رہے ہیں کہ قرآنِ حکیم کو شانِ نزول کے مطابق، یعنی جس ترتیب سے آیات نازل ہوئیں، کیوں مرتب نہ کیا گیا؟ وہ انقلابی آیات جو پہلے نازل ہوئیں انھیں بعد میں اور بعد میں نازل ہونے والی آیات کو پہلے کیوں رکھا گیا؟ اس سلسلے میں بھارت میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے سیکرٹری پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل خان نے بڑی تحقیق و تلاش سے قرآنِ حکیم کو شانِ نزول کے مطابق ترتیب دے کر دیکھا اور دکھایا ہے کہ قرآنِ حکیم کی موجودہ ترتیب سے اسلام کی انقلابیت پر اس کی شریعت غالب آ چکی ہے۔ یہ غور طلب بات ہے کہ کیا مجدد صاحبؒ نے مدنی آیات کو مکی آیات پر فوقیت دے کر اور بعد میں اورنگ زیب عالمگیر جیسے سخت گیر زاہد کی حمایت کر کے اسلامی تاریخ کا رخ باطنی اصلاح سے ظاہری انتہا پسندی کی جانب تو نہیں موڑ دیا؟

چلیے، واپس وحدت الشہود کی طرح چلتے ہیں۔ مجدد صاحبؒ کے اس نظریے کو ان کے خطوط...... مکتوباتِ امام ربانی...... کی روشنی میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

> ''دنیا اور اس کے یگانہ و یکتا خالق، خدا کے درمیان اس کے سوا کوئی تعلق نہیں کہ دُنیا اُسی نے بنائی ہے۔ خدا کی کئی صفات ہیں۔ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، رزاق ہے، جبار ہے قہار ہے۔ اسی طرح وہ خالق بھی ہے۔ خالق ہونے کے ناتے یہ دنیا اور ہمارے سمیت وہ سب کچھ جو دنیا میں ہے (وما فیہا) اُسی نے بنایا ہے۔ حقیقت بس اتنی ہے۔ اتحاد، عینیت، معیت، یا احاطہ جیسے تمام

Marfat.com

تصورات غلط ہیں۔ مثلاً یہ کہنا صحیح نہیں کہ خالق و مخلوق ایک ہی ہیں (اتحاد)، یا یہ دنیا خدا ہی کا عکس ہے، اس کا اپنا کوئی الگ وجود نہیں (عینیت)، خدا چونکہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے اس لیے تمام موجودات خدا ہی ہیں (معیت)، یا خدا چونکہ ہر شے پر محیط ہے لہٰذا کوئی شے خدا سے باہر نہیں، اس کے اندر ہی ہے (احاطہ)۔ یہ تمام تصورات اور دعوے دراصل صوفیوں کی حالت سرمستی (سُکر یا Ecstasy) میں محسوس کی ہوئی کیفیات ہیں۔ وہ صوفی جو شعور بیدار (صحو یا Sobriety) کی اعلیٰ تر سطح پر ہوتے ہیں، اس طرح کی نام نہاد معرفت اور اس معرفت کے ''معارف'' سے کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتے۔ یہ بجا ہے کہ وہ صوفی جو شعور بیدار کے مالک ہیں ایک وقت میں خود بھی اس طرح کی کیفیات سے گزرے ہوتے ہیں لیکن وہ ان کیفیات کو شعور بیدار کے اعلیٰ مقام کی راہ کا محض ایک پڑاؤ سمجھ کر آگے نکل جاتے ہیں اور اس حقیقت کو پا لیتے ہیں کہ علم ہو یا معرفت، حرف آخر صرف اور صرف وحیِ خداوندی ہے۔ اتحاد، عینیت، معیت اور احاطہ جیسے تصورات کچھ کچھ اس طرح کے مغالطے ہیں جیسے کوئی ماہر لسانیات ایک ابجد (Alphabet) ایجاد کرے اور ہر حرف کی ایک آواز بھی مقرر کر دے اور کوئی دوسرا شخص اٹھے اور اعلان کر دے کہ ابجد، حروف کی آواز اور ان کا موجد ایک ہی ہیں۔ یا یوں کہیے کہ کوئی مصور ایک تصویر بنائے اور ہم کہیں کہ تصویر اور مصور میں کوئی فرق نہیں اور مصور کا تصویر سے الگ کوئی وجود نہیں۔''

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ''وحدت الشہود'' کے نظریے کو محکم دلائل اور اپنی ذاتی روحانی واردات کی بنیاد پر اتنے بھرپور طریقے سے پیش کیا کہ آپ کے بعد آنے والے نقشبندی بزرگوں نے بھی اسی کو اپنا لیا۔ برصغیر میں آپ سے پہلے، صوفی سلسلوں میں، ابن عربی کا پیش کردہ ''وحدت الوجود'' کا نظریہ ہی مقبول تھا۔ قدرتی بات تھی کہ جب مجدد صاحبؒ نے اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کی سرگرم کوشش کی تو برصغیر کے مسلمان علما اور صوفیاء کے درمیان بڑی شد و مد سے اختلافی بحث چل نکلی۔ دوسرے سلسلوں سے تعلق رکھنے والے تو مجدد صاحب کے قائل نہ ہوئے اور یوں نقشبندی سلسلے کے تصوف کا دوسرے سلسلوں سے فاصلہ اور فرق بہت زیادہ بڑھ گیا۔ لیکن جب مجدد صاحبؒ کے نظریات پر سختی سے کاربند اورنگ زیب عالمگیر نے عنانِ حکومت سنبھالی تو دوسرے سلسلوں کی مخالفت اُوپر اُوپر سے دَب گئی۔

دینِ الٰہی اور سیاسی کشمکش

وسط ایشیا کے نقشبندی بزرگوں کی طرح مجدد صاحبؒ بھی اپنے عقیدت مندوں کو عموماً اور مریدوں کو خصوصاً قرآنِ حکیم کے احکامات اور رسولِ خدا کی سنت کی پوری پوری پیروی کا حکم دیتے تھے۔ آپ ہر اُس عمل اور عقیدے کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے جس کی سند یا تائید رسولِ خدا کی سنت سے حاصل نہ ہوتی ہو بلکہ آپ اُسے ''بدعت'' قرار دیتے تھے۔ آپ کی اسی روش نے آپ کو شہنشاہ اکبر کے دینِ الٰہی کی مخالفت کا راستہ دکھایا۔

Marfat.com

جس طرح مجدد صاحبؒ نے وحدت الوجود کے معاملے میں اپنے پیرو مرشد خواجہ باقی باللہؒ سے روحانی سطح پر انحراف کیا تھا اسی طرح آپ نے علمی سطح پر بھی ایک انحراف کیا تھا۔ جب آپ ابتدائی تعلیم مکمل کر کے اعلیٰ تعلیم کے لیے سرہند سے آگرہ آئے جو اس وقت مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت تھا تو آپ شہنشاہ اکبر کے دو انتہائی عالم فاضل وزیروں، فیضی اور ابوالفضل سے متعارف ہوئے جو آپس میں بھائی تھے اور شیعہ عقیدہ رکھتے تھے۔ آپ نے قرآن حکیم کی عربی زبان میں تفسیر لکھنے میں فیضی کی معاونت کی۔ اس تفسیر کا نام ''سواطع الالہام'' (الہام کی شعاعیں) تھا اور یہ پوری کی پوری تفسیر عربی کے ایسے الفاظ میں لکھی گئی تھی جن میں کوئی نقطہ (Dot) استعمال نہیں ہُوا تھا جب کہ عربی ابجد میں ب، ت، ث، ج، خ جیسے پندرہ حروف ایسے ہیں جن پر نقطہ موجود ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اکبر کے فکر و عمل پر فیضی اور ابوالفضل کا گہرا اثر تھا۔ اکبر کے دین الٰہی کے پیچھے اُس کی اپنی سوچ اور سیاسی ضرورتوں کے علاوہ اگر کچھ بھی اور تھا تو وہ فیضی اور ابوالفضل کی علمی اور اخلاقی تائید ہی ہو سکتی ہے۔ اور اب تاریخ فیضی کے سابقہ معاون کو دین الٰہی کی ''بدعت'' کے سب سے بڑے مخالف کے طور پر دیکھ رہی تھی۔

اکبر نے فیضی اور ابوالفضل کی سرکردگی میں مختلف مذاہب کا جائزہ لے کر ان کی چیدہ چیدہ تعلیمات کے امتزاج (اور اس کے مخالفوں کے مطابق ملغوبے) سے ایک نئے مذہب کی ابتداء کرنی چاہی اور اسے دین الٰہی کا نام دیا۔ اسلام، ہندومت، جین مت، مسیحیت اور زردشتیت کے گھال میل سے پورے ہندوستان کے ہر مذہب کے پیروکاروں کے لیے ایک قابلِ قبول فارمولا تیار کیا گیا جس کے بنیادی اصولوں کو آج بھی فتح پور سیکری (آگرہ) کے شاہی ایوانوں کی دیواروں اور ستونوں پر کندہ کیا ہُوا دیکھا جا سکتا ہے۔ مجدد صاحبؒ نے اس انوکھے تجربے کو اسلام کے نظریۂ توحید اور خدا تعالیٰ کے اس اصول کے سراسر خلاف قرار دیا جس کے مطابق خدا کے پیغمبر مذاہب کی بنیاد وحی کے ذریعے رکھتے چلے آئے تھے۔

مجدد صاحبؒ نے اس سلسلے میں متعدد خطوط کے ذریعے سے ایسے مغل امراء اور سنّی علماء سے رابطہ کر کے انھیں ذہنی طور پر اپنا ہم خیال بنانے کی کامیاب کوشش کی جو مغل دربار میں ایرانی اور شیعہ امراء اور علماء کے اثر و رسوخ سے نالاں تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ جب اکبر کے والد ہمایوں نے ایران کی فوجی تائید سے ہندوستان کا تاج و تخت واپس لیا جو شیر شاہ سوری نے اس سے چھین لیا تھا تو مغل دربار میں ایرانی امراء اور شیعہ علماء کا اثر بڑھنے لگ گیا تھا۔ پھر اکبر کے وارث جہانگیر کی والدہ ایک ہندو خاتون تھیں اور اس کے عہد میں پس پشت حکومت کرنے میں اس کی ایرانی نژاد ملکہ نور جہاں اور نور جہاں کے بھائی آصف الدولہ کا گہرا ہاتھ تھا لیکن جب جہانگیر اور اس کے بیٹے، خرم (شاہجہان) کے درمیان تخت نشینی پر کھینچا تانی شروع ہوئی تو سنّی العقیدہ مغل امراء نے مجدد صاحبؒ کے زیر اثر جہانگیر سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ دین اسلام کی پاسداری کرے گا اس کی حمایت کر کے اسے تخت نشین ہونے میں مدد دی تھی۔ مگر جب جہانگیر اس وعدے پر قائم نہ رہ سکا اور ایرانی اور شیعہ اثر و رسوخ کم ہونے کے بجائے اور بھی بڑھتا چلا گیا تو مجدد صاحبؒ نے بھی اپنی مخالفانہ

آواز مزید بلند کردی۔ چنانچہ جہانگیر نے آپ کو قید و بند میں ڈال دیا۔

مجدد صاحبؒ کی کوششیں بالآخر اس وقت رنگ لے آئیں جب شاہجہان کے آخری دور میں شہزادہ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں تخت نشینی پر جھگڑا ہوا اور وہ اورنگ زیب جس نے مجدد صاحبؒ کے بیٹوں اور پوتوں سے دینی تربیت حاصل کی تھی، مجدد صاحبؒ کے نظریات کے قائل سنّی امراء اور علماء کے تعاون سے شہنشاہِ ہند بن گیا اور یوں نقشبندی بزرگوں سے روحانی تائید حاصل کرنے کی تیموری روایات ایک مرتبہ پھر تازہ و تابندہ ہو گئیں۔

نفسِ انسانی کے پانچ درجات

وحدت الشہود کے تصور کے علاوہ بھی مجدد الف ثانیؒ نے برصغیر میں تصوف کی تاریخ میں قابلِ ذکر اضافہ کیا۔ ایک تو آپ نے تصوف کی رائج اصطلاحات کو واضح تر الفاظ دے دیے اور پھر اپنی جانب سے ان میں کچھ نئی اصطلاحات شامل کر کے ان کی قابلِ فہم تشریح بھی کر دی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے اپنی روحانی واردات کو اتنی وضاحت اور اعتماد سے بیان کیا کہ روحانی دنیا بھی مادی دنیا کی طرح ایک واضح اور متعین حقیقت محسوس ہونے لگی۔

اقبالؔ نے اپنے ساتویں خطبے میں مجدد الف ثانیؒ کے مجموعہ خطوط، مکتوباتِ ربانی، جلد اول، خط: 253 کا حوالہ دے کر ایک عجیب و غریب بات کہی ہے۔ مجدد صاحب نے اپنے اس خط اور بعض دوسرے خطوط میں نفسِ انسانی کے اُن پانچ درجوں کا واضح لفظوں میں ذکر کیا تھا جنھیں طے کیے بغیر انسان حقیقت یا خدا تک نہیں پہنچ سکتا: 1۔ قلب، 2۔ روح، 3۔ سرِ خفی (نیم خفیہ راز)، 4۔ سرِ اخفا (مکمل طور خفیہ راز)، 5۔ عالمِ امر (جو پہلے چار درجوں کا مجموعہ ہے اور اپنا الگ مقام اور مزاج بھی رکھتا ہے)۔ مجدد صاحبؒ کے بقول ان درجات سے گزر کر ہی کوئی متلاشیِ حق خدا کے صفاتی ناموں (اسمائے حسنٰی) کے نور تک پہنچتا ہے اور بالآخر ذاتِ خداوندی (اللہ) کا نور اس پر آشکارا ہوتا ہے۔ اقبالؔ نے لکھا ہے:

> ''ان درجات کے تعین کی جو بھی نفسیاتی بنیاد ہو اس سے کم از کم ہمیں یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ احمد سرہندیؒ جو اسلامی تصوف کے ایک عظیم مصلح (Reformer) ہیں ان کی نظر نفسِ انسانی کے اندر آباد ایک پورے جہان کا احاطہ کیے ہوئے ہے...... اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ (شیخ احمد سرہندی کے برعکس) جدید علمِ نفسیات ابھی نفسِ انسانی کے امکانات کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔''

اپنے اسی خطبے میں اقبالؔ نے کہا تھا:

> ''سترھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم مذہبی نابغہ (Genius)، شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے عہد کے تصوف کو اپنی جراَت مندانہ تنقید کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں تصوف کا ایک نیا ''طریقہ'' پیدا ہو گیا۔ اس سے قبل تصوف کے تمام تر سلسلوں کے ''طریقے'' وسط ایشیا یا عرب سے ہندوستان پہنچے تھے۔ یہ صرف شیخ احمد سرہندیؒ کا طریقہ تھا جس نے ہندوستان کی سرحد پار کی اور

Marfat.com

آج بھی پنجاب، افغانستان اور ایشیائی روس (موجودہ نوآزاد وسط ایشیائی ممالک مثلاً تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، قازقستان) میں ایک زندہ حقیقت کی صورت میں موجود ہے۔''

اپنے خطبات کے علاوہ اقبالؔ نے شیخ احمد سرہندیؒ کا ذکر اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ اقبالؔ کو پنجاب کے سرکارنواز پیرزادوں سے مجدد صاحبؒ کی یاد آئی تھی جو اپنے جوشِ ایمانی میں شہنشاہِ ہند جہانگیر کے سامنے بھی نہ جھکے تھے۔ کہاں مجدد صاحبؒ کا ''فقرِ غیور''، کہاں پنجابی پیرزادوں کا ''نشہء خدمت سرکار''۔ مزے کی نظم ہے، آپ بھی سنیے:

پنجاب کے پیرزادوں سے

حاضر ہُوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار
وہ ہند میں سرمایہء ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں، و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا، سلسلہء فقر ہُوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کُلہِ فقر سے ہو طرّہء دستار
باقی کُلہِ فقر سے تھا ولولہء حق
طرّوں نے چڑھایا نشہء خدمتِ سرکار

شاہ ولی اللہؒ

مجدد الف ثانیؒ کی وفات کے بعد نقشبندی سلسلے کے جن بزرگوں نے خصوصی شہرت حاصل کی ان میں شاہ ولی اللہؒ سرفہرست ہیں۔ وہ 21۔فروری 1703ء کو پیدا اور 10۔اگست 1762ء میں فوت ہُوئے۔ انھوں نے

Marfat.com

تصوف میں ایک نئی روح پھونکی۔ وہ اپنے آپ کو ایک ''قیوم'' کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اپنے عہد میں نہ صرف دینی اور روحانی معاملات کو بلکہ مادی، نفسیاتی، اقتصادی، معاشی اور سیاسی معاملات کو بھی صحیح رخ پر ڈالنے کی ذمہ داری محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور وفکر کیا کہ مذہب افراد کی مضبوط اخلاقی بنیادیں بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند، خوشحال اور منصفانہ معاشرہ بنانے میں کیا کردار ادا کرسکتا ہے۔

5۔ مئی 1731ء کو جب وہ مکے میں تھے تو شاہ ولی اللہؒ نے خواب دیکھا کہ رسولِ خدا آپ سے کہہ رہے ہیں، ''اپنے دور کے تمام غیر منصفانہ اور غیر اخلاقی اداروں کو ختم کردو''۔ اس خواب نے آپ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ آپ نے دیکھا کہ مذہب ایک بیمار جسم بن کر رہ گیا ہے اور اس کی روح مطالبہ کررہی ہے کہ اسے نئے زمانے کے لوگوں کے لیے ایک زندہ حقیقت بنایا جائے۔ چنانچہ آپ نے مذہب کو افراد کی اخلاقی زندگی کی روحِ رواں بنانے اور اسے اجتماعی اور معاشرتی سطح پر ایک مقبول اور مؤثر لائحہ عمل بنانے کے لیے اسلام کی از سرِ نو، نئے انداز سے اور نئے الفاظ میں تشریح کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نقشبندی بزرگ، خواجہ عبید اللہ احرارؒ اس بات کے قائل تھے کہ موت کے بعد بھی انسان کا روحانی سفر جاری رہتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے کسی ایک جگہ کسی ایک حالت میں نہیں پڑا رہتا۔ ان کے اس خیال کو شاہ ولی اللہؒ نے مزید وسعت دی اور انسان کے ''مسلسل روحانی ارتقا'' کا نظریہ پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ آپ کے خیال کے مطابق خدا ہماری دُنیوی زندگی میں اپنی تجلیات (حقیقت کو واضح کرنے والی نور کی شعاعیں) اس طریقے سے بھیجتا ہے جس سے ہماری دنیا اور آخرت کی دونوں زندگیاں ایک اکائی میں ڈھل جاتی ہیں اور جو اچھا یا بُرا عمل ہم نے اس دنیا میں کیا ہوتا ہے اس کا نتیجہ ہماری اُخروی زندگی میں نکلتا رہتا ہے۔ لیکن جس طرح ہم اپنے عمل کو اس دنیا میں بدلنے پر قادر ہوتے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی ہمیں یہ توفیق اور صلاحیت حاصل ہوتی ہے کہ ہم اپنی اصلاح کرکے روحانی ترقی کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہوسکیں۔

شاہ ولی اللہؒ اگرچہ مجدد الف ثانیؒ کے پیروکار تھے جنھوں نے ابن عربیؒ کے تصورات کو رد کردیا تھا لیکن شاہ صاحبؒ نے مجدد صاحبؒ کی اس روش کو اپنانے کے بجائے یہ کوشش کی کہ ابن عربیؒ اور مجدد صاحبؒ کے تصورات میں مطابقت پیدا ہو جائے۔ شاہ صاحبؒ کے خیال میں ان دونوں بزرگوں کے تصورات میں صرف تشبیہ (Simile) اور استعارے (Metaphor) کا فرق تھا۔ اس فرق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ تشبیہ میں ہم دو مختلف چیزوں کے درمیان وحدت دیکھتے ہیں مگر استعارے میں یہ فرق مٹ جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''آ و میرے چاند سے بیٹے'' تو اس تشبیہ میں چاند اور بیٹے کے درمیان مشابہت کے باوجود ایک فاصلہ اور فرق موجود رہتا ہے۔ اس کے برعکس استعارے میں دونوں چیزوں کے درمیان کوئی فاصلہ اور فرق نہیں رہ جاتا اور ہم اپنے چاند سے بیٹے کو یوں پکارتے ہیں، ''آ و میرے چاند''۔ تشبیہ میں ''دو قالب و یک جان'' کی کیفیت ہوتی ہے۔ اسے ہم محبت کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے اور

Marfat.com

چاند، چاند ہی رہتا ہے۔ استعارے میں بیٹا اور چاند ''یک جان و یک قالب'' ہو جاتے ہیں۔ اسے ہم عشق کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بیٹا چاند بن جاتا ہے اور چاند بیٹا۔ جو شخص خدا سے (ہوشمندی، صحو، بقاء کے مقام پر) محبت کرتا ہو اُسے حقیقت ''وحدت الشہود'' میں نظر آتی ہے اور جو عشقِ الٰہی میں غرق (مستی، سکر، فناء کے مقام پر) ہو اُسے ''وحدت الوجود'' میں۔ شاہ صاحبؒ نے ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ دونوں فلسفے درست ہیں کیونکہ یہ روحانی سفر کے دو اہم مقامات ہیں۔ ''وحدت الوجود'' فنا کا مقام ہے، ''وحدت الشہود'' بقاء کا۔ اور بقاء کا مقام فنا سے بالاتر ہے۔ بہر حال، وہ اپنے پیر و مرشد مجدد الف ثانیؒ کی طرح ابن عربیؒ کے فلسفے کو مکمل طور پر رد نہ کر سکے۔

شاہ ولی اللہؒ نے شیعہ اور سنی فرقوں میں بھی مطابقت کی کوشش کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ کی خلافت کا تعلق خدا کی صفت ''الظاہر'' سے تھا جو ایک خارجی صفت ہے اور علیؓ کی خلافت کا تعلق خدا کی صفت ''الباطن'' سے تھا جو ایک داخلی صفت ہے، اور ان دونوں صفات کو اپنی اپنی جگہ فضیلت حاصل تھی۔ لیکن وہ مجدد صاحب اور اُن کے بیٹے خواجہ محمد معصوم کی ''شیعہ دشمن'' تعلیمات کا اثر زائل نہ کر سکے۔ یاد رہے کہ مجدد صاحب نے تو شیعہ فرقے کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا تھا اور خواجہ محمد معصوم نے اورنگزیب عالمگیر کو مشورہ دیا تھا کہ شیعہ فرقے کے ہر فرد کو قتل کر دیا جائے۔ بڑے میاں سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک انسانی کوششوں کا حتمی مقصد ایک ایسی انسانیت گیر معاشرت کی تخلیق تھا جس میں کسی طرح کی عداوت یا استحصال نہ ہو۔ وہ فردِ واحد کو چھوٹا انسان اور پوری انسانیت کو بڑا انسان کہتے تھے۔ اپنے اس عقیدے کے تحت وہ تمام تر بنی نوع انسان کی وحدت کے خواہش مند تھے۔ اقبالؔ نے اسی خیال کو جمعیتِ اقوام (یا اقوام متحدہ) سے آگے کی منزل کے طور پر ''جمعیتِ آدم'' کا نام دیا تھا:

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

شاہ صاحبؒ انسانیت کی وحدت کو وحدت الوجود ہی کا لازمی نتیجہ سمجھتے تھے۔

نقشبندیہ کی تاریخ میں شاہ ولی اللہؒ کی سوچ اور رویے نے اپنی روحانی گہرائی اور سماجی تاثیر کے اعتبار سے گراں قدر اضافہ کیا لیکن سیاسی لحاظ سے ان کی کوشش و کاوش کا نتیجہ کچھ اچھا نہ نکلا۔ جب برصغیر میں مغلیہ دور کے اواخر میں مسلمانوں کے اندر معاشی کمزوری اور اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا تو شاہ صاحبؒ نے کابل کے حکمران، احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور وہاں، کیا ہندو اور کیا مسلمان، خوب لوٹ مار کی اور بعد میں قتل عام بھی کر ڈالا۔ وہ مقاصد جن کے تحت شاہ صاحبؒ نے ابدالی کو بلایا تھا، ہرگز ہرگز پورے نہ ہوئے اور مغلیہ سلطنت پر چھائے ہوئے زوال کے کالے بادل اور

Marfat.com

بھی گھنے ہو گئے اور انگریزوں کے لیے آسان ہو گیا کہ وہ پورے ہندوستان پر قابض ہو جائیں۔

شاہ صاحبؒ کے دور میں ہندوستان کی دفتری اور عدالتی زبان فارسی تھی۔ اُن کی دینی اور علمی خدمات میں ان کا یہ اقدام انتہائی قدر و قیمت رکھتا ہے کہ انھوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کے لیے ''فتح الرحمٰن'' کے عنوان سے اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جب مسیحیت کی تاریخ میں مارٹن لوتھر نے بائبل کا جرمن زبان میں ترجمہ کر کے یہ جسارت کی تھی تو رومن کیتھولک چرچ میں گویا ایک بھونچال آ گیا تھا۔ برصغیر میں شاہ صاحبؒ کی جسارت پر بہت اعتراضات ہُوئے۔ شاہ صاحبؒ کے اس اقدام سے بالآخر قرآن حکیم کے اردو ترجمے کا راستہ بھی کھل گیا اور عام مسلمانوں کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ علمائے کرام کی اجارہ داری کے بغیر ہی قرآن حکیم کے مطالب تک رسائی حاصل کر لیں۔ اردو ترجمہ شاہ ولی اللہؒ کے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ نے کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کو دُنیائے تصوف میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے سماجی ارتقاء کا ایسا فلسفہ پیش کیا جس میں معاشروں کے عروج اور زوال کے اسباب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بقاء اور ترقی کے لیے معاشی ناہمواریوں کے خاتمے کی اہمیت پر مدلل بحث کی گئی۔ آپ کا اصرار تھا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے بغیر سماجی ارتقاء جاری نہیں رہ سکتا۔ آپ نے دوٹوک الفاظ میں کہا جب بالا دست طبقے غریب محنت کشوں کا تادیر استحصال کرتے چلے جاتے ہیں تو بالآخر تشدد آمیز انقلاب ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آج کے اہلِ بصیرت مبصر دہشت گردی کے حوالے سے شاہ صاحبؒ ہی کے خیالات کی عکاسی کر رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے پوتے، شاہ عبدالعزیزؒ کے دور میں نقشبندی سلسلہ، جو پہلے ہی سیاست میں دلچسپی رکھتا آیا تھا سیاست میں اور بھی زیادہ ملوث ہو گیا۔ آپؒ نے ایک فتویٰ جاری کیا کہ انگریزوں (ایسٹ انڈیا کمپنی) اور سکھوں کے زیرِ تسلط ہندوستان کا تمام علاقہ ''دارالحرب'' ہے یعنی مسلمانوں کی اُس سے جنگ ہے اور ان پر واجب ہے کہ جنگ کے ذریعے سے اُسے واپس اپنے قبضے میں لے لیں۔ یہ گویا بیرونی یا غیر اسلامی تسلط کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ آپ کے اس اعلان پر اُس وقت عملدر آمد شروع ہو گیا جب رائے بریلی کے رہنے والے سید احمدؒ آپ کے مریدوں میں شامل ہوئے اور انھوں نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد کے لیے ''تحریکِ مجاہدین'' کی بنیاد رکھی۔

سید احمد بریلویؒ نے نقشبندی سلسلے کے ارادت مندوں کو جہاد کے لیے منظم کرنا شروع کیا تو انھیں پنجاب اور سرحد میں سکھ فوج کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس وقت (1831ء میں) ان صوبوں میں سکھوں کی عملداری تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں آپ پہلے مسلمان تھے جس نے اپنے ہمراہیوں سے فی سبیل اللہ جہاد کرنے کے لیے حلف وفاداری (بیعت) لیا۔ آپ نے مرشد اور مرید کے صوفیانہ تعلق کی بناء پر ایسے جانبازوں کو فوجی نظم و ضبط کا پاسدار بنایا جو جذبہء جہاد سے سرشار اور ہر قربانی کے لیے تیار تھے۔ آپ موجودہ پاکستان کے صوبہ سرحد کے ایک مقام، بالاکوٹ میں سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ آپ کے باقی ماندہ ساتھیوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ آپ مہدی آخر زمان تھے اور

Marfat.com

دشمن کو شکست دینے کے لیے اپنی روپوشی ختم کر کے دوبارہ منظر پر آ جائیں گے۔

جب 1857ء میں انگریزوں کے بقول غدر مچا اور اہلِ ہند کے مطابق جنگ آزادی شروع ہوئی تو سید احمد شہیدؒ کے مجاہد ساتھیوں نے انگریزوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انگریزوں نے ان مجاہدوں کو ''وہابیوں'' کا نام دیا اور ان کے جذبہء جہاد سے اندازہ لگایا کہ اگر ان کا پوری طرح خاتمہ نہ کیا گیا تو وہ پھر سر اٹھالیں گے چنانچہ انھوں نے چن چن کر ان مجاہدوں کو قتل کیا اور جو قید ہو گئے انھیں بڑی بڑی شاہراہوں کے کنارے درختوں کی شاخوں سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کی اس سنگدلانہ روش کے خلاف سر سید احمد خانؒ نے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر ثابت کیا کہ اس وحشیانہ سلوک کا کوئی جواز نہیں تھا۔

شاہ ولی اللہؒ اور آپ کے پوتے شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے مرید سید احمد شہید بریلویؒ کے رویے کے برعکس شاہ ولی اللہؒ کے ہمعصر، مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کا رویہ خالصتاً غیر سیاسی اور روحانی تھا۔ آپ نے خدا کے اس حکم کے تحت کہ ''ہم نے ہر بستی اور ہر قوم کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجے ہیں'' یہ نظریہ پیش کیا کہ ہندوؤں کے وید...... رگ وید، یجر وید، سام وید، اتھر وید...... بھی تورات، زبور، انجیل اور قرآنِ حکیم کی طرح الہامی کتابیں ہیں۔ آپ نے بعض ایسی ہندوانہ رسوم کے جواز میں بھی دلائل دیے جنھیں مسلمانوں کے سخت گیر علماء اور صوفیاء مشرکانہ قرار دیتے آئے تھے۔ آپ کے ایک مرید شاہ غلام علی دہلویؒ تھے جن کے ارادت مند حبشہ (Ethiopia)، شام، ترکی اور افغانستان تک پھیلے ہوئے تھے۔ برصغیر کے ایک عظیم ترین مسلمان قائد، سر سید احمد خانؒ اور ان کا خاندان شاہ غلام علیؒ کا معتقد تھا۔ یہ سر سید احمد خانؒ ہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سیکھنے کی راہ پر ڈالا اور اس سلسلے میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ انھی کے پیش کردہ ''دو قومی نظریے'' نے بالآخر 1930ء میں اقبالؒ کو تصورِ پاکستان پیش کرنے اور 1947ء میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کو پاکستان حاصل کرنے کا راستہ دکھایا۔

چھٹا باب

شریعت اور طریقت کو جمع کرنے والی دو ہستیاں

تصوف کی تاریخ کا یہ مختصر جائزہ اب ہمیں اس مقام پر لے آیا ہے کہ ہم ان عظیم ہستیوں کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر نگاہ ڈالیں جنھوں نے شریعت اور طریقت کے درمیان پلوں کا کردار ادا کیا۔ ان پلوں کی بدولت عام مسلمانوں کے لیے ممکن ہو گیا کہ وہ خدا کے اس حکم پر عمل کر سکیں کہ ''دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بجائے اسے اس کی مکمل شکل میں قبول کرو'' (2:208)۔ اس ضمن میں ہم یہاں بطور مثال پورے عالم اسلام سے دنیائے تصوف کی دو ایسی نمایاں ہستیاں چن لیتے ہیں جنھیں برصغیر پاک و ہند کے علمی، دینی اور روحانی حلقوں میں بھی تقریباً ہر کوئی پہچانتا ہے: غزالیؒ اور رومیؒ۔ خود برصغیر میں بھی ایسی دو ہستیاں، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ سر محمد اقبالؒ ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اقبالؒ کا ذکر آگے روحانی جواں مردی کے باب میں شامل ہے۔

غزالیؒ

فلسفی، ماہر دینیات، فقیہہ اور صوفی۔ غزالیؒ کا پورا نام ابو حامد محمد غزالی تھا۔ وہ 1058ء میں ایران کے علاقے طوس میں پیدا ہوئے اور وہیں 1111ء میں فوت ہوئے۔ اس عظیم الشان اور ہمہ گیر شخصیت نے اسلام کی حیاتِ نو کے لیے ایسی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں کہ ان کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ روشن رہے گا۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اپنی علمی پیاس اور تلاش کے باعث غزالیؒ نوجوانی ہی میں استادوں کی آنکھ کا تارا بن چکے تھے۔ نیشا پور میں امام الحرمین الجوینی کی تربیت نے سونے کو کندن بنا دیا اور اپنے وقت کے مشہور مدبر اور علوم و فنون کے مخلص سرپرست وزیر، نظام الملک نے انھیں بغداد کے اعلیٰ ترین مکتب (College) میں قانون کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ غزالیؒ نے بغداد میں ایک ماہر قانون (فقیہہ) کے طور پر بہت نام کمایا لیکن چار سال بعد ان کے خیالات اور عقائد میں ایک زلزلہ سا آیا اور ضمیر کے اس بحران نے ان کی یہ حالت کر دی کہ ان کی خوش بیانی تتلاہٹ میں بدل گئی اور یوں زندگی کے اس موڑ پر انھیں اپنا راستہ بدلنا پڑ گیا۔

یہ کہہ کر کہ میں حج پر جا رہا ہوں، انھوں نے اپنی مسند اپنے ایک بھائی کے سپرد کی اور خود بغداد سے دمشق جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ایک لمبا عرصہ گوشۂ تنہائی میں گزار کر آپ پہلے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور پھر بیت المقدس اور الخلیل (Hebron) تشریف لے گئے جو قانون کے برعکس روحانیت کے اہم مراکز تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھیں حصولِ علم کے جانے پہچانے وسائل مثلاً حواس اور عقل پر یقین نہیں رہا تھا اور ان کے مقابلے میں انھیں کسی بہتر اور برتر وسیلے کی تلاش

Marfat.com

تھی۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق ''وہ کسی باقاعدہ استدلال (Reasoning) یا صداقت کے ثبوت جمع کرنے سے صداقت تک نہیں پہنچے تھے، بس نور کی ایک کرن تھی جو خدا نے ان کی روح پر ڈالی اور حقیقت آشکار ہوگئی''۔

ان کی تقریباً 70 کتابوں میں سے علمی اعتبار سے ''احیائے علوم الدین'' (دینی علوم کی بحالی)، فکری اعتبار سے ''تہافتہ الفلاسفہ'' (فلسفیوں کی تباہی)، اخلاقی اعتبار سے ''کیمیائے سعادت'' اور تصوف کے اعتبار سے ''مشکوٰۃ الانوار'' زیادہ اہم ہیں۔ غزالیؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ رسولؐ خدا کے اصل وارث صوفیائے کرام ہیں کیونکہ صرف وہی خدا سے براہ راست روشنی حاصل کرتے ہیں لہٰذا انھیں اہلِ شریعت اور فقیہوں کے مقابلے میں برتر مقام حاصل ہونا چاہیے۔ ان کا وہ نظریہ جس نے انھیں ایک ''امام'' (دینی اور دنیوی رہبر) کی حیثیت دے دی، یہ تھا کہ صوفیوں کی کشف اور الہام سے حاصل کی ہوئی روشنی کو زیرِ عمل لانے کے لیے قانون اور دینیات کا ایک پائیدار ڈھانچا (Framework) بھی لازماً موجود ہونا چاہیے۔ انھیں اس خطرے کا شدید احساس تھا کہ ایسا ڈھانچا نہ ہونے سے تصوف کے نام پر نظریاتی بے اعتدالی اور اخلاقی بے لگامی کا راستہ کھل سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خاص طور پر شیعیت کی اس شاخ کو تنقید کا نشانہ بنایا جو حسن بن صباح کی قیادت میں ایک طرف قتل و غارت اور دوسری طرف منشیات اور عیش و عشرت کی ترغیب دیتی تھی اور یہ سب کچھ غیبی مرشدوں یا اماموں اور ان کی غیبی تعلیم کے نام پر کیا جارہا تھا۔

تاریخ اسلام میں غزالیؒ کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ہرفنِ مولا (A Man for All Seasons) تھے۔ وہ صوفیوں کے لیے صوفی، دینیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ماہرِ دینیات اور فقیہوں کے لیے فقیہہ تھے۔ وہ تاکیداً کہتے تھے کہ کسی فرد یا مکتبۂ فکر کی تردید کرنے سے پہلے اُس کے بارے میں پورا پورا علم حاصل کرنا چاہیے۔ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ وہ جو کہتے تھے پہلے خود اس پر عمل کرتے تھے۔ انھوں نے ہر مکتبۂ فکر کو اندر اور باہر سے چھان پھٹک کر اور ٹھونک بجا کر دیکھا تھا اور یہ مکاتبِ فکر اپنے حق میں جو دلائل دیتے تھے وہ انھوں نے ٹھنڈے دل سے سنے اور سمجھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب غزالیؒ نے اپنی ذات میں فلسفے، دینیات، فقہہ اور تصوف کا ایک قابلِ اعتماد امتزاج پیدا کر کے اسے قرآنِ حکیم اور رسولؐ خدا کے ارشادات کی کسوٹی پر کس کر اطمینان کرلیا کہ وہ درست ہے تو وہ اس قابل ہوگئے کہ اسلام کے ان چاروں شعبوں (فلسفہ، دینیات، فقہہ، تصوف) کا صحیح مقام طے کرسکیں۔

غزالیؒ سے پہلے اسلام کا ہر شعبہ اس حد تک ایک دوسرے سے الگ راستے پر چل نکلا تھا کہ ان کے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہ رہی تھی اور ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے یہ دعویٰ کرنے لگے تھے کہ وہ نہ صرف اسلام کے بہترین ترجمان ہیں بلکہ اسلام انھی پر ختم ہے۔ غزالیؒ کے ساتھ اسلام کے ایک عہد کا اختتام اور ایک نئے عہد کا آغاز ہوگیا۔ معتزلہ اور اشعری فلسفیوں کے اختلافات نے دانشوری کو غبار آلودہ کردیا تھا۔ ملت اور امت کے تصورات دھندلا چکے تھے اور ان کی جگہ مختلف فرقوں نے لے لی تھی جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ تمام تر حقانیت کا بلاشرکت غیرے وہی مالک ہے۔ غزالیؒ کے جامع افکار سامنے آئے تو وہ اسلام جسے خدا نے تو مکمل کردیا تھا لیکن فکر اور ذکر، فقہہ اور فرقہ کے اختلافات نے ٹکڑے

Marfat.com

ٹکڑے کر ڈالا تھا ایک مرتبہ پھر اپنی مکمل صورت میں دنیا کے سامنے آ گیا۔

غزالیؒ کے بعد یہ تو نہیں ہُوا کہ مختلف فرقے اور مکتبے بالکل ہی ٹھنڈے پڑ گئے ہوں لیکن یہ ضرور ہُوا کہ اسلامی وحدت اور یگانگت کا دھندلایا ہُوا تصور پوری آب و تاب سے نظروں میں آ گیا۔ رسُولؐ خدا کے دور کی یکجہتی کو اب، بدلے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر، ایک نئے قالب میں ڈھالنا ممکن ہو گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ دائرہ اسلام کا وہ مرکز جو فکری انتشار اور مذہبی اور روحانی تفرقے کی نذر ہو گیا تھا غزالیؒ نے اسے دوبارہ دریافت کر کے یہ ممکن بنا دیا کہ اسلام کا دائرہ پورے اعتماد سے جتنا بھی پھیلنا چاہے پھیلتا چلا جائے لیکن اس کی منزل ہمیشہ خدا ہی رہے اور اس کا راستہ ہمیشہ رسُولؐ خدا ہی کا رہے۔ اگر مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزالیؒ نے اسلام کو ایک ایسی مکمل ہستی کی صورت دے دی جس میں تصوف کو دل کا، شریعت کو چہرے کا، فلسفے کو دماغ کا اور فقہہ کو ہاتھ پاؤں کا مقام حاصل ہو۔ ان تمام اعضاء کے صحیح صحیح استعمال سے اسلام ایک بار پھر اس قابل ہو گیا کہ اس کے حوالے سے وجود میں آنے والی اسلامی تہذیب، بلوغت کو پہنچ سکے۔

رومیؒ

اسلام کے ایک عظیم ترین صوفی اور دنیا کے ایک عظیم ترین شاعر مولانا جلال الدین رومیؒ 30 ستمبر 1207ء کو افغانستان میں بلخ کے مقام پر پیدا ہوئے اور 17 دسمبر 1273ء کو ترکی کے شہر قونیہ میں فوت اور دفن ہوئے۔ آپ نے اپنے مزار کے بارے میں کہہ رکھا تھا کہ: در سینہ ہائی مردمِ عارف مزارِ ما (میرا مزار تو عارفوں کے سینوں میں واقع ہے)۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ کا ایک مزار بیسویں صدی کے ایک جلیل القدر مسلمان اور اردو اور فارسی کے ایک عظیم القدر شاعر اقبالؒ کے سینے میں بھی بنا ہُوا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ لاہور میں دفن ہونے والے اقبالؒ کا ایک علامتی مزار قونیہ میں ان کے پیر و مرشد رومیؒ کے پہلو میں بھی بنا ہُوا ہے۔

مولانا جلال الدین کو ''رومی'' ترکی میں رہائش پذیر ہونے کی بناء پر کہا جاتا تھا جو اُن کے زمانے میں ''رومی اناطولیہ'' کہلاتا تھا۔ وہ رومیؒ اس وقت کہلانا شروع ہوئے جب افغانستان پر منگولوں کے حملے کا خطرہ پیدا ہُوا اور وہ اپنے والد، بہاء الدین ولد کے ہمراہ ترکی میں آ بسے۔ ان کے والد ایک مستند ماہر دینیات اور فقیہہ لیکن ساتھ ہی جداگانہ طرز کے صوفی بھی تھے۔ بہاء الدین ولد کی کتاب ''معارف'' میں خدا سے وصال کے بارے میں انتہائی عاشقانہ انداز میں لب کشائی کی گئی ہے۔ رومیؒ کو اپنے والد کی روحانی میراث برہان الدین محقق کے ذریعے سے ملی جو بہاء الدین ولد کے شاگرد رہے تھے۔ بے شک ان کی زندگی میں روحانی سطح پر جو زلزلہ آیا اس کی وجہ شمس تبریزیؒ کی صحبت اور دوستی تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کے مختلف مکاتب کی حد بندیوں سے نکل کر روحانیت کے عالمگیر سرچشموں تک رسائی کا جو جنون انھیں شمسؒ نے بخشا تھا اس کے بیج ان کی زرخیز روح میں ان کے والد پہلے ہی بو چکے تھے۔ یہی نہیں، شمسؒ سے ملاقات سے

Marfat.com

پہلے رومیؒ اپنے طور پر سنائی اور عطارؒ کا مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ رومیؒ بھی سوکھی لکڑی کی طرح تھے جسے شمسؒ نے آگ دکھادی اور وہ ایک الاؤ کی مانند جل اٹھے۔

اپنے والد کی وفات پر رومیؒ نے قونیہ میں دینی طالب علموں کے استاد اور روحانی سالکوں کے شیخ کے طور پر مسند سنبھالی۔ وہ ایک عالم دین کے طور پر درس و تدریس اور ایک صوفی کے طور پر ذکر اور مراقبے میں مصروف رہتے اور نہایت بندھی تکی زندگی گزار رہے تھے کہ ایک روز یکا یک ایک عجیب و غریب حلیے کے اجنبی نے ان کا رستہ روکا اور ایک انوکھا سوال داغ دیا۔ یہ اجنبی شمس تبریزیؒ تھا جس نے مستند روایات کے مطابق رومیؒ سے کچھ پوچھنے سے پہلے خدا سے پوچھا تھا، ''میں نے دنیا چھان ماری ہے، مجھے تو ایسا کوئی ملا نہیں، میرے خدا تو ہی بتا، کوئی ہے جو میری دوستی کے لائق ہو اور میری صحبت برداشت کر سکے''۔ اور غیب سے آواز آئی تھی، ''ہم تمھیں تمھارا دوست عطا کر دیں تو تم ہمیں کیا دو گے؟''۔ اس پر شمسؒ نے بے دھڑک یہ عاشقانہ جواب دیا تھا، ''اپنی جان'' اور اسے غیب سے اشارہ ہُوا کہ قونیہ جاؤ اور جلال الدین رومیؒ سے ملو۔

اور اب شمس تبریزیؒ قونیہ کے بھرے بازار میں، جلال الدین رومیؒ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، ان کے گدھے کی باگیں پکڑے کھڑا تھا اور سوال پوچھ رہا تھا، ''بتاؤ، محمدؐ اور بایزید بسطامیؒ میں سے کون عظیم تر ہے''؟

بایزید بسطامیؒ مشہور و معروف صوفی بزرگ ہو گزرے تھے۔ عشقِ الٰہی میں سرمست اس روحانی شخصیت کے طرح طرح کے بیانات زبان زدِ عام تھے۔ جس طرح منصور حلاجؒ نے ''اَناالحق'' کا نعرہ لگایا تھا اسی طرح بسطامیؒ نے کہا تھا، ''میری اور خدا کی ایک ہی حقیقت ہے''۔ اور محمدؐ تو خدا کے محبوب اور معزز و محترم پیغمبر تھے۔ اس ٹیڑھے سوال کے اندر دراصل یہ سوال چھپا ہُوا تھا کہ اگر بسطامیؒ اور خدا کی حقیقت ایک ہے تو گویا ان کا مقام خدا کا ہے تو پھر خدا عظیم تر ہے یا اس کا ایک رسولؐ۔ اصولاً تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ آپؐ سے آپ کا کوئی اُمتی برتر ہو۔ مگر رومیؒ نے بلا تاخیر جواب دیا، ''بسطامیؒ سے محمدؐ رسول اللہ عظیم تر ہیں''۔

شمسؒ تڑ سے بولا، ''بسطامی نے کہا تھا، میں خدا کی شان ہوں'' جبکہ محمدؐ نے کہا تھا، ''اے خدا، میں تیری جتنی بھی تعریف کروں وہ کم ہے''۔

شمسؒ کے سوال نے رومیؒ کے اندر ایک ہلچل مچا دی۔ ان کی روح میں ایک شعلہ سا لپکا، انھیں محسوس ہُوا کہ یہ حقیقت کے بارے میں کوئی مناظرانہ سوال نہ تھا بلکہ حقیقت بذاتِ خود اس کے روبرو کھڑی تھی۔ کہتے ہیں کہ اگلے لمحے قونیہ کا جید عالم فاضل رومیؒ غش کھا کر قصبے کے گرد آلود بازار میں اوندھے مُنہ گرا پڑا تھا۔ ان کے شاگردوں اور مریدوں میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وہ شمسؒ کی درگت بنانا ہی چاہتے تھے کہ رومیؒ ہوش میں آ گئے۔ انھوں نے زمین پر گرے گرے شمسؒ کو مخاطب کر کے کہا، ''بسطامیؒ پر خدا کی معرفت کی چند بوندیں پڑ گئیں اور وہ آپے سے باہر ہو گئے، اس کے برعکس محمدؐ پر خدا کی معرفت موسلا دھار بارش کی طرح برسی تو برستی ہی چلی گئی مگر آپؐ کے مُنہ سے ہمیشہ یہی نکلا، انا عبدهٗ و رسولهٗ'' (میں تو بس اس کا بندہ اور رسول ہوں)۔

Marfat.com

جس طرح رومیؒ نے شمسؒ کے سوال کی گہرائی محسوس کر لی تھی اسی طرح شمسؒ نے رومیؒ کے جواب کی گہرائی محسوس کر لی تھی اور دل میں کہا، ''بے شک، یہی ہے وہ جس کی مجھے تلاش تھی''۔ رومیؒ اور شمسؒ اب یک جان و دو قالب ہو چکے تھے۔ ہفتوں اور مہینوں پر پھیلی ہوئی خلوتوں میں وہ کبھی زبان اور کبھی سکوت سے ہم کلام ہوتے رہتے۔ تصوف کی لغت میں ایسی خلوتوں کو صحبت کا نام دیا جاتا ہے۔ ان صحبتوں میں کس نے کس کو کیا دیا یہ تو وہی دونوں جانتے تھے، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ سورج کو عربی میں شمس کہتے ہیں اور رومیؒ کا اپنا نام جلال تھا جو سورج کی روح ہے۔ بس دو سورج آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو کٹھالی میں ڈالے ایک دوسرے کو تاب دے دے کر اس کے وجود سے میل کچیل کا ہر ذرہ صاف کر کے اسے زرِ خالص میں ڈھال رہے تھے۔ صحبت کیا تھی، کیمیا گری تھی۔

لیکن جن کے دل میں میل کے سوا کچھ نہیں ہوتا انھیں دوسروں کی ایسی صحبتیں بہت کھلتی ہیں۔ اپنے پیر و مرشد سے عقیدت کے نام پر رومیؒ کے شاگردوں اور مریدوں نے شمسؒ کے خلاف سازشوں کا جال بُننا شروع کر دیا، ''یہ دیوانہ کہاں سے آ ٹپکا ہے کہ اس دور کے سب سے بڑے فرزانے کو بھی دیوانہ بنائے دے رہا ہے''۔ ان کی سازشوں نے شمسؒ کو مجبور کر دیا کہ وہ قونیہ سے رخصت ہو جائے۔ رومیؒ نے بے قرار ہو کر اپنے بیٹے سلطان ولد کو شمسؒ کی تلاش میں بھیجا۔ بیٹے نے دمشق کے ایک قہوہ خانے میں شمسؒ کو جا لیا جو اس وقت ایک یورپی نوجوان کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ نوجوان پتے بازی کر رہا تھا۔ جب انھوں نے سلطان ولد اور اس کے ہمراہیوں کو شمسؒ سے اتنی عزت اور عقیدت سے پیش آتے دیکھا تو اسے احساس ہُوا کہ اس نے ایسی محترم ہستی کو جُل دے کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ اس نے جیتی ہوئی رقم واپس کرنی چاہی۔ شمسؒ نے کہا، ''یہ تم میری طرف سے مغرب میں ہمارے ''دوستوں'' کے لیے لے جاؤ''۔ تاریخ اس یورپی نوجوان کو سینٹ فرانسس آف اسیسیؒ (St. Francis of Assisi) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مسیحی تصوف میں سینٹ فرانسسؒ کا قریب قریب وہی مقام ہے جو اسلامی تصوف میں رومیؒ کو حاصل ہے۔

شمسؒ کو ایک نہیں، کئی بار مجبور کیا گیا کہ وہ قونیہ سے کوچ کر جائے لیکن رومیؒ نے اسے جب بھی بلایا وہ واپس آ گیا۔ آخر 5 دسمبر 1247ء کو کچھ سفاک و سنگدل لوگوں نے اس کی جان لے لی البتہ اس کا جسدِ خاکی غائب ہو گیا اور یوں اسلامی تصوف اپنی ایک افسانوی ہستی سے محروم ہو گیا۔ رومیؒ کے لیے شمسؒ کے غروب ہونے سے دنیا تاریک ہو گئی۔ اس امید پر کہ کہیں نہ کہیں سے آوازِ دوست سنائی دے جائے گی، وہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ بھٹکتے پھرے۔ وہ دمشق میں تھے کہ ایک روز اچانک ان کے دل سے شمس کی آواز آئی، ''یارِ من! تو مجھے کہاں ڈھونڈتا پھرتا ہے، میں تو تیرے دل میں رہتا ہوں''۔ تب ظاہری تلاش ختم ہو گئی اور رومیؒ دل کو پکڑ کر رہ گئے۔

اب رومیؒ تھے اور ان کے دل سے پھوٹنے والا لامتناہی نغمۂ نور تھا۔ عالم فاضل، فقیہہ و فقیر اب شاعر بن چکا تھا۔ اپنی شاعری کے مجموعے کو اپنا نہیں شمسؒ کا دیوان (دیوانِ شمسؒ) کہہ کر وہ ثابت کر رہے تھے کہ ان کی آواز میں آوازِ دوست اس طرح جذب ہو گئی ہے گویا رومیؒ کی زبان سے شمس بول رہا ہے اور پھر انھوں نے اپنی شہرہ آفاق ''مثنوی'' لکھنی شروع کر

Marfat.com

دی جسے اہلِ دل ''قرآن درزبانِ پہلوی'' کہنے میں باک نہیں سمجھتے۔ان کی شاعری کا جادو آج بھی سر چڑھ کر بول رہا ہے یہاں تک کہ امریکہ جیسے شاعری سے قریب قریب نابلد ملک میں رومیؒ مقبول ترین مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں۔

خدا نے اپنے بارے میں کہہ رکھا ہے کہ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔زمین بظاہر تو شمس یا سورج سے روشنی پاتی ہے لیکن شمس کی روشنی کہاں سے آتی ہے؟ رومیؒ کے لیے شمس خدا کے نور کا استعارہ بن گیا۔نور کے اُس ازلی و ابدی سرچشمے سے جس کی اپنی کوئی متعین صورت نہیں اور جسے خدا کہتے ہیں، زمین پر آباد رومیؒ کو شمسؒ کے متعین وجود کے ذریعے سے روشنی پہنچ رہی تھی۔رومیؒ اور خدا کے درمیان کوئی تھا تو اس کا دوست ہی تھا۔

جب رومیؒ فوت ہوئے تو مسلمانوں کے علاوہ بدھوں، مسیحیوں اور یہودیوں نے بھی ان کا ماتم کیا۔اگرچہ ان کا روحانی سفر اسلامی تصوف کے معروف راستوں ہی پر کٹا لیکن ان کی ساری زندگی دل کی عالمگیر وسعت کی مُنہ بولتی گواہی تھی۔ان کی دیدہ وری کسی ایک گروہ یا قوم کے مقدر کی نشان دہی تک محدود نہ تھی، اس میں پوری انسانیت کے تمام تر امکانات کا احاطہ کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ موجود تھا۔ان کی شاعری ہر دور کے اہلِ دل کے لیے روح کا ایسا نغمہ ہے جو خدا اور خلقِ خدا کے درمیان ایک قابلِ اعتماد پل کا کام دیتا ہے۔رومیؒ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ جلال و جمال کا منبع ہمارا اپنا قلب ہے جبکہ ہمارے ظاہری قالب کا کردار صرف اتنا ہے کہ وہ ہمارے قلب کی واردات کو الفاظ دے دے۔اسی طرح دین کی حقیقت محبت ہے اور یہ کائنات محبت کی کتاب ہے۔

رومیؒ کا کوئی ایک شعر، رباعی، نظم یا غزل ان کی ترجمانی نہیں کر سکتی۔پھر بھی ان کی وسعتِ نظر اور کشادہ دلی کی ایک دھندلی سی جھلک شاید ان تین نظموں میں دیکھی جاسکے:

المزّمّل

خدا نے اپنے پیغمبر محمدؐ کو المزمل کا نام دیا تھا
آپؐ کملی اوڑھ لپیٹ کر خدا کے حضور کھڑے تھے
خدا نے کملی پوش محمدؐ کو پکارا، '' یا ایّھا المزّمّل!
اپنی کملی سے نکل، تم کب تک اپنے آپ کو چھپاؤ گے
کب تک لوگوں سے دور بھاگو گے

اپنا چہرہ نہ چھپاؤ
دنیا الٹ پلٹ ہو رہی ہے، کسی بدمست شرابی کی طرح اس کے قدم اکھڑ چکے ہیں
تم ہی تو اس کے سرِ ہوش مند ہو
اپنی فصاحت و بلاغت کی شمع نہ بجھاؤ
اٹھو اور رات کے اندھیرے میں اجالا کر دو، میرے شہریار!

Marfat.com

تمھاری شمع کے بغیر ایک شیر ببر کو ایک خرگوش نے دبوچ رکھا ہے
اے مصطفےٰ، میرے چہیتے! جہاز کی کپتانی کرو
دیکھو، تہذیب کے کارواں پر شبخون مارا جا چکا ہے
بے وقوف ہر جگہ قائد بنے پھرتے ہیں
عیسیٰؑ کی طرح خلوت نہ ڈھونڈو
اجتماع کی جان بن کر جلوت میں رہو اور اس کی کمان سنبھالو
جس طرح کلغی دار ہما کا کوہ قاف پر بسیرا ہے
کہ تنہائی اس کی فطرت ہے
اسی طرح تمھاری فطرت یہ ہے کہ تم عوام میں رہو
اور انسانوں کی روحانی رہنمائی کرو"

سلیمانؑ کا تاجِ کجدار

سلیمانؑ دوسروں پر الزام دھر رہے تھے
جب کہ ان کے اپنے خیالات کا تضاد قوم میں انتشار پیدا کر رہا تھا
ان کا تاج ان کی پیشانی پر ٹیڑھا ہو گیا۔
انھوں نے اسے سیدھا کیا لیکن تاج دوبارہ ٹیڑھا ہو گیا
آٹھ مرتبہ ایسے ہی ہُوا
آخر کار انھوں نے اپنے تاج سے خطاب کیا:
"تم بار بار ماتھے سے ڈھلک کر میری آنکھیں کیوں ڈھانپ دیتے ہو؟"
تاج نے کہا، "تو میں اور کیا کروں؟
اگر تمھاری طاقت تمھارے رحم و کرم کو ڈھانپ لے گی
تو پھر تمھاری آنکھوں کو ڈھانپ کر مجھے ہی تمھیں بتانا پڑے گا
کہ تم کیا غلطی کر رہے ہو اور کیسے لگ رہے ہو"۔
سلیمانؑ پر فوراً ہی حقیقتِ حال کھل گئی
انھوں نے اسی وقت خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر معافی چاہی
یاد رکھو، جب بھی حالات میں خرابی واقع ہو
دوسروں کو الزام دینے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکو

Marfat.com

اور سوچو کہ کہیں تم خود تو غلطی نہیں کر رہے تھے
افلاطون ہو یا سلیمانؑ، مغالطہ کھا سکتے ہیں اور غلطی کر سکتے ہیں
جب کبھی تمھارا ''تاج'' ٹیڑھا ہو کر تمھیں کچھ بتانا چاہے تو سمجھ جاؤ
کہ دوسروں کے لیے تمھاری محبت میں ضرور کچھ کمی آ گئی ہے
اور تمھارے اندر مزید طاقت کی خواہش پل رہی ہے

ایک سانس

نہ میں نصرانی، نہ میں یہودی، نہ میں مسلمان
نہ میں ہندو، نہ میں بدھ
نہ میں صوفی، نہ میں بھکشو
نہ میرا کوئی مذہب، نہ میرا کوئی طرزِ زندگی
نہ میں مشرقی، نہ میں مغربی
نہ میں سمندر سے نکلا، نہ میں زمین سے برآمد ہُوا
نہ میں فطرت کی پیداوار ہوں، نہ میں کوئی غیر مرئی مخلوق ہوں
نہ ہی میں عناصر میں ظہور و ترتیب سے وجود میں آیا
میرا تو کوئی وجود ہی نہیں
نہ میں اِس دنیا کا بندہ
نہ میں اُس دنیا کا باسی
نہ ہی میں آدم و حوا کی اولاد ہوں
میں تخلیقِ کائنات کی کسی کہانی کا کردار نہیں
میرا مقام لامقام ہے
میں بے نشان کا نشانِ راہ ہوں
نہ میرا کوئی جسم، نہ میری کوئی روح
میں تو محبوب کا ایک سانس ہوں
دونوں جہانوں میں مجھے بس وہی نظر آتا ہے
اول و آخر، ظاہر و باطن
بس وہی محبوب کا ایک سانس

رومیؒ کے مُنہ سے ''نہ میں مسلمان'' سن کر آپ پریشان تو نہیں ہو گئے؟ چلیے، واپس اپنی تاریخ میں پناہ لیتے ہیں۔ رومیؒ کو شمسؒ کے چہرے میں خدا کا چہرہ نظر آ گیا تھا۔ جب شمسؒ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رومیؒ کو اپنے دل میں شمسؒ اور شمسؒ کے پردے میں خدا نظر آنے لگا۔ اب اُن کے لیے ممکن ہو گیا کہ خدا کو اس کی تمام تر مخلوق میں جلوہ گر دیکھ سکیں۔ اس صورت حال میں کہ ''جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے'' رومیؒ نے پہلے تو سونے چاندی کے ورق کوٹنے والے صلاح الدین زرکوب کے چہرے میں محبوب کا چہرہ جلوہ گر دیکھا اور جب صلاح الدین بھی فوت ہو گیا تو محبوب کی صورت حسام الدین چلپی میں منتقل ہو گئی۔ حسام رومیؒ کی مثنوی کا صرف کاتب ہی نہیں تھا، وہ چھ جلدوں پر پھیلی ہوئی اس عظیم نظم کے ور چھور اور اسرار و رموز کا بھی شناور تھا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کیونکہ یہ نظم عجب آزادانہ طور پر فلسفے سے لوک کہانیوں ور لطیفوں سے عشقیہ مضامین کی جانب چل نکلتی ہے۔ اپنی عمر کے آخری بارہ سال رومیؒ نے حسام کو یہ نظم املاء (Dictate) کرانے میں صرف کر دیے اور پھر دل کا ایک خاص دروازہ کھول کر اِس دنیا سے اُس دنیا میں داخل ہو گئے۔

Marfat.com

تیسرا حصہ

روحانی جواں مردی

Marfat.com

Marfat.com

ساتواں باب

روحانی جواں مردی کا تعارف

روحانیت اور اس کے قرآنی سرچشمے اور اسلامی تصوف کا کوئی تذکرہ یا تاریخ اس کی ایک اہم خصوصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی جسے عربی میں فُتُوّت، فارسی میں جواں مردی اور انگریزی میں (Chivalry) کہا جاتا ہے۔ جواں مردی کا لفظ چونکہ اردو میں عام استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم فارسی ترکیب کے مطابق اسے روحانی جواں مردی کہیں تو مناسب ہوگا۔ لیکن اس خصوصیت کے بنیادی معنی تک پہنچنے کے لیے عربی لفظ فُتُوّت پر غور کرنا ضروری ہے کیونکہ جواں مردی کا تصور فارسی دانوں تک عربی ہی سے پہنچا تھا۔

فتوت کا لفظ فتیٰ سے بنا ہے جس کا مطلب ہے جوان، یہ لفظ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اس وقت استعمال ہُوا ہے جب آپ کے ہم قوموں نے دیکھا کہ بُت کدے میں بُت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں اور وہ پکار اٹھے، ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ تب کچھ لوگوں نے کہا، ہم نے ابراہیم نامی ایک جوان (فتیٰ) کو ان کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا (21:59-60)۔ مسلمانوں میں عموماً اور شیعہ فرقے میں خصوصاً عربی کا ایک مصرع "لا فتیٰ اِلّا علی، لا سیف اِلّا ذوالفقار" بہت مشہور ہے یعنی حضرت علیؓ جیسا کوئی جوان نہیں اور ان کی دو نوکوں والی "ذوالفقار" جیسی کوئی تلوار نہیں۔

تصوف میں فتوت یا جواں مردی کا تصور "جسمانی" نہیں "روحانی جواں مردی" کے معنی رکھتا ہے۔ عام حالات میں یہ لفظ ادب آداب ملحوظ رکھنے والے، اور دوسروں، خصوصاً اپنے سے کمتر اور کمزور لوگوں سے مروّت اور سخاوت کے ساتھ پیش آنے والے افراد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے روحانی پہلو سمجھنے کے لیے اقبالؔ کے اس مصرعے: "آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی" کے علاوہ خراسان کے نامور صوفی، امام ابوالقاسم قشیری کا یہ قول قابلِ ذکر ہے کہ "جواں مرد وہ ہے جو بُت شکن ہو اور ہر شخص کا بُت اس کی انا ("میں"۔Ego) ہوتی ہے"۔ روحانی جواں مردی کا رخ انسان کے اپنے اندر غرور، تکبر، انانیت، لالچ، ہوس جیسے رجحانات کے بُتوں کو پاش پاش کرنے کی طرف ہوتا ہے۔ جب اقبالؔ یہ کہتا ہے:

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں، لا الہ الا اللہ

تو وہ پتھر یا مٹی سے بنے ہوئے بتوں سے زیادہ، انسان کے سینے میں چھپی ہوئی نفسانی خواہشات کے بتوں کی

Marfat.com

بات کر رہا ہوتا ہے۔

روحانی جواں مردی ایک انسانیت گیر بلکہ ہمہ گیر رویہ ہے جس کے تحت انسان رنگ، نسل، جنس یا عقیدے کے فرق سے بالا ہو کر سخاوت، مروّت اور بے غرضی کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بناتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں جن سات جوانوں (فتیان) کا ''اصحابِ کہف'' کے عنوان سے ذکر ہوا ہے اور جو صدیوں تک ایک غار میں سوتے رہے تھے، ان کا تعلق بھی روحانی جواں مردوں ہی کی کسی جماعت سے تھا۔ عہدِ حاضر سے پہلے یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں میں ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو نہ صرف روحانی جواں مردی کے قائل تھے بلکہ ان کے درمیان بھائی چارہ (Brotherhood) بھی قائم تھا۔ بہر حال تاریخِ مذاہب میں یہ شرف حضرت ابراہیمؑ کو حاصل ہے کہ وہ اولیں ''جواں مرد'' کہلائیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو خود خدا نے اس راہ پر ڈالا تھا۔ یہ روایت تینوں ابراہیمی مذاہب، یہودیت، مسیحیت اور اسلام میں عام ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کھانا نہ کھاتے تھے جب تک کسی مسافر یا حاجت مند کو کھانے میں شریک نہ کر لیں۔ ایک روز آپؑ بازار میں کھڑے ایسے ہی کسی ''مہمان'' کو ڈھونڈ رہے تھے کہ آپ کی نظر ایک خستہ حال بوڑھے پر پڑی۔ آپؑ نے تعارف کے طور پر اس کا حال احوال پوچھا تو پتا چلا کہ وہ خدا کا منکر ہے۔ اسے کھانے کی دعوت دیتے ہوئے آپؑ نے اپنے دل میں کچھ تنگی سی محسوس کی۔ آپؑ اس سوچ میں پڑ گئے کہ ایک کافر کو گھر لے جائیں یا نہیں۔ اس پر خداوند کریم نے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے کہا، ''میں اس شخص کو ستر سال سے ہر روز رزق دیتا آیا ہوں اور تم اسے ایک وقت کی روٹی دیتے ہوئے شش و پنج میں پڑ گئے ہو''۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس روز کے بعد مروّت اور سخاوت میں رنگ، نسل، جنس اور عقیدے کا فرق کرنا چھوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک یہودی، مسیحی اور مسلمان اگر کسی ایک انسان اور پیغمبر کی یکساں عزت کرتے ہیں تو وہ حضرت ابراہیمؑ ہیں۔

روحانی جواں مردوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھیں قرآنِ حکیم ''حنفاء'' (حنیف کی جمع) کہتا ہے۔ جب رسولِ خدا پر پہلی وحی آئی اور جبرائیل امین نے آپؐ کو سینے سے لگا کر بھینچا تو آپؐ خوفزدہ حالت میں غارِ حرا سے گھر تشریف لائے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ آپؐ کی تسلی کے لیے آپؐ کو ''ورقہ بن نوفل'' نامی جس عالم فاضل شخص کے پاس لے کر گئی تھیں اور جس نے تمام انسانوں میں سب سے پہلے آپؐ کی برحق رسالت کی گواہی دی تھی وہ بھی حنیف کہلاتا تھا۔ رسولِ خدا کی نبوت سے پہلے بھی ایسے لوگ موجود تھے جو عقیدے کے لحاظ سے بت پرستی سے متنفر تھے اور سماجی اعتبار سے سخاوت اور مروّت جن کا شعار تھا۔ یہ لوگ بھی حضرت ابراہیمؑ ہی کے حوالے سے حنیف کہلاتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو جہاں ایک بار ''خلیل'' کہا ہے وہاں سات مرتبہ ''حنیف'' کہا ہے۔ پھر اس نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی (مسیحی)۔ تو پھر وہ کیا تھے؟ قرآنِ حکیم کے مطابق وہ حنیف اور مسلم تھے۔ خدا نے رسولِ خدا کو بھی ''ملت ابراہیم حنیف'' اور ''دینِ حنیف'' کی پیروی کا حکم دیا تھا (2:135/3:67)۔ البتہ جب خداوند کریم نے اپنی آخری وحی میں دین کی تکمیل کا اعلان کر دیا تو اس دین کو ''اسلام'' کا نام دے دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ کے تمام پیغمبر اسلام ہی کی دعوت دیتے چلے آئے تھے لیکن مختلف علاقوں، مختلف وقتوں اور مختلف قوموں میں اس کا الگ

الگ نام رکھ دیا گیا تھا۔

رسولِ خدا کے عہد سے ذرا پہلے عرب کا مشہور ترین سخی، حاتم طائی بھی حنیف ہی تھا اور اگر ہم یہ کہنے کی جسارت کریں کہ نبوت سے پہلے رسولِ خدا خود بھی حنفاء ہی میں شامل تھے تو غلط نہ ہوگا۔ گویا روحانی جواں مردی لمبے عرصے سے چلی آتی ہے اور آج بھی تمام علاقوں، قوموں، مذہبوں، ثقافتوں اور معاشروں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو پوری بے غرضی سے سخاوت اور مروت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ البتہ مسلمانوں میں ایسے لوگ خاصے کمیاب ہیں۔ حنیف کا مطلب ہے یکسو ہو کر صرف اور صرف سچے خدا کو خدا سمجھنے والا شخص۔ آج عالمِ اسلام میں کتنے ہی بادشاہ اور ڈکٹیٹر خدا بنے بیٹھے ہیں اور سچے خدا کو ماننے والے کروڑوں مسلمان ان جھوٹے خداؤں کو اپنی پیٹھ پر لادے بے بسی اور بے حسی کی حالت میں جی رہے ہیں۔

تاریخِ اسلام کی ابتداء میں روحانی جواں مردی کا تصور شیعہ فرقے اور ایران میں زیادہ مقبول رہا۔ یہاں تک کہ عبدالرزاق کاشانی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جس طرح دین حضرت ابراہیمؑ سے رسولِ خدا تک پہنچا، اسی طرح روحانی جواں مردی حضرت ابراہیمؑ سے حضرت علیؓ تک آئی۔ کاشانی کے اس نظریے کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ نبوت کے برعکس روحانی جواں مردی کبھی صرف پیغمبروں تک محدود نہیں رہی، پیغمبروں کے علاوہ، بلکہ مسلمانوں کے بھی علاوہ لوگ اس خاصیت کے حامل رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہم اصحابِ کہف، ورقہ بن نوفل اور حاتم طائی کی مثال دیکھ چکے ہیں۔ ایران میں حضرت علیؓ کے بعد، پہلے تو سلمان فارسیؓ اور پھر ایرانی سپہ سالار ابو مسلم خراسانی کو جواں مردی کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ ابو مسلم ہی تھے جنھوں نے مشرقِ وسطیٰ میں بنوامیہ کی اُس خلافت کا خاتمہ کیا تھا جس کی بنیاد ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہ نے رکھی تھی۔ معاویہ کے بیٹے یزید کے دورِ حکومت میں عراق کے شہر کربلا کے نزدیک رسولِ خدا اور حضرت علیؓ کے قریب قریب تمام خاندان (اہلِ بیت) کو اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔

حضرت علیؓ ایک ایسی ہستی ہیں کہ رسولِ خدا کے بعد جس کی سنّی اور شیعہ یکساں عزت کرتے ہیں۔ ان کی ذات میں شجاعت اور سخاوت، خطابت اور قیادت، شریعت اور طریقت، عظمت اور عزیمت شیر و شکر ہو گئی تھیں۔ حضرت علیؓ کے رفیق، سلمانؓ فارسی کو اسی بناء پر عراق کے رزقِ حلال کما کر کھانے والے عوام میں بہت اثر و رسوخ حاصل تھا۔ یہی حال ابو مسلم خراسانی کا تھا۔ خصوصاً جب اس نے بنوامیہ کی حکومت ختم کر کے عباسی خلفاء کا راستہ کھول دیا تو اس کی شخصیت کو روحانی جواں مردی کے اعتبار سے ایران میں ایک افسانوی ہیرو کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

ان دو شخصیتوں کے بعد روحانی جواں مردی تصوف کا ایک لازمی حصہ بنتی چلی گئی۔ سلمٰی نے اپنی کتاب ''طبقات الصوفیاء'' میں معروف کرخیؒ، ابوتراب نقشبندی اور عباس دیناوری جیسے صوفیوں کو روحانی جواں مردوں کی صف میں شامل کیا تھا۔ پھر ایرانی صوفی، شاعر اور نثر نگار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر روحانی جواں مردی کے گن گانے لگے۔ فردوسی اور رومیؒ جیسے عظیم شاعروں کے کلام میں اس اہم انسانی اور روحانی صفت کا ذکر عام ملتا ہے۔ اس موضوع پر پوری

Marfat.com

پوری کتابیں لکھی گئیں جنھیں ''فتوت نامے'' کہا جاتا تھا۔ ان میں پندرھویں صدی کے عالم اور صوفی، حسین واعظ کاشفی کی مبسوط کتاب ''فتوت نامہ سلطانی'' خصوصاً قابل ذکر ہے۔

عباسیہ کے آخری دور میں خلیفہ ناصرالدین اللہ (متوفی 1225ء) نے روحانی جواں مردی کی بکھری بکھری مثالوں کو نظم و ضبط کے دائرے میں لانے کے لیے مسیحی دنیا کے نائٹوں (Knights) اور جاپان کے سمورائیوں (Samurais) کے نمونے پر ایسے جانبازوں کا ایک سلسلہ قائم کیا جو خصوصی رسوم ادا کرنے کے بعد اور خصوصی قسمیں کھا کر ''حلف جواں مردی'' اٹھاتے تھے۔ لیکن جب بغداد پر منگولوں نے چڑھائی کر دی تو اور سب کچھ کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ بھی افراتفری کا شکار ہو گیا۔ ان جانبازوں میں سے کچھ شام، مصر اور ترکی میں بکھر گئے اور یوں ایک طرح روحانی جواں مردی کا تصور پھیلنے لگا۔ البتہ اب جانبازوں کی رسموں اور قسموں کے بجائے محنت کشوں اور کاریگروں کی پیشہ ورانہ تنظیموں نے روحانی جواں مردی کے حوالے سے حلقے بنانے شروع کر دیے۔ ترکی اور پھر ہندوستان میں، ایسے حلقوں پر شیعہ عقائد کا اثر پایا جاتا تھا۔ ترکی میں خلافت عثمانیہ کے دوران ایسے حلقے انیسویں صدی تک موجود رہے۔ آج بھی شام، ایران، برصغیر پاک و ہند اور دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں اِکا دُکا ایسی پیشہ ورانہ تنظیمیں موجود ہیں جن میں کاریگری کے روایتی انداز باقی رہ گئے ہیں۔ مرشد اور مرید کی جگہ ان حلقوں میں استاد اور شاگرد کا رشتہ اہمیت رکھتا ہے اور اس رشتے کے دونوں فریق مرشد اور مرید ہی کی طرح اپنی اپنی ذمہ داریاں نباہتے ہیں۔

روحانی جواں مردی کے تصور نے مسلمان معاشرے پر جو گہرا اثر چھوڑا ہے اسے دیکھنا ہو تو ایران کے پہلوانوں کے زورخانوں اور برصغیر کے پہلوانوں کے اکھاڑوں میں جھانک کر دیکھیے۔ آج بھی پرانے پہلوان استادوں کو مرشد کا مقام اور خلیفہ کا نام دیا جاتا ہے اور شاگرد یا پٹھا ان کی ہدایات کے مطابق نہ صرف جسمانی طاقت بلکہ اخلاقی قدروں کی نشوونما کرتا ہے۔ پہلوانوں میں جنسی اخلاقیات کا اس حد تک خیال رکھا جاتا ہے کہ غیر پہلوان عوام و خواص میں بھی جو شخص جنسی بے راہ روی سے گریز کرتا ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ''لنگوٹ کا پکا'' ہے۔ آج بھی ہماری ورکشاپوں، چھاپہ خانوں بلکہ موسیقاروں، خوش نویسوں، مصوروں اور شاعروں میں استادی شاگردی کا یہ رشتہ زندہ ہے اور جب کوئی نوآموز کسی ماہر یا صاحبِ کمال کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے (ادب کے ساتھ، نماز میں اَتحیات کے انداز میں گھٹنے دوہرے کر کے بیٹھتا ہے) تو مرشد اور مرید کے درمیان ''بیعت'' (عہدِ وفاداری) کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

غور سے دیکھیں تو برصغیر کی ایک وقت میں بے حد متحرک، مقبول اور منظم خاکسار تحریک کے پیچھے بھی حضرت علیؓ سے چلتا ہوا، روحانی جواں مردی کا تصور، کارفرما نظر آئے گا۔ علامہ عنایت اللہ مشرقیؒ نے بظاہر اس تحریک کو جرمنی میں اپنے کلاس فیلو ایڈولف ہٹلر کی ''کالی وردی والی اسپیشل پولیس فورس'' (SS) کے خطوط پر منظم کیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو نوجوان اس تحریک میں شامل ہوئے، خصوصاً اس کے جانباز، وہ روحانی جواں مردی ہی کی دیرینہ اور شاندار روایات سے متاثر تھے۔ جن لوگوں نے 19 مارچ 1940ء کو لاہور کی بادشاہی مسجد کے سایہ میں خاکساروں کو سر سکندر حیات کی

Marfat.com

مشین گنوں سے لیس پولیس کا بیلچوں (Spades) سے مقابلہ کرتے دیکھا ہے وہ ان جانبازوں کی بہادری کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ خاکساروں کو صرف جسمانی تربیت ہی نہیں دی جاتی تھی، اخلاقی قدروں اور شرعی احکام کی پابندی بھی سکھائی جاتی تھی۔ یہ پابندی تو دوسری سیاسی تنظیموں میں پیش نظر نہ رکھی جا سکی لیکن جانبازی کا جذبہ قائداعظمؒ کی اپنی زندگی کے دوران مسلم لیگ، ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز پارٹی اور مولانا مودودیؒ کی جماعت اسلامی اور جمعیت طلبہ اسلام کے کارکنوں میں ضرور موجود رہا۔ حال ہی میں تحریک خلافت کے قائد ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی جماعت میں بیعت کی پرانی رسم اپنا کر روحانی جواں مردی کی روایت ہی کو نئی زندگی بخشنے کی کوشش کی ہے۔

فتوت ناموں کے مندرجات

تیرھویں اور پندرھویں عیسوی صدیوں کے دوران کاشانی، آملی، عمر سہروردی اور واعظ کاشفی نے جو فتوت نامے لکھے ان سے روحانی جواں مردی کے مقاصد، اس کی بیعت سے متعلقہ رسومات اور اس کے کاریگروں اور محنت کشوں کے ساتھ خصوصی تعلق کے بارے میں بہت کچھ پتا چل سکتا ہے۔ مثلاً کاشانی اپنی کتاب ''تحفۃ الاخوان فی الخصائص الفتیان'' (روحانی جواں مردوں کی خاصیتوں کی بابت برادرانہ تحفہ) میں وضاحت کرتا ہے کہ روحانی جواں مردی کا ایک بنیادی تصور ''فطرت سے ہم آہنگی'' ہے۔ انتشار اور ظلمات میں گھری ہوئی اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی انسان اپنی اُس فطرت کو برقرار رکھ سکتا ہے جس کے ساتھ خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ فطرت وہ نور ہے جس سے انسان کی روح، جو اس کے وجود کا مرکز ہے، منور رہتی ہے۔ خواہ انسان پر عقل، جذبات، جبلتوں اور فراموشی کے کتنے ہی پردے پڑے ہوں، روحانی جواں مردی انسان کے اندر سوئی ہوئی یا سلائی ہوئی روح کو اس حد تک بیدار اور طاقت ور بنا دیتی ہے کہ وہ اس دنیا کے اندھیروں پر غالب آ جائے۔ اس طرح انسان کی وہ فطرت، جس کے مطابق خدا نے اسے بہترین توازن (احسن تقویم) کے ساتھ پیدا کیا ہے، ازسرنو مستحکم ہو جاتی ہے۔ روحانی جواں مردی کا بنیادی اور اہم ترین فریضہ یہی ہے کہ فطرت کے نور کو امکان کے دائرے سے نکال کر حقیقت بنا دے۔ جب غالبؔ نے کہا تھا:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا، پایا

تو دراصل وہ اپنے روحانی سفر کے دوران امکان کے پہلے قدم سے آگے حقیقت کے دوسرے قدم ہی کی تمنا کر رہا تھا۔

مٹی کا پتلا انسان اکثر و بیشتر مٹی ہی میں دوبارہ جاتا ہے لیکن کوئی کوئی انسان حضرت علیؓ کے نقش قدم پر چل نکلے تو وہ اس مٹی پر غالب آ جاتا ہے۔ اقبالؔ نے مثنوی اسرار و رموز میں یہ نکتہ یوں بیان کیا ہے کہ اکثریت کی طرح مٹی (جسے عربی میں تراب کہتے ہیں) کو اپنے اوپر سوار کر لینے کے بجائے مٹی پر سوار ہو جانے (سفلی خواہشات پر قابو پا لینے) سے حضرت علیؓ بُوتراب (مٹی کے پُتلے کے بجائے مٹی کے باپ) بن گئے۔ یہی نہیں، اقبالؔ تو یہ گواہی بھی دیتا ہے کہ حضرت علیؓ

Marfat.com

صرف مٹی ہی پر نہیں موت پر بھی غالب آ گئے تھے۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا ابوالحسن (حسن کے والد) سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

روحانی جواں مردوں کی سب سے گھمسان کی جنگ فطرت کے نور کی مدد سے اپنی کھوئی اور سوئی ہوئی روح کی بازیابی ہے۔ روحانی جواں مردی کی معراج یہ صلاحیت ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر فطرت کے اسی حسنِ توازن کے ساتھ زندگی گزارنے لگیں جس کے مطابق خدا نے یہ ساری کائنات، ہمارا دین اور ہمیں پیدا کیا ہے۔

اپنی کتاب کے پہلے باب میں کاشانی روحانی جواں مردی کے مختلف درجوں کا تعین اور ان کی وضاحت کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ درجات مروّت سے شروع ہوتے ہیں جس کے بنیادی مفہوم کے مطابق اپنے حقوق کے مقابلے میں اپنے فرائض کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے اور دوسروں کی کمیوں، کوتاہیوں بلکہ گناہوں تک کے بارے میں برداشت، درگزر اور معافی کا رویہ اپنایا جاتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان کلچر میں اس کی ایک عام سی مثال ''پہلے آپ'' ہے۔ مغربی کلچر میں مروّت کو ''لیڈیز فرسٹ'' اور ہر کسی سے احترام کے ساتھ پیش آنے (Courtesy) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کاشانی ''ولایت'' کو روحانی جواں مردی کا ''مروّت'' سے اگلا درجہ قرار دیتا ہے۔ جب کوئی جواں مرد اپنی فطرت کی جانب لوٹ جاتا ہے تو وہ ولایت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ یہ درجہ روحانی جواں مردی کی معراج ہے اور روحانیت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل یہ ولایت ہی ہے جو نبوت اور روحانی جواں مردی کے درمیان پل کا کام کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ پہلے فرد تھے جن میں نبوّت اور جواں مردی جمع ہو گئے تھے جس کی بدولت آپ کو خدائے واحد کے نام پر بت توڑ ڈالنے کا حوصلہ ملا۔

روحانی جواں مردی کا ولایت سے اگلا اور آخری درجہ نبوّت کا ہے جو ولایت اور ہر طرح کی روحانیت اور روحانی جواں مردی کا سرچشمہ ہے۔ نبوت کے بغیر انسان اپنی ازلی فطرت کے اس نور کو لباسِ حقیقت نہیں پہنا سکتا جو اس کے وجود میں موجود تو ہوتا ہے لیکن اس کی زندگی کی صبح وشام کا حصہ نہیں بنتا۔

کاشانی نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ روحانی جواں مردی کی رسمیں اور قسمیں کیا تھیں اور ان کا مقصد کیا تھا۔ رسموں میں نمکین پانی پینا بھی شامل تھا جو شیعہ عقیدے کے مطابق روحانی جواں مردی کی بیعت کے موقع پر حضرت علیؑ نے سلمان فارسیؓ کو پیش کیا تھا۔ ''نمک حلال''، ''نمک حرام'' جیسی اصطلاحوں، اور وفاداری کے معنی میں ''میں نے آپ کا نمک کھایا ہے'' جیسے محاوروں کا سرچشمہ یہی رسم ہے۔ اسی طرح لباس کے نیچے ایک طرح کا زیر جامہ پہننے کی بھی شرط رکھی جاتی تھی جسے ''سروال'' کہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پٹی بھی باندھی جاتی تھی جیسی کہ رسولِ خدا نے حضرت علیؑ کی کمر میں اپنے دستِ مبارک سے کسی تھی۔ نمک سے وفاداری اور انصاف، زیر جامے سے ضبطِ نفس اور طہارت اور پٹی یا کمر بند سے عزتِ نفس اور جرأت وحوصلہ مراد تھے۔ ان رسوم کی روح تو وہی تھی جو تصوف میں مرشد اور مرید کے

Marfat.com

درمیان بیعت کی ہوتی ہے لیکن ظاہری اعتبار سے ان میں ضرور فرق تھا۔

جہاں تک جواں مردی کی قسموں کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر بیعت کرنے یا حلف وفاداری اٹھانے والے فرد کو اس مقام پر لا کھڑا کرتی تھیں جس کا ذکر قرآن حکیم میں خدا اور انسان کے درمیان ہونے والے اس عہد نامے کی شکل میں آیا ہے جس کے مطابق خدا نے انسان سے سوال کیا تھا: ''کیا میں تمھارا رب نہیں؟ (اَلَستُ بِرَبِکُم) اور انسان نے جواب دیا تھا: ''ہاں'' (بَلیٰ)۔ قرآن اور دیگر الہامی کتابوں میں اس عہد کو بار بار دہرایا گیا ہے اور یہی وہ عہد ہے جسے انسان اکثر و بیشتر بھول جاتا ہے۔

آج بھی اگر ہم اپنے ماحول پر نظر دوڑائیں تو ہمیں سیاسی، سماجی، رفاہی تنظیموں کے علاوہ طالب علموں سے لے کر کلرکوں اور وکیلوں تک کی ایسوسی ایشنوں کے عہدیدار، واضح اور متعین شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے، حلف اٹھاتے ملیں گے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار، مثلاً اراکین اسمبلی اور سینیٹ، وزراء، وزرائے اعلیٰ، گورنر، وزیراعظم اور صدر بھی خصوصی تقریبات میں بڑے سنجیدہ لہجے میں حلف اٹھاتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان رسموں کا خول تو باقی رہ گیا ہے اور مغز غائب ہو گیا ہے کیونکہ اتنے اہتمام سے حلف اٹھانے والے یہ لوگ نہ صرف طرح طرح کی بدعنوانیوں کے مرتکب ہوتے ہیں جو اس دستور کے سراسر الٹ ہوتی ہیں جس کی حفاظت کی انھوں نے قسم کھائی تھی بلکہ صدر صاحبان اور فوجی ڈکٹیٹر تو اکثر اس دستور ہی کو منسوخ یا معطل کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا جب تک کہ ہم روحانی قدروں، خصوصاً روحانی جواں مردی کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتے۔

جہاں تک نمکین پانی اور زیر جامہ جیسی رسوم کا تعلق ہے، بعض مذاہب نے اسے اپنے ہر پیروکار کے لیے لازمی قرار دے رکھا ہے۔ سب سے واضح مثال سکھ مذہب کی ہے جس میں ہر سکھ مرد کے لیے ''کچھ'' (زیر جامہ)، ''کڑا'' (لوہے کا کنگن جو کلائی میں پہنا جاتا ہے)، ''کرپان'' (چھوٹی تلوار)، ''کنگھا'' اور ''کیس'' (سر کے بالوں، مونچھوں اور ڈاڑھی کو نہ مونڈنا)...... پانچ چیزیں جن کا نام ''ک'' سے شروع ہوتا ہے، ضروری ہیں۔ اسی طرح سکھ حضرات تمباکو نوشی سے بھی مکمل پرہیز کرتے ہیں۔ بہر حال اس طرح کی رسوم چوروں، ٹھگوں، ڈاکوؤں، منشیات فروشوں، مافیا اور خفیہ تنظیموں میں بھی زیرِ عمل رہی ہیں۔ بعض خفیہ تنظیمیں مثلاً ''فری میسن'' بلند مقاصد کا دعویٰ کرتی ہیں لیکن مختلف وقتوں میں مختلف ملکوں کے اندر انھیں شک کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ جب رسموں کے پیچھے کارفرما مقصد دھندلا پڑ جاتا ہے تو یہودیوں اور مسلمانوں میں ختنے (Circumcision) کی رسم ہو یا مسیحیوں میں بپتسمے (Baptism، سائل کا سر کچھ لمحوں کے لیے پانی میں ڈبونے) کی رسم، ان کا یہی حال ہو جاتا ہے کہ رسم رہ جاتی ہے، روح غائب ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے ختنے کے بارے میں ایک تاریخی واقعہ اور سکھوں کے تمباکو نوشی سے پرہیز کا ایک نتیجہ سن لیجیے۔ نپولین بوناپارٹ 1789ء میں ہندوستان فتح کرنے کے لیے فرانس سے بحری فوج لے کر نکلا تو برطانوی بحری فوج نے اس کا رستہ روکنا چاہا۔ وہ ٹکراؤ سے بچتا بچاتا مصر کے ساحلوں تک جا پہنچا۔ جہاز میں اس نے مصر کے علاوہ اسلام کے بارے میں

Marfat.com

بھی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جب اس نے چلتے چلتے، لگے ہاتھوں، بے یارومددگار، بے بس اور بے جان مصر کو فتح کرلیا اور وہاں فرانس کا جھنڈا گاڑ دیا تو ایک روز اس نے مصر کے چیدہ چیدہ علماء اور امراء کو بلا بھیجا۔ وہ لوگ نپولین کے مُنہ سے یہ بات سن کر ہکابکا رہ گئے کہ وہ قاہرہ کی جامع مسجد میں جا کر اپنی تمام فوج کے ساتھ اسلام قبول کرنا چاہتا ہے۔ امراء تو اس بات پر بہت خوش ہوئے لیکن علماء نے آپس میں مشورہ کر کے کہا، ''جناب عالی مقام! ہمیں اس بات پر بے حد فخر اور مسرت ہے کہ آپ خداوند کریم کا سچا دین قبول کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں ایک قباحت ہے، آپ کو اور آپ کی تمام فوج کو پہلے ختنے کروانے پڑیں گے''۔ نپولین یہ شرط سن کر مصری علماء کا مُنہ تکنے لگا اور پھر بولا، ''اگر اکیلے میری بات ہوتی تو خیر تھی، لیکن ساری فوج والی شرط ذرا زیادہ ہی ٹیڑھی ہے، اس سلسلے میں مجھے اپنے فوجی عہدیداروں سے مشورہ کرنا پڑے گا''۔ اور یوں دنیا کے ایک نامور ترین فاتح اور قائد کے ساتھ ساتھ فرانس کی بحری فوج کے اسلام قبول کرنے کی بات کھٹائی میں پڑ گئی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ نے بھی ختنے کرائے تھے؟

سکھ حضرات کے تمباکونوشی سے پرہیز کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ جب یہ بھلا دیا گیا کہ تمباکونوشی سے ممانعت دراصل انسان کو غلط عادات اور منشیات کا غلام بنانے سے بچانے کیلئے ایک علامت کے طور پر کی گئی تھی تو سکھ حضرات نے تمباکو سے تو پرہیز کرلیا لیکن شراب کو اس حد تک اپنا لیا کہ یہ معلوم کرنا بھی بعض اوقات مشکل ہوجاتا ہے کہ ان کی رگوں میں خون دوڑ رہا ہے یا شراب۔ چونکہ ان کی شریعت یا قانون میں صرف تمباکونوشی ممنوع قرار دی گئی تھی اس لیے شراب از خود ان کے لیے جائز ہوگئی۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ روحانی جواں مردی کی ان کرداری خوبیوں کا ذکر کریں جو ''رسمِ اذاں'' میں کھوجانے والی ''روحِ بلالی'' کو واپس لاسکتی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر کاشانی کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں وہ ہماری کیا مدد کرسکتا ہے۔

کاشانی نے خصوصاً اور روحانی جواں مردی کے دوسرے ترجمانوں نے عموماً جن کرداری خوبیوں پر زور دیا ہے وہ یہ ہیں:

1۔ توبہ: یہ انسان کی ظاہری نہیں، قلبی تبدیلی (تقلیب یا Transformation) کا دوسرا نام ہے۔ مثل مشہور ہے کہ توبہ گناہ کو کھا جاتی ہے۔ سب سے پہلی اور دنیائے دین کی ایک مشہور ترین توبہ حضرت آدمؑ نے کی تھی جب انھیں شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھنے کی پاداش میں جنت سے نکال دیا گیا تھا۔ دراصل ہر روحانی سفر کا پہلا قدم یا تلاشِ حق کی پہلی سیڑھی توبہ ہی ہوتی ہے جو ایک طرح سے انسان کو دوبارہ اس کی اصل فطری طہارت یا پاکیزگی کے مقام پر لے آتی ہے۔ توبہ صرف اس جرم یا گناہ پر معافی کی درخواست نہیں ہوتی جو ہم سے سرزد ہوچکا ہے، یہ آئندہ کوئی جرم یا گناہ نہ کرنے کا وعدہ بھی ہوتی ہے۔

Marfat.com

2۔ سخاوت: یہ مروّت کی انتہائی منزل ہے اور اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کسی اجر یا ادلے بدلے کی تمنا کے بغیر سخاوت کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت کو روک کر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دے۔ تیسرا درجہ یہ ہے انسان اپنے مال میں دوسروں کو شریک سمجھے۔ سخاوت کا یہ درجہ قرآنِ حکیم کے اس فیصلے کی عملی تفسیر ہے کہ ''تمھارے مالوں میں حاجت مندوں اور محروموں کا جانا پہچانا حصہ ہے'' (70:24)۔

3۔ تواضع: ہم اسے انکسار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس خوبی کا دائرہ اپنے مُنہ میاں مٹھو نہ بننے سے لے کر اپنی انا کو لگام دینے اور دوسروں کی آنکھ کے تنکے کے بجائے اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر رکھنے تک پھیلا ہُوا ہے۔

4۔ امن: اپنے اندر دل و دماغ کی ہمنوائی اور اپنے باہر پھیلی ہوئی کائنات میں کارفرما فطری اصولوں اور خدا کی تمام مخلوقات کے ساتھ ہم آہنگی کا نام امن ہے۔

5۔ صِدق: جب انسان کے قول اور فعل میں فرق نہیں ہوتا اور وہ تمام معاملات میں جھوٹ، دھوکے اور دغا سے بخوشی باز رہتا ہے تو اسے ''صاحبِ صدق'' یا ''صادق'' کہتے ہیں۔

6۔ ہدایت: ہدایت اس راستے پر ثابت قدمی سے چلنے کا نام ہے جسے قرآنِ حکیم نے ''صراطِ مستقیم'' کا نام دیا ہے۔ یہ راستہ صرف چہرے کی آنکھوں یا بصارت ہی سے نہیں، دل کی آنکھوں یا بصیرت سے بھی طے کیا جاتا ہے۔

7۔ نصیحت: دوسروں کے لیے اچھی مثال بننے کا نام نصیحت ہے ورنہ دوسروں کو نصیحت، خود میاں فصیحت والی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دوسرے آپ کے قول کو سچا، آپ کے عمل کو درست اور آپ کے علم کو برحق پاتے ہیں تو آپ مُنہ بولتی اور چلتی پھرتی نصیحت بن جاتے ہیں۔

8۔ وفا: وفا کا آغاز اپنے قول، اصول اور تعلق کو نباہنے کے ارادے سے ہوتا ہے۔ وفا میں استحکام اور استقلال ہو تو انسان ایمان کی معراج کو پا جاتا ہے۔ اقبالؔ نے اس بیان کی وضاحت یوں کی تھی: ''وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے''۔ انسان جب بھی اپنے وعدے یا معاہدے کا پاس کرے یا دوستی، محبت اور عزیزداری کے تقاضے پورا کرے وہ دراصل اسی ازلی عہد کو نباہ رہا ہوتا ہے جو اس نے خدا سے اس وقت کیا تھا جب خدا نے سوال کیا تھا کہ ''کیا میں تمھارا رب نہیں؟'' اور انسان نے جواب دیا تھا، ''ہاں''۔

روحانی جواں مردی کی بہت سی ''صفات'' کی طرح کچھ ''آفات'' بھی ہیں جو اسے نقصان پہنچا سکتی اور کمزور کر سکتی ہیں۔ سب سے بڑی آفت غرور اور تکبر ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھنا اور اپنی نیکی کا ڈھنڈورا پیٹنا جواں مردوں کا کام نہیں۔ دوسری بڑی آفت جواں مردی کے عہد کو سنجیدگی سے نہ لینا ہے۔ کاشانی نے اسی لیے جواں مردوں کی تین قسمیں گنوائی ہیں۔ پہلی اور اصلی قسم تو سچے جواں مردوں کی ہے جو اپنے عہد کو ہر وقت یاد رکھتے ہیں اور

Marfat.com

جن کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ دوسری قسم وہ ہے جو دعویٰ تو جواں مردی کا کرتی ہے لیکن ان کا عمل اس دعوے کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو نہ تو جواں مردی کے اصولوں سے واقف ہیں اور نہ ان کا عمل ہی ان اصولوں کے مطابق ہوتا ہے؛ وہ تو جواں مردی کی رَسموں اور قسموں سے بھی نہیں گزرے ہوتے۔ انھوں نے جواں مردی کے بارے میں اِدھر اُدھر سے کچھ سنا ہوتا ہے اور لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے جواں مردی کا جھوٹا دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی جاہل شخص، ڈاڑھی بڑھا کر اپنے آپ کو مولانا یا علامہ کہلانا شروع کر دے۔ انگریزی میں ایسے بہروپیوں کو (Imposters) کہا جاتا ہے۔

بہرحال روحانی جواں مردی کی خوبیوں پر جوان عمر کے مردوں کی اجارہ داری نہیں ہے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ ان خوبیوں کو جزدی یا کلی طور پر اپنا سکتے ہیں۔ چنانچہ محنت کشوں سے لے کر صوفیوں تک نے جواں مردوں کی خوبیاں اپنائیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سے صوفی اس معاملے میں بہت آگے نکل گئے۔ برصغیر میں تصوف کی تاریخ اور روایات سے پتا چلتا ہے کہ اکثر صوفیوں نے رزقِ حلال کمانے کو روحانی سفر کے لیے اہم زادِراہ گردانا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سچے اور مخلص صوفی بعض اوقات نہایت معمولی درجے کے پیشے اپنا لیتے ہیں۔ کبھی ہم انھیں بھگت کبیرؒ اور شاہ حسینؒ کی طرح جولاہے (Weaver) کا کام کرتے دیکھتے ہیں اور کبھی شاہ عنایتؒ کی طرح مالی کا اور کبھی نور والے بابا فضل شاہؒ کی طرح بڑھئی کا۔ اس روایت کے پیچھے جہاں محنت کشی کا احترام (Dignity of Labour) شامل ہے وہاں رسُولِ خدا کا یہ ارشاد بھی کارفرما ہے کہ ''الکاسب حبیب اللہ'' (محنت یا کسب کرنے والے خدا کے پیارے ہوتے ہیں)۔ یہ حقیقت ہے کہ محنت کشوں کی پیشہ ورانہ تنظیموں میں روحانی جواں مردی کے تصور نے مذہب اور کام کے درمیان ایک طرح کا پل تعمیر کر دیا ہے۔

پروفیسر سید حسین نصر ہمارے عہد کی وہ نامور، مستند اور محترم ہستی ہیں جنھوں نے اسلامی فلسفے اور تصوف سے پوری دنیا کو روشناس کرایا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ روحانی جواں مردی کی بابت عربی، فارسی اور ترکی کی متعدد معتبر کتابوں میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس تصور نے کس طرح مسلمان معاشروں کی روزمرہ زندگی کو روحانی قدروں سے قریب تر لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ صنعت و حرفت کے مختلف شعبوں کے علاوہ اس تصور کا اثر موسیقی، مصوری، معماری، ادب اور شاعری جیسے فنونِ لطیفہ پر بھی واضح ہے۔ یہاں تک کہ ان تمام شعبوں کے لیے الگ فتوت نامے یا عہد نامے اور ہدایت نامے موجود ہیں۔ کپڑا بُننے والوں کا فتوت نامہ (رہنمائے جواں مردی) خصوصاً یہ وضاحت کرتا ہے کہ ان کی تنظیم کا روحانی جواں مردی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس میں دھاگا بنانے سے لے کر کپڑے کو رنگنے تک، ہر مرحلے کی علامتی معنویت واضح کی گئی ہے۔ اس طرح کی وضاحتیں ہمیں بھگت کبیرؒ اور شاہ حسینؒ کے اشعار میں بھی جابجا جگنوؤں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب کے صوفی شاعر بلھے شاہؒ کے دو شعر ملاحظہ کریں جن میں لوہار سے مراد مرشد ہے:

ڈھلک گئی چرخے دی ہتھی، کتیا مُول نہ جاوے

تکلے نوں وَل پے پے جاندے، کون لوہار سداوے
تکلے دے وَل کڈھ لوہارا، تندی ٹُٹ ٹُٹ جاوے
گھڑی گھڑی ایہہ جھولے کھاندا، چھلی کت پدھ لاہوے

(چرخے کا سپنڈل ڈھیلا پڑ گیا ہے، کاتنا محال ہو گیا ہے۔ تکلے (Spindle) کو بل پر بل پڑ رہے ہیں۔ کوئی ہے جو لوہار (مرشد) کو بلائے۔ اے لوہار! تکلے کے بل نکال دے کیونکہ دھاگا بار بار ٹوٹ رہا ہے۔ تکلے کے بار بار ہچکولے کھانے سے دھاگے کی نلکی نہیں اتاری جا سکے گی)۔

شیعہ عقائد کے مطابق پارچہ بافوں کی تنظیم کے روحانی پیشوا حضرت امام جعفر صادقؒ تھے اور یہ حضرت جبرائیل امین (وحی لانے والے فرشتے) تھے جنھوں نے انسان کو پہلے پہل کپڑا رنگنا سکھایا تھا۔ آج اس موضوع پر خاصا دلچسپ تحقیقی کام ہو چکا ہے کہ فرعونوں کے عہد میں اہرام مصر تعمیر کرنے اور ممی بنانے کے طریقے اور سکندر اعظم کے دور میں مجانیں بنا کر قلعوں کے اندر پتھراؤ کرنے اور آتشیں تیر پھینکنے کے طریقے سکھانے کے لیے آسمان یا دوسرے جہانوں سے لوگ آئے تھے اور زراعت سے لے کر تعمیرات تک کا ہر وہ علم اوپر سے آیا تھا جس نے انسانی طرز زندگی اور تہذیب و تمدن میں انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے۔ پتھر کے زمانے کو لوہے کے زمانے سے بدلنے کے لیے خدا نے لوہا بھی آسمان سے نازل کیا تھا چنانچہ قرآنِ حکیم نے اس سلسلے میں لوہا پیدا کرنے کے بجائے لوہا نازل کرنے (انا انزلنا الحدید، 57:25) کی بات کی ہے۔ پارچہ بافوں کے ہدایت نامے میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ ہر کاریگر کسی باصلاحیت و باکردار کاریگر کو اپنا استاد بنائے۔ اس طرح صرف روحانی ہدایات کو سلسلہ بہ سلسلہ جاری رکھنے ہی سے صنعت و حرفت اور فنونِ لطیفہ جیسے کاموں میں دین کی روح پھونکی جا سکتی ہے۔ آج جو لوگ بلا سوچے سمجھے فنون لطیفہ کے خلاف فتوے جاری کرنے چل دیتے ہیں، انھیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ روحانی جواں مردی کی طویل اور متواتر روایت نے مسلمان فنکاروں اور کاریگروں (Craftsmen) کے دل و دماغ کو، خوبصورتی کے ساتھ ساتھ بہترین انسانی اور اخلاقی قدروں سے اس حد تک متاثر کر رکھا ہے کہ اسلام کی روحانی تعلیم نظریے کی سطح سے بلند ہو کر عملی جامہ پہن لیتی ہے۔

حضرت علیؓ اور روحانی جواں مردی

مولانا جلال الدین رومیؒ نے اپنی لازوال مثنوی کی ایک مشہور ترین حکایت میں بتایا ہے کہ روحانی جواں مردی کی روح یہ ہے کہ انسان کا عمل بے غرضانہ سخاوت، حوصلہ مندی، بے لاگ انصاف اور اخلاص پر مبنی ہو اور یہ عمل سراسر نہ صرف خدا کے نام پر بلکہ خدا کی خاطر ہو۔ یہ حکایت رسولؐ خدا کے عہد کی ایک جنگ میں حضرت علیؓ کی عالی ظرفی اور روحانی جواں مردی سے تعلق رکھتی ہے۔ رومیؒ کا انداز بیان کوئی کہاں سے لائے، پھر بھی شاید ہمارے اِن ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اس کا مدعا بیان ہو جائے:

اخلاص سیکھنا ہو تو علیؓ سے سیکھو کہ شیرِ خداؓ غلط کاری اور غلط بیانی سے پاک تھے
کفار سے لڑتے ہوئے آپ اپنے مدِ مقابل پر غالب آ گئے
آپ نے تلوار سونتی اور قریب تھا کہ اس کی گردن اڑا دیں
عین اس وقت اس بد بخت نے علیؓ کے چہرے پر تھوک دیا
علیؓ؟ جس پر پیغمبر اور ولی فخر کرتے تھے
چہرہ؟ جس کے سامنے ماہِ کامل سجدہ ریز ہو جائے
علیؓ نے فوراً اپنی تلوار پھینک دی اور سکون سے ایک طرف کھڑے ہو گئے
بے دین پہلوان آپ کے اس اقدام پر ہکا بکا رہ گیا
یہ رحم لی اور جان بخشی کا تو نہیں، طیش کا مقام تھا
اس نے کہا، ''آپ نے اپنی ذوالفقار سینت تو لی تھی لیکن پھر پھینک دی؟
آخر آپ نے کیا سوچ کر مجھے چھوڑ دیا؟
وہ کونسی بات تھی جو آپ کو میرے قتل سے بہتر نظر آئی اور اب آپ مجھ سے بے نیاز کھڑے ہیں
وہ کیا تھا جس نے آپ کے طیش کو بجلی کے ایک کوندے کی طرح ٹھنڈا کر دیا
بہادری میں آپ اَسدُ اللہ کہلاتے ہیں
سخاوت میں آپ قومِ موسیٰ کے سر پر تنا ہُوا وہ بادل ہیں
جس سے بے مثال من و سلویٰ نازل ہوتا تھا''۔
علیؓ نے کہا، ''میں صرف خدا کی خاطر تلوار اٹھاتا ہوں
میں خدا کا خادم ہوں
میں جسم کی مٹی کے تابع نہیں
(بلکہ جسم کی مٹی۔ تراب۔ میرے تابع ہے اسی لیے تو میں بوتراب کہلاتا ہوں)
میں جذبات کا نہیں، خدا کا شیر ہوں
میرا عمل میرے دین پر گواہ ہے
میں جنگ میں خدا کے اس فرمان کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے حصہ لیتا ہوں:
''جب تم نے کنکریاں پھینکیں تو وہ تم نے نہیں، ہم نے پھینکی تھیں''
میں تو محض تلوار ہوں، اس تلوار کو چلاتا خدا کا ہاتھ ہے
میں نے خدا کی راہ میں اپنے نفس کا بوجھ اتار پھینکا ہے

Marfat.com

میرے نزدیک خدا ہی خدا ہے اور کچھ بھی نہیں
میں محض سایہ ہوں، سورج تو میرا رب ہے
میں محض کاردار ہوں، میں تو وہ حجاب بھی نہیں جو میرے رب کی راہ میں حائل ہے
کسی جواہردار تلوار کی طرح میں وصل کے موتیوں سے لدا ہوں
میں جنگ میں لوگوں کو قتل نہیں کرتا، انھیں نئی زندگی دیتا ہوں
لہو میری تلوار کی آب و تاب کو دھندلا نہیں سکتا
پھر ہوا میرے بادلوں کو کیونکر اڑا لے جا سکتی ہے
میں گھاس پھوس کا تنکا نہیں، برداشت، صبر اور انصاف کا پہاڑ ہوں
کوئی تیز و تند آندھی بھی اس پہاڑ کو سرکا نہیں سکتی''۔

ابنِ عربیؒ اور روحانی جواں مردی

روحانی جواں مردی کی اعلیٰ ترین تشریح ہمیں ابن عربیؒ کے افکار میں بھی ملتی ہے۔ اس نے اپنی مشہور کتاب ''فتوحات المکیہ'' میں پورے تین باب اس موضوع کے لیے مخصوص کیے ہیں۔ ان ابواب میں ابن عربیؒ روحانی جواں مردی کے اسرار و رموز بیان کرتا ہے۔ پہلے ہی باب میں وہ ایک پراسرار جواں سال جواں مرد سے ملاقات کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے، ''یہ ساری ضخیم کتاب اس ملاقات ہی کا شاخسانہ ہے''۔ یہی وہ ہستی ہے جو ابن عربی کو ربّ العزت کے کعبہ کی روحانی معنویت سے آگاہ کرتی ہے۔

یاد رہے کہ رومیؒ جس قدر فصیح و بلیغ ہے، ابن عربیؒ اتنا ہی پیچیدہ اور مبہم ہے۔ لیکن اسلامی روحانیت اور تصوف کے اس عظیم استاد کے طرزِ فکر اور اس طرزِ فکر کی گہرائی کی ایک جھلک دیکھ لی جائے تو امید ہے کہ ہماری اس کتاب کے مقصد کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔ رہا ترجمہ تو یہی کہا جا سکتا ہے، اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے، شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات۔ ابن عربی کہتا ہے:

> ''جواں سال جواں مرد سے ابتدائی تعارف کو ہم کئی مرحلوں میں بیان کر سکتے ہیں۔ پہلا مرحلہ طوافِ کعبہ کے دوران حجرِ اسود کے نزدیک اس سے ملاقات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مرحلے پر جواں سال جواں مرد یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے۔ کعبے کے روحانی معنی اس کی سنگین دیواروں سے پھوٹتے ہیں۔ ان معنی کی پہچان کا اس پراسرار ملاقات سے چولی دامن کا ساتھ ہے جو ہر صوفی، اس جواں سال جواں مرد کی صورت میں، اپنی روحانی اصلیت سے کرتا ہے۔ وہ جواں سال جواں مرد، صوفی کو حکم دیتا ہے: ''پیشتر اس کے کہ تم کعبے کا راز کھو بیٹھو اسے توجہ سے ذہن نشین کر لو۔ تم دیکھو

Marfat.com

گے کہ ان لوگوں سے جو کعبے کے غلاف کے پیچھے چھپے پتھروں کو تصور میں لاکر اس کے گرد ایک جلوس کی شکل میں طواف کر رہے ہیں کعبے کی شان کیسے دوبالا ہو رہی ہے''۔ صوفی واقعی محسوس کرتا ہے کہ کعبہ جیسے زندہ ہو گیا ہے۔ جیسے جیسے جواں سال جواں مرد کا رُتبہء عالی، زمان و مکاں پر چھائے ہوئے اس کے وجود کی اہمیت اور زمین پر اس کے نزول کا مطلب اس پر عیاں ہوتا جاتا ہے، صوفی اس سے علامتی، مثالی اور تصوراتی دنیا کے حساب سے مخاطب ہونے لگتا ہے۔ وہ اس کا دایاں ہاتھ چومتا ہے، اس کے ماتھے سے وحی کا پسینہ پونچھتا ہے اور عرض کرتا ہے، ''ذرا اس نیاز مند پر نگاہ ڈالیے جو آپ کی رفاقت میں جینا چاہتا ہے اور دل و جان سے آپ کی دوستی کا طلبگار ہے''۔ صوفی کی گزارشات کے جواب میں جواں سال جواں مرد بس اشارے کنائے سے اُسے سمجھاتا ہے کہ اپنی ازلی و ابدی فطرت کے مطابق وہ تمثیلی (Symbolic) گفتگو ہی کرنا بہتر سمجھتا ہے۔

بالآخر جواں سال جواں مرد کہتا ہے، ''جب تم میری تمثیلی گفتگو سیکھ لو گے، اسے اپنی واردات کا حصہ بنالو گے اور اس کی تہہ تک پہنچ جاؤ گے تو تمھیں پتا چلے گا کہ خطیبوں کی فصاحت و بلاغت (Eloquence) اور میری گفتگو میں بہت فرق ہے''۔ اب صوفی عرض کرتا ہے، ''اے خوش بختی کی بشارت دینے والے، میرے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ازراہِ کرم مجھے اپنی زبان سکھا دیں، اور اپنے اسرار و رموز کا تالا کھولنے کا گر بتا دیں تاکہ میں جاگتی راتوں میں آپ سے ہم کلام ہو سکوں۔ میں تو آپ سے وفاداری کا عہد کرنا چاہتا ہوں''۔

(اس موقع پر ابن عربیؒ صوفی کی جگہ خود بولنے لگ جاتا ہے) وہ جسے ازلی و ابدی رفیق یا روحانی پیشوا کہتے ہیں، اس نے پھر ایک اشارہ سا کیا لیکن میں اس اشارے کی تہ کو پا گیا۔ اس کے حسن و جمال کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی اور میرا وجود محبت سے سرشار ہو گیا میں غش کھا کر گر گیا مگر اس نے مجھے تھام لیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو ابھی تک اس کے حُسن کی دہشت سے تھر تھرا رہا تھا۔ اسے بخوبی معلوم تھا کہ میں اس کی حقیقت جان چکا ہوں۔ اس نے اپنا عصائے سفر پھینک دیا اور کھل کر میرے سامنے آ گیا۔

میں نے گزارش کی، ''مہربانی فرمایئے اور اپنے کچھ راز مجھ پر منکشف کر دیجیے تاکہ میرا شمار آپ کے واقفانِ حال میں ہو سکے''۔ اس نے مجھ سے کہا، ''میری فطرت کے واضح پہلوؤں اور میرے وجود کی ترتیب کو پوری طرح ذہن نشین کر لو۔ جو کچھ تم مجھ سے چاہو گے وہ میرے وجود میں یوں محفوظ ہو جائے گا جیسے پتھر پر لکیر۔ یاد رکھو میں وہ ہوں جو نہ تو لفظوں میں بات کرتا ہے اور نہ ہی وہ ہوں جس سے لفظوں میں بات کی جاتی ہے۔ میرے علم کی انتہا، میں خود ہوں اور میرے

Marfat.com

صفاتی نام ہی میری ذات ہیں۔ میں ہی علم ہوں، میں ہی معلوم ہوں، میں ہی علیم ہوں۔ میں ہی تمام تر دانش ہوں، میں ہی تمام دانشمندانہ اعمال ہوں، میں ہی دانشمند ہوں۔ میں نہ زندہ ہوں، نہ مردہ۔ میں ہر شے میں ہوں اور ہر شے مجھ میں ہے''۔

یہ کونسی ہستی ہے جو بیک وقت علم بھی ہے، علیم بھی ہے اور معلوم بھی اور جسے ابن عربیؒ اس نوعیت کی بظاہر متضاد خصوصیات کا حامل سمجھتا ہے کہ وہ زندہ بھی نہیں، مردہ بھی نہیں اور وہ ہر شے میں ہے اور ہر شے اس میں ہے؟ یہ وہی تو ہے جس کی فطرت کے سرچشمے سے تمام کی تمام ''فتوحات المکیہ'' سیراب ہوئی ہے۔ یہ جواں سال فرد جو روحانی جواں مردی کی روح ہے، ابن عربیؒ کی اپنی ازلی ابدی حقیقت کے سوا کچھ اور نہیں۔ یوں کہیے کہ عالمِ ارواح میں یہ اس کا اپنا روحانی وجود ہے۔

کیا اس جواں سال جواں مرد کی اتنی ہی حقیقت ہے؟ شاید نہیں۔ رسُولِ خدا کے کئی ارشادات میں جنت کے ایسے جواں سال باسیوں کا ذکر آیا ہے جن کے چہرے ڈاڑھی مونچھوں کے بغیر ہیں یعنی ابھی ان کی مسیں بھی نہیں بھیگی ہوں گی۔ ابن عربیؒ خود ایک حدیث کا حوالہ دیتا ہے جس میں رسُولِ خدا نے فرمایا تھا، ''میں نے اپنے رب کو ایک بے ریش نوجوان کی شکل میں دیکھا''۔ جس جواں سال جواں مرد سے خانہء کعبہ کے پاس ابن عربیؒ کی ملاقات ہوئی، وہ دراصل رب العزت ہی کی ذات ہے۔ جن خوش نصیبوں کو حضرت ابراہیمؑ اور رسُولِ خدا کی طرح یہ شرف عطا ہو جائے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کے بت کو پاش پاش کر دیں انھیں اس جواں سال جواں مرد سے ملاقات کا موقع بھی مل جاتا ہے جو تمام تر روحانی عظمت کا سرچشمہ ہے۔ اپنی روحانی حقیقت سے ملاقات کے ذریعے انسان، روح خداوندی کے اس ازلی وابدی سرچشمے سے فیضیاب ہونے لگتا ہے جو ہمیشہ جوانی اور جولانی کی حالت میں رہتا ہے۔

اس جواں سال جواں مرد نے، جو روح کے ازلی وابدی سرچشمہء حیات کی علامت ہے، ان گنت صوفیوں، عاشقوں، فنکاروں اور کاریگروں کی زندگی میں جواں مردی کا رنگ بھرا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے دنیا میں بسنے والے انسانوں کو علم کی اس معراج سے آشنا کرایا ہے جہاں ان پر واشگاف ہو جاتا ہے کہ ان کے وجود کی حقیقت خدا کے وجود سے جدا نہیں۔ جواں مردی کی انتہا یہی ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کا طوق اپنی گردن سے اتار کر اس جواں سال جواں مرد سے ملاقات کر سکے جو ہماری اصل حقیقت ہے اور جو ذات خداوندی کی قربت میں خود بھی لازوال ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

آٹھواں باب

جوانی، جواں مردی اور ہم

سوچنے والی بات ہے کہ روحانی جواں مردی کے تصور میں جوانی، جواں سالی اور جواں سال جواں مرد کا حوالہ اتنا اہم کیوں ہے؟ سب سے پہلے تو اس کتاب کی خواتین قارئین سے معافی کی درخواست ہے کہ وہ جواں مردی اور جواں مرد جیسے لفظوں میں صرف مردوں کا ذکر دیکھ کر یہ سمجھ سکتی ہیں کہ شاید ان روحانی صفات پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ نہ صرف اردو بلکہ انگریزی زبان کی بھی قباحت ہے کہ جب انسان کا ذکر آتا ہے تو اسے مذکر قرار دے کر اس کے لیے ضمیریں بھی مذکر استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً: ''انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑا عقلمند ہے''۔ انگریزی میں تو اب لوگ یہ فقرہ اس طرح بھی لکھ رہے ہیں کہ ''انسان یہ سمجھتی ہے کہ وہ بڑی عقلمند ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تصور میں مردانگی اور نسائیت دونوں شامل ہیں۔ لیکن صدیوں سے چلے آتے مردانہ غلبے کے تحت بننے والے معاشروں کو بدلتے ہوئے کچھ وقت لگے گا۔ بہتر تو یہی ہوتا کہ ہم ''جواں مردی'' کی جگہ ''جواں فردی'' اور ''جواں مرد'' کی جگہ ''جواں فرد'' لکھ سکتے۔ لیکن پھر صدیوں سے چلی آتی یہ اصطلاحیں خلط ملط ہو جاتیں۔

بہرحال، جوانی انسان کی عمر کا وہ حصہ ہے جب وہ صحت، خوبصورتی اور طاقت کے اعتبار سے اپنی معراج پر ہوتا ہے۔ افراد کے علاوہ معاشروں بلکہ تہذیبوں اور مذہبوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں ہر وہ چیز جو خدا نے پیدا کی ہے اسے ایک نہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہی پڑتا ہے۔ ایک بس خدا ہے جسے زوال ہے نہ موت یا پھر وہ روح ہے جو انسان کی تخلیق کے وقت خدا نے اپنی روح میں سے انسان کے اندر پھونکی تھی۔ اگرچہ مادی چیزوں اور جسموں کی موت کے بارے میں بھی آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے بعد یہ کہنا غلط ہو گیا ہے کہ وہ مر جاتے ہیں، مر کر وہ کہاں جاتے ہیں؟ بس جن ایٹموں سے وہ بنے ہوتے ہیں وہ بکھر جاتے ہیں اور پھر نئی چیزوں اور نئے جسموں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے خدا نے انسان کی ہمیشہ کے لیے موت کا ذکر کرنے کے بجائے موت کا ذائقہ چکھنے کی بات کی ہے۔ گویا اس کی موت بظاہر تو موت ہی ہے لیکن حقیقت میں ایک نئی زندگی کی ابتدا ہے عجیب بات تو یہ ہے کہ شاعروں نے خدا کی یہ بات صوفیوں کی طرح سائنس دانوں سے بہت پہلے جان لی تھی۔ چنانچہ جہاں بلھے شاہؒ یہ کہتا ہے، ''بلھیا! اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور'' (اے ابوعلی، ہم نے تو مرنا ہی نہیں، وہ جو قبر میں پڑا ہے وہ کوئی اور ہے) وہاں غالب یہ کہتا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اگر کسی پر بات پھر بھی واضح نہ ہوئی ہو تو اُس کے لیے چکبستؔ موت کی تفسیر یوں کرتا ہے:

Marfat.com

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھی اجزا کا پریشاں ہونا

جوانی کسی فرد، معاشرے، تہذیب یا مذہب کی عمر یا تاریخ کا وہ حصہ ہے جب اس کی مثبت صلاحیتیں عروج پر اور اس کی منفی صلاحیتیں پوری طرح دبی ہوئی ہوں۔ جوانی کی یہی وہ خاصیت ہے جس کی خاطر خالقِ کائنات نے دوسری تمام مخلوقات کی طرح انسان کو جوانی عطا کی تھی۔ آپ نے یہ عوامی جملہ سنا ہی ہوگا کہ ''جوانی تو گدھی پر بھی آتی ہے''۔ دوسرے لفظوں میں معمولی سے معمولی، بلکہ بدصورت سے بدصورت مخلوق بھی جوانی میں خوبصورت نظر آتی ہے۔ چلیے کسی خوبصورت چیز کی مثال لے لیتے ہیں۔ گلاب کا پھول غنچے کی حالت میں بھی خوبصورت ہوتا ہے لیکن اسے جو خوبصورتی پوری طرح کھِل اُٹھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ لاجواب ہے۔ غنچے کی حالت میں وہ مسکرا رہا ہوتا ہے، کھِل جانے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔ گلاب کے پھول کی زندگی کا یہ لمحہ اس کی معراج ہے، اس کے عروج کی انتہا ہے۔ اس لمحے کی ایک تصویر اقبال نے یوں کھینچی ہے:

میں صورتِ گل، دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

کاش یہ مہکتا ہُوا، ہنستا ہُوا، دغدغاتا ہُوا، اپنے آپ میں مکمل، اپنی شانِ بے نیازی میں سرشار و سرمست گلاب کچھ دن تو اس حالت پر قائم رہ سکتا مگر وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے آپے سے باہر ہو جاتا ہے، اس کی پنکھڑیاں گر کر بکھر جاتی ہیں اور ساری آب و تاب جاتی رہتی ہے۔ ''ہر کمال کو زوال'' کا اصولِ فطرت ہر شے، ہر انسان، ہر قوم اور ہر تہذیب پر لاگو چلا آتا ہے۔ بیچارے گلاب کے پھول کی کیا اوقات ہے، بڑے بڑے مذاہب بھی اس اصول سے بچ نہیں پائے۔ جب ہم کسی خاندان، قوم، ملک، سلطنت، مذہب یا تہذیب کا ''سنہری زمانہ'' یاد کرتے ہیں تو ایک طرح سے اس حقیقتِ حال کا ماتم کر رہے ہوتے ہیں کہ اب اس کی جوانی ڈھل چکی ہے۔

اگر قانونِ فطرت یہی ہے کہ ہر شے اور ہر مخلوق کو عروج کے بعد زوال ہی آتا ہے تو پھر اس بات کا کیا شکوہ کہ آج اسلام اور مسلمانوں پر زوال آ گیا ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ہم پر بھی کبھی جوانی آئی تھی اور ہم نے بھی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے کہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے؟ بدلتے وقت کے ساتھ قوموں پر عروج و زوال آتا ہی رہتا ہے۔ کبھی ہم دنیا کے حکمران تھے، آج کوئی اور ہے۔ ہمارا عروج شروع ہُوا تو ایرانی اور رومن تہذیبوں اور سلطنتوں پر زوال آنے لگا اور ہمارے مدمقابل وہ ریت کی دیواروں کی طرح ڈھے گئیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) نے اپنی مایہء ناز تصنیف: ''زوال و سقوطِ سلطنتِ روم'' (The Decline and Fall of the Roman Empire) میں بتایا تھا کہ اس عظیم سلطنت کے تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھونکا گیا جب سلطان محمد فاتح نے 1453ء میں قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) فتح کر لیا۔ اور یہ کل کے مقابلے

Marfat.com

میں آج کی بات ہے کہ دنیا کی دوسری سب سے طاقت ور سلطنت، سوویت یونین، پارہ پارہ ہوگئی ہے اور امریکہ دنیا کی واحد بڑی طاقت (Supreme Power) بن گیا ہے۔ آنے والے کل کو امریکہ کی جگہ چین دنیا کا حاکم بن کر ابھر سکتا ہے۔ تو پھر رونا کس بات کا؟

رونا اس بات کا کہ انسان اور اُس کے بنائے ہوئے سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی اداروں کے لیے زوال اور انحطاط سے بچنے کا راستہ موجود ہے۔ کیا کوئی ایسی ہستی موجود ہے جسے نہ زوال آئے اور نہ موت اور جو ایک سے ایک نئی دنیا پیدا اور آباد کرسکتی ہو؟ ہم میں سے ہر کوئی مُنہ پھاڑ کر کہہ دے گا کہ ہاں، یہ ہستی موجود ہے اور اس کا نام خدا ہے اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ہمارا ایمان کس کام کا جس کی صداقت پر ہمارا عمل گواہی نہ دے۔ کہنے کو تو ہر مسلمان خدا ہی کا اطاعت گزار اور پیروکار ہے۔ مگر جنھیں یہ حقیقت یاد نہ رہی ہو، انھیں قرآنِ حکیم یاد دلا رہا ہے کہ ''تمھاری منزل، تمھارا منتہیٰ و مقصود تمھارے رب کے سوا کوئی نہیں'' (53:42)۔ اگر ہم خدا کو منزل مان کر، خدا کے رستے پر استقامت کے ساتھ چلتے رہیں تو دنیا بلکہ کائنات کی کونسی طاقت ہے جو ہمیں زوال پذیر کرسکتی ہے؟ خدا کسی ایک جگہ بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے سو تو نہیں رہا کہ ہم بھاگ کر اسے جا لیں گے اور یوں ہماری منزل آ جانے سے ہمارا ارتقائی سفر انجام کو پہنچ جائے گا۔ خدا تو ہر لحہ نئی سے نئی تخلیق میں مصروف ہے۔

ایسے خدا کے مستقیم رستے (مستقیم کے اندر استقامت کا رنگ نظر انداز نہ کیجئے) پر چلنے والی قوم یا ملت کو صرف اس صورت میں زوال آ سکتا ہے کہ وہ بدلتے ہوئے وقت و مقام (زمان و مکاں Time and Space) کے پیشِ نظر خدا کے دائمی پیغام کی نئی تفسیر اور تشریح کرنے کے بجائے گذشتہ اوقات و مقامات میں کی گئی تشریح کو سینوں سے لگائے رہے اور ندرتِ فکر و عمل سے محروم ہو جائے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جوانی میں انسان نئی بات سوچتا بھی ہے اور پھر جوانی کی بخشی ہوئی جرأتِ رندانہ سے اس نئی بات پر عمل کے لیے بھی میدان میں بے خطر کود پڑتا ہے۔ اس ندرتِ فکر و عمل کو روحانی جواں مردی کا زادِ راہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ روحانی جواں مردی یہی ہے کہ انسان لحظہ بہ لحظہ پھولتی پھلتی، نئے سے نیا قالب اختیار کرتی اور انسان کی اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیتوں کو للکارتی ہوئی زندگی کے اندر خدا کو زندہ و متحرک محسوس کرے، اور روایات اور تقلید کے سانچوں کو توڑ کر اس زندہ خدا کے پیچھے چل نکلے۔

ہمارے عہد میں مسلمانوں کے اندر روحانی جواں مردی کے زوال پر جس شدتِ احساس کے ساتھ اقبال نے نوحہ گری کی ہے اور ساتھ ہی اس نے جس شد و مد اور جوش و خروش سے اس جواں مردی کی حیاتِ تازہ کا سامان کیا ہے وہ قابلِ قدر اور لائقِ توجہ ہے۔ رسُولِ خدا کے بعد روحانی جواں مردی کا جو جھنڈا علی حیدر کرارؓ نے تھاما تھا اور جسے خاندانِ رسولؐ نے رسمِ شبیریؓ ادا کر کے اپنی رگوں کے خون سے نئی آب و تاب بخشی تھی وہ دست بدستہ اس حالت میں سرسید احمد خانؒ سے اقبال تک پہنچا تھا کہ مسلمان ایک لٹا ہُوا کارواں بن کر رہ گئے تھے۔ یہی نہیں، صورتِ حال اس سے بھی زیادہ گمبھیر تھی:

Marfat.com

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے
نصیب خطہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

اقبالؔ نے اسلام کی روحانی جواں مردی کے زندہ و متحرک تصور کو زندہ و متحرک لیکن نئے الفاظ اور نیا آہنگ دیا اور ان الفاظ و آہنگ میں اپنے دل کا سارا زور اور اپنی روح کا سارا نور بھر دیا۔ اسے علم تھا کہ جو کچھ وہ اپنے وقت کے مسلمانوں سے چاہ رہا ہے اس کے لیے میدانِ عمل مہیا کرنے کی صلاحیت جس جواں مرد میں ہے اس کا نام محمد علی جناحؒ ہے چنانچہ اس نے مرنے سے پہلے نہایت محبت، عقیدت اور یقین کی پوری قوت سے روحانی جواں مردی کا جھنڈا جناحؒ کے سپرد کر دیا۔

پھر کیا ہُوا؟

سنا ہے عمر رسیدہ جواں مرد، جناحؒ کی قیادت اور سرسیدؒ اور اقبالؒ کے تربیت یافتہ جواں سال جواں مردوں کی سپہ سالاری میں برصغیر کے غریب و سادہ مسلمانوں نے پاکستان حاصل کر لیا تھا جو دنیا کی پانچویں سب سے بڑی ریاست اور دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک تھا اور جسے اسلام کی روحانی جواں مردی کے اصولوں کے لیے میدانِ عمل کا کام دینا تھا۔

پھر؟ پھر وہ سب کچھ ہُوا جو نہ ہوتا تو بہتر تھا بلکہ نہ ہوتا تو یہ کتاب لکھنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ چھوڑیے اس بات کو کہ آج یہ جھنڈا کس کے ہاتھ میں ہے اور یہ باقی بھی بچا ہے یا پاکستان کے نااہل اور نالائق سیاستدانوں، آدھا پاکستان گنوا دینے والے وردی پوشوں، منافع خور سیٹھوں، بدقماش جاگیرداروں، فتویٰ فروش عالموں، کھال مست پیروں، عیاش پیرزادوں، تنخواہ دار دانشوروں اور لفافہ خور اخبار نویسوں نے وہ بھی بیچ کھایا ہے؟

نہیں ایسا نہیں۔ یہ صورتِ حال خدا کے ازلی و ابدی قانون کے خلاف ہے۔ خدا نے نیکی کو بدی سے دس گنا زیادہ طاقت بخش رکھی ہے (8:65)۔ جہاں دس خود غرض ہوں وہاں ایک بھی جواں مرد ہو تو روحانی جواں مردی کا جھنڈا سربلند ہو جاتا ہے اور اگر سربلند نہ بھی ہو تو کم از کم گرتا نہیں۔ آج بھی ہماری راکھ میں جواں مردی کی چنگاریاں موجود ہیں۔ دیکھیے، اقبالؔ کی بانگِ درا کو زیادہ وقت نہیں گزرا، اگر اہلِ پاکستان نے اسے تھوڑا بھلا بھی دیا ہے تو اہلِ ایران نے اسے ابھی تک سینے سے لگا رکھا ہے۔ خود پاکستان میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبالؔ کو پیر و مرشد کا مقام دیتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اقبالؔ کی رہنمائی میں پورے اخلاص کے ساتھ چند قدم روحانی جواں مردی کے صراطِ مستقیم پر چل کر دیکھ لیں؟ شاید ہماری راکھ میں دبی چنگاریاں ہم پر چھائی ہوئی نحوست کو جلا ڈالیں اور ہم اس زمانے پر سوار ہو جائیں جو تقلید، انحطاط، زوال، بے بسی اور بے حسی کے کالے بادلوں کی شکل میں ہم پر سوار ہو چکا ہے۔

Marfat.com

نواں باب

اقبالؔ کی شاعری کا بنیادی پیغام

ہو سکتا ہے، کچھ قارئین کو روحانیت اور تصوف کی تاریخ کے باب میں اقبالؔ کا ذکر اَن مل بے جوڑ نظر آئے اس لیے بہتر ہوگا کہ تمہید کے طور پر چند وضاحتیں کردی جائیں۔

اقبالؒ اور قرآنِ حکیم

قرآنِ حکیم اور تاریخِ اسلام کے سنجیدہ طالب علم جانتے ہیں کہ بیسویں صدی میں جن افراد نے وقت کے اعلیٰ ترین علمی معیار اور استطاعت کے ساتھ خدا کی اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اس مطالعے کے حاصل کو انتہائی دلنشین انداز سے اہلِ فکر و نظر ہی نہیں، سیدھے سادے عوام تک بھی پہنچایا اُن میں اقبالؔ سرِ فہرست تھا۔ اقبالؔ وہ فلسفی اور شاعر ہے جو نہ صرف اپنے زمانے کے مشرقی اور مغربی علوم سے واقف تھا بلکہ ان علوم کی پوری روایت بھی اس پر واشگاف تھی۔ لیکن روح کے بغیر نرا علم تو وہ عقل و خرد ہے جس کے دامن کی تنگی کا وہ خُود شاکی تھا۔ وہ مسلمانوں کی زبوں حالی میں علم و فضل سے دُوری پر آنسو تو بہاتا ہے لیکن یہ بھی جانتا ہے کہ مغرب نے نری عقل کے پیچھے چل کر دُنیوی لذتوں اور کامیابیوں کی خاطر، گوئٹے کے فاوسٹ کی طرح، اپنی روح شیطان کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ اس نے پوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھا کہ مغرب کی چکا چوند کردینے والی ترقی سے متاثر ہو کر پڑھے لکھے مسلمانوں میں مغرب کی اندھی تقلید کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ اس رویّے کے برعکس اس نے دماغ کی روشنی میں دِل کا لہو اور روح کا نور شامل کر کے دُنیا اور دین میں رفاقت پیدا کرنے کا سامان کیا۔ اس کا ایمان تھا کہ اس امتزاج کے بغیر گزاری ہوئی زندگی مردانِ خدا کے لائق نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

خِرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے — جہاں روشن ہے نورِ لاالٰہ سے
خِرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کیا حاصل؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "دل کی نگاہ" اور "دل و نگاہ کی مسلمانی" اقبالؔ کو صرف علم سے مل گئی تھی؟ نہیں۔ اس کے پیچھے اس کی ابتدائی زندگی کے ایک واقعے کا ہاتھ ہے جس کی تاثیر اس کے دِل پر ایک حادثے کی طرح وارد ہوئی اور پھر یہ حادثہ اسے متواتر درپیش آتا رہا۔ لڑکپن میں اقبالؔ فجر کے وقت قرآنِ حکیم کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ اس کے والدِ محترم اس وقت مسجد سے واپس آتے، اس کے قریب رُکتے اور اقبالؔ محسوس کرتا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کہتے نہیں۔ ایک روز اس نے تلاوت روک کر پوچھا، "اباجی، لگتا ہے آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں!" تب اس کے والدِ محترم نے کہا، "ہاں بیٹے، میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تم قرآن پڑھو تو یوں محسوس کیا کرو جیسے وہ تمھی پر نازل ہو رہا ہے"۔ اقبالؔ نے تو

Marfat.com

سورہ الحشر میں یہ پڑھ ہی رکھا تھا کہ "خدا اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کر دیتا تو تم دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے کیسے دبا جاتا اور پھٹا پڑتا ہے" (59:21)۔ اور اسے یہ بھی یاد تھا جب رسولِ خدا پر وحی نازل ہوتی اور اس وقت اگر آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوتے تو وحی کے بوجھ سے بیٹھے بیٹھے جھک جاتے تھے، اونٹنی بھی زمین پر گھٹنے ٹیک دیتی تھی اور صحابہ کرامؓ آپ کے اوپر چادر ڈال دیتے تھے۔ قرآن حکیم کی اس انداز سے تلاوت نے جہاں اقبالؒ کی ہڈیاں چٹخا دیں وہاں اس کے دل کو اس قدر گداز کر دیا کہ اسے اپنا آپ بھول گیا اور وہ مردہ دل مسلمانوں کے لیے وقفِ دعا ہو گیا:

یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

یہ گدازیِ دل نہ فلسفیوں کو نصیب ہوتی ہے، نہ عالموں کو۔ یہ تو صرف مردانِ خدا، اولیاء اللہ اور روحانی جواں مردوں ہی کا شرف ہے:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

اقبالؒ اور عشقِ رسولؐ

جاننے والے بتاتے ہیں کہ اقبالؔ کی محفل میں جب کبھی رسولِ خدا کا نامِ نامی آ جاتا تو اقبالؔ پر شدتِ عشقِ رسولؐ میں گریہ طاری ہو جاتا اور وہ تادیر اس کیفیت میں اسیر رہتا۔ کچھ ستم ظریفوں نے پوچھا، "حضرت، آپ نے یورپ یاترا تو کئی بار کر لی لیکن روضۂ رسولؐ پر حاضری نہیں دی؟" عاشقِ رسولؐ نے عرض کی، "آپ کا تو ذکر ہی میرے وجود کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، یہ احساس کہ آپؐ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر سو رہے ہیں، میرے وجود کو ریزہ ریزہ کر ڈالتا"۔

لوگ روزِ محشر کو خدا کے سامنے جاتے ڈرتے ہیں کہ حساب کتاب ہو گا۔ اقبالؔ اس بات سے خوفزدہ ہے کہ خدا نے رسولِ خدا کے سامنے میرا دفترِ عمل کھول دیا تو میں آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ فارسی کی ایک مطبوعہ اور ایک غیر مطبوعہ رباعی میں اس نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے:

پہلے مطبوعہ رباعی سن لیجیے

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہؐ ما را
حسابِ من زچشمِ اُو نہاں گیر

(جب یہ دُنیا ختم ہونے پر آجائے اور ہر پوشیدہ تقدیر بے پردہ ہو جائے تو اے خدا! مجھے محمد مصطفٰیؐ کے سامنے رسوا نہ کرنا اور میرا حساب آپؐ کی نظر سے بچا کر لینا)

غیر مطبوعہ رباعی یہ ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائی من پذیر
تو اگر دانی حسابم من پذیر
از نگاہ مصطفٰےؐ پنہاں بگیر

Marfat.com

(اے خدا! تو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہے اور میں محتاج ہوں۔ روزِ محشر میرے عذر قبول فرمالے لیکن تو اگر یہ سمجھے کہ میرا احساب لینا ضروری ہے تو پھر نگاہِ مصطفٰے سے چھپا کر ہی لینا)

غور فرمایئے کہ رسولِ خدا سے یہ عقیدت جو عشق سے بھی کوئی آگے کی چیز ہے، کتنے فلسفیوں یا عالموں کو نصیب ہوئی ہوگی یا نصیب ہے؟ عقیدت اور احترام کا یہ درجہ اور جذبۂ محبت کی یہ گہرائی عارفوں ہی کا حصہ ہے۔ البتہ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہم مسلمانوں نے جو یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ رسولِ خدا قیامت کے روز خدا سے ہماری شفاعت (مغفرت کی سفارش) کریں گے، کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہم آپؐ کو کیا منہ دکھائیں گے؟ یہی نہیں، کیا ہمیں کبھی یہ بھی خیال آیا ہے کہ دوسری امتوں کے پیغمبروں کے سامنے ہماری وجہ سے رسولِ خدا کی کتنی سبکی ہوگی؟ ہم نے یہ سوچا تھا، یا ہم کبھی یہ محسوس کریں گے، اسے چھوڑیے، یہ دیکھیے کہ اقبال نے احساس کے کتنے اونچے مقام پر اور جذبے کی کتنی گہرائی میں یہ بات سوچی اور محسوس کی تھی۔ وہ خدا کے مُنہ سے مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے دراصل اپنے ہی دل کا درد بیان کر رہا تھا:

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

اور پھر اپنی طرف سے کہتا ہے:

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثرب کا پاس — کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تُو مُسلم نہیں

اقبال نے خدا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو اکثر بات کی ہے اور وہ اس کا جواز بھی پیش کرتا ہے:

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا — نقش ہوں، اپنے مصور سے گِلہ رکھتا ہوں میں

وہ صاف صاف کہتا ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

اور خدا کو للکارتا ہے:

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

اور کسی اور کے مُنہ سے کہلواتا ہے:

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال — کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا مُنہ بند

پھر وہ تمام مسلمانوں کے مُنہ سے شکوے کے لہجے میں یہ بھی کہہ دیتا ہے:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گِلہ ہے کہ وفادار نہیں — ہم وفادار نہیں، تُو بھی تو دِلدار نہیں

اور جب اس کی اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی تو پہلے جبریل کے مُنہ سے ابلیس پر یہ الزام لگاتا ہے:

Marfat.com

کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو؟

اور پھر ابلیس کے مُنہ سے جبریل اور خدا، دونوں پر چوٹ کرتا ہے:

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو، اللہ ہُو، اللہ ہُو!

لیکن یہی اقبالؔ جب بھی رسُولِ خدا کا ذکر کرتا ہے تو اس کی ساری شوخی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور وہ یکسر عجز و نیاز میں ڈھل جاتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''شکوہ'' لکھنے والا اقبالؔ جب خدا کے مُنہ سے ''جوابِ شکوہ'' لکھتا ہے تو اس کی تان بھی رسُولِ خدا کے ''مقامِ محمود'' ہی پر توڑتا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

خدا کے بارے میں اور خدا کے حضور میں چرب زبان اقبالؔ جب رسُولِ خدا کا ذکر کرتا ہے یا آپؐ سے مخاطب ہوتا ہے تو اسُ کا لہجہ یہ ہوتا ہے:

فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیئنۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

یا پھر بادِ صبا سے درخواست کرتا ہے:

پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیں میں تُو
کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام

اور:

اے بادِ صبا! کملی والےؐ سے جا کہیو پیغام مرا

اور:

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

فارسی سمجھنے والے قارئین ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں اقبالؔ کی نظم ''در حضورِ رسالت مآب'' میں اُس درخواست سے تو واقف ہی ہوں گے جو سر سید احمد خاںؒ کے ''خوابی مشورے'' سے اس نے اپنی شفایابی کے لیے دعا کی خاطر پیش کی تھی اور جو یوں شروع ہوتی ہے:

ای تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں این قوم را از ترسِ مرگ

رسُولِ خدا سے ہر مسلمان محبت کرتا آیا ہے۔ آج بھی آپؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو مسلمانوں کے غیض و غضب کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جس گہرائی و گیرائی کے ساتھ اقبالؔ نے آپؐ سے عشق کیا اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے تو وہ صدقِ صدیقؓ ہی ہے:

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

اس طرح کا عشق فلسفیوں اور عالموں کا مقدر نہیں، یہ اہلِ دل اور اہلِ صدق و صفا ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

Marfat.com

اقبالؒ اور رومیؒ

آپ میں سے جس کسی نے اقبالؒ کی اسلامی فلسفے پر عالمانہ اور فاضلانہ کتاب:

The Reconstruction of Religious Thought in Islam (فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو)

کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی گواہ ہے کہ اقبالؒ نہ صرف اپنے دور بلکہ پہلے ادوار کے مشرقی اور مغربی فلسفیوں اور اہلِ علم و فضل سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا اور ان میں سے کچھ کی دانائی اور بصیرت کا قائل بھی تھا اور اُن سے متاثر بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو سے لے کر نطشے (Nietzsche) اور برگساں (Bergson) تک اور امام ابو حنیفہؒ اور ابن سینا سے لے کر ابن رشد اور ابن خلدون تک، سب کو چھوڑ کر وہ رومیؒ کو اپنا معنوی اور روحانی مرشد تسلیم کرتا ہے؟ سیدھی بات ہے، رومیؒ ہی وہ سب کچھ ہے جو اقبالؒ کی خودی اور بے خودی کے ہر امکان کے لیے سان کا کام دے سکتا تھا کیونکہ اگر وہ اقبالؒ کی طرح عالم اور شاعر تھا تو اقبال ہی کی طرح عشقِ الٰہی، عشقِ رسولؐ اور عشقِ بنی آدم میں ڈوبا ہوا صوفی بھی تھا:

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا　　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اُسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن　　　اُسی کے فیض سے میرے سبُو میں ہے جیحوں
تُو بھی ہے اُسی قافلۂ شوق میں اقبالؒ　　　جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؒ

آیئے دیکھیں کہ وہ اقبالؒ جو صوفی و مُلا، دونوں سے بیزار ہے کس قماش کا صوفی تھا؟

اقبالؒ اور تصوف

اقبالؒ عمر بھر بے روح ملائیت اور بے شعور تصوف کا شدید ناقد رہا۔ اسے روایتی تصوف کی خستہ حالی، بے حضوری، تخریب (Corruption) اور بے رخی پر گہرا رنج تھا۔ وہ خدا سے فریاد کرتا ہے:

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں　　　کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

وہ روحانیت کے اِن اجارہ داروں کے بارے میں سنی سنائی نہیں، دیکھی بھالی بات کرتا ہے:

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے　　　کردار بے سوز، گفتار واہی

دورِ حاضر کے صوفیوں نے مسلمان عوام و خواص کو وقت کی پکار اور للکار سے غافل کر کے بے حسی کی جس راہ پر ڈال دیا ہے، اقبالؒ کا ابلیس اسے اپنے مقاصد کے لیے بے حد مفید پاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے چیلے چانٹوں سے کہتا ہے:

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خُوب تر　　　جو چھپا دے اس کی نظروں سے تماشائے حیات
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے　　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اقبالؒ کو مُلا کے مدرسے اور صوفی کی خانقاہ پر کیا اعتراض ہے۔ سنیے:

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک　　　نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

Marfat.com

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی　　اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

اقبال کو مدرسے پر یہ اعتراض ہے کہ اسے نہ زندگی سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی وہاں انسانیت سے محبت ہی سکھائی جاتی ہے۔ رہی خانقاہ تو وہاں نہ خداشناسی ہے، نہ نگاہ کی وہ پاکیزگی جو گناہ گاروں کے دل کا میل دھوڈالے۔ اقبال دیکھتا ہے کہ مسلمان معاشروں اور ریاستوں میں بادشاہت یا ملوکیت نے جو خرابیاں پیدا کی تھیں، ملا اور پیر، جابر سلطانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے بجائے ان بدقماش اور بے لگام حاکموں کے آلۂ کار بن گئے ہیں اور یوں مسلمان محض نام کا مسلمان رہ گیا ہے اور اپنا اصل کردار کھو بیٹھا ہے۔ وہ دُکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے:

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے　　گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی　　یہ کس کافر کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

باقی نہ رہی تیری، آئینہ ضمیری　　اے کُشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟　　خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟

نہ مومن ہے، نہ مومن کی امیری　　رہا صوفی، گئی روشن ضمیری

تمام عارف و عامی خودی سے بیگانہ　　کوئی بتائے کہ یہ مسجد ہے یا کہ میخانہ

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب　　نہ مدرسے میں ہے باقی، نہ خانقاہ میں ہے

جانتا ہوں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی　　اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟　　اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اقبال صوفی میں جس خودداری، جرأتِ کردار اور بے غرضی کا متلاشی ہے وہ اسے مسلمانوں میں کہیں نہیں ملتی:

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال　　مُلّا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار

شاعر کی نوا، مردہ و افسردہ و بے ذوق　　افکار میں بدمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

اب حُجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی　　خونِ دلِ شیراں ہو، جس فقر کی دستاویز

اقبال اس صورت حال کی وجہ بھی ڈھونڈتا ہے:

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خِرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ ''الست''

گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی　　اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

Marfat.com

"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے   خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اقبالؔ نے دیکھا کہ جس طرح اسلام کے علمائے کرام نے، "والعصر" کہہ کر زمانے کی صداقت کی قسم کھانے والے خدا کے برخلاف، زمانے کو بُرا قرار دے دیا ہے اسی طرح صوفیائے کرام بھی رسُولِ خدا کی یہ حدیثِ قدسی بھول گئے جس کے مطابق زمانے کو بُرا نہیں کہنا چاہیے کیونکہ خدا ہی زمانہ ہے (لا تسبُّوا الدھر فان اللہ ھو الدھر) مسند' امام احمد حنبلؒ (299/311)۔ اور تو اور انھیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ صوفیوں کے امامِ اعظم ابنِ عربیؒ نے تو "الدھر" کو خدا کے اسمائے حسنٰی میں شمار کیا ہے۔ دہر کے، زمانے کے علاوہ، ایک معنی دنیا کے بھی ہیں۔ زمانے اور دنیا کی بدخوئی سے مسلمانوں میں عصری تقاضوں اور دُنیوی ذمہ داریوں سے غفلت کا رُجحان پیدا ہُوا اور ہوتا چلا جا رہا ہے:

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم   جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز   تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

اقبالؔ کو صوفی کی خانقاہ سے رہبانیت کی بو آ رہی ہے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ   کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی   یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ اسلام کی روح تو غائب ہوتی جا رہی ہے اور صرف اس کا قالب یا ظاہری ڈھانچا باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ کبھی براہِ راست اور کبھی اپنے اوپر طنز اور تنقید کر کے وہ اس صورتِ حال کی یوں عکاسی کرتا ہے:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے   وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج   یہ سب باقی ہیں، تُو باقی نہیں ہے
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال   تری اذاں میں نہیں مری سحر کا پیام
دل ہے مسلماں، میرا نہ تیرا   تو بھی نمازی، میں بھی نمازی
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور   ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر
شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام   میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب
سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے   اے بے خبر، جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
ترا تن روح سے نا آشنا ہے   عجب کیا، آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق   خدائے زندہ، زندوں کا خدا ہے
حلقۂ صوفی میں ذکر، بے نم و بے سوز و ساز   میں بھی رہا تشنہ کام، تو بھی رہا تشنہ کام
محبت کا جنوں باقی نہیں ہے   مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق   کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

یہ پیرانِ کلیسا و حرم، اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کدوکاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

میں سربسجدہ ہُوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالؓ نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالیؒ نہ رہی

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اقبال کو علمائے اسلام سے، جنھیں وہ مُلّا کا کچھ کچھ تحقیر آمیز نام دیتا ہے، بہت شکایتیں تھیں۔ وہ تو خدا کو مشورہ دیتا ہے کہ انھیں جنت میں بھی جگہ نہ دے:

میں بھی حاضر تھا وہاں، ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلّا کو مِلا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی! میری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حُور و شراب ولبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بدآموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کُنشت

وہ مسلمانوں کے مدرسوں میں مُلّا کی تعلیم کا حاصل یہ دیکھتا ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الٰہ الا اللہ

اور مُلّا کے دین کا خلاصہ یوں کرتا ہے:

دینِ مُلّا فی سبیلِ اللہ فساد

اب رہ گیا ''زاہد'' تو اس کی بابت بھی اس کی رائے سن لیجیے:

غرورِ زُہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

اقبال تو دینیات اور الٰہیات کی تاویلوں میں الجھے ہوئے مسلمان مفسروں کو بھی ابلیس کے لائحۂ عمل کے عین مطابق قرار دیتا ہے۔ اس کی مشہور نظم، ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں مسلمان کو اسلام کی دُنیوی اور روحانی انقلابیت سے یکسر غافل رکھنے کے لیے ابلیس یہ تجویز کرتا ہے کہ:

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

ابلیس کے مُنہ سے اقبال ان چند مسائل کا حوالہ بھی دیتا ہے جو دینیات اور الٰہیات کے ماہروں کو درپیش ہیں۔ ہوسکتا ہے اس تفصیل سے آپ کو امریکیوں سے پہلے تاتاریوں کے ہاتھوں برباد ہونے والے بغداد کی یاد آ جائے کہ جب ہلاکو خاں کے خُونخوار لشکر اس کے سر پر منڈلا رہے تھے تو اس کے ماہرینِ دینیات والٰہیات اس بحث میں ایک دوسرے کا سر کھا رہے تھے کہ سُوئی کی نوک پر ایک وقت میں کتنے فرشتے نازل ہوسکتے ہیں:

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟

ہیں کلامُ اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم؟
اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

تو یہ ہے اقبالؒ کے زوردار الفاظ میں وہ صورتِ احوال جس میں مسلمان گزشتہ کئی صدیوں سے جینے کے نام پر رہتا چلا جارہا ہے۔ بے شک بیچ بیچ میں مجدد بھی پیدا ہوئے، مصلح بھی، انقلابی سوچ کے حامل مفکر بھی اور اہلِ دل صوفی بھی انھی کی بدولت آج بھی اسلام کی اصل روح کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی عالمِ اسلام پر چھائے ہوئے بے بسی اور بے حسی کے تاریک بادلوں میں بجلی کی طرح چمک جاتی ہے۔ لیکن مجموعی طور پر مسلمان سیاسی، اقتصادی، معاشی اور عسکری لحاظ سے بے حد کمزور ہو چکا ہے اور اس سے زیادہ دردناک حقیقت یہ ہے کہ وہ علمی، تعلیمی، ثقافتی، اخلاقی، تمدنی، تہذیبی اور سب سے بڑھ کر روحانی اعتبار سے اپنا راستہ کھو بیٹھا ہے۔ نوجوان اور جواں سال مسلمانوں میں اسلام کی عزت و حرمت کے لیے جان تک نچھاور کرنے کی بے قراری کی جھلک ہر روز اُن کے خودکش حملوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس ضرورت پر نہ تو مسلمان قیادتیں توجہ دے رہی ہیں اور نہ مسلمان حکومتیں کہ:

ہو صداقت کے لیے جس دِل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

مسلمان معاشروں اور ریاستوں میں قائدین اور حکومتوں کی پوری پوری کوشش یہی چلی آرہی ہے کہ عوام سے طاقت حاصل تو کی جائے اور انھیں سیاسی طاقت کا سرچشمہ تو سمجھا جائے لیکن طاقت اور وسائل کو ان تک ہرگز ہرگز نہ پہنچنے دیا جائے۔ وہ عناصر جو نہ تو اسلام کی انقلابی روح سے واقف ہیں اور نہ روحِ عصر کے تقاضوں سے، انھوں نے مسلمان معاشروں کو ذلت اور پستی کی بے پیندہ کھائیوں میں دھکیل دیا ہے۔ ان عناصر میں نہ صرف عیاش بادشاہ، خودغرض اور بے بصیرت ڈکٹیٹر اور ایسی نام نہاد جمہوری جماعتیں شامل ہیں جن کے اپنے اندر نہ جمہوریت ہے نہ باصلاحیت کارکنوں کی حوصلہ افزائی اور نہ اختلاف کی جرأت رکھنے والوں کے لیے قبولیت بلکہ اِن کا ایک بہت بڑا حصہ فتویٰ فروش عالموں اور مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ سیاست کرنے والے مُلّاؤں، بزرگوں کے نام پر سماجی، اقتصادی اور سیاسی قدر و منزلت پانے والے گدی نشینوں اور پیرزادوں، اور ''ضمیر فروش'' دانشوروں اور استادوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک رکھی ہے، اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے۔ پسے ہوئے مسلمان عوام میں غم و غصے کا ایک زبردست ریلا (Under Current) ہے جو ظلمت، یبوست، نحوست، جہالت اور غلاظت کے پانیوں میں، اندر ہی اندر، نیچے ہی نیچے، کسی گم کردہ منزل کے لیے سرگرداں ہے۔ وہ چند دیدہ ور جنھیں خدا ہر دور میں بیج کی طرح پالتا رہتا ہے تاکہ جب بھی فضا سازگار ہو اسلام کے زندگی افروز دین کی ایک تازہ فصل تیار ہو جائے، وہ اس ریلے کو پانیوں کے اندرون سے باہر لا کر لباسِ حقیقت

Marfat.com

پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ان کی کیفیت کو اقبال ہی کے الفاظ میں پہچانیے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

مسلمان کے پیکر خاکی، اس کی مادی، سیاسی، عسکری، اقتصادی، سماجی، علمی، ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی حیاتِ نو کے لیے اقبال جو لائحہ عمل تجویز کرتا ہے اسے کوئی ایک عنوان دیا جاسکتا ہے تو وہ ہے: روحانی جواں مردی۔ اقبال اپنے شاہینوں، مردانِ خدا، فقرِ غیور کے حاملوں اور عاملوں، امیری کو نہیں فقیری کو طریقِ زندگی قرار دینے والے جوانوں اور جواں مردوں سے، عاشقوں اور درویشوں سے اگر کچھ چاہتا ہے تو یہی کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پا جائیں۔ اپنی خودی کو، اپنے آپ کو، اپنی اصل فطرت کو، اور فطرت کے مقاصد کو پہچان جائیں اور ان کے حصول کے لیے اپنی عملی اور روحانی صلاحیتوں کے امتزاج سے بے خوف وخطر، اجر اور انعام سے بے پرواہو کر، پوری بے غرضی اور پورے اخلاص کے ساتھ، خالصتاً فی سبیل اللہ مصروفِ عمل ہو جائیں۔

اقبال یہ سب کچھ اسلام کے پھیلتے ہوئے دائرے (Spiral) کے اندر پوری طرح ممکن پاتا ہے۔ لیکن وہ بے کردار ملاؤں اور بے سوز و گداز پیروں کے ہاتھوں اسلام کی مٹی پلید ہوتے دیکھ کر اتنا پریشان ہے کہ روایتی خطابت کے تھکے ہوئے اور فرسودہ الفاظ، اصطلاحوں، تشبیہوں اور استعاروں کے بجائے اسلام کے تنِ بے روح کو خدائے زندہ کا دین بنانے کے لیے نئے الفاظ، نئے آہنگ، نئی اصطلاحوں اور نئی علامتوں کا استعمال ضروری سمجھتا ہے۔ کئی مرتبہ اپنی اس کوشش میں وہ اس حد تک دور نکل جاتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے وہ نٹشے کے سپرمین اور برگساں کے نظریۂ قوتِ حیات (Elan Vital) سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا ہے۔

بے شک وہ رسولِ خدا کے اس ارشاد پر یقین رکھتے ہوئے کہ علم مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے، کہیں سے بھی روشنی حاصل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ لیکن یہ حقیقت روز بروز الم نشرح ہوتی چلی جائے گی کہ وہ بنیادی طور سے اسلامی روحانیت کے اس خاص پہلو سے متاثر ہے جسے عربوں نے فُتوّت، عجمیوں نے جواں مردی اور ہم نے روحانی جواں مردی کا نام دیا ہے۔ اقبال کھلی آنکھوں کی بصیرت اور دلِ پُر خون کی بصیرت سے دیکھ رہا ہے کہ دورِ حاضر میں اسلام کی مادی اور اخلاقی پسماندگی کا کوئی حل ہے تو وہ روحانی جواں مردی کے اصولوں پر دیانتدارانہ عمل ہی سے عبارت ہے۔

اقبال روحانی جواں مردی کی طویل اور درخشاں روایت کو حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے لے کر حضرت علیؓ اور امام حسینؓ تک پھیلا ہوا دیکھتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم — نہایت اس کی حسینؓ، ابتداء ہے اسماعیلؑ

اقبال دیکھ رہا ہے کہ معرکۂ حق و باطل انسانی زندگی کا ایک مسلسل و متواتر حصہ ہے۔ اور اس معرکے کے غازی روحِ اسلام سے محروم مُلّا اور خانقاہوں میں سوئے ہوئے صوفی نہیں، صرف اور صرف روحانی جواں مرد ہیں:

Marfat.com

آگ ہے ، اولادِ ابراہیم ہے ، نمرود ہے — کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟
حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؓ — بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی
قوموں کی تقدیر ، وہ مردِ درویش — جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اقبالؔ جانتا ہے کہ خدا کی اس دنیا میں ہر لحظہ خدا کے بندوں کا امتحان ہوتا رہتا ہے۔ جب مردانِ خدا اس امتحان میں کودنے کی ہمت واستطاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو وہ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جب یہ امتحان حضرت ابراہیمؑ کو پیش آیا تو ''بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق''۔ ابراہیمؑ کے عشقِ الٰہی نے انھیں جو یقین بخش رکھا تھا، اقبالؔ اس کی تصویر کشی یوں کرتا ہے:

یقیں ، مثلِ خلیل ، آتش نشینی — یقیں ، اللہ مستی ، خودگزینی

جب اقبالؔ کو اپنے عہد کے عالمِ اسلام میں یہ یقین، یہ اللہ مستی دُور دُور تک نظر نہیں آتی تو وہ یاد کرتا ہے کہ کیا اسلام کا دامن شروع ہی سے اس سے خالی تھا: اسے حیرت ہوتی ہے کہ ایسا تو نہیں تھا۔ اس کی یہ حیرت خدا سے شکوے میں ڈھل جاتی ہے۔ خدا سے اس طرح کا سوال تو غالبؔ نے بھی کیا تھا کہ:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند — گستاخیء فرشتہ ہماری جناب میں

لیکن غالبؔ یہ سوال پوری انسانیت کی طرف سے پوچھ رہا تھا۔ اقبالؔ خدا سے مسلمانوں کی خدامستی کا احوال کہہ کر مسلمانوں کی طرف سے شکوہ کرتا ہے کہ خدا نے ان سے آنکھیں کیوں پھیر لی ہیں۔ یوں تو تمام کا تمام ''شکوہ'' ہی اس سلسلے میں لائقِ توجہ ہے لیکن مثال کے لیے یہ ایک بند سن لیجیے:

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے — اور مرتے تھے ترے نام کی عزت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے — سربکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے؟
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی — بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

وہ روحانی جواں مردی کی ایک عمومی (General) تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

اور پھر اللہ کے شیروں کی شاندار ترین مثال کے طور پر وہ حیدر کرار (حضرت علیؓ) اور شبیر (حضرت حسینؓ) کے اسمائے گرامی کا انتخاب کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ وہ نام ہیں جنھیں رسُولِ خدا کے بعد نہ صرف شیعہ فرقے بلکہ سُنّی اکثریت کے لیے بھی ''سنی سنائی مردہ روایت'' کے بجائے ''محسوس کی ہوئی زندہ حقیقت'' کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ وہ بار باران دو عظیم روحانی جواں مردوں کا حوالہ دے کر نہ صرف مسلمان عوام کو بلکہ پیرانِ کلیسا (ملاؤں) اور شیخانِ حرم (صوفیوں) کو بھی دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے:

مرے لیے فقط زورِ حیدریؓ کافی — ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک

Marfat.com

حیدریؓ فقر ہے نَے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرارؓ بھی ہے؟

خودی شیرِ مولاؓ ، جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید ، آسماں اس کا صید

اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ہے یا حیدرِ کرار

خام ہے جب تو ہے مٹی کا اک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

اس آخری شعر میں بھی حضرت علیؓ اور ان کی دونوکوں والی تلوار (ذوالفقار) ہی کا حوالہ چھپا ہُوا ہے۔(مٹی کا پتلا انسان مٹی کو اپنے اوپر سوار کرلیتا ہے لیکن شیر مولیٰ علیؓ، کردار کی پختگی کی بدولت مٹی پر سوار ہو جاتے ہیں اور اس اعتبار سے بُوتراب یعنی مٹی کے باپ کہلاتے ہیں)۔

اور ذرا اقبالؔ کا یہ کرب دیکھیے کہ کربلا بھی موجود ہے، قافلۂ حجاز میں کروڑوں مسلمان بھی شامل ہیں لیکن شہیدِ کربلا غائب ہے:

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی، گیسوئے دجلہ وفرات

وہ بے عملی اور بے حسی کی تیرہ و تار خانقاہوں میں سوئے ہوئے مسلمانوں کو للکارتا ہے:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

اور جب وہ کسی کو بھی یہ رسم ادا کرنے پر آمادہ نہیں پاتا تو خدا سے دعا کرتا ہے:

دِلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

اقبالؔ نے مسلمان معاشروں میں روحانی جواں مردی کے فقدان پر صرف آنسو ہی نہیں بہائے، اس نے فقر، فقرِ غیور، فقیری، قلندری، اور درویشی جیسی قدروں کے علاوہ مردِ خدا، مردانِ خدامست، مردانِ حق، مردِ مومن اور شاہین جیسی علامتوں کی مدد سے ان کے تنِ مردہ میں نئی روح پھونکنے کا جتن بھی کیا ہے۔ اسے علم ہے کہ فقر اور فقیری جیسی اصطلاحیں ایک عرصے سے منفی معنی میں استعمال ہو رہی تھیں چنانچہ وہ وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہے کہ وہ کس طرح کے فقر کا امیدوار ہے:

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیّتِ اکسیری

اک فقر ہے شبیریؓ، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی ، سرمایۂ شبیریؓ

احتیاط کے طور پر وہ مثبت معنی رکھنے والے فقر کو فقرِ غیور کا نام دے دیتا ہے۔ وہ فقر یا فقیری کے الفاظ استعمال کرے یا فقرِ غیور کی ترکیب، مطلب ہمیشہ فقرِ غیور ہی ہوتا ہے۔ ان اصلاحوں کے بغیر بھی اس کا

Marfat.com

بنیادی پیغام روحانی جواں مردی اور فقرِ غیور ہی ہے:

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم | عشق ہو جس کا جسُور، فقر ہو جس کا غیور
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی | جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اسی طرح اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کی تشریح میں بھی دفتر لکھے جا سکتے ہیں لیکن خودی کی روح بھی بنیادی طور پر فقیری، فقر اور فقرِ غیور اور روحانی جواں مردی ہی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے نوجوان اور ہونہار بیٹے، جاوید کے ہاتھ کا لکھا ہُوا پہلا خط پا کر لندن سے اسے تلقین کرتا ہے:

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے | خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

آیئے ذرا تفصیل سے فقر کی پوری تصویر دیکھیں:

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ | فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیء عقل و خرد | فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم | علم ہے جُویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر | فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا "موجود" اور، فقر کا "موجود" اور | اشہدُ اَن لا اِلہ، اشہدُ اَن لا اِلہ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی | ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

زندگی کے ہر نئے قدم پر اقبالؔ اپنی قوم کی مادی اور روحانی ابتری کا علاج فقر ہی میں پوشیدہ پاتا ہے:

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے | روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے | یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی
نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے؟ | خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے؟
کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے | وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار | اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سُبحانی
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو | کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی | نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر

فقرِ غیور نہ صرف اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کی روح ہے، وہ تو اسے اسلام کے مترادف قرار دیتا ہے:

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر | دوسرا نام اسی دیں کا ہے فقرِ غیور

یہی نہیں وہ اپنے عہد کے ایک اہم ترین جرمن فلسفی آسولڈ سپنگلر (Oswald Spengler) کی طرح مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے تو پکار اٹھتا ہے:

Marfat.com

اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور
کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر، تونگری سے نہیں

سبب کچھ اور ہے، تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا، بے زری سے نہیں

اقبالؔ نے فقر، فقیری اور فقرِ غیور کے رشتے درویشی اور قلندری سے جوڑ کر بتایا ہے کہ مردِ خدا، مردِ خدامست اور مردِ مومن کیا ہوتا ہے۔ اس کا شاہین بھی انھی صفات کا حامل ہے اور یہ تمام اصطلاحیں اور علامتیں اسلام کی روحانی جواں مردی ہی کی تشریح اور تفسیر کرتی ہیں:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اُس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے، وہ صاحبِ آفاق

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

امینِ راز ہے مردانِ حق کی درویشی

اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

گزراوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد میں
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

پاکستان کے قیام کے بعد اقبالؔ کا کلمہ پڑھنے والوں نے اگرچہ زمین اور جائیداد کی الاٹمنٹ پر گِدھوں کی صورت گر کر اس کی فقر، فقیری، فقرِ غیور، درویشی اور جواں مردی کی تمام تر تلقین کو طاقِ نسیاں میں رکھ دیا لیکن اقبالؔ اپنی قبر کے اندر سے آج بھی یہی کہتا سنائی دیتا ہے:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہُوا
قلندری سے ہُوا ہے، تونگری سے نہیں

کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

نہ تخت و تاج میں، نَے لشکر و سپاہ میں ہے
وہ بات جو کہ قلندر کی بارگاہ میں ہے

Marfat.com

لیکن جب مسلمانوں کی ایک پرانی نسل نے زمانے کو اپنے پیچھے چلنے کا پابند کرنے اور زمانے پر سوار ہو جانے کے بجائے زمانے کو بُرا اقرار دے کر اس کے تقاضوں ہی کو سمجھنے سے انکار کر دیا اور یوں زمانے کو مہلت دے دی کہ وہ مسلمانوں پر سوار ہو جائے تو اقبالؔ کو حضرت موسیٰؑ کی طرح یہی بہتر محسوس ہُوا کہ وہ سال خوردہ مسلمانوں کے بجائے اپنی قوم کے جوانوں سے امید لگائے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب خداوند تعالیٰ نے قومِ موسیٰؑ کو مصری فرعونوں کی طویل غلامی سے نجات دینے کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیے، سمندر کی تہ کو ان کی گزرگاہ بنا دیا، آسمان سے ان کے لیے من و سلویٰ اتارا، اپنے ہاتھ سے دس احکام پتھر کی سلوں پر لکھ کر ان کے لیے صراطِ مستقیم کی نشاندہی کی، وادیٔ سینا کے بیابانوں میں ان کی رہنمائی کے لیے روشنی سے معمور وہ بادل بھیجا جو قافلے سے آگے آگے چلتا تھا لیکن پھر بھی شکرگزار ہونے کے بجائے قومِ موسیٰؑ خوئے غلامی میں اس حد تک اسیر رہی کہ آگے جانے کے بجائے واپس مصر جانے کو بہتر سمجھتی رہی۔ تب خدا نے موسیٰؑ سے کہا، اس غلامی پیشہ نسل کو مر کھپ جانے دو اور اُن نو جوانوں سے امید لگاؤ جو صحرا و بیاباں کی کھلی فضا میں پیدا ہو کر جوان ہوئے ہیں۔ اقبالؔ نے بھی یہی راستہ بہتر سمجھا۔ اب اس کی تلقین بدل گئی اور دعا بھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے بیٹے جاوید کو تمام تر پدرانہ محبت کے باوجود جو بھی تلقین کرتا ہے یا جو بھی دعا دیتا ہے وہ تمام مسلمان جوانوں کے لیے ہوتی ہے:

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسُور و غیور — قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

وہ بظاہر جاوید سے اور بباطن ہر مسلمان نو جوان سے کہتا ہے:

ہمت ہو تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

وہ مسلمان نوجوان سے امید لگائے بیٹھا ہے:

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے — ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہ خدا سے دعا کرتا ہے:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور محراب گُل افغان کے مُنہ سے کہتا ہے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا — شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری

Marfat.com

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اس کے فقر میں ہے حیدریؓ و کراریؓ

اور اپنے دلگداز ''ساقی نامہ'' میں خدا سے کچھ مانگتا ہے تو یہ:

خودی کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

اقبالؔ محسوس کرتا ہے کہ جو فقرِ غیور اور روحانی جوان مردی وہ اپنی قوم میں دیکھنا چاہتا ہے، اسے وہ صرف جوشِ کردار سے مل سکتی ہے اور جوشِ کردار عموماً نوجوانوں ہی میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کی سیاسی اور عسکری بدحالی کا علاج نوجوان مسلمانوں کے جوشِ کردار اور ندرتِ فکر و عمل میں ڈھونڈتا ہے:

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے، ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

نوجوان مسلمانوں کے سوزِ آرزو اور خودداری و ہنرمندی کے سوا اسے اسلام کی حیاتِ نو کا کوئی اور راستہ دکھائی نہیں دیتا:

زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ مسلمان علماء اور فقہاء عوام کو اپنے درمیان وحدتِ افکار پیدا کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں لیکن نہ تو ان کے اپنے قول و فعل میں کوئی ہم آہنگی ہے اور نہ ہی وہ عوام کو کردار کی وحدت کی دعوت دیتے ہیں:

آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی، بے وحدتِ کردار نہیں

وہ چاروں طرف اندھیرا دیکھ کر اپنے اندر جھانکتا ہے اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کہتا ہے:

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اقبالؔ اپنے آنسوؤں سے دنیائے اسلام کی بظاہر بنجر لیکن بباطن زرخیز زمین میں تھوڑی نمی پیدا کر کے مسلمانوں کی جس نئی فصل کی نمود کا منتظر ہے اسے ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کے عنوان سے یوں پکارتا ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
سماں ''الفقرُ فخری'' کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط، چہ حاجت روئے زیبارا

وہ بار بار اپنے مردِ مومن کو یاد دلاتا ہے کہ:

نہ تو زمیں کے لیے ہے، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے

Marfat.com

اور اسے بتاتا ہے کہ:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن ‏ ‏ ‏ ‏ گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

کبھی اپنے فرزند ارجمند، جاوید کے حوالے سے بالواسطہ اور کبھی جوانانِ اسلام سے براہِ راست، اقبال اسلام کی جس حیاتِ تازہ کا امیدوار ہے وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ روحانی جواں مردی کی عملِ پیہم، ندرتِ فکر و عمل اور جدتِ کردار جیسی گم کردہ لیکن ناگزیر صفات کو دل و جان سے اپنالیں۔ اسے بخوبی علم ہے کہ بے غرض، فقیرانہ، درویشانہ، شاہیں صفت، خدامست جدوجہد کے بغیر اسلام کے ساکن پانیوں میں طغیانی تو کیا روانی اور جولانی بھی نہیں آسکتی۔ یہ روحانی جواں مردوں ہی کا نصیب ہے کہ جب پرانی قیادتیں اور نسلیں آگے دیکھنے سے قاصر ہو جائیں اور کاروانِ حیات رکتا ہوا نظر آئے تو وہ یہ سمجھیں کہ ہم ابھی رہ گزر میں ہیں اور قیدِ مقام سے یوں گزر جائیں جیسے تیغِ ہلالِ عیشِ نیام سے گزر جاتی ہے۔ وہ خدا کی خدائی پر نظر ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ:

فریب نظر ہے سکون و ثبات ‏ ‏ ‏ ‏ تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
ہر شے مسافر ہر چیز راہی ‏ ‏ ‏ ‏ کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید ‏ ‏ ‏ ‏ کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکُون

چنانچہ وہ محسوس کرتا ہے کہ:

پرانے ہیں یہ ستارے، فلک بھی فرسودہ ‏ ‏ ‏ ‏ جہان چاہیے مجھ کو جو ہو ابھی نوخیز
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ‏ ‏ ‏ ‏ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں ‏ ‏ ‏ ‏ یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ‏ ‏ ‏ ‏ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود ‏ ‏ ‏ ‏ کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

اقبال کے یہ روحانی جواں مرد اسلام کی روح کو خالی خولی عاجزانہ دعاؤں میں نہیں، درویشانہ و بے غرضانہ جہدِ مسلسل میں دیکھتے ہیں اور مردانِ حق کے اسلام اور مُلّا کے اسلام میں تمیز کر سکتے ہیں:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ‏ ‏ ‏ ‏ یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست ‏ ‏ ‏ ‏ یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار ‏ ‏ ‏ ‏ فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا ‏ ‏ ‏ ‏ ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستہ خیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن ‏ ‏ ‏ ‏ جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

Marfat.com

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے ، نہ جدتِ کردار

ہر لحظہ نیا طور ، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش

اقبالؔ کے روحانی جواں مردوں کی جہدِ مسلسل دراصل ایک طرح کا انقلابِ مسلسل ہے:

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی قوتِ پرویز

یہاں تک کہ وہ ''دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا'' کرنے نکلتے ہیں تو ''قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا'' کر کے چھوڑتے ہیں۔ وہ سکون و قیام کے مقابلے میں پیہم عمل کو اس حد تک ترجیح دیتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک یہ کہتا نظر آتا ہے:

مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بے باک

اقبالؔ کی نظر میں قوموں کے عروج و زوال کا پورا نقشہ ہے۔ وہ مغرب کی فتوحات کے پیچھے علم اور عقل کے بے دریغ استعمال کو کارفرما دیکھتا ہے اور مغرب کے نشۂ قوت میں نہ صرف محکوم اور غلام قوموں کے حقوق پامال ہوتے پاتا ہے بلکہ مغرب کے سرمایہ دارانہ استحصالی نظام کے اندر خود مغرب کو روحانی اعتبار سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ وہ کھل کر کہہ سکے گا:

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

جو حرف ''قُلِ العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

لیکن وہ ''کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری'' مسلمانوں پر واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اگر وہ پیرویٔ مغرب میں صرف علم و عقل کو اپنا رہنما مان کر چلیں گے تو زیادہ سے زیادہ اس دُنیا کا کچھ مال و متاع حاصل کر لیں گے، انھیں روحانی طور پر نئی زندگی نصیب نہیں ہوگی۔ روحانی زندگی کا احیاء تو صرف اسوۂ ابراہیمؑ کے مطابق ''بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق'' ہی سے ہوگی۔

خدا نے اقبالؔ کو عشق کی نعمت، عشقِ رسول ؐ کی صورت میں عطا کی تھی اور پھر رومیؒ کی آتش سوز نے اس عشق کو اُس نغمۂ روح کی شکل دے دی تھی جو ہر دور میں روحانی جواں مردوں کے کاروانوں کے لیے حُدی کا کام کرتا رہے گا:

علم نے مجھ سے کہا ، عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا ، علم ہے تخمین و ظن

عشق پہ بجلی حلال ، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب ، عشق ہے اُمّ الکتاب

عشق پر حاصل حرام ہونے سے آخر مطلب کیا ہے؟

کیا عشق کی کوئی منزل نہیں ہے؟

ہاں، عشق کی منزل ہے لیکن وہ صرف اور صرف خدا ہے وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (بس، تیرا رب ہی

Marfat.com

تیری منزل اور تیرا منتہیٰ و مقصود ہے، (53:42)۔ عشق کہتا ہے، تیرے رب نے سب کچھ تیرے لیے پیدا کیا ہے اور تجھے صرف اپنے لیے۔ جب بھی انسان کی جدوجہد کا رخ دُنیوی مال و منال کے لیے مخصوص ہو جائے تو وہ جسے بہترین صلاحیتیں عطا کی گئی تھیں وہ کمترینوں سے بھی کمتر ہو جاتا ہے۔ (لَقَدْ خَلَقْنَا الانسانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیم . ثُمَّ رَدَدْنٰہُ ، اَسْفَلَ سافلِین، 95:4-5)۔

اہلِ محبت، مردانِ خدا، مردانِ خدا مست اور عاشقانِ الٰہی کی جدوجہد اور پیہم عمل کا جو بھی حاصل ہو وہ صرف ان کے اپنے فائدے کے بجائے پوری جمعیت، پوری قوم بلکہ پوری انسانیت کے لیے عام ہو جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو فقر اور فقرِ غیور کو ہوا و ہوس سے ممتاز کرتا ہے اور یہ امتیاز عقل و خرد کے مقابلے میں جذب و جنوں اور عشق و محبت کو اہم تر سمجھنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اب جدوجہد کے حاصل کو ایک روحانی مقام حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں سے خودغرضی کا زہر خارج ہو جاتا ہے اور وہ انسانیت کے استحصال اور استبداد کے ایک ذریعے سے بلند ہو کر بیمار، نادار اور بے مہار معاشروں کے لیے حیاتِ نو کا سامان بن جاتا ہے:

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہُوا
عشق تمام مصطفیٰ ، عقل تمام بولہب

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ، محبت کی زباں ہو جا

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں ، بدر و حنین بھی ہے عشق

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ مُلّا، نہ زاہد ، نہ حکیم

کمالِ عشق و مستی ، ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی ، حرفِ رازی

یہی مقصودِ فطرت ہے ، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری ، محبت کی فراوانی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبالؔ کی شاعری کا سرسری مطالعہ بڑی آسانی سے یہ تاثر پیدا کر سکتا ہے کہ اس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو دُنیوی غلبے کے لیے ابھارنا ہے۔ مثلاً یہی مصرع لے لیجیے: خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا۔ یا جب وہ مُلّا کی اذان کے مقابلے میں مجاہد کی اذان کو ترجیح دیتا ہے اور اس طرح کے مقبولِ عام شعر کہتا ہے کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر ایک مرتبہ پھر وہی جذبۂ جہاد پیدا کرنا چاہتا ہے جس نے دیکھتے ہی دیکھتے انھیں اسی طرح دنیا کا حاکم بنا دیا تھا جیسے کل تک برطانیہ تھا اور آج نشۂ قوت میں بدمست امریکہ ہے جس کی خودی اتنی بلند

Marfat.com

ہو چکی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے خدا نے اس دنیا میں سیاہ وسفید کرنے کا ٹھیکہ اُسی کو دے دیا ہے۔

اقبال کے ساتھ اِس سے بڑی دھاندلی اور نہیں ہوسکتی کہ اس کی "تعلیمِ خودی" کو تو یاد رکھا جائے اور "تلقینِ بے خودی" کو نظرانداز کر دیا جائے۔ بے شک وہ نہ صرف کہتا ہے بلکہ اصرار کرتا ہے کہ مسلمان کی تلوار ایک مرتبہ پھر بے نیام ہو لیکن وہ کونسی تلوار ہے؟ قتلِ عام کرنے والی، ظلم وستم کرنے والی، انسانیت کو فتنہ وفساد میں مبتلا کرنے والی تلوار؟ نہیں۔ وہ تو فقر کی تلوار کی بات کر رہا ہے۔ یہ وہ تلوار ہے جو موت نہیں بلکہ معاشروں کو نئی زندگی بخشتی ہے، محبت اور اخوت جیسی قدروں کو مستحکم کرتی ہے اور امن وامان کی ضمانت دیتی ہے۔

اگر یہی بات تھی تو پھر تلوار یا شمشیر، مجاہد، شاہین، بازوئے حیدرؓ، خالدِؓ جانباز جیسے الفاظ اور تراکیب کی تکرار کا کیا مقصد تھا؟

جن لوگوں نے مختلف معاشروں میں آزادی، مساوات اور بنیادی انسانی حقوق کی پُرامن لیکن کامیاب تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ یہ تحریکیں اس وقت تک کامیاب نہ ہوسکیں جب تک وہ اُسی معیار پر منظم نہ ہوئیں جو فوجی تنظیموں کا خاصہ ہے اور جب تک ان تحریکوں کے قائدین اور کارکنوں میں اسی سطح کا جذبۂ جانبازی نہ پیدا ہُوا جو جنگوں کے دوران بے جگری سے موت کے مُنہ میں کود جانے والے سُورماؤں (Heroes) میں ہوتا ہے۔ اقبال یقیناً یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ایک مرتبہ پھر اسلام کی اُس پُرصدق سادگی کو اپنا لیں جب وہ دُنیوی جاہ وجلال کے لیے نہیں، خالصتاً فی سبیل اللہ میدانِ زندگی میں نکلے تھے۔ اگرچہ وہ اجر اور انعام سے بے نیاز تھے لیکن اجر اور انعام ان کی جھولی میں خود ہی آ گرے۔

اقبال اس بحث سے بخوبی آگاہ تھا کہ اسلام تلوار سے پھیلا تھا یا تعلیم وتلقین سے۔ وہ ان مسلمان تاریخ دانوں اور اہلِ فکر کا ہمنوا تھا جو اسلام کی روح کو اسلام کی تلوار میں نہیں، اس تلوار کو چلانے والے اس ہاتھ میں دیکھتے تھے جو خودغرضی، ظلم وستم اور قوت برائے قوت کے بجائے بے غرضی، مساوات ومروت اور "قوت برائے اصلاحِ احوال" جیسی قدروں کے تابع تھا۔ لیکن اقبال کو یہ بھی علم تھا کہ اپنے انحطاط وزوال کے دور میں مسلمان کو اپنے شاندار ماضی کی کوئی علامت یاد رہ گئی ہے تو وہ مردِ مجاہد کی تلوار ہی ہے۔ وہ نہایت فراست سے تلوار کی علامت کو "سلطانی وملائی وپیری" کے ہاتھوں برباد ہو جانے والے مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

شاید بات واضح نہ ہوئی ہو اس لیے آیئے اسے اقبالؒ کے بعد کے عرصے اور ماضی قریب کے ایک واقعے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب پاکستان کو وجود میں آئے ہُوئے بیس سال ہو گئے اور اس دوران جمہوری عمل سے بننے والے اس ملک میں ایک مرتبہ بھی "ایک شخص، ایک ووٹ" کے اصول پر عام انتخابات نہ ہوئے اور اس میں غریب عوام کی معاشرتی اور معاشی پس ماندگی کو دور کرنے کی کوشش تو کیا، بات بھی نہ کی گئی تو ذوالفقار علی بھٹو کی سرکردگی میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سیاسی جماعت کے منشور میں قائداعظم کی اس فکر کے مطابق کہ "اگر پاکستان میں

Marfat.com

ریب مسلمان کو دو وقت کی عزت کی روٹی میسر نہیں آ سکتی تو بہتر ہوگا کہ ایسا پاکستان بنایا ہی نہ جائے''، اقتصادی مسئلے کو رفہرست رکھا گیا تھا۔ جب اس جماعت اور دوسری جمہوری جماعتوں کی جدوجہد سے فیلڈ مارشل ایوب خان کی ''بنیادی مہوریت'' اور سیاسی آمریت کا خاتمہ ہوگیا۔

جب دسمبر 1970ء میں نئے فوجی ڈکٹیٹر یحییٰ خان کے عہد میں بالغ رائے دہی(Adult Franchise) کے صول پر عام انتخابات ہوئے تو پاکستان پیپلز پارٹی نے انتخابی نشان کے طور پر ''تلوار'' کا انتخاب کیا۔ بے شک اس کی ایک جہ یہ بھی تھی کہ اس پارٹی کے مقبول عوام قائد کے نام کا پہلا حصہ ''ذوالفقار علی'' تھا جس کی ''تلوار'' سے نسبت بہت پرانی تھی ور پاکستان کے اَن پڑھ عوام کے شعور اور لاشعور میں بھی پوری طرح رچی بسی تھی۔ لیکن پارٹی کے نظریہ سازوں اور خطیبوں نے اس نسبت کو بڑے سلیقے اور تواتر سے استعمال کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی متحرک قیادت، پارٹی کے انقلابی منشور اور پارٹی کے غریب اور مخلص کارکنوں کی بے مثال تگ ودو کے ساتھ مل کر اس نشان کے پیچھے اسلام کی عظمت کی ایک طویل تاریخ نے پاکستان پیپلز پارٹی کو اس وقت کے مغربی پاکستان اور آج کے پورے پاکستان میں زبردست اکثریت سے فتح دلا دی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی فتح میں تلوار کے نشان کو جو اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ جب جنرل ضیاء الحق نے ملک میں تیسرا مارشل لاء لگایا تو جہاں پیپلز پارٹی کی عوامی مقبولیت سے خائف ہو کر اپنے حلفیہ دعوؤں کے باوجود بار بار انتخابات ملتوی کیے وہاں یہ قانون بھی بنا دیا کہ آئندہ کوئی سیاسی جماعت انتخابی نشان کے طور پر ''تلوار'' کا انتخاب نہ کر سکے گی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر جمہوری سیاست اور سوشلسٹ معیشت کی بات کرنے والی جماعت کو تلوار کے انتخابی نشان سے کیوں فائدہ ہُوا؟ بس یہی فائدہ اقبالؔ نے عروجِ اسلام کی خاطر مجاہدانہ ترکیبوں اور اصطلاحوں سے اٹھایا۔ بات تو وہ بھی ملوکیت اور بادشاہت کے خاتمے اور اقتصادی استحصال سے نجات کی کر رہا تھا، فقرِ غیور کی کر رہا تھا اور طائرِ لاہوتی سے کہہ رہا تھا کہ ''اُس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' اور اس سلسلے میں اس نے عشق اور محبت اور اخوت اور درویشی اور قلندری اور قربانی اور فقیری کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا لیکن یہ ساری بات وہ جہادی اصطلاحوں اور علامتوں کے ذریعے کر رہا تھا۔ اس کی یہ فراست ہی تھی جس نے سر سیدؒ سے لے کر محمد علی جناحؒ تک کی روشن خیال مسلمان قیادتوں میں زندگی کا لہو بھر کے پاکستان کا قیام ممکن بنا دیا۔

اقبالؔ کو شدید احساس تھا کہ اس کی اس فراست کا غلط نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔ جس طرح اس کے عہد کے علماء جنھیں وہ تحقیر سے مُلّا کا نام دیتا ہے، مسلمانوں کو ماضی کے شاندار کارنامے سنا کر اور یہ بتا کر کہ اب بُرا وقت آ گیا ہے حال سے مایوس اور عہدِ حاضر کے تقاضوں سے غافل کر رہے تھے اسی طرح اس کی جہاد سے نسبت رکھنے والی اصطلاحوں اور علامتوں سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ بھی ماضی ہی کی عظمتوں کا قصیدہ گو ہے۔ چنانچہ اس ممکنہ غلط فہمی سے بچنے کے لیے ایک تو وہ اپنے انگریزی خطبات میں The Principle of Movement in the Structure of Islam (اسلام کی تعمیر میں حرکت کا اصول) کے عنوان سے ایک پورا باب باندھ کر واضح کرتا ہے کہ اسلام کوئی جامد نظام یا

Marfat.com

Dogma نہیں بلکہ ایک ''زندہ و متحرک اور ہر لحظہ نئی سے نئی تخلیق کرتے چلے جانے والے خدا'' اور ایک ''مسلسل و متواتر پھیلتی ہوئی کائنات'' کے ساتھ تعلق کے حوالے سے انسان میں اعلیٰ تر شعور بیدار کرنے کا سرچشمہ ہے۔ دوسرے، وہ اپنے کلام میں جدتِ کردار اور ندرتِ فکر و عمل جیسے تصورات کی مدد سے اپنے قارئین کو بتاتا ہے کہ وہ کسی ایسی تحریک کا علم بردار نہیں جو ماضی کی بحالی (Revivalism) کے ہم معنی ہو بلکہ وہ مسلمانوں کو حال کی حقیقتوں کے پیشِ نظر فقرِ غیور، جذبِ دروں اور صدق و سادگی جیسی ازلی و ابدی روحانی قدروں کی مدد سے ایک نئی اور نرالی دنیا آباد کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ وہ صاف صاف اعلان کرتا سنائی دیتا ہے:

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
زمانے کی یہ گردشِ جاودانہ
حقیقت ایک تُو ، باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

دوش (ماضی) اور فردا (مستقبل) کے برعکس امروز (حال) کو روحانی جواں مردوں کا زمانہ قرار دے کر اقبالؔ نے نہ صرف یہ کام کیا ہے کہ مسلمانوں کو شاندار ماضی کے سحر اور مبہم مستقبل کے خوابوں سے نکال کر حال کا حق ادا کرنے کا راستہ دکھایا ہے بلکہ اپنا نام ان عظیم صوفیوں میں لکھوا دیا ہے جنھیں ''صاحبانِ حال'' کہتے ہیں۔ انسان اکثر و بیشتر یا تو ماضی کی کامیابیوں پر اتراتا اور غلطیوں پر پچھتاتا رہتا ہے یا پھر مستقبل میں ہوائی قلعے بناتا رہتا ہے۔ یہ بیدار دِل اور روشن ضمیر صوفیوں ہی کا شرف ہے کہ وہ انسان کو حال کی اہمیت سے آگاہ کرتے چلے آئے ہیں۔

مسلمان مفکروں، عالموں اور صوفیوں نے وقت یا زماں یا دہر کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ فلسفیوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وقت یا تو ماضی ہے یا مستقبل اور حال محض وہ نقطہ یا لکیر ہے جہاں ماضی اور مستقبل آپس میں ملتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر ہمیں بالآخر یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ وقت ایک چھلاوا یا وہم (illusion) ہے۔ لیکن صوفیوں نے وقت کو اس طرح سے دیکھا ہے کہ ماضی گزر چکا ہے اور مستقبل ابھی پردۂ غیب میں ہے لہٰذا وقت اگر ہے تو صرف حال ہی ہے۔ وقت کے بارے میں یہ تصور رسولِ خدا کی اس حدیثِ قدسی سے پھوٹتا ہے جس کے مطابق خدا خود وقت ہے اور یوں وقت کی نفی دراصل خدا کی نفی بن جاتی ہے جس سے بہر صورت بچنا چاہیے۔ اقبالؔ اسی صوفیانہ نظریۂ وقت کا قائل ہے اور بے حرکت و عمل مسلمانوں کو حال کا حق ادا کرنے کے لیے فقر کی بے غرض، بامروت اور عدل و احسان افروز تیغِ بے نیام بن جانے کا درس دیتا ہے۔

اقبالؔ کو صوفیاء کی صف میں کھڑا کرنے کا ایک جواز اور بھی ہے۔ مسلمان مفکروں اور عالموں نے انسان اور خدا کے درمیان اتنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں کہ اقبالؔ کے الفاظ میں خدا فرشتوں کو حکم دیتا ہے:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

فرشتے خدا کے فرمان پر کس حد تک عمل کر سکے، یہ تو وقت ہی بتائے گا کیونکہ خدا کا ایک دن بھی پچاس ہزار سال

Marfat.com

پر پھیلا ہوتا ہے لیکن یہ بات ثابت ہے کہ گو ابن عربیؒ کی طرح اقبال نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ میں نے خدا کا دیدار کیا ہے لیکن اس کی یہ خواہش چھپائے نہیں چھپتی:

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو ۔۔۔ کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

اور تھوڑی تکرار معاف:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

بلکہ وہ خدا کو چیلنج کرتا ہے کہ میں تجھے دیکھنے کی تاب رکھتا ہوں اور موسیٰؑ کے مقابلے میں تعلّی کے لہجے میں گستاخی کرتا ہے کہ موسیٰؑ لن ترانی (تم مجھے دیکھ نہیں سکتے) سن کر چپ ہو گئے تھے مگر میں ارنی (میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں) کہہ رہا ہوں تو اس پر قائم ہوں البتہ تو ہی آمادۂ ظہور نہیں۔ دراصل یہ ساری بحث اب ہمیں وہیں لے آئی ہے جہاں اقبال قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس کر رہا ہے کہ یہ اسی پر نازل ہُوا ہے اور اگر وہ خدا کو دیکھ نہیں پار ہا تو یہ ضرور جانتا ہے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جو یا تو بیدار دل صوفیوں کو نصیب ہوتا ہے یا پھر ان روحانی جواں مردوں کو جو راہِ حق میں اپنی جان ہر لحظہ ہتھیلی پر رکھے رہتے ہیں اور جان نثار کر کے بھی مومن کے لفظوں میں یہ کہتے سنائی دیتے ہیں:

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی ۔۔۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

اقبال کی زندگی میں اس پر کفر کے فتوے بھی لگے۔ اقبال نے تو ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا جس سے علماء کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہوتا۔ اس نے تو الٹا یہ کہا تھا: ''میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہہ'' لیکن یہ اس کی دیدہ دلیری تھی جو علماء کو چبھتی تھی کیونکہ وہ خدا کے حضور میں شوخی کا مرتکب ہو جاتا تھا۔ اقبال ان کے اس اعتراض کو لکم دینکم و لیَ دِین کے انداز میں ٹال دیتا تھا:

تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر ۔۔۔ ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی

اقبال محسوس کرتا تھا کہ علمائے وقت اور پیرانِ وقت نے اسلام کا ایک مزار سا بنا لیا ہے۔ وہ عوام سے اس مزار پر بساط سے بھی بڑھ کر چڑھاوے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس چڑھاوے کے بل پر خود دادِ عیش دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ باغی مرید کے مُنہ سے یہ کہلواتا ہے:

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی ۔۔۔ گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

لیکن اس طرح کی طنز و تنقید صرف ضمنی اور فروعی تھی۔ اقبال کو عالموں یا ملاؤں پر اصل اعتراض یہ تھا کہ وہ جس قرآن کا درس دیتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے۔ وہ اپنے دل میں انھیں وہی مقام دیتا تھا جو خدا نے تورات کے حاملوں کو یہ کہہ کر دیا تھا: ''جنھیں تورات دی گئی تھی انھوں نے اس کا حق نہ ادا کیا۔ ان کی مثال اُس گدھے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں'' (64:5)۔ وہ کتاب اللہ کے ندرتِ فکر و عمل سے محروم نام نہاد عالم (بزعمِ خود بحر العلوم) سے کہتا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے ۔۔۔ کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

Marfat.com

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

اقبال کو صوفی پر یہ اعتراض ہے کہ وہ قم باذن الله (اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جاؤ) کہنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے اور خانقاہوں کا مجاور یا گورکن بن کر رہ گیا ہے۔ صوفی کا نام نہاد فقر مریدوں میں مسکینی و دلگیری تو پیدا کرتا ہے، رسمِ شبیریؓ ادا کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ اقبالؒ شریعت کے اماموں اور طریقت کے پیشواؤں میں روحانی جواں مردی نہیں پاتا۔ یہی وہ اعتراض تھا جو علماء، فقہاء اور صوفیاء کو سب سے زیادہ پریشان کرتا تھا۔ کیونکہ یہ انھیں گریبان میں جھانکنے پر مجبور کرتا تھا اور ان پر واضح کرتا تھا کہ ان کی اصلیت بہروپیوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ انھیں جتنا غیرت اور فقرِ غیور کی طرف مائل کرتا تھا، وہ اتنا ہی چڑتے تھے اور پھر اپنی جھنجلاہٹ میں اس کے خلاف کفر کے فتوے جاری کرنے بیٹھ جاتے تھے۔

اقبال بھی بالآخر ان سے مایوس ہو کر اپنے نوجوان اور ہونہار بیٹے کے واسطے سے نوجوانانِ اسلام پر طریقت کی حقیقت واضح کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ اس حقیقت کو پلے باندھ کر اسلامی تصوف کو روحانی جواں مردی کے راستے پر ڈال سکیں گے:

غیرت ہے طریقتِ حقیقی غیرت سے ہے فقر کی تمامی

اور پھر اپنے انگریزی خطبات کے آخری خطبے ?Is Religion Possible (کیا مذہب ممکن ہے؟) کے آخری پیرے میں وہ نفسِ انسانی (Ego) کی معراج بیان کر کے ایک طرح سے اسلامی روحانیت کی معراج کا نقشہ کھینچتا ہے اور شاعرانہ الفاظ کے بجائے عالمانہ زبان میں فنا فی الله کے برعکس باقی بالله کا جواں مردانہ تصور پیش کرتا ہے:

"نفسِ انسانی کا آخری مقصد کسی کا دیدار کرنا نہیں ہے بلکہ خود کچھ بننا ہے۔ انسان کے نفس کے کچھ بننے (to be) کی اسی کوشش کی بدولت انسان اپنی معروضی حقیقت (Objective Reality) کو اجاگر کرتا اور اپنی ذات کا ایک مستحکم تر اقرار حاصل کرتا ہے......
نفس کی جستجو کا مقصد انفرادیت کی حد بندیوں (Limitations) سے فراغت پانا نہیں بلکہ اس کے برعکس انفرادیت کی ایک واضح تر شکل و صورت کا حصول ہے۔ آخری قدم کوئی ذہنی عمل نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا عمل ہے جو نفس کے پورے وجود کو گہرائی عطا کرتا ہے۔ نفسِ انسانی کا یہ آخری قدم انسان کی قوتِ ارادی کو اس تخلیقی یقین دہانی سے تیز تر کرتا ہے کہ یہ دُنیا صرف تصورات کے ذریعے دیکھنے یا جاننے کی چیز نہیں بلکہ پیہم عمل سے تعمیر اور تعمیرِ نُو کرتے چلے جانے والی حقیقت ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب نفسِ انسانی اعلیٰ ترین برکت سے بہرہ ور ہوتا اور عظیم ترین امتحان سے گزرتا ہے۔"

انگریزی نثر کے اس پیرے کے بعد اقبال اپنی طویل فارسی نظم "جاوید نامہ" سے ایک اقتباس پیش کر کے اپنے اس خطبے کو یوں ختم کرتا ہے:

Marfat.com

تم ''زندگی''، ''موت'' یا ''جیتے جی موت'' میں سے کس مقام پر ہو؟
اپنے اس مقام کی تصدیق کے لیے تین گواہوں کی تائید ڈھونڈو
اگر پہلا گواہ تمھارا اپنا شعور ہو تو
تم اپنے آپ کو اپنے نور سے دیکھو
اگر دوسرا گواہ کسی اور کا شعور ہو تو
تم اپنے آپ کو اپنے نور کے بجائے کسی اور کے نور سے دیکھو
اگر تیسرا گواہ خدا کا شعور ہو تو
پھر تم اپنے آپ کو خدا کے نور سے دیکھو
اگر تم خدا کے نور کے سامنے دہل کر نہ رہ گئے
تو سمجھ لو کہ تم خدا ہی کی طرح زندہ و پائندہ ہو
صرف وہی شخص صاحبِ حقیقت ہے جس میں جرأت ہو
خدا کو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت
''معراج'' کیا ہے؟ بس ایک گواہ کی تلاش
جو تمھاری حقیقت کی حتمی تصدیق کر سکے
ایسے گواہ کی تصدیق ہی تمھیں دوام بخش سکتی ہے
کوئی بھی خدا کے حضور میں لرزے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا
اور اگر کوئی رہ سکتا ہے تو پھر وہ زرِ خالص ہے
کیا تم محض ایک ذرّۂ خاک ہو؟
تو پھر اپنی خودی کی گرہ کو سختی سے باندھ لو
اور اپنے خفی وجود کو مضبوطی سے تھام لو!
اپنی خودی کو آب و تاب دینے میں کتنی شان ہے
اور اس کی چمک دمک کو سورج کے روبرو پرکھنے میں کتنا لطف ہے
تو اپنے فرسودہ ڈھانچے کو از سرِ نو صیقل کرو
اور اپنا ایک نیا وجود تعمیر کرو
ایسا وجود جو حقیقی ہو
ورنہ تمھاری خودی دھوئیں کے ایک مرغولے کے سوا کچھ بھی نہیں

Marfat.com

آپ ''جاوید نامہ'' کے اس دھندلے سے ترجمے میں ابن عربیؒ کے ''زرِ خالص''، منصور حلاجؒ کے ''انا الحق'' اوران دونوں سے اختلاف رکھنے والے شیخ احمد سرہندیؒ کے ''مکتوباتِ ربانی'' کے رنگوں کی دھنک صاف صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اسلامی روحانیت، خصوصاً روحانی جواں مردی کے اصول کو دل و جان کی پوری صلاحیت اور طاقت سے اپنائے بغیر کوئی انسان خدا کے حضور میں ثابت قدمی سے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ بہر حال یہ انسانی نفس کی معراج ہے۔ اس سطح کی روحانیت اور جواں مردی ہر کسی کے بس کی بات نہیں لیکن وہ بات کرنے کے لائق کب ہُوا کرتی ہے جو ہماری عظیم ترین صلاحیتوں کے لیے چیلنج نہ ہو! قرآنِ حکیم کی یہ ایک بات یاد رہ جائے تو یہ بظاہر ناممکن بات ممکن بننے لگتی ہے کہ خدا نے خود اپنے آپ کو انسان کی منزل اور منتہیٰ ومقصود قرار دے رکھا ہے۔ خدا سے کم انسان کسی بھی بات یا ذات کو اپنی منزل سمجھ بیٹھے تو وہ انسانیت کے معیار سے گر جاتا ہے۔ رہا یہ کہ انسان میں اتنی سکت کہاں کہ خدا کا سامنا کر سکے تو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآنِ حکیم کا ایک واضح ترین اصول یہ ہے کہ ''خدا انسان پر کبھی اتنا بوجھ نہیں ڈالتا جو وہ اٹھا نہ سکے''۔ اقبالؔ تو آپ کو بشارت دے ہی چکا ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے ۔۔۔ کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردُوں

لیکن اقبالؔ یہ بشارت بلاسند نہیں دے رہا۔ قرآنِ حکیم میں غوطہ زن رہنے والے اقبالؔ کو یہ سند خود خدا کے اس ارشاد سے ملی تھی: ''آگاہ رہو، یہ لوگ (خدا اور قرآن کے منکر) اپنے ربّ سے ملاقات کی بابت شک میں پڑے ہوئے ہیں'' (41:54)۔ ذرا خدا کے الفاظ کو اس طرح دہرا کر دیکھیے۔ خبردار جو لوگ اس شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ شاید ان کی خدا سے ملاقات نہیں ہوگی وہ خدا اور قرآن کے منکر ہیں۔

برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں میں یہ جملہ عام استعمال ہوتا ہے: ''آخر ایک دن سب نے خدا کے سامنے جانا ہے''۔ مخمصہ صرف یہ ہے کہ بظاہر یہ واقعہ جیتے جی نہیں، مرنے کے بعد پیش آئے گا اور اقبالؔ کہہ رہا ہے کہ نہیں، اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی روحانی ترقی کی یہ معراج نصیب ہوسکتی ہے۔ غور فرمائیے، کیا اس لمحے، جب آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہیں، خدا ہمیں نہیں دیکھ رہا؟ لازماً ہم اس وقت کیا، ہر وقت اس کی نظر میں رہتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جو ہمیں دیکھ سکتا ہے، ہم بھی اسے دل کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ صرف اتنی سی نادانی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ خدا کہیں دور آسمانوں میں بادلوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہُوا ہے اور بھول جاتے ہیں کہ وہ تو ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر موجود ہے۔ بادلوں کے ذکر سے مشہور ڈراما نویس آغا حشرؔ کاشمیری کا یہ مقبولِ عوام شعر یاد آ گیا:

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے ۔۔۔ بادلو! ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے

ہم اکثر و بیشتر خدا کو آغا حشرؔ کاشمیری ہی کے مقامِ نظر سے دیکھتے رہتے ہیں حالانکہ اردو شاعری میں بھی تصوف کے زیرِ اثر صحیح طرزِ احساس موجود ہے۔ غالبؔ کا یہ بظاہر شوخ لیکن نہایت سنجیدہ شعر ہی لے لیجیے:

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ ۔۔۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

Marfat.com

یہی وہ طرزِ احساس ہے جس نے اقبالؒ سے کہلوایا تھا کہ میں روضۂ رسولؐ پر حاضر ہوتے ہوئے ڈرتا تھا کہ میں آپؐ کے سامنے گیا تو میرا وجود ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کیا کعبے میں خدا بیٹھا تھا یا روضۂ رسولؐ میں رسولِؐ خدا تشریف رکھتے تھے کہ غالبؔ اور اقبالؒ کو وہاں جاتے ہوئے شرمندگی اور خوف لاحق تھا؟ بس ان عظیم ہستیوں کا احساس دوسروں سے لطیف تر ہو چکا تھا اور ان پر یہ حقیقت واشگاف ہو گئی تھی کہ خدا تعالیٰ اور رسولِؐ خدا کو جیتے جی بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن چہرے کی آنکھ سے نہیں، دل کی آنکھ سے، روح کے افقِ اعلیٰ پر۔

Marfat.com

Marfat.com

دسواں باب

روحانی جواں مردی کی مثالیں

پیغمبرانِ کرام

جس علم کی گواہی عمل نہ دے وہ ذہنی عیاشی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ روحانی جواں مردی کوئی ایسا تصور نہیں جو خوبصورت تو ہو مگر قابلِ عمل نہ ہو۔ بے شک اس تصور کی بہترین عملی مثالیں ہمیں پیغمبروں کی زندگی میں ملتی ہیں لیکن خدا نے پیغمبروں کو عام انسانوں کے لیے روشنی کے مینار بنایا ہے اور بتایا ہے کہ اگر تم صدقِ دل سے ان کی پیروی کرو تو تم بھی انسانیت کے اعلیٰ ترین معیار کو چھو سکتے ہو۔

خدا نے پیغمبروں، خصوصاً حضرت محمدؐ کے بارے میں نہایت اصرار کے ساتھ یہ وضاحت کی ہے کہ آپؐ رسول ہونے کے علاوہ عبد (بندے) بھی ہیں۔ اس وضاحت کی ضرورت دو وجوہ سے پیدا ہوئی۔ ایک وجہ مثبت اور دوسری منفی تھی۔ مثبت: خدا چاہتا تو جس طرح اس نے حضرت موسیٰؑ کو پتھر کی سلوں پر اپنے احکام لکھ کر دے دیے تھے رسولِ خدا کو بھی دے دیتا، آپ کو مکّے اور طائف میں مشکلیں اور مصیبتیں اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت یہی تھی کہ لوگوں کو پتا چلے کہ آپؐ خدا کے جو احکام سنا رہے ہیں وہ قابلِ عمل ہیں کیونکہ دوسروں کو بتانے کے ساتھ ساتھ آپؐ خود ان پر عمل پیرا ہیں۔ منفی: حضرت عیسیٰؑ کو ان کے پیروکاروں نے خدا کی خدائی میں حصہ دار ٹھہرا دیا تھا۔ رسولِ خدا اور آپؐ کے پیروکاروں کو کھول کھول کر بتایا گیا کہ اس روش سے یکسر بچا جائے۔ اس روش کے نتیجے کے طور پر یہ تصور پیدا ہو سکتا تھا کہ لوگ آپؐ کی پیروی کہاں کر سکتے ہیں، وہ تو ٹھہرے عام انسان اور آپؐ ہوئے خدائی صفات کے مالک۔

آگے چلنے سے پہلے پیغمبروں کی بابت دو اور باتیں دہرا لی جائیں تو بہتر ہوگا۔ خدا نے کسی بڑی آبادی والی بستی یا شہر کو پیغمبروں سے محروم نہ رکھا تھا۔ ہر دوسرے مسلمان کی نوکِ زبان پر یہ جملہ پھڑکتا رہتا ہے کہ خدا نے دُنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے تھے۔ لیکن ہندوستان، چین، روس، یونان، افریقہ یا شمالی اور جنوبی امریکہ میں کسی پیغمبر کے امکان کا ذکر بھی آ جائے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں اور اپنی خاموشی سے یہ ثابت کرنے کی غیر ارادی کوشش کرتے ہیں کہ خدا دنیا کے جغرافیے سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ خصوصاً رسولِ خدا کی تشریف آوری سے پہلے ابھی نہ تو ابن بطوطہ ہی ہندوستان اور چین پہنچا تھا اور نہ ہی کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر خدا ایک ہی ہے تو جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سب اسی ایک خدا کا پیغام لے کر آئے تھے۔ خدا کا اپنا حکم ہے کہ میرے پیغمبروں میں فرق نہ کیا کرو (2:136)۔ ظاہر ہے کہ اس فرق سے یہ تو مراد نہیں تھی کہ ان کا ناک نقشہ، قد کاٹھ یا حلیہ ایک جیسا تھا۔ اس سے یہی مراد ہو

Marfat.com

سکتی تھی کہ ان کے بنیادی پیغام میں کوئی فرق نہیں تھا۔

کاشفی اور کاشانی کی طرح روحانی جواں مردی کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ سے شروع کرلیا جائے تو آسانی ہوگی۔ یہ الگ بات کہ آدمؑ سے لے کر آج تک انسانی دنیا کبھی روحانی جوانمردوں سے مکمل طور پر خالی نہیں رہی۔ شجرِ ممنوعہ کے سلسلے میں خدا کی نافرمانی کر لینے کے بعد آدمؑ جس طرح پشیمان ہوئے اور انھوں نے جس طرح عاجزی کے ساتھ توبہ کی، وہ تاریخ انسانیت میں پہلی روحانی جواں مردی تھی۔ ذرا رُکیے، کہنے کو تو خدا کے واضح حکم کے باوجود شجرِ ممنوعہ کا پھل کھالینا خود بہت بڑی جواں مردی تھی۔ لیکن ہم روحانی جواں مردی کی بات کررہے ہیں، خالی خولی جواں مردی کی نہیں ورنہ تو دنیا کے ہر بڑے مجرم، چور، ڈاکو، ظالم، غاصب اور قاتل کا نام بھی جواں مردوں کی فہرست میں شامل کرنا پڑ جائے گا۔ یہی امتیاز ہمیں پوری انسانی تاریخ سے مثالیں ڈھونڈتے ہوئے بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔

ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ

حضرت ابراہیمؑ نہ صرف ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئے جو بُت پرست تھا بلکہ انھوں نے ایک ایسے گھرانے میں پرورش پائی جو بُت ساز تھا۔ تلاشِ نور میں مصروف اس جواں سال جواں مرد نے چاند، سورج اور ستاروں کو ڈوبتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ ڈوب جانے والے خدا نہیں ہوسکتے، میرا خدا تو وہی ہوسکتا ہے جس پر کبھی لمحۂ زوال نہ آئے۔ پھر جب ابراہیمؑ سے خوش ہوکر خدا نے ان سے کلام کرنا شروع کردیا اور انھوں نے خدا سے یہ بھی پوچھ لیا کہ تُو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا تو خدا نے سدھائے ہوئے پرندوں کو پہاڑ کی مختلف چوٹیوں پر تقسیم کرنے اور انھیں ابراہیمؑ کی ایک آواز پر واپس چلے آنے کی عملی مثال سے انھیں عین الیقین اور حق الیقین کے مراحل سے بھی گزار دیا۔ تب ابراہیمؑ میں اتنی استقامت پیدا ہوگئی کہ انھوں نے بڑے بت خانے میں جاکر اپنی کلہاڑی سے ایک ایک کرکے سارے بت توڑ ڈالے اور کلہاڑی سب سے بڑے بت کے کندھے سے لٹکا دی۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ کسی نے بت ساز آذر کے جواں سال بیٹے ابراہیمؑ کو بت خانے کے پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ پوچھ گچھ پر ابراہیمؑ نے کہا، ''عجیب بات ہے، آپ لوگ بڑے بت سے کیوں نہیں پوچھ لیتے، کلہاڑی تو اسی کے کندھے پر نظر آرہی ہے''۔ ان لوگوں نے زیادہ شرمندہ ہوئے بغیر جواب دیا، ''وہ تو نہ اپنی جگہ سے ہل سکتا ہے اور نہ ہی بول سکتا ہے۔ اوّل تو اس نے دوسرے بت توڑے ہی نہیں اور توڑے بھی ہوں تو وہ بتا تھوڑی سکتا ہے؟'' اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جب لوگوں کے پاس دلیل نہیں ہوتی تو وہ تشدد پر اتر آتے ہیں چنانچہ وقت کے حاکم نمرود نے حکم صادر کردیا کہ ایک بڑا الاؤ دہکایا جائے اور ابراہیمؑ کو اس میں پھینک دیا جائے۔ کہتے ہیں کہ جب ایسا کیا گیا تو خدا کے حکم سے انگارے پھول بن گئے۔ خدا کے حکم سے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے مطابق خدا نے صرف اتنا کہا تھا ''یا نارُ کُونی بَرداً وّ سلاماً علیٰ اِبراھِیم'' (اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیم کے لیے سلامتی بن جا، 21:67)۔ اللہ جانے خدا اور مردِ خدا ابراہیمؑ کے

درمیان کیا طے پایا تھا، آگ خود ہی پھولوں میں بدل گئی تھی یا اوپر سے موسلا دھار بارش برسی تھی۔ ہمارے مطلب کی بات تو اتنی ہے کہ "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق"۔ اسی عشق کا دوسرا نام روحانی جواں مردی ہے۔

نمرود کی دہکائی ہوئی آگ تو ٹھنڈی ہو گئی لیکن وہ آگ ٹھنڈی نہ ہو سکی جو ابراہیمؑ کی بیوی سائرہ یا سارہ کے سینے میں دہک اٹھی تھی۔ جب ابراہیمؑ اور سارہ کے یہاں دیر تک اولاد نہ ہوئی تو سارہ کی ترغیب پر ابراہیمؑ نے سارہ کی باندی ہاجرہ سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے جو نہ صرف اپنے ماں باپ بلکہ سارہ کی آنکھ کا بھی تارا تھے۔ لیکن جب قومِ لوط کو تباہ کرنے کے لیے آنے والے فرشتوں نے راستے میں رُک کر ابراہیمؑ کو یہ خوشخبری دی کہ سارہ کے یہاں بھی اولاد ہو گی اور یوں حضرت اسحاقؑ کی ولادت ہو گئی تو سارہ کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور اسماعیلؑ کے لیے جگہ نہ رہی۔ اس طرح ابراہیمؑ کی گھریلو زندگی میں بدمزگی پیدا ہو گئی اور وہ پریشان رہنے لگے۔ انھوں نے خدا سے رہنمائی چاہی تو انھوں نے ایک خواب دیکھا، جیسے خدا کہہ رہا ہو کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دو۔ جب یہ خواب بار بار آیا تو انھوں نے بیٹے سے مشورہ کیا اور بیٹے نے روحانی جواں مردی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا، "بابا، آپ وہی کریں جو خدا چاہتا ہے، میں حاضر ہوں"۔ یہودی اور عیسائی اس بیٹے کا نام اسحاقؑ بتاتے ہیں، مسلمان مفسروں کی رائے میں وہ اسماعیلؑ ہیں۔ قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ بہرحال جب باپ بیٹا دونوں تیار ہو گئے کہ بیٹے کو ذبح کر دیا جائے تو خدا نے کہا، "ابراہیم ایسا نہ کرو، ہم نے دیکھ لیا، تم نے خواب کو حقیقت بنا دیا ہے، یہ بڑا ہی کڑا امتحان تھا جس میں تم کامیاب رہے ہو۔ البتہ بیٹے کی جانی قربانی کو ہم اس سے بھی بڑی قربانی میں بدل رہے ہیں"۔ قرآنِ کریم کے سنجیدہ طالب علم اس بڑی قربانی (ذبحِ عظیم) کو دُنبے کی قربانی نہیں سمجھتے کیونکہ اسے ہرگز ہرگز ذبحِ عظیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بیٹے کی قربانی کی جگہ دنبے کی قربانی کیونکر عظیم ٹھہر سکتی ہے؟ بڑی قربانی یہ تھی کہ ابراہیم اپنے لختِ جگر اسماعیلؑ کو اپنے سے جدا کر کے فلسطین سے مکّہ لے جائیں اور وہاں خانۂ خدا، کعبہ، تعمیر کر کے انھیں وہاں آباد کر دیں اور جیتے جی اُن سے دور ہو جائیں۔

ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی زندگی کا یہ عجیب و غریب اور ایک سطح پر پُرہیبت واقعہ جہاں ایک عظیم باپ اور ایک عظیم بیٹے کی روحانی جواں مردی کی ناقابلِ فراموش مثال ہے وہاں خدا نے ابراہیمؑ کو اپنے بڑھاپے کے سہارے کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے سے روک کر تمام خدا پرستوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے "انسانی قربانی" سے منع کر دیا۔ تاریخِ انسانیت میں کتنے ہی معاشروں میں انسانی قربانی کی روایت موجود تھی۔ سمندروں کی طغیانی روکنے اور دریاؤں میں طغیانی لانے کے لیے ہی نہیں، ستی کے طور پر اور دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے بھی انسانی قربانی عام تھی۔ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی روحانی جواں مردی نے انسان کے شعور پر ایسا گہرا اثر چھوڑا کہ اس کے صدقے آہستہ آہستہ انسانی قربانی کی رسم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

لیکن عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔ اب یہ قربانی قوم، ملک، سلطنت کے نام پر جنگوں میں اپنی اور مخالفوں کی جواں سال اولاد کو ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں قتل کر کے اور کروا کے جاری رکھی جا رہی ہے۔ اس کی ایک

Marfat.com

اور شکل خود کش حملوں میں ظاہر ہورہی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انسانی قربانی کی شکل کوئی بھی ہو، ننادے فیصد مرتے صرف نوجوان ہیں۔ جنگوں میں بوڑھے حکمران اور جرنیل اکثر و بیشتر بچ جاتے ہیں مگر لاکھوں نوجوان موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ بم باندھ کر جاتے ہیں تو نوجوان، مگر وہ بوڑھے مُلا جوانھیں خدا کے نام پر خدا کی بے گناہ مخلوق کے پرخچے اڑانے بھیجتے ہیں، حلوہ کھا کر ڈکار مارتے رہتے ہیں۔ جب بوڑھے لوگ جوانوں کو موت کے مُنہ میں بھیجتے ہیں تو یہ کہاوت حقیقت بن جاتی ہے: چڑھ جا بیٹا سُولی پر، رام بھلی کرے گا۔

یوسفؑ اور برادرانِ یوسفؑ

حضرت یوسفؑ تاریخِ انسانیت میں پہلے اہم ترین نفسیات دان اور ماہر اقتصادیات تھے۔ فرعونِ وقت کے اس خواب کی صحیح صحیح تعبیر کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی جس میں سات ہری بھری گائیوں (cows) کو سات سوکھی سڑی گائیں کھا جاتی ہیں۔ جب فرعونِ مصر کا دل اپنے خواب کے بارے میں یوسفؑ کی اس تعبیر سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ پہلے سات سال تک فصلیں بہت اچھی ہونگی اور اگلے سات سال تک زبردست قحط پڑے گا تو آپؑ یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ پہلے سات سال کے دوران بڑے بڑے گودام بنا کر آبادی کی ضرورت سے زائد غلہ محفوظ کر لیا جائے اور اگلے سات سال کے دوران ایک مؤثر راشننگ سسٹم کے تحت یہ غلہ نہ صرف مصر بلکہ آس پاس کے قحط زدہ علاقوں کے لوگوں میں تقسیم کیا جاتا رہے۔ یوسفؑ کے خوبصورت مُنہ سے اقتصادی منصوبہ بندی کا یہ تیر بہدف نسخہ سن کر فرعون کا اپنا مُنہ لٹک جاتا ہے اور وہ یوسفؑ سے پوچھتا ہے، ''بھلے آدمی، اس ''چودہ سالہ اقتصادی منصوبے'' پر عملدرآمد کیسے ہوگا؟ جو کچھ تم بتا رہے ہو ایسا تو نہ کبھی سنا نہ دیکھا، پھر اس عجیب وغریب منصوبے کو کون پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا کیونکہ تم یہ بھی بتا رہے ہو کہ چودھویں سال کے اختتام پر گوداموں میں اتنا غلہ باقی رہ جانا چاہیے کہ جب بالآخر بارشیں ہوں تو وہ غلہ بیج کے طور پر استعمال ہو سکے''؟

اس موقع پر یوسفؑ نے جو جواب دیا وہ تاریخِ انسانی کی ایک ایسی شہ سرخی ہے جو اَبد تک روحانی جواں مردوں کا دل گرماتی رہے گی۔ آپؑ نے یہ کہہ کر چُپ نہیں سادھ لی کہ میں نے تمھیں نسخہ بتا دیا ہے، اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تمھارا کام ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ آپؑ نے جو جواب دیا، قرآنِ حکیم نے اسے ان الفاظ میں تاریخِ انسانیت کی پیشانی پر لکھ دیا ہے: قَالَ اجْعَلْنِی علیٰ خزآئنِ الارضِ اِنّی حفیظ'' علیم (تم مجھے زمین کے خزانوں پر مامور کردو کیونکہ میں ایسا صاحبِ علم ہوں جو حفیظ و امین بھی ہے، 12:55)۔

فلسفیوں کے فلسفی، افلاطون سے لے کر ہمارے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک فلسفے اور فلسفۂ مذہب کے سنجیدہ طالب علم یہ بحث کرتے چلے آئے ہیں کہ حکمرانی کس کا حق ہے اور کیا مردانِ خدا کے لیے مناسب ہے کہ وہ عہدوں کے امیدوار ہوں۔ یوسفؑ کی روحانی جواں مردی نے اس سوال کا شافی جواب پیش کر دیا تھا جسے لوگ مختلف وجوہ سے نظرانداز کرتے رہے ہیں۔ مردِ خدا کے لیے ''حکمرانی'' ذاتی اغراض کے لیے نہیں ہوتی بلکہ خلقِ خدا کی خاطر ایک ''ذمہ داری'' کے

Marfat.com

بطور ہوتی ہے۔ اگر کسی نے حکمرانی عمرؓ بن خطاب اور علیؓ ابن ابی طالب کی طرح کرنی ہے تو وہ خلقِ خدا کے لیے کتنی ہی مبارک ہو خود ان کے اپنے لیے پھولوں کی نہیں، کانٹوں کی سیج ہوتی ہے۔ اگر حکمرانی اتنی ہی گھٹیا شے ہوتی تو اللہ کے دو برگزیدہ پیغمبر داؤدؑ اور سلیمانؑ بادشاہت کو ہاتھ نہ لگاتے اور رسولؐ خدا ایک ریاست کی بنیاد رکھ کر اس کے اوّلیں سربراہ نہ بنتے۔ خلفائے راشدہ سے بہتر کون مسلمان تھا؟ ان میں سے تو کسی ایک نے بھی اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا تھا۔ یوسفؑ پر آفرین جنھوں نے خلقِ خدا کی بھلائی کی خاطر نہ صرف ایک عہدہ قبول کیا بلکہ مُنہ سے مانگ لیا۔

یوسفؑ نے نہ صرف یہ ذمہ داری مُنہ سے مانگ کر اختیار کر لی، انھوں نے اسے کمال فراست اور دیانت داری سے انجام بھی دیا۔ روحانی جواں مردی کا یہ واقعہ اپنی جگہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو اس کی وجہ سے آپؑ کی زندگی کے دو اور نہایت اہم واقعے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ ایک واقعہ فرعونِ مصر کے خواب کی تعبیر اور اس پر عملدر آمد سے پہلے اور دوسرا اس کے بعد کے عرصے سے تعلق رکھتا ہے۔

جب برادرانِ یوسف نے آپؑ کو جنگل میں ایک کنویں کے اندر پھینک دیا تو حُسنِ اتفاق سے ایک قافلہ اُدھر سے گزرا جسے اس کنویں سے پانی حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی اور یوں یوسفؑ کو کنویں سے نکال کر مصر کے ایک بازار میں ایک حسین وجمیل غلام کے طور پر بکنے کے لیے پیش کر دیا گیا۔ حکمتِ خداوندی سے آپؑ کو اس علاقے کے گورنر نے جسے عزیز کہا جاتا تھا، خرید لیا اور آپؑ کے نیک اطوار سے متاثر ہو کر وہ آپؑ سے اپنے بیٹے جیسا سلوک کرنے لگا۔ لیکن عزیز کی بیوی (جسے ہم زُلیخا کے نام سے جانتے ہیں) آپؑ کے نیک اطوار سے زیادہ آپؑ کے حسن وجمال پر مرمٹی۔ اس نے آپؑ کو گناہ پر آمادہ کرنا چاہا لیکن آپؑ اپنے مصری مالک سے زیادہ کون ومکاں کے مالک خدائے واحد سے ڈرتے ہوئے اس کی جانب مائل نہ ہوئے۔

ایک روز تنہائی پا کر اُس بی بی نے دروازے بند کر کے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ یوسفؑ کو دامن چھڑا کر بھاگنا پڑ گیا۔ اس کھینچا تانی میں آپؑ کی قمیص پھٹ گئی لیکن جب محل کے عملے نے یوسفؑ کو دروازہ کھول کر پریشانی کے عالم میں باہر بھاگتے دیکھا تو مُشک کی طرح زُلیخا کا عشق بھی چھپا نہ رہ سکا۔ بے شک عزیزِ مصر پر یوسفؑ کی بے گناہی اس بات سے ثابت ہو گئی تھی کہ آپؑ کی قمیص آگے سے نہیں، پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جب آپؑ زُلیخا کی جسارتوں سے بچنے کے لیے اس سے دور بھاگ رہے تھے تو آپؑ کا پیچھا کرتے ہوئے اس کا ہاتھ آپؑ کی قمیص پر پڑ گیا اور وہ پیچھے سے پھٹ گئی تھی۔ لیکن بی بی کا اصرار تھا کہ دست درازی یوسفؑ نے کی ہے۔ کہاں ایک غلام اور کہاں گورنر صاحب کی بی بی! صاحب، بی بی اور غلام کی آویزش میں نزلہ بر عضوِ ضعیف ہی گرنا تھا چنانچہ یوسفؑ کو جرمِ بے گناہی میں جیل خانے بھیج دیا گیا۔ اس پاک باز جوانِ رعنا کی روحانی جواں مردی دیکھیے کہ اگر آپؑ زلیخا کو ناراض کرنے کے بجائے خود بھی شادکام ہوتے اور اسے بھی شادکام کرتے تو غالباً راوی آپؑ کے لیے چین ہی چین لکھتا رہتا لیکن لنگوٹ کے پکے اس مردِ خدا نے کہا، ''بے شک نفس تو برائی کی جانب راغب کرتا ہی ہے لیکن جس پر خدا کی مہربانی ہو وہ اس کی چالوں میں

Marfat.com

نہیں آتا''۔ یوسفؑ کی یہ روحانی جواں مردی دو اعتبار سے یادگار رہے گی۔ اول تو آپؑ جوان جہان ہوتے ہوئے اور گناہ کا پورا پورا سامان اور پوری پوری سہولت ہوتے ہوئے گناہ کے مرتکب نہ ہوئے، دوسرے یہ واقعہ ہر اُس گناہ گار کے خلاف ایک ناقابلِ تردید دلیل بن گیا جو کبھی اپنی جوانی اور کبھی دوسروں کی ترغیب کو موردِ الزام ٹھہرا کر زلیخا کی طرح معصوم بننے کی کوشش کرتا ہے۔

ایک اہم ترین ذمہ داری کو قبول کر کے اسے پوری طرح نباہنے اور اپنے دامنِ عصمت کو پاک رکھنے کے علاوہ یوسفؑ کی روحانی جواں مردی کا تیسرا اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ جب فرعون کے خواب کے عین مطابق مصر اور آس پاس کے ملکوں میں زبردست قحط پڑا اور اس وقت کے کنعان اور بعد کے فلسطین میں آباد یوسفؑ کے والدِ محترم یعقوبؑ کا سارا خاندان بھی بھوکوں مرنے لگا تو برادرانِ یوسفؑ نے بھی مصر کی راہ لی کیونکہ یوسفؑ کی اقتصادی سے زیادہ روحانی منصوبہ بندی کی بدولت نہ صرف مصری عوام بلکہ اردگرد کے متاثرہ علاقوں کے عوام کو بھی وہاں سے غلہ مل جاتا تھا۔ جب گیارہ بھائیوں کی یہ پوری ٹیم یوسفؑ کے رُوبرو آئی تو آپؑ نے انھیں پہچان لیا لیکن برادرانِ یوسفؑ کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ یہ مصری شہزادہ ان کا وہی بھائی ہے جسے وہ حسد کی آگ میں جنگل کے اندر کنویں میں پھینک آئے تھے اور جس کی بابت واپس جا کر انھوں نے باپ سے، جو خدا کا برگزیدہ پیغمبر تھا، یہ جھوٹ بول دیا تھا کہ یوسفؑ کو بھیڑیے نے کھالیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں یوسفؑ کی کہانی ایک طویل سورۃ میں بیان ہوئی ہے اور خدا نے اسے ''احسن القصص'' (سب کہانیوں سے بہتر کہانی) قرار دیا ہے۔ اس کہانی کا نقطۂ عروج (Climax) یہ ہے کہ بھائیوں کی تمام تر بدسلوکی کے باوجود یوسفؑ نے خداوند کریم کا اس بات پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ آپؑ کو اپنے والدِ محترم کے بارے میں خبر مل گئی تھی کہ وہ حیات ہیں اور آپؑ کی اپنے ماں جائے بھائی ''بن یامین'' سے ملاقات ہو گئی تھی، یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْم (آج کے روز تم لوگوں پر کوئی پکڑ نہیں)۔ یوسفؑ کی یہی روحانی جواں مردی تھی جو تاریخِ انسانیت کے عظیم اور محترم ترین روحانی جواں مرد رسُولِ خدا حضرت محمدؐ کے لیے بھی مثال بن گئی۔ چنانچہ جب آپؐ نے فتحِ مکّہ کے بعد اپنے سابقہ خون کے پیاسے دشمنوں کو بلا سزا معاف کر دیا تو حرف بہ حرف وہی الفاظ استعمال کیے جو یوسفؑ نے برادرانِ یوسف کو معاف کرتے ہوئے ادا کیے تھے: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْم (12:92)۔

موسیٰؑ اور فرعون

حضرت یعقوبؑ کا ایک نام اسرائیل بھی تھا۔ توراتِ مقدس کی پہلی کتاب، پیدائش کے 32 ویں باب میں جب آپؑ کی خدا سے ملاقات ہوئی اور آپؑ کے بقول پھر بھی آپؑ کی جان بچ گئی تو خدا نے کہا، تیرا نام آئندہ سے یعقوب نہیں اسرائیل ہوگا۔ جب یوسفؑ نے بھائیوں کو معاف کر دیا تو اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو پیغام بھیجا کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کنعان (فلسطین) سے ہجرت کر کے مصر میں آبسیں۔ یوں یعقوبؑ کی آل اولاد جو اب ''بنی اسرائیل'' کہلاتی تھی مصر

Marfat.com

میں جا آباد ہوئی۔

کئی نسلیں گزر جانے پر جب بنی اسرائیل کی تعداد بے تحاشا بڑھ گئی تو مصری فرعونوں نے ان سے برابری کا سلوک کرنا ترک کر دیا اور انھیں غلاموں کا درجہ دے دیا۔ وہی بنی اسرائیل جو یوسفؑ کے عہد میں خوشی خوشی مصر آئے تھے اور ان کا باعزت استقبال ہُوا تھا اب مصریوں کی غلامی میں جان لیوا اور ذلت آمیز محنت مشقت سے تنگ آ کر واپس فلسطین جانے کے لیے ترس گئے تھے۔ یوسفؑ انھیں یہاں لائے تھے اور اب خدا نے موسیٰؑ کی ذمہ داری ٹھہرائی تھی کہ وہ انھیں یہاں سے نکالیں۔

اس دوران مصری کاہنوں نے فرعونِ وقت کو پٹی پڑھائی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو انھیں مصریوں کی غلامی سے چھڑا کر واپس فلسطین لے جائے گا۔ شاید انھوں نے یہ بات بنی اسرائیل ہی سے سن لی ہو جن کے بڑے بوڑھے انھیں اس طرح کی بشارت دیتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مصری کارندے بنی اسرائیل کے گھر گھر کی تلاشی لیتے رہتے اور ان کے یہاں پیدا ہونے والے ہر نر بچے کو قتل کر ڈالتے۔ موسیٰؑ پیدا ہوئے تو آپؑ کی والدہ خوفزدہ رہنے لگیں کہ آج نہیں تو کل، آپؑ کو بھی بے دردی سے ذبح کر دیا جائے گا۔

خدا نے اہلِ ایمان سے خود کہہ رکھا ہے کہ تم خدا کے دشمنوں کو اپنی چال چلنے دو پھر ہم بھی اپنی چال چلیں گے اور ہم تو سب چالبازوں سے بڑے چالباز ہیں۔ (ناراض تو نہیں ہو گئے آپ؟) خدا نے چالباز کے لیے ماکر کا لفظ استعمال کیا ہے جو مکار کے مقابلے میں مبالغے کا صیغہ ہے یعنی زیادہ مکار۔ اَنا خَیرُ الْمَاکِرِین ۔ تو یوں کہہ لیتے ہیں کہ فرعون نے یہ چال چلی کہ بنی اسرائیل کے کسی نومولود نر بچے کو زندہ ہی نہ چھوڑا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن خدا نے اس سے بھی بڑی چال چلی کہ بنی اسرائیل کے نجات دہندہ کو خود فرعون کی گود ہی میں پالا جائے۔ چنانچہ خدا نے موسیٰؑ کی والدہ سے کہا، ''تم اپنے بچے کو ایک صندوقچے میں رکھ کر دریا (نیل) میں بہا دو، دریا اسے اس مقام تک لے جائے گا جہاں میرے اور اس کے دشمن اسے پا کر اپنا لیں گے''۔

اس محترم خاتون نے ایسے ہی کیا۔ موسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کا یہ واقعہ جہاں آپؑ کی والدہ صاحبہ کی روحانی جواں مردی یا حوصلہ مندی کی روشن مثال ہے وہاں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب عام سے عام انسان بھی خدا کے کسی واضح حکم کو پورے ایمان سے بجا لاتا ہے تو تمام دانشمندوں سے عظیم تر دانشمند اور تمام طاقتوروں سے عظیم تر طاقتور خدا اپنے بے پناہ وسائل اور بے شمار ذرائع سے اس کی پوری پوری مدد فرماتا ہے۔

یوسفؑ کو کنویں میں پھینک دیا گیا تھا لیکن خدا نے انھیں مصر کا ایک معزز ترین منصب دار بنا دیا۔ موسیٰؑ کو دریا میں بہا دیا گیا تھا لیکن خدا نے انھیں فرعون کے محلات میں نشوونما دی۔ ان دونوں پیغمبروں کو مصر میں شہزادوں کا مقام حاصل تھا۔ یوسفؑ نے حیاداری، برداشت اور درگزر کے حوالے سے روحانی جواں مردی کا ثبوت دیا۔ موسیٰؑ نے شہزادگی پر لات مار کر، اپنی غلام قوم کا ترجمان بن کر، اور جب خدا نے انھیں بنی اسرائیل کی نجات کا مشن دے دیا تو اس کی تکمیل

Marfat.com

کے لیے تن من کی ہر صلاحیت صرف کر کے روحانی جواں مردی کے اعلیٰ تر معیار قائم کر دیے۔

عیسیٰؑ ابن مریم

جب موسیٰؑ کی قوم کو فلسطین میں آباد ہوئے کئی نسلیں گزر گئیں تو ایک یہودی قبیلے، آلِ عمران کی ایک خاتون نے خدا سے دعا کی کہ اگر تو مجھے بیٹا عطا کر دے تو میں اسے تیرے لیے وقف کر دوں گی۔ خدا بھی مرضی کا مالک ہے اس نے بیٹے کے بجائے اسے بیٹی عطا کر دی۔ خاتون نے کمال سادہ لوحی سے کہا، یارب! اب کیا ہوگا، میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے؟ جیسے خدا کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے پیٹ میں بیٹا تھا یا بیٹی۔ بہرحال اس بھلی مانس نے یہ کہہ کر اپنا عہد پورا کر دیا کہ ''میں جانتی ہوں کہ لڑکی، لڑکے کے برابر تو نہیں ہوتی لیکن میرے رب! میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے، بس تو اسی کو قبول فرمالے''۔ خدا نے مریم کو بخوشی قبول کر لیا جو اس حقیقت کا اعلان تھا کہ خدا کے نزدیک بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں۔ خدا نے حضرت زکریاؑ کو مریم کا سرپرست مقرر کر دیا۔ پھر وہ وقت آیا جب فرشتوں نے آ کر مریم سے کہا، ''خدا نے تجھے برگزیدہ بنایا ہے اور پاکیزگی عطا کی ہے اور دنیا کی تمام عورتوں پر ترجیح دے کر اپنے مقاصد کے لیے چن لیا ہے۔ خدا تجھے اپنے ایک ''کلمے'' کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح ابن مریم ہوگا اور وہ دنیا و آخرت میں معزز ہوگا اور خدا کے قریبی بندوں میں شمار ہوگا۔ وہ پنگھوڑے کی عمر سے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک لوگوں سے ''ہم کلام'' ہوگا اور وہ ایک نیکوکار جواں مرد ہوگا''۔

یہ سن کر مریم نے کہا، ''پروردگار، میرے ہاں بچہ کیونکر پیدا ہوگا۔ مجھے تو کسی مرد نے اس نیت سے ہاتھ بھی نہیں لگایا''۔ خدا نے جواب دیا، ''اس کے باوجود تمھارے ہاں بچہ پیدا ہوگا، کیونکہ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جب وہ کسی بات کا ارادہ کر لیتا ہے تو وہ بس اتنا کہہ دیتا ہے، ''ہوجا'' اور وہ بات ہو جاتی ہے۔ تمھارا بیٹا بنی اسرائیل کی جانب خدا کا رسول ہوگا اور انھیں کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا''۔

عیسیٰؑ ابن مریم بنی اسرائیل کے لیے خدا کی کئی نشانیاں لے کر آئے۔ وہ گندھی ہوئی مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ خدا کے حکم سے جیتا جاگتا پرندہ بن جاتا تھا۔ اسی طرح وہ مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا بخش دیتے اور مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ یہاں تک تو یہودی ملائیت نے آپؑ کو مارے باندھے برداشت کیا کیونکہ ان معجزات کی وجہ سے عیسیٰؑ عوام میں بے حد مقبول تھے لیکن جب آپؑ نے خلقِ خدا کو بھوکوں مارنے والے ذخیرہ اندوزوں کی بابت بتانا شروع کیا کہ انھوں نے گوداموں میں کتنا غلہ چھپا رکھا ہے تاکہ مہنگے داموں بیچ سکیں تو وہ آپؑ کے مخالف ہو گئے۔ اسی طرح جب آپؑ عوام کو حرام اور حلال کی جکڑ بندیوں میں پھنسانے والے یہودی رُحبان (مُلّاؤں Rabbis) کا کچا چٹھا کھولنے لگے جنھوں نے مفاد پرستوں کے ساتھ مل کر بے شمار ایسی چیزیں ازخود حرام قرار دے دی تھیں جنھیں خدا نے حلال ٹھہرایا تھا تو ملائیت کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ یوں ہمیشہ کی طرح ساہوکار اور مُلّا نے

Marfat.com

ہی بھگت سے وقت کے پیغمبر کے خلاف مشترکہ محاذ بنالیا۔

عیسیٰ پر واضح ہوگیا کہ اب ساہوکار اور مُلّا انھیں چھوڑیں گے نہیں اور رومی حکمرانوں کو کسی نہ کسی بہانے آمادہ کریں گے کہ وہ آپؑ کو سنگین مجرموں کی طرح پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں۔ اس نازک موقع پر آپؑ نے اپنے اردگرد کے لوگوں سے پوچھا کہ خدا کی راہ میں کون میرا ساتھ دے گا تو آپؑ کے بارہ حواریوں (صحابیوں، انصار، شاگردوں) نے مُنہ بھر کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ دیں گے لیکن جب یہودی ملاؤں نے نہایت شدومد سے اصرار کیا کہ آپؑ نہ صرف یہودی شریعت بلکہ قیصرِ روم (Roman Caesar) کے باغی ہیں کیونکہ آپ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر رکھا ہے اور فلسطین کے رومن گورنر نے بادلِ ناخواستہ آپ کو پھانسی کی سزا سنادی تو یہ حواری تتر بتر ہو گئے۔

عیسیٰ تختۂ دار پر لٹکے ہوئے ہیں جنھیں رومن قانون کے مطابق پھانسی سے پہلے اندھادھند کوڑے مار مار کر ادھ موا کیا جا چکا ہے مگر اس عظیم مردِ خدا کی روحانی جواں مردی ملاحظہ کیجیے کہ گو وہ خدا سے یہ ضرور کہتے ہیں کہ "اے میرے رب، اے میرے رب! تو نے مجھے کیوں اکیلا چھوڑ دیا"؟ (اِیلی، اِیلی! لما سبقتنی) لیکن اپنے دشمن یہودی ملاؤں، ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے عوام، اور کوڑے مارنے اور صلیب پر لٹکانے والے جلادوں کے بارے میں خدا سے یہی سفارش کرتے ہیں کہ وہ انھیں معاف فرمادے "کیونکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔

ہماری آج کی بدقسمت دنیا میں مسیحیت اور اسلام کے پیروکاروں کے درمیان ایک طویل عرصے سے نفرت آمیز کھینچا تانی جاری ہے۔ کروسیڈوں سے لے کر امریکی حکمرانوں کی کوتاہ اندیشی تک اسلام کو شک کی نظر سے دیکھا گیا، جس کی تازہ ترین شکل امریکہ کی افغانستان پر بمباری، عراق پر قبضہ اور ایران اور شام کو دھمکیوں کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ مسلمان حکومتوں کی بے بسی اور مسلمان قیادتوں کی بے حسی نے حساس مسلمان افراد اور گروہوں کو خود کُش حملوں کی صورت میں جوابی کارروائی پر مجبور کر رکھا ہے۔ یہ کارروائیاں تمام تر جانثاری کے باوجود مسلمانوں کے لیے فائدہ بخش ہونے کے بجائے الٹا نقصان دِہ ہیں۔ پھر ان حملوں میں مارے جانے والے عام لوگ پوری طرح بے گناہ ہوتے ہیں۔ اور ایک بھی بے گناہ شخص کا قتل قرآنِ حکیم کے مطابق ساری انسانیت کے قتل کے مترادف ہوتا ہے۔ دوسری طرف اگرچہ امریکی حکمران اور ان کے حواری پوپلے مُنہ سے یہ کہتے جاتے ہیں کہ ہماری جنگ اسلام کے خلاف نہیں، مسلمان تشدد پسندوں کے خلاف ہے لیکن اس بات کا پورا پورا خدشہ موجود ہے کہ سیموئل ہَن ٹِنگ ٹَن (Samuel Huntington) کی پیشگوئی پوری ہو اور یہ جنگ مسیحیت اور اسلام کی جنگ بن جائے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ تاریخِ انسانیت کی دو عظیم اور برگزیدہ ہستیوں، عیسیٰ اور محمدؐ اور دو عظیم مذاہب، مسیحیت اور اسلام کے صحیح العقیدہ پیروکار ایک لحظہ رُک کر کھلی آنکھ سے دیکھیں کہ یہ ہستیاں اور مذاہب اپنی اصلیت میں کتنے قریب ہیں اور اس بدقسمتی کا کوئی جواز نہیں کہ محبت اور رحمت کا کلمہ پڑھنے والے مسیحی اور رحمۃ للعالمین حضرت محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والے مسلمان آپس میں دست و گریبان ہوں۔

یہودی اور مسلمان تو صدیوں تک باہم امن و امان سے رہتے آئے ہیں۔ مسلمانوں کے زرّیں عہدوں میں

Marfat.com

یہودیوں پر کبھی اس طرح کا ظلم وستم نہیں کیا گیا جیسا مسیحیوں کے دورِ عروج میں قریب قریب ساری مسیحی دنیا میں روا رکھا گیا۔ اگر آج اسرائیلیوں اور فلسطینیوں میں کوئی باعزت اور قابلِ عمل سمجھوتا ہو جائے تو دنیا دیکھے گی کہ خدائے واحد کو ماننے والے یہودی اور مسلمان ایک مرتبہ پھر شیر و شکر ہو جائیں گے۔ یہودیوں کی دولت اور سازش کی صلاحیت کو جتنا بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے، ان کی تعداد پوری انسانی آبادی ہی میں نہیں، مسیحیت اور اسلام کے مقابلے میں بھی آٹے میں نمک کے برابر ہی رہے گی۔ پیروکاروں کی تعداد کے اعتبار سے آج کی دنیا کے دو سب سے بڑے مذہب مسیحیت اور اسلام ہی ہیں۔ اگر ہم دنیا میں امن چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ مسیحی اور مسلمان ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اور صحیح سے صحیح علم رکھیں۔

اس لیے آیئے، مسلمان ہونے کے ناتے ہم پہل کریں اور مسیحیت کی سب سے بنیادی دستاویزوں کے حوالے سے معلوم کریں کہ عیسیٰؑ (Jesus) یا مسیحؑ (Christ) کی بنیادی تعلیم کیا تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم عیسیٰؑ کے اپنے عہد کے فقیہوں (قانونِ شریعت کے ماہروں) اور فریسیوں (ظاہری طور سے شریعت پر سختی سے عمل کرنے والوں) سے ایک خطاب، پھر آپؑ کی زندگی کے ایک مشہور ترین واقعے: آخری شام کی روٹی (The Last Supper) کی روداد انجیلِ مقدس کے اپنے الفاظ میں بیان کریں گے اور درمیان میں آپؑ کی بیان کی ہوئی تین تمثیلوں (Parables) پر انجیلِ مقدس ہی کی روشنی میں نظر ڈالیں گے۔ قرآنِ حکیم، سیرتِ رسولؐ اور آج کے عالموں اور صوفیوں کے کردار سے واقفوں کو انجیلِ مقدس کے آئینے میں بہت اپنائیت محسوس ہوگی۔ لیجیے پہلے تو روحانی جواں مرد مسیح علیہ السلام کے لب و لہجے کا طنطنہ دیکھیے:

مسیحؑ کا فقیہوں اور فریسیوں سے خطاب

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ (اپنی کرتوتوں کے باعث) نہ تو اس میں خود داخل ہو پاتے ہو اور نہ ہی مستحق لوگوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم بیواؤں کے گھر دبا لیتے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو لمبا کرتے جاتے ہو۔ تم سزا سے بچ نہ پاؤ گے بلکہ تمھیں زیادہ سزا ہوگی۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ ایک شخص کو اپنا مرید بنانے کے لیے خشکی اور تری کا سفر کرتے ہو اور جب وہ تمھارا مرید بن جاتا ہے تو اسے ایسے غلط راستے پر ڈال لیتے ہو کہ وہ تم سے دونا جہنم کا حقدار ہو جاتا ہے۔

اے اندھے راستوں کے رہبرو! تم پر افسوس کہ تم کہتے ہو، اگر کوئی خانۂ خدا کی قسم توڑ دے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کے در و دیوار اور گنبد پر جو سونا لگا ہُوا ہے اس کی قسم کھائے تو پھر وہ یہ قسم نباہنے کا پابند ہوگا۔ (یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی خانۂ کعبہ کی قسم کھا کر توڑ دے تو کوئی بات نہیں، لیکن غلافِ کعبہ کی قسم توڑنے والا گنہگار ٹھہرے)۔

اے احمقو اور اندھو! سونا مقدس ہے یا خدا جس کے باعث یہ سونا مقدس قرار دیا گیا ہے۔ اور پھر کہتے ہو کہ اگر

Marfat.com

کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کوئی بات نہیں لیکن جو نذر اس پر چڑھائی گئی ہو، کوئی اس کی قسم کھائے تو وہ اس کا پابند ہوگا۔ اندھو! نذر بڑی ہے یا قربان گاہ جس کی وجہ سے نذر متبرک قرار دی جاتی ہے..........

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ پودینے، سونف اور زیرے پر عُشر (دسواں حصے) کی تو تمھیں بہت فکر رہتی ہے لیکن انصاف، رحم اور ایمان جیسی شریعت کی گراں قدر باتوں کو تم نے ترک کر دیا ہے۔ لازم تھا کہ تم چھوٹی بڑی ساری باتوں کی فکر کرتے لیکن اندھے رہبرو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ اپنے پیالے اور رکابی کو اوپر اوپر سے صاف کرتے ہو جبکہ ان کے اندر لوٹ اور بد دیانتی کا مال بھرا ہے۔ اے پاکبازی کے دعویدار اندھو! پہلے اپنے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرو، پھر وہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں گے۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر سے مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں۔ ان قبروں کی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریا کاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم نبیوں کی قبریں اور راستبازوں کے مقبرے بناتے اور سجاتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں اپنے باپ دادا کا ساتھ نہ دیتے۔ اس طرح تم اپنے بارے میں خود ہی گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کی اولاد ہو۔ چلو اب تم رہی سہی کسر نکال دو اور اپنے باپ دادا کے گناہوں کا پیالہ بھر دو۔

اے سانپو، اے سانپوں کی اولادو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ دعویٰ تو تم یہ کرتے ہو کہ تم اپنے باپ دادا کی طرح نبیوں کو قتل نہ کرتے لیکن اب تمھارے سامنے بھی نبی، ولی اور کاتبانِ وحی آئیں گے اور ان میں سے کچھ کو تم قتل اور مصلوب کرو گے اور کچھ کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور انھیں شہر بہ شہر پھراؤ اور ستاؤ گے تا کہ سب بے گناہوں کا خون جو آج تک زمین پر بہایا گیا ہے تمھاری گردنوں پر آجائے۔ آدمؑ کے راستباز بیٹے ہابیل سے لے کر زکریاہؑ کے بیٹے زکریاہؑ کے خون تک جسے تم نے خانۂ خدا اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا...... ان سب کا خون تمھاری گردن پر آئے گا (متی، 23واں باب)۔

روزِ محشر کا ایک نقشہ

جب حشر کا دن آئے گا اور مسیحؑ ایک جلیل القدر بادشاہ کی طرح اپنے تخت پر تشریف رکھیں گے تو وہ اپنے دائیں ہاتھ کھڑے راستبازوں سے کہیں گے، ''اے خدا کے مبارک بندو! خدا نے تمھارے لیے جو بادشاہی روزِ ازل سے قائم کر رکھی ہے اسے اپنی میراث سمجھو اور اس سے لطف اندوز ہو کیونکہ میں بھوکا تھا اور تم نے مجھے کھانا کھلایا تھا، میں پیاسا تھا اور تم نے مجھے پانی پلایا تھا، میں پردیسی تھا اور تم نے مجھے اپنے گھر میں ٹھہرایا تھا، میں ننگا تھا اور تم نے مجھے کپڑا پہنایا تھا، میں بیمار تھا

Marfat.com

اور تم نے میری عیادت کی تھی، میں قید میں تھا اور تم مجھے دلاسا دینے آئے تھے"۔

تب راستباز کہیں گے، "اے عالی مرتبت بادشاہ! ہم نے کب آپ کو بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا؟ ہم نے کب آپ کو پردیسی دیکھ کر اپنے گھر میں ٹھہرایا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ ہم کب آپ کو بیمار یا قید میں دیکھ کر آپ کے پاس آئے"؟

مسیح جواب میں فرمائیں گے، "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے اور اپنے کمزور سے کمزور اور حقیر سے حقیر بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی یہ حسنِ سلوک کیا تھا تو وہ دراصل میرے ہی ساتھ حسنِ سلوک تھا"۔

پھر مسیح بائیں طرف والے گناہ گاروں سے کہیں گے، "اے بدبختو! میرے سامنے سے ہٹ جاؤ اور اس دائمی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے چیلے چانٹوں کے لیے بھڑکائی گئی تھی کیونکہ جب میں بھوکا تھا تو تم نے مجھے کھانا نہ کھلایا تھا، میں پیاسا تھا تو تم نے مجھے پانی نہ پلایا تھا، میں پردیسی تھا تو تم نے مجھے اپنے گھر میں جگہ نہ دی تھی، میں ننگا تھا تو تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا تھا، میں بیمار اور قید تھا تو تم نے میری خبر نہ لی تھی"۔

تب گناہ گار کہیں گے، "اے عالی مرتبت بادشاہ! ہم نے کب تجھے بھوکا، پیاسا، پردیسی، ننگا، بیمار یا قید میں دیکھ کر تیری خدمت نہ کی تھی؟" اس وقت مسیح جواب میں فرمائیں گے، "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے اور اپنے کمزور سے کمزور اور حقیر سے حقیر بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی بدسلوکی کی تھی تو وہ دراصل میرے ہی ساتھ بدسلوکی تھی" (متی، 25واں باب)۔

امید ہے کہ قارئین کو انجیلِ مقدس کی اس تمثیل اور ابوسعید خدریؓ کی بیان کردہ مشہور حدیثِ قدسی میں زبردست مماثلت صاف صاف نظر آ گئی ہوگی۔ آیئے اب آگے چلتے ہیں اور مسیح کے مُنہ سے "فضول خرچ بیٹے کی واپسی" والی تمثیل سنتے ہیں:

فضول خرچ بیٹے کی واپسی

ایک شخص کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے چھوٹے نے باپ سے کہا، "بابا، تیرے مال میں سے جتنا میرے حصے آتا ہے وہ مجھے دے دے۔ باپ نے اپنا مال و متاع دونوں بیٹوں میں بانٹ دیا۔ کچھ ہی دن بعد چھوٹا بیٹا اپنا سب کچھ سمیٹ کر کسی دُور دراز کے ملک کو روانہ ہو گیا جہاں اس نے اپنی ساری پونجی بدکاری میں اڑا دی۔ جب وہ بالکل پھانک ہو گیا تو اُنھی دنوں اُس ملک میں سخت قحط پڑا اور وہ پائی پائی کا محتاج ہو گیا۔ تب اس نے وہاں کے ایک شخص کی چاکری کر لی جس نے اُسے کھیتوں میں سؤر چرانے پر لگا دیا۔ اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ ترستا تھا کہ جو خوراک سؤروں کو ملتی تھی اسی سے پیٹ بھر لے لیکن اسے اس کی بھی اجازت نہیں تھی۔ ایک روز اُس کو یاد آیا کہ میرے باپ کے تو ملازم بھی سیر ہو کر کھاتے تھے اور میں یہاں بھوکوں مر رہا ہوں۔ اس نے دل میں سوچا، "میں واپس اپنے باپ کے پاس جاؤں گا اور کہوں گا کہ میں تیرا اور خدا کا گناہ گار ہوں اور اس لائق نہیں کہ تیرا بیٹا کہلاؤں، بس تم مجھے اپنے ملازموں میں جگہ دے دو"۔ چنانچہ وہ واپس

Marfat.com

اپنے باپ کی جانب چل پڑا۔

وہ ابھی دور ہی تھا کہ اُسے دیکھ کر اُس کے باپ کو ترس آیا اور اس نے دوڑ کر بیٹے کو گلے سے لگا لیا اور چوما۔ بیٹے نے کہا، ''بابا، میں تیرا اور خدا کا گناہ گار ہوں اور اس لائق نہیں کہ تیرا بیٹا کہلاؤں''۔ مگر باپ نے اپنے ملازموں سے کہا، ''جلدی سے جلدی اچھے سے اچھا لباس نکالو اور اس کے زیب تن کرو۔ یہی نہیں، اس کے ہاتھ میں انگوٹھی اور پاؤں میں جوتی بھی پہناؤ اور ایک موٹا تازہ بچھڑا پکڑ کر ذبح کرو تا کہ ہم کھا کر خوشی منائیں کیونکہ میرا یہ بیٹا مردہ تھا لیکن زندہ ہو گیا ہے، یہ کھو گیا تھا لیکن اب مل گیا ہے''۔ چنانچہ وہ خوشی منانے لگے۔

اُس وقت اُس کا بڑا بیٹا کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ جب وہ کام سمیٹ کر گھر کے قریب آیا اور اس نے گانے بجانے اور ناچنے کی آواز سنی تو ایک ملازم کو بلا کر پوچھنے لگا، ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ملازم نے اُسے بتایا کہ تیرا بھائی واپس آ گیا ہے اور تیرے باپ نے اسے بھلا چنگا پا کر ضیافت کے لیے ایک خوب پلا ہُوا بچھڑا ذبح کرایا ہے۔ یہ سن کر بڑے بیٹے کو بہت رنج پہنچا اور وہ گھر سے باہر ہی ٹھہر گیا۔ باپ کو پتا چلا تو وہ باہر آ کر اُسے منانے لگا۔ دل برداشتہ بیٹے نے کہا، ''بابا، اتنے برسوں سے میں آپ کی خدمت کرتا آیا ہوں اور کبھی آپ کی حکم عدولی نہیں کی، میرے لیے تو آپ نے کبھی بکری کا ایک بچہ بھی ذبح نہیں کرایا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ خوشی منا لیتا۔ لیکن جونہی آپ کا یہ بیٹا آیا ہے جس نے آپ کا دیا ہُوا مال و متاع طوائفوں میں اڑا دیا ہے تو آپ نے اس کے لیے پلا ہُوا بچھڑا ذبح کرایا ہے؟''

باپ نے کہا، ''میرے پیارے بیٹے، تم تو ہمیشہ میرے پاس ہو اور جو کچھ میرا ہے وہ سب تیرا ہی تو ہے۔ لیکن اس فضول خرچ بیٹے (Prodigal Son) کی واپسی پر خوشی منانا اور شادمان ہونا مناسب تھا کیونکہ تیرا یہ بھائی مردہ تھا جو اب زندہ ہو گیا ہے، وہ کھویا ہُوا تھا اور اب مل گیا ہے'' (لوقا، 15 واں باب)۔

مسیح علیہ السلام کی اس تمثیل کی معنویت واضح کرنے کے لیے اگر ہم باپ کی جگہ خدا اور فضول خرچ بیٹے کی جگہ تائب ہو جانے والے کسی گناہ گار کو رکھ کر دیکھیں تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ خدا ہم جیسے گناہ گاروں کی توبہ کا کس درجے منتظر ہے اور اس کے نزدیک توبہ کی کتنی اہمیت ہے۔ اس تمثیل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جو شخص روحانی قدروں کو پامال کر دے اسے مُردہ سمجھنا چاہیے اور جب وہ توبہ کر لے تو گویا وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزے کے پیچھے یہ معنی بھی موجود ہوتے ہیں۔

ہمارا اصل ہمسایہ کون ہے؟

اور پھر یوں ہُوا کہ ایک عالمِ شرع (مُلّا) اٹھا اور یہ کہہ کر عیسیٰؑ کی آزمائش کرنے لگا، ''اے مرشد! میں ایسا کونسا کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پا جاؤں؟''

عیسیٰؑ نے اس نے پوچھا، ''اِس کے متعلق تورات میں کیا لکھا ہے اور اُس سے تم کیا مراد لیتے ہو؟''

عالمِ شرع نے جواب دیا، ''تورات میں تو یہ لکھا ہے کہ اگر تم ہمیشہ کی زندگی چاہتے ہو تو خدا سے اپنے سارے

Marfat.com

دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت اور اپنی ساری عقل کے ساتھ محبت رکھو اور اپنے ہمسایے سے اتنی محبت کرو جتنی تم اپنے ساتھ کرتے ہو"۔

عیسیٰ نے کہا، "تم نے بالکل ٹھیک جواب دیا ہے۔ بس تم یہی کرو جو تورات میں لکھا ہے اور لازم ہے کہ تم دائمی زندگی پا جاؤ"۔

عالمِ شرع نے اپنے آپ کو راستباز ٹھہرانے کی غرض سے عیسیٰ سے کہا، "خدا سے محبت تو میری سمجھ میں آتی ہے لیکن میرا ہمسایہ کون ہے؟"

عیسیٰ نے جواب میں یہ تمثیل بیان کی:

ایک شخص یروشلم سے یریکو (Jericho) کی طرف جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے اُسے گھیر لیا۔ انھوں نے اُسے مارا پیٹا اور کپڑے بھی اتار لیے۔ پھر وہ اسے اَدھ مُوا چھوڑ کر چل دیے۔ اتفاقاً ایک کاہن (Priest) اسی راہ سے جا رہا تھا لیکن وہ اِس زخمی شخص کو دیکھ کر کنی کترا کر آگے چل دیا۔ اسی طرح ایک یہودی پیشوا (Levite) بھی اُدھر سے گزرا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر اپنی راہ ہو لیا۔ پھر یوں ہُوا کہ علاقۂ غیر کا ایک سماری (Samaritan) سفر کے دوران اُدھر آ نکلا جو نہ تو اس کا ہم مذہب تھا اور نہ ہی اُس کی اِس زخمی شخص سے کوئی جان پہچان تھی۔ پھر بھی اُسے اِس حالت میں دیکھ کر اُس سماری کو ترس آ گیا اور اُس نے اِس کے زخموں کو شراب سے دھویا اور تیل لگا کر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد اُس نے اِسے اپنے گھوڑے پر بٹھایا اور قریب کی ایک سرائے میں لے گیا اور وہاں اِس کی خوب دیکھ بھال کی۔

دوسرے دن اُس نے کچھ رقم نکال کر سرائے کے مالک کو دی اور کہا، "دیکھو اِس زخمی شخص کی خبر گیری کرنا۔ اگر اِس پر مزید رقم خرچ کرنے کی ضرورت پڑے تو دریغ نہ کرنا، میں واپسی پر وہ بھی ادا کر دوں گا"۔

اتنا کہہ کر عیسیٰ نے عالمِ شرع سے پوچھا، "جو شخص ڈاکوؤں میں گھر گیا تھا، تمھاری دانست میں ان تینوں میں سے اُس کا حقیقی ہمسایہ کون ٹھہرے گا"؟

عالمِ شرع نے جواب دیا، "وہ غیر آدمی جس نے اُس پر رحم کیا"۔

عیسیٰ نے فرمایا، "تم بھی ایسے ہی ہمسایے بنو اور ہر ضرورت مند کی رنگ، نسل، وطنیت اور عقیدے کے فرق سے بالا ہو کر خدمت کرو" (لوقا، دسواں باب)۔

آج کی دنیا میں عیسیٰ کی یہ تمثیل ایک نسخۂ کیمیا کا مقام رکھتی ہے۔ آج ذرائع آمد و رفت اور ذرائع ابلاغ (Transportation and Communication) کے زبردست انقلاب کے باعث ہر دوسرا انسان کسی ایک ملک کے بجائے پوری دنیا کا باشندہ بن چکا ہے۔ خصوصاً امریکہ اور یورپ میں مختلف مذاہب اور نسلوں کے لوگ، مختلف ثقافتی اور لسانی ورثے کے باوجود، ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ ان حالات میں اس تمثیل کی رُوح ہی "تہذیبوں کے تصادم" کی جگہ "تہذیبوں کا ملاپ" پیدا کر سکتی ہے۔ اگر مختلف مذاہب، نسلوں، وطنوں، اور ثقافتوں کے لوگ نیک دل سماری کی طرح

Marfat.com

روحانی جواں مردی کو اپنا وتیرہ بنا لیں تو جنگ، قحط سالی، بدامنی، نسل کشی، تشدد، بیماری اور جہالت کی شکار دنیا سکھ کا سانس لے سکتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی روحانی جواں مردی پر آپؑ کی تصلیب (Crucifixion) نے جو اپنی جگہ انسانی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور دردناک باب ہے، قریب قریب ویسا ہی سایہ ڈال دیا جیسے اسلام کی رحمانیت اور امن دوستی پر اُس کی جنگی کامیابیوں نے ڈال رکھا ہے۔ عیسیٰؑ اور عیسائیت کی رُوح تک پہنچنے کے لیے شاید ''آخری شام کی روٹی'' کے دوران پیش آنے والے ایک واقعے سے بہتر کوئی مثال نہ ہو۔

آخری شام کی روٹی

''مصر میں موت سے بچاؤ کی یاد میں منائی جانے والی عید'' (Passover) سے پہلے عیسیٰؑ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ دنیا سے رخصت ہو کر خدا کے پاس جانے والے ہیں۔ وہ زندگی بھر جن لوگوں سے جیسی محبت کرتے آئے تھے، آخری دم تک ویسی ہی محبت کرتے رہے۔ اُس وقت تک شیطان آپؑ کے ایک حواری یہوداہ (Judas) کے دل میں یہ سوچ ڈال چکا تھا کہ وہ چاندی کے چند سکوں کے عوض آپؑ کو پکڑوا دے۔ جب کچھ دیر بعد آپؑ نے اپنے مریدوں سے کہا کہ آج تم میں سے ایک میرے ساتھ بے وفائی کرے گا تو گویا آپؑ کو یہوداہ کی بے وفائی کا بخوبی علم تھا۔ آپؑ کو یہ بھی علم تھا کہ خدا نے ہر چیز آپ کے اختیار میں دے دی ہے۔ یعنی آپ جو کہتے وہ ہو جاتا۔ لیکن آپؑ نے اپنا اختیار استعمال نہ کیا اور اپنی تقدیر خدا ہی کے ہاتھ میں رہنے دی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ آپؑ خدا ہی کی طرف سے آئے ہیں اور خدا ہی کی طرف جانے والے ہیں۔

''شام کی روٹی کھالی گئی تو عیسیٰؑ دسترخوان سے اٹھے۔ آپؑ نے اوپر کا لبادہ اتارا اور اپنی کمر سے ایک تولیہ باندھ لیا۔ پھر آپؑ نے ایک برتن میں پانی لیا اور باری باری اپنے مریدوں کے پاؤں دھونے شروع کر دیے۔ جب آپؑ اُن میں سے کسی کے پاؤں دھو لیتے تو اپنی کمر سے بندھے ہوئے تولیے کے ساتھ انھیں پونچھتے جاتے۔ شمعون پطرس (Simon Peter) کی باری آئی تو اس نے کہا، ''اے بزرگ و برتر آقا! کہاں میں اور کہاں آپؑ، میں تو کبھی آپؑ کو یہ نہیں کرنے دوں گا''۔ عیسیٰؑ نے اس سے کہا، ''اگر تم نے مجھے اپنے پاؤں نہ دھونے دیے تو سمجھو کہ تمھارا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں''۔ اس پر شمعون پطرس نے عاجزی سے جواب دیا، ''اے بزرگ و برتر آقا! اگر یہ بات ہے تو نہ صرف میرے پاؤں بلکہ میرے ہاتھ اور میرا سر بھی دھوڈالیے''۔ عیسیٰؑ نے محبت سے کہا، ''جو پورا غُسل کر چکا ہو اُس کے پاؤں کے سوا اور کچھ بھی دھونے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ تو سراسر پاک ہو چکا ہوتا ہے۔ تم لوگ بھی پاک ہو، لیکن سب کے سب نہیں''۔

آپؑ نے یہ آخری بات اس لیے کہی کیونکہ آپ جانتے تھے کہ انھی میں یہوداہ بھی بیٹھا ہے جو آپؑ کے ساتھ بے وفائی کر کے آپؑ کو پکڑوانے والا ہے۔ چنانچہ جب آپؑ سب مریدوں کے پاؤں دھو چکے اور آپ نے دوبارہ پورے کپڑے پہن لیے تو آپؑ نے انھیں مخاطب کر کے پوچھا، ''کیا تم جانتے ہو کہ میں نے اس وقت تمھارے ساتھ کیا کیا ہے؟

تم بجا طور پر مجھے اپنا مرشد اور آقا کہتے ہو، جب تمھارے مرشد اور تمھارے آقا نے تمھارے پاؤں دھوئے ہیں تو تم پر بھی فرض ہے کہ ایک دوسرے کے پاؤں دھویا کرو۔ میں نے تمھارے سامنے ایک نمونہ، ایک مثال پیش کر دی ہے۔ بس جیسا میں نے تمھارے ساتھ کیا ہے، تم بھی ایسا ہی ایک دوسرے کے ساتھ کیا کرو'' (یوحنا، 13واں باب)۔

روحانی جواں مردی کی کیسی شاندار مثال ہے جو عیسیٰؑ نے قائم کر دی۔ قیادت کا کیسا بلند معیار ہے جو عیسیٰؑ نے آنے والی نسلوں کے لیے مقرر کر دیا۔ ارد گرد نظر دوڑائیے، ہر بڑا قائد، ہر بڑا منصب دار، ہر بڑا عالم، ہر بڑا ادیب، ہر بڑا کاروباری اس فکر میں مبتلا نظر آئے گا کہ دوسروں کی عزت افزائی کے بجائے ان کی تذلیل اور کردار کشی کرتا رہے تا کہ خود ان سے بہتر اور بڑا نظر آئے۔

کہنے کو تو یہ فرعونِ موسیٰ کی روایت تھی جو اس ڈر سے کہ بنی اسرائیل کا کوئی جواں مرد اُس کی بادشاہت نہ ختم کر دے ان کا ہر نوزائیدہ بچہ قتل کروا ڈالتا تھا لیکن بغور دیکھیں تو اونچی کرسیوں اور بلند مقامات پر فائز لوگ ہر اُس نوخیز، ہونہار اور باصلاحیت فرد کا قد چھوٹا کرنے کی فکر میں پیچ و تاب کھاتے دکھائی دیں گے جن میں ان کی جگہ لینے کا امکان موجود ہو۔ جس طرح ناگن اپنے بچے کھا جاتی ہے اسی طرح اونچی کرسیوں والے اپنے باصلاحیت پیروکاروں کو کھا جاتے ہیں۔ ادبی ذوق رکھنے والے قارئین کو ابسن کا مشہور کھیل The Master Builder یاد آ گیا ہو گا۔

آئیے ذرا غور کریں کہ جو کام عیسیٰؑ نے اپنے مریدوں کے پاؤں دھو کر کیا، کیا اُس سے آپؑ اپنے مقام سے گر گئے یا آپ کا مقام پہلے سے بھی بلند ہو گیا؟ اگر بات واضح نہ ہوئی ہو تو اس سوال کا جواب عیسیٰؑ ہی سے پوچھ لیتے ہیں۔ آپؑ نے یہ مسئلہ ان الفاظ میں حل کر دیا تھا، ''اگر کوئی مالک اپنے نوکر سے حُسنِ سلوک کرے تو نوکر مالک سے برتر اور مالک نوکر سے کمتر نہیں ہو جاتا، بلکہ مالک کا درجہ مزید بڑھ جاتا ہے''۔

تاریخِ انسانیت کے عظیم ترین روحانی جواں مرد، محمدؐ رسول اللہ

جس طرح خداوند کریم کے کتنے ہی خوبصورت نام (اسمائے حسنیٰ) ہیں اسی طرح رسولِؐ خدا کے بھی بہت سے مبارک نام مسلمانوں کی نوکِ زبان پر رہتے ہیں۔ ویسے تو تمام تر ''حمد'' (تعریف) خدا ہی کے لیے ہے (الحمد للہ) لیکن ''حمد'' ہی وہ جڑ ہے جس سے محمد، احمد، حامد، محمود، حمید اور حماد جیسے کئی نام بنے ہیں جن سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے۔

اہلِ سنت والجماعت اور ان میں خصوصاً بریلوی کہلانے والے مسلمانوں کی مذہبی تقریبوں میں ''درودِ تاج'' پڑھا جاتا ہے جس میں بڑی خوبصورتی سے آپؐ کے بیسیوں نام اور صفات ایک آہنگ (Rhythm) میں پروئے گئے ہیں۔ لیکن آپ کی ایک صفت ایسی ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت یاد رہنی چاہیے۔ ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ رسولِ خدا ''انسان کامل تھے اور ہمیشہ ہمیشہ انسان کامل'' (The Perfect Man) رہیں گے۔ انسانوں میں نہ تو پہلے کوئی آپ کے مقامِ محمود'' کو پہنچ پایا تھا اور نہ آئندہ ہی پہنچ پائے گا۔ لیکن خدا نے آپ کی ایک صفت کو باقی تمام صفات سے فوقیت دے رکھی ہے۔ اگر ہم آپ کو سیکڑوں

Marfat.com

مبارک ناموں اور بیسیوں عظیم صفات سے یاد کریں اور وہ ایک نام اور صفت بھول جائیں جو خدا نے آپؐ کے لیے مخصوص کی ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ہم نے آپ کو یاد کرنے کا حق ادا نہیں کیا۔

وہ کون سی صفت ہے جو خدا نے رسولِ خدا کے لیے مخصوص کی ہے؟

قرآنِ حکیم کی سورہ الانبیاء کی 107 ویں آیت ملاحظہ فرمائیے: وَمَا اَرسَلنٰکَ اِلَّا رَحمَةً لِّلعٰلَمِین (اے محمدؐ) ہم نے تمھیں صرف اور صرف، "دنیا جہان کے لیے رحمت" بنا کر بھیجا ہے۔

اگر انسانِ کامل ہونے کے ناتے ہم آپ کو بہترین مدبّر، بہترین حکمران، بہترین سپہ سالار، بہترین خاوند، بہترین باپ، بہترین رہنما، بہترین مُرشد، بہترین امین...... سمجھیں اور اپنی زندگیوں میں آپؐ کی پیروی کرنے کی دُعا اور کوشش کریں لیکن اس "جانِ رحمتؐ" کی اُس رحم دلی، شفقت، محبت، کرم نوازی، بندہ پروری، درگزر، برداشت اور چشم پوشی کو بھول جائیں جو آپ نے نہ صرف اپنوں بلکہ غیروں کے لیے بھی روا رکھی تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ہم نے آپؐ سے نہ محبت کی اور نہ وفا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر انفرادی سطح پر ہر مسلمان کی ذاتی زندگی اور اجتماعی سطح پر ہر مسلمان قیادت، جماعت، حکومت اور مملکت کی قومی اور بین الاقوامی پالیسی میں "رحمت" کا عنصر نمایاں نہ ہو تو ان کا نہ اسلام سے کوئی واسطہ ہوگا اور نہ رحمة للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق۔

لیکن رحمت کا جواں مردی سے کیا رشتہ ہے؟

جواں مردی سے تو عموماً کسی ایسے شخص کا نقشہ سامنے آتا ہے جس کی شان میں گستاخی ہو جائے تو وہ گستاخ کو دو تھپڑ رسید کر دے۔ بظاہر جواں مردی کا رحمت کے ساتھ جوڑ کچھ ٹھیک بیٹھتا دکھائی نہیں دیتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے سامنے محمدؐ کی نہیں عیسیٰؑ کی تعلیم رکھی جا رہی ہے جنھوں نے فرمایا تھا کہ کوئی تمھارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اس کے آگے دوسرا گال بھی کر دو۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ اوّل تو خدا کے ہر پیغمبر نے بنیادی طور پر ایک ہی طرح کی تعلیم دی ہے۔ دوسرے آیئے ذرا قرآنِ حکیم سے پوچھتے ہیں کہ اس مسئلے میں خود خداوند کریم کی کیا رائے ہے؟ سورہ الشوریٰ کی 36 ویں سے 43 ویں آیت تک کے الفاظ اس سلسلے میں قولِ فیصل کا درجہ رکھتے ہیں:

"(اے انسانو) جو کچھ بھی تمھیں اس دنیا میں دیا گیا ہے وہ چند روزہ زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ اس سے بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بڑے بڑے (کبیرہ) گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو معافی اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے رب کا حکم بجا لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق عطا کیا ہے اس میں سے (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ اگر ان پر ظلم و زیادتی کی جائے تو ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ بے شک برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے لیکن جو کوئی معاف کر دے اور صلح صفائی سے کام لے تو پھر اس کا اجر خدا کے ذمے ہے۔ خدا ظلم و زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو لوگ ظلم و زیادتی

Marfat.com

ہونے پر بدلہ لیں انھیں اس پر ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو عوام پر ظلم ڈھاتے اور دنیا میں تباہی اور بدامنی پھیلاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور معاف کر دے تو یہ بہت بڑی جواں مردی کا کام ہے"۔

قرآنِ حکیم کی یہ مُنہ بولتی عبارت صاف صاف کہہ رہی ہے کہ انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ ادلے کا بدلہ لیا جائے لیکن اصلاح کی خاطر فی سبیل اللہ (کسی دُنیوی اجر کے بغیر) معاف کر دینا بدلہ لینے سے کہیں بہتر ہے کیونکہ بدلہ لے کر دُنیا میں (فوری طور پر) جو کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا، معاف کر دینے پر خدا اس سے کہیں بہتر اور پائیدار اجر عطا کرتا ہے۔

یہاں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ "معاف کرنے" کی تھوڑی وضاحت کر دی جائے۔ اگر کوئی شخص ہم پر ظلم کرے تو ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اتنے کمزور اور بزدل ہوں کہ اپنا دفاع ہی نہ کر سکیں، یہ صبر کا مقام ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم بدلہ لے سکتے ہوں اور ہم لے لیں۔ یہ جواں مردی کا مقام ہے۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہمارا پلہ ظلم کرنے والے سے بھاری ہو اور ہم اُسے ناکوں چنے چبوا سکتے ہوں لیکن پھر بھی اصلاح کی خاطر اُسے معاف کر دیں۔ یہ رُوحانی جواں مردی کا مقام ہے۔ قرآنِ حکیم اس مقام کو عزم الامور (بڑی اولوالعزمی) کا نام دیتا ہے۔

آیئے اب تاریخ انسانیت کے عظیم ترین روحانی جواں مرد، محمدؐ رسول اللہ کی زندگی کے چند ایسے واقعات یاد کریں جن کی مدد سے روحانی جواں مردی کا وہ تصور مزید واضح ہو جائے جس کی جانب قرآنِ حکیم کی مندرجہ بالا آیات میں ہماری توجہ دلائی گئی ہے۔

کوڑا پھینکنے والی خاتون

جب رسُولِ خدا نے اوّل اوّل مکّے میں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی اور انھیں اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کے بجائے زمین و آسماں کی تمام تر مخلوقات کے خالق و مالک خدا کی پرستش کے لیے پکارا تو صدیوں کے عادی بت پرستوں کو بہت بُرا محسوس ہُوا۔ وہ طرح طرح سے آپ کی مذمّت اور بے عزتی کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ آپ کی ہمسایہ، ایک عمر رسیدہ خاتون نے یہ وتیرہ اختیار کیا کہ جب آپ گھر سے خانہ کعبہ کی جانب روانہ ہوتے تو وہ اپنی چھت سے نیچے گلی میں اس طرح کُوڑا کرکٹ (Garbage) پھینکتی کہ وہ سیدھا آپؐ پر گرتا۔ بوڑھی اماں صبح سویرے گھر میں جھاڑو دے کر دن بھر کا کوڑا کرکٹ جمع کر لیتی، آپؐ کے انتظار میں بیٹھی رہتی اور آپؐ پر کوڑا پھینک کر مطمئن ہو جاتی کہ اُس نے لات و عُزّیٰ کی نفی کرنے والے شخص سے بدلہ لے لیا ہے۔

ایک روز کیا ہُوا کہ رسُولِ خدا کعبے کے لیے روانہ ہوئے اور بوڑھی اماں کے گھر سے بھی آگے نکل گئے تو آپ کو اچانک یاد آیا کہ آج آپؐ کے اوپر کوڑا نہیں پھینکا گیا۔ آپؐ یہ سوچتے ہوئے انھی قدموں پر واپس آئے کہ خیر ہو سہی، بڑی اماں کو کیا ہُوا؟ آپؐ نے اس کے گھر کے صحن میں جھانکا اور دیکھا کہ بڑی اماں دن دہاڑے چارپائی پر پڑی ہوئی ہیں۔ آپؐ نے اُسے خبردار کرنے کے لیے کھنگارا اور صحن میں داخل ہو گئے۔ بڑی اماں سخت بخار کی حالت میں ہائے ہائے کر رہی

Marfat.com

تھیں۔آپ ؐ نے اُسے پانی پلایا اور پوچھا، ''اماں! آپ نے کوئی دوا دارو کیا؟'' اُس نے سر کے اشارے سے بتایا کہ نہیں۔ آپ ؐ سیدھے طبیب کے پاس گئے۔اُسے بڑی بی کی حالت بتائی، دوائی خریدی اور واپس آ کر اُسے کاڑھا چھانا اور خاتون کو پلایا۔ پھر اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر اُسے محبت کے ساتھ دبایا، تولیے کو ٹھنڈے پانی میں بھگو کر بار بار اس کی پیشانی پر رکھا اور یہ کہہ کر اجازت چاہی کہ ''جب شام کو دوائی کی دوسری خوراک کا وقت ہوگا تو میں پھر حاضر ہو جاؤں گا''۔

جب تک بڑی اماں شفایاب نہ ہو گئیں، آپ ؐ اتنے روز تک ایسا ہی کرتے رہے۔ ادلے کا بدلہ تو یہی تھا کہ جب بڑی اماں کو بیماری نے لاچار کر دیا تھا تو آپ بھی اپنے گھر سے کچھ کوڑا کرکٹ لا کر اُس پر ڈال دیتے۔ لیکن کوئی مسلمان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ رسُولِ ؐ خدا کے دل میں اس طرح کے ادلے بدلے کا خیال بھی گزرا ہوگا۔ آپ ؐ روحانی جواں مرد تھے۔ آپ ؐ سے خدا کو روحانی جواں مردی ہی کی توقع تھی اور آپ ؐ جانتے تھے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ ہر بدلے کے مقابلے میں بے بدل، بہتر اور برتر ہے۔ چنانچہ آپ ؐ کے صبر اور حسنِ سلوک کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ بڑی اماں دل و جان سے اسلام لے آئیں۔

حُجت باز یہودی

رسُولِ ؐ خدا مکّے سے ہجرت کر کے نئے نئے مدینے میں آئے تھے۔ مسجد نبوی کی کچی پکی تعمیر ہو چکی تھی۔ اسی کے ایک گوشے میں آپ ؐ کی رہائش تھی۔ مسجد میں دن بھر کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ نماز کے علاوہ وہیں درس و تدریس ہوتا، وہیں دُور و نزدیک سے آئے ہوئے لوگ آپ ؐ سے ملتے اور رشد و ہدایت پاتے، وہیں عدالت لگتی، وہیں جنگ سے لے کر امن تک کے امور طے پاتے۔ آپ ؐ، فجر کی نماز سے عشاء کی نماز تک، دن کا بیشتر حصہ مسجد ہی میں گزارتے۔

ایک روز عصر کی نماز کے بعد ایک یہودی عالم وہاں آیا اور جیسا کہ یہودی عالموں کا پرانا وتیرہ ہے کہ وہ کج بحثی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، یہ شخص بھی کچھ سیکھنے نہیں بلکہ آپ ؐ کو زِچ کرنے ہی کی نیت سے آیا تھا۔ اُس نے تورات اور زبور میں بیان کردہ مختلف واقعات اور معاملات کے حوالے سے آپ ؐ کو بحث میں اُلجھانے کی کوشش کی۔ اُسے علم تھا کہ قرآن میں متقیوں (فرض شناس پرہیزگاروں) کی یہ تعریف آئی ہے کہ وہ نہ صرف اُس وحی کے پابند ہیں جو رسُولِ ؐ خدا پر نازل ہوتی ہے بلکہ وہ آپ ؐ سے پہلے آنے والے پیغمبروں کی وحی کے بھی قائل ہیں (وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ، 2:4)۔ آپ ؐ اپنے مزاج کے مطابق اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں اُسے جواب دیتے رہے لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ میں آپ ؐ کے جوابوں سے مطمئن نہیں ہُوا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تو نماز کے بعد اُس نے پھر بحث شروع کر دی۔ آپ ؐ نے پوری دلجمعی سے اس کی تسلی کرانے کی کوشش کی۔ بیچ بیچ میں آپ ؐ فوری توجہ کے لائق معاملات بھی طے کرتے جاتے تھے۔ جب مغرب سے عشاء کا وقت آ گیا اور وہ شخص یہی ظاہر کرتا رہا کہ ابھی اسے اپنے سوالوں کا شافی جواب نہیں ملا۔ آپ ؐ نے فرمایا ''ایسا کرتے ہیں کہ تم رات کو یہیں مسجد میں قیام کر لو۔ تمھارے لیے بستر اور کھانا یہیں آ جائے گا۔ فجر کی نماز کے بعد ہم اپنا سلسلۂ کلام پھر شروع کر لیں گے''۔

رسولِ خدا کا وتیرہ تھا کہ سب سے پہلے خود مسجد میں آتے تھے، ایک تو آپؐ رات رات بھر جاگ کر عبادت کرتے رہتے تھے، پھر آپؐ کا حجرہ بھی مسجد ہی کے ایک گوشے میں تھا۔ پو پھٹ چکی تھی، آپؐ مسجد کے صحن میں داخل ہوئے تو آپ کو بدبو محسوس ہوئی۔ آپؐ نے بغور دیکھا تو صحن کے عین درمیان پاخانہ پڑا تھا۔ آپؐ فوراً سمجھ گئے کہ یہ حرکت کل والے یہودی عالم نے کی ہے اور اس بدتمیزی کے ذریعے سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں آپ کے دین اور آپ کی تعلیم کو یہ درجہ دیتا ہوں۔ آپؐ نے سوچا، کل اس بھلے آدمی کو مجھ سے بحث کرتے ہوئے جن مسلمانوں نے دیکھا تھا، تھوڑی ہی دیر میں دوسروں کی طرح وہ بھی نمازِ فجر کے لیے آتے ہی ہوں گے۔ انھیں پتا چل گیا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے تو ممکن ہے ان میں سے کوئی جوشیلا آدمی اس ''نیک بخت'' کو کہیں پا کر قتل ہی نہ کر ڈالے۔ آپؐ نے اپنے پاک ترین ہاتھوں سے وہ ناپاکی اٹھائی اور مسجد سے باہر کسی نالی میں پھینک دی۔ پھر واپس آ کر وضو کے لیے جو پانی مسجد میں رکھا تھا اس میں سے کچھ کے ساتھ جلدی جلدی صحن کا متاثرہ حصہ دھو ڈالا۔

کہتے ہیں کہ قاتل کے دل میں قتل گاہ کی طرف لوٹنے کی کشش ہوتی ہے۔ وہ بدبخت یہودی بھی یہ معلوم کرنے کے لیے بہت بے چین تھا کہ جب آپؐ نے اس کی پھیلائی ہوئی غلاظت دیکھی ہوگی تو آپ کا کیا ردِعمل تھا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا تو اسے اندازہ ہُوا کہ مسلمانوں میں سے کوئی جانتا ہی نہیں کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہُوا تھا، ہر کوئی زیادہ سے زیادہ یہی بتاتا تھا کہ ایک کج بحث یہودی رات کو مسجد میں ٹھہرا تھا لیکن فجر کی نماز سے پہلے ہی وہ وہاں سے چل دیا تھا۔ وہ یہودی عالم صاحبِ دل تو نہیں تھا لیکن صاحبِ دماغ ضرور تھا، سمجھ گیا کہ دوسروں کے علم میں آنے سے پہلے ہی محمدؐ نے غلاظت کو ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ جب صورتِ حال پوری طرح اس پر واضح ہوگئی تو وہ بے حد نادم ہُوا اور بھاگم بھاگ مسجد میں آ کر آپؐ کے قدموں میں گر گیا اور اسلام قبول کر لیا۔

میثاقِ مدینہ

رسولِ خدا کی مدنی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ ''میثاقِ مدینہ'' (The Charter of Madina) کی تدوین تھا۔ یہ واقعہ اسلام کی ابتدائی سیاسی تاریخ ہی کی حد تک نہیں بلکہ اسلام کے عروج کے دور میں بھی دنیائے اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی بنیاد ثابت ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج جب بہت سے مسلمان ملکوں میں ''غیر مسلم اقلیتوں'' کے مقام کا تعین ہو رہا ہے اور بہت سے ''غیر مسلم اکثریت کے ملکوں'' میں مسلمان اقلیت کی حیثیت طے ہو رہی ہے تو میثاقِ مدینہ کی روحانی روشنی میں درست اور قابلِ عمل فیصلے کیے جا سکتے ہیں۔

جب رسولِ خدا مکّے سے ہجرت کر کے مدینے آ گئے اور مسلمانوں کے لیے قرآنِ حکیم کے احکامات پر شخصی سطح کے علاوہ اجتماعی سطح پر بھی عمل کرنا ممکن ہو گیا تو مدینے کی سماجی اور سیاسی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں آنے لگیں۔ اس سے پہلے مدینے کا سیاسی ڈھانچا بہت ڈھیلا ڈھالا تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس ڈھانچے کا جسم تو تھا لیکن سر غائب تھا۔ اس کی مثال پاکستان، خصوصاً پنجاب کا وہ قدیم دور ہے جب یہاں کا گوپال (Pastoral) معاشرہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹا

ہُوا تھا اور کسی مرکزی حکومت کے بغیر چل رہا تھا۔ رسُولِ خدا نے مدینے کو ایک باقاعدہ ریاست کے انداز سے چلانے کی خاطر اس کے لیے ایک بااختیار مرکزی حکومت قائم کرنے کی ابتدا کی اور اس سلسلے میں مدینے کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک ریاست کے شہریوں کے طور پر زندگی گزارنے کی خاطر ''میثاقِ مدینہ'' یا دستورِ مدینہ تشکیل دیا۔ یاد رہے کہ تاریخ انسانیت کی یہ پہلی دستاویز ہے جس میں مذہب کے اختلاف کے باوجود، تمام فریقوں کو ''ایک قوم'' قرار دے کر برابر کے انسانی حقوق دیے گئے تھے۔

میثاقِ مدینہ پر کس حد تک عملدر آمد ہُوا، اس سے قطعِ نظر اہم بات یہ ہے کہ رسُولِ خدا نے مذہب کے اختلاف کے باوجود قومیت کا مسئلہ کس خوبصورتی سے حل کیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی دوقومی نظریے کے نام پر پاکستان کو ایک قوم نہیں بننے دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں تو پاکستان کا قیام ہی غلط ثابت ہو جائے گا کیونکہ وہ تو دوقومی نظریے پر قائم ہُوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مکّے میں مسلمانوں کے ساتھ دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شہریوں کا سلوک ہو رہا تھا تو خدا نے ہجرت کا حکم دیا اور یوں مکّے سے الگ ایک نئی ریاست کا قیام ضروری سمجھا گیا۔ یہی حال پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا تھا۔ جب ان کے حقوق کا تحفظ ناممکن ہو گیا تو اُس محمد علی جناحؒ نے پاکستان کے نام سے الگ ریاست کا قیام ضروری سمجھا جو عمر بھر ہندوستان کی وحدت کے نہ صرف قائل بلکہ علمبردار رہے تھے۔ یہاں تک کہ مسز سروجنی نائیڈو نے انھیں ''ہندو مسلمان اتحاد کا پیغامبر'' قرار دیا تھا۔

آج اگر پاکستان میں اقلیتوں کو مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شہری تسلیم نہیں کیا جاتا تو ایک دن پاکستان بھی اسی طرح تقسیم ہو جائے گا جیسے 1947ء میں ہندوستان تقسیم ہُوا تھا۔ ابھی کل کی بات ہے جب مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ دوسرے درجے کے شہری بنا کر رکھ دیے گئے ہیں تو وہ ''بنگلہ دیش'' بنانے کے لیئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اگر مسیحیوں، احمدیوں یا ہندوؤں نے محسوس کیا کہ ہمیں غیر قوم سمجھ کر پاکستان میں ہمارے ساتھ برابری نہیں برتی جاتی تو وہ بھی موقع کی تاک میں رہیں گے کہ کب متحرک ہوں اور ایک چھوٹا سا الگ ملک بنالیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر ''میثاقِ مدینہ'' پر تھوڑی زیادہ تفصیل سے بات کر لی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

جو لوگ ''میثاقِ مدینہ'' کو ایک ناکام تجربہ قرار دے کر اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں ان کا شمار ان لوگوں میں ہونا چاہیے جو رسُولِ خدا کے اس عمل کو غلط قرار دیتے ہیں کہ آپ نے فتحِ مکّہ کے موقع پر ابوسفیان اور اس کے خاندان کو مکّے کے دوسرے باسیوں کے ہمراہ کیوں معافی دی کیونکہ بعد میں اسی خاندان کے ایک فرد، یزید بن معاویہ بن ابوسفیان کے عہد میں کربلا کے مقام پر رسُولِ خدا کے پورے خاندان کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک میثاقِ مدینہ کے ناکام ہونے کا تعلق ہے۔ کیا ہم اس صورت حال کے تحت یہ کہنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ قرآنِ حکیم بھی ایک ناکام دستاویز ہے کیونکہ آج پوری روئے زمین پر پھیلے ہوئے 57 مسلمان ملکوں میں سے ایک میں بھی اس کی تعلیم پر عمل نہیں ہو رہا اور نہ ہی جب سے خلافت ملوکیت میں بدلی ہے ایسا پہلے کبھی ہُوا ہے؟

Marfat.com

رسُولِ خدا کی روحانی جواں مردی کا یہ اقدام جسے تاریخ ''یثاقِ مدینہ'' کے نام سے یاد کرتی ہے نہ صرف سیاسی سطح پر توہمات اور فضولیات میں الجھے ہوئے مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتا ہے بلکہ ''تنگ دل قومیت'' (Narrow Nationalism) کے بیمار تصور میں پھنسی ہوئی ساری انسانیت کے لیے بھی مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔

یثاقِ مدینہ کے الفاظ رسُولِ خدا کے اپنے الفاظ ہیں اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآنِ حکیم کے بعد یثاقِ مدینہ اسلام کی اہم ترین دستاویز ہے۔ یہ دستاویز ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتی ہے:

هٰذا کتاب'' مِن مُحمّد النبی...... یہ خدا کے نبی محمدؐ کی تحریر ہے۔ رسُولِ خدا کے پہلے مستند ترین سوانح نگار ابنِ ہشام نے یثاقِ مدینہ کے عربی متن کو آپؐ کے اپنے الفاظ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ پاکستان کے ممتاز صحافی اور رسُولِ خدا کے عاشقِ صادق، محمد رفیق ڈوگر کی مہربانی سے اب یہ متن اور اس کا ترجمہ بڑی خوبصورتی سے شائع ہو چکا ہے۔

اگر چہ انگریزوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا میگنا کارٹا (یثاقِ عظیم Magna Carta) دنیا کی پہلی دستاویز ہے جس کے تحت عوام کو شہری اور جمہوری حقوق دیے گئے۔ لیکن یثاقِ مدینہ ان کے میگنا کارٹا سے کم از کم چھ صدیاں پہلے کی دستاویز ہے۔ پھر میگنا کارٹا نے تو صرف انگریز امراء (Barons) کو بادشاہ کے ''خدائی حقوق'' کے مقابلے میں کچھ حقوق کی حد تک تحفظ دیا تھا۔ مگر یثاقِ مدینہ نے تو ریاست کے ہر شہری کو مذہب، نسل یا جنس کے فرق کے بغیر سماجی اور سیاسی حقوق دیے تھے۔ اس دستاویز کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ رسُولِ خدا مذہبی رواداری اور انسانی مساوات کو کتنا عزیز رکھتے تھے۔

جب 11 اگست 1947ء کو کراچی میں قائداعظم نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے اس کے منتخبہ صدر کے طور پر خطاب کیا تو برصغیر پاک و ہند ہولناک ہندو مسلم، سکھ فسادات کی زد میں تھا۔ آپؒ نے کمال بصیرت سے کام لیتے ہوئے رسُولِ خدا کے یثاقِ مدینہ سے روشنی لی اور اس انقلابی سوچ کا مظاہرہ کیا جس پر دیانتداری سے عمل ہوتا تو آج پاکستان نہ صرف دنیا کا پانچواں سب سے بڑا ملک اور تمام دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست ہوتا بلکہ دورِ حاضر میں قرآنِ حکیم اور رسُولِ خدا کی تعلیم کے مطابق ایک ایسا خطۂ زمین ہوتا جس میں جمہوریت بھی ہوتی اور مساوات بھی۔ اس کے بالکل برعکس قائداعظم کی اس تقریر کو اوّل تو عوام کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی گئی اور اگر کسی نے اس کا ذکر بھی کیا تو کہا کہ اُس روز قائداعظم بہت تھکے ہوئے تھے، انھیں بخار تھا اس لیے وہ کچھ غلط سلط باتیں کہہ گئے تھے۔ بہرحال اس تقریر کے اس پیراگراف میں جسے پاکستان کے قیام کے مخالفوں نے دوقومی نظریے کے خلاف قرار دے کر دبا دینا چاہا، رسُولِ خدا کے تحریر کردہ یثاقِ مدینہ کی روح صاف جھلکتی محسوس کی جاسکتی ہے:

''اب اگر ہم پاکستان کی اس عظیم ریاست کو خوش اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں تن من دھن سے لوگوں کی، خصوصاً عوام کی اور غریبوں کی بہتری پر تمام تر توجہ صرف کرنی ہوگی۔ اگر آپ نے باہمی تعاون سے کام لیا اور ماضی کو بھلا کر اور پرانی دشمنیوں کو دفن کر کے چلے تو کامیابی لازماً آپ کے قدم چومے گی۔ اگر آپ نے ماضی کی روش ترک کر کے اس جذبے سے ایک

Marfat.com

دوسرے کا ساتھ دیا کہ آپ میں سے کوئی کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ماضی میں آپ کے ساتھ اس کے کیسے ہی تعلقات رہے ہوں۔ اس کا کوئی سارنگ، ذات یا عقیدہ ہو وہ اوّل، دوم اور سوم اس ریاست کا شہری ہے اور برابر کے حقوق، سہولتوں اور فرائض کا حامل ہے تو پھر آپ اتنی ترقی کریں گے جس کی کوئی انتہا نہ ہوگی...... آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں، آپ آزاد ہیں کہ اپنی مسجدوں میں جائیں یا اس ریاست پاکستان میں کسی بھی عبادت گاہ میں جائیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقے یا عقیدے سے ہو، اس کا ریاست کے امور سے ہرگز کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ ہم ایسے دور کا آغاز کر رہے ہیں جب ایک ذات یا عقیدے کا دوسری ذاتوں اور عقیدوں سے کوئی امتیاز اور فرق پیش نظر نہیں رکھا جائے گا۔ ہم اس بنیادی اصول کو پیش نظر رکھ کر چلیں گے کہ ہم سب ایک ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔"

جو لوگ قائداعظم کی گیارہ اگست 1947ء کی مذکورہ بالا تقریر کو میثاق مدینہ کی روح کے مطابق نہیں سمجھتے ان کی خدمت میں قائداعظم کی چودہ اگست 1947ء کی اُس تقریر سے چند سطریں پیش کر دی جائیں تو بہتر ہوگا جو آپؒ نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس بیان کے جواب میں کی تھی کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونا چاہیے جیسا مغل شہنشاہ، اکبراعظم کے دور میں ہوتا تھا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

"جو رواداری اور خوشدلی شہنشاہ اکبر نے اپنے وقت میں اقلیتوں کے ساتھ برتی وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ تو تیرہ صدیاں پرانی ہے جو ہمارے پیغمبرؐ (محمد رسول اللہ) نے نہ صرف قولاً بلکہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ برتی۔ حالانکہ آپؐ ان پر فتح پا چکے تھے لیکن پھر بھی آپؐ نے ان کے ساتھ ان کے مذہب اور عقیدے کے بارے میں انتہائی برداشت اور عزت و احترام کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے جہاں بھی حکمرانی کی، رسولؐ خدا کے قائم کردہ انسانیت پرور اور عظیم القدر اصولوں کی پیروی اور پابندی کی"۔

آیئے اب واپس اُن حالات کی طرف چلتے ہیں جن کی اصلاح کے لیے رسولؐ خدا نے "میثاقِ مدینہ" کی تدوین جیسے اقدامات ضروری سمجھے۔ اگر ان ابتر حالات کی عکاسی کے لیے ہم الطاف حسین حالی کی "مسدس" سے مدد چاہیں تو دریا کو کوزے میں یوں بند کیا جاسکتا ہے:

کہیں تھا مویشی چَرانے پہ جھگڑا — کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جُو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا — کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں — یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

کیا نجد اور کیا حجاز، پورا جزیرہ نما عرب خاندانی اور قبائلی چپقلشوں میں اُلجھا ہُوا تھا۔ خدا نے رسولؐ خدا کو جو

Marfat.com

زبردست سیاسی بصیرت عطا کی تھی اُس کا ابتدائی اظہار تو اُسی وقت ہو گیا تھا جب مکّے میں خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر مختلف قبائل میں اس مسئلے پر رسّہ کشی ہو رہی تھی کہ حجرِ اسود کو دیوار میں اس کی سابقہ جگہ پر کون نصب کرے گا۔ آپؐ نے حجرِ اسود کو اپنی کالی کملی کے بیچوں بیچ رکھ کر متحارب قبائل کے سرداروں کو چادر کے اردگرد کھڑا کر کے چادر کو اپنے اپنے سامنے سے پکڑ کر اوپر اٹھانے کے لیے کہا اور جب چادر اُس سطح تک اوپر اٹھ گئی جہاں حجرِ اسود کو دیوار میں نصب کرنا مقصود تھا تو آپؐ نے اسے اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر وہاں رکھ دیا۔ آپ کی سیاسی بصیرت کا ایک اور شاندار اظہار صُلحِ حدیبیہ کو فتح مکّہ میں تبدیل کر دینے کا ''معجزہ'' تھا۔ لیکن حجرِ اسود کی تنصیب سے فتح مکّہ تک کے تمام فیصلوں میں جو سیاسی بصیرت کارفرما ہی اس کی بنیاد اور سرچشمہ آپ کی وہ روحانی جواں مردی ہی تھی جس کی بہترین مثال ''میثاقِ مدینہ'' ہے۔

مدینے کے سیاسی بحران کی بنیادی وجہ کیا تھی؟

عرب کے مختلف قبائل عام طور سے صحرا کی وسعتوں میں ایک دوسرے سے اچھے خاصے فاصلے پر آباد تھے اور یوں ان کے درمیان لڑائی جھگڑے میں بھی قدرتی طور پر کچھ نہ کچھ وقفہ پیدا ہو جاتا تھا۔ مکّہ کاروباری مرکز تھا، مختلف قبائل کے افراد یا تو یہاں حج کے لیے آتے تھے یا کاروبار کے لیے۔ اس کے برعکس مدینے کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا اور اسلام قبول کرنے والے دو بڑے قبیلے، اوس اور خزرج بہت قریب قریب آباد تھے اور یوں ان میں آئے دن کسی نہ کسی چھوٹی موٹی یا جھوٹی سچی وجہ سے دنگا فساد ہوتا رہتا تھا۔ ان دونوں قبیلوں کے مرد دن بھر کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ نماز کے لیے اذان دینے اور اذان کے دوران دائیں طرف مُنہ کر کے حی الی الصلوٰۃ اور بائیں طرف مُنہ کر کے حی الی الفلاح کہنے کی ضرورت بھی اسی وجہ سے پیش آئی تھی تاکہ کھیتوں میں کام کرنے والے افراد کو پتہ چل جائے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔

جو قبائل ایک دوسرے سے دُور دُور آباد تھے ان میں قتل کے بدلے قتل کرنے کی رسم تھی لیکن قاتل کے لیے آسان تھا کہ وہ صحرا کی وسعتوں میں تادیر گم رہے اور بدلہ لینے والے کے لیے اتنا ہی مشکل تھا کہ وہ صحرا کی ریت چھان چھان کر قاتل کو جا پکڑے۔ زراعت پیشہ اوس اور خزرج کے پاس نہ تو قاتل کے لیے چھپنے کی آسانی تھی اور نہ اُسے ڈھونڈنے میں مشکل۔ یہاں تو قاتل سامنے کے کھیت میں کھڑا مل جاتا تھا۔ ''قتل کے بدلے قتل'' کی رسم تو خانہ بدوش صحرائی ثقافت سے چلی آ رہی تھی لیکن ان دونوں قبیلوں کی معاشرت صحرائی سے مدنی ہو چکی تھی (مدنیت ہی کی وجہ سے ''یثرب'' کا پرانا نام ''مدینہ'' میں بدل گیا۔ مدینہ کا لفظی ترجمہ شہر ہے)۔ صحرائی رسوم اور مدنی زندگی میں کوئی تال میل نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ قتل کی شرح یک دم بڑھ گئی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ مدینے میں امن سے رہنا ناممکن ہے۔

رسُولِ خدا نے تہیہ کر لیا کہ اس قتل و غارت کو ختم کرنا ہوگا۔ آپ نے اس پرانے سیاسی نظام کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا جو کسی مرکزی اختیار کے بغیر چل رہا تھا اور جس کی مثال ایک ''بے سر کے دھڑ'' کی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے بڑے حوصلے اور جواں مردی کی ضرورت تھی اور چونکہ نظام کی اس تبدیلی کا مقصد ذاتی مفاد نہیں بلکہ اجتماعی امن و

Marfat.com

امان تھا اس لیے آپؐ کے اس اقدام کو روحانی جواں مردی ہی کا نام دینا مناسب ہوگا۔ چنانچہ آپ نے ''میثاقِ مدینہ'' کے تحت ایک جمہوری اور روادار ریاست کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔

دیگر بہت سی سماجی اصلاحات کے علاوہ آپؐ کا ایک اہم اقدام یہ تھا کہ قصاص اور دیت کے ذریعے ''قتل کے بدلے میں قتل'' کا لامتناہی سلسلہ بند ہو جائے۔ اب قتل کے ارتکاب کے بعد ''خون کا بدلہ خون'' کے بجائے یہ ممکن ہو گیا کہ مقتول کے لواحقین ''دیت'' کے اصول کی روشنی میں ''خون کے بدلے کوئی مناسب رقم یا معاوضہ'' قبول کر کے بدلہ لینے سے باز آجائیں۔ ایک زمانے میں یہ معاوضہ ایک سو اونٹ تھا۔ جہاں تک قصاص کا تعلق ہے، پرانی قبائلی رسم یہ تھی کہ مقتول کے لواحقین قاتل کے قبیلے کے کسی بھی شخص کو قتل کر سکتے تھے۔ اس طرح تین شدید نقصانات عمل میں آجاتے تھے۔ اوّل، قاتل کے قبیلے کے ہر شخص کو ہر وقت اپنی جان کے لالے پڑے رہتے تھے۔ دوم، قبائل اپنے بہترین افراد سے محروم ہو جاتے تھے۔ سوم، بدقماش مجرم قاتل بچ جاتا تھا اور کوئی نیک نام بے گناہ اس کی جگہ قتل ہو جاتا تھا۔ قصاص کے محمدیؐ اصول کے مطابق صرف اُسی شخص کو قتل کیا جا سکتا تھا جس نے قتل کا ارتکاب کیا ہوتا تھا اور اسے اتنی ہی ایذا دی جا سکتی تھی جتنی اس نے مقتول کو قتل کرتے ہوئے پہنچائی تھی۔ حقیقت ہے کہ رسُولِ خدا نے میثاقِ مدینہ کی اس ایک شق سے، خون میں لتھڑے ہوئے ''یثرب'' کو امن و امان کے گہوارے ''مدینہ'' میں بدل دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میثاقِ مدینہ کے صحیفے پر دستخط کرنے والے قبائل کے بارے میں ایک وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔ مدینے کے زیادہ تر غیر مسلموں کا مذہب یہودیت تھا۔ مسیحی وہاں خال خال ہی تھے بلکہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ چنانچہ جن غیر مسلم قبائل نے ''میثاقِ مدینہ'' پر دستخط کیے وہ یہودی ہی تھے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآنِ حکیم نے واضح کر رکھا تھا کہ مسیحوں کے برعکس یہودی اسلام کی زیادہ ڈٹ کر مخالفت کریں گے اس لیے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رسُولِ خدا نے مدینے کے اُن یہودی قبائل کو مسلمانوں کے ساتھ ایک اُمت قرار دیا تھا جنھوں نے ریاست مدینہ میں میثاقِ مدینہ کے آئین یا دستور کے مطابق زندگی گزارنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا تو ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ میثاقِ مدینہ کی روح یہی ہے کہ مسلمان اور دوسرے تمام مذاہب کے پیروکار کسی اسلامی ریاست میں ایک ہی امت قرار پائیں گے اور انھیں برابر کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور انسانی حقوق حاصل ہونگے۔ آج پاکستان جیسے ''اسلامی جمہوری'' ملکوں میں یہ غیر اسلامی اور منافقانہ روش جلد از جلد اور ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانی چاہیے کہ پاکستان کی اکثریت (مسلمان) اور اقلیتیں باہم ایک قوم ہیں یا نہیں اور مخلوط طرزِ انتخاب جائز ہے یا ناجائز۔ رسُولِ خدا کے نام پر جان دینے کے دعویداروں کو رسُولِ خدا کی روحانی جواں مردی کی روشنی میں پاکستان کو ایک قوم اور مخلوط انتخابات کو واحد طریقۂ انتخاب تسلیم کر کے یہ غیر ضروری اور نامبارک بحث بند کر دینی چاہیے۔

میثاقِ مدینہ میں رسُولِ خدا نے اس کے تمام دستخط کنندگان (Signatories) کو نہ صرف ایک ''قوم'' بلکہ ایک ''امت'' قرار دیا تھا۔ اگرچہ تین یہودی قبائل کو اس صحیفے پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر مدینے سے شہر بدر کر دیا گیا تھا لیکن

Marfat.com

جن گیارہ یہودی قبائل نے اس پر دستخط کر دیے تھے ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کر کے کہا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک امت (اُمتِ واحدہ) شمار ہونگے البتہ ان کا دین ان کے لیے اور ہمارا دین ہمارے لیے ہوگا (لَکُم دِینُکُم وَلِیَ دِین) ۔ غور فرمایئے، دوبارہ التجا ہے کہ غور فرمایئے، اگر مدینے کی پہلی اسلامی ریاست کے بانی، رسولِ خدا حضرت محمدؐ نے ریاست کے تمام شہریوں کو بلا تفریق مذہب، رنگ، نسل، جنس ایک امت قرار دیا تھا تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔

اس کی ایک ہی وجہ تھی جسے آج کے مسلمان نظر انداز کر چکے ہیں۔ اسلام ایک عالمگیر دعوت ہے، اس کے دامن میں دُنیا کے تمام انسانوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کے لیے جگہ ہے۔ یہ ایک اپنائیت افروز (Inclusive) دین ہے، کوئی غیریت انگیز (Exclusive) مذہب نہیں کیونکہ یہ رب المسلمین کا نہیں رب العالمین (اللہ) کا، رحمۃ للمسلمین نہیں، رحمۃ للعالمین (محمدؐ) کا اور ذکر للمسلمین کا نہیں ذکر للعالمین (قرآن) کا دین ہے۔ اس دین کے ایک سنجیدہ ترین اور مخلص ترین ترجمان اقبالؔ نے اسی لیے اسلام کے سیاسی نظام کو ''روحانی جمہوریت'' کا نام دیا تھا کیونکہ میثاقِ مدینہ کے پیچھے کارفرما رسولؐ خدا کی روحانی جواں مردی کا حاصل روحانی جمہوریت ہی تھی۔

فتحِ مکہ سے پہلے صلحِ حدیبیہ

اگر ہم خداوند کریم اور قرآنِ حکیم پر دل سے اعتبار کریں کہ رسولؐ خدا کا بنیادی کردار پوری انسانیت کے لیے ''رحمت'' ہی تھا تو پھر یہ جاننے اور ماننے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی کہ آپ کی زندگی میں بدر اور احد سے لے کر خندق اور خیبر تک جتنی بھی جنگیں آئیں ان سب کا مقصد بھی عرب اور بالآخر ساری دنیا کو امن و امان اور باہمی رحمدلی کا گہوارہ بنانا ہی تھا۔ قرآنِ حکیم کی تعلیم کا واضح رخ یہی ہے کہ جنگ کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور جیسے ہی امن کا امکان پیدا ہو جائے جنگ ختم کر دینی چاہیے۔ چنانچہ سورہ الانفال، جو زیادہ تر جنگی معاملات پر روشنی ڈالتی ہے، اُس کے نقطۂ عروج کے طور پر خدا کہتا ہے:

> ''اے نبیؐ! ان کافروں سے کہو کہ وہ اگر اب بھی باز آجائیں تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اس سے درگزر کر لیا جائے گا۔ لیکن انھوں نے اگر اپنی پچھلی روش ہی کو دہرایا تو پھر پہلے گزری ہوئی قوموں کا جو حشر ہُوا وہ اس سے بچ نہ پائیں گے۔ اے ایمان والو! ان بے ایمانوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور زندگی کا چلن (دین) پوری طرح خدا کے احکامات سے ہم آہنگ ہو جائے'' (8:38:39)۔

مختصر یہ کہ قرآنِ حکیم جنگ کو ایسی تباہی و بربادی قرار دیتا ہے جس سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے البتہ جب یہ ناگزیر ہو جائے یا آپ پر ٹھونس دی جائے تو پھر پوری جاں نثاری سے مقابلہ کرنا ہوگا اور بزدلوں کی طرح پیٹھ نہیں پھیرنی ہوگی۔ عرب کی صدیوں سے فتنہ و فساد اور قتل و غارت میں پھنسی ہوئی معاشرت کو امن سے ہمکنار کرنے کے

Marfat.com

لیے مسلمانوں کو مجبوراً جنگ قبول کرنی پڑ جاتی تھی۔ ان کی جنگ کو کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ ہے "جنگ برائے امن"۔ یہ حقیقت ہے کہ رسولِ خدا عرب کی معاشرتی زندگی میں جس طرح کی جوہری (Qualitative) اور انقلابی تبدیلی لانا چاہتے تھے اس کے لیے جنگ ناگزیر ہو گئی تھی۔ لیکن آپ کا اصول یہی تھا کہ ناگزیر صورتِ حال میں جنگ ایک ذریعہ (Means) تو ہو سکتی ہے، مقصد (End) کسی حالت میں نہیں ہو سکتی۔

یہاں ایک وضاحت بے حد ضروری ہے۔ آج خودکش حملوں سے تنگ آیا ہوا امریکہ مسلمان ملکوں پر زبردست دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ جنگ اور جہاد سے نہ صرف باز آجائیں بلکہ ان تصورات کو اسلامی تعلیمات ہی سے خارج کر دیں۔ بے شک اسلام کا رُخ سلامتی اور امن کی طرف ہے لیکن انسانی زندگی میں ایسے مقامات آجاتے ہیں کہ جنگ اور جہاد ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ جنگ اور جہاد کا فیصلہ انفرادی سطح پر نہیں بلکہ اجتماعی یا قومی سطح ہی پر ہو سکتا ہے لیکن یہ یکسر غلط ہے کہ امریکہ کو تو "خود ساختہ" اختیار ہو کہ وہ جس مسلمان ملک پر چاہے چڑھ دوڑے لیکن مسلمانوں کو جنگ اور جہاد کا حق نہ ہو۔ بس احتیاط یہ کرنی چاہیے کہ یہ حق ریاست اور قوم کو تو حاصل ہو، افراد کو نہیں۔ اس ضمن میں ایک تاریخی صورتِ حال کا ذکر مناسب ہوگا۔ جب قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کشمیر میں قبائلی مسلمانوں نے "جہاد" شروع کر دیا حالانکہ حکومتِ پاکستان نے بھارت کے خلاف ریاستی سطح پر جنگ کا اعلان نہیں کیا تھا تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا تھا: "جب تک پاکستان اور بھارت کے درمیان امن کا معاہدہ موجود ہے اور حکومت پاکستان، ریاست کی سطح پر، اس معاہدے کو توڑنے کا اعلان نہیں کرتی، کشمیر کے نام نہاد 'جہاد' کو جہاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس میں مرنے والے ناحق مارے جائیں گے"۔

بہر حال جب مسلمانوں نے خندق کی جنگ (The Battle of the Trench) میں مکی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیے اور مدینے کے اندر بھی اُن کی مخالفت دم توڑ گئی تو رسولِ خدا نے اپنی حکمتِ عملی (Strategy) میں آئندہ جنگ و جدل (جنگی جہاد) کے بجائے صلح و امن کو پہلے سے بھی زیادہ نمایاں درجہ دے دیا اور یہی وہ اقدام ہے جو آپ کی روحانی جواں مردی کی ایک روشن ترین مثال ہے۔ اب مکی قوتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت بدر اور احد کی جنگوں کی طرح کمزور نہیں تھی۔ اب تو وہ ایک ایسی قوت بن چکے تھے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں انھیں مقامِ قوت (Position of Strength) حاصل تھا۔ رسولِ خدا کی جگہ کوئی عام دُنیوی قائد ہوتا تو وہ یہی کوشش کرتا کہ ہزیمت خوردہ دشمنوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ لیکن آپؐ کا مقصدِ حیات (Mission) بربادی نہیں اصلاح تھا اور یہی مقصدِ حیات تمام روحانی جواں مردوں کا ازل سے رہا ہے اور ابد تک رہے گا۔

مارچ 628ء کو رسولِ خدا نے حالات کو ایک ایسے رُخ پر ڈال دیا جس کے نتیجے میں بالآخر پورا عرب ایک قوم میں ڈھل گیا اور ملک بھر میں امن و امان قائم ہو گیا۔ آپؐ نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اٹھایا وہ نہ صرف جرأت بلکہ فراست کا حیرت انگیز نمونہ تھا۔ آپؐ نے اعلان کر دیا کہ "میں حج کے لیے مکّہ جا رہا ہوں، بولو تم میں سے کون کون میرا ساتھ دینے

Marfat.com

کے لیے تیار ہے"۔ یادرہے کہ حج کے موقع پر جو کوئی مکّے میں آتا تھا وہ ہتھیار نہیں لا سکتا تھا۔ ہتھیاروں کے بغیر مکّے میں جانے کا ایک ہی مطلب تھا کہ مسلمان از خود موت کے مُنہ میں جارہے تھے۔ بظاہر تو خانۂ کعبہ کے متولی (Guardians) ہوتے ہوئے قریش بھی پابند تھے کہ حاجیوں کی حفاظت کریں لیکن مسلمانوں سے تو اُن کی جانی دشمنی تھی۔ کیا ان پر اعتبار کیا جاسکتا تھا کہ وہ نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ نہ کر دیں گے؟

ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت۔ اور یہاں تو یار بھی وہ تھا کہ نہ اس جیسا کوئی پیدا ہُوا اور نہ پیدا ہوگا، تقریباً ایک ہزار مسلمان آپؐ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ کیا عجیب قافلہ تھا یہ! ایک ہزار نہتے مسلمان، احرام باندھے، رسُولِ خدا کے گرد گھیرا ڈالے لبیک اللھم لبیک پکارتے چلے جارہے ہیں اور کسی کے دل میں تشویش نہیں کہ کہیں اُس کا استقبال موت تو نہیں کرے گی۔ ان سب کو رسُولِ خدا کی فراست پر اعتماد تھا اور وہ آپؐ کی پیروی ہی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے۔ اگر یہ پُرامن جہاد رسُولِ خدا کی اعلیٰ ترین روحانی جواں مردی کی دلیل تھا تو یہ ان کے ہمراہیوں کی روحانی جواں مردی کا بھی خوبصورت ثبوت تھا۔

رسُولِ خدا اور مسلمانوں کے اس اقدام نے قریش کو بھی شش و پنج میں ڈال دیا۔ کعبہ کے متولی ہوتے ہوئے وہ مسلمان حاجیوں کو کیونکر روکیں جو ہتھیاروں کے بغیر احرام باندھے مکّے کی جانب بڑھے آتے تھے۔ اگر وہ انھیں روکتے تو پھر گویا وہ اپنے مقدس فرائض سے غفلت اور کعبے کی بے حرمتی کے مرتکب ٹھہرتے تھے۔ قدیم زمانے سے چلی آتی رسم کے مطابق وہ ان حاجیوں کے خلاف ہتھیار بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ کریں تو کیا کریں؟ بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے مکّے سے باہر مسلمان حاجیوں کو اُس مقام سے پہلے روکنے کے لیے ایک فوج بھیج دی جہاں سے وہ علاقہ شروع ہوجاتا تھا جہاں داخل ہو جانے والوں کے خلاف کسی قسم کی جنگی کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی۔ یادرہے کہ خانۂ کعبہ کو مسجد الحرام یا حرم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی حرمت کے تقاضے کے طور پر اس کے قرب و جوار میں انسانی خون نہیں بہایا جاتا۔ بہرحال جب مسلمانوں کے بدوی اور مکی دوستوں نے انھیں قریش کے اس لشکر کی خبر دی تو رسُولِ خدا نے راستہ بدل کر حرمت والے علاقے کی سرحد پر واقع "حدیبیہ" کے مقام پر جا پڑاؤ ڈالا۔ بہت آؤ تاؤ کے بعد قریش اس بات پر راضی ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیں جسے تاریخ "صلح حدیبیہ" کا نام دیتی ہے۔ قریش کے اپنے اندر ایسے عناصر موجود تھے جو مسلمانوں کے ساتھ آئے دن کی جنگ بازی سے تنگ آچکے تھے اور پھر اس مرتبہ تو مسلمان خالصتاً حج کی نیت سے آئے تھے اور احرام باندھے ہوئے نہتے عرب مسلمانوں پر ہتھیار اٹھانا عربوں کی روایتی جواں مردی کے خلاف تھا۔ دوسرے اس سے پورے عرب سے حج کی نیت سے مکّہ آئے ہوئے لوگوں میں قریش کے بارے میں نفرت پیدا ہو سکتی تھی۔

لیکن جن شرائط پر یہ صلح نامہ لکھا گیا وہ جوشیلے مسلمانوں کے لیے زود ہضم نہ تھیں۔ بظاہر یہ معاہدہ دونوں فریق کے لیے گھاٹے کا سودا تھا۔ خصوصاً مسلمانوں نے محسوس کیا کہ قریش نے انھیں اس سال حج کرنے سے روک کر ان کی ہتک کی ہے۔ اُن کے دل میں کہیں نہ کہیں یہ بات اٹکی ہوئی تھی کہ رسُولِ خدا نے یہ قدم خدا کے ہی حکم کے تحت اٹھایا ہوگا

Marfat.com

لہٰذا اس میں کامیابی ہی ہونی چاہیے تھی۔ بہر حال ان کی تشفی کے لیے خداوند کریم نے سورہ فتح نازل فرمائی جس کی پہلی ہی آیت میں ایک فیصلہ کن فتح کی خوش خبری سنائی گئی تھی (اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیناً)۔ اس خوش خبری نے مسلمانوں کو اطمینان سے زیادہ پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس صلحِ حدیبیہ کو فتحِ مبین کیسے کہا جا سکتا ہے جس میں بظاہر ہم نے وہ تمام شرائط مان لی ہیں جو قریش ہم سے منوانا چاہتے تھے۔ لیکن رسُولِ خدا مطمئن تھے کہ اس صلح نامے سے جنگ کے بغیر ایک عظیم ترین فتح کا دروازہ کھل گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ کا یہ اطمینان بھی روحانی جواں مردی ہی کے زمرے میں آتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

صلحِ حدیبیہ واقعی ایک انقلابی دستاویز ثابت ہوئی جس نے جنگ و جدل کو امن و امان میں بدل دیا۔ پورے عرب میں اس صلح نامے سے رسُولِ خدا کی فراست اور قیادت کی دھاک بیٹھ گئی۔ صدیوں سے باہمی خون خرابے نے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی پر جمود کی جو مہر لگا رکھی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ پھوٹ گئی اور ایک کے بعد دوسرے عرب قبیلے نے آپؐ کے ہاتھ پر وفاداری کا حلف اٹھا کر اسلام قبول کر لیا۔ بہت سے نئے مغربی تاریخ نویسوں نے رسُولِ خدا کو پہلا عرب قوم پرست (Nationalist) لیڈر قرار دیا ہے جس نے عربوں کا بکھرا ہُوا شیرازہ از سرِ نو جمع کر کے انھیں ایک ریاست میں ڈھال کر ایک متحدہ قوم کی حیثیت دے دی۔ کچھ مغربی سوانح نگاروں نے آپؐ کے اس کارنامے پر آپ کو دُنیا کے پہلے "سیاسی پیغمبر" کا خطاب بھی دے رکھا ہے۔ بہر حال، جلد ہی وہ لمحہ بھی آ گیا جب خدا کی دی ہوئی فتحِ مبین کی بشارت رنگ لے آئی۔ "اور آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا"۔

حدیبیہ کے صلح نامے میں اور باتوں کے علاوہ یہ طے ہُوا تھا کہ دونوں فریق نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی نہیں کریں گے بلکہ ایک دوسرے کے اتحادی قبائل پر چڑھائی بھی نہیں کریں گے۔ نومبر 629ء میں قریش نے آپؐ کے ایک اتحادی قبیلے پر حملہ کر دیا اور یوں صلحِ حدیبیہ کی کھلی خلاف ورزی کر دی جس کی بنا پر رسُولِ خدا نے دس ہزار جوانوں پر مشتمل لشکر کے ساتھ مکّے کے دروازے جا کھٹکھٹائے۔

اس زبردست قوت کے سامنے قریش کو اپنی شکست دیوار پر لکھی دکھائی دی اور ان کے جہاں دیدہ اور موقع شناس اکابرین نے شکست قبول کر کے مکّے کے دروازے کھول دیے اور یوں رسُولِ خدا ایک قطرۂ خون بہائے بغیر مکّے پر قابض ہو گئے۔ اس سے بڑی فتحِ مبین اور کیا ہو سکتی تھی؟ سورہ الفتح میں فتحِ مبین کی بشارت پر ناک بھوں چڑھانے والوں پر نہ صرف قرآنِ حکیم کی حقانیت واضح ہو گئی بلکہ صلحِ حدیبیہ قبول کرنے پر رسُولِ خدا کی روحانی فراست کی دھاک بھی بیٹھ گئی۔ لیکن آپ کی روحانی جواں مردی کا عظیم ترین مظاہرہ تو ابھی باقی تھا۔

جب مسلمانوں نے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریم کی تصویروں کو چھوڑ کر کعبے میں رکھے ہُوئے 360 بت توڑ ڈالے تو رسُولِ خدا نے تمام حاضرین سے خطاب فرمایا اور قرآنِ حکیم کی روشنی میں بتایا کہ کعبے کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں سے ہوئی تھی اور اسے خالصتاً اللہ رب العالمین ہی کے لیے مخصوص رہنا چاہیے۔ پھر آپ نے یہ

حیرت انگیز اعلان کیا کہ اگلے پچھلے کسی جرم پر کسی کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اس موقع پر آپ نے قرآنِ حکیم میں مندرج وہی آیت پڑھی جو حضرت یوسفؑ نے اپنے مجرم بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے پڑھی تھی کہ لَا تَثْرِیبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ بے شک برادرانِ یوسف نے یوسفؑ کو حسد کی بناء پر جنگلی کنویں میں پھینک کر اور اپنے معزز و محترم والد حضرت یعقوبؑ سے جھوٹ بول کر کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے بہت بڑا ظلم کیا تھا۔ لیکن کیا قریش نے تیرہ طویل برسوں تک نہ صرف بلالؓ جیسے غلام مسلمانوں پر بلکہ خود رسولِ خدا کی ذات پر کوئی کم ظلم روا رکھا تھا؟ سماجی بائیکاٹ سے لے کر طائف میں اتنی شدید سنگ زنی تک کہ سر سے بہنے والے خون سے آپ کی جوتیاں بھی لبالب بھر گئیں، کون سی ایذا تھی جو آپ کو نہ دی گئی ہو۔ اور جب آپؐ رات کے اندھیرے میں ہجرت کے لیے نکلے تو قریش نے بھوکے بھیڑیوں کی طرح آپ کا تعاقب کیا تھا یہاں تک کہ مدینے میں بھی آپ کو امن سے نہ بیٹھنے دیا تھا اور ایک کے بعد دوسری جنگ آپؐ پر مسلط کرتے رہے تھے۔ لیکن آپ کی روحانی جواں مردی ملاحظہ فرمایئے کہ آپ نے اصلاح کی خاطر یہ سب کچھ معاف کر دیا۔

عام معافی کے اس اعلان کے بعد آپؐ نے ایک اعلان اور کیا۔ آپ نے فرمایا، ہماری طرف سے معافی کے واضح اعلان کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جو ہماری حکومت قبول نہ کرنا چاہتے ہوں اس لیے مکّے کے وہ تمام شہری جو مسلمانوں کے تحت امن سے رہنا چاہتے ہیں کسی ایک جگہ پر جمع ہو جائیں۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ حاضرین نے ابوسفیان کے گھر کے صحن میں جمع ہونے کے حق میں رائے دی کیونکہ شہر میں وہی سب سے بڑی چار دیواری تھی۔ رسُولِ خدا نے ایک لمحے کے لیے سوچا، یہ وہی ابوسفیان ہے جس نے میری اور اسلام کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ یہ شخص اور اس کی بیوی سب سے آخر میں بادلِ ناخواستہ مسلمان ہوئے تھے اور اس کی بیوی ہندہ کون تھی؟ یہ وہ کینہ پرور خاتون تھی جس نے ''وحشی'' نامی حبشی کو بھاری انعام کا لالچ دے کر اُحد کی جنگ میں صرف اور صرف اس مقصد سے بھیجا تھا کہ وہ رسُولِ خدا کے ایک عظیم ترین محافظ اور آپؐ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کر دے۔ وحشی اسی تاک میں رہا کہ حمزہ کب اُس کے نیزے کے نشانے پر آتے ہیں۔ موقع پا کر اُس ماہر نیزہ باز نے اپنا ہتھیار حمزہؓ کے سینے میں اتار دیا۔ پھر ہندہ کے کہنے پر اُس نے حمزہ کا سینہ چیرا اور ان کا کلیجہ نکال کر ہندہ کو دیا جس نے اسے اپنے دانتوں سے چبا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

کیا اس ابوسفیان اور اِس ہندہ کے گھر کو جائے امان قرار دینا مناسب ہوگا؟ تاریخ انسانیت کے عظیم ترین روحانی جواں مرد نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر میں معافی کی یہ مثال قائم کر دوں گا تو دوسرے مسلمانوں کے لیے بھی آسان ہو جائے گا کہ وہ اُن لوگوں کو معاف کر دیں جنھوں نے اسلام قبول کرنے کے ''جرم'' میں انھیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ رسُولِ خدا کی رضامندی سے ابوسفیان کے گھر کو جائے امن وامان قرار دے دیا گیا۔ وائے حسرت! آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رسُولِ خدا کے نام لیواؤں کے ہاتھوں آپؐ کے اُمتی خدا کے گھروں (مسجدوں اور امام بارگاہوں) میں بھی امن وامان سے محروم ہیں۔

Marfat.com

آخری حج کا خطبہ

فتحِ مکّہ سے کوئی دو سال بعد، مارچ 632ء کو حج کے موقع پر فجر کی نماز کے بعد رسُولِ خدا حج کی ایک رسم کے مطابق ''عرفات'' تشریف لے گئے۔ وہاں ظہر کی نماز کے بعد آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور آپؐ نے بلند آواز کے ساتھ بظاہر حاضرین سے لیکن روحانی طور پر تمام مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اے لوگو! میری بات غور سے سنو کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اِس سال کے بعد میں تمھارے درمیان رہوں یا نہ رہوں۔ تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری عزت تا قیامت اسی طرح مقدس ہے جس طرح حج کا یہ مقدس مہینہ اور اِس مہینے کا یہ مقدس دن۔ یقیناً وہ دن آنے والا ہے جب تم اپنے ربّ کے سامنے پیش ہو گے اور اپنے اعمال کے لیے جوابدِہ ٹھہرو گے۔ اس لیے جس کسی کے پاس کسی کی امانت پڑی ہے وہ اُسے لوٹا دے اور یاد رکھو، جو جرم کرے گا صرف وہی مجرم گردانا جائے گا۔ باپ کے جرم کا سزاوار اس کا بیٹا نہیں ہوگا اور نہ ہی بیٹے کے جرم کا سزاوار اس کا باپ ہوگا۔ یاد رکھو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان آپس میں ایک برادری ہیں۔ کسی مسلمان بھائی کی کوئی چیز کسی دوسرے مسلمان کے لیے اس وقت تک قانوناً جائز نہیں جب تک کہ وہ خود اپنی خوش دلی سے دوسرے کو نہ دے دے۔ اس لیے کوئی کسی کو ایسا کرنے کے لیے مجبور نہ کرے۔

اے لوگو یاد رکھو! کفر اور جاہلیت کی تمام رسمیں اب پامال ہوگئیں۔ جاہلیت کے دور کے خون اور خون کے بدلے خون، سب معاف ہو گئے۔ سب سے پہلے میں اپنے حلیف ابن ربیعہ بن الحارث کا خون معاف کرتا ہوں۔ اسی طرح اگلا پچھلا سود بھی معاف ہوگیا، البتہ تم لوگ اصل زر کے حقدار ہو۔ اس سلسلے میں بہتر یہی ہے کہ نہ تمھارے ہاتھوں کسی کا نقصان ہو اور نہ کسی کے ہاتھوں تمھارا۔ چونکہ خدا نے سود سے روک دیا ہے اس لیے میں پہل کرتے ہوئے ان تمام رقموں پر سود معاف کرتا ہوں جو میرے چچا عباسؓ بن ابو مطلب نے لوگوں کو قرض دے رکھی ہیں۔

اے لوگو! عورتوں کی بابت خدا سے ڈرتے رہو۔ تم نے خدا کو گواہ بنا کر ان سے شادی کا رشتہ قائم کیا ہے۔ یقیناً تمھیں اُن پر اور اِسی طرح اُنھیں تم پر حقوق حاصل ہیں۔ عورتوں پر قانون نافذ کرتے ہوئے سختی کا نہیں نرمی کا ثبوت دیا کرو۔

اے لوگو! جب تم اپنا امیر چن لو تو اس کی اطاعت کیا کرو خواہ وہ حبشہ (Ethiopia) کا کوئی اپاہج غلام ہی کیوں نہ ہو۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ تمھاری قیادت خدا کے احکام کے مطابق کرتا ہو۔ یقیناً میں تمھارے لیے خدا کی کتاب (قرآنِ حکیم) اور اپنا عمل (سُنّت) اپنی میراث

کے طور پر چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم ان پر ثابت قدم رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

اے لوگو! جہاں تک تمھارے غلاموں کا تعلق ہے ان سے برابری کا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ وہی انھیں کھلاؤ، جو خود پہنو وہی انھیں پہناؤ۔ اگر ان سے کوئی ایسا قصور ہو جائے جو تمھارے نزدیک نا قابلِ معافی ہو تو پھر تم ان سے بے تعلق ہو جاؤ (یعنی وہ جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں چلے جائیں)۔

اے لوگو! تمھارا خدا بھی ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو۔ کسی عرب کو کسی غیر عرب (عجمی) پر فوقیت حاصل نہیں اور نہ ہی کوئی غیر عرب کسی عرب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسی طرح نہ تو کوئی سفید جلد والا کسی کالی جلد والے سے افضل ہے اور نہ ہی کوئی کالی جلد والا کسی سفید جلد والے سے افضل ہے۔ فوقیت اسی کو حاصل ہے جو تم میں سے زیادہ نیک اور فرض شناس ہے۔''

جب رسولؐ خدا انسانی حقوق پر مشتمل تاریخِ انسانیت کا یہ پہلا ''اعلانِ آزادی و مساوات'' (Declaration of Freedom and Equality) کر چکے تو آپؐ نے جہاں خدا کو گواہ بنا کر کہا کہ میں نے تیرا پیغام تیری مخلوق تک پہنچا دیا وہاں خلقِ خدا کو گواہ بنا کر اس سے بھی کہا کہ لوگو! گواہی دو کہ میں نے خدا کی رسالت کا حق ادا کر دیا ہے یا نہیں۔ یاد رہے کہ اس سارے خطاب میں رسولِؐ خدا نے ایک مرتبہ بھی ''اے مسلمانو'' کہہ کر لوگوں کو نہیں پکارا بلکہ ہر مرتبہ اے لوگو (یَا اَیُّھَا النَّاس) ہی کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ خدا کے اس برگزیدہ ترین اور آخری پیغمبر نے عوام الناس کو یہ اعزاز بخشا کہ وہ آپؐ کے بارے میں گواہی دیں حالانکہ آپ کا نیک ترین سے نیک ترین پیرو کار بھی یہ امید لگائے رکھتا ہے کہ جب یومِ حساب آئے گا تو آپؐ ہی کی گواہی سے اس کا بیڑا پار ہوگا۔ یقیناً خدا نے خود بھی انسان کو محض انسان ہونے کے ناتے تکریم بخش رکھی ہے لیکن اس تکریم کو جس خوبصورتی اور علانیہ انداز سے رسولؐ خدا نے لفظی اور عملی جامہ پہنچایا وہ عالی ظرفی اور روحانی جواں مردی کی معراج ہے۔

Marfat.com

گیارھواں باب

روحانی جواں مردی کی مثالیں

رسُولِ خدا کے چند پیروکار

ابوبکر صدیقؓ

ابوبکر مکّے کے ایک معزز اور محترم شہری تھے۔ آپ کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور آپ کی دیانتداری ضرب المثل تھی۔ آپ مکّے میں 573ء کو پیدا اور مدینے میں 23 اگست 634ء کو فوت ہوئے۔ رسُولِ خدا کی وفات کے بعد آپ پہلی اسلامی ریاست کے پہلے خلیفہ بنے۔ آپ کا دورِ حکومت 632ء سے 634ء تک جاری رہا۔

قبولِ اسلام

ابوبکر صدیقؓ رسُولِ خدا کے ہم عمر دوست تھے۔ جب رسُولِ خدا نے نبوت کا اعلان کر دیا تو اس موقع پر وہ تجارت کے سلسلے میں مکّے سے باہر تھے۔ اُن تک یہ خبر پہنچی تو وہ بھاگم بھاگ مکّے پہنچے اور اپنے گھر جانے کے بجائے سیدھے رسُولِ خدا کے گھر پہنچ کر آپ کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ رسُولِ خدا نے اوپر سے جھانکا تو ابوبکرؓ نے کہا "ذرا نیچے آیئے"۔ رسُولِ خدا نے خیال فرمایا کہ ابوبکر کو میرے اعلانِ نبوت کی خبر مل چکی ہے اور وہ پریشان ہیں کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا ہے۔ آپ نے نیچے آ کر دروازہ کھولا اور ابوبکر کو بتانے لگے کہ غارِ حرا میں کس طرح ایک فرشتہ آیا اور اس نے کیا کہا۔ ابوبکرؓ نے سُنی اَن سُنی کر دی اور تکرار کے ساتھ پوچھا، پہلے آپؐ یہ بتایئے کہ کیا آپؐ نے نبوت کا اعلان کر دیا ہے؟ رسُولِ خدا نے ابوبکر کی آنکھوں میں جھانکا، وہاں آپؐ کے لیے محبت کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں، میں نے نبوت کا اعلان کر دیا ہے"۔ ابوبکرؓ نے کہا "میں اور میرا سب کچھ آپؐ پر قربان، ہاتھ بڑھایئے، میں آپؐ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں"۔ رسُولِ خدا نے ہاتھ آگے کر دیا اور یوں بالغ مردوں میں آپ "اول المسلمین" کہلائے۔ آپ کا یہی صِدق تھا جس نے آپ کو "صدیق" کے لقب کا مستحق بنایا۔ دوست پر ایسا ایمان صرف اور صرف کسی روحانی جواں مرد ہی کا شرف ہوتا ہے۔

صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

ہجرت کے بعد 17 مارچ 623ء کو مسلمانوں کو "بدر" کے مقام پر قریش سے پہلی جنگ پیش آئی۔ اس جنگ کی تیاری کے لیے رسُولِ خدا نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ حسبِ توفیق حصہ ڈالیں۔ اقبال نے "بانگِ درا" میں اس واقعے کی

Marfat.com

بڑی ہی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق مسلمان نیک کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔حضرت عمرؓ کے دل میں آئی کہ اس موقع پر وہ ابوبکر صدیقؓ سے بہتر کارگزاری کا مظاہرہ کرسکیں گے کیونکہ وہ ابوبکرؓ کی بہ نسبت زیادہ خوشحال تھے۔جب وہ اپنے حساب سے بہت کچھ لے کر رسولِ خدا کے پاس آئے تو:

پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
کی عرض، نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
پروانے کو چراغ ہے، بُلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خُدا کا رسولؐ بس

خدا کے رسولؐ سے محبت کا دعویٰ تو ہر مسلمان کو ہے لیکن دیکھنے والی بات یہ ہے کہ آپ کی اس سُنت پر ہم میں سے کتنے عمل کرتے ہیں کہ شام ہو جائے تو ہم یہ سوچیں کہ گھر میں ہماری آج کی ضرورت سے اگر کچھ زیادہ موجود ہے تو ہم رات گزرنے سے پہلے وہ ان لوگوں تک پہنچا دیں جو اس کے بغیر بھوکے پیٹ سوئیں گے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ہم ابوبکر صدیقؓ کی طرح سادہ لوح نہیں ہیں کہ رسولِ خدا کی پیروی میں اپنے لیے کچھ بھی نہ رکھیں۔اس طرح کا دیوانہ پن تو روحانی جواں مردوں ہی کا خاصہ ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کا یہ شیوہ کسی ایک دن تک محدود نہ تھا۔رسولِ خدا کی وفات کے بعد مسلمانوں نے آپ کو خلیفۂ رسولؐ کے طور پر اپنا حکمران منتخب کر لیا تو سوال پیدا ہُوا کہ آپ کی گزر اوقات کیونکر ہوگی۔آپ کپڑے کی تجارت کرتے تھے جس کے لیے آپ کو اکثر سفر پر نکلنا پڑتا تھا۔پورے عرب کی حکمرانی کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ آپؓ تجارت کے لیے وقت اور توجہ نہ دے سکتے تھے۔طے ہُوا کہ گزر اوقات کے لیے بیت المال (قومی خزانے) سے آپ کو مناسب رقم یا راشن لینے کا اختیار دے دیا جائے۔چونکہ اختیار آپ کا تھا چنانچہ آپؓ نے مسلمانوں کی ایک ٹولی یہ معلوم کرنے کے لیے مدینے کے بازاروں میں بھیجی کہ اوسط درجے کے ایک مزدور یا کاریگر کی روزانہ اجرت یا کمائی کیا ہے۔غور فرمائیے، یہ چودہ

Marfat.com

صدیاں پہلے کا سستا زمانہ تھا۔ جنگِ عظیم دوم سے پہلے برصغیر میں مزدور کی یومیہ اجرت ایک روپیہ ہوتی تھی۔ صدیوں پہلے تو ایک دو پیسے ہی ہوگی۔ وہی اجرت اسلام کے پہلے خلیفہ نے اپنے لیے مقرر کر دی۔ ہے نا سیدھا سا دیوانہ پن۔ ہم نے تو پاکستان جیسے غریب ملک کے حکمرانوں کو لباس، فرنیچر اور کٹلری تو دور کی بات ہے، پینے کا پانی بھی ولایت سے منگواتے دیکھا ہے۔ پتا نہیں، یہ ابوبکر صدیق کس مٹی سے بنے تھے کہ اپنا نہ سہی، اپنے اہلِ دعیال ہی کا کچھ خیال کیا ہوتا۔ مصیبت بس یہ تھی کہ روحانی جواں مردی کا تقاضا یہی تھا کہ بوریہ نشین پیغمبرؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والے ابوبکر صدیقؓ بھی اپنے اور اپنے اہلِ دعیال کے مفاد سے زیادہ دوسرے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرتے۔

ٹھہریے، اسی ضمن میں ابوبکر صدیقؓ کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ جب رُوکھی سُوکھی کھاتے بہت دن ہو گئے تو ایک روز کھانا کھاتے ہوئے آپؓ نے بیوی سے فرمائش کی، کوئی میٹھی چیز ہے؟ اس نے کہا، جو راشن گھر میں آتا ہے اس میں تو میٹھے کی گنجائش نہیں۔ آپؓ چپ ہو گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اچانک ایک روز کھانے کے بعد بیوی نے آپ کے آگے حلوے کی ایک چھوٹی سی تھالی رکھ دی۔ آپ نے حلوہ تو کھا لیا لیکن کھاتے ہی خیال آیا کہ روزانہ کے راشن میں اس کی گنجائش کہاں سے نکل آئی؟ بیوی نے خوشی خوشی بتایا کہ اُس نے ہر روز دو وقت آٹا گوندھتے ہوئے ایک ایک مٹھی آٹا الگ رکھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مٹھی آٹا کم ہو جانے سے گھر کے افراد کو کسی خاص کمی کا احساس ہی نہ ہُوا۔ جب سیر بھر آٹا جمع ہو گیا تو وہ محلے کے پنساری کے پاس لے گئیں اور اس کے عوض کچھ گڑ لے آئیں۔ بس پھر کیا تھا، تھوڑا آٹا بھونا اور حلوہ تیار۔

ابوبکر صدیقؓ نے بیوی کی فراست پر اُسے شاباش دی لیکن گھر سے نکل کر پہلا کام یہ کیا کہ بیت المال کے منتظم کو پیغام بھیجا کہ آئندہ ہمارے گھر میں روزانہ دو مُٹھی آٹا کم بھیجا کرو کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہمارا اتنے میں بھی گزارا ہو جاتا ہے۔ آج پاکستان میں کم از کم تیس فیصد لوگ ایسے ہیں جنھیں امریکہ کے پالتو کتوں اور بلیوں کی خوراک سے بھی گھٹیا خوراک اتنی مقدار میں نہیں ملتی کہ وہ پیٹ بھر کر سو سکیں۔ لیکن کیا حکمران اور کیا سیاسی اور مذہبی رہنما، سب کے سب اسمبلیوں میں علی الاعلان اپنی تنخواہیں اور الاونس بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور ان کے لیے ضمیر کا کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔ پتا نہیں ابوبکر صدیقؓ کو کیوں نہ سوجھا کہ کچھ اپنی فکر بھی کر لیتے۔ بات اتنی ہے کہ وہ روحانی جواں مرد تھے اور آج کے مسلمانوں کے حکمران طبقے روحانی مُردے ہیں۔

اخلاقی جرأت

عام طور پر حضرت ابوبکرؓ کو نرم دل اور حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کو جرأت مند سمجھا جاتا ہے۔ ابوبکرؓ کا خود بھی اپنے بارے میں یہی خیال تھا۔ ایک روز رسولِ خدا نے مسلمانوں کو اشارتاً یہ بتایا کہ میرے نزدیک میرے بعد تمھیں ابوبکرؓ کو اپنا امیر بنانا چاہیے۔ آپؐ نے اپنی جگہ ابوبکر کو نماز کی امامت کے لیے کھڑا کر دیا۔ ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ میں تو بہت رقیق القلب ہوں، نماز کے دوران مجھ پر اکثر گریہ طاری ہو جاتا ہے اس لیے آپ کسی اور کو یہ اعزاز بخشیں۔

Marfat.com

لیکن رسولِ خدا نے ابوبکرؓ ہی کو اس منصب کے لائق سمجھا کہ جیتے جی، رسولِ خدا ہوتے ہوئے، انؓ کے پیچھے نماز پڑھیں۔
اب ذرا اس رقیق القلب انسان کی روحانی جواں مردی کی تین مثالیں دیکھیے جنھیں دُنیوی زبان میں اخلاقی جرأت (Moral Courage) بھی کہا جاسکتا ہے۔

1۔ رسولِ خدا وفات پا گئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے گویا قیامت آ گئی ہے۔ عمرؓ جیسے جلیل القدر اور بلند حوصلہ قائد یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ رسولِ خدا فوت بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ عمرؓ نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور کہا کہ جو کوئی یہ کہے گا کہ رسولِ خدا وفات پا گئے ہیں میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔
رسولِ خدا سے محبت اور عقیدت آپ کے تمام جاں نثاروں کو تھی لیکن ابوبکرؓ سے بڑھ کر کس کو ہو گی جسے قرآنِ کریم نے بھی آپ کا یارِ غار تسلیم کرتے ہوئے، دو میں سے دوسرا'' اور رسولِ خدا کے'' صاحب'' کا نام دیا تھا۔ جب مسلمانوں میں رسولِ خدا کی وفات سے سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اور انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ دنیا آپؐ کے بغیر اندھیر ہو گئی ہے تو یہی رقیق القلب صاحب رسولؐ اٹھتا ہے اور سب کو پکار کر کہتا ہے، ''تم میں سے جو محمدؐ رسول اللہ کی پرستش کرتا تھا وہ سمجھ لے کہ آپ کی وفات سے اسلام ختم ہو گیا۔ لیکن جو کوئی اللہ رب العالمین کی پرستش کرتا ہے وہ سمجھ لے کہ اللہ کو کوئی فنا نہیں اور اسلام اسی لا فانی اللہ کا لا فانی دین ہے''۔

ابوبکرؓ کے ان تاریخی الفاظ نے جہاں عمرؓ جیسے جید اور جسور مسلمانوں کے ہوش ٹھکانے کر دیے وہاں قیامت تک کے لیے اسلام کو مسیحیت کے برعکس خالصتاً خدا کے دین کا عنوان دے دیا۔ مغرب کے ماہرینِ مشرقیت (Orientalists) نے مقدور بھر زور لگایا ہے کہ جس طرح مسیحؑ کے حوالے سے مسیحیت کی اصطلاح بنی ہے، اسلام کو بھی محمدیت (Muhammadanism) قرار دے دیا جائے۔ لیکن خدا پرست مسلمانوں نے انھیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ یہ ابوبکرؓ ہی کی روحانی جواں مردی تھی جس نے اسلام کی تاریخ کے ایک نہایت نازک موڑ پر بے پناہ اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے فکر و عمل کو راہِ راست پر ڈال دیا تھا۔

2۔ ابوبکرؓ کے مختصر سے عہدِ خلافت (اڑھائی سال) میں تاریخِ اسلام کا ایک اور نازک اور اہم موڑ اُس وقت آیا جب بعض عرب قبائل نے یہ کہہ کر زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا کہ رسولِ خدا کی وفات کے بعد زکوٰۃ واجب نہیں رہی۔ ایک مرتبہ پھر عمرؓ جیسے اولوالعزم مسلمان نے ابوبکر کو مشورہ دیا کہ یہ اسلام کا بہت ہی ابتدائی دور ہے اور فتحِ مکہ کے بعد بہت سے عرب قبائل نے اسلام کی تعلیمات کو دل و جان سے قبول کرنے کے بجائے محض اس لیے قبول کر لیا ہے کہ اس طرح انھیں سیاسی اور معاشرتی فائدے اور وقار حاصل ہو جائے گا، چنانچہ آپ زکوٰۃ دینے سے منکر قبائل پر زیادہ سختی نہ کریں۔ مگر ایک مرتبہ پھر اسی رقیق القلب ابوبکرؓ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ''زکوٰۃ خدا کا حکم ہے اور میں محمدؐ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ میں اس بات کا پابند ہوں کہ اگر کسی پر اونٹ باندھنے کی رسّی کے برابر بھی زکوٰۃ واجب ہے تو میری تلوار اُس وقت تک نیام میں نہ جائے گی جب تک میں اس سے یہ رسّی وصول کر کے اس شخص تک نہ پہنچا دوں جو زکوٰۃ کا مستحق ہے''۔ اور ابوبکرؓ نے

Marfat.com

یہ کر کے بھی دکھا دیا۔ یہ ان کی روحانی جواں مردی کا ایسا یادگار کارنامہ ہے جس کی بدولت مسلمانوں کے امیر طبقے نے زکوٰۃ سے بچنے کے خواہ کتنے ہی راستے نکال رکھے ہوں لیکن کسی نہ کسی حد تک آج بھی خدا کے اس حکم پر عمل ہوتا ہی رہتا ہے اور زکوٰۃ کے سلسلے میں زکوٰۃ خوروں اور زکوٰۃ چوروں کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس حقیقت سے انکار کریں کہ اسلام میں نماز اور روزے کی طرح زکوٰۃ بھی اہم فرض ہے۔

3۔ جیسے ہی رسولِ خدا نے آنکھیں موندیں، عرب کے طول و عرض میں ایک افراتفری سی مچ گئی۔ اگرچہ اسلام کی پہلی ریاست کی بنیاد خود رسولِ خدا ہی نے رکھی تھی اور یہ بھی آپ ہی کے عہد میں طے پا گیا تھا کہ مکے کے بجائے مدینہ اس ریاست کا دارالحکومت ہوگا۔ لیکن رسولِ خدا کی حیثیت صرف اس ریاست کے بانی حکمران کی نہیں تھی، آپؐ اوّل و آخر خدا کے رسول تھے۔ اس لیے جن افراد اور قبائل نے براہِ راست آپؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا ان میں سے اکثر نے آپؐ کی وفات کے بعد یہ سمجھ لیا کہ ہمارا حلفِ وفاداری ختم ہو گیا ہے اور ضروری نہیں کہ ہم اسلامی ریاست کے شہری ہونے کے ناتے ابوبکرؓ کی خلافت کے بھی اسی طرح وفادار ہوں، جیسے رسولِ خدا کی حیات میں آپ کی قیادت کے وفادار ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں دو باتیں خصوصاً یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ صدیوں سے عرب قبائل کسی مرکزی حکومت کے بغیر زندگی گزار رہے تھے۔ رسولِ خدا نے عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پورے عرب کی ایک ریاست اور ایک حکومت قائم کر کے انھیں ایک قوم میں ڈھالا تھا۔ لیکن صدیوں کی عادتیں دنوں میں کہاں جاتی ہیں؟ اسلامی ریاست کے وفادار ہوتے ہوئے کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلے پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا اور یہ بات ہمیشہ کے لیے قبول کر لینا ان جنگجو قبائل کے لیے بہت مشکل تھا جن کی گزراوقات ہی ان حملوں پر منحصر تھی۔ یہی نہیں کہ ان قبیلوں نے یہ کہہ کر زکوٰۃ دینی بند کر دی تھی کہ ہمارا عہد تو محمدؐ رسول اللہ سے تھا لہٰذا اب آپ کی وفات کے بعد ہم زکوٰۃ دینے کے پابند نہیں بلکہ انھوں نے پرانی عداوتوں اور نئی ضرورتوں کے تحت ایک دوسرے کے خلاف حملے بھی شروع کر دیے تھے۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ رسولِ خدا کو جو فیصلہ کن حیثیت حاصل تھی وہ خدا کا رسول ہونے کی وجہ سے تھی۔ چنانچہ جن قبائل نے اسلامی ریاست کے نئے نئے غیر مستحکم اقتدار کو چیلنج کیا، انھوں نے ضروری سمجھا کہ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیں کہ ان کے ہاں ایک نیا نبی پیدا ہو گیا ہے۔ اس روش نے نہ صرف ایک دُنیوی فتنہ کھڑا کر دیا بلکہ دینی سطح پر بھی انتشار کی آگ بھڑکا دی۔ تاریخِ اسلام میں اسے فتنۂ اِرتداد کا نام دیا گیا ہے۔ اس فتنے کا ایسا تدارک کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا کہ جس سے نئی نئی قائم ہونے والی اسلامی ریاست بھی توڑ پھوڑ سے بچ جائے، ایک باضابطہ دین کے طور پر اسلام کو بھی کوئی ضعف نہ پہنچے اور رسولِ خدا کی ختمی نبوت پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔ ابوبکرؓ نے کمال جرأت اور انتہائی بصیرت افروز حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے، نرمی اور سختی کے حسین ترین امتزاج سے اِس فتنے کا اس طرح خاتمہ کیا کہ دنیا کی پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد مضبوط تر ہو گئی، رسولِ خدا کو تمام مسلمانوں نے آخری اور ختمی نبی تسلیم کر لیا اور عرب کے جنگجو قبائل کا رخ

Marfat.com

باہر کی جانب مڑ گیا۔ یہ ابوبکرؓ ہی کی روحانی جواں مردی تھی جس نے رسُولِ خدا کی وفات کے بعد اُٹھنے والے انکارِ زکوٰۃ اور ارتداد جیسے فتنوں کو ختم کر کے اسلام کی روحانی وحدت کو مضبوط بنایا اور سیاسی طور پر متحارب قبائل کو غیر اسلامی علاقوں کی طرف متوجہ کر کے اسلام کو بالآخر دنیا کی ایک عظیم ترین قوت بنا دیا۔ آپ کے اسی اقدام اور حکمت عملی کو جاری رکھ کر دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے روم اور فارس کی عظیم سلطنتوں کو اسلام کے سامنے سرنگوں کیا تھا۔ یاد رہے کہ حمزہؓ، عمرؓ اور علیؓ کے برعکس ابوبکرؓ کوئی جیالے جنگجو یا پہلوان نہیں تھے۔ ان کی تمام تر اخلاقی جرأت کا سرچشمہ ان کی روحانی جواں مردی ہی تھی۔

عمرؓ، فاروقِ اعظم

ابوبکرؓ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے خلیفہ بننے والے اور تاریخ میں امیر المومنین کہلانے والے پہلے شخص حضرت عمرؓ فاروق کی ساری زندگی ہی روحانی جواں مردی کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی اور مُنہ بولتی مثال تھی۔ مگر اس کتاب کی تنگی داماں کا تقاضا ہے کہ ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف چند واقعات پر قناعت کریں۔

قبولِ اسلام

عمرؓ اپنے وقت کے ایک جانے پہچانے جسور و غیور انسان تھے۔ قد کاٹھ، جسمانی طاقت، قوتِ فیصلہ اور جرأت و شجاعت میں بہت کم کوئی آپ کا ثانی تھا۔ اوپر سے طبیعت بھی جلالی پائی تھی۔ جب رسُولِ خدا نے نبوت کا اعلان کر کے لوگوں کو بت پرستی اور جاہلیت کی رسم و رواج چھوڑ کر خدائے وحدہٗ لاشریک اور باہمی محبت و مساوات کی طرف بلانا شروع کیا تو عمر کے کان کھڑے ہو گئے۔ جیسے جیسے لوگ رسُولِ خدا کے ہاتھ پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے، آپؐ کے خلاف عمر کا غصہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ آخر ایک روز انھوں نے ٹھانی کہ کیوں نہ محمد کو قتل کر دیا جائے تا کہ اسلام کی جڑ ہی کٹ جائے۔ چنانچہ وہ ننگی تلوار لیے، غصے میں بھرے اس مقام کی طرف چل پڑے جہاں رسُولِ خدا اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ قیام کر رہے تھے۔

راستے میں جس کسی نے انھیں یوں بپھرے ہوئے دیکھا، اس نے پوچھا، ''اے عمر! خیر تو ہے، ننگی تلوار لیے کِدھر جا رہے ہو''۔ انھوں نے دھڑلے سے یہی جواب دیا، ''آج میں محمد کو قتل کر کے اسلام کا ٹنٹا ہی مٹانے جا رہا ہوں''۔ یاد رہے کہ رسُولِ خدا کو قتل کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ اتنا آسان ہوتا تو آپؐ اس وقت تک قتل ہو چکے ہوتے۔ عرب کی قبائلی زندگی میں بنی ہاشم کے اس چشم و چراغ اور کعبے کے نیک نام متولی ابو مطلب کے پوتے کو قتل کرنے کا مطلب اس پورے قبیلے اور خاندان سے دشمنی مول لینا تھا۔ اس لحاظ سے عمر جو کام کرنے نکلے تھے وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہر حال چلتے چلتے انھیں ایک شخص ملا جس نے دوسروں کی طرح وہی سوال کیا اور عمر نے بھی پہلے کی طرح اسے وہی جواب دیا۔ لیکن اس شخص نے عمر کو ایک ایسی دھماکہ خیز اطلاع دی جس نے ان کے ہوش گم کر دیے۔ اس نے کہا، ''تم محمد کو قتل کرنے جا رہے ہو تا کہ اسلام کا جڑ سے خاتمہ ہو جائے لیکن اسلام تو تمھارے اپنے گھر کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ کیا تم

جانتے نہیں کہ تمھاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں؟''

عمرؓ طیش میں آ گئے، ''یہ بات ہے، محمدؐ سے تو میں بعد میں نبٹ لوں گا، پہلے اپنے گھر والوں کی خبر تو لے لوں''۔ یہ کہہ کر انھوں نے راستہ بدلا اور سیدھے اپنے بہنوئی کے گھر جا پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے ہی اندر سے قرآن حکیم کی تلاوت کا آہنگ سنائی دے گیا۔ پھر کیا تھا، غصے میں دروازہ پیٹا اور جب بہن نے دروازہ کھولا تو علیک سلیک کے بغیر ہی اسے پیٹنے لگ گئے۔ جب وہ ادھ موئی سی ہو کر گر گئی تو یہی سلوک بہنوئی کے ساتھ بھی کیا۔ پھر ایک ذرا دم لینے کو رُکے تو کہا، ''اگر تم نے اسلام سے روگردانی نہ کی تو میں تم دونوں کو قتل کر ڈالوں گا''۔ اس پر بہن نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''بھائی! تم بے شک ہمیں قتل کر دو لیکن ہم اسلام کو ترک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے''۔

عمر یہ سن کر سکتے میں آ گئے کہ آخر اسلام میں ایسا کیا جادو ہے کہ جو مسلمان ہو جاتا ہے وہ نہ تو لالچ سے اسے ترک کرتا ہے اور نہ ہی سخت سے سخت ایذا سے۔ تھوڑا نرم پڑ کر بولے، ''اچھا ذرا میں بھی تو سنوں تم دونوں کیا پڑھ رہے تھے؟'' بہنوئی نے خوش الحانی سے سورہ طٰہٰ کی تلاوت شروع کر دی۔ عمر خاموشی سے سننے لگے۔ پھر یوں ہُوا کہ تلاوت کانوں کے راستے اُن کے دِل میں اُترنے لگی اور عمر کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بہن اور بہنوئی سے معافی مانگی، اور ایک عجیب سرمستی کے عالم میں اسی طرح ننگی تلوار تانے تیز تیز قدموں سے رسُولِ خدا کے ڈیرے کی طرف چل دیے۔

رسُولِ خدا اُس وقت جس گھر میں مقیم تھے وہ ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ آپؐ کے ایک جاں نثار محافظ نے خبر دی کہ عمر بن خطاب ننگی تلوار لیے بڑھے آتے ہیں۔ رسُولِ خدا کے پاس اس وقت آپ کے چچا حمزہؓ بھی تشریف رکھتے تھے جن کی بہادری کا پورے عرب میں شہرہ تھا۔ انھوں نے باہر نکل کر دیکھا، عمر واقعی والہانہ انداز سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ حمزہؓ نے اندر آ کر رسُولِ خدا سے کہا، ''اللہ ہمارا مددگار ہے۔ اگر تو عمر اچھی نیت سے آ رہا ہے تو شوق سے آئے نہیں تو میں اسی کی تلوار سے اس کا سر اڑا دوں گا''۔ رسُولِ خدا نے فرمایا، ''میں ایک عرصے سے دعا کر رہا ہوں کہ ربّ العزت مکّے کے دو عمروں میں سے کم از کم ایک کو ضرور اسلام کی خدمت کا شرف بخش دے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا نے میری التجا سن لی ہو''۔ یاد رہے کہ ایک عمر تو یہی عمر بن خطاب تھے اور دوسرا اسلام کا مشہور دشمن ابو جہل تھا جس کا اصل نام بھی عمر ہی تھا۔

جب عمر عین دروازے پر پہنچ گئے تو حمزہؓ نے باہر نکل کر پوچھا، ''عمر! کس نیت سے آئے ہو''۔ عمر نے ایک لحظہ رُکے بغیر کہا، ''اسلام لانے کے لیے''۔ حمزہؓ نے دروازہ کھول دیا۔ عمر نے رسُولِ خدا سے ہاتھ آگے بڑھانے کی درخواست کی۔ پھر چشمِ فلک اور تاریخ نے دیکھا کہ عمرؓ نے اتنی محبت، اتنے خلوص اور اتنی ثابت قدمی سے رسُولِ خدا کا ہاتھ تھاما کہ اسلام کا ایک عظیم ترین قلعہ بن گئے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس واقعے میں روحانی جواں مردی کا کیا دخل ہے؟

پہلا نکتہ تو یہ ہے کہ عمرؓ کو ابو جہل ہی کی طرح اسلام کا شدید ترین دشمن سمجھا جاتا تھا۔ جب کسی شخص کو ایک خاص رویّے کی بنا پر اپنے معاشرے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اس رویّے کو پہلے سے زیادہ مستحکم بناتا رہے۔ اس رویّے کو یکدم اور یکسر ترک کر دینے والے شخص کو اس کا معاشرہ عزت کے بجائے تحقیر کی نظر سے

Marfat.com

دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اور اس روز عمرؓ نے یہی کچھ کیا تھا۔ یہی نہیں، شہر کے بھرے بازاروں سے وہ اسی روز علی الاعلان یہ کہتے ہوئے گزرے تھے کہ میں محمد کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ یہ نہ بھولیے کہ اس ایک چھوٹے سے فقرے نے کہ "لوگ کیا کہیں گے" تاریخ انسانیت میں کروڑوں انسانوں کو حقیقت واضح ہو جانے پر بھی اسے قبول کر لینے اور ماضی کے غلط رویے کو ترک کر دینے سے روکا ہے۔ اگر عمر اس روز واقعی رسولِ خدا کو قتل کر ڈالتے تو مکے کا ہر مرد، عورت اور بچہ تالیاں بجا بجا کر انھیں داد دیتا۔ لیکن وہ عمر جسے پورے شہر میں بات کا پکا اور قول کا سچا کہا جاتا تھا اس نے تو آج اپنے سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بھائی صاحب نکلے تو محمد کو قتل کرنے تھے اور پلٹے تو محمدؐ کے جاں نثار بن کر۔ ایسی کایا پلٹ کا مظاہرہ کوئی ایسا ہی فرد کر سکتا ہے جو صرف جواں مرد ہی نہیں، بلند پایہ روحانی جواں مرد ہو۔

امیر المومنین کا کُرتا

عمرؓ خلیفہ بن چکے تھے۔ آپؓ کے زیر قیادت مسلمان عرب سے باہر نکل کر عراق اور شام میں فتح پر فتح حاصل کر رہے تھے۔ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خُمس) مدینے پہنچ رہا تھا اور جہاد میں حصہ نہ لینے والے ضرورت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ ایک روز عمرؓ مدینے کے ایک چوک میں اہلِ شہر سے خطاب کر رہے تھے۔ ابھی انھوں نے تمہید ہی باندھی تھی کہ حاضرین میں سے ایک شخص بول اٹھا، "عمرؓ! میں تمھاری بات تب سنوں گا جب پہلے تم یہ وضاحت کرو گے کہ تم نے جو یہ نیا کُرتا پہن رکھا ہے یہ بنا کیسے ہے؟ تمھارا قد عام لوگوں سے کہیں لمبا ہے۔ ہم سب کو مالِ غنیمت میں سے ایک ایک چادر ملی ہے۔ تمھیں بھی اصولاً ایک ہی چادر ملنی چاہئے تھی۔ ایک چادر سے تو تم جیسے لمبے شخص کا کرتا بننے سے رہا۔ بولو! پھر یہ کیسے بنا ہے؟"

عمرؓ نے طیش میں آئے بغیر مجمعے پر نظر دوڑائی، پچھلی صفوں میں آپ کا بیٹا، عبداللہ بن عمرؓ، کھڑا تھا۔ آپ نے کہا، "عبداللہ، تم بتاؤ میرا یہ کرتا کیسے بنا ہے؟" عبداللہؓ نے وضاحت کی، "دوسرے لوگوں کی طرح مجھے اور میرے والد امیر المومنین عمر کو بھی ایک ایک چادر ملی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے بابا کا کُرتا میرے کُرتے سے کہیں زیادہ بوسیدہ ہو چکا ہے تو میں نے تجویز پیش کی، "بابا، آپ کی طرح میرا قد بھی بہت لمبا ہے، ایک چادر سے نہ تو آپ کا کرتا بن سکتا ہے اور نہ میرا۔ چونکہ آپ کا کرتا جا بجا پیوند لگنے کے باوجود بالکل پھٹنے کو ہے اس لیے میں اس مرتبہ اپنی چادر آپ کو دے دیتا ہوں تاکہ دو چادروں سے آپ کا کرتا بن جائے۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی مزید مالِ غنیمت آئے گا۔ تب آپ اپنے حصے کی چادر مجھے دے دینا تاکہ دو چادروں سے میرا بھی کرتا بن جائے"۔

یہ سن کر اعتراض کرنے والے شخص نے کہا، "ٹھیک ہے، بات میری سمجھ میں آ گئی ہے اس لیے عمرؓ! اب بولو، تم کیا کہنا چاہتے ہو"۔

عام طور پر اس واقعے کو اسلامی مساوات کی ایک شاندار مثال سمجھا جاتا ہے لیکن یہ انسانی آزادی اور جمہوری احتساب کی بھی اُتنی ہی شاندار مثال ہے۔ عمرؓ جیسے جلال اور دبدبے کے مالک خلیفۂ وقت نے یوں سرِ عام ٹوکے جانے پر

Marfat.com

نہ تو خود اس شخص کو سرزنش کی اور نہ ہی کسی خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں کو اسے جوتے لگانے کے لیے اس کے گھر بھیجا۔ ذرا آج کے 57 نام نہاد اسلامی ملکوں اور ان کی نام نہاد مسلمان قیادت کے بادشاہانہ اور آمرانہ رویوں پر نگاہ دوڑائیے تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ امیرالمومنین عمرؓ فاروقِ اعظم کے رویے کے پیچھے برداشت، بردباری اور حساب دہی (Accountability) کی بنیادوں پر استوار ہونے والی کتنی عظیم روحانی جواں مردی کارفرما تھی۔

بیت المقدس (یروشلم) میں آمد

جب 638ء میں مسلمانوں نے پہلی مرتبہ یروشلم (القدس یا بیت المقدس) فتح کیا تو اس ''قبلۂ اوّل'' کے متولی، سافرونیس (Sophronius) نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کا خلیفہ خود آ کر اس مقدس شہر کی چابیاں وصول کرے۔ عمرؓ خود بھی ہجرت کے بعد رسولِ خدا کی امامت میں یروشلم کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے تھے اور انھیں ابراہیمؑ، داوٗدؑ، سلیمانؑ اور عیسیٰؑ ہی کے حوالے سے نہیں، رسولِ خدا کے سفرِ معراج کے پہلے پڑاؤ کے طور پر بھی اس شہر سے گہری عقیدت تھی۔ انھوں نے سافرونیس کی درخواست قبول کر لی اور یروشلم کی طرف چل پڑے۔

ذرا رُک کر یہ دیکھیے کہ اگر آج کسی نئے ہوائی اڈے یا بندرگاہ کا افتتاح کرنا ہو تو ہمارے صدر یا وزیراعظم کس شان و شوکت سے وہاں تشریف لے جاتے ہیں اور ان کی تشریف آوری سے پہلے ان کی قیمتی جان کی حفاظت کے لیے کس طرح فوج اور پولیس کے سیکڑوں ہتھیار بردار جوان ان راہوں پر پہرہ دے رہے ہوتے ہیں جہاں سے اس قیمتی جان نے گزرنا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ منظر بھی دیکھیے، کہ غیر مسلم دُنیا کے ایک مشہور ترین، اہم ترین اور مقدس ترین شہر کا قبضہ لینے کے لیے امیرالمومنین عمرؓ کس سادگی سے وہاں پہنچتے ہیں۔

آپؓ نے ایک خادم ساتھ لیا اور ایک اونٹ پر کچھ زادِراہ لاد کر اس انداز سے سفر شروع کیا کہ دن کا آدھا وقت آپ اونٹ پر سوار ہوتے اور اس دوران خادم اونٹ کی مہار پکڑے آگے آگے پیدل چلتا اور آدھا وقت خادم اونٹ پر بیٹھتا اور آپؓ اونٹ کی رسی تھامے آگے آگے پیدل چلتے۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ جب سفر کی آخری منزل آئی تو یروشلم کی فصیلوں سے باہر آپ کا استقبال کرنے کے لیے آئے ہوئے شہر کے یہودی اور مسیحی معززین اور مسلمان فاتحین نے یہ عجیب منظر دیکھا کہ عرب، عراق، شام، مصر اور ایران کا حاکم ایک اونٹ کی رسی پکڑے چلا آرہا ہے جبکہ اس کا خادم اونٹ پر بیٹھا ہے۔ سافرونیس نے یروشلم کی چابیاں عمرؓ فاررقِ اعظم کو پیش کرتے ہوئے کہا، ''یروشلم کو بجا طور پر ''شہرِ خدا'' (The City of God) کہا جاتا ہے، آج میں اس ''شہرِ خدا'' کا قبضہ بخوشی ایک ''مردِ خدا'' کے ہاتھ میں دیتا ہوں''۔

جب یہی ''شہرِ خدا'' 1099ء میں عیسائی مجاہدین (Crusaders) کے ہاتھ آیا تو وہاں آباد ہر یہودی اور مسلمان کو بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ لیکن جب مردِ خدا عمرؓ فاروقِ اعظم نے اس کی چابیاں وصول کی تھیں تو ''شہرِ خدا، مکّہ'' کی فتح کے موقع پر جو روّیہ محبوبِ خداؐ نے اس کے باسیوں کی بابت اپنایا تھا اسی کی پیروی میں اُنھوں نے حکم دیا کہ یروشلم کے ہر یہودی اور عیسائی باشندے کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے اور کس کی مجال

Marfat.com

تھی کہ اُس مردِ خدا، مردِ درویش، مردِ مومن اور مردِ مسلمان کے حکم کی سرتابی کرتا جس نے اپنے مرشد پاک کی طرح اپنی عبادت اپنا وتیرہ، اپنی زندگی اور اپنی موت اللہ رب العالمین کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

کُتے کی موت اور مینارِ پاکستان

جس وقت یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں پاکستان کے کم از کم پانچ کروڑ شہری بھوک سے بے حال ہیں اور بے روزگاری، بیماری اور بے ہنری کے باعث غربی کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان میں سے کوئی نہ کوئی لاہور میں واقع مینارِ پاکستان سے کود کر قائدِ اعظمؒ کے وارثوں کو شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اُس مردِ خدا نے کہہ رکھا تھا کہ اگر پاکستان میں غریب مسلمان کو عزت کے ساتھ دو وقت کی روٹی نہیں ملتی تو ایسا پاکستان بنانے سے بہتر ہے کہ اسے بنایا ہی نہ جائے۔ مگر محسوس یہی ہوتا ہے کہ ملک بنا ہی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سیاسی ملاؤں، عیاش پیرزادوں اور طالع آزما وردی پوشوں کے لیے تھا۔

کیا ان خودکشیوں سے پاکستان کے حکمران طبقے کے کان پر جوں بھی رینگتی ہے؟ نہیں! ہرگز نہیں۔ صرف پاکستان کے حکمران طبقے ہی کا نہیں، پورے عالمِ اسلام کے مسلمان حکمرانوں کا یہی حال ہے۔ ابھی کل کی بات ہے، امریکہ میں سعودی عرب کے سفیر شہزادہ بندر بن سلطان نے مستعفی ہونے والے امریکی وزیرِ خارجہ، جنرل کولن پاول کے اعزاز میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ اس ضیافت میں شریک ہونے والے ایک صاحب نے ایک معتبر امریکی ہفت روزے: Newsweek کو بتایا کہ جس ایک میز پر میں بیٹھا تھا اس پر جو نایاب خوراک (خصوصاً مچھلی کے انڈے جنھیں Caviar کہتے ہیں) رکھی تھی اس سے اعلیٰ درجے کی تیس (30) نئی کاریں خریدی جا سکتی تھیں۔

اس پس منظر میں امیر المومنین عمرؓ فاروقِ اعظم کے دو جملے سن لیجیے، آپ پر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ایک روحانی جواں مرد اور روحانی طور پر مردہ حکمران میں کیا فرق ہوتا ہے۔

1- کسی ہم دمِ دیرینہ نے عمرؓ سے پوچھا، ''ایک وقت تھا کہ بھرے مجمع میں تمھیں دُور سے پہچانا جا سکتا تھا۔ دوسروں کی طرح کھڑے تو تم بھی زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن محسوس یوں ہوتا تھا جیسے تم گھوڑے پر بیٹھے ہو۔ اور اب میں دیکھتا ہوں تو تمھاری کمر دُہری ہوتی جا رہی ہے اور سر کے بال یا تو جھڑ گئے ہیں یا سفید ہو گئے ہیں۔ خدا نے تمھیں اتنی عزت دی ہے۔ تمھارے دور میں مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کی ناقابلِ تسخیر سمجھی جانے والی سلطنتوں کو سرنگوں کر دیا ہے۔ آخر تمھیں کیا فکر کھائے جا رہی ہے؟'' عمرؓ نے نظریں جھکا کر جواب دیا''، میں رات رات بھر یہ سوچ کر سو نہیں سکتا کہ میرے دورِ حکومت میں دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو میں خدا کو کیا جواب دوں گا''۔

کیا آپ کے خیال میں عالمِ اسلام کے عموماً اور پاکستان کے خصوصاً کسی ایک حکمران نے بھی اس قسم کی فکر پال رکھی ہے؟ کمال ہے، کیا آپ انھیں اتنا ہی سادہ سمجھتے ہیں؟ نہیں جناب، وہ بہت ہوشیار ہیں، دُور دراز فرات کے کنارے نہیں، یہیں اپنے سندھ اور چناب کے کناروں پر روز بیسیوں کُتے نہیں انسان بھی بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر

جائیں تو ان کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوتا اور اگر کسی اور وجہ سے ہو بھی جائے تو جھٹ پٹ کوئی اے، بی، سی مارکہ خضاب لگا کرا سے کالا کر لیتے ہیں۔

2- اب عمرؓ فاروقِ اعظم کا دوسرا جملہ بھی سن لیں۔ جب سے آپؓ خلیفہ بنے تھے صرف اور صرف جَو کے آٹے کی روٹی کھاتے تھے۔ جب عرب سے باہر فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ڈھیروں مالِ غنیمت مدینے پہنچنے لگا تو بہت سے خوشحال گھرانے گندم کے آٹے کی روٹی کھانے لگے۔ لیکن امیر المومنین عمرؓ تب بھی جو ہی کی روٹی کھاتے رہے۔ ایک مرتبہ پھر کسی ہمدمِ دیرینہ نے پوچھا، ''خدا تمھارا بھلا کرے، عمرؓ! اب تو ہر دوسرا مسلمان گندم کی روٹی کھا رہا ہے، تم اپنے ساتھ اتنی سختی کیوں کرتے ہو، کیا مسلمانوں کے خلیفہ کو یہ حق نہیں کہ وہ بھی گندم کی روٹی کھا لے؟'' اس مرتبہ عمرؓ نے نظریں جھکانے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ''خلیفہ ہوتے ہوئے مجھے یہ حق اُس دن پہنچے گا جب ہر دوسرا نہیں، ہر ایک مسلمان گندم کی روٹی کھا رہا ہوگا''۔ کیا آج کوئی ایک مسلمان حکمران بھی ایسا ہے جسے انواع و اقسام کے کھانے حلق سے اتارتے ہوئے یہ سوچ کر اُچھو آ جاتا ہو کہ عین اس وقت کتنے ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان، اور وہ بھی مسلمان، اُن کے زیرِ حکومت، بھوکے یا نیم بھوکے بیٹھے ہیں اور انھیں گندم چھوڑ جو یا باجرے کی روٹی بھی میسر نہیں آئی۔ آج، اس وقت، سوڈان میں دارفور کے اُن لاکھوں سیاہ فام مسلمان پناہ گزینوں ہی کو دیکھ لیں جنھیں خود ان کے اپنے عرب لیکن سفید رنگ مسلمان ''بھائیوں'' نے ان کے گاؤں جلا کر اور انھیں گھروں سے نکال کر غیر مسلم امدادی تنظیموں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ ایک میز پر تیس نئی کاروں کی قیمت کے برابر خوراک پیش کرنے والے کسی بھی عرب یا غیر عرب مسلمان حکمران کو اتنی بھی توفیق نہیں ہو رہی کہ ان ستم رسیدہ مسلمانوں کے لیے ایک تنکا بھی توڑ سکیں۔ وجہ؟ یہ لوگ عمرؓ فاروقِ اعظم کی طرح روحانی جواں مرد نہیں، روحانی طور پر مردہ ہیں۔ یہ الگ بات کہ اپنی بے لگام مردانگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے وہ یورپ اور امریکہ کے پُرعیش شبستانوں میں ایک ایک رات کے اندر کروڑ کروڑ روپے (یا ڈالر؟) ہوا میں اڑا دیں۔

بظاہر تو عمرؓ کی روحانی جواں مردی کی تصویر مکمل ہو گئی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ وہ کہانیاں جو آج سے سو، پچاس سال پہلے ہر مسلمان بچے کے کان میں کہیں نہ کہیں سے پڑ ہی جاتی تھیں، آج کے مصروف ماں باپ کی، ٹیلی وژن اور کمپیوٹر گیموں پر پلنے والی بے استاد اولاد، شاید ان سے محروم رہ جاتی ہو، عمرؓ کے ابتدائی عہدِ حکومت کی ایک کہانی بیان کر دینا مناسب دکھائی دیتا ہے۔

امیر المومنین عمرؓ کا سارا سارا دن لحہ بہ لحہ پھیلتی چلی جانے والی اسلامی ریاست کے گوناگوں مسائل سے عہدہ برآ ہونے میں گزرتا تھا۔ پھر بھی رات کو وہ مدینے کے گلی کوچوں میں یہ دیکھتے پھرتے تھے کہ امن و امان قائم ہے یا نہیں۔ ایک رات وہ ایک گلی سے گزرے تو انھیں ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ وہیں یہ دیکھنے کے لیے رُک گئے کہ کیا معاملہ ہے۔ گھر کی کچی دیوار سے آنگن میں جھانک کر دیکھا تو ایک عورت چولھے کے پاس بیٹھی کچھ پکا

رہی تھی اوراس کے گرد تین چار بچے بیٹھے رہ رہ کر رو رہے تھے۔ آپؓ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس عورت نے دروازہ کھولا تو آپ نے پوچھا، ''بہن، بچے کیوں رو رہے ہیں؟'' عورت سخت جھلائی ہوئی تھی، بولی، ''عمرؓ کی جان کو رو رہے ہیں۔ آیا بڑا امیرالمومنین، میرے بچوں کو تو اس کے دور میں روٹی بھی میسر نہیں''۔ آپؓ نے صبر سے کام لیتے ہوئے کہا، ''چولھے پر کیا پک رہا ہے''؟ عورت نے کہا، ''خالی پانی ابل رہا ہے، بچوں کو دلاسا دے رہی ہوں کہ ابھی کھانا پک جائے گا، سوچتی ہوں، خود ہی رو دھو کر سو جائیں گے''۔ عمرؓ نے کہا، ''بہن، تم ذرا بچوں کو بہلاؤ، میں ابھی کھانے کو کچھ لاتا ہوں''۔

یہ کہہ کر مسلمانوں کا حاکمِ وقت، جس کے فقرِ غیور کا یہ دبدبہ تھا کہ اسلامی لشکروں کے بڑے بڑے سپہ سالار اور غیر اسلامی ملکوں کے بادشاہ آپ کا نام سن کر لرزتے تھے، وہاں سے بھاگم بھاگ بیت المال پہنچا، اپنی پیٹھ پر آٹے کا ایک بورا لادا، دونوں ہاتھوں میں نمک، مرچ اور گڑ، دال جیسا جو خشک راشن اس وقت وہاں موجود تھا اٹھایا اور اسی طرح بھاگم بھاگ اس خاتون کے گھر واپس آیا۔ خاتون نے جلدی میں جو دال روٹی تیار ہو سکتی تھی، تیار کر کے بچوں کے آگے رکھی۔ آپ اس دوران وہیں ایک کونے میں دبکے بیٹھے تھے۔ جب بچے کھا پی کر لیٹ گئے تو خاتون نے کہا، ''اے رحمت کے فرشتے، کیا ہی بہتر ہوتا اگر عمر کی جگہ تم امیرالمومنین ہوتے''۔ آپؓ نے سر جھکا کر جواب دیا''، بہن میں ہی عمر ہوں اور آپ سے اپنی کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں دل و جان سے کوشش کروں گا کہ حالات بہتر ہو جائیں''۔

حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں۔ مسلمان بادشاہ، جاگیردار، جرنیل، سرمایہ دار، افسر، سیاسی مُلّا اور پیرزادے دُنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور امیر ترین ملکوں کے حکمرانوں سے بھی اونچے معیارِ زندگی کے مطابق شاندار محلات اور کوٹھیوں میں رہ رہے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں میں پڑی ہے۔ ان کی اولادیں بیرونِ ملک تعلیم کے نام پر سیر سپاٹا کر رہی ہیں۔ بس ایک ہی کمی ہے۔ ان کی ''تمام تر کوشش'' کے باوجود نہ جانے ان کے کروڑوں بھوکے ننگے، جاہل، کاہل، بیمار، لاچار ہم وطنوں میں ان کی طرح ترقی کرنے کا جذبہ کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ سچے ہیں یہ لوگ کیونکہ ''خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا''۔ جو کام خدا نہیں کر سکتا وہ یہ بیچارے حکمران کیسے کر سکتے ہیں؟

افسوس تو اس بات کا ہے کہ پھر یہ لوگ حالات بدل دینے کے وعدے اور دعوے کیوں کرتے ہیں اور اگر حالات کی بہتری میں ان کا سرے سے کوئی کردار ہی نہیں تو قوم ان کے اللّے تللّے کیوں برداشت کرتی ہے، اُنھیں جوتے لگا کر گھر کیوں نہیں بھیج دیتی۔

ذکرِ عمرؓ کا ہو تو خواہ مخواہ تحریر میں جلالی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے اب کسی متوازن مزاج کے روحانی جواں مرد کی بات کریں۔

Marfat.com

علیؓ، حیدرِ کرّار

اگر چہ علیؓ کے کچھ پرستار عمرؓ کی بابت خاصا درشت رویہ رکھتے ہیں لیکن تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کچھ اور ہی کہتا سنائی دیتا ہے۔ ایک مثال: جب عمرؓ مدینہ سے بیت المقدس کے لیے روانہ ہوئے تو انھوں نے جس شخص کو اپنی جگہ امورِ سلطنت نبٹانے کے لیے چنا وہ علیؓ ہی تھے۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ راز بھی کھل سکتا ہے کہ جس طرح رسولؐ خدا نے اپنی وفات سے پہلے ابوبکر کو اپنی جگہ نماز کی امامت کرنے کے لیے کہا تھا اور خود ان کی امامت میں نماز ادا کی تھی اور یوں مسلمانوں کو اشارتاً بتا دیا تھا کہ میرے نزدیک میرے بعد تمھاری قیادت کے لائق کون ہے، اسی طرح عمرؓ بن خطاب نے علیؓ بن ابی طالب کو اپنی زندگی میں اپنی مسند پر بٹھا کر واضح کر دیا تھا کہ میرے بعد کوئی اس ذمہ داری کے لائق ہے تو وہ کون ہے۔ البتہ نہ تو رسولؐ خدا نے مسلمانوں پر ریاست کے امور میں اپنی رائے ٹھونسی اور نہ ہی عمرؓ نے۔

قبولِ اسلام

علیؓ کو اسلام کی ابتداء ہی سے مسلمانوں میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ رسولؐ خدا نے خدا کے حکم کے مطابق اپنے خاندان اور اہلِ خانہ کو دعوت اسلام دینے کے لیے بلایا (26:214) اور ان کی خاطر مدارات کرنے کے بعد یہ پوچھا کہ ''اگر میں آپ لوگوں سے کہوں کہ جس ٹیلے کے سایے میں ہم بیٹھے ہیں اس کے پیچھے سے ہمارے خاندان کا کوئی دشمن ہم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا آپ میری بات کا یقین کر لیں گے''۔ تمام حاضرین نے بیک زبان کہا، ''کیوں نہیں، اے محمدؐ، آپ نے تو کبھی جھوٹ بولا ہی نہیں، ہم لازماً آپ کی بات پر یقین کر لیں گے''۔ تب رسولؐ خدا نے کہا، ''میں اللہ رب العالمین کا رسول ہوں اور میں آپ کو بت پرستی اور شرک کے بجائے خدائے واحد کے دین کی طرف بلاتا ہوں۔ آپ میں سے کون کون میری دعوت پر اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہے''؟

علیؓ جو رسولؐ خدا کے چچا ابوطالب کے بیٹے ہونے کے ناطے آپ کے چچازاد بھائی تھے، اس وقت صرف تیرہ سال کے تھے۔ جب حاضرین میں سے کسی ایک بھی فرد نے اسلام قبول کرنے کی ہامی نہ بھری تو جواں سال جواں مرد علیؓ نے کہا، ''یا محمدؐ، میں آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہوں''۔

اس وقت تک صرف مردوں میں ابوبکرؓ اور خواتین میں خدیجۃ الکبریٰؓ نے اسلام قبول کیا تھا لیکن ابھی انھوں نے اس کا سرِ عام اعلان نہیں کیا تھا۔ اس طرح علیؓ پہلے نوجوان اور پہلے علی الاعلان مسلمان ہونے والے فرد تھے۔ قیامت تک یہ شرف کسی اور شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ علیؓ کی اخلاقی جرأت اور روحانی جواں مردی سے رسولؐ خدا اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپؐ نے بھی علی الاعلان فرما دیا، ''میں علی کو اپنا بھائی، اپنا وصی (وصیت پر عملدرآمد کرنے اور کرانے والا Executor) اور اپنا وارث قرار دیتا ہوں۔ میرے عزیز و اقارب کو چاہیے کہ اس کی بات کا پاس کریں اور اس کی اطاعت کریں''۔ اس پر ہاشمی خاندان کے سب لوگ اٹھ کر چل دیے البتہ انھوں نے ابوطالب پر طنز کی، ''محمدؐ نے تمھیں اپنے بیٹے کی حکم برداری کا

Marfat.com

پابند بنا دیا ہے، اب تم علی کو نہیں، علی تمھیں حکم دیا کرے گا"۔

فقرِ حیدریؓ

اگرچہ علیؓ کا خلفائے راشدہ میں چوتھا نمبر تھا لیکن آپ پہلے خلفاء کے معتمد مشیروں میں شمار ہوتے تھے اور اپنی اخلاقی جرأت اور روحانی جواں مردی کے باعث انھیں وہی مشورہ دیتے تھے جسے اپنے ضمیر، اپنے ذہن اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اُمتِ مسلمہ کے بہترین مفاد میں صحیح سمجھتے تھے۔ مثلاً عمرؓ کے عہدِ حکومت میں جب لگاتار فتوحات ہونے لگیں اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کے پاس آنے لگا تو عمرؓ نے ضروری سمجھا کہ اسے سارے کا سارا عوام میں تقسیم کر دینے کے بجائے اس کا ایک حصہ ہنگامی ضروریات کے لیے بیت المال میں محفوظ کر لیا جائے۔ علیؓ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے یہ رائے دی کہ جتنا بھی مالِ غنیمت مرکز میں آئے سارے کا سارا تقسیم کر دینا چاہیے اور خدا پر بھروسا رکھتے ہوئے اس میں سے کچھ بھی مستقبل کی ممکنہ ضروریات کے لیے نہیں بچانا چاہیے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عمرؓ اقتصادی سطح پر ریاست کو ایک اہم مقام دینے کے قائل تھے۔ اسی لیے انھوں نے فتح کردہ زرعی زمینوں کو بھی مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے قومی ملکیت میں رہنے دیا تھا۔ اس کے برعکس علیؓ کا رویہ صوفیانہ تھا۔ صوفیوں کے صوفی عیسیٰؑ نے آنے والے کل کی فکر میں مبتلا لوگوں کو اس فکر سے آزاد کرنے کے لیے کہا تھا، "ہوا کے پرندوں کو دیکھو، نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں اور نہ ہی بھڑولوں میں اناج جمع کرتے ہیں۔ پھر بھی آسمانی باپ (خدا) انھیں رزق دیتا ہے۔ کیا خدا کی نظر میں تم پرندوں سے بھی گئے گزرے ہو کہ وہ تمھیں رزق نہ دے گا؟ کل کی فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنی فکر خود کرے گا"۔ عیسیٰؑ نے جو مشہورِ عالم دعا سکھائی تھی اور جسے دنیا "خداوند کی دعا" (The Lord's Prayer) کے نام سے جانتی ہے اسے عیسائیت میں وہی مقام حاصل ہے جو سورہ فاتحہ کو اسلام میں ہے۔ اس دعا میں بھی عیسیٰؑ نے خدا سے صرف اور صرف "آج کی روٹی" مانگی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ جس فقر کے گیت گاتا رہا ہے اس کی شان دیکھنی ہو تو علیؓ کی زندگی کا کوئی ایک لمحہ دیکھ لینا کافی ہوگا۔ ایسا ایک لمحہ ہم جلال الدین رومیؒ کے خوبصورت لفظوں میں پہلے ہی دیکھ چکے ہیں جب وہ دشمن کے سینے سے اس لیے اتر آئے تھے کہ اس بدبخت نے آپ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا تھا۔ آپ کی زندگی کا ایک اور مثالی لمحہ وہ تھا جب عمرؓ کی شہادت پر ان کی مقرر کردہ کونسل نے سب سے پہلے خلافت علیؓ ہی کو پیش کی لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ وہ پہلے دو خلفاء، ابوبکرؓ اور عمرؓ، کے فیصلوں کے پابند ہوں گے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں علیؓ کو مالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں عمرؓ سے اختلاف تھا چنانچہ آپ نے غیر مشروط طور پر پہلے دونوں خلفاء کے ہر فیصلے کی پابندی کرنے پر رضامندی ظاہر نہ کی۔ علیؓ کا یہ فیصلہ تقلید کے برعکس اجتہاد کو ترجیح دینے کے مترادف تھا۔ یوں بھی قرآنِ حکیم نے فیصلہ کن انداز میں کہہ رکھا تھا کہ حکم صرف اور صرف اللہ کا ہے (اِنِ الحُکمُ اِلّا لِلّٰہِ، 6:57)، اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا ہی کی اطاعت کی (مَن یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَد اَطَاعَ اللّٰہَ، 4:80)۔ خدا نے خدا اور رسول کی دو پابندیوں کے علاوہ کسی

Marfat.com

تیسری غیر مشروط پابندی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ چنانچہ علیؓ بھی اس تیسری پابندی پر راضی نہ ہوئے۔ وہ خلافت کے اتنے ہی متمنی ہوتے تو اِتنے ہی زور سے ہاں کہہ دیتے جتنے زور سے عثمانؓ نے اُس وقت کہہ دی تھی جب علیؓ کے رضامند نہ ہونے پر کونسل نے خلافت انھیں پیش کر دی تھی۔

رسُولِ خدا کی چارپائی

622ء میں آسمان کی آنکھ نے ایک ایسا منظر دیکھا جس نے دُنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ محمدؐ رسول اللہ نے خدا سے اشارہ پا کر مکّے سے مدینے کی جانب ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی اہمیت کا اندازہ اس ایک بات سے کیا جا سکتا ہے کہ مسیحیوں کی طرح مسلمانوں کا کیلنڈر ان کے رسول کی پیدائش کے بجائے ہجرت کے واقعے سے شروع ہوتا ہے۔ یہی نہیں، اِس واقعے نے اُس اسلامی ریاست کا قیام ممکن بنایا جس نے صدیوں تک دُنیا میں علم کی روشنی اور روحانی قدروں کا نور پھیلایا۔ اس تاریخی لمحے میں محمدؐ رسول اللہ نے تمام مسلمانوں میں سے دو روحانی جواں مردوں کا انتخاب کیا، ابوبکرؓ اور علیؓ۔ ابوبکر کو ساتھ لے کر مدینہ روانہ ہونے سے پہلے آپؐ نے علی کو اپنے گھر میں اپنی چارپائی پر سلا دیا تاکہ آپؐ کے جانی دشمنوں (قریش) کو یہ احساس نہ ہو کہ آپؐ مدینے کی جانب ہجرت کر گئے ہیں۔

اگر ہجرت کے سفر کے دوران یہ خطرہ تھا کہ کسی بھی وقت آپؐ اور ابوبکرؓ قتل ہو سکتے تھے تو اِس کا بھی پورا پورا امکان تھا کہ قریش آپؐ کے گھر پر دھاوا بول دیتے اور یہ سوچ کر کہ چارپائی پر محمدؐ ہی سو رہے ہیں، علیؓ کو قتل کر ڈالتے۔ خدا نے رسُولِ خدا، ابوبکرؓ اور علیؓ، تینوں کو محفوظ رکھا لیکن جس طرح ابوبکرؓ اِس کٹھن سفر کے دوران رسُولِ خدا سے محبت میں جان ہتھیلی پر رکھے رہے اسی طرح یہ شرف تا ابد علیؓ ہی کو حاصل رہے گا کہ رسُولِ خدا نے انھیں جیتے جی اپنے اوپر قربان ہو جانے کے لیے چُنا۔ یہی نہیں، علیؓ کے ذمے آپؐ نے ایک کام اور بھی لگایا تھا کہ مدینہ روانہ ہونے سے پہلے وہ تمام امانتیں جو اہلِ مکہ کے کئی لوگوں نے امین ہونے کے ناتے رسُولِ خدا کے پاس رکھوائی ہوئی تھیں، انھیں بحفاظت سب کو لوٹا دیں۔ یہ بات بھی علیؓ کی بلند کرداری اور روحانی جواں مردی پر رسُولِ خدا کے مکمل اعتماد کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

قرآنِ حکیم کا احترام

جب حضرت علیؓ کے سیاسی مخالفوں کو جنگِ جمل میں شکست ہو گئی تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے محاسبے کے نام پر، امیر معاویہ کی سرکردگی میں ایک نئی بغاوت برپا کر دی۔ جب علیؓ کی فوج کا پلڑا بھاری ہو گیا تو امیر معاویہ کے ساتھی، عمرو بن العاص نے قرآنِ حکیم کے اوراق کو نیزوں پر اٹھا کر، صلح! صلح!! کا نعرہ لگا دیا۔ حضرت علیؓ کو بخوبی اندازہ تھا کہ یہ شکست سے بچنے کا حربہ ہے لیکن انھوں نے قرآنِ حکیم کے احترام میں ہتھیار رکھ دیے۔ عمرو بن العاص نے آپ کے نہتے ساتھیوں پر حملہ کر دیا جس سے آپ کی پوزیشن کمزور ہو گئی۔ معاویہ کو دُنیا مل گئی لیکن علیؓ کا نام نامی آج تک

Marfat.com

ہر اُس مسلمان کے دل میں اور زبان پر رہتا ہے جو روحانی طور پر زندہ و بیدار ہو۔

حسینؓ ابن علیؓ

جب علیؓ کو ایک خارجی، ابنِ ملجم، نے شہید کر دیا اور معاویہ بن ابوسفیان خلیفہ بن گیا تو مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں اہم تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ ایک تو خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی۔ جس کی بناء پر مسلمانوں کا یہ حق چھن گیا کہ وہ خلیفہ کا براہِ راست یا بالواسطہ انتخاب کریں۔ اب باپ کے بعد بیٹا یا خاندان کا کوئی اور شخص وراثت کی بنیاد پر خلیفہ بننے لگا۔ دوسری اہم تبدیلی اس پہلی تبدیلی ہی کا شاخسانہ تھی۔ اب یہ ضروری نہ رہا کہ خلیفہ مسلمانوں کا لائق ترین اور نیک ترین شخص ہو۔ گویا صلاحیت کے اعتبار سے بہترین شخص کے انتخاب (Meritocracy) کی گنجائش ختم ہو گئی اور محض وراثت کی بنیاد پر بدکار اور نااہل سے نااہل شخص بھی خلیفہ، سلطان یا بادشاہ بننے لگا۔ تیسری تبدیلی یہ ہوئی کہ مسلمانوں کی صفوں میں وہ انتشار، جو عثمانؓ کے عہد میں شروع ہُوا تھا اور علیؓ کے عہد میں کھل کر سامنے آ گیا تھا، اس حد تک پھیل گیا کہ مسلمان علماء میں سے کچھ نے امن وامان کی خاطر اور کچھ نے عہدوں اور فائدوں کے لالچ میں ملوکیت یا موروثی بادشاہت کے حق میں فتوے دے دیے۔ معاویہ کے عہد تک ابوذر غفاریؓ جیسے صحابی زندہ تھے جنھوں نے رسولؐ خدا اور پہلے چار خلفاء (خلفائے راشدہ، صراطِ مستقیم پر چلنے والے خلفاء) کا عہد اور ان کے رویوں اور فیصلوں کو قریب سے دیکھا تھا چنانچہ جب وہ معاویہ کو اسلام کی روح سے روگردانی کرتے دیکھتے تھے تو چپ نہ رہتے تھے بلکہ صاف صاف لفظوں میں کھلی کھلی تنقید کرتے تھے۔ ابوذرؓ کی اپنی بے عیب زندگی اور مسلمانوں میں عزت واحترام کے باعث خلیفہ کے لیے بھی آسان نہ تھا کہ ان کی زبان بندی کر سکتا۔ لیکن جب معاویہ کی وفات پر اس کا بدنام اور نالائق بیٹا یزید، خلیفہ کے نام پر بادشاہ بن بیٹھا تو اس کی بات ٹوکنے اور اس کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ رہا۔ اصل میں معاویہ نے کافی عرصہ پہلے ہی چیدہ چیدہ مسلمان اکابر سے یزید کے حق میں حلفِ وفاداری لے لیا تھا۔ پھر بھی ایک تو عبداللہ بن زبیرؓ اور دوسرے حسینؓ ابن علیؓ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ یزید کے حکم سے دونوں کو مختلف حالات اور اوقات میں شہید کر دیا گیا۔

حضرت حسین کو اندازہ تھا کہ یزید کی بیعت نہ کرنے پر انھیں آزاد نہیں چھوڑا جائے گا۔ وہ مدینے سے مکّے میں آ گئے۔ یاد رہے کہ مدینہ اب اسلامی ریاست کا دارالخلافہ نہیں تھا۔ علیؓ نے عراق کے شہر ''کوفہ'' کو اور معاویہ نے شام کے شہر ''دمشق'' کو دارالخلافہ بنا لیا تھا۔ علی کے حامیوں نے، جنھیں اس وقت شیعانِ علیؓ کہا جاتا تھا حسینؓ سے درخواست کی کہ وہ کوفہ تشریف لے آئیں جہاں وہ آپ کی نہ صرف حمایت بلکہ حفاظت بھی کریں گے۔ اب تو خیر کوفے والے بے وفائی کی علامت بن چکے ہیں لیکن اس وقت ابھی ان کی بے وفائی پر پردہ پڑا ہُوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اہلِ کوفہ نے اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے حسینؓ کو اتنے خط لکھے کہ بوریاں بھر گئیں۔ حسینؓ سے عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ جیسے کئی ممتاز مسلمانوں

Marfat.com

نے عرض کی کہ آپ احتیاط کریں۔ حسینؓ نے احتیاطاً اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو پیشگی طور پر کوفے بھیجا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان لوگوں میں یزید کے لشکروں کے سامنے ڈٹ جانے کی کتنی ہمت ہے۔ کہتے ہیں، جب مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے تو لوگوں نے کہا کہ آپ جمعے کی نماز کی امامت کریں۔ جمعے کی نماز سے پہلے خطبے میں مسلم نے یزید کی صراطِ مستقیم سے رُوگردانی کرنے والی حکومت کے خلاف رسولِ خدا کے دلارے نواسے اور علیؓ کے نیک نفس اور بلند کردار فرزند حسینؓ کی حمایت کرنے کی دعوت دی۔ جب جمعے کے دو فرض ادا کرتے ہوئے مسلم بن عقیل نے دائیں جانب رخ کر کے سلام پھیرا تو دیکھا، اس طرف ایک بھی شخص موجود نہ تھا اور جب بائیں طرف سلام پھیرا تو ادھر بھی تمام صفیں خالی تھیں۔ کوفے کے یزیدی حکمران کے لیے مسلم بن عقیل کو گرفتار کر کے شہید کرنے میں اب کونسی رکاوٹ رہ گئی تھی!

حسینؓ کو عیسیٰؑ کی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ دونوں اس انجام سے بچ سکتے تھے لیکن دونوں کا مقدر یہی تھا کہ وہ خدا کے دین کو نئی زندگی عطا کریں۔ البتہ ان دونوں کی داستان میں ایک فرق یہ تھا کہ عیسیٰؑ کے ساتھ ان کا ایک بھی حواری مصلوب نہ کیا گیا بلکہ وہ تو جائے واردات ہی سے فرار ہو گئے یہاں تک کہ پطرس جیسے جید حواری نے، جسے عیسیٰؑ نے وہ چٹان قرار دیا تھا جس پر آپؑ کی تعلیم کی عمارت کھڑی ہونی تھی، عیسیٰؑ کی گرفتاری کے چند گھنٹوں کے اندر اندر تین مرتبہ اس حقیقت سے انکار کر دیا تھا کہ اس کا آپؑ سے کوئی تعلق تھا۔ اس کے برعکس جب حسینؓ سوئے مقتل چلے تو رسولِ خدا کے خانوادے کے اٹھارہ افراد اور 54 ایسے مسلمان آپ کے ہمراہ تھے جن میں سے تیس صحابۂ رسولؐ تھے۔ بہتر (72) افراد کے اس قافلے میں حسینؓ کے بیٹے علی اصغر جیسے دودھ پیتے بچے، آپؓ کے بیٹے زین العابدینؒ جیسے بیمار، حسینؓ کی زوجہ محترمہ شہر بانوؓ اور آپؓ کی بہن زینبؓ جیسی معزز خواتین بھی شامل تھیں۔ جب یہ قافلہ عراق کے شہر، کربلا کے قریب پہنچا تو حسینؓ نے دریائے فرات کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ یزید کے حکم پر عراق کے گورنر ابن زیاد نے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس موقع پر ایک رات حسینؓ نے اپنے ہمراہیوں سے کہا، ''دیکھو، مجھے اپنا اور خانوادۂ رسولؐ کا انجام صاف نظر آ رہا ہے۔ میں آپ سب کو بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ رات کے اندھیرے میں جدھر چاہیں چلے جائیں اور اپنی جان بچا لیں''۔ لیکن کوئی ایک شخص بھی آپ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ آفرین ہے حسینؓ پر، اہلِ بیتِ رسولؐ پر، حسینؓ کے جان نثاروں پر جنھوں نے حسینؓ کے ساتھ جینے اور مرنے کا عہد نباہ کر ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمد رسول اللہؐ، ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ کی روحانی جواں مردی کی عظیم روایت میں ایک ایسی مثال کا اضافہ کر دیا جو تا قیامت اہلِ محبت کا دِل گرماتی رہے گی اور یہ کہہ کر باطل کے خلاف زبان کھولنے اور جان دینے پر اکساتی رہے گی کہ ''نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ''۔

ابن زیاد کے لشکر نے قافلۂ حسینؓ کا پانی بند کر دیا۔ آٹھ روز تک معصوم بچوں اور بیماروں کو پانی سے محروم رکھا گیا۔ آخر دس محرم 61ھ یا دس اکتوبر 680ء کو جب ایک ایک کر کے قافلے کے ہر بالغ مرد کو شہید کر دیا گیا بلکہ حسینؓ کے دودھ پیتے بچے علی اصغر کو بھی نہ بخشا گیا تو حسینؓ بھی اولاد اور ہمراہیوں کے غم سے نڈھال لیکن جذبۂ عشقِ الٰہی سے

Marfat.com

سرشار گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں نکلے۔ آپ کی شہادت ہی کو کافی نہ سمجھا گیا، ابن زیاد کے حکم سے یزید کی تسلی اور اپنی کارکردگی کے اظہار کے لیے حسینؓ کا سر قلم کر کے دمشق روانہ کر دیا گیا۔ ہر سال دس محرم کو چند سنگ دلوں کے سوا تمام مسلمان غمزدہ ہو کر اپنے دل میں کہتے ہیں کہ کاش ہم اس وقت میدانِ کربلا میں ہوتے تو حسینؓ اور خانوادۂ رسولؐ پر اپنی جان نثار کر دیتے۔ ان میں سے شیعیانِ علیؓ کو یہ غم اور حسرت اس حد تک متاثر کرتی ہے کہ وہ دس محرم کو اپنی جاں نثاری کے ثبوت میں اپنے ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتے ہیں بلکہ زنجیر زنی سے اپنی خوں ریزی بھی کر ڈالتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے یزید کے حکم پر حسینؓ اور خانوادۂ رسولؐ کو تہ تیغ کیا اور خاندانِ رسول کی معزز و محترم خواتین کو ننگے سر دمشق کے بازاروں میں پھرایا انھیں یہ سب کچھ کرتے ہوئے ضمیر کے کسی بحران کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ گستاخی معاف، کون کہہ سکتا ہے کہ ہم واقعی میدانِ کربلا میں ہوتے تو ہم کیا کرتے؟ اگر ہم واقعی وہی کچھ کرتے جس کی ہم خواہش، دعا اور دعویٰ کرتے ہیں تو دو باتیں نہ ہوتیں۔ ایک تو اقبالؔ کو یہ نہ کہنا پڑتا کہ ''قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں'' اور دوسرے یہ کتاب لکھنے کی ضرورت نہ پڑتی جو آپ اس وقت پڑھ رہے ہیں۔

کربلا کی اس کہانی کی تاثیر عیسیٰؑ کی کہانی کی طرح بعد میں واضح ہوئی۔ اناطول فرانس نے اُس جمعے کی کہانی لکھی ہے جب عیسیٰؑ کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ آدھی دنیا میں پھیلی ہوئی رومن ایمپائر میں یہ واقعہ صرف اتنی اہمیت کا حامل سمجھا گیا تھا کہ کہانی کی آخری دو سطروں میں یہ بتا دیا جائے کہ اس روز جہاں اور اتنے اہم واقعات اور فیصلے ہوئے تھے وہاں دُور دراز فلسطین کے شہر یروشلم میں ایک دیوانے کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا جو کہتا تھا کہ میں یہودیوں کا بادشاہ ہوں۔ لیکن آج اسی دیوانے کی الم ناک تصلیب (Crucifixion) کے حوالے سے دنیا کا سب سے بڑا مذہب موجود ہے بلکہ اس کے پیروکار دنیا کے حاکم بنے ہوئے ہیں۔ آج مسیحی دنیا میں اس طرح کے نوحے گائے جاتے ہیں۔ ''ہائے اس وقت میں کہاں تھا جب وہ میرے خداوند کو پھانسی دے رہے تھے''۔ مسلمانوں میں بھی، خصوصاً صفوی عہد سے لے کر آج تک، حسینؓ کی شہادت پر نوحہ گری ہوتی آئی ہے۔ خود برصغیر میں انیسؔ اور دبیرؔ جیسے قادر الکلام شاعروں نے صرف اس واقعے کو اپنے فن کا مرکز و محور بنایا اور نام کمایا۔ کل تک جوشؔ ملیح آبادی اور آج افتخار عارف کے کلام میں شہیدانِ کربلا کے مقدس خون کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن کربلا ایک ہی مرتبہ تو خوں ریز نہیں ہوئی تھی۔ اوّل تو آئے دن کہیں نہ کہیں ایک نئی کربلا برپا ہوتی رہتی ہے اور آج تو عراق کی اصل کربلا بھی خوں ریز ہے اس لیے سوچنے والی بات تو یہی ہے کہ آج کے دن کون سر پر کفن باندھ کر اُس روحانی جواں مردی کا ثبوت دیتا ہے جس کی وجہ سے حسینؓ اور شہیدانِ کربلا کو یاد کیا جاتا ہے۔ آج کے یزید کا ہاتھ کون روکے گا؟ خودکش حملے کرنے والے چند جیالے جوان؟ نہیں، آج کے یزید کا ہاتھ روکنے کے لیے مسلمانوں کو علم اور روح کے اس ورثے کی طرف پلٹنا ہو گا جو آدمؑ سے ہم تک پہنچا لیکن ہم نے اس کی کچھ قدر نہ کی۔ آج ہمارے پاس نہ علم ہے اور نہ وہ روح جو خدا نے ہم میں اپنی روح میں سے پھونکی تھی۔ علم دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور علم کو

Marfat.com

ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی خاطر استعمال کرنے کے لیے روح کی روشنی چاہیے۔ علم کی طاقت اور روح کے نور ہی سے روحانی جواں مردی جنم لیتی ہے۔ اور آج مسلمانوں کو سب سے بڑھ کر اسی کی ضرورت ہے۔

شہیدانِ کربلا میں حسینؓ کے سوتیلے بھائی قاسمؓ اور آپ کی سگی بہن زینبؓ کے دو بیٹوں اور جاں نثار ''حُر'' نے جو کردار ادا کیا اور جب لٹے پٹے قافلہ حسین کو یزید کے دربار میں پیش کیا گیا تو زینبؓ نے جس اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا اسے یاد کیے بغیر روحانی جواں مردی کا کوئی تذکرہ مکمل نہیں کہلا سکتا۔ ہم یہاں انھیں سلامِ عقیدت پیش کر کے آگے بڑھتے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ سے نکل کر یورپ کے جنوب مغرب میں واقع کل کے اندلس اور آج کے سپین چلتے ہیں۔

طارق بن زیاد اور یوسف بن تاشفین

711ء میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے سپین میں قدم جمائے۔ یہی وہ سال ہے جب محمد بن قاسم نے برصغیر میں قدم رکھا۔ اس سے پہلے بھی افریقہ کے مسلمان ملک، مراکش یا مراکو کی طرف سے سپین پر وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے لیکن ان کی نوعیت چھاپا مار کر واپس آ جانے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ جب 711ء میں بربر (عرب نہیں) جرنیل طارق کو یہ مہم دی گئی تو اس نے روحانی جواں مردی کی ایک روشن مثال قائم کرتے ہوئے مراکش سے سپین کے ساحل تک سمندری سفر طے کرنے پر پہلا کام یہ کیا کہ اپنی وہ بادبانی کشتیاں اپنے ہاتھ سے جلا ڈالیں جن کے ذریعے سے وہ اور اس کے سپاہی یہاں تک پہنچے تھے۔ طارق کے اس اقدام نے جہاں دنیا کی مختلف زبانوں کو ''کشتیاں جلا دینے'' کا محاورہ دے دیا وہاں آنے والی انسانی نسلوں کے بامقصد اور آرزومند (Committed and Ambitious) افراد کو حصولِ مقصد اور تکمیلِ آرزو کا ایک ایمان افروز راستہ بھی دکھا دیا۔

اب طارق کے ہمراہیوں کو معلوم تھا کہ واپسی کا امکان باقی نہیں رہا، اب تو تخت یا تختہ والا معاملہ تھا۔ طارق کے ساتھ تین سو عرب اور سات ہزار بربر سپاہی تھے اور ان کا مقابلہ سپین کے مسیحی بادشاہ روڈریگو (Rodrigo) کی کیل کانٹے سے لیس ٹِڈی دَل فوجوں سے تھا۔ طارق کے ساتھی بے جگری سے لڑے اور تاریخ نے یہ معجزہ دیکھا کہ شاہی فوج اُن سرپھرے مسلمانوں کے سامنے نہ ٹھہر سکی جنھوں نے اپنی کشتیاں جلا کر جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ یوں مسلمان آگے بڑھتے گئے اور اگلے سال موسیٰ بن نصیر مراکش سے مزید مسلمان فوج لے کر طارق سے آ ملا۔ کچھ ہی عرصے میں پورا سپین ان کے قدموں میں تھا۔

گو موسیٰ بن نصیر خود عرب تھا لیکن اس کی فوج میں بھی صرف عربی النسل سپاہی نہ تھے، اس میں عرب کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے علاوہ شام کے عرب، مصر کے قبطی اور افریقہ کے بربر بھی شامل تھے۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ اب اسلام صرف جزیرہ نمائے عرب تک محدود نہ تھا اور نہ ہی اہلِ عرب کو اس پر اجارہ داری حاصل تھی۔ آج ہمارے یہاں کے سادہ لوح مولوی صاحبان لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں تو اسلام کی اس

Marfat.com

عالمگیر روح کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ہر طرح کے نسلی امتیاز کو رد کر کے دنیا بھر کی تہذیبوں اور ثقافتوں کو سینے سے لگاتی ہے اور اسلام کو موجودہ سعودی عرب تک محدود کر دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ لوگ، خصوصاً عورتیں، اسلام کے اس ظاہری لبادے کو اپنا لیں جو چودہ سو سال پہلے عرب میں رائج تھا۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے اور اس کی آبیاری صرف عربوں نے نہیں کی، اس کے لیے غیر عربوں نے بھی خونِ جگر صَرف کیا اور خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اس لیے اسلام کی ثقافت محض عرب ثقافت نہیں بلکہ ایک عالمگیر ثقافت ہے جس میں دنیا بھر کی ثقافتوں کے لیے پوری پوری جگہ ہے۔

رسُولِ خدا نے اپنے آخری خطبے میں اسی لیے یہ کہنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ اہلِ عرب کو غیر عرب اور غیر عرب کو اہلِ عرب پر نسلی اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت کی بنیاد صرف اور صرف تقویٰ یعنی خدائی احکام کی بجا آوری ہو گی۔ پاکستان کا ایک شلوار قمیص میں ملبوس ڈاڑھی منڈا مسلمان جو رزقِ حلال کما کر اپنی اولاد کو اچھی تعلیم اور نیک تربیت دے رہا ہے وہ اس عیاش عرب شہزادے سے کہیں بہتر ہے جس نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے، لمبا جبہ پہن رکھا ہے لیکن یورپ اور امریکہ کے قمار خانوں اور نائٹ کلبوں میں ایک ایک رات میں کئی کئی لاکھ ڈالر خرچ کر ڈالتا ہے۔

بے شک قرآنِ حکیم عربی زبان میں نازل ہُوا ہے لیکن اس میں بھی عربی زبان کی اپنی کوئی خصوصیت نہیں۔ یہ خدا کی سنت ہے کہ جس شخص کو نبوت کا شرف دیا جائے اس پر اسی کی زبان میں وحی نازل کی جائے تا کہ اس کے لیے اپنے اردگرد کے لوگوں کو سمجھانے میں آسانی ہو۔ یہ خداوند کریم کا عربوں پر احسان تو ہے کہ قرانِ حکیم عربی میں نازل ہُوا۔ اس میں عربوں کا اپنا تو کوئی کمال نہیں۔ اسی لیے خدا نے قرآنِ حکیم میں نہ تو اپنے آپ کو عربوں کا خدا کہا ہے، نہ رسُولِ خدا کو رسولِ عربی کہا ہے۔ اسلام کا خدا، رسول اور کتاب، سب تمام جہانوں اور قوموں (عالمین) کے لیے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ انھیں، خصوصاً رسُولِ خدا کو ''رسولِ عربی'' کہہ کر چھوٹا کرنے کی کوشش نہ کی جائے کیونکہ خدا کہتا ہے، ''(اے محمد) ہم نے تمھیں تمام انسانوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (34:28)۔

سپین میں مسلمانوں نے (جنھیں مغربی مؤرخ Moors لکھتے ہیں) 711ء سے 1492ء تک تقریباً آٹھ صدیاں حکومت کی ہے۔ جب بنو امیہ (ابوسفیان اور معاویہ کے خاندان) کی حکومت کو بغداد میں زوال آ گیا تو اس خاندان کا ایک فرد، عبدالرحمٰن الاوّل، عباسی فرمانرواؤں کی دستبرد سے بچ کر 756ء میں سپین پہنچ گیا۔ اس نے پہلے قرطبہ فتح کیا اور پھر آہستہ آہستہ پورے سپین پر قابض ہو گیا۔ اس کے خاندان نے سپین پر 1031ء تک حکومت کی۔ جب بنو امیہ کو سپین میں زوال آ گیا تو آپس کی کھینچا تانی اور مسیحیوں کی یورش کے باعث مسلمانوں کے پاس صرف غرناطہ (Cordoba) باقی رہ گیا۔ مسیحیوں کی چڑھائی سے خوفزدہ ہو کر مسلمان حکمران ''متعمد'' نے مراکش کے بربر فاتح ''یوسف بن تاشفین'' کو سپین آنے کی دعوت دی جس نے 1086ء میں الفانسو ششم کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس طرح

Marfat.com

مسلمانوں کے عہدِ زریں کی طرح ایک بار پھر پورے سپین پر ان کا تسلط قائم ہو گیا جو کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی حد تک 1492ء تک قائم رہا۔

یہاں رُک کر ایک ذرا یوسف بن تاشفین کے ذہنی اور جسمانی حلیے کا جائزہ لے لیا جائے تو مناسب ہو گا۔ وہ مراکش اور موریتانیہ میں اسلام کی انقلاب آفریں دعوت دینے والے بزرگ'' ابنِ یاسینؒ '' کا پیروکار تھا۔ جس طرح رسُولِ خداؐ نے عرب کے متحارب قبائل کو اسلام کے حوالے سے ایک قوم میں ڈھال دیا تھا، اسی طرح آپؐ کے ایک پیروکار ابنِ یاسینؒ نے افریقہ کے بربر قبائل کو'' رباط'' کے نام سے ایک وحدت میں پرو دیا۔ ابنِ یاسینؒ کی تعلیم کا مطلب تھا کہ اسلام کے سادہ لیکن انقلاب آفرین اصولوں کو دل و جان سے اپنایا جائے۔ اس کی تعلیم نے بربر قوم میں قریب قریب وہی دینی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا جو رسُولِ خداؐ اور پہلے دو خلفائے راشدہ کے دور کے مسلمانوں کا خاصہ تھا۔

یوسف بن تاشفین جانوروں کی کھال میں ملبوس ہوتا تھا اور کہتے ہیں اس سے اونٹ کے پسینے کی بو آتی تھی۔ کہاں وہ اور کہاں سپین کے مسلمان حکمرانوں کی شان و شوکت، دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ اس کی سپین کے شاہی درباروں میں وہی حالت تھی جو اونٹنی کا دودھ پی کر اور جو کی روٹی اور کھجوریں کھا کر بدر اور احد میں لڑنے والے اور عراق، شام، ایران اور مصر فتح کرنے والے کسی مجاہد کی آج کے کسی عرب بادشاہ کے دربار میں جا کر ہو سکتی ہے۔ جس طرح اس مجاہد کو محسوس ہو گا کہ میں کسی شیطانی محفل میں آ گیا ہوں اسی طرح یوسف بن تاشفین اور اس کے رباطی مجاہدوں کو بھی سپین کے مسلمان بادشاہوں کی محفلوں میں یہی کچھ محسوس ہُوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سادگی پسند، جفاکش اور پاکباز رباطی جنھیں تاریخ ''المراویہ'' کا نام دیتی ہے وہ نہ صرف مسیحی بلکہ عیش کوش اموی شہزادگان کو روند کر اندلس پر چھا گئے۔ یہ الگ بات کہ بعد میں یہ لوگ بھی اسی انجام کو جا پہنچے جو نمک کی کان میں داخل ہونے والوں کا ہو جاتا ہے۔

بہر حال سپین میں مسلمانوں کا عہدِ حکومت نہ صرف مسلمانوں کے لیے کئی اعتبار سے قابلِ فخر ہے بلکہ تاریخِ انسانیت میں بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس عہد میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج کو جا پہنچا تھا اور علوم و فنون میں زبردست ترقی ہوئی تھی۔ یہی نہیں، یہودیت اور مسیحیت کے پیروکار بھی اسلامی حکومت کے تحت مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی اور یگانگت کے ساتھ رہ رہے تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کبھی کوئی کھینچا تانی یا رقابت پیدا ہی نہ ہوتی تھی، یقیناً جس طرح ہنستے بستے گھروں میں بحث مباحثہ اور مسابقت سر اٹھاتی رہتی ہے اسی طرح سپین میں بھی مسلمانوں، مسیحیوں اور یہودیوں کے درمیان رسہ کشی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جس طرح 1492ء کے بعد مسیحیوں نے سپین میں ایک ایک مسلمان کو تہ تیغ کر دیا، مسلمانوں کے عہد میں اس طرح کا قتلِ عام کبھی نہیں ہُوا۔

جب اسلامی عہد کا سپین نہ صرف جاگ رہا تھا بلکہ علوم و فنون کی روشنی میں جگمگا رہا تھا تو یورپ سویا ہُوا تھا اور اس پر جہالت کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یورپ کے اس عہد کو ازمنۂ تاریک (Dark Ages) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب سپین میں مسلمانوں کی حکومت کے تحت مسلمان، مسیحی اور یہودی یگانگت سے رہ رہے تھے،

Marfat.com

پوپ اور یورپ کی مسیحی قوتوں نے دینی جہادوں (Crusades) کے زیرِ عنوان مسلمانوں کے خلاف مذہبی جنگوں کی آگ بھڑکا رکھی تھی۔ اس حقیقت سے مغربی تاریخ نویس، اپنی روایتی اسلام دشمنی کے باوجود انکار نہیں کر سکتے کہ جب یورپ کا بیشتر حصہ مادی اور روحانی اعتبار سے غربت، جہالت اور انحطاط کا شکار تھا تو ہسپانوی مسلمانوں نے ایک شاندار تہذیب برپا کر رکھی تھی اور اقتصادی خوشحالی کا ایک ٹھوس نظام قائم کر رکھا تھا۔ اسلامی سپین نے فنونِ لطیفہ خصوصاً فنِ تعمیر، سائنسی علوم، فلسفہ، طِب اور شاعری کی نشوونما میں ایسا مثالی اور فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا کہ پوری دنیا میں اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ یہاں تک کہ جب تیرھویں صدی میں مسیحی فکر و فلسفہ اپنی معراج پر تھا تو اس وقت بھی وہ سپین سے روشنی پا رہا تھا۔ چنانچہ ہم طامس اتی وی نس (Thomas Aquinas) جیسے اہم ترین دینی مفکر اور دانتے (Dante) جیسے عظیم ترین شاعر پر بھی اسلامی سپین کے اثرات صاف دیکھ سکتے ہیں۔ اُس وقت کے اسلامی سپین کو بجا طور پر ''یورپ کی مشعل'' کہا جاتا ہے۔

طارق بن زیاد اور یوسف بن تاشفین، دونوں بربر تھے۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ ''بربریت'' کا لفظ اسی 'بربر' سے بنا ہے جس کے معنی میں گنوار پن، اکھڑ پن اور وحشی پن شامل ہے۔ ان دونوں روحانی جواں مردوں کو اپنا بلند مقصد اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اور یہی رویہ روحانی جواں مردی کی جان ہے۔ جب کوئی اپنے ذاتی مفاد یا انا کی تسکین کے بجائے کسی بلند تر اجتماعی مفاد کے تحت اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو خدا اس کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اس کے اقدامات سے ان کی توقعات سے بھی کہیں بہتر نتائج پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جوں جوں مغربی تاریخ دانوں کی آنکھوں سے تعصب کی پٹی اترتی جاتی ہے، وہ یہ اقرار کرنے لگے ہیں کہ یورپ کی تحریکِ احیائے علوم (Renaissance) کے پیچھے اندلس کے سائنس دانوں، حساب دانوں، مفکروں اور فنکاروں کا ہاتھ تھا۔ یورپ کی اسی تحریک نے اسے بالآخر پوری دنیا کا حاکم بنا دیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ازمنۂ وسطیٰ (Middle Ages) میں رہ رہا تھا جنھیں ازمنۂ تاریک (Dark Ages) بھی کہتے ہیں۔

یونان اور ایران کی قدیم تہذیبوں میں جو علوم و فنون اور فکر و فلسفہ پروان چڑھا تھا، اس پر وقت نے فراموشی کی موٹی چادر ڈال دی تھی۔ سپین کے مسلمانوں نے اسے نہ صرف ازسرِ نو دریافت کیا بلکہ درمیان کی صدیوں نے جو نئے سوال پیدا کر دیے تھے ان کی روشنی میں ان کی نئی تشریح کی اور ساتھ ہی ان میں اپنی طرف سے قابلِ ذکر اور قابلِ قدر اضافہ بھی کیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اسلامی دنیا میں سپین علوم و فنون اور فکر و فلسفہ کا مرکز بن گیا۔ خصوصاً 1150ء سے 1250ء کے دوران یہ علمی اور فنی ذخیرہ لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر یورپ کی علمی اور فنی اعتبار سے بنجر زمینوں کو سیراب کرنے لگا۔

روحانیت کے بارے میں اس کتاب میں یہ بیان بظاہر غیر متعلقہ نظر آتا ہے لیکن غور کریں تو ایسا نہیں۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو موجودہ علمی، اخلاقی اور روحانی پسماندگی سے نکال کر ایک مرتبہ پھر اُس راہ پر ڈالنا ہے

جس نے انھیں قوموں کی امامت بخشی تھی۔ یہ بیان ہمیں یہ حوصلہ دے سکتا ہے کہ اگر کل مغربی دنیا نے ہم سے علمی اور فکری روشنی پائی تھی تو آج ہم بھی رسولِ خدا کے اس ارشاد کے مطابق کہ "علم مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے" مغرب سے علمی، فکری اور تکنیکی (Technical) روشنی پا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ مغرب نے تو علمی، فکری اور تکنیکی ترقی کو انسانیت کے استحصال اور استبداد کے لیے استعمال کیا تھا لیکن ہم رحمان و رحیم خدا اور رحمۃ للعالمین رسولِ خدا کی پیروی میں اسے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے سادہ لوح علماء اسے پیرویٔ مغرب کہہ کر ہمیں انھی تاریک صدیوں میں دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہے جن میں کبھی مغرب ڈوبا ہوا تھا۔ درحقیقت یہ پیرویٔ مغرب نہیں، پیرویٔ خدا و رسول ہے۔ یہ پیرویٔ مغرب نہیں، اُس علم اور روح کی تجدید ہے جس سے خدا نے آدم کے حوالے سے بنی آدم کو نوازا تھا۔

سپین میں ارسطو (Aristotle) کی بازیافت نے یورپ کی ذہنی اور فکری آب و ہوا بدل کر رکھ دی تھی۔ یورپ نے جہاز رانی کو ترقی دے کر دنیا بھر میں اپنی نو آبادیاں (Colonies) بنا لی تھیں۔ لیکن یہ ترقی اُس اسطرلاب (Astrolabe) کی بدولت ہی ممکن ہوئی تھی جو سپین میں ایجاد ہُوا تھا۔ اگر اسلامی سپین میں حساب (Mathematics) نے جو ترقی پائی وہ یورپ تک نہ پہنچی ہوتی تو نیوٹن جیسے عظیم سائنس دان نے جو کمالات کر دکھائے وہ ناممکن ہو جاتے۔ اسی طرح سترھویں صدی میں یورپ نے جو طبّی (Medical) ترقی کی وہ بھی اسلامی سپین ہی کے ذریعے سے پہنچنے والی معلومات پر مبنی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ چھ صدیوں کے دوران مغربی دنیا کے وسائل میں جو حیرت انگیز اضافہ ہُوا ہے اس کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہے کہ مغرب نے آج سے صدیوں پہلے اسلامی تہذیب، خصوصاً سپین، کے علمی اور فکری سرمایے سے بے دریغ استفادہ کیا۔ آج تو یہ سرمایہ سپین میں اسلامی تہذیب کے کھنڈروں میں چھپ چکا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کھنڈروں میں دبے ہوئے علمی اور فکری سرمایے کی خوشہ چینی کر کے ہی یورپ نے نئی زندگی پائی تھی۔ ان کھنڈروں میں آج بھی مسجدِ قرطبہ اور الحمراء فنِ تعمیر کے شہکاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے ملبے کے اندر سے ابنِ عمار کی شاعری، ابنِ رُشد کے فلسفے، ابنِ زُہر کی طب، ابنِ طفیل کے ادب اور ابنِ حزمؒ کی قانون دانی کا وہ نور آج بھی جھلکتا نظر آتا ہے جس نے کبھی یورپ کی شبِ تاریک میں اجالا کیا تھا۔ آیئے، مردِ خدا طارق بن زیاد اور مردِ خدا یوسف بن تاشفین اور ان کے حوالے سے اندلس کا یہ تذکرہ اقبال کی مشہور نظم "مسجدِ قرطبہ" کے ان دو شعروں پر تمام کریں:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تُو بھی جلیل و جمیل

صلاح الدین ایوبی

روحانی جواں مردی کا ہر تذکرہ صلاح الدین ایوبی کے بغیر نامکمل رہے گا۔ وہ 1138ء میں پیدا ہُوا اور

Marfat.com

1193ء میں فوت ہُوا۔ وہ عرب نہیں، کُرد تھا۔ اس نے 1171ء میں مصر فتح کرنے کے بعد 1175ء میں شام بھی فتح کر لیا۔ اس کی حکومت ترکی کے شہر قونیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ یوں اس نے مسیحی کروسیڈرز (Crusaders) کے گرد گھیرا ڈال کر ان کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بیت المقدس جو حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، مسیحیوں کے پہلے کروسیڈ (مذہبی جہاد) میں ان سے چھن گیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی کی دلی آرزو تھی کہ وہ دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں آ جائے کیونکہ وہ رسولِ خدا کے سفرِ معراج کے پڑاؤ، قبلۂ اوّل اور مسجد عمرؓ (جو اس جگہ بنائی گئی تھی جہاں ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ کو قربانی کے لیے لٹایا تھا اور جو مسیحی دنیا میں Dome of the Rock کے نام سے پہچانی جاتی ہے) کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے باعث احترام تھا اور آج بھی ہے۔

2-اکتوبر 1187ء کو صلاح الدین ایوبی کی آرزو پوری ہوئی اور بیت المقدس کے مسیحی حکمران نے ہتھیار ڈال دیے۔ 88 سال پہلے جب مسیحی کروسیڈروں نے اسے فتح کیا تھا تو انھوں نے اس کے تمام مسلمان اور یہودی باشندوں کو بے دردی سے ذبح کر دیا تھا۔ اب ایک مردِ خدا نے اسے فتح کیا تھا تو اس کی روحانی جواں مردی نے بیت المقدس کی تاریخ میں ایک مرتبہ پھر اُس دن کی یاد تازہ کر دی جب عمرؓ فاروق اعظم، ایک اونٹ کی مہار پکڑے اس کا قبضہ لینے آئے تھے اور اس شہرِ خدا کو ایک مردِ خدا کے ہاتھوں مکمل امان ملی تھی اور کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی تھی۔

صلاح الدین ایوبی نے اعلان کیا جو بھی مسیحی یا یہودی بیت المقدس میں رہنا چاہے اس کی مکمل حفاظت کی جائے گی البتہ جو یہاں سے جانا چاہے وہ مرد ہے تو دس دینار، عورت ہے تو پانچ دینار اور بچہ ہے تو ایک دینار کی حقیر رقم ادا کر کے ایسا کر سکتا ہے اور اپنے ساتھ اپنا ضروری سامان بھی لے جا سکتا ہے۔ ہزار ہا لوگ ایسے تھے جو یہ حقیر رقم بھی نہیں دے سکتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی نے ان تمام لوگوں کو کسی رقم کے بغیر، جہاں وہ جانا چاہتے تھے جانے دیا۔ مسیحیوں کے سب سے بڑے مذہبی رہنما ہرقلیس نے اپنی اور اپنی بیوی کی طرف سے پندرہ دینار ادا کیے اور بیسیوں خچر گاڑیوں پر بیت المقدس کے سب سے بڑے گرجے اور اپنی رہائش گاہ کا تمام قیمتی سامان لاد لیا جس میں سونے چاندی کے بے شمار برتن بھی تھے۔ مسلمان نگرانوں نے صلاح الدین ایوبی کو خبر کی۔ مالِ غنیمت کی امید رکھنے والے سپاہیوں نے شدید اعتراض کیا لیکن صلاح الدین نے کہا، ''مجھے علم ہے کہ اس سامان کی قیمت کم از کم دو لاکھ دینار ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہرقلیس کو کچھ نہ کہا جائے۔ آج اس مبارک گھڑی کی برسی (Anniversary) ہے جب ہمارے پیغمبر، محمدؐ رسول اللہ نے 27۔ رجب کو اپنے سفرِ معراج کے دوران اس شہر میں قیام فرمایا تھا''۔

چالیس روز تک بیت المقدس سے مسیحیوں کا نکاس جاری رہا۔ جس نظم وضبط سے یہ مرحلہ مکمل ہُوا اور اس دوران صلاح الدین ایوبی، اس کے فوجی سرداروں اور عام سپاہیوں نے جس غیر معمولی فیاضی اور رحم دلی سے غیر مسلم آبادی کے ساتھ حسنِ سلوک کیا، کیا اسلامی اور کیا مسیحی دنیا، اس کی شہرت خوشبو کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی۔ صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کے بعد لبنان کے شہر، ٹور (Tyer) کو بھی فتح کرنا چاہا۔ لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اس دوران

Marfat.com

1191ء میں رچرڈ شیر دل(Richard, the Lion - Heart)نے صلاح الدین سے فلسطین کی بندرگاہ عکرہ(Acre) بھی چھین لی جو اس نے 1187ء میں فتح کی تھی۔ یہاں سے صلاح الدین اور رچرڈ کے درمیان جنگوں کا وہ لمبا سلسلہ شروع ہُوا جس نے صلاح الدین کا نام مسیحی دنیا کے بچے بچے کی نوکِ زبان پر پہنچا دیا کیونکہ جواں مردی (Chivalry) کی روایت وہاں بھی موجود تھی اور اس کا احترام بھی کیا جاتا تھا۔

رچرڈ انگلستان کا بادشاہ تھا۔ جذبۂ جہاد سے سرشار یہ خودسر اور مغرور بادشاہ ابھی 34 سال کا جوان تھا کہ وہ کروسیڈز میں شامل ہوگیا۔ جب وہ عکرہ کے قریب پہنچا تو اس کا حوصلہ اس بات سے اور بھی بڑھ چکا تھا کیونکہ اس نے مسلمانوں کے بیروت سے چلے ہوئے ایک جہاز پر قبضہ کرلیا تھا جس پر غذا کے علاوہ بہت سا جنگی سامان بھی لدا تھا۔ یہی نہیں، اس میں عکرہ جانے والے 650 سپاہی بھی سوار تھے جنھیں گرفتار کر لیا گیا تھا اور اس سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا تھا۔

عکرہ کا محاصرہ ہو چکا تھا اور رچرڈ نے بیمار ہونے کے باوجود گولے پھینکنے والی منجنیقوں اور شہر کے مرکزی دروازے کے سامنے لکڑی کے ایک اونچے مینار کی تعمیر کی بہ نفسِ نفیس نگرانی کی تھی جس سے مسیحی مجاہدینِ دین کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ رچرڈ کا ارادہ یہی تھا کہ عکرہ فتح کر کے جلد از جلد بیت المقدس کا رخ کیا جائے جو اس کے نزدیک کروسیڈوں کا اصل مقصد تھا۔ چنانچہ اس نے عکرہ کے محاصرے کے دوران اپنی تیز طبیعت کے عین مطابق اس خواہش کا اظہار کیا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی سے اس کی براہِ راست ملاقات ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سلطان کو اپنی شخصیت اور گفتگو ہی سے اتنا مرعوب کرلے گا کہ وہ بیت المقدس سے ہاتھ اٹھالے۔

صلاح الدین نے جواب دیا، ''بادشاہوں کی ملاقات سے پہلے ضروری ہوتا ہے کہ کسی معاہدے کی بنیاد ڈالی جا چکی ہو۔ کیونکہ یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ان کی ملاقات کے بعد حالات امن کے بجائے جنگ کا رخ کرلیں''۔ رچرڈ کے لیے یہ ''نفاست'' خصوصاً اس لیے بھی حیران کن تھی کیونکہ اس نے تو اپنے باپ اور بھائیوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہ کی تھی۔ صلاح الدین نے خود ہی درمیانی راستہ نکالا اور اپنے بھائی ''عادل'' کو رچرڈ سے ملاقات کے لیے بھیج دیا۔ ان دونوں کے درمیان اس قدر دوستی ہوگئی کہ کچھ عرصہ بعد رچرڈ نے اپنے ہاتھوں سے عادل کے بیٹے کو Knighthood کی پٹی پہنائی۔ عکرہ کے محاصرے کے دوران دونوں طرف سے تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔ ایک جنگ میں رچرڈ کا گھوڑا زخمی ہوگیا تو صلاح الدین نے اسے دو اصیل گھوڑے پیش کیے کہ جس پر چاہے سوار ہو جائے تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ وہ اس لیے مارا گیا کہ پیدل تھا۔

جب رچرڈ بہت بیمار ہوگیا اور اسے شدید بخار نے آلیا تو صلاح الدین نے ٹھنڈی پٹیاں کرنے کے لیے برف اور کھانے کے لیے انواع و اقسام کے پھل بھیجے۔ بالآخر بیماری نے رچرڈ کو واپس انگلستان جانے پر مجبور کر دیا اور یوں رچرڈ اور صلاح الدین کے درمیان، جو آپس میں کبھی نہ ملے تھے، صلح نامہ ہوگیا۔

Marfat.com

گو یورپ میں صدیوں تک مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب پایا جاتا رہا ہے۔ لیکن صلاح الدین کی روحانی جواں مردی نے پہلی مرتبہ مغربی دنیا کو اسلام کا "چہرۂ رحمت" دکھا کر بتایا کہ اسلام اوّل و آخر، قرآن حکیم کی تعلیم اور رسُولِ خدا کی سنت کے مطابق آزادی اور مساوات کی بنیاد پر امن کا خواہش مند ہے۔

چلتے چلتے، صلاح الدین ایوبی کے بارے میں چند چھوٹی چھوٹی باتیں اور سن لیجیے:

(1) جب عالی ظرفی، صداقت اور سادگی شاہی درباروں اور محلات سے رخصت ہو چکی تھی تو صلاح الدین کی زندگی عالی ظرفی، صداقت اور سادگی کا جیتا جاگتا مرقع تھی۔

(2) اس کے عہد حکومت میں مسیحیوں اور یہودیوں پر اسلامی شریعت ہرگز ہرگز نہ ٹھونسی گئی۔ ان کے لیے ان کی اپنی شریعت کے مطابق عدالتیں قائم کی گئی تھیں اور ان کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جاتی تھی۔

(3) صلاح الدین اپنے ہم عصر عالم اور صوفی، غزالیؒ کی تعلیمات سے متاثر تھا جس کے نتیجے میں اس کا طرزِ عمل شریعت اور تصوف کا خوبصورت امتزاج تھا۔

(4) جب 4 مارچ 1193ء میں اسلام کا یہ روشن چراغ بجھا تو اس کی عمر صرف 55 سال تھی۔ اس کے چہرے پر کھلتا ہُوا تبسم بتا رہا تھا کہ اس کی پاک دامنی کو اس کے ربّ نے شرف قبول بخش دیا ہے۔

(5) اپنے دور کا یہ عظیم حکمران، جس کی فراخ دلی، فیاضی اور فراست کی دھاک اسلامی دنیا سے نکل کر مسیحی دنیا تک جمی ہوئی تھی، اس دُنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا توشہ نیکیوں سے بھرا ہُوا تھا لیکن اس کی جیب اس حد تک خالی تھی کہ اس کے کفن دفن کے لیے بھی اس میں کچھ نہ تھا۔ نہ کوئی جائیداد تھی، نہ کوئی ساز و سامان تھا اور نہ ہی کوئی گھر تھا۔ ہاں، اس مردِ خدا، اس روحانی جواں مرد کے لیے اُس کے ربّ کی خاص الخاص جنت میں یہ سب کچھ، بلکہ اس سے بھی بہت کچھ زیادہ موجود تھا۔

ظہیرالدین بابر

آیئے، صلاح ایوبی کے بعد ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین بابر سے ملتے ہیں۔ دونوں میں کوئی نسلی رشتہ داری تو نہیں تھی کیونکہ صلاح الدین کُرد تھا اور بابر مغل، لیکن روحانی جواں مردی کے اعتبار سے وہ سگے بھائی معلوم ہوتے ہیں حالانکہ وقت کے حساب سے دونوں میں کم از کم تین صدیوں کا فاصلہ تھا۔ بابر کے لفظ سے ببر شیر کا خیال آتا ہے جو اپنی بہادری، عالی ظرفی اور درویش منشی کے باعث دنیائے حیوانات کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ظہیرالدین نے "بابر" کا لقب خود چنا تھا یا نہیں، یہ تھا اس کے کردار کے عین مطابق!

بابر، عظیم مغل فاتح تیمور کی پانچویں پشت سے تعلق رکھتا تھا۔ زمانے کی گردش نے اس کے باپ کی حکومت کو بدخشاں کے صوبے فرغانہ تک محدود کر دیا تھا۔ 1494ء میں گیارہ سالہ بابر فرغانہ کے تخت پر بیٹھا تو اس کے دشمن، ازبک

Marfat.com

سردار شیبانی خان نے اس کی زندگی اجیرن کر دی۔ بابر کے اگلے انیس سال اِدھر اُدھر چھپ چھپا کر اپنی جان اور فرغانہ کا تخت بچاتے گزر گئے۔ اس دوران اس نے تاریخ اور جغرافیہ کھنگال ڈالے۔ ہمت ہارنے کے بجائے اس کا حوصلہ اتنا بلند ہوتا گیا کہ اس نے تیمور کے صحیح جانشین کے طور پر اس کے دور کی پوری سلطنت پر تسلط قائم کرنے کی ٹھان لی۔ وراثت کے اعتبار سے وہ بادشاہ تھا جبکہ حالات نے اسے ایک ایسا مہم جُو (Adventurist) بنا دیا تھا جو ہر وقت جان ہتھیلی پر رکھے قسمت آزماتا رہتا ہے۔

قسمت بھی ایسے ہی جواں مردوں کی باندی ہوتی ہے، اس نے پلٹا کھایا اور 1504ء میں بابر کابل اور قندھار پر قابض ہو گیا۔ گو اس کا خواب تو تیمور کے دارالحکومت سمرقند کو فتح کرنا تھا لیکن قدرت تو اسے اسلام کے مقدر کا ستارہ سمجھتی تھی۔ 12-711ء میں جب طارق بن زیاد سپین کے ساحلوں پر کشتیاں جلا رہا تھا تو یہی دن تھے جب محمد بن قاسم سندھ کے راستے ہندوستان میں داخل ہُوا تھا۔ 1492ء میں سپین کی مسلمان حکومت ملیامیٹ ہوئی تو یہی دن تھے جب 1494ء میں بابر فرغانہ کے تخت پر بیٹھا اور پھر قدرت نے اسے ہندوستان میں ایک پائیدار مسلمان حکومت کی بنیاد رکھنے کا خواب عطا کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے سپین میں ختم ہوتی ہوئی مسلمان سلطنت کی ہندوستان میں منتقلی کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

کابل اور قندھار کو بدخشاں سے جوڑ کر بابر نے پہلے تو اپنے لیے ایک مربوط، منظم اور مضبوط حصار تعمیر کیا اور پھر اپنی نظریں شمال کے بجائے جنوب کی طرف موڑ دیں جو ہندوستان کے دِل، دِلّی کے افغان سلطان ابراہیم لودھی کے تخت پر جا ٹھہریں۔ اوّل اوّل اس نے اپنی کچھار سے نکل کر ہندوستان پر چھاپے مار کر یہ دیکھا کہ ابراہیم لودھی کتنے پانی میں ہے۔ اسے اندازہ ہُوا کہ ہندوستان کے ہندوؤں نے تو مسلمانوں کے سامنے مدافعتی (Defensive) انداز اختیار کر رکھا تھا اور ان کی کوشش تھی کہ مسلمانوں کو ایک ناگزیر برائی (Necessary Evil) سمجھ کر ان کے ساتھ گزارہ کرنے کی راہیں نکالتے رہیں۔ مگر وہاں کے مسلمان حکمران طبقے میں پہلی سی توانائی اور جذبہ نہ رہا تھا۔ گویا بابر کے لیے گنجائش موجود تھی۔

ابراہیم لودھی سے اس کے افغان امراء خوش نہیں تھے۔ وہ وعدے کا پکا نہیں تھا اور اپنے ماتحتوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دوٹوک بات کرنے کے بجائے اپنے ناپسندیدہ امراء کو سازش سے مروا ڈالتا تھا۔ آہستہ آہستہ غیرت مند امراء اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ چنانچہ پنجاب کے افغان گورنر نے بابر کو دعوت دی کہ وہ آئے اور ان کی ابراہیم لودھی سے جان چھڑائے۔ اصل میں یہ امراء ایک ایسا حکمران چاہتے تھے جو دِلّی کے بجائے کابل میں بیٹھ کر برائے نام حکومت کرے اور انھیں ان کے علاقوں میں کُھل کھیلنے دے۔ انھیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ کسی معمولی شخص کو نہیں، ایک ایسے جواں مرد کو بلا رہے تھے جو نابغۂ روزگار (Genius) تھا اور جس کی جواں مردی صرف جسمانی نہیں، اخلاقی اور روحانی جواں مردی تھی۔

Marfat.com

21-اپریل 1526ء کو بابر نے ابراہیم لودھی پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ دِلّی سے صرف پچاس میل پہلے، پانی پت کے میدان میں دونوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ غور فرمایئے کہ بابر اپنی فوج کے ساتھ کابل سے دِلّی کے چند میل دُور تک کا رقبہ فتح کر چکا تھا۔ لیکن جب اس کی ابراہیم لودھی سے براہِ راست ٹکر ہوئی تو پتا چلا کہ لودھی کی فوج تعداد اور تیاری میں اس سے کہیں زیادہ تھی۔ یہی نہیں، ایک سو جنگی ہاتھی بھی اس میں شامل تھے۔ لیکن دونوں فوجوں میں اصل فرق قیادت اور قیادت سے وفاداری کا تھا جو بابر اور اس کے ساتھیوں کا خاصہ تھا۔ جہاں لودھی کے سردار اور سالار اندر سے اس کے ساتھ نفرت کرتے تھے، وہاں بابر کے ساتھی اس کی ولولہ انگیز قیادت اور کرشماتی شخصیت کے دِل سے قائل تھے۔ پھر بابر کو ایک فوقیت یہ بھی حاصل تھی کہ اس کے چابک دست گھڑسوار دستے دائیں اور بائیں طرفوں سے ناگہانی آفت کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور تو اور، اس کا توپ خانہ نیا نیا ترکی سے آیا تھا جس میں نہ صرف زیادہ دُور تک گولے پھینکنے کی صلاحیت تھی بلکہ اسے نہایت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک لے جایا جا سکتا تھا۔ بابر نے احتیاطاً توپ خانے کا انچارج بھی ایک ماہرِ فن تُرک افسر ہی کو بنا رکھا تھا۔ یوں بابر کا پلہ بھاری ثابت ہُوا، ابراہیم لودھی جنگ میں مارا گیا اور اس کا ٹِڈی دَل لشکر بتر بتر ہوگیا۔

بابر کو بلانے والے افغان امراء انتظار کر رہے تھے کہ بابر کب دِلّی پر قبضہ کر کے اسے لُوٹنے کے بعد کابل کا رخ کرے گا۔ انھوں نے یہ طرفہ تماشا دیکھا کہ بابر تو دِلّی سے آگے، آگرے کی طرف بڑھ گیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب نپولین کے بُرے دن آئے تھے تو اس نے روس پر چڑھائی کر دی تھی اور جس نپولین کو اس وقت تک یورپ کے کسی ملک کا کوئی جرنیل شکست نہ دے پایا تھا اسے روس کے دو جرنیلوں نے الٹے پاؤں واپس بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں ایک کا نام ''جرنیل جنوری'' اور دوسرے کا ''جرنیل فروری'' تھا۔ روس میں جنوری اور فروری کے مہینوں میں پڑنے والی برف کے سامنے ناقابلِ تسخیر نپولین نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ تاریخ اب ہندوستان میں بابر کے مقابلے میں ''جرنیل جُون'' اور ''جرنیل جولائی'' کو کھڑا کر کے یہ آزما رہی تھی کہ فرغانہ کا شیر ببر اور اس کے ساتھی ہندوستان کی تباہ کن گرمی کے سامنے کتنے دن ٹھہرتے ہیں۔

چوکنے اور چاق و چوبند بابر نے اپنے سرداروں اور سالاروں کو آپس میں ہندوستان کی گرمی اور گرد ہی نہیں، یہاں کے حبس کی شدید شکایت کرتے سن لیا تھا۔ آگرے پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ لاہور کے شالامار کی طرح کا ایک باغ بنوایا جس میں فوارے، آبشاریں، سبزہ زار اور سایہ دار پودے آنکھوں کو طراوت دیتے تھے اور جس کی ہوادار بارہ دریاں حبس اور پسینے کو دُور بھگاتی تھیں۔ اس سب کچھ سے زیادہ، کابل کے انگوروں اور خربوزوں، اس کی ٹھنڈی ہواؤں اور برفیلے پانیوں کو ترسنے والے ''بیگوں'' کو جس ایک بات نے ہندوستان میں تادیر قیام کے لیے آمادہ کیا وہ بابر کی سحر انگیز قیادت تھی جس سے بے وفائی کا خیال بھی ان کے نزدیک کفر تھا۔

اس نازک موقع پر قدرت نے ایک مرتبہ پھر بابر کی مدد کی۔ بظاہر تو رانا سانگا کا یہ اقدام بابر کے لیے ایک بہت

بڑی مصیبت بن کر سامنے آیا تھا کہ اس نے ہندوستان کے تمام راجپوت راجاؤں کے تعاون سے بابر کی یلغار روکنے کی ٹھانی تھی۔ لیکن اس کی بدولت بابر کو یہ موقع مل گیا کہ اپنی کشتیاں جلا ڈالنے والے طارق بن زیاد کی طرح وہ بھی اپنے گھروں سے ہزار ہا میل دور آئے ہوئے اپنے سپاہیوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مربوط اور مضبوط کر لے۔

جب لڑائی دو مسلمان بادشاہوں کے درمیان تھی تو ہندوستان کی ہندو آبادی کو اس سے غرض نہیں تھی کہ دونوں میں سے کون ہارے یا جیتے گا۔ لیکن اب تو رانا سانگا نے ایک لاکھ کا لشکر اس نعرے پر اکٹھا کیا تھا کہ ہم مسلمان حملہ آوروں کو ان کے گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔ اس طرح یہ جنگ کفر اور اسلام کی جنگ بن گئی تھی۔ اس جنگ نے جہاں بابر کے لیے اپنے ساتھیوں کے اندر ایمان کی روح پھونکنا آسان بنا دیا وہاں خود اس کی جواں مردی کو روحانی جواں مردی میں بدل ڈالا۔

بابر کو قدرت نے خداداد صلاحیت بخشی تھی کہ وہ آگا دوڑ اور پیچھا چوڑ کے بجائے، آگے بڑھنے سے پہلے اپنے گھر کو پوری طرح محفوظ کر لیتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے فتح کرتا اور دوسرے سے استحکام دیتا رہتا تھا۔ وہ ہندوستان کے جس بھی گوشے میں ہوتا اس کا کابل سے رابطہ کبھی کمزور نہ پڑتا۔ یوں اسے تازہ دم سپاہیوں اور سامانِ جنگ کی نئی سے نئی کھیپ پہنچتی رہتی تھی۔ کابل سے ہر وقت کوئی نہ کوئی قافلہ آتا اور بابر کے کیمپ سے کوئی نہ کوئی قافلہ واپس جاتا رہتا تھا۔ یاد رہے کہ چنگیز خان کے دور سے منگولوں اور ان کی نئی پود "مغلوں" کا رسل و رسائل کا بندوبست مثالی چلا آتا تھا اور بابر نے اسے اور بھی زیادہ منظم اور قابلِ اعتماد بنا دیا تھا۔

جہاں کابل سے سپاہی اور سامانِ جنگ آتا تھا وہاں کابل کی بھٹیوں میں تیار ہونے والی اچھی سے اچھی شراب بھی آتی تھی۔ بابر کا اپنا مصرع ضرب المثل بن چکا ہے کہ "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست (بابر! جتنا عیش کر سکو کر لو کہ دنیا کی یہ زندگی پھر نہیں آئے گی)۔ ظاہر ہے کہ وہ شراب کی حد تک پرہیزگار نہ تھا۔ جب بابر اور رانا سانگا کی فوجیں آمنے سامنے آئیں تو ایک مرتبہ تو بابر کو محسوس ہُوا کہ نہ صرف ہندوستان میں ایک پائیدار مغلیہ سلطنت کا خواب دھرے کا دھرا رہ جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود اور اس کے تمام ساتھی تہ تیغ کر دیے جائیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھا رہا تھا کہ اتنے میں اسے خبر ملی کہ ابھی ابھی کابل سے خچروں کی ایک بڑی تعداد اس کی پسندیدہ شراب لے کر پہنچ گئی ہے۔ بابر کے ضمیر نے اس کے دل سے سرگوشی کی جو بابر کے کان میں بھی پڑ گئی، "تم خدا سے دعا کر رہے ہو کہ وہ تمھیں کفر اور اسلام کی اس جنگ میں فتح عطا کرے اور اسی بنیاد پر تم اپنے ساتھیوں سے جاں نثاری کا مطالبہ کر رہے ہو لیکن تم خدا کا اتنا سا حکم بھی نہیں مان رہے کہ شراب سے پرہیز کرو"۔

وہ کوئی عجیب معجز نما سا لمحہ تھا۔ بابر بلند آواز سے پکار اٹھا، "ربّ العزت! میں اپنے ہزار ہا ساتھیوں کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ اس لمحے کے بعد شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میری تجھ سے التجا ہے کہ مجھ گناہ گار کو کفر کے خلاف اس معرکے میں فتحِ کامل عطا فرما"۔ اور پھر تاریخ نے یہ تماشا دیکھا کہ ہزاروں من قیمتی شراب ایک بڑے گڑھے میں انڈیلی

جاری ہے اور لحہ بہ لحہ مسلمان رانا سانگا کے لشکر پر غلبہ حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔

تاریخ دان اور فنِ حربیات کے ماہر لاکھ کہیں کہ رانا سانگا نے اس لیے شکست کھائی کہ اس کے لشکر میں ویسی یک جہتی نہیں تھی جیسی بابر کی فوج میں تھی کیونکہ اس میں شامل جتھے مختلف راجاؤں کی طرف سے اپنے اپنے سپہ سالاروں کے تحت اپنی اپنی حکمت عملی کے مطابق لڑ رہے تھے۔اور پھر ان راجاؤں کے درمیان قدیمی رقابتیں بھی رنگ میں بھنگ ڈال رہی تھیں۔یہ ماہرین یہ بھی ضرور کہیں گے کہ بابر کے متحرک اور مؤثر توپ بنانے کا کوئی توڑ راجپوت فوج کے پاس نہیں تھا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ''خالی خولی جواں مردی'' بابر کو جہاں تک لے آئی تھی اس سے آگے بڑھنا ''روحانی جواں مردی'' کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔بابر کے اس عجیب وغریب اقدام نے جہاں اس کے اپنے سپاہیوں کے حوصلے بلند کر دیے وہاں دشمن کے سپاہیوں کے حوصلے بھی پست کر دیے۔اس سے بھی بڑی صداقت یہ ہے کہ بابر کی روحانی جواں مردی آنے والی انسانی نسلوں کے لیے یہ سبق چھوڑ گئی کہ روح کو ہر مادی طاقت پر برتری حاصل ہے۔

بابر کو میواڑ کے مقام پر 16 مارچ 1527ء کو خدا نے جو کامیابی بخشی اس نے ہندوستان میں مغل مسلمانوں کو کم از کم تین صدیوں تک کسی بڑے چیلنج سے دوچار ہوئے بغیر حکومت کرنے کا موقع دے دیا۔بے شک خود انھی کی طرح باہر سے آئے ہوئے انگریزوں نے بعد میں مغلوں سے حکومت چھین لی لیکن بابر نے رانا سانگا کو شکست دے کر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اٹھنے کی تادیر جرأت نہ کرنے دی۔

جس طرح بابر فتح (Conquest) کو استحکام (Consolidation) کا ہم رکاب رکھتا تھا اسی طرح جب ایک مرتبہ اس کی جواں مردی روحانی جواں مردی میں بدل گئی تو اس نے اسے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے وجود کا مستحکم حصہ بنالیا۔قدرت نے جلد ہی اس حقیقت کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔1530ء میں بابر کا محبوب بیٹا اور ولی عہد ہمایوں بیمار پڑا اور اس کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔بدخشاں اور کابل سے موجودہ صوبہ سرحد اور پنجاب سے ہوتی ہوئی دِلی اور آگرے سے بنگال تک پھیلی ہوئی مغل سلطنت کے بانی نے بیٹے کے علاج کے لیے دُنیا کی ہر دولت خرچ کر ڈالی لیکن اسے شفا نہ ہوئی۔آخر اس نے اپنی روحانی جواں مردی کو آزمانے کا تہیہ کرلیا۔لکھنے والے لکھتے ہیں کہ بابر نے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے ہمایوں کے گرد خاموشی سے چکر لگانے شروع کر دیے۔وہ اپنے رب کو ہمایوں کے عوض اپنی جان پیش کر رہا تھا۔جوں جوں بابر دل وجان اور ان سے بھی زیادہ اپنی روح کی پوری طاقت سے یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ ہمایوں کی جگہ خود اسے موت آجائے، اس کی زندگی ہمایوں میں منتقل ہوتی جارہی تھی۔اور پھر تاریخ نے دیکھا کہ بابر کی موت ہمایوں کی زندگی بن گئی اور روح ایک مرتبہ پھر مادّے پر غالب آگئی۔

جلال الدین اکبرِ اعظم

بابر نے بظاہر تو اپنی جان اپنے بیٹے ہمایوں کے لیے قربان کی تھی لیکن تاریخ کی تجزیاتی آنکھ سے دیکھیں تو یہ

Marfat.com

قربانی دراصل اس کے پوتے جلال الدین اکبر کے لیے تھی جس نے ہندوستان میں اُس مغلیہ سلطنت کو استحکام و استقلال دیا جسے بابر نے جسم اور روح کی ساری توتیں صرف کر کے قائم کیا تھا۔ ہمایوں کا تاریخی کردار یہی نظر آتا ہے کہ وہ بابر اور اکبر کے درمیان، سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اکبر اُس خواب کی تعبیر تھا جو بابر نے دیکھا تھا۔

مذہب سے لگاؤ رکھنے والے مسلمانوں میں دینِ الٰہی جیسی بدعت اور ہندو عورتوں سے شادی کی بنا پر اکبر کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔ خصوصاً مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ کے پیروکار اکبر کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غیر مسلم عورتوں سے شادی کا تو پھر بھی کوئی جواز تھا کیونکہ کئی ممتاز صوفیاء ہندوؤں کو بھی اہلِ کتاب تسلیم کرتے تھے اور اہلِ کتاب سے شادی کی اجازت تو خود اسلام نے دے رکھی ہے۔ البتہ اسلام اور ہندوستان میں رائج دوسرے مذاہب کا ملغوبہ بنا کر اسے دینِ الٰہی قرار دینے کی جسارت، بدعت ہی کہلائے گی کیونکہ کوئی بھی دین اگر خدا (یا الٰہی) سے منسوب ہے تو پھر وہ کسی بندۂ خدا کا گھڑا ہُوا نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ حکیم نے اس سلسلے میں واضح اعلان کر رکھا ہے، ''خبردار، دین خالص اللہ کا حق ہے'' (39:3)۔ بے شک دورِ حاضر میں سنجیدہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر مکالمہ ہو۔ ایسی عبادت گاہیں بھی بن گئی ہیں اور بن رہی ہیں جہاں مشرق و مغرب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کی مکمل سالمیت کو قائم اور محفوظ رکھتے ہوئے، اُس ایک حقیقتِ برحق کی عبادت کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں جسے خدا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس رویئے اور دینِ الٰہی کے اقدام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

تو پھر روحانی جواں مردی کے اس تذکرے میں اکبر کے ذکر کی کیا تک ہے؟

اکبر تخت پر بیٹھا تو باپ اور دادا کے برعکس قریب قریب اَن پڑھ تھا۔ البتہ جس طرح فرغانہ کے تخت پر بیٹھتے وقت بابر صرف گیارہ سال کا تھا اسی طرح ہندوستان کے تخت پر بیٹھتے وقت اکبر بھی صرف تیرہ سال کا تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت کا پہلا امتحان یہ تھا کہ اپنے لائق اور بہادر اتالیق بیرم خان کی وفاداری کی قدر کرے جس نے اسے نہ صرف اتنی بڑی سلطنت کی ابتدائی مشکلات سے نکالا بلکہ پانی پت کی دوسری جنگ میں ہیمو بقال کو شکست دی، گوالیار اور جونپور کو دوبارہ سلطنت میں شامل کیا اور سلطنت کو مستحکم کر کے اکبر کی بادشاہت کا سکہ جما دیا۔ اکبر کی سیاسی بصیرت کا دوسرا امتحان یہ تھا کہ وہ ساری عمر بیرم خان کے گھنے سایے میں بادشاہت کرے گا یا اس سایے سے آزاد ہو کر کھلے آسمان تلے اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر امورِ سلطنت نبٹائے گا۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر میں بیرم خان کو اسی طرح فارغ کر دیا جس طرح تمام دنیادار حکمران سب سے پہلے انھی لوگوں کو قید یا قتل کرتے ہیں جن کے شانوں پر وہ ایوانِ اقتدار میں پہنچتے ہیں۔

اکبر کے اس اقدام کو بھی سیاسی فراست یا جواں مردی تو کہا جا سکتا ہے، روحانی جواں مردی ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل یہاں اس کی سیاسی فراست اور جواں مردی کا ذکر کیا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کی روحانی جواں مردی زیادہ کھل کر سامنے آ جائے۔ ذرا اردگرد نظر دوڑایئے اور دیکھیے کہ سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی دنیا میں قائدین کا اپنے نائبوں اور ممکنہ وارثوں کے بارے میں کیا رویّہ ہوتا ہے۔ برادرانِ یوسفؑ کو دیکھ لیں، فرعونِ موسیٰؑ کو دیکھ لیں عیسیٰؑ کے عہد میں فلسطین کے یہودی بادشاہ

Marfat.com

ہیرودیس(Herod) کو دیکھ لیں جس نے متّی کی انجیل (2:12) کے مطابق فرعونِ موسیٰؑ کی طرح نوزائیدہ نر بچوں کے قتل کا حکم دے دیا تھا، انگریز بادشاہ ''ہنری دوم'' کو دیکھ لیں جو اپنے عزیز ترین دوست بلکہ یارِ غار آرچ بشپ طامس بیکٹ کو گرجے کے اندر قتل کروا ڈالتا ہے (T.S. Eliot's Play: Murder in the Cathedral)۔ کیا کیا گنوایا جائے، قابیل سے چلا ہُوا حسد کا سلسلہ آج تک نت نئے گُل کھلاتا رہتا ہے۔ لیکن جب اکبر نے بیرم خان کا گھونٹ بھر لیا اور اپنے طور پر فتح حاصل کر کے اپنی دھاک بٹھالی تو اس نے ایک ایسا کام بھی کر دیا جس نے اسے اکبر سے اکبرِ اعظم(Akbar, the Great) بنا دیا۔ یہی وہ کام ہے جس کی وجہ سے اکبر کو اس تذکرے میں یاد کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

کاش ہمارے بڑے لیڈر، عالم اور ادیب، اکبر سے یہ بات سیکھ سکتے کہ جب دُنیا آپ کو بڑا تسلیم کر ہی لے تو اپنے پیچھے آنے والوں میں جس کسی کے اندر جوہر(Talent) دیکھیں اس کی قدر افزائی کے علاوہ اس کے جوہر کی آبیاری کریں۔ بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی کی صلاحیتوں پر اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے تو وہ چھوٹا نہیں ہو جاتا بلکہ پہلے سے بھی بڑا ہو جاتا ہے۔ وہ بڑے آدمی دراصل چھوٹے ہوتے ہیں جو چھوٹوں کو اپنے قد کے برابر اوپر اٹھتا دیکھ کر حسد کے مارے جل بھن جاتے، اور اوّل تو انہیں زندہ نہیں دیکھنا چاہتے، یا پھر ان کی کردار کُشی میں لگ جاتے ہیں۔

تمہید یقیناً لمبی ہوگئی ہے لیکن اکبر کی یہ بات ہے بہت اہم۔ جب اس نے نہ صرف اپنی حکومت بلکہ اپنی ذات کو مستحکم کر لیا تو اس نے سوچا، بادشاہ تو میں ہی ہوں، پھر میں اتنے بڑے ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے کیوں نہ ملک کے بہترین لوگوں کا تعاون حاصل کروں۔ وہی اکبر، جس نے کبھی بیرم خان جیسے لائق، بہادر اور وفادار انسان کو اپنی شخصیت چمکانے کے لیے موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا، پورے ہندوستان پر نظر دوڑاتا ہے اور بیربل جیسے دانا و بینا وزیرِ اعظم، ٹوڈرمل جیسے وزیرِ مالیات اور ابوالفضل اور فیضی جیسے جید عالموں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اسے تان سین جیسے گُنی گویّے کی بابت پتا چلتا ہے تو وہ اسے گوالیار کی چھوٹی سی ریاست کی ملازمت چھوڑ کر مغلیہ سلطنت کے دارالحکومت میں چلے آنے پر رضامند کرنے کے لیے بہ نفسِ نفیس گوالیار جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح کے نورتن تھے جن کی بدولت اکبر، محض اکبر سے ''اکبرِ اعظم'' بن گیا۔ یہ رویہ تاریخ میں اتنا کمیاب ہے کہ سوائے پیغمبروں کے بہت کم لوگوں کو اسے اپنانے کی توفیق ہوتی ہے۔ یقیناً یہ رویہ روحانی جواں مردوں ہی کا حصہ ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اکبر نے ''دینِ الٰہی'' مرتب کر کے مذہبی سطح پر جو غلطی کی تھی، روحانی سطح پر تمام مذاہب کے لوگوں کو برابر کے انسانی حقوق دے کر اور جوہرِ قابل کی قدر اور افزائش کر کے اس کا مداوا کر دیا۔

اکبر سے 1857ء کی جنگِ آزادی تک کی تین صدیوں میں برصغیر کے اندر یقیناً کئی ایسے افراد پیدا ہوئے جو روحانی جواں مردی کے حامل تھے۔ ان میں سے کچھ کا ذکر تصوف کی مختصر تاریخ میں آ چکا ہے۔ کاش بنگال کے نواب سراج الدّولہ، میسور کے حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسی جیالی اور جواں مرد شخصیات کی بابت کچھ تفصیلات بیان کی جا سکتیں۔ شاید کچھ قارئین اور ناقدین کو اورنگ زیب عالمگیر کے ذکر کی کمی بھی محسوس ہوگی۔ لیکن اس زاہد و عابد مجاہد کی اور جتنی بھی مذہبی خوبیاں ہوں، روحانی اعتبار سے اس کا دامن خالی ہی نظر آتا ہے۔

بارھواں باب

عہدِ حاضر کے چند مسلمان رُوحانی جواں مرد

سرسید احمد خانؒ

(1817-1898ء)

مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں سرسیدؒ وہ ہستی ہیں کہ وہ نہ ہوتے تو اقبالؒ اور جناحؒ بھی نہ ہوتے اور پاکستان بھی نہ ہوتا۔ برصغیر میں سرسیدؒ سے پہلے اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مسلمان مسلسل سیاسی زوال سے دوچار رہے۔ مگر 1857ء کی جنگِ آزادی کے نتیجے میں وہ انگریزوں کے ظلم و ستم کا خصوصی نشانہ بن گئے۔ آخری مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر کو جو صرف ''نام کا بادشاہ'' تھا ملک بدر کر دیا گیا اور اس خیال سے کہ مسلمانوں کے اندر سے ''بوئے سلطانی'' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دی جائے، انگریزوں نے ہر اس مسلمان کو قتل کر دیا جس کے بارے میں شبہ بھی تھا کہ اس میں غیرت کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہے۔ سرسیدؒ صرف اس لیے بچ گئے کہ وہ انگریز حکومت کے ایک بھلے مانس قسم کے ملازم تھے۔

خداوند کریم نے اسی بھلے مانس کو مسلمانوں کی ڈوبی ہوئی کشتی کو پار لگانے کے لیے چن لیا۔ آج کا پاکستانی مسلمان نوجوان اقبالؒ اور جناحؒ کے بارے میں تو شاید ایک دو ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ ہی دے لیکن وہ سرسیدؒ کی بابت قریب قریب لاعلم ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مولانا الطاف حسین حالؔی کی لکھی ہوئی سرسیدؒ کی سوانح عمری، ''حیاتِ جاوید'' سے کم از کم ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ہی مستفیض ہو جائے۔

ہر پڑھے لکھے پاکستانی کے ضمیر میں یہ حقیقت رچی ہونی چاہئے کہ اگر سرسید احمد خانؒ نے مغربیت (Westernization) اور جدیدیت (Modernization) کے درمیان فرق کو اجاگر کر کے برصغیر کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے راستے پر نہ ڈالا ہوتا تو آج ہم جہالت کی دلدل میں اس بری طرح پھنسے ہوتے کہ نہ ہم میں کوئی اقبالؒ پیدا ہوتا اور نہ محمد علی جناحؒ۔ ہماری حالت افغانستان کے طالبان سے بھی بدتر ہوتی۔ انھیں تو پھر بھی بندوق بنانی اور چلانی آتی ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی سے لاعلمی کے باعث ہم شاید اتنا بھی نہ کر سکتے۔ یہ بھی نہ بھولیے کہ ہندوستان کے برعکس افغانستان پر انگریز پوری کوشش کے باوجود قبضہ نہ کر سکے تھے کیونکہ افغان بندوق بنانے اور چلانے کے لیے آزاد تھے۔ 1857ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو یہ آزادی بھی نصیب نہ تھی۔ تلوار کی طاقت بھی ہم نے آزما کر دیکھ لی تھی۔ سید احمد بریلویؒ 1831ء میں سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو چکے تھے۔ مسلمان عوام اور قبائلی سرداروں نے انھیں اور ان کے جاں باز ساتھیوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ مسلمانوں کے پاس اب دو ہی راستے تھے، جہالت کی موت یا علم کی روشنی میں نئی زندگی۔ سرسیدؒ نے ایک طویل، صبر آزما اور معجز نما جدوجہد سے مسلمانوں کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر دور

Marfat.com

حاضر کی للکار سے عہدہ برآ ہونے کے لائق بنادیا۔ سرسید کی زندگی کے دریا کو کوزے میں بند کرنا مقصود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ:

سرسیدؒ = دلِ دردمند + علم + استقلال

آج کا عام تعلیم یافتہ پاکستانی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ سرسید کو یہ راستہ اختیار کرنے پر خود مسلمانوں کے اندر سے کتنی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انھیں انگریزوں کے پٹھو اور ٹوڈی ہی نہیں، کافر اور دہریہ بھی کہا گیا۔ لیکن اس مردِ خدا نے جب ایک مرتبہ دیکھ لیا کہ زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے مسلمان نہ صرف سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بلکہ تہذیبی، اخلاقی اور روحانی طور پر بھی پسماندہ ہو گئے ہیں تو اس نے خدا اور اپنے مقصدِ حیات کی صداقت پر مکمل ایمان رکھتے ہوئے ہر مشکل اور ہر مخالفت کو ہنس کر برداشت کر لیا اور آگے سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

سرسیدؒ نے دیکھا کہ 1857ء کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو چن چن کر نشانۂ ستم بنانا شروع کر دیا ہے تو انھوں نے ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر مسلمانوں کی وکالت کی اور انگریزوں کو بتایا کہ اس بغاوت کی اصل وجہ انگریز حکام کی ہندوستانی عوام سے دوری، رعونت اور سخت گیری ہے۔ انگریزوں کے نمک خوار کہلانے والے سرسیدؒ نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر انگریزی حکومت پر کڑی تنقید کی اور مسلمانوں پر نازل شدہ عذاب کو ٹالنے کا راستہ نکالا۔

انگریزوں کے اسی نام نہاد پٹھو نے دیکھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب The Life of Mohammad (حیاتِ محمدؐ) میں رسولِ خدا کے بارے میں نہایت گمراہ کن مواد جمع کر دیا ہے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہو رہی ہے اور غیر مسلموں خصوصاً انگریزی خوان لوگوں میں تعصب پھیل رہا ہے تو ان کا خون کھول اٹھا۔ انھوں نے دِلّی میں اپنی جائیداد بیچی، لندن جا کر جو جواب خود اردو میں لکھا تھا اسے ایک انگریز سے ترجمہ کرایا اور وہیں سے یہ انگریزی تصنیف The Series of Essays on the Life of Mohammad. Trubner & Co. 1870 شائع کی تاکہ حتی الامکان اس حلقے تک پہنچا جائے جہاں سر ولیم میور کی کتاب کے پہنچنے کا امکان تھا۔ اس طرح کی غیرت کا علمی اور عملی اظہار کوئی ایسا مردِ خدا ہی کر سکتا تھا جو روحانی جواں مردی کے جوہر کا حامل ہو۔

لندن میں قیام کے دوران سرسیدؒ نے مہدی علی خان کے نام جو خطوط لکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سفر نے اس مردِ خدا کے دل و دماغ پر اسلام کی حقانیت کا نقش مزید گہرا کر دیا۔ سرسیدؒ نے محسوس کر لیا کہ اس حقانیت کو دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق واضح کرنے کی شدید ضرورت ہے اور اس سلسلے میں انھیں مسلمانوں میں جدید علوم کی روشنی پھیلانی ہوگی تاکہ وہ خدا کی عطا کردہ علمی اور روحانی استعداد کو پوری طرح بروئے کار لا سکیں۔ صرف اس طرح یہ ثابت ہو سکے گا کہ اسلام حال اور مستقبل کے تمام مسائل سے مغرب کے مقابلے میں بھی بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اقبالؔ نے شاید یہ شعر سرسیدؒ ہی کے لیے کہا تھا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

Marfat.com

جب تک فارسی سرکاری اور دفتری زبان تھی، مسلمانوں کو پھر بھی کچھ ملازمتیں مل جاتی تھیں۔ جب 1835ء میں گورنر جنرل لارڈ بنٹنک (Bentinck) نے یہ مقام انگریزی کو دے دیا اور ساتھ ہی انگریزی تعلیم کو کسی بھی قابلِ ذکر سرکاری ملازمت کی شرط بنا دیا تو مسلمان رہی سہی سماجی حیثیت بھی کھو بیٹھے۔ کئی مسلمان علماء نے انگریزی تعلیم کو کفر و الحاد کا ذریعہ قرار دے دیا۔ یوں بھی ہندوستانی مسلمان قدامت پرستی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس ہندو میں حالات کے مطابق ڈھل جانے کی لچک پیدا ہو چکی تھی۔ جب مسلمانوں کا دورِ حکومت تھا تو ہندوؤں نے فارسی سیکھ لی تھی۔ اب وہ جھٹ پٹ انگریزی سیکھنے پر تیار ہو گئے اور جلد ہی زیادہ تر ''درمیانہ افسرانہ'' ملازمتوں پر ان کی اجارہ داری ہو گئی۔

بہتر سرکاری ملازمتوں نے ہندوؤں کے اندر درمیانے طبقے کو مضبوط سے مضبوط کر دیا اور یہی طبقہ ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ طبقہ پہلے بھی بے حد محدود تھا۔ ان کے عہدِ عروج میں باہر سے آئے ہوئے امراء اور علماء کا شمار تو اونچے طبقے ہی میں ہوتا تھا البتہ جو غیر مسلم عوام، صوفیاء کی تعلیم و تلقین سے اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ پہلے ہی کی طرح نچلے طبقے میں سسکتے رہتے تھے۔ نئے حالات میں مسلمان امراء اور علماء بھی ایک طرف انگریزوں اور دوسری طرف ہندوؤں کے درمیان چکی کے دو پاٹوں میں پسنے لگے تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے لیکن سارا الزام مسلمانوں پر آ جانے سے خصوصاً مسلمان امراء اور علماء انگریزوں کے عتاب میں آ رہے تھے۔ اب ان لوگوں کے پاس بھی شان و شوکت کی پرانی یادوں کے سوا کچھ باقی نہ بچا تھا۔ انگریزوں کے مقرر کردہ وظیفوں سے کس سطح کا معیارِ زندگی اپنایا جا سکتا تھا، اس کا احوال دیکھنا ہو تو مرزا اسداللہ غالب کی مثال کافی ہے۔

خطرہ صرف یہ نہ تھا کہ ریڑھ کی ہڈی نہ ہونے سے مسلمان جہالت اور دُنیوی کمزوری کے باعث ہندوؤں میں گم ہو کر رہ جائیں گے، انگریزی تعلیم اور انگریزی جاہ و جلال نوجوان مسلمانوں کو مغرب پرستی اور بے دینی کی طرف بھی لے جا سکتا تھا۔ سرسیدؒ نے محسوس کیا کہ ہندوؤں سے الگ تشخص کے ساتھ ساتھ جہاں مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سیکھنے ہوں گے وہاں یہ بھی بے حد ضروری تھا کہ وہ جدیدیت اور مغربیت میں فرق کرنا بھی سیکھیں۔ ایک ایسے زندہ خدا کے پیروکار ہونے کے ناتے جو ہر لحظہ نت نئی تخلیق کرتا رہتا ہے اور ''والعصر'' کہہ کر زمانے کی صداقت کی قسم کھاتا ہے بلکہ کہتا ہے کہ میں خود زمانہ ہوں، مسلمانوں کے لیے زمانے سے ہم آہنگ ہونے کا مطلب صرف اور صرف یہ تھا کہ وہ خدا سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔ اس طرح جہاں مغرب کی اندھی پیروی غلط تھی وہاں جدیدیت بے حد ضروری تھی۔

زمانے سے ہم آہنگی ہی نے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی اور روحانی عظمت بخشی تھی۔ بلکہ مسلمانوں ہی سے روشنی پا کر یورپ میں بھی تحریکِ احیائے علوم شروع ہوئی تھی جس نے یورپ کو دنیا کا حکمران بنا دیا تھا۔ اس لیے زمانے سے ہم آہنگ ہونا عین اسلام تھا۔ یہ پیرویٔ مغرب نہیں، جدیدیت تھی۔ اور مسلمانوں کو جدیدیت اختیار کرنے کے لیے اپنے عقائد سے منحرف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ انگریزی تعلیم کی بدولت جدید علوم و فنون سے بہرہ مند مسلمان جو انگریزی لباس میں ملبوس ہو اور چھری کانٹے سے کھانا کھاتا ہو، ایمان اور اعتقاد کے

Marfat.com

اعتبار سے سو فیصد اسلام پر کاربند ہو سکتا ہے۔ سرسیدؒ نے خود تو خیر اس لیے ڈاڑھی بڑھا رکھی تھی کہ ان کے گلے میں ایک بدنما رسولی اُگ آئی تھی جسے اُنھوں نے اس کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ غور فرمایئے کہ کیا اس سوچ کے بغیر مسلمانوں میں اقبالؒ اور جناحؒ جیسے جہاں دیدہ ور لیکن ڈاڑھی منڈے لیڈر پیدا ہو سکتے تھے؟ اور کیا بیسویں صدی نے ان دو ڈاڑھی منڈوں سے عظیم تر کوئی اور مسلمان بھی دیکھا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! خصوصاً قائداعظم محمد علی جناحؒ کو دیکھ لیں کہ ان کی زبان، لباس، طرزِ زندگی مکمل طور پر جدید ترین ہونے کے باوجود ان کی روح میں اسلام اس طرح رچا ہُوا تھا جیسے پھول میں خوشبو۔

سرسیدؒ نے، علمی سطح پر جدیدیت اور مغربیت کا فرق واضح کر کے اس وضاحت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 1875ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی جسے مسلمانوں کی تحریک جدیدیت (Muslim Modernism) کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن غور کریں تو آپ اسے پاکستان کے قیام کی پہلی منزل بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس کالج کے قیام کے عین دس سال بعد انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آ گئی۔ سرسیدؒ جو شروع ہی سے مسلمانوں کے انگریزوں اور ہندوؤں سے الگ تشخص کے قائل تھے، اب وہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ اس تشخص کو لباسِ حقیقت پہنانے میں مصروف ہو گئے۔ ان کی چشمِ بصیرت نے دیکھ لیا کہ ایک نہ ایک دن انگریزوں کو ہندوستان سے جانا پڑے گا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ کانگریس کی تشکیل میں انگریزوں کا بھرپور عمل دخل ہے۔ اور انھیں یہ بھی صاف نظر آ گیا کہ کانگریس کے ذریعے سے آزاد ہونے والے ہندوستان میں مسلمانوں کو ذات پات اور چھوت چھات کے قائل ہندوؤں کے ماتحت زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

انگریزوں کے اس بظاہر (so called) نمک خوار نے ایک مرتبہ پھر روحانی جواں مردی کا ثبوت دیتے ہوئے کانگریس کے معمار، انگریز حکمرانوں کی کھلی مخالفت کی اور مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ اسی سلسلے میں انھوں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا اور اس مطالبے کو اس حقیقت کی بنیاد پر استوار کیا کہ ہندوستانی مسلمان کسی نام نہاد ہندوستانی قوم کا حصہ نہیں ہیں بلکہ ایک الگ تشخص کی حامل قوم ہیں۔ سرسیدؒ کا یہ دو قومی نظریہ ہی پاکستان کے مطالبے کی کامیاب بنیاد بنا۔ یوں دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ پاکستان کی بنیادوں میں اس مردِ خدا اور روحانی جواں مرد کا خونِ جگر شامل ہے اور وہ اس عزت و تکریم کا حقدار ہے کہ ہر پاکستانی اقبالؒ اور جناحؒ کے ساتھ سرسید کو بھی اپنے محسنوں میں شمار کرے۔

چلتے چلتے (1): علی گڑھ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کے دوران سرسیدؒ لاہور بھی تشریف لائے۔ جب اہلِ پنجاب کو پسیجتے نہ دیکھا تو آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا، ''آپ اگر یہ شرط رکھیں کہ پہلے میں آپ کو اس ڈاڑھی سمیت ناچ کر دکھاؤں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں''۔ اس پر اہلِ پنجاب نے بھی دل اور جیب کھول کر چندہ دیا۔

(2) علی گڑھ کی طوائفوں تک خبر پہنچی کہ مسلمان نوجوانوں تک علم کی روشنی پہنچانے کے لیے کالج بن رہا ہے تو انھوں نے بھی آپس میں چندہ جمع کر کے سرسیدؒ کو بھجوایا۔ ساتھیوں نے سنا تو انھوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ حرام کی کمائی

Marfat.com

کالج پر نہیں لگنی چاہیے۔ سرسیدؒ تو پائی پائی کے لیے جان توڑ محنت کر رہے تھے۔ آپ نے ایک قابلِ قبول حل نکالا۔ کہا: ''ہم طوائفوں کے چندے سے غسلخانے اور ٹٹیاں بنالیں گے''۔ ساتھی مان گئے۔

علامہ سر محمد اقبالؒ

(1875-1938ء)

اقبالؒ کے علمی اور ادبی کارنامے جتنے بھی اہم ہوں، اُن کی شاعری نے برصغیر اور ہمسایہ ملکوں خصوصاً افغانستان اور ایران کے مسلمانوں کی سیاسی اور اخلاقی بیداری میں جتنا بھی اہم کردار ادا کیا ہو اور پاکستان کے تصور کو اُجاگر کرنے اور مسلم لیگ کے ایک مشکل اور نازک دور میں جتنی بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہوں، اس کے پورے پورے اعتراف کے باوجود اس کتاب میں اقبال کا ذکر ایک اور وجہ سے کیا جا رہا ہے۔

وہ کونسی انوکھی وجہ ہے؟

آیئے، تاریخ کے کچھ ورق پلٹیں۔ 1936ء کے موسم گرما میں اقبالؔ لاہور میں میوروڈ پر (جو اَب علامہ اقبال روڈ کہلاتی ہے) اپنی کوٹھی ''جاوید منزل'' میں بیماری کی وجہ سے چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس کے نامور، مقبول اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کی ایک میٹنگ اور جلسۂ عام کی وجہ سے لاہور آئے ہوئے ہیں۔ انھیں اقبالؔ کی علالت کا پتا چلتا ہے۔ وہ چند اور اہم کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ان کی بیمار پرسی کے لیے جاوید منزل پہنچ جاتے ہیں۔ علیک سلیک اور حال احوال کے تبادلے کے بعد سیاسی امور پر تبادلۂ خیالات شروع ہو جاتا ہے۔ نہرو کی کرسی اقبالؔ کی چارپائی سے قریب ہے۔ اقبالؔ بدستور، بنیان اور دھوتی میں ملبوس لیٹے ہیں۔ زیادہ تر گفتگو نہرو کر رہے ہیں۔ اقبالؔ بولنے سے زیادہ سن رہے ہیں۔ اقبالؔ اور نہرو میں دو مشترکہ قدریں موجود ہیں۔ دونوں کشمیری الاصل ہیں اور دونوں ہی سیاسی طور پر روس کے کیمونسٹ انقلاب سے متاثر ہیں۔ نہرو کو ہندوستان کا ''سرخ ستارہ'' کہا جاتا ہے۔ اقبالؔ روسی انقلاب میں اسلام کے مساواتی اقتصادی نظام کے احیاء کا امکان دیکھ رہے ہیں:

جو حرف قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

یہ وہ زمانہ ہے کہ 1935ء کا انڈیا ایکٹ نافذ ہو چکا ہے اور ہندوستان میں انتخابات کی آمد آمد ہے۔ نہرو تمہید باندھ رہے ہیں کہ اقبالؔ جیسے عظیم انسان کو کانگریس میں شامل ہو کر ہندوستان کی رہنمائی کرنی چاہیے: ''اگر آپ یہ مہربانی کریں گے تو آپ ہی کی یہ بات پوری ہو جائے گی کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''۔ پھر آپ ہی نے تو کہہ رکھا ہے کہ، ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا، ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا''۔

نہرو ایک باکمال سیاست دان اور شاطر وکیل کی طرح اقبالؔ کو اقبالؔ ہی کے الفاظ سے رام کرنے کی کوشش کر

Marfat.com

رہے ہیں۔ اقبال نے اگرچہ اپنی وکالت کی ڈگری کو کبھی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا لیکن پھر بھی وہ نہرو کے سامنے لاجواب نہیں ہو رہے۔ انھوں نے صرف یہ کہہ کر اس موضوع پر گفتگو کو سمیٹنا چاہا، ''پنڈت جی، آپ کا شکریہ کہ آپ میری طبیعت پوچھنے تشریف لائے۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ایک واضح رائے رکھتا ہوں۔ میں نے آپ ہی کے شہر الہ آباد میں، مسلم لیگ کے 1930ء کے سالانہ اجلاس میں، مسلمانوں کے لیے الگ اور خودمختار علاقے کی جو تجویز پیش کی تھی، میں آج بھی اسی کو برصغیر میں امن اور خوشحالی کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اور آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ کانگریس یہ تجویز کبھی قبول نہیں کرے گی''۔

نہرو یہ جواب سن کر کچھ دیر کے لیے ضرور چپ ہو گئے لیکن آسانی سے ہتھیار ڈالنے والے تو وہ بھی نہ تھے۔ انھوں نے پینترا بدل کر کہا، ''علامہ صاحب! اگر برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لیے الگ راستہ ہی چننا ہے تو پھر ان کی قیادت آپ ہی کو کرنی چاہیے۔ آپ سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو اسلام کے تاریخی کارناموں اور اس کے زندۂ جاوید اصولوں کو بھی سمجھتا ہو اور دورِ حاضر کی ضرورتوں سے بھی آگاہ ہو۔ برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کا حق کسی کو حاصل ہے تو صرف آپ کو''۔

بیماری کے ہاتھوں نقاہت کے باعث چارپائی پر لیٹے ہوئے اقبال اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے اور نہرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے، ''پنڈت جی، ہندوستان کے مسلمانوں کا صرف اور صرف ایک لیڈر ہے اور وہ ہے محمد علی جناحؒ۔ رہا میں، تو میں محمد علی جناحؒ کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں''۔ یہ بات کوئی مردِ خدا مست اور کوئی روحانی جواں مرد ہی کہہ سکتا تھا۔

گفتگو ختم ہو گئی۔ ماحول پر گہری چُپ چھا گئی۔ نہرو اور ان کے رفقاء کچھ کہے بغیر خاموشی سے رخصت ہو گئے۔
یہ وہ دن تھے کہ بے یار و مددگار اور بے مہار مسلمانوں نے لندن میں مقیم محمد علی جناحؒ سے اصرار کے ساتھ درخواست کی تھی کہ وہ ترکِ وطن ختم کر کے واپس آ جائیں اور مسلمانوں کی ڈانواں ڈول کشتی کے ناخدا بن جائیں۔ محمد علی جناحؒ اس شرط پر واپس آنے پر رضامند ہو گئے کہ آدھا وقت ہندوستان اور آدھا وقت انگلستان رہیں گے اور اگر انھوں نے ضرورت محسوس کی اور مسلمانوں نے یکسو ہو کر ان کا ساتھ دیا تو پھر وہ پورا وقت ہندوستان میں رہنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔
ہندوستان کے جو چیدہ چیدہ لوگ جناح کو بلانے میں پیش پیش تھے، اقبال اُن میں سرفہرست تھے۔ اقبال کی چشمِ بصیرت نے دیکھ لیا تھا کہ ''چمن میں جس دیدہ ور کی آرزو میں نرگس ہزاروں سال سے رو رہی ہے'' وہ جناحؒ کے سوا کوئی اور نہیں۔ اگر جناحؒ نے اقبالؒ کے اس خواب کو اپنا لیا جو انھوں نے اپنے 1930ء کے خطبۂ الہ آباد میں خود دیکھا اور دوسروں کو دکھایا تھا تو برصغیر کے مسلمانوں کی وہ کشتی جو اُن کی بے عملی، اندرونی سازشوں اور کوتاہ نظری کے باعث اندھیروں کی دلدل میں پھنسی تھی، پار لگ سکتی ہے۔
محمد علی جناحؒ لندن سے واپس بمبئی آ چکے تھے۔ لیکن ابھی انھوں نے پاکستان کے تصور کو نہیں اپنایا تھا۔ 1935ء

Marfat.com

کے انڈیا ایکٹ کے مطابق انتخابات بھی منعقد ہو چکے تھے جن میں کانگریس کو ملک کے تمام صوبوں میں زبردست اکثریت حاصل ہو چکی تھی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو لوگ کامیاب ہوئے تھے۔ایک راجہ غضنفر علی (جو قیام پاکستان کے بعد بھارت میں پاکستان کے سفیر بنے) اور دوسرے لاہور کے باصلاحیت اور باکردار وکیل ملک برکت علی۔ چند ہی روز بعد راجہ غضنفر علی مسلم لیگ کو چھوڑ کر سر سکندر حیات کی یونین اسٹ (Unionist) پارٹی میں شامل ہو گئے تھے اور اب پنجاب جیسے بڑے صوبے میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، مسلم لیگ کے پاس صرف ایک ملک برکت علی کی سیٹ باقی رہ گئی تھی۔

ان حالات میں جناحؒ نے اقبالؒ سے ذاتی درخواست کی کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے صدر بن جائیں۔اقبالؒ نے خرابیٔ صحت کی بناء پر پہلے تو انکار کر دیا کہ وہ اتنی بڑی ذمہ داری نہ نباہ سکیں گے لیکن ان کے ضمیر میں یہ بحران پیدا ہو چکا تھا کہ ایک طرف تو میں جناحؒ کو واپس بلانے والوں میں شامل ہوں اور پھر یہ بھی کہتا ہوں کہ میں جناح کا ادنیٰ سپاہی ہوں تو بے شک میری صحت خراب ہو لیکن مجھے جناحؒ کے ادنیٰ سپاہی ہونے کا عملی ثبوت دینا چاہیے۔انھوں نے جناحؒ کی بات مان لی اور پنجاب مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ان کا یہ اِقدام ان کے مردِ خدا اور روحانی جواں مرد ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ جو پیغام وہ مسلمانوں کو اپنی ولولہ انگیز شاعری کے ذریعے سے دے رہے تھے، انھوں نے اب اسے اپنی جان پر نافذ کر کے اپنی یہ پوزیشن بدل کر رکھ دی تھی:

اقبال بڑا اُپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اس کتاب کے جو قارئین اُس وقت کے پنجاب کی سیاسی شطرنج سے واقف نہیں وہ شاید ہی اس نازک صورتِ حال کا اندازہ کر سکیں جس میں اقبالؒ نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی۔ جناحؒ سکندر پیکٹ کے مطابق یہ طے پا گیا تھا کہ قومی سطح پر پنجاب کا طاقت ور اور طرّہ پوش وزیر اعظم (اس وقت پنجاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کے چیف ایگزیکٹو کو وزیر اعلیٰ نہیں، وزیر اعظم کہا جاتا تھا) مسلم لیگ کا ساتھ دے گا مگر صوبائی معاملات وہ اپنی یونین اسٹ پارٹی کے تحت طے کرے گا اور مسلم لیگ کے کسی حکم کا پابند نہیں ہو گا۔ جب مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں سر سکندر حیات اپنے لمبے قد اور اس پر پگڑی کے ایک فٹ اونچے طرّے کے ساتھ داخل ہوتے تو برصغیر کے مسلمانوں میں ہمت و حوصلہ کی زبردست لہر دوڑ جاتی اور وہ سمجھتے کہ ہندوستان کا بازوئے شمشیر زن، پنجاب، ان کے ساتھ ہے۔یاد رہے کہ اس وقت بھی پنجاب ہی فوجی بھرتی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔طاقت کے اسی تاثر کو قائم رکھنے کے لیے 23مارچ 1940ء کا تاریخی اجلاس، پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں منعقد کیا گیا تھا۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ مسلم لیگ کو پورے پنجاب میں (اور یاد رکھیے کہ اس وقت پنجاب میں پاکستانی پنجاب کے علاوہ بھارت کے تین صوبے...... پنجاب، ہریانہ اور ہماچل پردیش بھی شامل تھے) کسی گھر یا دکان کی پیشانی پر اپنا سائن بورڈ لگانے اور جھنڈا لہرانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ان حالات میں اقبالؒ اور ان کے چند باہمت ساتھیوں

Marfat.com

(ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، شیخ غلام رسول اور عاشق حسین بٹالوی) کی روحانی جواں مردی تھی کہ وہ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھے ''چراغ اپنا جلا رہے تھے''۔

اقبالؔ کی قیادت میں اُن کی زندگی کے آخری دو سالوں کے دوران اُن کی مختصر سی ٹیم نے پنجاب کی مردم خیز سرزمین میں جو بیج بوئے وہ تحریکِ پاکستان کے آخری چند سالوں میں اس طرح پھوٹ نکلے جس طرح برفیلے علاقوں میں سبزہ وگل برف میں دب جاتے ہیں اور دیکھنے والا سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہاں کچھ اُگ بھی سکتا ہے۔ لیکن جب موسمِ بہار آتا ہے، برف پگھل جاتی ہے اور سورج کی تابانی سے برف میں دبے (Hybernated) بیج پھوٹ نکلتے ہیں تو میل ہا میل تک پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔

اقبالؔ کی وفات کے بعد اُن کے ساتھیوں کو نظر انداز کرنا بہت آسان ہو گیا۔ وہ نہ صرف نظر انداز کر دیے گئے بلکہ معتوب ٹھہرے لیکن اقبالؔ نے اپنی زندگی کے آخری دو ''سیاسی برسوں'' میں وہ عظیم روحانی کارنامہ سرانجام دیا جس کی وجہ سے جب تک پاکستان قائم ہے وہ ہر پاکستانی کے لیے محترم ٹھہریں گے۔ انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعے سے اپنے قائد، محمد علی جناحؒ کو قیامِ پاکستان کی ضرورت اور اہمیت کا قائل کر ڈالا۔ اس سے پہلے مسلم لیگ کی پالیسی یہ ہوتی تھی کہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع کبھی وہ کانگریس کی حمایت اور انگریزی حکومت کی مخالفت کرتی اور کبھی انگریزی حکومت کی حمایت اور کانگریس کی مخالفت کرتی۔ اس پالیسی کا نتیجہ 7-1936ء کے انتخابات میں یہ نکلا کہ ملک کے تقریباً تمام صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس وقت کی مسلم لیگ کی حیثیت یہ تھی کہ لاہور کے انگریزی اخبار Tribune (ٹری بیون) نے لکھا، ''مسلم لیگ ہے کیا؟ محمد علی جناح اور اس کا ٹائپ رائٹر''۔ یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں مسلم لیگ صرف جناحؒ کے اخباری بیانات ہی کے سہارے چل رہی تھی۔ مگر جیسے ہی جناحؒ نے اقبالؔ کی گزارشات پر کان دھرا اور کبھی کانگریس اور کبھی انگریزی حکومت کی حمایت یا مخالفت سے ہاتھ کھینچ کر صرف اور صرف مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ ملک کی بات شروع کی (یاد رہے کہ مسلم لیگ نے 1940ء تک بھی چودھری رحمت علی کے ایجاد کردہ نام ''پاکستان'' کو باقاعدہ Officially نہیں اپنایا تھا) تو تین معجزے رونما ہوئے۔

(1) محمد علی جناح ''مسلم لیگ کے قائد کے بجائے مسلمانانِ ہند کے قائدِ اعظم بن گئے۔

(2) وہی محمد علی جناحؒ جو (بے ادبی معاف) پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں کے مصداق، یوسفِ بے کارواں بنے، اپنے ٹائپ رائٹر کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے، ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں اس حد تک مقبول ہو گئے کہ 23۔ مارچ 1940ء کو لاہور میں، آج کے مینارِ پاکستان کے مقام پر، پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے نمائندے ان کے قدموں میں بیٹھے تھے۔

(3) پاکستان کا لفظ مسلم لیگ کے لیڈروں کے لبوں پر تو بہت بعد میں آیا، البتہ مسلمان عوام نے اسے بہت پہلے شرفِ قبول بخش دیا۔ یوں معلوم اور محسوس ہوتا تھا جیسے برصغیر کی زمین اور مسلمانانِ ہند کا ضمیر صدیوں سے اس لفظ، نعرے

Marfat.com

اور تصور کے لیے ترس گیا تھا۔

یہ اقبالؒ کی دیدہ ورانہ روحانی جواں مردی تھی کہ انھوں نے اپنی زمین اور عوام کی آرزو کو پہلے تو لفظی جامہ پہنایا اور پھر اسے عملی جامہ پہنانے کی خاطر قایدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی آرزو بنا دیا۔ یہی نہیں، انھوں نے اس آرزو کی تکمیل کے لیے عالمگیر شہرت رکھنے کے باوجود اپنی زندگی کے آخری دو سال جناحؒ کے سپاہی کے طور پر عملی سیاست کی نذر کر دیے۔

قایدِ اعظم، محمد علی جناحؒ

(1876-1948ء)

''بہت کم لوگ تاریخ کے دھارے کا رخ موڑتے ہیں۔ ان سے بھی کم لوگ دنیا کا نقشہ بدلتے ہیں۔ مگر شاید ہی کوئی ہو جسے کسی قومی ریاست کے خالق ہونے کا اعزاز حاصل ہو۔ محمد علی جناحؒ نے یہ تینوں کام کر دکھائے۔ پاکستان کے قائداعظم کہلانے والے اور اس کے پہلے گورنر جنرل جناحؒ نے اپنی ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی کے بل پر دیکھتے ہی دیکھتے اس خطۂ زمین کو ایک ریاست کی شکل دے دی۔ اس کی بلندیٔ مقام کسی سر بفلک مینار کی طرح مسلم لیگ کے دوسرے لیڈروں کے کارناموں پر سایہ فگن ہے...... مہاتما گاندھی جیسی حیرت انگیز لیکن پنڈت نہرو سے زیادہ زوردار شخصیت کے حامل قایدِ اعظم، دورِ حاضر کے ایک زبردست کرشماتی لیڈر ہیں۔ افسوس کہ اہلِ دنیا ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔

''طالب علم، وکیل اور جج، اِن دنوں لندن میں لنکنز اِن (Lincoln's Inn) کے اندر بھاگم بھاگ آتے جاتے شاید ہی اُس آئل پینٹنگ پر نگاہ ڈالتے ہوں جو اُس کے بڑے ہال اور لائبریری کے دروازے کی پتھریلی پیشانی پر جولائی 1965ء سے لٹک رہی ہے۔ البتہ جو ایسا کرتے ہیں وہ حیران ہوتے ہوں گے کہ پاکستان کے بانی اور اس کے پہلے گورنر جنرل محمد علی جناحؒ کا لمبوترا اور سنجیدہ چہرہ آخر کس خوشی میں اوپر سے ان پر آنکھیں گاڑے ہوئے ہے۔ قد آور، دبلے پتلے، ایک آنکھ کی عینک (Monocle) لگائے، قراقلی ٹوپی پہنے جس شخص کی تصویر کشی کی گئی ہے اس کی بابت تصویر کے نیچے صرف یہ لکھا ہے: محمد علی جناح جو 25۔دسمبر 1876ء کو پیدا ہُوئے اور 11۔ستمبر 1948ء کو فوت ہُوئے۔ گمنام مصور نے جناحؒ کی بے ریائی اور اولوالعزمی کے ساتھ ساتھ لباس کے بارے میں ان کے اعلیٰ ترین ذوق کی بہترین عکاسی کر رکھی ہے۔ ان کی آنکھیں چوپٹ کھلی ہیں اور نظریں دیکھنے والے کے آر پار ہوئی جاتی ہیں۔ ہونٹ بھینچے ہوئے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اِس شخص سے ٹکر لینا مشکل ہے۔ تصویر سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فالتو گفتگو کے قائل نہ تھے اور انھیں پٹری سے اتارنا اور شکست دینا ہرگز آسان نہ تھا۔

''جناحؒ کے بے مثال کارنامے کی کہانی کا تانا بانا ان کے وکیلانہ جوہر ہی کا کرشمہ ہے۔ لنکنز اِن میں ان کی تصویر کا بھرپور جواز یہی ہے کہ ہندوستان میں برطانوی راج کی پوری تاریخ میں وہ عظیم ترین ''دیسی'' وکیل تھے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اپنی عمر کے آخری دس سالوں میں تو وہ پوری برطانوی سلطنت کے سب سے ذہین و فطین وکیل تھے۔ انھوں

Marfat.com

نے کم از کم اتنے ہی برطانوی وکیلوں سے ٹکر لی ہو گی جتنے کہ ہندوستانی وکیلوں سے۔ پاکستان کا مقدمہ انھوں نے حیرت انگیز یکسوئی سے لڑا اور اپنے سامنے آنے والے ہر وکیل کو شکست دی۔ اس ایک مقدمے میں انھوں نے اپنی جان بھی داؤ پر لگا دی اور یہ مقدمہ جیت کر انھوں نے جنوبی ایشیا کا نقشہ بدل ڈالا اور دنیا کی تاریخ کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا"۔

یہ الفاظ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے مشہور اور مستند ترین سوانح نگار، سٹینلی والپرٹ (Stanley Walport) کی کتاب : Jinnah of Pakistan سے لیے گئے ہیں اور ان سے آپؒ کی مثالی اولو العزمی، نا قابل تسخیر قوتِ ارادی اور یکسوئی مقصد بہت اچھے انداز سے واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن روحانی جواں مردی کے حوالے سے ہمیں ان کی زندگی کے جس واقعے اور ان کے کردار کے جس پہلو سے دلچسپی ہے وہ اور ہے۔ وہ ہے اِنکسار!

کیا کہا؟ اِنکسار؟ قائداعظمؒ اور اِنکسار؟

جی ہاں۔ یہی تو عجیب بات ہے کہ جس اِنکسار کا اظہار قائداعظمؒ نے کیا وہ شاید ہی ان کے ہمعصروں میں سے کسی دوسرے غیر مسلم یا مسلمان لیڈر کو نصیب ہُوا ہو۔ ابھی ہم نے والپرٹ کے تعارفی کلمات پڑھے ہیں۔ اِن میں اُن سب خوبیوں کا ذکر ہے جو عموماً انکسار کے منافی ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت ہے کہ اپنی سطح، مقام اور وقت پر جس انکسار کا اظہار حضرت عمرؓ نے کیا تھا، اپنی سطح، مقام اور وقت پر قائداعظمؒ نے بھی اسی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت عمرؓ اپنی اسلام دشمنی کے لیے پورے مکّے میں مشہور تھے مگر اسلام دشمنی کی شہرت کے باوجود جب انھوں نے قرآن سنا تو کرنا خدا کا کیا ہُوا کہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کٹ گیا۔ نہ یہ خیال رہا کہ کل تک میں بانگ دہل اسلام کی کیا کیا مخالفت کرتا آیا ہوں اور اس کے خلاف کیا کیا دلیلیں دیتا رہا ہوں۔ نہ یہ یاد رہا کہ ابھی آج ہی مکّے کے بھرے بازاروں میں مجھے کتنے لوگوں نے ننگی تلوار لیے محمدؐ کو قتل کرنے کی نیت سے دندناتے ہوئے جاتا دیکھا ہوگا۔ سارا جلال اور طنطنہ نہ جانے کہاں رفو چکر ہو گیا۔ تنی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی اور تمام تر غرور یکسر انکسار میں بدل گیا۔

محمد علی جناحؒ جو 1876ء میں پیدا ہوئے تھے۔ 1938ء تک آتے آتے باسٹھ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس وقت تک وہ ایک نہ ایک رنگ میں ہندوستان کی آزادی اور اپنے اس عظیم مقصد کے لیے ہندو مسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے۔ یاد رہے کہ ہندو لیڈر، جن میں گاندھی جی بھی شامل تھے، ہندوستان کی آزادی کا اِتنے زور سے مطالبہ نہیں کرتے تھے جتنے زور سے محمد علی جناحؒ کرتے تھے۔ ہندو لیڈر دراصل اندر ہی اندر ڈرتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا تو فوج میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے باعث فسادات یا خانہ جنگی کی صورت میں ان کا پلڑا بھاری ہو سکتا ہے اور ایسے حالات دوبارہ پیدا ہو سکتے ہیں کہ پہلے کی طرح ہندوؤں کو مسلمانوں کے ماتحت زندگی گزارنی پڑے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں، خصوصاً جب 1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں ہندوستان کے اکثر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بن گئیں تو مسلمانوں کو بھی یہ خوف لاحق ہو گیا کہ اگر انگریز پارلیمانی نظامِ جمہوریت قائم کر کے ہندوستان سے رخصت ہو گیا تو

Marfat.com

کانگریس کا ہندو مزاج کھل کر سامنے آ جائے گا اور وہ ہندوستان میں رام راج قائم کرنے کی کوشش کرے گی جس سے مسلمان دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جائیں گے۔ اِسی طرح کے تحفظات کے پیشِ نظر جناحؒ نے کانگریس اور مسلم لیگ کو آزادیٔ ہند کے کسی ایک فارمولے پر متفق کرنے کے لیے 1916ء میں لکھنؤ پیکٹ کے ذریعے ایک حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس پیکٹ پر دیانتدارانہ عمل سے ہر اس ہندوستانی کی دلی آرزو پوری ہو سکتی تھی جو ہندوستان کو نہ صرف آزاد بلکہ ایک پرامن جمہوری ملک بنانے کا خواب دیکھتا تھا۔

یہی دن اور یہی حالات تھے جب مشہور اور معتبر کانگریسی لیڈر محترمہ سروجنی نائیڈو نے محمد علی جناح کو ''ہندو مسلم اتحاد کا سفیر'' قرار دیا تھا۔ جناحؒ نے اپنی تمامتر وکیلانہ صلاحیت سے ایک ایسا آئینی ڈھانچا ترتیب دیا تھا جس سے آزادی اور امن، دونوں کے تقاضے پورے ہو جاتے۔ لیکن پہلی جنگِ عظیم میں پھنسے ہوئے انگریز حاکموں نے جناحؒ کی آئینی تجاویز پر خاطر خواہ توجہ نہ دی، پھر 1917ء میں روس میں کمیونسٹ انقلاب آ جانے سے بھی عالمی شطرنج کے مہرے الٹ پلٹ ہو گئے۔ بہر حال یہ بیل منڈھے نہ چڑھی۔ لیکن جو لوگ برصغیر کی سیاسی تاریخ اور قائداعظم کی باسٹھ سال تک کی سیاسی زندگی سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب تک 38-1937ء میں اقبالؔ نے انھیں خطوط لکھ لکھ کر ہندوستان کی تقسیم پر راضی نہ کر لیا وہ متحدہ ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد ہی کے داعی رہے تھے۔

اتنا لمبا سیاسی سفر اور ایک مُوقِف کی خاطر مسلسل جدوجہد، لیڈروں کے لیے سرمایہ کاری (Investment) بن جاتی ہے اور اس مقام پر اپنے موقف میں یکسر تبدیلی کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کیا کرایا کھُوہ (کنویں) میں ڈال دیا جائے۔ اور اگر اس سیاسی لیڈر کی شہرت اور ساکھ کی بنیاد یہ ہو کہ وہ بات کا دھنی اور ارادے کا پکا ہے تو اس کے لیے اپنا موقف بدلنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ سو بار سوچتا ہے، ''لوگ کیا کہیں گے''؟

لیکن یہ لیڈر روحانی جواں مرد ہو تو وہ لوگوں کی نہیں، صِرف صداقت کی پروا کرتا ہے۔ ایسا لیڈر اُس عالِم، فلسفی، یا سائنس دان کی طرح ہوتا ہے جس نے عمر بھر ایک دلیل، نظریے یا دریافت کو سچا ثابت کرتے ہوئے صَرف کر دی ہو اور یوں کہیے کہ اس کے حق میں ایک بلند و بالا مینارۂ نور تعمیر کر دیا ہو اور عین اس وقت جب ساری دنیا اس کی دلیل، نظریے یا دریافت کی قائل ہو جائے اور وہ خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہو تو اسے اچانک مسئلے کا ایک ایسا نیا پہلو نظر آ جائے جس کے اقرار سے اس کا قائم کردہ مینارۂ نور دھڑام سے زمین پر آ گرے۔ اگر یہ عالم، سائنس دان یا فلسفی روحانی طور پر مردہ ہو تو وہ اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لیے عمر کے باقی لمحات چپ چاپ گزار کر دنیا کی عزت سمیٹے رخصت ہو جائے گا۔ مگر وہ روحانی طور پر زندہ ہو تو پھر اس کی روحانی جواں مردی کا تقاضا یہی ہو گا کہ مرنے سے پہلے اپنی غلطی یا کم فہمی کا اقرار کر لے۔ اس کا یہ اقرار انکسار کی انتہا ہو گا اور روحانی جواں مردوں کے لیے رہتی دنیا تک ایک مثال بن جائے گا۔

اب آپ حضرت عمرؓ کے انکسار کے حوالے سے محمد علی جناحؒ کا یہ انکسار دیکھیے کہ جیسے ہی ان پر یہ صداقت واضح ہو گئی کہ تقسیمِ ہند کے سوا ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نہیں تو زندگی بھر کی کمائی کی پروا کیے بغیر انھوں نے اس

صداقت کو پلے باندھ لیا اور تن من دھن کی ہر طاقت اس صداقت کو لباسِ عمل پہنانے پر خرچ کر دی۔ وہ شخص جسے اولوالعزمی اور ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی کا مالک سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے اس نے اپنے رویے میں وہ لچک دکھائی جو اس کے ہمعصر دوسرے بہت سے نامور مسلمان رہنما نہ دکھا سکے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ جن حقائق نے اقبالؒ اور جناحؒ کو قیامِ پاکستان کی ضرورت کا قائل کیا تھا وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ یا علامہ عنایت اللہ مشرقیؒ کی نظروں سے اوجھل ہو۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کرنے پر تیار نہ ہوا، یہاں تک کہ ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان قائم ہو گیا۔

اس لچک کے سلسلے میں دو باتیں خصوصاً اہم ہیں۔ لوہا اور فولاد دونوں، مضبوطی کے لیے مشہور ہیں لیکن ان میں صرف ایک فرق ہے۔ دباؤ پڑنے پر لوہا تو ٹوٹ جاتا ہے لیکن لچک رکھنے کی بدولت فولاد نہیں ٹوٹتا۔ اپنی اپنی سطح، مقام اور وقت پر حضرت عمرؓ اور قائداعظمؒ نے انکسار کا اظہار کر کے دراصل یہ ثابت کیا کہ وہ لوہے کی طرح ٹوٹ جانے والے نہیں، لچکدار فولاد کی سی طاقت کے مالک تھے۔

کائنات کا مالک و خالق رب، جو تمام چال چلنے والوں سے بہتر چال چلنے والا (خیر الماکرین) ہے فولاد صفت لوگوں کے اعترافِ حق کا، نادانوں کی طرح تمسخر نہیں اڑاتا۔ وہ اُن روحانی جواں مردوں کے انکسار کو خیر و برکت میں بدل دیتا ہے۔ عمرؓ صداقت کا اقرار کر کے انکسار کا مظاہرہ نہ کرتے تو آج شاید کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا۔ ان کے انکسار نے ان کے لیے سیاسی تاریخ کے سب سے عظیم حکمران بننے کا راستہ کھول دیا۔ قائداعظمؒ نے اقبالؒ کی بات مان کر جس انکسار کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کا مقدمہ جیت کر جو اعزاز حاصل کیا اسے خدا کے انعام کے سوا اور کیا نام دیا جا سکتا ہے، ایسا اعزاز صرف روحانی جواں مردوں ہی کا حق ہوتا ہے۔

قائدِ عوام، ذوالفقار علی بھٹو

(1928-1979ء)

16 دسمبر 1971ء کو پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا تو بچے کھچے پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو 73ء تک صدر اور پھر 1973ء کا آئین بن جانے پر 1977ء تک وزیراعظم رہے۔ آپ موجودہ پاکستان کے عوام کی اکثریت کے ووٹوں سے منتخب ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ پہلے سیاسی لیڈر تھے جس نے 1970ء کے عام انتخابات میں اپنی سیاسی جماعت ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کے منشور میں عوام کے سیاسی حقوق کے ساتھ ساتھ اقتصادی حقوق کو خصوصی اہمیت دی تھی۔ اس منشور میں سامراج (Imperialism) ، سرمایہ داری (Capitalism) اور جاگیرداری (Feudalism) کے خاتمے پر زور دیا گیا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ پاکستان ٹوٹنے کی بنیادی وجہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش)

Marfat.com

کی یہ شدید لیکن جائز شکایت تھی کہ آبادی کے لحاظ سے اکثریت رکھنے کے باوجود اسے مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) جتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کہنے کو تو اس کی 56 فیصد آبادی کے مطابق اسے بجٹ میں 56 فیصد حصہ دے دیا جاتا تھا لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ بجٹ کا بیشتر حصہ سب سے پہلے فوج کے لیے وقف کر دیا جاتا تھا اور بچی کھچی رقم کا 56 فیصد مشرقی پاکستان کو پکڑا دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ فوج تو ملک کے دونوں صوبوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ فوج.....ملٹری، نیوی، ایرفورس قریب قریب تمام کی تمام مغربی پاکستان سے بھرتی کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ بجٹ کا بہت بڑا حصہ درحقیقت مغربی پاکستان کے لوگوں پر خرچ ہو جاتا تھا۔

بھٹو نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ملک کے آئین کی بنیاد وفاقیت کے اصولوں کے مطابق صوبائی خود مختاری (Provincial Autonomy) پر رکھی تاکہ جیسی شکایت مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے پیدا ہوگئی تھی آئندہ ویسی شکایت کسی صوبے کو نہ ہو۔ بھٹو کے عہد میں بننے والا 1973ء کا آئین اس شکایت کے ازالے کی ضمانت دیتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس آئین پر اس کی وفاقی روح کے مطابق کبھی عمل نہیں ہوا۔

1974ء میں پاکستان سے ازل کا بیر رکھنے والے بھارت نے ایٹمی دھماکا کر کے پاکستان کو دفاعی اعتبار سے یکا یک بے حد کمزور پوزیشن میں ڈال دیا۔ وہ 1971ء میں روایتی ہتھیاروں سے بھارت کے سامنے نہ ٹھہر سکا تھا۔ ملک ٹوٹ جانے سے پہلے بھارت اگر آبادی کے لحاظ سے پاکستان کے مقابلے میں چار گنا بڑا تھا تو اب آٹھ گنا بڑا ہو گیا تھا اور اوپر سے وہ ایٹمی طاقت بھی بن گیا تھا۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ ہم گھاس کھا لیں گے لیکن اپنے دفاع کے لیے، خصوصاً بھارت سے پورا اترنے کے لیے ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ یورپی طاقتوں نے منع کیا بلکہ امریکہ نے تو ننگی (Blatant) دھمکی دی، ''مسٹر بھٹو، ایٹم بم بنانے سے باز آ جاؤ ورنہ ہم تمھارا بہت بُرا حشر کریں گے''۔ یہ بھٹو کی سیاسی جواں مردی تھی کہ انھوں نے کسی مناہی یا دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کو کھلی چھٹی دے دی کہ جتنی بھی رقم خرچ ہو، یہ کام کر دکھاؤ۔ اگر کسی کی نظر میں پاکستان کی ایٹمی حیثیت کی اہمیت اور قدر ہے تو اسے صدقِ دل اور پورے احترام کے ساتھ بھٹو کو سلام پیش کرنا چاہیے۔

یہ سارے کارنامے اپنی جگہ جتنے بھی قابلِ قدر ہوں، روحانی جواں مردی کے ضمن میں ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر یہاں تین دوسری وجوہ سے کیا جا رہا ہے۔

(1) بھٹو طبقاتی لحاظ سے بہت اونچے درجے کے امیر اور جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد، سر شاہ نواز بھٹو، ریاست جوناگڑھ کے وزیراعظم رہے تھے اور سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں اتنی لمبی چوڑی جاگیر کے مالک تھے کہ ان کی نامور پوتی، محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات Daughter of the East (دخترِ مشرق) میں لکھا ہے کہ جب سندھ کا انگریز فاتح سر چارلس نیپئر علاقے کے دورے پر آیا تو اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے علاقائی ماتحتوں سے پوچھا، یہ کس کی زمین ہے؟ اسے بتایا گیا کہ یہ بھٹو خاندان کی زمینیں ہیں۔ اچھی خاصی دیر کے

Marfat.com

بعداس نے وہی سوال کیا تو پھر وہی جواب ملا۔اس پر اس نے کہا، میں تھوڑی دیر سو لیتا ہوں، جب بھٹو خاندان کی زمینیں ختم ہو جائیں تو مجھے جگا دینا۔ جب دیر تک اسے کسی نے نہ جگایا تو وہ خود جاگ اٹھا۔اس نے اپنا سوال پھر دہرایا، ماتحت افسروں نے ایک مرتبہ پھر اپنا جواب دہرا دیا۔

یوں کہیے کہ بھٹو سونے کا چمچہ منہ میں لیے پیدا ہوئے تھے۔یہی نہیں، آپ نے امریکہ میں یونیورسٹی آف کیلی فورنیا (برکلی) اور انگلستان میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بین الاقوامی امور اور انٹرنیشنل لاء کی اعلیٰ ترین ڈگریاں لے رکھی تھیں۔صدر ایوب خاں کی کابینہ کے رکن کے طور پر آپ آٹھ سال اہم وزارتوں پر فائز رہے تھے۔آپ تھوڑا سا سر نیچے کر کے اقتدار کے سارے لطف اٹھا سکتے تھے مگر آپ نے 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ''پروں میں چونچ دبا لینے والی فاختہ'' (Dove) کے بجائے ''جھپٹنے پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے والے باز'' (Hawk) کا کردار ادا کیا تو امریکہ کا چہیتا ایوب خان امریکی صدر جانسن کی نظروں سے گر گیا اور اس کے دباؤ میں آکر ایوب نے بھٹو کو کابینہ سے نکال دیا۔ایوب کا خیال تھا کہ جس طرح ذوالفقار علی بھٹو کے بھائی سکندر علی بھٹو کو شراب کی لت لے ڈوبی تھی اسی طرح اقتدار کے جاہ و جلال اور شدید مصروفیت کے یکدم ختم ہو جانے سے ذوالفقار علی بھٹو بھی شراب میں ڈوب کر جان دے دیں گے۔ لیکن بھٹو کی جان تو پاکستان کے غریب اور بے سہارا عوام میں زبردست مقبولیت کی ''پاداش'' میں جانے والی تھی۔

بھٹو 1966ء میں ایوب خان سے جدا ہوئے لیکن 1967ء میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان کے عوام سے وابستہ ہو گئے۔ 1965ء کی جنگ نے انھیں ''بھارت سے دو دو ہاتھ'' (Confrontation with India) کی پالیسی کی وجہ سے پنجاب، خصوصاً اس کے سرحدی اضلاع کا ہیرو بنا دیا تھا۔یکم دسمبر 1967ء کو انھوں نے پنجاب کے دارالحکومت اور پاکستان کے ثقافتی دارالحکومت لاہور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی جس نے اپنے منشور کی بنیاد ان چار نعروں پر رکھی:

اسلام ہمارا دین ہے۔

جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

سوشلزم ہماری معیشت ہے۔

طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

جس طرح پاکستان کا لفظ مسلمان عوام کی زبان پر پہلے چڑھ گیا تھا اور مسلم لیگ اور جناحؒ نے اسے بعد میں اپنایا تھا اسی طرح ان چار نعروں کو عوام نے ''اسلامی سوشلزم'' کے نام سے بھٹو اور پیپلز پارٹی سے بھی پہلے اپنا لیا۔بھٹو نے ملک بھر میں، خصوصاً مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ دورے کر کے پاکستان کے کچلے ہوئے مزارعوں، کسانوں، مزدوروں، کوچوانوں اور چھوٹے دکان داروں کے علاوہ گھروں، دکانوں اور دفتروں میں کام کرنے والے نوکروں، چپڑاسیوں اور کلرکوں جیسے چھوٹے سرکاری ملازموں کو ایک بھولی ہوئی حقیقت یاد دلائی۔بھٹو نے انھیں بتایا کہ وہ کسی کمتر خدا کی بدقسمت مخلوق نہیں بلکہ ربّ العزت کے

Marfat.com

باعزت بندے ہیں اور کسی جھوٹے خدا کی مجال نہیں کہ ان کی جان، مال اور عزت پر ہاتھ ڈال سکے کیونکہ پاکستان پیپلز پارٹی ان کے ساتھ جینے مرنے کے لیے تیار ہے۔ دراصل یہی تو وہ بات تھی جس کی خاطر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان بنایا تھا۔ یہ الگ بات کہ قائداعظم کا دم بھرنے والوں نے ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ملک میں لوٹ مار شروع کر کے یہ حالات پیدا کر دیے تھے کہ غریبوں نے مایوس ہو کر سمجھ لیا تھا کہ پاکستان ہمارے لیے نہیں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور اونچے درجے کے سرکاری اور فوجی افسروں کے لیے بنا ہے۔

بھٹو نے اقبالؔ کے الفاظ میں خدا کا یہ فرمان پورا کر دیا کہ ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو اور کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو''۔ اس فرمان سے زیادہ انھوں نے خدا کے اس ارشاد کو پیشِ نظر رکھا کہ ''یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی ہے'' (17:70)۔ بھٹو نے افتادگانِ خاک (The Wretched of the Earth) کو زمین سے اٹھایا، ان کو سینے سے لگایا اور انھیں بتایا کہ میں شاید تمھیں مالدار نہ بنا سکوں لیکن آئندہ کوئی آپ کو گالی دے کر نہیں بلائے گا اور تھانے اور کچہری میں آپ کو ذلیل نہیں کرے گا۔

بھٹو کے دور میں دو مرتبہ زرعی اصلاحات ہوئیں، مزدوروں کی تنخواہیں بڑھیں اور انھیں یونین بنانے کا حق ملا۔ اسی طرح لاکھوں غریب لوگوں کو پاسپورٹ جاری کیے گئے تا کہ وہ بیرونِ ملک خصوصاً سعودی عرب اور امارات میں جا کر روزی کمائیں اور ہر سال کروڑوں روپیہ اپنے گھر والوں کے نام ملک میں بھیجیں جس سے ملک کو زرِ مبادلہ بھی حاصل ہو۔ ان سب باتوں سے زیادہ تاریخ میں یاد رہ جانے والی بات اور روحانی جواں مردی کے اعتبار سے قابلِ ذکر واقعہ یہی ہے کہ امیروں میں امیر تر ہونے کے باوجود بھٹو نے پاکستان کے غریب سے غریب تر عوام کو ربّ العزت کی عطا کی ہوئی اور حکمران طبقوں کی چھینی ہوئی عزت لوٹا دی۔

(2) بھٹو کو اوّل اوّل جس ایک بات نے عوام میں مقبولیت بخشی تھی وہ ان کی ''بھارت سے دو دو ہاتھ'' کرنے کی پالیسی یا مجاہدانہ قوم پرستی (Militant Nationalism) تھی۔ انھوں نے کشمیر کے مسئلے پر اقوامِ متحدہ میں جو تقریریں کی تھیں اور ہزار سالہ جنگ کا جو نعرہ دیا تھا اس نے پاکستان بھر کے، خصوصاً پنجاب کے سرحدی اضلاع کے لوگوں میں انھیں بے حد مقبول بنا دیا تھا۔ جب دسمبر 1971ء کو وہ ٹوٹے پھوٹے اور شکست خوردہ پاکستان کے صدر بنے تو بھارت کی فوجی مداخلت سے نہ صرف مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو چکا تھا بلکہ بھارت یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ اب دو قومی نظریے کی جس بنیاد پر پاکستان قائم ہُوا تھا وہ ختم ہو گئی۔ یہی نہیں، بھارتی وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی اپنے ہم وطنوں سے عنقریب ایک اور بڑی خوشخبری سنانے کا وعدہ کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خوشخبری یہی ہو سکتی تھی کہ وہ رہے سہے پاکستان کا بھی گھونٹ بھر لیں گی یا کم از کم آزاد کشمیر تو ضرور چھین لیں گی۔ اس وقت 90 ہزار پاکستانی جن کی اکثریت فوجی تھی، بھارت کی قید میں تھے اور موجودہ پاکستان کا 5000 مربع میل رقبہ بھارت کی تحویل میں تھا۔ عوام ہی نہیں، خواص اور بری، بحری اور ہوائی فوجیں بھی حوصلہ ہارے ہوئے تھیں۔

Marfat.com

بھٹو نے اِن بُرے حالات میں ملک کو اس کے قدموں پر کھڑا کیا۔ نہ صرف سیاسی معاشی اور سماجی حالات درست کیے بلکہ قیدی اور رقبہ بھی بھارت سے واپس لے لیا۔ یہ سب کچھ اُن کی سیاسی بصیرت، محنت اور فراست کا کمال تھا۔ لیکن یہاں انھیں جس خاص وجہ سے یاد کیا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ شہرت تو انھیں بھارت کی مخالفت کے باعث ملی تھی، اس سے ہزار سال تک جنگ کے دعوے پر ملی تھی اور جب وہ اس شہرت کی بناء پر انتخاب جیت کر برسرِ اقتدار آئے تو جنگ میں ایک شکست ہو چکی تھی اور دوسری شکست سامنے نظر آرہی تھی۔ اس موقع پر اپنی شہرت کا قیدی بنے رہنے کے بجائے وہ ملک کے مستقبل کے تقاضوں کے پیشِ نظر بھارت کے ساتھ امن کی تلاش میں شملہ پہنچے اور ہارے ہوئے ملک کا نمائندہ ہونے کے باوجود جہاں اپنے قیدی اور رقبے واپس لے آئے وہاں دونوں ملکوں کے درمیان امن بھی قائم کر دیا جو کم از کم آج تک تو قائم ہے۔ یہ امن اپنے کردار میں ویسی ہی لچک دکھانے سے حاصل ہُوا تھا جو قائداعظمؒ نے عمر بھر متحدہ ہندوستان کی آزادی کے موقف کو تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے مطالبے میں بدل کر دکھائی تھی۔ وہ بھی روحانی جواں مردی تھی، یہ بھی روحانی جواں مردی تھی۔

(3) رہے سہے پاکستان میں بھٹو کو آئین ساز اسمبلی کے اندر دو تہائی سے زیادہ اکثریت حاصل تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی خودسَرا اکثریت (Brute Majority) کی بناء پر جیسا آئین چاہتے بنا کر نافذ کر دیتے۔ لیکن انھوں نے یہاں بھی روحانی جواں مردی کا ثبوت دیا اور ٹوٹے پھوٹے ملک کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لیے اسمبلی میں نمائندگی رکھنے والی چھوٹی سے چھوٹی سیاسی جماعت کے مطالبات کو بھی جائز اہمیت دے کر قوم کو ایک متفقہ آئین دے دیا۔ جس رویّے کا بعد میں نیلسن منڈیلا نے اظہار کیا، بھٹو نے ان سے اکیس سال پہلے 1973ء کا آئین بناتے ہوئے اس کا مظاہرہ کر دکھایا۔ اُن کی روحانی جواں مردی ہی کا نتیجہ ہے کہ بھٹو اور پیپلز پارٹی سے دِلی نفرت کے باوجود کوئی سیاسی حکمران اور کوئی فوجی ڈکٹیٹر پہلے کی طرح اِس آئین کو منسوخ نہیں کر سکا۔ کوئی اقرار کرے یا نہ کرے، سب جانتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ یہ متفقہ آئین ختم ہو گیا تو کوئی نیا آئین اوّل تو بن ہی نہیں سکے گا اور اگر بن گیا تو پاکستان کی علاقائی اور قومی سالمیت کی ضمانت نہ دے سکے گا۔

Marfat.com

تیراھواں باب

عہدِ حاضر کے چند غیر مسلم رُوحانی جواں مرد

مہاتما گاندھی

(1869-1948ء)

''حضرت محمدؐ کے ارشادات صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں، تمام انسانیت کے لیے ایسا بے بہا خزینہ ہیں جس سے راہِ ہدایت پائی جاسکتی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ دنیا کے تمام عظیم مذاہب صداقت کے حامل ہیں۔ زمین پر صرف اُس وقت پائیدار امن قائم ہوگا جب ہم دوسرے مذاہب کو برداشت کرنے کے علاوہ ان کا اپنے مذہب کی طرح احترام بھی کریں۔ اس احترام کا تقاضا ہے کہ ہم حضرت محمدؐ اور انسانیت کے دوسرے بڑے بڑے راہ دانوں کی تعلیم کا عقیدت مندانہ مطالعہ کریں۔

''حضرت محمدؐ کی سوانح عمری کے مطالعے کے بعد میں پہلے سے کہیں زیادہ قائل ہوگیا ہوں کہ جس ایک بات نے اسلام کے ابتدائی دور میں اسے اتنی شاندار کامیابی بخشی وہ تلوار نہیں تھی بلکہ پیغمبر اسلام کی حیرت انگیز سادگی، منکسر مزاجی، وعدوں اور معاہدوں کا پورا پورا پاس، ہر لحظہ اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کی فلاح و بہبود کا خیال، حق وصداقت کی بے خوف وخطر علمبرداری اور خدا اور اپنے مقصدِ زندگی پر پورا پورا ایمان تھا۔ تلوار نے نہیں، پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی ان صفات نے ہر رکاوٹ دُور کر کے اسلام کا راستہ ہموار کیا''۔

یہ کس کے الفاظ ہیں؟ اُس مہاتما گاندھی کے جس کے بارے میں اچھے الفاظ استعمال کرنے کی جسارت کی جائے تو کئی معزز پاکستانیوں کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ یہ بھی بُھلا دیا جاتا ہے کہ 30۔جنوری 1948ء کو ایک متعصب ہندو نے انھیں کس جرم میں گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ گاندھی جی کا جرم صرف یہ تھا کہ جب ہندوستان تقسیم ہوگیا اور بھارت اور پاکستان میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تو انھوں نے بھارت کے ہندو سکھ باشندوں کو مسلمانوں کے خلاف قتل وغارت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہر کوئی اُنھیں یہی جواب دیتا تھا، ''آپ دیکھ نہیں رہے، وہاں پاکستان میں کیا ہو رہا ہے''؟ اس پر گاندھی جی کہتے، ''پہلے تم مسلمانوں پر ظلم وستم بند کرو، پھر میں پاکستان جا کر مسلمانوں سے بھی التجا کروں گا کہ آپ بھی ایسا ہی کریں''۔ جب کانگریسی حکومت نے انھیں تسلی دی کہ ہم فسادات کی آگ ٹھنڈی کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے تو انھوں نے پاکستان کے دورے کا پروگرام بھی بنالیا۔ لیکن اتنے میں ان کی آنکھوں کے سامنے دِلّی میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوگیا۔ گاندھی جی نے لاچار ہو کر مَرن بَرت (موت تک کھانا پینا بند) رکھ لیا۔ انھوں نے کہا،

Marfat.com

''جب تک مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی ضمانت نہ دی جائے گی، میں بَرت نہ توڑوں گا''۔

ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ تین دن سے ایک کھیل اور پانی کی ایک بوند بھی گاندھی جی کے مُنہ میں نہ گئی تھی۔ گُردوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور اب پیشاب آنا بھی بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے دیکھا کہ بے آبی (Dehydration) مہلک ہوتی جا رہی ہے تو آپ کو پانی کے ٹب میں بٹھا دیا۔ رات کے اڑھائی بجے تھے۔ آپ کو ہوش آ گیا۔ آپ نے اپنے سٹینوگرافر پیارے لال کو بلایا اور ٹب میں بیٹھے بیٹھے اُسے بھارت کی نہرو حکومت کے نام ایک خط لکھوایا کہ ہندوستان کے مشترکہ مالیاتی سرمایے میں سے پاکستان کا جو حصّہ بنتا ہے اُسے فوراً ادا کر دیا جائے۔

اگلے دن نہرو حکومت کے وزیرِ خزانہ ڈاکٹر جان متھائی، خود پنڈت نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل گاندھی جی کی خدمت میں یہ بتانے کے لیے حاضر ہوئے کہ کابینہ نے 55 کروڑ روپے کی یہ رقم پاکستان کو ادا نہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ پہلے تو وزیرِ خزانہ اور وزیرِ اعظم نے اس فیصلے کے حق میں دلائل دیے۔ اس کے بعد پورا ڈیڑھ گھنٹہ سردار پٹیل نے دلائل کا انبار لگایا۔ گاندھی جی نقاہت کے باعث اپنی چارپائی پر گھٹنے سینے سے لگائے لیٹے تھے۔ وہ اٹھ کر سیدھے بیٹھ گئے اور اپنی جان کی رہی سہی قوت جمع کر کے بولے، ''سردار، تم اب وہ سردار نہیں رہے جسے میں جانتا تھا''۔ اتنا کہہ کر آپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

پھر کیا ہُوا؟ متھائی، نہرو اور پٹیل وہاں سے تو آنکھیں نیچے کیے اٹھ گئے مگر جاتے ہی کابینہ کا ہنگامی اجلاس بلایا جس نے گاندھی جی کا ردِّ عمل سن کر یہ فیصلہ کر دیا کہ پاکستان کو 55 کروڑ روپے ادا کر دیے جائیں۔ اور وہ ادا کر دیے گئے۔ کیا اس پر گاندھی جی نے مَرن بَرت توڑ دیا؟ نہیں۔ ان کی شرط تو یہ تھی کہ ہندوستان کے لیڈر اور عوام انھیں یقین دلائیں کہ وہ بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر حرف نہیں آنے دیں گے۔

برت جاری رہا اور گاندھی جی کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ دنیا بھر کی حکومتوں اور شہری تنظیموں کی طرف سے بھارتی حکومت پر دباؤ آ رہا تھا کہ انسانیت کی اس شمع کو بجھنے نہ دیا جائے۔ آخر 18۔ جنوری 1948ء کی صبح ایک سو ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی اور دیگر مذاہب کے چیدہ چیدہ لوگ جمع ہو کر گاندھی جی کے پاس آئے۔ ان میں ہندو مہا سبھا اور آر ایس ایس کے نمائندے، بھارت میں پاکستان کے ہائی کمشنر (سفیر)، کانگریس کے نئے صدر بابو راجندر پرشاد اور پرانے صدر مولانا ابوالکلام آزاد (جو اُس وقت بھارت کے وزیرِ تعلیم تھے) بھی شامل تھے۔

ان تمام لوگوں نے تحریراً یہ ضمانت دی کہ ''بھارت کے مسلمانوں کی جان، جائیداد اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی، انھیں اسلام ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا اور جن علاقوں میں جاتے ہوئے وہ خطرہ محسوس کرتے ہیں وہاں آزادانہ آمد و رفت کو یقینی بنایا جائے گا۔ اسی طرح جن مسجدوں میں پاکستان سے بے گھر ہو کر آنے والے ہندو سکھ مہاجروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں انھیں مسلمانوں کو واپس کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ مسلمان تاجر اور دکان دار جو خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے یا روپوش ہو گئے تھے انھیں واپس اپنے دفتروں اور دکانوں میں لا کر تحفظ دیا جائے گا''۔

Marfat.com

گاندھی جی نے اصرار کیا کہ یہ تمام حضرات ریڈیو پر اور اخبارات میں بھی اس عہد نامے کے مطابق واضح الفاظ میں بیانات دیں تاکہ اُن کے زیرِ اثر لوگ قتل و غارت سے باز آجائیں۔ جب یہ ساری کارروائی ہوگئی تو گاندھی جی نے اپنی ''تا مرگ بھوک ہڑتال'' ختم کردی۔ سوال: گاندھی جی کی جان توڑ بھوک ہڑتال کا کوئی فائدہ بھی ہُوا یا نہیں؟ اُس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ، عالمی شہرت کے مالک قانون دان اور مدبّر، سر محمد ظفر اللہ خان تھے۔ انھوں نے اقوامِ متحدہ کی سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں اِس سوال کا اِن الفاظ میں جواب دیا تھا: ''مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کے نتیجے میں دونوں ملکوں، پاکستان اور بھارت، کے درمیان جذبۂ دوستی کی جونئی اور زبردست لہر پیدا ہوئی ہے اس نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے''۔

بھوک ہڑتال کے خاتمے کے دو روز بعد گاندھی جی کو بازوؤں پر اٹھا کر اُن کی مقررہ جائے عبادت پر لایا گیا۔ وہ اپنی نحیف آواز میں محبت اور امن کا درس دے رہے تھے کہ قریبی باغ کی دیوار سے کسی نے مجمعے پر دستی بم پھینک دیا۔ مجمع تتر بتر ہوگیا۔ لیکن گاندھی جی شانتی (اطمینان) کا مجسمہ بنے بیٹھے رہے۔ قریبی ساتھیوں نے آپ کے اس رویّے پر داد دی تو آپ نے کہا، ''تعریف کے لائق تو میں تب ہوتا کہ اس بم کے نتیجے میں دم توڑ رہا ہوتا اور پھر بھی میرے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور میرے دل میں بم پھینکنے والے کے خلاف بھی کوئی میل نہ ہوتا''۔ گاندھی جی کے یہ الفاظ صلیب پر لٹکے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اُن الفاظ سے کتنے قریب ہیں جو آپؑ نے اپنا تمسخر اڑانے والوں، کانٹوں کا تاج پہنانے والوں، چہرۂ مبارک پر تھوکنے والوں اور کوڑے پر کوڑا مارنے والوں کی بابت کہے تھے، ''یا خدا! انھیں معاف فرمادے، یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں''۔

گاندھی جی نے تلقین کی، ''جس بھلے آدمی نے بم پھینکا ہے اُسے بُرا بھلا نہ کہا جائے۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اُس کے خیال میں شاید میں ہندو مت کا دشمن ہوں''۔ وہ بھلا آدمی پاکستانی پنجاب سے لُٹ پُٹ کر آنے والا جواں سال مدن لال تھا جو دِلّی کی ایک مسجد میں پناہ گیر تھا۔ جب گاندھی جی کو دلائی جانے والی یقین دہائی کے مطابق اس مسجد کو خالی کرایا جا رہا تھا تو مدن لال نے مزاحمت کی تھی اور پولیس نے اُسے وہاں سے زبردستی نکالا تھا۔ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا، ''میں نے اپنی آنکھوں سے پاکستان میں ہولناک واقعات دیکھے ہیں۔ میں پاکستانی پنجاب کے شہروں میں ہندوؤں پر اندھا دھند برستی ہوئی گولیوں کا چشم دید گواہ ہوں''۔ اس نے بتایا کہ وہ مسلمانوں سے بدلہ لینے کے خیال سے اور مسلمانوں کو تحفظ دینے کے لیے مَرن بَرت رکھنے والے گاندھی کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کے لیے آر آر ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) میں شامل ہوگیا تھا۔

25 جنوری 1948ء کی دعائیہ محفل میں گاندھی جی کہہ رہے تھے، ''میں خوش ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں امن ہوتا جا رہا ہے۔ میری آپ لوگوں سے التجا ہے کہ آپ میں سے ہر شخص آئندہ اپنے ساتھ ایک مسلمان کو بھی اس محفل میں لایا کرے''۔ حاضرین ان کی درخواست پر ''ہاں'' کہہ رہے تھے لیکن انھی میں کھڑا ایک اونچی ذات کا برہمن دل ہی دل

Marfat.com

میں ''نہ'' کہہ رہا تھا۔ ''ناتھورام ونائیک گاڈسے'' بمبئی سے دلی آیا تھا۔ وہ پُونہ سے شائع ہونے والے ایک ہندو مہا سبھائی ہفت روزے کا ایڈیٹر تھا۔ مدن لال اور پانچ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ وہ اس سازش میں شریک تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حق میں بلند ہونے والی گاندھی جی کی واحد آواز کو خاموش کر دیا جائے۔ مدن لال کے دستی بم سے بات نہ بنی تو گاڈسے کی ذمہ داری ٹھہری کہ وہ گاندھی جی کو ٹھکانے لگائے۔ اُس کا ہاتھ جیب میں رکھی ہوئی پستول پر تھا اور وہ اپنے ارادے کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے بڑبڑا رہا تھا، ''مسلمانوں کا بھارت اور اس دعائیہ محفل میں کیا کام ہے؟ یہ آدمی مہاتما کہلاتا ہے اور اپنی اس محفل میں قرآن بھی پڑھتا ہے۔ انہے ٹھکانے لگا دیا جائے تو پھر دیکھیں گے کہ مسلمانوں کو کون بچاتا ہے۔ پھر تو ہمیں کوئی روکنے والا نہ ہوگا، ہم پاکستان پر حملہ کر کے اکھنڈ بھارت بنالیں گے''۔

گاڈ آہستہ آہستہ اگلی صفوں میں پہنچتا جا رہا تھا۔ جب وہ گاندھی جی کے روبرو آ گیا تو اس نے پُھرتی سے پستول نکالا اور تین گولیاں ان کے نحیف و نزار بدن سے گزار دیں۔ ''مہاتما'' کے مُنہ سے ایک لفظ نکلا، ''پر ماتما'' اور ساری دُنیا میں پیغمبروں کی سی عزت و احترام سے یاد کیے جانے والے اس روحانی جواں مرد نے بھارتی مسلمانوں اور اُس پاکستان کی حمایت کے جُرم میں جان دے دی جہاں اُن کے بارے میں کلمۂ خیر کہنا قریب قریب حرام ہے۔

گاندھی جی کے ساتھ بھارت میں بھی کوئی اچھا سلوک نہیں ہُوا۔ بھارتیوں نے انھیں ایک بہت اونچے سنگھاسن (Padestal) پر بٹھا کر انھیں اور ان کے پیغام کو پوری طرح بھلانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کوشش پاکستانیوں کی اس کوشش سے بہت ملتی جلتی ہے کہ محمد علی جناح کو قائداعظم کا شاندار لقب دے کر اور اس لقب کے آخر میں رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ کر کے کراچی کے ایک خوبصورت مقبرے میں نہ صرف جسمانی بلکہ معنوی طور پر دفن کر دیا جائے اور ان کی آئین پسندی اور ان کے پیغام......ایمان، اتحاد، تنظیم کو یکسر بھلا دیا جائے۔

گاندھی جی کی ساری عمر تین کام کرتے گزری تھی۔ ایک تو انھوں نے عدم تشدد کا پرچار کیا اور اس پر کاربند ہو کر دکھایا۔ دوسرے انھوں نے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان امن کی کوشش کی اور ان کی یہ کوشش ان کے آخری سانس تک جاری رہی۔ تیسرے انھوں نے ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کی مخالفت کی اور ہندوؤں کی سب سے نچلی ذات شودروں اور اچھوتوں (Untouchables) کے انسانی اور شہری حقوق کی حمایت کی۔ گاندھی جی اچھوتوں کو ہریجن یعنی خدا کی اولاد کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ جو دوسروں کے گھروں کی غلاظت اٹھا کر دُور پھینکتے رہتے تھے خود گندی ترین آبادیوں میں موت کے انتظار میں زندگی گزارتے تھے۔ گاندھی جی خود، ان کی بیوی اور ان کے خصوصی عقیدت مند اِن آبادیوں میں جا کر اپنے ہاتھوں سے اُن کے گھروں کی غلاظت صاف کیا کرتے تھے۔

اب ذرا بھارت کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ عدم تشدد کے پیغمبر گاندھی کے چیلوں نے حیدر آباد دکن پر فوج کشی کی، جونا گڑھ کو زبردستی بھارت میں مدغم کیا، کشمیری مسلمانوں کی آرزوؤں کا خون کر کے وادیٔ کشمیر میں فوج اتاری۔ خود کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لے جا کر خود ہی اس کی قراردادوں کو رد کر دیا اور کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کے ساتھ دو جنگیں لڑیں اور

Marfat.com

ابھی 2003ء میں پاکستان کی سرحدوں پر فوج لاکھڑی کی۔اس سے پہلے 1971ء میں پاکستان کو دوٹکڑے کرنے میں فوجی سطح پر مداخلت کی۔رہا ہندو مسلم سکھ امن، تو بابری مسجد کی شہادت اور گجرات میں مسلمانوں کا ریاستی سطح پر قتل تو کل کی بات ہیں۔سکھوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔انھیں سیاسی طور پر کمزور کرنے کے لیے بھارتی پنجاب کے صوبے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔امرتسر کے دربار صاحب اور دِلّی کے کوچہ و بازار میں سکھوں کا قتلِ عام ہُوا۔اچھوتوں کے حالات سیاسی طور پر ضرور کچھ بہتر ہیں۔ایک اچھوت کچھ دنوں کے لیے بھارت کا صدر بھی بن گیا تھا لیکن مجموعی طور پر ان کی حالت دیکھنی ہو تو روہنٹن مستری کے ناول A Fine Balance (ایک نازک توازن) کا مطالعہ نہایت چشم کشا ثابت ہوگا۔

ہم پاکستانیوں کے قائداعظمؒ بھی زندگی بھر تین کام کرتے رہے تھے۔ایک تو اُن کی ساری جدوجہد آئینی اور قانونی حدود میں رہی۔گاندھی اور ان کے عقیدت مند تو عدم تشدد کے پرچار کے باوجود قانون شکنی کرتے رہے اور لمبی لمبی دیر تک جیل جاتے رہے لیکن قائداعظم ایک دن کے لیے بھی جیل نہ گئے۔دوسرے، انھوں نے پاکستان خالصتاً جمہوری عمل سے، جمہور (عوام) کو اپنی تحریک میں بھرپور شرکت دے کر، بنایا۔تیسرے، قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد، وہ ہمیشہ واضح کرتے رہے کہ پاکستان میں تھیوکریسی (مُلّا شاہی) نہیں ہوگی۔اب ہم ذرا پاکستان کی تاریخ میں یا دوسرے لفظوں میں اپنے گریبان میں جھانک لیتے ہیں: آئین کے بارے میں ہمارے ایک فوجی آمر نے کہا تھا، یہ کاغذ کا ٹکڑا ہے، میں جب چاہوں اسے پھاڑ دوں۔پہلے نو سال تک آئین بنا ہی نہیں، بنا تو دو سال بعد ایک فوجی آمر نے اُسے منسوخ کر کے 1962ء میں ایک فردِ واحد کا لکھا ہُوا آئین ڈنڈے کے زور پر نافذ کر دیا جسے اس کے جانشین فوجی آمر نے 1969ء میں منسوخ کر دیا۔اُسی جانشین کے دور میں ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔رہے سہے پاکستان کو 1973ء میں عوام کے ووٹوں سے قائم ہونے والی اسمبلی کے ذریعے متفقہ آئین دینے والے ذوالفقار علی بھٹو کو ایک اور فوجی آمر نے پھانسی دے دی اور اس نے 1973ء کے وفاقی، پارلیمانی اور جمہوری آئین کو پہلے تو 1985ء تک معطل رکھا اور پھر آٹھویں ترمیم کے ذریعے سے اُسے جمہوریت اور مارشل لاء کا ملغوبہ بنا دیا۔1999ء میں تازہ ترین فوجی آمر نے بھی پہلے اس آئین کو تین سال تک معطل رکھا اور پھر وہ ''اسی کاغذ کے ٹکڑے'' میں وردی اور فوجی بوٹوں سمیت داخل ہو گیا۔

رہی جمہوریت اور جمہوری عمل تو اس کی بابت مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں آدھے سے زیادہ وقت فوجی آمریت یا بھیس بدل کر فوجی آمر چھائے رہے ہیں اور باقی وقت سیاسی لیڈر جمہوریت کے نام پر ایک دوسرے کا زن بچہ کولھو میں پسواتے رہے ہیں۔آخر میں تھیوکریسی کی بھی سن لیں۔ملک میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین حرفِ آخر (سپریم لاء) نہیں ہیں، ایک وفاقی شرعی عدالت بنا دی گئی ہے جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو بھی غلط قرار دے سکتی ہے۔تھیوکریسی (مُلّا شاہی) اور کیا ہوتی ہے ؟

بھارت اور پاکستان کی یہ دلخراش تاریخ اس لیے کھنگالی گئی ہے کہ ان دونوں ملکوں کے دونوں عظیم لیڈروں، مہاتما گاندھی اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے جو سیاسی، اخلاقی اور روحانی میراث چھوڑی تھی اُسے اگر دیانت داری سے آگے

Marfat.com

بڑھایا جاتا تو دوایشی طاقتوں کے مل بیٹھنے سے وہ امن، جمہوریت اور خوشحالی کا گہوارہ بن سکتے تھے۔ یہ دلخراش تاریخ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ آج یہ مردم خیز خطہ ایک مرتبہ پھر ترس گیا ہے کسی مردِ راہ داں کے لیے، کسی مردِ خدا کے لیے۔ کسی روحانی جواں مرد کے لیے۔

ڈاکٹر مارٹن لُوتھر کنگ (جُونیر)

(1929-1968ء)

''مسئلہ یہ نہیں کہ ہم تشدد کی راہ اختیار کریں یا عدم تشدد کی۔ اب تو مسئلہ یہ ہے کہ ہم عدم تشدد کے راستے پر چلیں یا موت کے''۔ ڈاکٹر مارٹن لُوتھر کنگ۔

امریکہ میں بسنے والی کالی مخلوق کے مشہور ترین لیڈر ڈاکٹر مارٹن لُوتھر کنگ (Dr.Martin Luther King Jr.) نے اپنے عہد کے انسانوں کے لیے جو لائحۂ عمل تجویز کیا تھا اس پر خود عمل کر کے اس کی صداقت کو ثابت کر دیا۔ کنگ کو 39 سال کی عمر میں دن دہاڑے اس پاداش میں مار ڈالا گیا کہ وہ امریکہ کے بے کس و بے یار و مددگار کالے عوام کے شہری حقوق کے لیے آواز کیوں اٹھا رہا تھا۔ ڈوبوئس (Du Bois) کے بعد کنگ ہی وہ شخص تھا جس کی آواز پر منتشر کالی مخلوق جمع ہو جاتی تھی۔ دونوں اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ اور بہترین قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن ڈوبوئس تشدد کا اور کنگ عدم تشدد کا قائل تھا۔ ڈوبوئس اپنے مقصد کے لیے جان دینے کو تیار نہ تھا چنانچہ وہ امریکہ چھوڑ کر گھانا میں جا آباد ہُوا۔ کنگ اپنے مقصد کے لیے مرنے پر تیار تھا، اُسے امریکہ کے شہر ممفس میں مار ڈالا گیا۔ تشدد کا حامی بچ گیا، عدم تشدد کا حامی مارا گیا۔ یہی کچھ 1948ء میں عدم تشدد (اہنسا) کے سب سے بڑے پرچارک اور اُپدیشک مہاتما گاندھی کے ساتھ بھارت میں ہُوا تھا۔ دونوں تشدد کا شکار ہو گئے لیکن دونوں ہی انسانیت کے ضمیر میں آج بھی زندہ ہیں۔

پہلے یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ کنگ کے عہد کے امریکہ میں کالی مخلوق کی حالت کیا تھی۔ بہتر ہوگا کہ اس حالت کی تصویر کشی کنگ کے بجائے امریکہ کے دو معتبر گورے لیڈروں کے لفظوں میں دیکھی جائے۔ 1963ء میں امریکہ کے نائب صدر لنڈن جانسن نے کہا تھا:

> ''آج سے سو سال پہلے (ابراہیم لنکن کے عہدِ حکومت میں) کالوں کو آزادی مل گئی تھی۔ آج سو سال بعد بھی کالوں کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ آج کا کالا انسان انصاف مانگ رہا ہے۔ لیکن ہم اس کے مطالبے پر کان نہیں دھر رہے۔ ذرا سوچیے کہ وہ کالے جو انصاف کا مطالبہ کرتے کرتے مر گئے یا مار دیے گئے اُس وقت کیا سوچتے ہوں گے جب ہم آج کے کالوں کو صرف صبر کی خالی خولی تلقین کر کے رہ جاتے ہیں''۔

اور اب آپ اُسی سال امریکہ کے صدر جان کینیڈی کے الفاظ سنیے۔ کینیڈی دراصل ڈاکٹر کنگ کے

Marfat.com

مطالبۂ انصاف اور اس مطالبے کے حق میں چلائی جانے والی تحریک پر اپنا ردِعمل ظاہر کر رہا تھا:

''آج ہمیں ایک ایسا اخلاقی مسئلہ درپیش ہے جو آسمانی صحیفوں جتنا پرانا اور امریکی دستور جتنا واضح ہے۔ ہم دُنیا بھر میں آزادی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ ہم امریکہ کے اندر آزادی پر بھی فخر کرتے ہیں۔ لیکن کیا ہم دُنیا والوں سے، اور اپنے ملک میں ایک دوسرے سے، سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ گوروں کی طرح کالے بھی آزاد ہیں؟ کیا صحیح صورتِ حال یہ نہیں کہ ہم آزاد ہیں مگر کالے آزاد نہیں۔ ہم برابر کے شہری ہیں مگر کالے برابر کے شہری نہیں۔ ہم میں ذات پات ہے نہ چھوت چھات، نسلی امتیاز ہے نہ طبقاتی تفریق مگر کالے دُوسرے درجے کے شہری ہیں۔ ایک سو سال پہلے صدر لنکن نے کالوں کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک سو سال سے ہم انھیں وعدوں اور صبر کی تلقین پر ٹرخا رہے ہیں۔ حقیقتاً وہ آج بھی برائے نام آزاد ہیں اور اب ملک کے تمام شہروں اور ہر شہر کے بازاروں میں اس صورتِ حال کو بدلنے کا مطالبہ آگ کی طرح پھیل رہا ہے۔''

اقتدار کے بلند و بالا ایوانوں تک کالی مخلوق کے حقوق کی آواز پھیلانے میں جن کالے جیالوں کا خونِ جگر اور اپنی رگوں کا خون صَرف ہُوا اُن میں ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ سرِ فہرست تھا۔ کنگ اور اس کے ساتھیوں نے کہا، لنکن کے اعلانِ آزادی کے بعد کینیڈی کی مندرجہ بالا تقریر دوسرا اعلانِ آزادی ہے۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح پہلا اعلانِ آزادی جاری کرنے والا لنکن گولی کا نشانہ بنا دیا گیا تھا اسی طرح کچھ ہی عرصے میں دوسرا اعلانِ آزادی جاری کرنے والا کینیڈی بھی دن دہاڑے قتل کر دیا جائے گا۔ بہر حال کینیڈی کی تقریر کے بعد کنگ نے سوچا، یہی وقت ہے، لوہا گرم ہے، بہتر ہے کہ پورے زور سے اس پر چوٹ لگا کر اسے حسبِ خواہش ڈھال لیا جائے۔ چنانچہ 28۔ اگست 1963ء کو اُس نے امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں کالی مخلوق کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ اُسے امید تھی کہ امریکہ کی دونوں اسمبلیوں کے وہ قانون ساز جن کی آنکھیں کینیڈی کی تقریر سے بھی نہیں کھلیں، اس جلسے سے ضرور کھل جائیں گی چنانچہ اس نے اس جلسے کو کامیاب کرنے کا پورا پورا جتن کر ڈالا۔

اُس روز 22 خصوصی ٹرینوں، 2000 خصوصی بسوں اور تقریباً دس ہزار ٹھسا ٹھس بھری ہوئی کاروں کے ذریعے سے تین لاکھ کالے امریکی واشنگٹن پہنچے اور لنکن میموریل اور واشنگٹن میموریل کے درمیان کے علاقے پر گھنے بادلوں کی طرح چھا گئے۔ تاریخ اس عدیم المثال اجتماع کو 83-1775ء کے امریکی انقلاب کے وعدوں اور 65-1861ء کی خانہ جنگی کے ادھورے ایجنڈے کی تکمیل کے طور پر دیکھ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس روز خدا نے ڈاکٹر کنگ کے دل پر اپنا ہاتھ اور اس کے مُنہ میں اپنی زبان رکھ دی تھی۔ سننے والوں نے کنگ کے مُنہ سے اس روز جو تقریر سنی اُسے تاریخ ''میرا بھی ایک خواب ہے'' کا عنوان دیتی ہے۔ کاش اس کتاب کا دامن زیادہ وسیع ہوتا، بہر حال اس تقریر کے چند جملے آپ بھی سنیں۔ پوری تقریر ''بیسویں صدی کی عظیم ترین تقریروں'' کے کسی بھی انتخاب میں پڑھی جا سکتی ہے۔ 28۔ اگست کے تپتے سورج

کی گرمی میں موم کی طرح پگھلتے ہوئے اور فولاد کی طرح مضبوط کنگ نے لنکن کے مجسمے کے سایے میں کھڑے ہو کر یوں لب کشائی کی:

''پیارے لوگو! آپ کے درمیان آج کے دن میرا دل باغ باغ ہو رہا ہے۔ ہمارا آج کا یہ اجتماع ہماری قومی تاریخ میں ہماری آزادی کے عظیم ترین مظاہرے کے طور پر ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جس عظیم امریکی (لنکن) کے علامتی سایے میں ہم اس وقت کھڑے ہیں اس نے سو سال پہلے ہماری آزادی کے اعلان پر دستخط کیے تھے۔ وہ یادگار اعلان ان لاکھوں سیاہ فام غلاموں کے لیے امید کے منارۂ نور کی حیثیت رکھتا تھا جنھوں نے ناانصافی کے جان لیوا شعلوں میں جھلستے جھلستے زندگی کے دن کاٹے تھے۔ وہ اعلان اُن کی اسیری کی لمبی رات کے خاتمے پر صبح کے پُرمسرت اُجالے کی مانند تھا۔ لیکن سو سال بعد بھی خدا کے کالے بچے آزاد نہیں ہو پائے۔ سو سال بعد بھی وہ نسلی امتیاز اور چھوت چھات (Segregation) کی ہتھکڑیوں کے ہاتھوں بُری طرح لاچار ہیں۔ سو سال بعد بھی وہ مادی ترقی اور خوشحالی کے بے کراں سمندر میں غربت و افلاس کے ایک ویران جزیرے میں رہ رہے ہیں۔ سو سال بعد بھی وہ امریکی معاشرے کے کونے کھدروں میں پڑے ایڑیاں رگڑتے نظر آتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی ہی سرزمین میں جلاوطنی کے دن کاٹ رہے ہیں۔''

جب کنگ غلامی کی زنجیروں، بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کے بوجھ اور تکلیف کو اپنے سیاہ فام ساتھیوں کے دل و دماغ میں تازہ کر چکا تو پھر اس کی الہامی زبان سے ''میرا بھی ایک خواب ہے'' کی امید افزا تانیں بلند ہونے لگیں۔ جس طرح اس نے ''سو سال بعد'' کی تکرار سے ناامیدی کا رنگ جمایا تھا اب ''میرا بھی ایک خواب ہے'' کی تکرار سے مایوسیوں کے آسمان پر امید کی دھنک بکھیر دی۔ لیکن یہ کام تو بسمر و سے لے کر ہٹلر تک کے خطیب کرتے ہی آئے ہیں۔ روحانی جواں مردی کے حوالے سے ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کنگ کا خواب صرف امریکہ کی کالی مخلوق کی فلاح و بہبود اور شہری حقوق تک محدود نہیں تھا۔ وہ تو ایک سچے مردِ خدا اور روحانی جواں مرد کے طور پر ''خدا کی بادشاہت'' کو کالی اور گوری، سرخ اور پیلی تمام نسلوں کے لیے عام کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

افسوس، کنگ کا خواب اس کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا۔ وہ اپنے سے پہلے کے کالے لیڈروں کی طرح بدلے اور بدامنی کی سیاست نہیں کر رہا تھا، وہ تو سب کے لیے سیاسی جمہوریت اور معاشی مساوات کی بات کر رہا تھا اور اس کی بات کا رُخ یہ تھا کہ اس طرح نہ صرف کالی مخلوق کا بھلا ہوگا بلکہ امریکہ کی گوری آبادی کے مذہبی لوگ احساسِ گناہ اور اس آبادی کے غیر مذہبی لوگ احساسِ جرم کے بغیر امن کی زندگی گزار سکیں گے۔ اس سے پہلے ایلیجاہ محمد کی ''بلیک مسلم تحریک'' نفرت کی بنیاد پر چل رہی تھی۔ مگر بعد میں ملک شہباز (مالکوم ایکس) اور ایلیجاہ محمد کے بیٹے وارث یا ولیس نے تحریک کو نفرت کے

بجائے عزتِ نفس کے خطوط پر آگے بڑھایا جو کنگ کے رویے سے قریب تر رویہ ہے۔ یہاں تک کہ اب ایلجاہ کے پرانے رویئے کے علمبردار اور دعویدار لوئی فرّاخاں کے غصیلے رویے میں بھی کنگ کے رویے کی مقبولیت نے خاصی نرمی پیدا کر دی ہے۔ البتہ کنگ کے اصل پیروکار ہونے کا شرف کسی کو حاصل ہے تو وہ جنوبی افریقہ کا سیاہ فام لیڈر نیلسن منڈیلا ہے جس نے کنگ کی پیروی میں کالی اور گوری آبادی میں نفرت کی دیوار توڑ کر دونوں کو شانہ بشانہ کھڑا کر دیا ہے۔ جس روز منڈیلا اپنے ملک کے صدر کے طور پر حلف اٹھا رہا تھا تو اُس کی خصوصی دعوت پر کنگ کی بیوہ سٹیج پر رونق افروز تھی۔

کنگ کی 28۔ اگست 1963ء کی تقریر کا جواب ''شیطان کی بادشاہت'' میں یقین رکھنے والوں نے یہ دیا کہ پہلے تو 22۔ نومبر 1963ء کو کالوں کے حامی صدر کینیڈی کو قتل کر دیا اور جب کالوں کی تحریکِ مساوات دبنے کے بجائے مزید ابھر آئی تو انھوں نے 4۔ اپریل 1968ء کو اس تحریک کے روحِ رواں کنگ کو بھی ممفس کے شہر (ریاست مس سی پی) میں گولی مار کر شہید کر دیا۔

نتیجہ؟

کیا کالی مخلوق کی تحریک کینیڈی اور کنگ کی موت سے واقعی دب گئی؟ نہیں، گو آج بھی کنگ کی موت سے پیدا ہونے والا قیادت کا خلا موجود ہے لیکن امریکہ کے کالے اور گورے روز بروز قریب سے قریب تر آتے جاتے ہیں۔ باکسنگ، امریکی فٹ بال اور باسکٹ بال جیسے کھیلوں میں تو کالے چھائے ہی ہوئے تھے اب وہ ٹینس، گالف اور بیس بال میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں جو کبھی خالصتاً گورے کھیل سمجھے جاتے تھے۔ کل تک فلموں میں کالے لوگوں کو گھریلو ملازموں، ٹیکسی ڈرائیوروں یا مجرموں کے کردار سے زیادہ دخل حاصل نہ تھا لیکن اب وہ مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔ آسکر ایوارڈ ہی کو دیکھ لیں کہ گذشتہ چند برسوں میں کتنے کالوں نے یہ اعزاز حاصل کر لیا ہے۔ تفریح کے میدان میں وہ چھائے ہوئے ہیں، موسیقی اور رقص تو جیسے ان کے خون میں رچے ہوئے ہیں۔ تعلیم، ادب، صحافت اور سیاست میں بھی وہ پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ 4-4-2000ء میں جنرل کولن پاول، امریکہ کا پہلا کالا وزیر خارجہ بنا۔ اس کے ریٹائر ہونے پر ایک کالی خاتون کونڈی لیزا رائس نے اس کی جگہ لی ہے۔ یاد رہے کہ امریکی وزیر خارجہ دنیا بھر کے ملکوں کے لیے امریکہ کا چہرہ ہوتا ہے۔ آج کالے لوگ یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اب سیاسی دیدہ ور اس لمحے کا انتظار کر رہے ہیں جب ''اوباما'' جیسا کوئی کالا سنیٹر امریکہ کا پہلا کالا صدر بن جائے گا۔ امریکہ کی کالی مخلوق اس مقام کی جائز حقدار تھی۔ لیکن اسے یہاں تک پہنچانے میں ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کی روحانی سوچ اور روحانی جدوجہد کا گہرا ہاتھ ہے۔

بہت پہلے، انسانیت کے سرخیل، رسولِ خدا نے فرمایا تھا، ''اختلافِ رائے باعثِ برکت ہوتا ہے کیونکہ اس سے مسئلے کے تمام پہلو سامنے آجاتے ہیں''۔ لیکن اختلافِ رائے کی برکت اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک تمام فریق ایک دوسرے کے موقف کو دیانت داری اور خلوص کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔ جیسے ہی ایک فریق دلیل کی جگہ تشدد پر اتر آئے تو برکت ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ جمہوریت میں حزبِ اقتدار کے ساتھ ساتھ حزبِ اختلاف اسی لیے یکساں

ضروری ہوتی ہے تاکہ اقتدار کے نشے میں حکومت کی آنکھوں پر چڑھی ہوئی چربی پگھل جائے اور اسے سکے کا دوسرا رُخ بھی نظر آ جائے۔ روحانی طور پر زندہ قیادتیں حزبِ اختلاف کے پُر امن اختلاف کا احترام کرتی ہیں اور وہ حزبِ اختلاف میں ہوں تو اختلاف کو پُر امن رکھنے کا جتن کرتی ہیں۔ روحانی طور پر مردہ قیادتیں اقتدار میں ہوں تو حزبِ اختلاف اور پریس اور میڈیا کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔

مارٹن لوتھر کنگ سے پہلے کالے اور گورے کا اختلاف نفسیاتی اور جسمانی تشدد کے ذریعے سے واضح ہوتا آیا تھا۔ کنگ وہ پہلا لیڈر تھا جس نے اختلاف کو مسئلے کی وضاحت کے لیے اس کی انتہا تک پہنچانا تو ضروری سمجھا لیکن ہمیشہ یہ احتیاط کی کہ کالوں کی تحریکِ مساوات تشدد میں نہ بدل جائے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کنگ نے اختلاف کا یہ استعمال مہاتما گاندھی سے سیکھا تھا۔ یقیناً کنگ جیسے عالم فاضل اور باخبر لیڈر کی نظر سے گاندھی جی کے کارنامے چھپے ہوئے نہیں تھے لیکن وہ بنیادی طور پر ایک مذہبی رہنما اور ایک روحانی شخصیت تھا۔ اُس کا مذہبی اور روحانی پیشوا گاندھی نہیں، سینٹ پال تھا جس نے کہہ رکھا ہے کہ ''انسان کے پاس تین ہی طاقتیں ہیں...... ایمان، امید اور محبت۔ اور محبت ہر طاقت سے زیادہ طاقت رکھتی ہے''۔ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کی روحانی جدوجہد آج اسی لیے کامیابی کی لہلہاتی فصل کاٹ رہی ہے کیونکہ اُس نے تمام روحانی جواں مردوں کی طرح نفرت اور تشدد کے بجائے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کا راستہ اختیار کیا۔

پوپ جان پال (دوم)

(1920-2005ء)

16- اکتوبر 1978ء کو پوپ منتخب ہونے والے جان پال، دوم (JohnPaulII) 455 سال بعد پہلے غیر اطالوی پوپ تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے ستائیس سالہ عہد میں دنیا کے کونے کونے تک پہنچ کر ثابت کر دیا کہ وہ محض پولینڈ کے نہیں، دنیا بھر کے شہری تھے اور اُن کے مخاطب صرف مسیحیوں کے رومن کیتھولک (Roman Catholic) فرقے سے تعلق رکھنے والے نہیں بلکہ تمام مذاہب کے لوگ تھے۔ ہمارے عہد میں اقتصادی سطح پر گلوبلائزیشن (Globalization) اور اس کے ڈبلیو ٹی او (World Trade Order) جیسے مظاہر نے دُنیا کو ایک ''عالمی گاؤں'' بنا دیا ہے۔ سیاسی سطح پر اقوامِ متحدہ (UNO) جیسے ادارے دنیا کو ارادی یا غیر ارادی طور پر ''دُنیائے واحد'' (One World) میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اسی طرح ایک ارب (ایک سو کروڑ) رومن کیتھولک پیروکاروں کے اس فعال اور موثر مذہبی لیڈر نے مسیحیوں کے دوسرے بڑے فرقے پروٹسٹنٹ (Protestant) ہی کی طرف نہیں، مسلمانوں، یہودیوں، بودھوں اور ہندوؤں کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا کر عالمگیر مذہبی یک جہتی اور پُر امن بقائے باہمی کو امکان کے دائرے سے نکال کر، حقیقت سے قریب تر کر دیا۔

2- اپریل 2005ء کو اٹلی کے شہر، روم میں سینٹ پیٹر کے گرجے کے چوک میں کم از کم ایک لاکھ انسان،

Marfat.com

غم واندوہ میں ڈوبے، پوپ جان پال دوم کی وفات پر آنسو بہا رہے تھے۔ دفن سے پہلے کے چند روز میں کم از کم بیس لاکھ انسانوں نے آپ کا چہرہ دیکھنے کے لیے سارا سارا دن اور ساری ساری رات قطاروں میں کھڑے گزار دی تھی۔ لیکن یہ عجیب چہرہ تھا کہ دنیا کے کونے کونے میں اس کے غروب ہو جانے پر سوگ منایا گیا اور اس سوگ میں صرف رومن کیتھولک مسیحی ہی نہیں، پروٹسٹنٹ مسیحی، مسلمان، یہودی، بدھ اور ہندو بھی شامل تھے۔ یہی نہیں، یورپ کی اکثر "بے خدا آبادی"، دنیا بھر کے انسان پرست (Humanists) اور دہریے بھی اس شخص کے دُنیا سے اٹھ جانے پر افسوس کر رہے تھے۔

پوپ کے جنازے میں جہاں تقریباً سب ملکوں کے صدر، وزیراعظم، آمر، بادشاہ اور وزیر شامل ہوئے، وہاں دنیا بھر سے چالیس لاکھ عوام بھی جمع ہوئے۔ ہم مسلمانوں میں کہا جاتا ہے کہ جس شخص کا جنازہ بڑا ہو تو سمجھ لو کہ وہ بخشا گیا۔ تاریخ نے اتنا بڑا جنازہ تو شاید پہلی مرتبہ ہی دیکھا ہو۔ پھر جن لوگوں نے ٹیلی وژن پر جنازے کی کارروائی دیکھ کر خیالی طور پر اس میں شرکت کی اُن کی تعداد دو ارب (دو سو کروڑ) بتائی جاتی ہے۔ لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے عہد میں یہ پوپ واحد ایسے انسان تھے جو صرف نام کے تقدس مآب نہ تھے بلکہ ان کی ذات مجسم "تقدس" (Holiness) بن چکی تھی۔ توقع یہی ہے کہ اگلے چند سالوں میں پوپ جان پال دوم کو "وَلی" (Saint) تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور وہ پہلے وَلی ہوں گے جنھیں ان کی جہاں گردی کی بدولت کروڑوں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔

روحانی جواں مردی کی حد تک ہمیں اس سے بحث نہیں کہ جان پال دوم نے بطور پوپ اپنے عقیدے اور عقیدت مندوں کے لیے کیا کارنامے انجام دیے۔ یہاں تو یہ دیکھنا مقصود ہے کہ جب دنیا جنگوں، مذہبی تعصبات اور سیاسی رقابتوں میں الجھی ہوئی تھی تو اس مردِ خدا نے انسانوں کو امن، مذہبی رواداری اور انسانی حقوق سے ہمکنار کرنے کے لیے کیا کیا۔ پہلی بات تو اُس نے یہ کی کہ دوسروں کو درگزر، برداشت اور معافی کا درس دینے سے پہلے اس تعلیم کو اپنی جان پر لاگو کیا۔ جس وقت مغربی دُنیا پوپ جان پال دوم کو اِس بات پر خراجِ تحسین پیش کر رہی تھی کہ انھوں نے پولینڈ کی کیمونسٹ حکومت کو کمزور کر کے پورے مشرقی یورپ کو کیمونزم کے چنگل سے نکالنے اور سوویٹ یونین کو پارہ پارہ کرنے میں زبردست کردار ادا کیا ہے، اُس وقت اِسی بات سے چڑ کر 13۔ مئی 1981ء کو روم کے ایک جلوس میں ترکی کے ایک نوجوان باشندے محمد علی آغا نے پوپ کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ محمد علی آغا کے بیان کے مطابق وہ پوپ کو سرمایہ داری نظام (Capitalism) کا گماشتہ سمجھتا تھا۔ پوپ کے شدید زخمی ہونے پر مذہبی، سیاسی اور اخباری دنیا میں کہرام مچ گیا۔ اٹلی کی ایک خاص عدالت نے محمد علی آغا کو بیس سال کی قید سنا دی۔ مگر جب 55 دن ہسپتال میں گزار کر پوپ شفایاب ہو گئے تو وہ جیل میں محمد علی آغا سے ملنے چل دیے۔

کیوں؟

اُسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ انھوں نے اُسے دل سے معاف کر دیا ہے۔

اس پوپ کے عہد سے پہلے 1965ء میں ویٹی کن (اٹلی کے اندر دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست جو ایک طرح

Marfat.com

سے رومن کیتھولک فرقے کے امام، پوپ کا دفتر اور گھر ہے) کی طرف سے، مذہبی آزادی کی جو دستاویز جاری ہوئی، اس میں پوپ اُربین دوم کی اس دعوت کے بالکل اُلٹ، جو اُس نے 1095ء میں دینی جہادوں (Crusades) کے نام پر مسیحی دنیا کو دی تھی، زور دے کر اعلان کیا گیا تھا کہ مذہب کے تحفظ کے نام پر دوسرے مذاہب کے لوگوں پر جبر اور تشدد کرنا ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا۔ پوپ جان پال دوم نے اس اعلان کو آگے بڑھاتے ہوئے کروسیڈوں کا آغاز کرنے اور ان کے دوران مسلمانوں اور یہودیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر بھی کھلے دل سے معافی چاہی۔ جو قارئین کروسیڈوں کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اس ایک واقعے سے اس اعلان کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں کہ جب پہلے کروسیڈ کے نتیجے میں مسیحیوں نے بیت المقدس (یروشلم) فتح کرلیا تو اس کے تمام یہودی اور مسلمان باشندوں کو بے دردی سے ذبح کردیا گیا تھا۔ اپنے اس پُرامن رویے کے عین مطابق 1979ء میں امریکہ کے دورے اور اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کے موقع پر جان پال دوم نے ساری دُنیا کی حکومتوں کو یہ لائحۂ عمل دیا کہ ''جنگ بند ہوجانی چاہیے'' اور ''آئندہ کبھی جنگ نہیں ہونی چاہیے''۔

کہا جاسکتا ہے کہ پوپ کے اس لائحۂ عمل پر دُنیا کے حکمرانوں پر تو شاید ہی کوئی اثر ہُوا ہو۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا تو پیغمبروں کے کہنے پر بھی ایک دم نہیں بدل جاتی رہی۔ دُنیا تو خدا کے وقت کے مطابق ہی بدلتی ہے اور اس کی تبدیلی میں کتنے ہی روحانی جواں مردوں کا خونِ جگر صَرف ہوتا ہے۔ دنیا یقیناً بدل رہی ہے۔ پرسوں دنیا مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ کل دُنیا پر یورپ کا راج تھا۔ آج امریکہ طاقت کے نشے میں بدمست دکھائی دیتا ہے لیکن دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کا مرکز ومحور امریکہ سے چین کی جانب منتقل ہورہا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کیا پوپ جان پال دوم اقوام متحدہ میں اپنی 1979ء والی تقریر بھول گئے یا اس کے مطابق اُنھوں نے آج کی دنیا کے تھانیدار امریکہ کی جنگ بازی کے خلاف بھی آواز اٹھانے کی جرأت دکھائی؟

نومبر 1989ء میں مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان کھنچی ہوئی ''دیوارِ برلن'' گرگئی۔ یہ گویا کمیونزم کی شکست کا اعلان تھا۔ اگلے ہی مہینے (دسمبر 1989ء) امریکہ نے پانامہ پر حملہ کردیا۔ پوپ جان پال دوم نے اس اِقدام کی علانیہ مخالفت کی۔ یہی نہیں، آئندہ بھی امریکہ نے بمبار طیارے یا لڑاکا فوجیں کہیں بھیجیں تو پوپ نے اس کی مذمت کی۔ 1991ء میں انھوں نے پہلی خلیجی جنگ کی، 2002ء میں افغانستان کے غریب اور بے گناہ شہریوں پر اندھا دھند بمباری کی اور اسی طرح 2003ء میں عراق پر حملے کی واضح مخالفت کی۔ آج مسلمانوں کے کسی بُزدِل بادشاہ یا کٹھ پتلی آمر سے پوچھ کر دیکھیے کہ امریکہ کی مخالفت کتنی آسان ہے؟ پوپ تو امریکہ کی مخالفت کی پروا کیے بغیر اس کی نفرت کے ''اولین شکار'' فیڈل کاسٹرو سے ملنے اور کیوبا کا دورہ کرنے بھی پہنچ گئے تھے۔ اس طرح کے کام روحانی جواں مرد ہی کیا کرتے ہیں۔

پوپ جان پال دوم نے دوسرا اہم کارنامہ یہ انجام دیا کہ تاریخ کا قرض اتارتے ہوئے یہودیوں سے اس بات کی معافی چاہی کہ ماضی میں پاپائے روم کی طرف سے انھیں ''حضرت عیسیٰؑ کے قاتلوں'' کا لقب دے کر ان کے خلاف نفرت پھیلائی جاتی رہی تھی اور جب ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم کے دوران لاکھوں یہودیوں کو مشقت، بھوک اور تشدد ہی

Marfat.com

سے نہیں، آگ کی بھٹیوں میں جلا کر مار ڈالا تو رومن کیتھولک مسیحیوں نے اس کے خلاف مؤثر آواز نہ اٹھائی تھی۔ جان پال دوم نے 2002ء میں یروشلم کا دورہ کیا اور ہیکلِ سلیمانی کی مغربی دیوار کے سامنے ادب سے سرنگوں ہو کر یہ واضح کیا کہ وہ عیسائیوں کے اس دعوے سے دست بردار ہوتے ہیں کہ عیسیٰؑ کی تشریف آوری کے بعد اس قدیم ہیکل کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی اور نیا ہیکل، رُوم میں سینٹ پیٹر (پطرس) کا گرجا ہے۔

پوپ نے محمد علی آغا کے ہاتھوں زخمی ہونے کے ایک سال بعد 1983ء میں فلسطینی رہنما یاسر عرفات مرحوم سے ملاقات کی تھی اور ان کے موقف کو پوری توجہ سے سنا تھا۔ چنانچہ جب وہ 2002ء میں بیت المقدس گئے تو انھوں نے ''بیت لحم'' کا دورہ بھی کیا اور اُس گرجے میں بھی گئے جو اُس جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے (اب یہ علاقہ فلسطینی عربوں کے پاس ہے)۔ اس موقع پر پوپ نے فلسطینی عوام کے اس مطالبے کی پوری پوری تائید کی کہ انھیں اپنی آزاد ریاست کے قیام کا حق ملنا چاہیے۔ اسی طرح اگر وہ پہلے ایسے پوپ تھے جو مذہبی یک جہتی کی خاطر کسی یہودی عبادت گاہ (Synagogue) میں گئے ہوں تو وہ دمشق کی جامع مسجد میں بھی گئے جہاں انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر خدا سے دعا کی کہ وہ دنیا کو جبر، تشدد اور غربت سے نجات دے کر آزادی، امن اور خوشحالی سے ہمکنار کر دے۔

گو دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ رومن کیتھولک فرقے اور اس کے پوپوں نے جو زیادتیاں کی تھیں اُن پر اِن مذاہب کے لوگوں سے معافی چاہنا اپنی جگہ بہت بڑی روحانی جواں مردی تھی لیکن پوپ جان پال دوم نے اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اپنے زیرِ اثر تمام ملکوں کو حکم دیا کہ وہ بچوں کی نصابی کتابوں سے وہ سارا مواد نکال دیں جو دوسرے مذاہب اور اِن مذاہب کے پیغمبروں کے خلاف نفرت یا حقارت پیدا کرتا تھا۔

آزاد خیال لوگوں کی طرف سے پوپ جان پال دوم پر اعتراضات ہو رہے ہیں کہ انھوں نے پادریوں کو شادی کی اجازت کیوں نہ دی، انھوں نے رومن کیتھولک عورتوں کو حمل گرانے کی اجازت کیوں نہ دی، انھوں نے عورت کو عورت اور مرد کو مرد سے شادی کی اجازت کیوں نہ دی یا انھوں نے عورتوں اور ہم جنس پرستوں کو پادری بننے کی اجازت کیوں نہ دی۔ مگر ہمارے لیے یہ سوال زیادہ اہم ہے کہ جب انھوں نے مشرقی یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کے عوام کے انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے لیے آواز اٹھائی اور اُن لوگوں اور تحریکوں کی ہمنوائی کی جو اِس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں تو اُنھوں نے جنوبی امریکہ کے آمروں کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی ہمنوائی کیوں نہ کی؟

درحقیقت اس کی ایک اہم وجہ تھی۔ پوپ یہ جانتے اور مانتے تھے کہ تشدد سے تشدد پیدا ہوتا ہے۔ وہ آمریت کے خلاف پُرامن جدوجہد کے حامی تھے اور ان کا یہ رویہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم اور مسیحیت کی روح کے عین مطابق تھا۔ مشرقی یورپ کے ممالک کی عوامی تحریکیں، مثلاً پولینڈ میں لیخت ولیسا کی تحریک ''سولیڈیرٹی'' (Solidarity) اور چیکوسلاواکیہ میں واتسلاؤ ہیول کی تحریک، ''کمزوروں کی طاقت'' (Power of the Powerless) پُرامن جدوجہد کے اصول پر کام کر رہی تھیں۔ اس کے برعکس جنوبی امریکہ میں بائیں بازو کی تمام تحریکوں میں تشدد کو خصوصی اہمیت حاصل

Marfat.com

تھی۔ یاد رہے کہ اس وقت جنوبی امریکہ رومن کیتھولک فرقے کا گڑھ ہے۔ پوپ اس براعظم میں عوامی تحریکوں کی حمایت کر کے پہلے سے بھی زیادہ مقبول ہو سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اصول پرستی کو مقبولیت پر ترجیح دی۔ یہ کام بھی کوئی روحانی جواں مرد ہی کر سکتا تھا۔

چلتے چلتے: (1) پوپ جان پال دوم نے جہاں تاریخ کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے رومن کیتھولک چرچ کی ماضی کی غلطیوں پر متاثرین سے معافی مانگی وہاں انھوں نے علمی ترقیوں میں رکاوٹ بننے پر اپنے پیشرووں کے غلط رویے کا بھی اقرار کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سترھویں صدی کے مشہور سائنس دان اور ماہر فلکیات گیلی لیو (Galileo) کی دریافتوں کو رد کرنے اور اسے نظر بند کرنے پر بھی معافی چاہی۔

(2) اپنی زندگی کے آخری سالوں میں پوپ کی جسمانی صحت جواب دے گئی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے زندگی کے آخری سانس تک نہ صرف اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دیے بلکہ دور دراز ملکوں کے صبر آزما دورے کر کے عوام سے اپنا رابطہ مضبوط تر کیا۔ اس رابطے نے انھیں ''عوام کا پوپ'' تو بنایا ہی تھا، اس کا اصل حاصل یہ تھا کہ اس کی وجہ سے خدا کی خدائی اور خدا کی مخلوق قریب تر ہو گئیں۔ دوسرے یہ ثابت ہو گیا کہ روح کی طاقت جسمانی کمزوری کی تلافی کر دیتی ہے۔

نیلسن منڈیلا

(......1918ء)

27 سال گورے حکمرانوں کی قید میں کاٹ کر جب گیارہ فروری 1990ء کو جنوبی افریقہ میں بھاری اکثریت کی حامل کالی خلقِ خدا کے لیڈر نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) نے آزادی کا سانس لیا تو اس نے اپنے ملک کے غریب اور کمزور عوام سے یوں خطاب کیا:

> ''دوستو، ساتھیو اور جنوبی افریقہ کے باسیو! میں تمھیں امن، جمہوریت اور ''سب کی آزادی'' کے حوالے سے سلام پیش کرتا ہوں۔ میں یہاں کسی پیغمبر کے طور پر نہیں، آپ، عوام کے ایک ناچیز خادم کے طور پر کھڑا ہوں۔ اگر آج میں جیل کی سلاخوں سے باہر موجود ہوں تو یہ آپ کی مثالی قربانیوں کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ اس لیے میں اپنی زندگی کے بقیہ سال بھی آپ کے ہاتھوں میں دیتا ہوں۔''

نیلسن منڈیلا کے یہ الفاظ اس لیے یادگار ہیں کیونکہ وہ ان میں اپنا سیاسی قد بڑھانے کے بجائے اپنے عوام کا قد بڑھاتا نظر آتا ہے۔ سیاست دانوں میں روحانی جواں مرد وہی ہوتے ہیں جو چھوٹوں کو بڑا کرنے سے بڑے بنتے ہیں۔ لیکن منڈیلا ایک اور وجہ سے بھی روحانی جواں مردوں میں شمار ہوتا ہے کیونکہ جب وہ نسلی امتیاز (Apartheid) کے

Marfat.com

خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے تو صرف گوروں کے اندر کالوں کے خلاف نہیں، کالوں کے اندر گوروں کے خلاف نفرت کے خاتمے کی بھی بات کرتا ہے۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات ''آزادی کا لمبا سفر'' (LongWalktoFreedom) میں وہ لکھتا ہے:

''میں نے آزادی کے لیے اُس وقت ترسنا شروع کیا جب مجھے اندازہ ہُوا کہ نہ صرف میرے لڑکپن کی آزادی چھن چکی ہے بلکہ ہر وہ شخص آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے جس کی شکل اور رنگ مجھ سے ملتا ہے۔ چنانچہ میں ''افریقی قومی کانگریس'' (ANC) میں شامل ہو گیا اور ذاتی آزادی کے لیے میری تڑپ، میرے عوام کی آزادی کی عظیم تر تڑپ میں بدل گئی۔ اور پھر یہ تڑپ صرف کالے عوام کی آزادی کی نہیں، جنوبی افریقہ کے کالے اور گورے تمام تر عوام کی تڑپ بن گئی۔ مجھ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ مجبوروں کے ساتھ ساتھ جابروں کی آزادی بھی اُتنی ہی ضروری ہے۔ وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کی آزادی چھینتا ہے وہ ''نفرت کا قیدی'' بن جاتا ہے۔ جس طرح میں کسی کی قید میں ہوتے ہوئے آزاد نہیں ہوتا، ہُوبہُو اسی طرح میں اس وقت بھی آزاد نہیں ہوتا جب میں نے کسی کی آزادی چھین رکھی ہو۔ مجبوروں اور جابروں، دونوں کی آزادی ہی نہیں، انسانوں کی انسانیت بھی لُٹ جاتی ہے۔ جب میں نے جیل سے باہر قدم رکھا تو میرا ایک ہی مقصدِ حیات تھا کہ مجبوروں اور جابروں، دونوں کو آزادی نصیب ہو جائے۔''

اِردگرد نظر دوڑائیے آپ کم ہی سیاستدانوں کو اس طرح سوچتے اور اس طرح کی سوچ کو عملی جامہ پہناتے اور اپنا مقصدِ حیات بناتے دیکھیں گے۔ غنیمت ہے کہ آج بھی بین الاقوامی سیاست میں نیلسن منڈیلا جیسے روحانی جواں مرد موجود ہیں۔ عالمِ اسلام میں نہ سہی، دنیا میں کہیں تو موجود ہیں۔

اگر آج بھی جنوبی افریقہ جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ گوری اقلیت نے کس طرح کالی اکثریت کو جانوروں کے اصطبلوں سے بھی بدتر جگہوں میں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ بیماری، لاچاری، بے روزگاری کے ساتھ ساتھ یہ نادر شاہی حکم کہ کالے لوگ شہروں میں محنت مزدوری کرنے آئیں گے تو ایک خاص وقت سے پہلے شہروں سے نکل کر اپنی ٹین کی جھگیوں والی بستی (Shanty Town) میں واپس چلے جائیں گے۔ ایک ایک جھگی یا کٹیا میں آٹھ آٹھ گھنٹے کی تین شفٹوں میں مزدوری پیشہ لوگ رہنے کے لیے نہیں صرف کمر سیدھی کرنے کے لیے آتے ہیں۔ دن کے وقت بھی ان کٹیاؤں میں کھڑکیوں پر کالے کاغذ منڈھے ہوتے ہیں کیونکہ غریب مزدوروں کی کوئی نہ کوئی کھیپ اُس وقت بھی وہاں سو رہی ہوتی ہے۔ کئی کئی سو انسانوں کے لیے ایک بیت الخلاء (Lavatory) نظر آئے گی اور پوری پوری کچی آبادی کے لیے پانی کا ایک نلکا۔

ایسے حالات میں جب نیلسن منڈیلا اور گوروں کے لیڈر ڈی کلارک کے درمیان طے پانے والے صلح نامے کے مطابق عام انتخابات ہوئے اور کالی اکثریت نے کالے بادلوں کی سی گھن گرج کے ساتھ انتخابات جیت لیے تو کوئی

Marfat.com

عجب نہیں تھا کہ برسوں سے گوری اقلیت کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگ قتل وغارت اور لوٹ مار پر اتر آتے۔ لیکن یہ نیلسن منڈیلا کی سیاسی فراست اور بصیرت ہی نہیں، روحانی جواں مردی تھی کہ اُس نے ظلم وستم کا بدلا لینے کے بجائے اپنے ملک اور اس کے عوام کی بہتری اور خوشحالی کے لیے دشمنوں کو دوست بنالیا۔ ہمارے عہد میں خداوند کریم کے اس حکم کی تعمیل شاید ہی کسی مسلمان حکمران یا لیڈر کو نصیب ہوئی ہو کہ ''جب تم غالب آجاؤ اور پشیمان دشمن کو معاف کر دو تو وہ جو کبھی تمھارا جانی دشمن تھا وہ تمھارا جگری دوست بن جائے گا''۔ وہ کام جو کبھی یوسفؑ نے کیا تھا یا پھر ساری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ اور سراپا رحمت، رسولِ خدا نے کیا تھا وہ ہمارے دور میں نیلسن منڈیلا نے کر دکھایا۔

اور اس کا فائدہ کیا ہُوا؟

جس طرح افریقہ کے کئی اور ملکوں میں بدامنی نے تباہی مچائی تھی اور مچا رکھی ہے، جنوبی افریقہ اُس سے بچ گیا۔ جب اپریل 1994ء کو عام انتخابات ہوئے تو منڈیلا نے دل وجان سے اپنی پارٹی (ANC) کی کامیابی کے لیے کوشش کی لیکن اس کی دُعا تھی کہ اُسے اکثریت تو مل جائے لیکن دو تہائی اکثریت نہ ملے۔ وہ یہ دعا اس لیے کر رہا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ ملک کا دستور بنانے میں ملک کی تمام اہم پارٹیاں اور دونوں بڑی آبادیاں حصہ لیں تاکہ ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر پُرامن بقائے باہمی ممکن ہو جائے۔

نیلسن منڈیلا 1994ء میں پانچ سال کے لیے جنوبی افریقہ کا متفقہ صدر منتخب ہوگیا۔ وہ چاہتا تو اپنی بے انتہا مقبولیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت آسانی سے پانچ سال کے بعد دوبارہ بھی صدر منتخب ہو جاتا۔ لیکن اقتدار سے ہر قیمت پر چمٹے رہنے والے کتنے ہی دوسرے ایشیائی اور افریقی لیڈروں کے برعکس وہ 2۔ جون 1999ء کو صدارت سے مستعفی ہوگیا اور اس نے ''تھابو مبیکی'' کو صدر بننے میں پوری پوری مدد دی۔ ایک ہم ہیں کہ جب تک عوام ہمارے آمریت پسند حکمرانوں کو انسان سے کُتّا نہ بنا دیں وہ اقتدار ہی نہیں چھوڑتے اور اگر عوام عاجز آجائیں تو خدا کو خود ہاتھ ڈال کر انھیں ہٹانا پڑ جاتا ہے۔

تاریخ نیلسن منڈیلا کو کئی وجہ سے یاد رکھے گی۔ روحانی جواں مردی کی ذیل میں البتہ اس کا ایک اور یادگار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نسلی امتیاز کے تاریک دور کے زخم مندمل کرنے کے لیے 1997ء میں ''صداقت اور صلح صفائی کمیشن'' (Truth and Reconciliation Commission) تشکیل دیا۔ اس کمیشن کے سامنے اگر ''بوتھا'' اور ''ڈی کلارک'' جیسے گورے صدر پیش ہوئے تو نیلسن منڈیلا کی سابقہ بیوی ''وِنی'' بھی پیش ہوئی۔ جس کسی کے ساتھ ظلم ہُوا تھا وہ بھی پیش ہُوا اور جس کسی نے ظلم کیا تھا وہ بھی۔ صرف ظلم کی داستانیں ہی نہ سنائی گئیں، ظلم کرنے والوں نے اپنے جرائم تسلیم کر کے ان کی معافی بھی چاہی۔ بڑے بڑے دلدوز واقعات دہرائے گئے۔ کئی مرتبہ تو یہ محسوس ہُوا کہ زخم بھرنے کے بجائے ہَرے ہو گئے ہیں۔ لیکن جس طرح انفرادی سطح پر تحلیلِ نفسی (Psycho Analysis) کے دوران رونے دھونے سے جی ہلکا (Catharsis) ہو جاتا ہے اور اس کے بعد نفسیاتی صحت حاصل ہو جاتی ہے اسی طرح اس کمیشن نے قومی سطح

Marfat.com

پر نفسیاتی صحت کا بھرپور امکان پیدا کر دیا۔ آج پاکستان جیسے کئی ملکوں میں یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ سیاسی محاذ آرائی اور فوجی مداخلت نے ملک کو جو نقصانات اور عوام کو جو صدمات پہنچائے ہیں ان کی تلافی کرنے کے لیے اسی طرح کے کمیشن قائم ہونے چاہئیں تاکہ یہاں بھی قومی یک جہتی کو تقویب مل سکے۔

چلتے چلتے: آج جب اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی موجودگی میں کیا مسلم اور کیا غیر مسلم، تقریباً ہر ملک نے کشمیریوں کے حقِ خودارادیت کی تائید ترک کر دی ہے، یہ اعزاز نیلسن منڈیلا کو جاتا ہے کہ اُس نے بَرملا اُن کے اِس حق کی حمایت کی۔ روحانی جواں مردی کے اعتبار سے یہ اعزاز امن کے اس نوبل پرائز سے کہیں برتر ہے جو اُسے 1993ء میں دیا گیا تھا۔ جب خود پاکستان کے حکمرانوں نے استصواب کے پرانے موقف سے ہٹنے کا عندیہ دے دیا ہو اور ساری دنیا یہ جانتے ہوئے کہ پاک بھارت مذاکرات میں کشمیر کے اہم ترین حصے پر قابض بھارت کا پلڑا ہر صورت میں بھاری رہے گا، اِبھی ''یک طرفہ مذاکرات'' پر اصرار کر رہی ہو تو اس طرح کی ''غیر مقبول'' بات کوئی روحانی جواں مرد ہی کر سکتا ہے۔

روحانی جواں مردوں کے اس تذکرے کے اختتام پر ایک چھوٹا سا دھیان جس میں کچھ گیان بھی شامل ہے:

ہنس کر گزار دیں یا رو کر گزار دیں، زندگی تو سبھی گزارتے ہیں لیکن روحانی طور پر وہی زندگی کوئی وزن اور معنی رکھتی ہے جو پیچھے رہ جانے اور بعد میں آنے والوں کے لیے زندگی افروز ہو۔ ہم اس کے لیے تیار ہوں یا نہ ہوں، ہماری زندگی ایک نہ ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ ہماری دولت، شہرت اور اقتدار قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔ ہماری امیدیں، آرزوئیں، منصوبے اور خواب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہماری وہ فتوحات اور شکستیں جو کبھی بے حد اہم تھیں کسی کو بھولے سے بھی یاد نہیں آتیں۔ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں جا پہنچے، کسی کو اس سے سروکار نہیں ہوتا۔ ہم حسین و جمیل تھے یا بدصورت، ذہین و فطین تھے یا کند ذہن، امیر تھے یا غریب، طاقتور تھے یا کمزور، مشہور تھے یا بدنام......لوگوں کی نظر میں ہم جائیں بھاڑ میں۔

ہمارا کچھ باقی بھی بچتا ہے یا ہمارے جسموں کی طرح ہمارے فکر و عمل کو بھی کیڑے ہی کھا جاتے ہیں؟

پیشتر اس کے کہ ہم باقی رہ جانے والی کچھ باتوں کا شمار کریں ایک بات واضح ہے کہ یادگار زندگی کا دارومدار ہماری قسمت پر نہیں، ہمارے اختیار کے درست استعمال پر ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ باقی رہنے کی کیا گنجائش ہے:

(1) یہ باقی نہیں رہتا کہ ہم نے کیا مسمار کیا، یہ باقی رہتا ہے کہ ہم نے کیا تعمیر کیا۔

(2) ہماری ملکیت باقی نہیں رہتی، ہماری سخاوت باقی رہ جاتی ہے۔

(3) ہماری کامیابی باقی نہیں رہتی، ہمارے فکر و عمل کی معنویت باقی رہ جاتی ہے۔

(4) یہ باقی نہیں رہتا کہ ہم نے کیا سیکھا تھا، یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اوروں نے ہم سے کیا سیکھا تھا۔

Marfat.com

(5) ہمارا تکبر، غصہ، حسد اور کینہ باقی نہیں رہتا، ہماری توبہ، دلداری، انکسار، امن پسندی، وفاداری، مروت، رواداری اور عفوودرگزر باقی رہ جاتے ہیں۔

(6) ہماری اپنی یادیں باقی نہیں رہتیں، لوگوں کے دلوں میں ہماری یاد باقی رہ جاتی ہے۔

(7) ہماری قابلیت باقی نہیں رہتی، ہمارا کردار باقی رہ جاتا ہے۔

یقیناً اور بھی بہت کچھ باقی رہ سکتا ہے۔ بس یہی کوشش اور یہی دُعا ہونی چاہیے کہ ہمارا جو کچھ بھی باقی رہ جائے وہ ہمارے خالقِ اکبر، اللہ رب العزت کی نظر میں شرفِ قبول پا جائے اور رسولِ خدا کے لیے باعثِ فخر ہو۔

یہ دعائیہ لمحہ ایک اور دعائیہ لمحے سے جا ملا ہے جو سینٹ فرانسس آف اسیسی (St. Francis of Assisi) کو نصیب ہُوا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ سینٹ فرانسس کو مسیحی تصوف میں وہی مقام حاصل ہے جو اسلامی تصوف میں رومیؒ کو ہے، تو غلط نہ ہوگا۔ یوں بھی، جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، دونوں ہمعصر (Contemporaries) تھے اور دونوں پر ''شمس'' کا سایہ پڑا تھا۔ لیجیے، سینٹ فرانسس کی دعا بھی سنیے اور خدا توفیق دے تو اس پر آمین بھی کہہ دیجیے:

دعائے امن

اے میرے خدا، مجھے اپنے امن کا وسیلہ بنا لے
جہاں نفرت ہو، مجھے شرف دے کہ وہاں محبت کے بیج بو دُوں
جہاں بے دردی ہو، وہاں ہمدردی بن جاؤں
جہاں مایوسی ہو، وہاں امید بن جاؤں
جہاں بے یقینی ہو، وہاں ایمان بن جاؤں
جہاں تاریکی ہو، وہاں اُجالا بن جاؤں
جہاں اداسی ہو، وہاں مسرت بن جاؤں
اے مقدس آقا، مجھے شرف دے
کہ اپنی تسلی کے بجائے دوسروں کو تسلی دوں
اپنی بات سمجھانے کے بجائے دوسروں کی بات سمجھوں
محبت کا مطالبہ کرنے کے بجائے دوسروں سے محبت کروں
کیونکہ ہم دے کر ہی کچھ پا سکتے ہیں
معاف کر کے ہی معافی کے حقدار ہو سکتے ہیں
کسی نیک مقصد کے لیے جان دے کر ہی دائمی زندگی میں داخل ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

چوتھا حصہ

روحانیت اور روحانی قدریں

Marfat.com

چودھواں باب

روحانیت کیا ہوتی ہے؟

اس دنیا کے ایک مشہور ترین اور عظیم ترین خادمِ خلق البرٹ شویٹزر (Albert Schweitzer) نے اپنی 80ویں سالگرہ کے موقع پر اپنے زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا تھا :

''ایک سچائی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ تاریخ عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اُس کا انحصار ہر پھر کر روحانیت پر ہوتا ہے۔ اگر ہماری روحانیت مضبوط ہو، تو ہم تاریخ عالم میں ایک نیا باب رقم کر ڈالتے ہیں۔ اگر ہماری روحانیت کمزور ہو، تو تاریخ عالم ہمیں روند ڈالتی ہے۔''

اب ذرا ہمارے عہد کے مشہور اور مستند تاریخ دان آرنلڈ ٹوئن بی (Arnold Toynbee) کا ایک محاکمہ بھی سُن لیں جو انھوں نے اپنی کتاب A Study of History (تاریخ کا مطالعہ، حصہ پنجم) میں دے رکھا ہے:

''تباہی و بربادی نہ تو ناگزیر ہوتی ہے اور نہ ہی ناقابلِ علاج۔ لیکن توڑ پھوڑ اور ٹوٹ پھوٹ کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو میرا تجزیہ یہی ہے کہ وہ اکثر اوقات ایک خاص طور طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔ عوام اپنے لیڈروں سے متنفر اور مایوس ہو جاتے ہیں اور لیڈر، یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی دلکشی کا جادو کھو بیٹھے ہیں، اقتدار سے آخری وقت تک چمٹے رہنے کے لیے طاقت اور تشدد کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے بدقسمت زمانے میں پیدا ہونے والے عوام کی روحوں میں ایک نفسیاتی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ باہم متضاد اور دست و گریباں نفسیاتی رجحانات، جو شاید انسانی فطرت میں ہمیشہ سے موجود چلے آتے ہیں، اب انھیں کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے اور لوگ سارا رکھ رکھاؤ بھول کر کوئی راہِ فرار ڈھونڈنے کے لیے اندھے رستوں پر جا نکلتے ہیں۔ اُس وقت ''عظیم روحیں'' دنیا سے کنارہ کش ہو جاتی ہیں۔ لیکن ''عظیم تر روحیں'' دنیا میں موجود زندگی کو ایک اعلیٰ تر زندگی میں بدل دینے کی کوشش کرتی ہیں اور ایک تازہ دم روحانی جست کے بیج بو دیتی ہیں۔''

روحانیت (Spirituality) کوئی ہوائی، خیالی یا تجریدی (Abstract) تصور نہیں۔ یہ ایک ٹھوس، عملی اور طاقتور انسانی رویہ ہے۔ یہ رویہ اپنانے سے زندگی کا رُخ منفی کے بجائے مثبت ہو جاتا ہے اور اس کا مرکز و محور، بے یقینی کے بجائے ایمان میں، نفرت کے بجائے محبت میں، بدی کے بجائے خیر میں، جھوٹ کے بجائے صداقت میں اور بدامنی کے بجائے امن میں بدل جاتا ہے۔ روحانیت کے بیج سے پھوٹنے والا اور ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن

Marfat.com

کے پانیوں سے سیراب ہونے والا زندگی کا یہ شجر قرآنِ حکیم کے اُس شجرِ طیب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس پر ہمیشہ بہار رہتی ہے اور ہمیشہ میٹھا پھل آتا رہتا ہے۔ آسانی کے لیے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ:

روحانیت = ایمان + محبت + خیر + صداقت + امن

جس شخص کی زندگی محبت، خیر، صداقت اور امن کی مظہر ہو، وہ خدا پر ایمان نہ بھی رکھتا ہو تو کچھ لوگ اُسے روحانی اعتبار سے زندہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآنِ حکیم کو خداوند کریم کا صحیح ترین پیغام تسلیم کرنے والے یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے۔ قرآنِ حکیم کے مطابق روح کا سرچشمہ صرف اور صرف خدا ہے۔ خدا پر ایمان کے بغیر انسان اخلاقی طور پر تو زندگی کا ثبوت دے سکتا ہے، روحانی طور پر وہ مردہ ہی رہتا ہے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ خدا پر ایمان کا خالی خولی دعویٰ کافی نہیں ہوتا، اس کا عملی ثبوت بھی ضروری ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیم میں خدا کا تصور شامل نہیں لیکن اُن سے روشنی پا کر آج تک اربوں انسانوں نے اُن لوگوں سے کہیں بہتر زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے جنھوں نے، خدا پر ایمان کے دعوے کے باوجود، دنیا میں بے ایمانی، نفرت، بدی، جھوٹ اور بدامنی پھیلائی ہے۔

آج افریقہ خانہ جنگی، بیماری، قحط اور غربت کے باعث جاں بہ لب ہے۔ اگر سوڈان، روانڈا اور نائیجر میں خانہ جنگی نے ہلاکت کی انتہا کر دی ہے تو پورا افریقہ ایڈز (Aids) کی بیماری سے موت کے مُنہ میں اترتا جا رہا ہے۔ مغرب کی انسان دشمن اور استحصالی (Exploitative) پالیسیوں اور افریقہ کی اپنی نااہل اور بددیانت حکومتوں کے ناپاک گٹھ جوڑ سے بیمار اور مفلس افریقی عوام کا بال بال امیر قوموں کے قرض میں جکڑا ہُوا ہے۔ اس بھوکے، بیمار، مقروض اور لہولہان افریقہ کے لیے کون آواز اٹھا رہا ہے؟ اگر کچھ لوگ ایسا کر رہے ہیں تو یہ طے ہے کہ ان میں عالمِ اسلام کی مالدار حکومتیں اور شعلہ بیان علماء ہرگز ہرگز شامل نہیں۔ دورِ حاضر کے وہ پوپ گائیک (Pop Singers) جنھیں علمائے کرام طوائفوں اور کنجروں میں شمار کرتے ہیں، آج وہی ہیں جنھوں نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے افریقہ کے حق میں مؤثر ترین آواز اٹھائی ہے۔ وہ آواز جو رحمۃ للعالمین کے پیروکار ہوتے ہوئے مسلمان حکومتوں، مسلمان قیادتوں اور اسلام کے دعویدار علماء کو اٹھانی چاہیے تھی، کوئی اٹھا رہا ہے تو یہی طوائفیں اور کنجر اٹھا رہے ہیں۔

1985ء میں ایک پاپ گائیک باب گیلڈاف (Bob Geldof) اور اس کے دو ساتھیوں بونو (Bono) اور رچرڈ کرٹس (Richard Curtis) نے راک کنسرٹ (Rock Concerts) منعقد کر کے بارہ سو کروڑ روپے ($ 200 m) جمع کیے اور افریقہ کے قحط زدگان پر خرچ کیے تھے۔ انھی لوگوں نے 2۔ جولائی 2005ء کو یورپ اور امریکہ کے چیدہ چیدہ شہروں میں جی ایٹ (G-8) کے مقابلے میں لائیو ایٹ (Live-8) بنا کر اس کے جھنڈے تلے عظیم الشان کنسرٹ منعقد کیے جن میں شرکت کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں رکھا گیا تھا۔ ان کنسرٹوں میں دُنیا بھر سے میڈونا (Madonna)، پنک فلائیڈ (Pink Floyd) اور پال میکارٹنی (Paul McCartney) جیسے ہر دلعزیز گائیکوں نے مفت حصہ لیا۔ جہاں لاکھوں لوگوں نے بذاتہ ان میں شمولیت کی وہاں کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں نے ٹیلی

Marfat.com

وژن پر یہ پروگرام دیکھے۔ دُنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی نے ان گائیکوں کے مقصد کی تائید کرتے ہُوئے G-8 میں شامل دُنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک (امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور کینیڈا) سے مطالبہ کیا کہ وہ افریقی ممالک کے قرضے معاف کردیں اور ان کی مالی امداد میں خاطر خواہ اضافہ کریں۔ اُن کی یہ آواز رائیگاں نہیں گئی، اس پر خاصی بڑی حد تک عمل ہو رہا ہے۔ 26۔ ستمبر 2005ء کی خبر ہے کہ ورلڈ بنک نے 18۔ غریب ملکوں کے 40۔ ارب ڈالر (چوبیس کھرب روپے) کے قرضے معاف کردیے ہیں۔

غور فرمایئے، کیا یہ لوگ اُن نام نہاد مسلمان علماء، حکمرانوں اور قائدین سے نہ صرف عملی طور پر بلکہ روحانی لحاظ سے بلند اور افضل نہیں جو دعویٰ تو پیغمبرِ انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا کرتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے افریقہ میں انسانیت کو دم توڑتا ہوا دیکھ کر نہ تو اُن کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکتا ہے اور نہ ہی ان کی جیب سے کوئی کھوٹا کھرا سکہ ہی نکلتا ہے ؟

ہمارے دور کا مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) خدا کو نہیں مانتا تھا لیکن اُس نے انسان اور انسان کے درمیان امن کے لیے جو طویل اور بھرپور جدوجہد کی اس کی بناء پر وہ ان لوگوں سے یقیناً زیادہ قابلِ قدر ہے جنھوں نے خُدا کے نام پر خدا کی بے گناہ مخلوق کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا۔ البتہ خوش قسمت ہیں ہم مسلمان اور دوسرے تمام خدا پرست لوگ، جنھیں ایمان جیسی بنیادی نعمت بھی حاصل ہے۔ ایمان تو خدا کو نہ ماننے والے بھی کائنات پر یا اس میں کارفرما کسی اصول پر رکھتے ہی ہیں۔ لیکن ان کا ایمان خدا پر ایمان کے مقابلے میں بہر صورت کمتر اور نامکمل ہوتا ہے کیونکہ خدا، کائنات سے ہر حال میں اور ہر وقت، زیادہ بڑا اور زیادہ مکمل ہوتا ہے۔ کائنات تو خدا کے ہاتھ میں گندھی ہوئی مٹی کی طرح ہے جس میں وہ ہر وقت تبدیلی اور اضافہ کرتا رہتا ہے۔ ذرا سوچیے، اُس مسلمان کا کیا اعلیٰ مقام و مرتبہ ہوگا جس کی زندگی کا درخت ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے پانیوں سے سیراب ہو رہا ہو اور اس پر ہمیشہ میٹھا پھل آ رہا ہو اور جس کا پتا پتا خدا کے نور سے جگمگا رہا ہو۔

کیا خدا پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآنِ حکیم کی تعلیمات، رسُولؐ خدا کی سیرت اور احادیث، فقہ (Jurisprudence) اور تاریخِ اسلام پر عبور رکھتے ہوں؟ ہمت اور توفیق ہو تو ہمیں ضرور ایسا ہی کرنا چاہیے۔ لیکن جیسا کہ ہمارے دور کے عظیم ترین مسلمان مفکر، علامہ اقبالؒ نے اپنے انگریزی خطبات کے پیش لفظ کے پہلے جملے میں کہا تھا، ''قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو خیال سے زیادہ عمل پر زور دیتی ہے'' چنانچہ ہمارے لیے بہتر رویہ یہی ہے کہ ہم خدائے رحمان و رحیم پر ایمان اور رسُولِ خدا، جنھیں خدا نے اول و آخر تمام قوموں اور زمانوں کے لیے رحمت کے طور پر متعارف کرایا ہے، کی مثال کو سامنے رکھ کر عمل کی راہ پر چل نکلیں۔

عمل پر زور دینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم علم کی اہمیت سے انکار کردیں۔ روح کی طرح علم ہی تو وہ دوسری عظیم نعمت ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ مگر علم تو ایسی حقیقت ہے کہ جتنا ہم زیادہ جانتے چلے جاتے

Marfat.com

ہیں، اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ ادھو، کتنا کچھ اور ہے جو ہم نہیں جانتے۔ سارا علم تو بس خدا ہی کو حاصل ہے جو علیم مطلق ہے۔ پھر جس علم کی شہادت عمل نہ دے اُسے تو سچا قرار ہی نہیں دیا جاسکتا۔ ہمارے وہ عالم جنھیں اپنے علم پر ناز ہے اور انھوں نے اپنے ناموں کے ساتھ مولانا اور علامہ جیسے دُم چھلّے لگا رکھے ہیں اگر اُن کے عمل سے ایمان کا نور نہیں جھلکتا، محبت کی خوشبو نہیں آتی، خیر، صداقت اور امن کے بجائے ان کے قول وفعل سے برائی، جھوٹ اور بدامنی کی بُو آتی ہے تو اُن سے وہ کم علم شخص ہزار درجہ بہتر ہے جس کا رویہ روحانی، اخلاقی اور انسانی قدروں سے قریب تر ہوتا ہے۔

ذرا سوچیے کہ وہ مسلمان عالم جو قرآنِ حکیم کا حافظ ہے، سیرتِ رسولؐ اور احادیثِ نبوی پر سند کی حیثیت رکھتا ہے، کسی ایک فرقے کی فِقہ کا ماہر ہے، تاریخ اسلام اس کی نوکِ زبان پر ہے اور وہ منبرِ رسُولِ خدا پر کھڑا ہو کر نوجوان مسلمانوں کو دوسرے مذاہب یا فرقوں کی عبادت گاہوں میں جا کر وہاں خدا کے بے گناہ نام لیواؤں کو گولیوں سے بھوننے یا بم مار کر ان کے پرخچے اڑانے بھیجتا ہے وہ روحانی اعتبار سے کیا مقام رکھتا ہے؟ کیا اس نام نہاد عالم سے وہ سادہ سا مسلمان بہتر نہیں جو محنت مشقت سے رزقِ حلال کما کر اپنے بچوں کو نہ صرف پالتا ہے بلکہ انھیں لوگوں کے ساتھ محبت، سچائی اور اچھائی سے پیش آنا سکھاتا ہے اور اپنی مثال سے بتاتا ہے کہ ماحول کو کیسے پُرامن اور خوشگوار بنایا جاسکتا ہے؟

آیئے خدا سے وعدہ کریں کہ ہم حتی المقدور دین کا علم بھی حاصل کریں گے بلکہ دل وجان سے جانِ رحمت، رسُولِ خدا کی پسندیدہ قرآنی دعا بھی کریں گے کہ "اے میرے رب، میرے علم میں اضافہ فرما" (ربِّ زِدْنِی عِلْمًا، 20:114) لیکن ساتھ ہی ایمان کے سہارے عمل کے میدان میں کود پڑیں گے اور نام نہاد عالموں سے بڑھ کر ثابت کردیں گے کہ ہم اوّل و آخر رحمان و رحیم خدا اور اوّل و آخر رحمۃ للعالمین محمدؐ کے مخلص پیروکار ہیں اور ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن ہمارا وتیرہ ہے۔

روحانی سفر کی چار منزلیں

(1) روحانیت کے سفر کی پہلی منزل یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کو مستحکم کر کے اپنی ذات سے آگے اور بالا دیکھنے کے قابل ہوجائیں۔ ہمارا کنبہ، ہمارا خاندان، ہماری قوم، پوری انسانیت اور پوری فطرت اس منزل کے مختلف مراحل ہیں۔ جوں جوں ہم اپنی ذات اور خدا کی سب مخلوقات سے ہم آہنگ (Synchronized) ہوتے جاتے ہیں، روحانیت کی پہلی منزل، اس کی دوسری منزل سے قریب آتی جاتی ہے بلکہ پہلی منزل ختم ہونے سے پہلے ہی ہمارا قدم دوسری منزل میں داخل ہوجاتا ہے۔

(2) روحانیت کے سفر کی دوسری منزل یہ ہے کہ ہم خدا کو جو ہماری ذات، انسانیت، اور فطرت کا خالق ہے اپنے اندر اور باہر (انفس و آفاق میں) تلاش کریں اور اسے نہ صرف ایک حاضر و ناظر ہستی کے طور پر پہچانیں بلکہ اس کی وحدت پر بھی ایمان لے آئیں۔ جس کا ثبوت یہ ہوگا کہ ہم خدا کی تمام تر مخلوق کی وحدت کو بھی تسلیم کریں۔

Marfat.com

(3) روحانیت کے سفر کی تیسری منزل یہ ہے کہ ہم خدائے واحد کی تخلیق کردہ ہماری اپنی ذات، ساری انسانیت اور تمام تر فطرت کو وحدتوں کے طور پر پہچاننے کے ساتھ ساتھ ان وحدتوں کو آپس میں جڑا ہُوا اور ہم رشتہ محسوس کریں لیکن یہ یاد رکھیں کہ خدا ان وحدتوں کے مجموعے کا نام نہیں۔ خدا ان تینوں وحدتوں کا خالق تو ہے مگر انھی تک محدود نہیں، وہ صرف ان کے اندر ہی نہیں، ان کے باہر بھی موجود ہے۔ اسی طرح وہ موجود، معلوم اور محدود ہی کے اندر نہیں، غیر موجود، نا معلوم اور لامحدود کے اندر بھی موجود ہے۔ اکثر صوفیوں کی طرح یہ سمجھنا کہ "خدا سب کچھ ہے اور جو کچھ ہے وہ خدا ہے" بڑا دلکش تصور ہے۔ اس تصور کو "وحدت الوجود" کہیں یا کچھ اور، یہ ہے نیچریت (Pantheism) ہی۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے "باخدا مادہ پرستی" (Theistic Materialism) کہہ سکتے ہیں۔ وحدت الوجود کا انگریزی ترجمہ عموماً Unity of Being کیا جاتا ہے۔ بے شک "جو کچھ موجود ہے" اس میں ایک وحدت ہے لیکن "جو کچھ موجود ہے" وہ اگرچہ خدا کی خدائی کا "حصہ" ہے مگر خدا کا "کُل" نہیں کیونکہ خدا کی خدائی صرف موجود تک محدود نہیں بلکہ اُس حقیقت تک پھیلی ہوئی ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئی، گو اس کا امکان ہے۔ یہی نہیں، خدا تو ناممکن پر بھی دسترس رکھتا ہے۔

روحانیت کے سفر کی یہ بڑی ہی خوبصورت لیکن احتیاط طلب منزل ہے۔ اسی منزل میں جذب و سرمستی اور فنافی اللہ جیسے مرحلے آتے ہیں جن کی وجہ سے تلاشِ حق میں نکلا ہُوا انسان کبھی پیغمبر اور کبھی خدا ہونے کا دعویٰ کرنے لگ جاتا ہے۔ ہر شے میں خدا کو جلوہ گر دیکھتے دیکھتے انسان جب خدا کو اپنے دِل میں بھی جاگزیں دیکھتا ہے تو اپنے اور خدا کے درمیان فرق نہیں کر پاتا۔ ہر شے میں، ہر انسان میں اور اپنے دل میں خدا کو موجود محسوس کرنے سے جو سرشاری اور لطف محسوس ہوتا ہے اکثر لوگ، خصوصاً صوفیاء، اسے روحانیت کی انتہا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اصل میں یہ کوئی معمولی واردات نہیں، یہ تو صوفیوں کو بھی بڑی مشکل سے نصیب ہوتی ہے مگر جب نصیب ہو جائے تو وہ اس کیفیت سے باہر آنا پسند نہیں کرتے۔ البتہ جو صوفی سُکر یا عالمِ بے ہوشی یا مجذوبیت (Intoxication) ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے، وہ اس کیفیت کو راستے کا ایک پڑاؤ سمجھ کر اگلی منزل کی طرف چل دیتے ہیں۔

(4) روحانیت کے سفر کی چوتھی منزل یہ ہے کہ سرمست یا مجذوب صوفیوں کے بجائے صحو یا بیداری (Sobriety) کے قائل صوفیوں کا راستہ اپنایا جائے جسے پیغمبروں کا راستہ کہنا چاہیے۔ صوفیوں سے کہیں بڑھ کر پیغمبر، خدا سے قریب ہوتے ہیں۔ خدا کے اپنے الفاظ میں ان میں سے کوئی خلیل اللہ ہوتا ہے، کوئی کلیم اللہ اور کوئی روح اللہ۔ رسُولِ خدا حضرت محمدؐ سے زیادہ خدا سے کون قریب ہو سکتا ہے مگر خدا نے آپؐ سے ملاقات میں بھی باہم دو کمانوں کے لگ بھگ فاصلہ قائم رکھا (53:9)۔ یہ صرف اور صرف خدا کی شان ہے کہ وہ ہم سے ہر وقت ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر رہتا ہے لیکن ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہم بھی ہر وقت اس سے اتنے ہی قریب ہوتے ہیں۔ اگر رسُولِ خدا معراج میں بھی خدا سے دو کمانوں کے لگ بھگ فاصلے پر رہے تو مجذوب صوفیوں کا یہ دعویٰ غور طلب ہے کہ وہ خدا سے اتنے قریب ہو گئے کہ اسی میں جذب یا فنا ہو گئے۔ بہر حال صوفیاء اس کیفیت سے باہر آنا چاہیں یا نہ چاہیں، پیغمبر اس حالت سے باہر آتے ہیں

اور جو کچھ خدا نے انھیں دیا ہوتا ہے، دوسرے انسانوں کو اس میں شریک کرتے ہیں۔ زیادہ ہوش مند صوفیائے کرام بھی پیغمبری راستے ہی پر چلتے ہوئے واپس عوام کے درمیان آ کر اپنے فیض کو عام کرتے ہیں۔

عام انسان، جو صوفی ہے نہ پیغمبر، اُس کے لیے بھی پیغمبری راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ چنانچہ روحانیت کے سفر کی چوتھی اور آخری منزل پر متلاشیِ حق کو اپنی ناچیز سطح پر، پیغمبروں کی طرح سب سے پہلے اپنی ذات کی اصلاح کرنی چاہیے۔ پھر قول و فعل کے ہر تضاد کو مٹا کر اُسے انسانیت کے درمیان امیر اور غریب، کمزور اور طاقتور، کالے اور گورے، مرد اور عورت کی تفریق کو ختم کر دینا چاہیے۔ جس طرح خدا، سب کا خدا ہونے کے ناتے، اچھے برے، ہر کسی کو پالتا ہے اسی طرح اُسے بھی ساری انسانیت کے ساتھ یکساں محبت کا رویہ رکھنا چاہیے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لیے اس رویّے کے علاوہ کوئی بھی اور رویہ غلط ہوگا کیونکہ وہ جس نبیؐ کے پیروکار ہیں اس کی نبوت تمام زمانوں اور قوموں کے تمام انسانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ سرورِ کائناتؐ کے مخلص پیروکار ہوتے ہوئے ہماری محبت تو انسانیت سے بھی آگے جا کر خشکی، تری اور ہوا کے جانداروں، جنگلوں، سمندروں، پہاڑوں اور فضاؤں کی حفاظت اور نگہداشت تک وسیع ہو جانی چاہیے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انسان نے اپنی خود غرضی میں اس زمین کے ساتھ اتنی سنگین زیادتیاں کر ڈالی ہیں کہ ماحول (Environment) کی آلودگی (Pollution) کے باعث اس سیارے پر انسان سمیت ہر طرح کی زندگی کے ناپید ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔ رسولِ خداؐ کے ہر سچے پیروکار کو ''ماحول کا بہترین محافظ'' اور موت نہیں، زندگی کا علم بردار ہونا چاہیے۔

چلتے چلتے: روحانی طور پر مردہ شہریوں کے ہاتھوں سڑکوں کے درمیان لگائے جانے والے گھاس، پھولوں اور پودوں کا حشر تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ جن نہروں میں گرمی کے موسم میں غریب اور درمیانے طبقے کے لڑکے بالے نہاتے ہیں اور جن کے کنارے غریب عورتیں کپڑے دھوتی ہیں، آپ نے ان میں روحانی طور پر مردہ شہروں کی غلاظت بہتی اور بہائی جاتی بھی دیکھی ہوگی۔ نہریں تو ایک طرف رہیں، اب تو راوی جیسے رومانوی دریا بھی گندے نالے بن چکے ہیں۔ اور یہ تو آپ نے سوچا ہی ہوگا کہ ہمارے کارخانوں کا زہریلا پانی کہاں جاتا ہے؟ یہ دردناک سوال ''میرا سوہنا شہر قصور'' کے رہنے والوں سے پوچھ کر دیکھیے جو چمڑا رنگنے والے کارخانوں (Tanneries) کا پانی پی پی کر پاکستان کی صنعتی ترقی پر ناز کرنے کے ساتھ ساتھ خون بھی تھوک رہے ہوتے ہیں۔

محبت اور قانون

جیسا کہ اہلِ دل، اہلِ نظر اور واقفانِ حقیقت پر واضح ہے، خدا اوّل و آخر رحمان و رحیم ہے۔ بے شک وہ جبار بھی ہے، قہار بھی ہے، ذُوانتقام بھی ہے، شدیدُ العقاب بھی ہے۔ لیکن اس کی یہ صفات لوگوں پر ظلم و ستم کرنے والوں، بے گناہوں کو قتل کرنے والوں، خدا کی خدائی میں خدا کی حکم عدولی کرنے والوں اور اجتماعی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اپنی ذاتی اغراض......شہرت، دولت، اقتدار......کی پیروی کرنے والوں کے لیے وقف ہیں۔ ہمارے دور کے عظیم درویش،

Marfat.com

قلندر اور صوفی، نور والے بابا، فضل شاہؒ فرمایا کرتے تھے، ''جب خدا نے رسُولِ خدا کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیج دیا اور آپ کی نبوت کا دائرہ تا قیامت، ہر سرزمین اور ہر زمانے کے تمام انسانوں تک پھیلا دیا تو خدا نے اپنی قہاری، جباری، انتقامی اور تعاقبی صفات معطل کر دیں۔ قرآنِ حکیم سے ثابت ہے کہ حضرت لوطؑ اور حضرت یونسؑ اِس کی بہترین مثال ہیں کہ جب تک نبی اپنے لوگوں میں موجود ہو اُن پر خدا کا عذاب نازل نہیں ہوتا۔ اِس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ کو تو خدا تا قیامت رحمت بنا کر بھیجے اور خود لوگوں کو جبر، قہر، انتقام اور تعاقب کا نشانہ بناتا رہے۔ بس، اب خدا بھی تا قیامت رحمان و رحیم ہے۔ خصوصاً جس کسی نے رسُولِ خدا کو جانِ رحمت تسلیم کر لیا اور خود رحمت کی مثال بن گیا اس کا بیڑا پار ہے''۔

نور والے باباؒ سے جب بھی کسی نے پوچھا، ''حضور! خدا کا کون سا نام اسمِ اعظم ہے''؟ آپؒ نے ہمیشہ یہی فرمایا، ''الوَدُودُ''۔ راز کی بات بھی بتائی، ''الوَدُود'' کا مطلب ہے سب سے بڑھ کر محبت کرنے والا۔ ہم کہاں خدا سے محبت کا حق ادا کر سکتے ہیں، ہم تو اس کے نام کے عاشق ہیں، اصل میں وہ ہمارا عاشقِ صادق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا جیسی محبت کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یاد رکھو (آپؒ ایسے موقع پر انگریزی کا لفظ نوٹ Note استعمال کیا کرتے تھے) صرف محبت کی نظر سے دیکھنے والا ہی ہمارے عیبوں، کمیوں، کجیوں اور کوتاہیوں کو دیکھنے کے بجائے ہماری اچھائیوں اور بھلائیوں کو دیکھتا ہے۔ خدا کو یا وَدُودُ کہہ کہ پکارو گے اور یاد کرو گے تو جس طرح محبت کرنے والے ماں باپ اپنی اولاد کے عیبوں کے بجائے اس کی خوبیوں ہی کو دیکھتے ہیں اسی طرح ''وہ سب سے بڑھ کر محبت کرنے والا'' بھی تمھاری غلطیاں اور گناہ معاف کر دینے کے ساتھ ساتھ تمھیں ایسی خوبیوں سے نواز دے گا کہ تمھارے دشمن بھی تمھاری تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔

ہم خدا کو تلاش نہیں کرتے، خدا ہمیں تلاش کرتا ہے کیونکہ خدا سے جتنی محبت ہم کرتے ہیں اس کے مقابلے میں خدا ہمارے ساتھ کہیں زیادہ محبت کرتا ہے، اس تصور کو مسیحی شاعر فرانسس ٹامسن (Francis Thompson) نے اپنی مشہور نظم The Hound of Heaven (آسمانی صیاد) میں انتہائی خوبصورتی سے لفظی جامہ پہنایا ہے۔

ہمارے زیادہ تر صوفیوں اور صوفی شاعروں نے بھی خدا کو ''محبت ہی محبت'' قرار دیا ہے۔ مسیحیت کا تو نعرہ ہی یہ ہے کہ ''خدا محبت ہے'' (God is Love)۔ ہمارے صوفیوں میں ابن عربیؒ اور صوفی شاعروں میں رومیؒ اسی موقف کے ترجمان ہیں۔ البتہ معتدل مزاج فلسفی صوفی، غزالیؒ، خدا کی محبت کے ساتھ ساتھ خدا کے قانون (شریعت) کو بھی برابر کی اہمیت دیتا ہے۔ تصوف کے نقشبندی سلسلے میں خصوصاً اور قادریہ سلسلے میں عموماً، غزالیؒ ہی کے رویے کی پیروی کی جاتی ہے۔ اسلام اور دوسرے دونوں ابراہیمی مذاہب...... یہودیت اور مسیحیت...... کے درمیان یہی فرق ہے۔ یہودیت میں خدا کے قانون پر اتنا زیادہ زور دیا گیا کہ اس کی محبت اس کے قانون میں دب کر رہ گئی۔ مسیحیت میں خدا کی محبت کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی کہ اس کا قانون پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ اسلام میں قانون اور محبت یا دوسرے لفظوں میں شریعت اور طریقت کے درمیان ایک خوبصورت توازن پیدا کر دیا گیا۔ خود رسُولِ خدا کی ذات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلال اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جمال کا نہایت ہی جلیل و جمیل امتزاج نظر آتا ہے۔ گویا اسلام = محبت + قانون۔

Marfat.com

مگر پہلے محبت، پھر قانون۔

اگر قانون اور محبت کو یکساں اہمیت دینی مقصود ہو تو پھر بھی ان دونوں میں سے ایک کا مقام اوّل ہوگا اور دوسرے کا دوم۔ رسُولِ خدا کا ایک مشہور ارشاد ہے، ''اگر تم میں سے دو لوگ بھی اکٹھے سفر پر نکلیں تو انھیں اپنے میں سے ایک کو امام بنا لینا چاہیے''۔ اس ارشاد کے مطابق قانون اور محبت میں سے کون امام ہوگا؟ آیئے اس بات کا فیصلہ ایک مثال کی روشنی میں کر لیتے ہیں۔ اسلام میں جہاں خدا کے حقوق ہیں وہاں اس کے بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ خدا کے حقوق کے لیے ''حقوق اللہ'' اور بندوں کے حقوق کے لیے ''حقوق العباد'' کی اصطلاحیں (Terms) استعمال ہوتی ہیں۔ خدا کے احترام میں حقوق اللہ کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے اور حقوق العباد کا بعد میں۔ لیکن جب عمل کا مرحلہ آتا ہے تو ہنگامی حالت میں ہمیشہ حقوق العباد پہلے ادا کیے جاتے ہیں اور حقوق اللہ بعد میں۔

فرض کیجیے آپ ایک ڈاکٹر ہیں۔ مغرب کی نماز کی اذان ہو چکی ہے اور آپ وضو کر کے مصلّے پر پاؤں رکھنے ہی والے ہیں۔ عین اس وقت ایک مریض آپ کے کلینک میں داخل ہوتا ہے۔ وہ آپ کو پکارتا ہے، ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے میری جان بچایئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ لہولہان ہے اور اس کے بازو سے فوارے کی طرح خون بہہ رہا ہے، اگر اس پر فوری توجہ نہیں دی جاتی تو اس کے مرنے کا خدشہ ہے۔ آپ کیا کریں گے؟ پہلے نماز ادا کریں گے یا اس مریض کی مرہم پٹی کریں گے؟ اگر آپ روحانی طور پر بیدار نہ بھی ہوں تو انسانیت اور آپ کے پیشے کا تقاضا یہی ہے کہ آپ پہلے اس مریض پر توجہ دیں۔ تو کیا آپ خدا کو مریض سے کم اہمیت دیتے ہیں؟ نہیں! خدا بھی آپ سے یہی توقع رکھتا ہے کہ آپ پہلے جاں بہ لب مریض کی جان بچائیں۔ کیوں؟ خدا کے پاس بہت وقت ہے، اس مریض کے پاس کوئی وقت نہیں۔ پھر شریعت کے مطابق نماز کی قضا جائز ہے، آپ کچھ دیر بعد بھی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس جاں بہ لب مریض کے علاج کی کوئی قضا نہیں، آپ اس کے مرجانے پر اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

نتیجہ: احتراماً ہم خدا کے حق کو پہلا اور بندوں کے حق کو دوسرا مقام دیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ شریعت اور طریقت دونوں ہی اسلام کے بنیادی رکن ہیں۔ یعنی شریعت کا ذکر پہلے اور طریقت کا ذکر بعد میں کریں گے لیکن عملاً طریقت یا خدا کی محبت اور اس محبت کے ثبوت کے طور پر خدا کی مخلوق سے محبت کو پہلا مقام دیں گے۔ یاد رہے کہ خدا نے شریعت یا قانون پر زور دینے والے یہودیوں کے مقابلے میں طریقت یا محبت پر زور دینے والے مسیحیوں کو اسلام کی جانب راغب ہونے کے اعتبار سے پہلا مقام دیا ہے۔ مسیحیوں کے بارے میں قرآنِ حکیم کا یہ بیان دُنیا کے ''دو سب سے بڑے مذہبوں، مسیحیت اور اسلام، کے درمیان امن اور بہتر تفہیم (Understanding) کے لیے اتنا اہم ہے کہ یہاں اسے درج کرنا نہایت مناسب ہوگا:

> ''اہلِ ایمان (مسلمانوں) سے عداوت رکھنے میں یہودی اور مشرک لوگ سب سے زیادہ شدید رویہ رکھیں گے البتہ مسلمانوں سے دوستی میں سب سے قریب وہ لوگ ہوں گے جو اپنے

Marfat.com

آپ کو نصاریٰ (مسیحی) کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحیوں میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر (Monks) پائے جاتے ہیں اور ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ چنانچہ جب وہ اس کلام (قرآنِ حکیم) کو سنتے ہیں جو رسول (محمدؐ) پر اترا ہے تو تم دیکھو گے کہ حق شناسی کی وجہ سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں اور وہ پکار اٹھتے ہیں کہ ''پروردگار، ہم ایمان لاتے ہیں، ہمارا نام صداقت کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے''۔ اور وہ کہتے ہیں، ''آخر ہم کیوں نہ خدا پر ایمان لائیں اور کیوں نہ اس حق (قرآنِ حکیم) کو تسلیم کرلیں جو ہم تک پہنچ گیا ہے کیونکہ ہم اس بات کے خواہشمند ہیں کہ ہمارا ربّ ہمیں نیک لوگوں میں شمار کرے''۔ اُن کے اس قول کی وجہ سے خدا نے انھیں ایسی جنتیں عطا کی ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ان کے اچھے رویے کی جزا ہے (5:82-85)۔''

قرآنِ حکیم کی اِن بصیرت افروز آیات سے واضح ہے کہ حق و صداقت کے لیے قانون پسندی اور غرور کے مقابلے میں محبت اور انکساری افضل ہیں۔ اہلِ ایمان کی زندگی میں محبت کو اُسی طرح اولین مقام حاصل ہونا چاہیے جیسے خداوند کریم کی صفات میں محبت، رحیمی، کریمی، غفاری، اور ربوبیت کو جباری، قہاری، انتقام اور تعاقب کے مقابلے میں اوّلیت حاصل ہے۔

محبت کی اوّلیت سے کیا مراد ہے اور قرآنِ حکیم کی تعلیم کی روشنی میں وہ معاشرہ جسے ایک روحانی جمہوریت (Spiritual Democracy) کے طور پر قائم ہونا اور قائم رہنا ہے اس میں محبت اور قانون کا باہمی رشتہ کیا ہوگا؟

ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں یہ تعین کرنا ہوگا کہ معاشرتی سطح پر محبت اور قانون ہوتے کیا ہیں۔

قانون کا تعلق گناہ، جُرم، ظلم، ناانصافی، بددیانتی اور فتنہ وفساد سے ہے۔ قانون اِن سے بچنے کی خاطر اچھائی کی وہ کم سے کم (Minimum) حد مقرر کرتا ہے جسے پار کرنے سے معاشرے کا فرد قانون کی زد میں آجاتا ہے۔ اس کے برعکس محبت کا تعلق نیکی، رحمدلی، انصاف، دیانت داری اور خوش دلانہ امن سے ہے۔ محبت میں اچھائی کی زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھی جاتی ہے اور برائی کی وہ کم سے کم حد مقرر کی جاتی ہے جسے پار کرکے ہم محبت کے دائرے سے نکل جاتے ہیں۔

جن معاشروں میں شریعت یا قانون پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اس میں انسان کو صرف یہ فکر یا احتیاط لاحق ہوتی ہے کہ وہ اچھائی کی کم سے کم حد کو ضرور ملحوظ رکھے۔ اگر وہ اس حد سے نیچے چلا جاتا ہے تو وہ قانون کی پکڑ میں آجاتا ہے۔ اس کے برعکس جن معاشروں میں محبت پر زور دیا جاتا ہے ان کے افراد یہ احتیاط کرتے ہیں کہ وہ برائی کی کم سے کم حد کو کبھی پار نہ کریں۔ قانونی معاشروں میں اچھائی کم سے کم اور محبتی معاشروں میں برائی کم سے کم پائی جائے گی۔ قانونی معاشروں کے افراد کوشش کریں گے کہ قانون کی زد سے بچنے کے لیے شراب پئیں تو غل غپاڑا نہ مچائیں، جؤا کھیلیں تو دوسرے جواریوں کو دھوکا دیتے ہوئے پکڑے نہ جائیں، بدمعاشی اور حرام کاری کریں تو چھپ کر کریں، چوری کریں تو پتا نہ چلنے دیں، قتل

کریں تو وکیل ذرا اونچے درجے کا منتخب کریں اور بچ جائیں۔ اور حکومت خواہ اچھی ہی ہو اُسے الٹا کر خود برسر اقتدار آنے کے لیے سازش اور ساز باز تو کر لیں، فساد نہ مچائیں۔ اور اگر فساد مچائیں تو اتنا زیادہ مچائیں کہ کامیاب ہو جائیں ورنہ بغاوت کے الزام میں دھر لیے جائیں گے۔

اس کے برعکس محبتی معاشروں کے افراد کوشش کریں گے کہ شراب، جوئے، بدمعاشی، حرام کاری، چوری چکاری، قتل و غارت اور فتنہ فساد سے حتی الامکان پرہیز کریں اور برائی کو صرف اور صرف ناگزیر حالات میں اختیار کریں۔ قانونی معاشروں کا رخ برائی کی جانب ہوگا اور وہ کم سے کم اتنی اچھائی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور سمجھیں گے کہ پکڑے نہ جائیں۔ محبتی معاشروں کا رخ اچھائی کی جانب ہوگا اور اگر انھیں مجبوراً برائی کرنی پڑ جائے گی تو وہ کم سے کم برائی کرنے کی کوشش کریں گے۔ مثال: قرآنِ حکیم کے مطابق چار چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں۔ خون، مُردار، سؤر کا گوشت اور وہ ذبیحہ جس پر خدا کے بجائے کسی اور کا نام لیا گیا ہو (2:173) لیکن خدا نے اسی آیت میں یہ اجازت دی تھی کہ اگر جان بچانے کی خاطر حرام شے کھانے پر مجبور ہو جاؤ تو صرف کم سے کم مقدار میں ایسا کرو۔

محبتی معاشرے نہ صرف حرام خوراک کے سلسلے میں یہ رویہ اپنائیں گے بلکہ دنیا کی ہر برائی سے بھی اسی طرح بچنے کی خواہش رکھیں گے اور کوشش کریں گے کیونکہ انھیں قرآنِ حکیم کی یہ تعلیم اور رسولِ خدا کی یہ تلقین بھی یاد ہوگی کہ خدا نے جو چیزیں حرام قرار دی ہیں وہ صرف خون، مُردار، سُور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ ہی نہیں اس نے تو "بے شرمی کے تمام کام خواہ وہ کھلم کھلا کیے جائیں یا چھپ چھپا کر...... حرام ٹھہرائے ہیں۔ اسی طرح ہر گناہ اور بلا جواز بغاوت، خدا کے ساتھ کسی کو خواہ مخواہ خدائی میں حصہ دار سمجھنا اور خدا کے حوالے سے، جانتے بوجھتے ہوئے، کوئی ایسی بات کہنا جو خدا نے کہی ہی نہ ہو، یہ سب باتیں بھی حرام ہیں (7:33)۔ اب ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو عموماً اپنے ملک میں لوگوں سے چوری چھپے اور خصوصاً بیرون ملک جا کر علی الاعلان (کیونکہ وہاں یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ "لوگ کیا کہیں گے")، ایک سُور کا گوشت نہ کھانے کے سوا کون سا حرام کام اور کونسی بے شرمی ہے جو ہم نہیں کر گزرتے۔

وجہ: ہم صرف قانون کی پکڑ میں آجانے سے ڈرتے ہیں۔ خداوند کریم، رسُولِ خدا اور قرآنِ حکیم سے ہماری محبت زیادہ تر دکھاوے کی ہے۔ کوئی صریحاً جھوٹ بول کر یہ کہہ دے کہ فلاں شخص نے رسُولِ خدا کی شان میں بے ادبی اور قرآنِ حکیم کی بے حرمتی کی ہے تو ہم اس بے گناہ کو قتل کرنے چل دیتے ہیں البتہ اپنی زندگی اور عمل پر نہ تو رسُولِ خدا اور نہ ہی قرآنِ حکیم کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتے۔ یہ صورتِ حال صرف اور صرف ایک طرح بدل سکتی ہے کہ ہم قانون کے بالمقابل ہر حالت میں خدا اور اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کو ترجیح دیں۔

اس کا کیا طریقہ ہے؟

اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم محبت کو آئین کا مقام دیں اور جیسا کہ دنیا بھر کے مہذب معاشروں میں ہوتا ہے، اپنے ہر قانون کو اس آئین کی روح سے ہم آہنگ بنائیں۔ دوسرے لفظوں میں ہر وہ قانون جس سے محبت یا اس کے

Marfat.com

لوازمات مثلاً نیکی، رحم لی، انصاف، دیانت داری اور خوش دلانہ امن پورے نہ ہوں، اُسے کالا قانون قرار دے کر اسے کسی ایسے نئے قانون سے بدل دیں جو محبت کے لوازمات کا تحفظ ہی نہیں ان کی نشوونما اور افزائش بھی کرے۔ محبت اور قانون یا طریقت اور شریعت میں یہی رشتہ قائم ہوگا اور پروان چڑھے گا تو عالمِ انسانیت میں خدا کا نور پھیلے گا اور پاکستان جیسے نام نہاد اسلامی ملک میں اور پورے عالمِ اسلام میں روحانی جمہوریت پرورش پا سکے گی۔

قانون کہتا ہے، یہ برا کام نہ کرو۔ روحانیت کہتی ہے، یہ اچھا کام کرو۔ قانون کہتا ہے، قتل نہ کرو۔ روحانیت کہتی ہے، زندگی بچاؤ۔ قانون کہتا ہے، خودکشی نہ کرو۔ روحانیت کہتی ہے، تمھاری زندگی خدا کی امانت ہے، اس کی حفاظت کرو۔ قانون کہتا ہے، دھوکا بازی نہ کرو۔ روحانیت کہتی ہے، دیانتدار بنو۔ قانون کہتا ہے، کسی کے مال، جان اور عزت پر ہاتھ نہ ڈالو۔ روحانیت کہتی ہے، دوسروں کے مال، جان اور عزت کے رکھوالے بنو۔ قانون ایک منفی طاقت ہے۔ روحانیت ایک مثبت طاقت ہے۔ قانون ''نہ'' ہے۔ روحانیت ''ہاں'' ہے۔

برائی نہ کرنا اور اچھائی کرنا ایک جیسے عمل نہیں ہیں۔ فرض کریں کہ ایک شخص کے گھر میں دو روٹیاں ہیں اور کھانے والے چار ہیں۔ اب اگر ہم قانون پر عمل کرتے ہوئے اس کی دو روٹیاں نہ چرائیں تو گویا ہم نے برائی نہ کی۔ اس سے اس غریب گھرانے کی حالت میں تو کوئی فرق نہ پڑا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ دو روٹیاں بھی چوری ہو جاتیں تو اس کی حالت اور خراب ہو جاتی لیکن ہم نے چوری نہ کر کے اس کی موجودہ حالت میں کوئی بہتری پیدا نہیں کی۔ اب اگر ہم روحانیت کے تقاضے کے طور پر اُس شخص کو دو روٹیاں اپنی طرف سے پیش کر دیتے ہیں تو اس کے گھرانے کی حالت میں مثبت فرق پڑ جاتا ہے۔

چلتے چلتے: Not Bad کا مطلب Good نہیں ہوتا۔ روحانیت ''بُری نہیں'' کے بجائے ''اچھی'' ہوتی ہے۔

تقدُّس، شکایت اور شکریہ

جب ہم اس قرآنی اور روحانی حقیقت پر دل و جان سے ایمان لے آتے ہیں کہ خدا نے انسان کو انسان ہونے کے ناتے عزت (تکریم) دی ہے تو ہم ہر انسان کی عزت کریں گے..... خواہ وہ ہمارا دوست ہو یا دشمن، ہمارا رشتے دار ہو یا بیگانہ، کالا ہو یا گورا، عورت ہو یا مرد، مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ یہاں تک کہ حالاتِ جنگ میں ہم دشمنوں کی لاشوں کی بھی بے حرمتی نہیں کریں گے۔ اسی طرح اس ایمان کی بدولت کہ خدا ہر جگہ اور ہر شے میں موجود ہے، ہم معمولی سے معمولی چیز کے غلط استعمال سے بچنے کی کوشش کریں گے۔

اس رویے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کائنات کی ہر شے عموماً اور ہر انسان خصوصاً ہمارے لیے محترم ٹھہرے گا اور ہماری زندگی میں تقدس پیدا ہو جائے گا۔ بدتعریفی، بدکلامی، غیبت اور کردار کشی کے بجائے ہم فطرت کے مظاہر، چیزوں اور انسانوں کے قدر دان بنتے چلے جائیں گے۔ یہ روحانی رویہ ہماری عادت اور ہمارا شعار بن جائے گا۔ اس طرح خود ہم پر، چاہتے نہ چاہتے ہوئے، تقدس (Holiness) کا رنگ چڑھ جائے گا اور ہمارے ماحول میں خود ہمارے لیے

Marfat.com

عزت واحترام پیدا ہو جائے گا۔

اب آیئے، یہ دیکھیں کہ روحانیت میں شکایت اور شکریے کا کیا مقام ہے؟

ایک گھسی پٹی مثال: پانی کا گلاس آدھا بھرا ہُوا اور آدھا خالی ہے۔ ایک رویّہ یہ ہے کہ ہم یہ کہیں، ''آدھا گلاس خالی کیوں ہے، بھرا ہُوا کیوں نہیں؟'' یہ منفی رویہ شکایت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس منفی رویے سے ہماری زندگی میں محرومیوں، اُداسیوں اور افسردگیوں کا اضافہ ہوتا ہے اور ہم نہ صرف خود ناخوش و بیزار رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی ناخوش و بیزار کرتے ہیں۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ ہم کہیں، ''اچھا ہُوا کہ آدھا گلاس تو بھرا ہُوا ہے، یہ بھی نہ ہوتا تو ہم کیا کرتے''۔ یہ مثبت رویہ شکریے کا مقام رکھتا ہے۔ اس مثبت رویے سے ہماری زندگی میں مہربانیوں، نوازشوں اور دلداریوں کا اضافہ ہوتا ہے اور ہم نہ صرف خود خوش و خرم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی خوش و خرم رکھتے ہیں۔

شکایت کا رویہ غیر روحانی اور شکریے کا رویہ روحانی ہے۔ اس روحانی رویے سے میاں بیوی، والدین اور اولاد، دوست احباب، اور اہلِ محبت ہی کے درمیان نہیں، بندے اور خدا کے درمیان بھی خوشگوار تعلقات پیدا ہو جاتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں۔ جب انسان ''جو کچھ اسے ملا ہے'' اُسے ناکافی اور حقیر سمجھتا ہے اور جو کچھ اُسے نہیں ملا اس سے محروم ہونے کی بناء پر ناخوش اور ناشکر گزار ہوتا ہے تو وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مزید کا حقدار نہیں۔ یہ ایک روحانی حقیقت ہے کہ جب ہم کچھ پا کر اس پر خدا کا شکریہ ادا نہیں کرتے یا اس کا صحیح استعمال نہیں کرتے تو خدا کہتا ہے کہ اس شخص نے ہماری ''عطا'' کی قدر نہیں کی لہٰذا اسے مزید کچھ نہ دیا جائے۔ اس کے برعکس جب ہم اس کی بظاہر ناکافی یا کمتر عطا پر اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اس عطا کا بہترین استعمال کرتے ہیں تو خدا کہتا ہے کہ اس شخص نے ہماری عطا کی قدر کی اور اس کا بہترین استعمال کر کے اس کا حق ادا کیا لہٰذا اسے مزید عطا کیا جائے۔

ملازمت کے میدان میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص اپنے چھوٹے عہدے کی ناقدری کرتے ہوئے اس سے متعلقہ فرائض کو دلجمعی اور سلیقے کے ساتھ انجام نہیں دیتا وہ اس سے اونچے عہدے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ بجا کہ ہمارے جیسے بے انصاف ملکوں میں ناحقدار اور غیر مستحق لوگوں کو نہ صرف بڑے بڑے سرکاری عہدے مل جاتے ہیں بلکہ وہ رکن اسمبلی بھی منتخب ہو جاتے ہیں، وزیر اور وزیرِ اعلیٰ ہی نہیں، وزیرِ اعظم اور صدر بھی بن جاتے یا بنا دیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ناانصافی خدا کے یہاں نہیں چلتی۔ اس کے یہاں تو یہی اصول ہے کہ اگر آپ اس کی موجودہ ''عطا'' کی قدر کریں گے تو آپ اس سے بڑی اور اہم تر ''عطا'' کے حقدار ٹھہریں گے۔

چلتے چلتے۔ اگر خدا ہمیں دولت یا اقتدار دے اور ہم زبان سے خدا کا شکریہ ادا کر کے یہ سمجھیں کہ ہم نے اس کی مہربانی کا حق ادا کر دیا تو یہ ہماری نادانی ہوگی۔ اوّل تو یہ زبانی شکریہ بھی ہم اس طرح ادا کرتے ہیں کہ کوئی اور نہ سن لے۔ رہا خدا کی عطا کا صحیح استعمال تو اس کے بارے میں ہم کم ہی سوچتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ جس کسی کو اس کی ضرورت سے زیادہ دولت دی جائے یا دوسروں پر حکمرانی کا موقع دیا جائے وہ اس عطا کا شکریہ صرف اور صرف اس طرح ادا کر سکتا ہے کہ

Marfat.com

زائد دولت اور اقتدار کو دوسروں کی بہبود کے کام میں لائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر قوم اور مذہب کے روحانی طور پر بیدار اور صحیح معنوں میں شکر گزار لوگوں نے دولت اور اقتدار کو ایک آزمائش اور خدا کی امانت سمجھتے ہوئے، اپنی سفلی خواہشوں کی تکمیل کے بجائے، دوسروں کی زندگی میں آسانی، راحت اور اطمینان پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

نعمتیں عطا کرنے والے خدا کے نزدیک ان نعمتوں پر انسان کی شکر گزاری اتنی ضروری ہے کہ سورہ الرحمٰن میں اس نے "فبای ءَ الآءِ رَبِّکما تُکذِّبان" کے جملے کو بار بار دُہرایا ہے۔

ایمان، امید اور آزادی

روحانیت، خصوصاً روحانی جواں مردی، ہمیں یہ ہمت و حوصلہ بخشتی ہے کہ ہم ایک ایسی زندگی گزار سکیں جس کی بنیاد ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن پر ہو اور ہم اخلاص، اخلاق، ایثار، انکسار، اعتماد، امید اور انصاف جیسی قدروں کو اپنا کر انسانیت کی آبیاری کرتے رہیں۔ روحانیت چونکہ ایک عملی حقیقت ہے اس لیے ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم بے ایمانی کے خلاف ایمان، نفرت کے خلاف محبت، بدی کے خلاف نیکی، جھوٹ کے خلاف سچ اور بدامنی کے خلاف امن کا ساتھ دیں، جہالت کے اندھیروں میں علم کا نور پھیلائیں، غلاظت کی جگہ نفاست پیدا کریں اور ہر طرح کی لُوٹ مار، ظلم و ستم، تشدد اور زیادتی کے خلاف مفلسوں، محکوموں، محروموں، مظلوموں، مجبوروں اور محروموں کی جانی، مالی اور اخلاقی مدد کریں۔

ایسی زندگی کا خواب تو بہت لوگ دیکھتے ہیں لیکن راستے کی مشکلات سے گھبرا کر اس خواب کی تعبیر دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیتے ہیں۔ کبھی وسائل کی کمی بہانہ بن جاتی ہے اور کبھی خاندانی اور گھریلو ذمہ داریاں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں نہ بھی ہوں تو ہمت جواب دے جاتی ہے، ''بھئی یہ تو عظیم لوگوں کا کام ہے، ہم بے چارے دُنیا اور اُس کے نظام سے کہاں ٹکر لے سکتے ہیں''؟

لیکن آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ کبھی کبھی غریب و نادار لوگ بھی ایسے ایسے کارہائے نمایاں کر دکھاتے ہیں جن کی توفیق بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں کو بھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح کوئی کوئی ''سونے کا چمچہ مُنہ میں لے کر پیدا ہونے والا'' بھی ایسے مفید کام کر جاتا ہے جس سے ہزاروں بلکہ لاکھوں غریب بھی فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ بھید کی بات کیا ہے؟

بھید کی بات ہے، ایمان۔ اپنے مشن پر، اپنے مقصد کی اہمیت اور افادیت پر ایمان۔

ایمان سے کیا مراد ہے اور یہ حصولِ مقصد کے لیے کیا کردار ادا کرتا ہے؟

آیئے پہلے یہ دیکھیں کہ نئے ستارے کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات سمجھ میں آ گئی تو ہم پر ایمان کی طاقت کا راز بھی کھل جائے گا۔ یہ تو ہمیں پتا ہی ہے کہ مادے کے اندر روشنی اور قوت (Energy) موجود ہے۔ مادّے (Matter) کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے (ایٹم) کو توڑا جائے تو اس کے اندر سے لامحدود روشنی اور قوت نمودار ہو جاتی ہے۔ اب اگر مادّے میں روشنی موجود ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ روشنی اور مادّہ ایک دوسرے میں بدل سکتے ہیں۔

آسانی کے لیے یہ کہہ لیں کہ جس طرح پانی کو بھاپ یا بخارات میں اور بھاپ یا بخارات کو دوبارہ پانی میں بدلا جاسکتا ہے اسی طرح مادہ روشنی میں اور روشنی مادے میں بدل جاتی ہے۔ آئن سٹائن کے بعد ہر کوئی مانتا ہے کہ ہماری کائنات جامد نہیں اور یہ مسلسل پھیلتی چلی جارہی ہے۔ اس کے پھیلنے کا طریقہ کچھ یوں ہے کہ مختلف ستاروں سے روشنی کی جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کا راستہ کاٹتی یا اسے کراس (x) کرتی ہیں۔ وہ نقطہ جہاں یہ شعاعیں کراس کریں صد ہا ہزار صدیوں میں مادے کے ایک ذرّے میں بدل جاتا ہے۔ ذرہ ہوتے ہوتے ستارہ بن جاتا ہے اور اس کی روشنی آگے، اور آگے پھیلتی چلی جاتی ہے اور نئے سے نئے ستارے جنم دیتی رہتی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''۔

ایمان بھی اسی طرح کا ایک نقطہ ہے۔ جب ہماری گوناگوں صلاحیتوں کی شعاعیں ایک جگہ مرکوز ہو جاتی ہیں تو گویا وہاں بھی ایک ''ستارہ'' جنم لے لیتا ہے۔ لیکن ہمارے ایمان کا ستارہ صرف ہماری اپنی صلاحیتوں ہی سے فیضیاب نہیں ہوتا، ہمیں دوسرے انسانوں سے بھی مدد ملتی رہتی ہے۔ جس طرح ستاروں کی دنیا میں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں ستاروں سے پھوٹنے والی روشنی کی شعاعیں کسی ایک نقطے پر جمع ہو کر ایک نیا ستارہ پیدا کر دیتی ہیں، اسی طرح انسانی زندگی میں وہ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں انسان جو اپنی صلاحیتوں کو کسی نقطے یا مقصدِ حیات پر مرکوز نہیں کرتے ان کی صلاحیتوں سے پھوٹنے والی شعاعیں بھی صاحب ایمان انسان کے ''ستارے'' کا چارہ بن جاتی ہیں۔ ایک بڑا فلسفی، عالم، ادیب، شاعر، سائنس دان یا صوفی جب اپنی تمام تر صلاحیتوں کو ایک جگہ مرکوز کرتا ہے تو وہ بھی اپنے ماحول سے اسی طرح فیضیاب اور سیراب ہوتا ہے۔ اُس کے تمام چھوٹے موٹے ہمعصروں کے پاس جو تھوڑی بہت جمع پونجی ہوتی ہے سب اس کے پاس بطور نذرانہ پہنچ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کو اردو کے ایک قریب قریب گمنام لیکن منفرد شاعر، عظیم قریشی نے یوں بیان کیا تھا: یہاں پھول تھے اور وہاں پھول تھے، مگر چاند نے سب کے سب کھالیے۔

لیکن ایمان صرف توجہ مرکوز کرنے (Concentration) کا نام نہیں۔ ایمان کا سرچشمہ یہ یقین ہے کہ جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے ہمارا اُس کے ساتھ ذاتی تعلق ہے اور ہمیں اس بات پر پورا اعتماد ہے کہ وہ ہمارا مخالف یا دشمن نہیں اور اُس کی جانب سے ہماری طرف ہمیشہ رحمت ہی آتی ہے کیونکہ وہ ہمارے ساتھ ہمارے والدین سے بھی بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ اسی ایک یقین سے یہ امید جنم لیتی ہے کہ ہمارے مہربان خدا نے ہمارے اندر اپنی جو رُوح پھونک رکھی ہے اگر ہم اس روح کو اپنی جسمانی ضرورتوں، خواہشوں، جبلتوں، حواس، جذبات اور خیالات کا امام بنا کر زندگی گزاریں تو پھر ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی فطرت اور کائنات بھی ہماری مخالف اور دشمن نہیں بلکہ ہماری دوست اور خدمت گزار بن جاتی ہے۔ ہمارے جدِ امجد، آدمؑ کے سامنے فرشتوں کو جھکا کر خدا نے اسے یہی بتایا تھا کہ فطری قوانین (Natural Laws) اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بلکہ مددگار و معاون ہیں بس شرط یہ ہے کہ آدمؑ اور اولادِ آدم خدا کے سامنے جھکی رہے۔

جب بھی کوئی انسان...... وہ غریب ہو یا امیر، کمزور ہو یا طاقتور اپنی ذات میں ایک مہربان خدا اور ایک ہمدرد

Marfat.com

کائنات پر ایمان کو سمو کر اپنی صلاحیتوں کو کسی ایسے مقصد یا مشن پر مرکوز کرتا ہے جو صرف اس کی اپنی ذات کے فائدے تک محدود نہ ہو بلکہ دوسروں (اور ہو سکے تو ساری انسانیت) کے فائدے تک پھیلا ہُوا ہو تو نہ صرف خدا اور فطرت اس کی پوری پوری مدد کرتے ہیں بلکہ اس کے اردگرد کے اُن ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی صلاحیتوں کا زور بھی اس کے مقصد کے پیچھے آ کھڑا ہوتا ہے جو ایمان اور مقصدِ حیات سے محروم ہوتے ہیں۔

ایمان محض ایک تصور نہیں، ایک عظیم اور حقیقی عمل ہے۔ ایمان کی حقیقت وہ تعلق ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ انسان بعض اوقات اس تعلق کو بھلا بیٹھتا ہے۔ کسی صاحب ایمان شخص اور کسی ایمان سے محروم شخص کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ صاحب ایمان شخص خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے اور جس طرح ایک بچہ اپنی ماں اور اپنے باپ سے ہمیشہ نیک امید رکھتا ہے اسی طرح صاحب ایمان شخص خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہوتا (لا تقنطوا من رحمۃ اللہ) اور خدا پر اس کا اعتماد کبھی کمزور نہیں پڑتا۔ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا اس سے محبت کرتا ہے اور وہ اس کی حفاظت بھی کرے گا، نشوونما بھی اور ربوبیت بھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا، ''اگر تم میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان ہو اور تم پہاڑ سے کہو کہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو وہ ہٹ جائے گا''۔

امید کے علاوہ خدا پر ایمان کا دوسرا اہم ترین حاصل ''آزادی'' ہے جب انسان لا الٰہ الا اللہ پر صدقِ دل سے ایمان لے آتا ہے اور خدا کو سب سے بڑھ کر محبت کرنے والی ہستی کے طور پر پہچان لیتا ہے تو پھر وہ دُنیا کی کسی منفی، غلط یا باطل قوت یا فرد کے سامنے جھکنے کی مجبوری سے آزاد ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سچے خدا کے سامنے اس کا ایک سجدہ اسے ہزارہا جھوٹے خداؤں کے سامنے ہزارہا بار سجدہ ریز ہونے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

روحانیت اور اعتماد

روحانی طور پر بیدار لوگ خدا، اس کی بنائی ہوئی کائنات، اپنی دنیا، اپنی زندگی اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی انسانیت کو اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتے ہیں۔ جب ہم ان حقیقتوں کے بارے میں یہ اعتماد رکھیں کہ وہ بنیادی طور پر ہماری بھلائی اور بہتری چاہتی ہیں تو اگر ان کی طرف سے وقتی طور پر ہمیں رنج، تکلیف یا نقصان بھی پہنچ جائے تو انجام کار اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اگر مسلمان ہوتے ہوئے ہم اس بات پر ایمان رکھیں کہ خدا محبت، خیر، صداقت اور امن کی انتہا ہے، رسولِ خدا کی نبوت موجودہ اور آئندہ، تمام وقتوں اور قوموں تک رحمت کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے اور اس وجہ سے خود خدا کی رحمانی، رحیمی اور کریمی صفات ہی برسرِ عمل ہیں، تو ہمارے اندر ایک عجیب اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم ناامیدی کے اندھیروں سے نکل کر اُمید کے اجالوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں خدا نے ہماری ہر نیکی کو ایک ایسا دانہ قرار دیا ہے جسے بو دیا جائے تو اس سے سات شاخوں والا

Marfat.com

پودا پھوٹتا ہے جس کی ہر شاخ پر ایک بالی ہوتی ہے اور ہر بالی میں ایک سو دانے ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں یہ بھی یاد ہو کہ خدا ہماری ہر بھلائی کا سات سو گنا اجر دیتا ہے تو پھر ہم میں سے ہر کوئی ایک دوسرے سے بڑھ کر نیکی کرنے کی کوشش کرے گا اور ہماری ہر نیکی ایک سرمایہ کاری (Investment) بن جائے گی۔ ماہرینِ اقتصادیات اور اہلِ تجارت تو جانتے ہیں کہ جب سرمایہ لگانے سے فائدے کی امید ہو تو بازار چڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ اعتماد لوگوں اور حکومتوں کو نئے سے نئے شعبۂ زندگی میں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اسی طرح جب انسان دوسرے انسانوں کو بنیادی طور پر اچھا سمجھتا ہے تو اس اعتماد سے معاشرے میں بھی اچھائی پیدا ہونے لگتی ہے۔ لوگ چوری چکاری، ڈاکا زنی، دھوکا دہی کے خوف سے نجات پا کر ایک تو اپنی بچتوں (Savings) کو سرمایہ کاری میں بدلنے لگتے ہیں اور دوسرے یہ راز کھل جاتا ہے کہ انفرادی ترقی کے بجائے اجتماعی ترقی سے افراد کو جو فائدہ پہنچتا ہے اس سے نہ تو احساسِ گناہ پیدا ہوتا ہے اور نہ احساسِ جرم۔ گویا خود غرضانہ مفاد پرستی (Vested Interest) کے مقابلے میں اپنا اور سب کا مفاد (Enlightened Self Interest) کہیں بہتر اور فائدہ بخش ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ تھوڑی مزید وضاحت مناسب ہوگی۔ ایک مثال: اگر آپ مکمل طور پر خود غرض اور مفاد پرست ہیں تو کسی مشکل یا مصیبت پیش آجانے پر صرف آپ کی اکیلی جان ہوگی جو اس مشکل یا مصیبت سے نبٹنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ اپنے مفاد کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مفاد کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے تو مشکل یا مصیبت درپیش آنے پر صرف آپ ہی نہیں، دوسرے بھی آپ کے ساتھ مل کر کوشش کریں گے کہ وہ خوش اسلوبی اور کامیابی سے نبٹ جائے۔ یہ اصول اسلام کے اقتصادی فلسفے کی جان ہے اور اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔

یہ اصول عملی سطح پر کوآپریشن (Cooperation) یا امدادِ باہمی کے اداروں میں کامیابی سے برتا گیا ہے۔ روس میں زرعی کوآپریٹوز زیادہ کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ لیکن چین میں ''کمیون'' اور اسرائیل میں ''کبوز'' کے نام سے امدادِ باہمی کے جو ادارے بنائے گئے انھوں نے ان ملکوں کی زرعی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ روس میں ان اداروں کی ناکامی کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو کوآپریٹوز کا سائز بہت ہی بڑا تھا جس سے رُکن افراد اپنا تشخص کھو بیٹھتے تھے۔ دوسرے روس میں نوکر شاہی (Bureaucracy) کی جکڑ بندی بہت سخت تھی جس سے رُکن افراد آزادانہ رائے نہیں دے سکتے تھے۔ آج بھارت میں کوآپریٹوز نے ایک زرعی معجزہ کر دکھایا ہے۔ بھارتی پنجاب جو ہمارے پنجاب سے کہیں چھوٹا ہے، بھارت کے سو کروڑ انسانوں کی ضرورت سے زائد زرعی اجناس پیدا کر رہا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کے دو بڑے صوبے پنجاب اور سندھ، زمین اور نہری پانی، دونوں زیادہ ہونے کے باوجود، پندرہ کروڑ انسانوں کی زرعی ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ کبھی ہم گندم درآمد کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی چینی۔ وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ بھارت نے زرعی اصلاحات کے ذریعے جاگیرداری نظام بالکل ختم کر کے زمین کے چھوٹے مالکوں کو امدادِ باہمی کے درمیانے سائز کے اداروں میں منظم کر دیا ہے۔ اِدھر پاکستان میں امدادِ باہمی صرف برائے نام ہے۔

Marfat.com

ذاتی مفاد کے ساتھ ساتھ دوسروں کا مفاد پیشِ نظر رکھنے سے ہمیں جو فائدہ پہنچتا ہے وہ صرف اپنا مفاد پیشِ نظر رکھنے کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے، یہ حقیقت اب علمی سطح پر بھی ثابت ہوگئی ہے۔ 1954ء میں پروفیسر جان ناش (John Nash) کو ان کی گیم تھیوری (Game Theory) پر حساب (Mathematics) کے شعبے میں نوبل پرائز ملا تھا۔ پروفیسر ناش نے حسابی طور پر ثابت کر دکھایا تھا کہ "میں" کے مقابلے میں "ہم" کے انداز سے سوچنے میں صرف دوسروں کا نہیں خود ہمارا ذاتی مفاد بھی زیادہ بہتر طور پر پورا ہوسکتا ہے۔ انھوں نے عظیم اقتصادیات دان، ایڈم سمتھ (Adam Smith) کو غلط قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ ذاتی مفاد (Self Interest) کے مقابلے میں ایسا اجتماعی مفاد جس میں ہمارا ذاتی مفاد بھی پورا ہوتا ہو اور اجتماعی ضرورتوں کا بھی پورا پورا دھیان رکھا جائے (Enlightened Self Interest) بالآخر ہمارے لیے ذاتی طور پر بھی کہیں زیادہ فائدہ بخش ہوتا ہے۔ ابھی چند سال پہلے پروفیسر ناش کے بارے میں "ایک خوبصورت ذہن" (A Beautiful Mind) کے نام سے ایک خوبصورت فلم بھی بنی ہے۔ جس میں وہ کبوتروں کے رویے کا گہرا مطالعہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

امدادِ باہمی ہو یا مفادِ باہمی، ان دونوں کی کامیابی کا صرف ایک بات پر انحصار ہے اور وہ ہے اعتماد۔ گویا امدادِ باہمی ہو یا مفادِ باہمی، دونوں صرف اور صرف اعتمادِ باہمی سے کامیاب ہوسکتے ہیں۔ جب تک امدادِ باہمی اور مفادِ باہمی میں ہر رُکن کو ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو، وہ دل و جان سے اس کی کامیابی کے لیے کام ہی نہیں کرسکتا۔ پروفیسر ناش کی یہ بات حسابی سطح پر تو درست ثابت ہوگئی تھی۔ لیکن اب معاشرتی فلسفی (Social Philosophers) بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک کسی معاشرے کے افراد کے درمیان اعتماد نہیں ہوگا وہ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی طور پر ترقی ہی نہیں کرسکتا۔ وہ یہ بھی واضح کر رہے ہیں کہ اعتماد اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جب معاشرے کے ارکان اخلاقی قدروں کا پاس کریں...... سچ بولیں، پورا تولیں، وقت کی پابندی کریں، وعدہ خلافی نہ کریں، دھوکا دہی سے باز آجائیں، جھوٹی قسمیں نہ کھائیں، خوراک میں آمیزش نہ کریں، دوائی بنائیں تو اجزاء صحیح بھی ہوں اور پورے بھی، برآمدات میں جو نمونہ دکھائیں سارا مال بھی اسی کے مطابق ہو، قیمت بتا کر کے گاہک پھنسالیں تو معیار کم نہ کریں۔ قرآنِ حکیم میں دیانتداری سے پورا تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو (55:9) کا جامع حکم ان تمام اخلاقی قدروں پر محیط ہے۔

عالمِ اسلام کے 57 ملکوں پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ہمارے معاشرے مردہ کیوں ہوگئے ہیں تو یہی راز کھلے گا کہ ہم نے اخلاقی قدروں کو ترک کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں، خصوصاً مارٹن لُوتھر (Martin Luther) کی تحریکِ اصلاحِ دین (Reformation) کے بعد جہاں بھی پاپائیت سے فراغت حاصل کرلی گئی وہاں معاشرتی اور کاروباری زندگی میں اخلاقی قدروں پر خصوصی زور دیا گیا اور کاروبار کے لازمے کے طور پر کاروباری اخلاقیات (Business Ethics) کی اہمیت اور معنویت کو واضح کیا گیا۔ کاروباری اخلاقیات ہی نے امریکہ اور یورپی ممالک، خصوصاً جرمنی اور انگلستان میں اعلیٰ صنعتی معیار قائم کیے اور اسی وجہ سے ان کے

صنعتی اداروں کی ساکھ (نیک نامی) کی دھوم مچی۔ بعد میں ایک ایشیائی ملک، جاپان نے بھی نقالی سے آگے بڑھ کر اپنی صنعتی پیداوار کا معیار بلند کرلیا اور اپنی ساکھ قائم کرلی۔ اب چین اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے جبکہ امریکہ کے کئی بڑے بڑے کاروباری اور صنعتی اداروں کے کرتا دھرتا بدعنوانی کے الزام میں بدنامی اور ناکامی سے دوچار ہو چکے ہیں۔

کیا مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا فلسفہ یا اصول نہیں تھا جو انھیں معاشی اور معاشرتی ترقی میں مدد دیتا؟ ہم ابھی ابھی سورہ الرحمٰن کی ''پورا تولنے اور ڈنڈی نہ مارنے'' والی آیت کا حوالہ دیکھ چکے ہیں۔ لیکن جو ایک بات مسلمانوں کو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے راستے سے بھٹکنے کی کبھی اجازت نہ دے سکتی تھی اس پر مسلمانوں نے شاید آج تک غور ہی نہیں کیا۔ اوّل تو وہ قرآن پڑھتے ہی نہیں، پڑھیں بھی تو اس پر غور نہیں کرتے۔ ورنہ قصۂ آدم ہی میں خدا نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ ریز کر کے واضح کر دیا تھا کہ اگر اولادِ آدم روحانی اور اخلاقی قدروں کو اپنالے تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی خدمت پر مامور ہو جائیں گی، انسان کو بس ایک راندۂ درگاہِ ہستی، شیطان سے بچنا چاہیے جو ایمان کی جگہ بے ایمانی، محبت کی جگہ نفرت، خیر کی جگہ شر، صداقت کی جگہ جھوٹ اور امن کی جگہ بدامنی کی راہ دکھاتا ہے۔ اگر آج بھی مسلمان خدا کے اس ارشاد کی بناء پر کہ انسان کو بہترین صلاحیتیں (احسنِ تقویم) دے کر پیدا کیا گیا ہے، پہلے خدا پر، پھر اپنے اوپر اور پھر ایک دوسرے پر اعتماد پیدا کرلیں اور ساتھ ہی ایمان کی حد تک یقین کرلیں کہ خدا کی بنائی ہوئی یہ ساری کائنات ان کی ہمدرد اور معاون ہے اور ان پر اپنے تمام خزانوں کے دروازے کھولنے پر تیار ہے، تو قوموں کی امامت کا فریضہ اور اعزاز انھی کو حاصل ہو جائے گا۔

بھید کی بات کیا ہے؟

بھید کی بات یہ ہے کہ کائنات تو مسلمانوں کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہے بشرطیکہ وہ بھی خدا کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔

آیئے، ہم میں سے ہر کوئی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ کیا ہم واقعی خدا کے سامنے جھکے ہوئے ہیں؟ یاد رہے کہ خدا کے سامنے جھکنے کا مطلب صرف نماز میں رکوع و سجود کرنا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارا ہر قول و فعل روحانی اور اخلاقی قدروں کے مطابق ہو۔ نماز پڑھنے ''لیکن ضرورت مندوں تک ضرورت کی چیزیں نہ پہنچانے والوں'' کو خدا نے سورہ الماعون میں ''فَوَیلٌ لِلمُصَلِّین'' کہہ کر تباہی کی ''نوید'' سنائی ہے۔ اور یہ تباہی آج پورے عالمِ اسلام پر برس رہی ہے۔ اگر ہم آج بھی محبت، ایثار، انکسار، رحمدلی، درگزر، عدل اور احسان جیسی روحانی اور اخلاقی قدریں اپنالیں اور ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے حق میں اور بے ایمانی، نفرت، بدی، جھوٹ اور بدامنی کے خلاف جہاد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اس جہاد کا پہلا ہدف (Target) اپنے آپ کو بنائیں تو ہم پر تباہی کے بجائے سلامتی برسنے لگے گی۔ افسوس، ہمیں نہ تو اپنے آپ پر اعتماد ہے، نہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات پر اور نہ ہی خدا پر۔

دورِ حاضر کے اکثر قابلِ ذکر معاشرتی مفکر اعتماد (Trust) کو معاشرتی سرمایہ (Social Capital) قرار

Marfat.com

دے رہے ہیں۔ جس طرح اقتصادی ترقی کے لیے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح معاشرتی ترقی کے لیے معاشرتی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ مسلمانوں کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ شیطان کا کہا مان کر اور بداعتمادی کو زادِ راہ بنا کر "ترقی کا سفر" کریں اور بالآخر آج کی طرح ہمیشہ کے لیے زندگی کے ہر میدان میں ناکام ہو جائیں، یا اپنی مثبت صلاحیتوں پر، ایک دوسرے کی اچھائی پر، ایک ہمدرد اور معاون کائنات پر اور سب سے بڑھ کر رحمان و رحیم خدا پر اعتماد کر کے ترقی کے سفر پر نکلیں۔ اگر وہ اس دوسرے راستے پر چل نکلے تو نہ صرف اپنے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، علمی، ثقافتی اور تہذیبی زوال کو عروج میں بدل دیں گے بلکہ اقوامِ عالم کی رہنمائی کا شرف بھی حاصل کر لیں گے۔

مسرت، گناہ اور معافی

وقت جسم کے زخم تو بھر دیتا ہے لیکن دل کے زخم نہیں بھرتا۔ اوپر اوپر سے بھر بھی جائیں تو شکست، بدنامی اور بے عزتی کے زخم اندر ہی اندر ہماری جان کھاتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہم انھیں اوروں ہی سے نہیں، خود اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ در پردہ زخم ہمارے اندر طرح طرح کے منفی رویے اور نفسیاتی بیماریاں پیدا کر دیتے ہیں۔

دشمن اور مخالف تو ایک طرف رہے، ہم ان زخموں کے باعث اپنے آپ سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اپنی شکل و صورت سے لے کر اپنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالت تک، ہمیں سب کچھ بُرا لگنے لگتا ہے۔ بچپن میں بھائی بہنوں اور ماں باپ کی کہی ہوئی کچھ باتیں جو اوپر اوپر سے بھول گئی ہوتی ہیں، اندر ہی اندر ہمارے دل پر کچوکے اور چرکے لگاتی رہتی ہیں۔ مخالفوں، حریفوں اور رقیبوں نے ہماری کردار کشی کرتے ہوئے جو ذلت آمیز الفاظ اور جملے کہے ہوتے ہیں وہ ہمیں رہ رہ کر یاد آتے رہتے ہیں اور ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے مقام و مرتبہ میں کمی کرنے کی خاطر ہمارے خلاف کیا کیا سازشیں اور ناانصافیاں ہوئیں، ہم ان پر تلملاتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں، ہم جن سے محبت کرتے ہیں اُن کی عدم دلچسپی اور بے وفائی ہمیں تڑپاتی رہتی ہے۔ جس اولاد کو چوم چاٹ کر پالا ہوتا ہے، اس کی ناز یبا حرکتوں اور بدتمیزیوں سے اور جس خاوند یا بیوی نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہوتی ہیں، اس کے دِل شکن طعنوں اور شکایتوں سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہوتا رہتا ہے۔ نتیجہ: ہم اپنی زندگی سے بیزار اور خدا سے ناخوش ہو جاتے ہیں۔

یہ کیفیت صرف بے مذہب یا لادین لوگوں تک محدود نہیں ہوتی، اچھے بھلے دیندار، نمازی اور پرہیز گار لوگ بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اولاد کے علاوہ ہر کسی کو نیکی کی تلقین کرنے والے لوگ جب خود ناخوشی کے اس رویے کا نمونہ بنے ہوں تو ان کی تلقین سے ہر کوئی یہی سبق حاصل کرتا ہے کہ نیکی سے ناخوشی پیدا ہوتی ہے۔ اوّل تو خوشی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے چنانچہ زیادہ تر لوگ اس تلقین کو ایک کان سے سنتے اور دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کچھ اسے سُن کر پلے باندھ ہی لیں تو وہ کوشش کرتے ہیں کہ نیک تو بن جائیں لیکن خوش نہ ہوں اور اگر خوش ہوں بھی تو

Marfat.com

خوش نظر ہرگز نہ آئیں۔

ہم میں سے قریب قریب ہر کوئی یا تو دُنیا کی بُرائی کر رہا ہوتا ہے یا اپنے ملک، اپنے ہموطنوں، اپنے معاشرے، اپنے خاندان یا اہلِ خانہ کو تنقید کا نشانہ بنائے ہوتا ہے۔ زیادہ پڑھے لکھے لوگ دُنیا میں جاری سیاسی اور معاشی نظاموں کو ہر برائی کا سرچشمہ قرار دیتے سنائی دیتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی سیانے لوگ زلزلوں، سنامیوں، وباؤں اور قحطوں کے ہاتھوں لاکھوں بے گناہوں کی موت پر ایک مہربان اور شفیق خدا کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جب بے کس و بے سہارا خلقِ خدا کو ظالم اور طاقتور لوگ قتل و غارت، لوٹ مار اور بے حرمتی کا نشانہ بناتے ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ نہیں روکتا تو یہ لوگ انسانیت کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی بنیادی صفت اچھائی نہیں، برائی ہے۔ اسی طرزِ فکر نے دُنیا کے سب سے بڑے مذہب، مسیحیت کو ''ازلی گناہ'' کا دردناک اور مسرت دشمن تصور اپنانے کی راہ دکھائی تھی۔

بے شک آدم اور حوا نے خدا کی نافرمانی کر کے گناہ کیا۔ لیکن ان دونوں نے اپنے گناہ سے توبہ کر لی اور خدا نے ان کی توبہ قبول کر کے انھیں معاف کر دیا۔ اس معافی کا ثبوت یہ ہے کہ خدا نے اولادِ آدم کو اتنی برکت دی کہ آج دنیا اس سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ آدم اور حوا کی نافرمانی سے پہلے ابلیس نے بھی ایک نافرمانی کی تھی۔ لیکن اُسے توبہ کرنے کی توفیق نہ ہوئی اور وہ آج تک راندۂ درگاہِ خداوندی ہے۔

مسلمانوں پر خدا نے خصوصی کرم فرمایا اور انھیں بتایا کہ ہم نے انسان کو گناہ سے پاک اور بہترین صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے اور اگر اس سے کوئی گناہ، جرم، غلطی یا خطا سرزد ہو جائے تو ہم نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور جو شخص سچے دل سے اپنی کوتاہی کا اقرار کر لے اور وعدہ کرے کہ اس کوتاہی کی تکرار نہیں کرے گا تو ہم اُسے معاف کر دیں گے۔ زبانی کلامی نہیں، دل سے اور عملی طور پر توبہ کرنے سے انسان ایک مرتبہ پھر اُسی طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے وقت پاک تھا۔

افسوس کہ انسانی معاشرہ ہی نہیں خود توبہ کرنے والا انسان، دونوں ہی گناہ گار، مجرم، غلط کار اور خطاوار کو معاف نہیں کرتے۔ اصولاً جس طرح خدا کسی گناہ گار کی مخلصانہ توبہ قبول کرے تو وہ از سرِ نو پاک ہو جاتا ہے اسی طرح جب معاشرہ کسی مجرم کو سزا دے لے تو اس شخص کو جرم کرنے سے پہلے کی طرح بے خطا سمجھنا چاہیے۔ لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ معاشرہ توبہ کر لینے والے گناہ گار اور سزا کاٹ لینے والے مجرم کو معاف نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ لوگوں کی نظر سے گر جانے والے فرد کو معاشرہ بہت ہی کم معاف کرتا ہے۔ مثال: ایک قاتل کو قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ وہ قید کے دوران دل سے توبہ کرتا ہے کہ میں آئندہ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ خدا سے یہاں تک وعدہ کرتا ہے کہ میں مقتول کے لواحقین سے بھی معافی مانگ کر ان کی حسبِ توفیق خدمت کروں گا۔ مگر جب وہ عمر قید کاٹ کر رہا ہوتا ہے تو موقع کی تاک میں بیٹھے مقتول کے لواحقین اُسے قتل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کسی ایسے شخص کو جس نے شدید مجبوری کی حالت میں، محض اپنی یا اپنی اولاد کی جان بچانے کی خاطر چوری کر لی ہو، سزا کاٹنے

Marfat.com

کے باوجود چور ہی سمجھتا ہے۔اس صورت حال کی بہترین عکاسی فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو(Victor Hugo) نے اپنے یادگار ناول ''بیچارے لوگ'' (Les Miserables) میں کی ہے جس کے ہیرو نے بھوک کے ہاتھوں تنگ آ کر ایک ڈبل روٹی چرائی تھی لیکن سزا بھگتنے کے باوجود اور دنیا بھر کی ہر نیکی کرنے کے بعد بھی اُسے چور ہی سمجھا جاتا رہا۔

معاشرے کو چھوڑیے، انسان کے لیے اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں، اولاد، بیوی یا خاوند، عزیزوں اور دوستوں کو بھی معاف کرنا یا ان سے معافی چاہنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔کچھ مذہبی لوگ یہ سوچ کر دوسروں کو ان کی زیادتیوں پر معاف کر دیتے ہیں کہ خدا نے کہہ رکھا ہے،''اگر تم چاہتے ہو کہ ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں تو تم بھی ان لوگوں کو معاف کر دو جنھوں نے تمھارے ساتھ زیادتیاں کی ہیں''۔وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ زیادتی کرنے والوں سے ان کی زیادتی کا بدلہ نہیں لیتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے معاف کرنے کا حق ادا کر دیا۔یقیناً یہ معافی بھی بدلہ لینے کے مقابلے میں بہت قابلِ قدر ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اب یہ لوگ دوسروں کی زیادتی کا بدلہ اپنے آپ لیتے رہتے ہیں۔وہ دوسروں کی غلطی پر انھیں تو سزا نہیں دیتے لیکن دل ہی دل میں غصہ کھا کھا کر اپنی جان جلاتے رہتے ہیں۔بظاہر وہ بڑے بردبار ہوتے اور کہلاتے ہیں کیونکہ وہ غصہ پی گئے تھے۔لیکن وہ اندر ہی اندر غصے سے کھولتے رہتے ہیں۔یہ مذہبیت تو ہے، روحانیت نہیں۔روحانیت کا تقاضا ہے کہ آپ دوسروں کی غلطیوں کی سزا اپنے آپ کو بھی نہ دیں۔آپ خود بھی تو ایک انسان ہیں۔ایک تو دوسروں نے آپ سے زیادتی کی اور اب آپ خود اپنے ساتھ یہ زیادتی کر رہے ہیں کہ ان کے کیے کی سزا خود کو دے رہے ہیں۔یہ کہاں کی روحانیت ہے؟ یہ تو انسانیت بھی نہیں کہ آپ خطا کار کو تو معاف کر دیں اور بے خطا کو سزا دینے لگیں۔

روحانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح ہم خدا سے توقع رکھتے ہیں کہ ہمیں معاف کرنے کے بعد اپنے دل میں ہمارے خلاف بغض نہ رکھے اسی طرح ہم دوسروں کو معاف کرنے کے بعد اُن کے لیے کوئی بغض نہ رکھیں اور جہاں انھیں کوئی سزا نہ دیں وہاں ان کے حصے کی سزا اپنے آپ کو بھی نہ دیں۔یہ حقیقت ہے کہ انسان، خصوصاً ایک حساس انسان، کے لیے اپنے آپ کو معاف کرنا بہت مشکل کام ہے، خصوصاً جب اس نے خود گناہ، جرم، خرابی یا خطا کی ہو۔لیکن یہ مشکل خدا کو رحمان الرحیم، غفار الذنوب، اور ستار العیوب سمجھ کر، مخلصانہ توبہ کر کے اور آئندہ اس کوتاہی کو دہرانے سے پرہیز کر کے آسان بنائی جا سکتی ہے۔اہم بات یہ ہے کہ سچی اور پکی توبہ کر لینے کے بعد جہاں ہمیں وہ غلط کام دوبارہ نہیں کرنا چاہیے وہاں اس غلط کام پر ہر وقت اپنے آپ کو ملامت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ہمارے عہد کے عظیم صوفی جناب واصف علی واصفؔ ''تلقین فرماتے تھے کہ ''کسی گناہ پر مخلصانہ توبہ کے بعد اس پر بار بار خدا سے معافی مانگتے رہنے سے ہم اپنے وجود کو اس گناہ سے پاک نہیں ہونے دیتے کیونکہ جب تک یہ گناہ ہماری یادداشت میں رہتا ہے، ہماری جان نہیں چھوڑتا''۔

وہ تمام لوگ جو دل سے چاہتے ہیں کہ برائیوں سے اٹی ہوئی یہ دُنیا پاک ہو جائے، انھیں اس اہم اور نیک

Marfat.com

مقصد کے حصول کے لیے آغاز اپنے آپ سے کرنا چاہیے۔ دل میں چھپی ہوئی نفرت اور غصے سے، ان کا ہدف دوسرے ہو یا خود آپ، دنیا کو نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا شرف ہے جو پہلے اپنے وجود کو نفرت، غصے اور ہر منفی جذبے سے پاک کرتے ہیں اور پھر اپنے ماحول، معاشرے اور انسانیت کو بدلنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بیج ہی کو نفرت اور غصے کے کیڑے کھا رہے ہوں تو اس سے اچھی فصل کیا خاک پیدا ہو گی؟

چلتے چلتے: (1) ایمان اور نفرت کی دو تلواریں آپ کے دل کے نیام میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔

(2) ذرا سوچیے، اگر آپ گناہ گار، مجرم یا قصوروار شخص کی جگہ ہوتے تو کیا غالباً وہی کچھ نہ کرتے جو اس نے کیا تھا۔ یہ سوچ اکثر و بیشتر دوسروں کو معاف کر دینے میں آسانی پیدا کر دیتی ہے۔

ہمّت و حوصلہ، جہاد اور اِجتہاد

اگر چہ فارسی زبان سے اب ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی بیگانہ ہو گئے ہیں لیکن یہ محاورہ ابھی تک ہمارے یہاں خاصا عام ہے: ہمّتِ مرداں، مددِ خدا۔ ہمت کی حد تک تو اکثر چور، ڈاکو، اور منشیات سمگل کرنے والے بھی مہم پر نکلتے ہوئے خدا ہی سے کامیابی کی مدد مانگ رہے ہوتے ہیں۔ پھر انسان دوست اور انسانیت پرور کاموں اور منصوبوں کو شروع کرتے ہوئے خدا سے یہ امید کیوں نہ رکھی جائے کہ وہ ہماری مدد کرے گا۔ یہ امید اس وقت اور بھی مضبوط اور مؤثر ہو جاتی ہے جب ہمیں اس حقیقت پر ایمان ہو کہ خدا اور اس کی بنائی ہوئی یہ کائنات، اس کائنات میں جاری و ساری فطری قوتیں اور اصول، اور اتنی بڑی کائنات میں یہ ہماری پیاری زمین.....سب منتظر بیٹھے ہیں کہ کب ہم کسی بھلے کام کے لیے کمرِ ہمّت باندھیں اور وہ ہماری توقعات سے بھی بڑھ کر ہماری مدد کریں۔

جس انسان کو ایمان کی حد تک یقین ہو کہ:

(1) خدا اچھا ہے، اچھائی کو پسند کرتا ہے، اور اچھے لوگوں کی مدد کرتا ہے۔

(2) کائنات اچھی ہے، اچھائی کو پسند کرتی ہے، اور اچھے لوگوں کی مدد کرتی ہے۔

(3) یہ دنیا اچھے خدا کی تخلیق اور اچھی کائنات کا حصہ ہے اور وہ بھی اچھی ہے اور اچھائی کے لیے میدان میں آنے والوں کی مدد کرتی ہے تو اُسے خواہ مخواہ اچھے کاموں اور منصوبوں کے لیے ہمت و حوصلہ مل جاتا ہے۔

پاکستان میں عبدالستار ایدھی نے بے یار و مددگار ''زندہ لاشوں'' کی دیکھ بھال اور بے گور و کفن ''لاوارث لاشوں'' کی تدفین کر کے جو مقام حاصل کیا ہے وہ اس ایمان اور اس کے مطابق میدانِ عمل میں کود پڑنے کی ہمت کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ ایدھی صاحب کے اپنے پلّے کیا تھا؟ نہ روپیہ پیسہ، نہ جائیداد، نہ جاگیر، نہ تعلیم، نہ تقدس۔ بس انھیں اپنے بے غرضانہ مشن کی ضرورت اور افادیت پر یقین تھا اور وہ اچھے خدا (Good God) پر ایمان رکھتے تھے۔ بس

Marfat.com

یہی سمجھیے کہ ہمتِ مرداں مددِ خدا کہہ کر، بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔اس سادہ لوح اور سادہ دماغ لیکن روحانی طور پر بیدار شخص نے دورِ حاضر کے بڑے بڑے سیاستدانوں، علمائے دین اور پیرانِ کرام سے بڑھ کر دُکھی انسانیت کی اتنی قابلِ قدر خدمت کی ہے کہ وہ جیتے جی رحمۃ اللہ علیہ کہلانے کا حقدار ہو گیا ہے۔

بے شک اچھے کاموں کے لیے میدان میں آنے والوں کے راستے میں رکاوٹیں بھی آتی ہیں لیکن جو لوگ ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسی روحانی صلاحیتوں سے لیس ہو کر جدوجہد کرتے رہتے ہیں وہ بالآخر کامیاب ہو جاتے ہیں۔رکاوٹیں تو پیغمبروں کے راستے میں بھی آتی ہیں لیکن یہ رکاوٹیں نیک کاموں اور منصوبوں کی جڑ لگانے کا کام دیتی ہیں۔اچھے سے اچھا ترقی دادہ بیج، زمین کے اوپر رکھ دیا جائے تو وہ پھوٹ تو پڑتا ہے، جڑ نہیں پکڑتا۔ہم زمین میں ہل چلا کر بیج کو زمین کی سطح سے تھوڑا نیچے ڈالتے ہیں اور پھر زمین پر سُہاگہ پھیر کر اسے تھوڑا دبا کر بیج کے لیے ایک رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں۔کیوں؟ یہی رکاوٹ بیج کو جڑ پکڑنے میں مدد دیتی ہے۔پھوٹنے کے بعد بیج جوں جوں مٹی سے باہر روشنی کی طرف بڑھتا ہے، اس کی جڑ مٹی کے اندر دھنستی جاتی ہے۔اور جوں جوں اس کی جڑ مٹی میں دھنستی ہے وہ اوپر اٹھتے اٹھتے پہلے ایک ننھا سا پودا اور پھر ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔یہ وہی اصول ہے جس سے راکٹ اوپر اٹھتا ہے۔

''ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ'' اس کے لیے ہمت و حوصلہ کا ایک اہم ترین راستہ جہاد ہے۔عام طور پر جہاد کو قتال یا جنگ و جدل کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔بے شک جب جنگ ناگزیر ہو جائے تو روحانی طور پر زندہ و بیدار لوگ سر پر کفن باندھ کر اس میں حصہ لیتے ہیں بلکہ آخری وقت تک پیٹھ نہیں پھیرتے۔لیکن یہ جنگی جہاد ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے جسے انفرادی سطح پر نہیں، اجتماعی سطح ہی پر طے کرنا چاہیے۔کسی ریاست کے شہری ہوتے ہوئے اگر ہم سب اپنے اپنے طور پر یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں کہ ہتھیاروں کے ساتھ جہاد کرنے چل دیں تو ملک اور قوم میں فتنہ و فساد پیدا ہو جائے گا اور فتنے کو خدا نے کفر سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔

دنیا کا موجودہ سیاسی نظام قومی ریاستوں کے حوالے سے کام کر رہا ہے۔لیکن بعض اوقات یہ ریاستیں اتنی کمزور، نااہل یا بزدل ہوتی ہیں کہ اِن کے حساس باشندے انفرادی طور پر یا گروہی تنظیموں اور تحریکوں کے ارکان کی حیثیت سے اُن مقاصد کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو اُن کی قوم کے لیے تو بے حد اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کی حکومت اُن کے حصول کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا چاہتی یا کر پاتی۔اس طرح کی کوئی تحریک ایک ہی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ ''پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے''۔ورنہ اس کی جاں بازی و جاں نثاری کا صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس سے ''مسئلہ'' کسی نہ کسی حد تک زندہ رہ جاتا ہے۔کشمیر اور فلسطین میں ہزارہا بہادروں کی جانی قربانی سے اب تک یہی فائدہ ہُوا ہے۔لیکن اس فائدے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔کئی تحریکیں تاریک راہوں میں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔

اس طرح کی کسی تحریک کو بے شک تحریکِ آزادی کا نام دیا جائے لیکن آج کی دُنیا کے خود ساختہ تھانیدار، امریکہ نے اسے دہشت گردی (Terrorism) کا نام دے ڈالا ہے اور مسلمانوں کے کمزور، نااہل اور بزدل حکمرانوں

Marfat.com

نے یہ نام قبول کرلیا ہے۔ اگر یہ حکومتیں ایسا نہ بھی کرتیں تو ہم ان تحریکوں کو آزادی کی تحریکیں تو کہہ سکتے تھے، جہاد قرار نہیں دے سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی، اقتصادی، علمی، تکنیکی اور جنگی حالت نے انھیں جہاد کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ اوپر سے ان کی روحانی اور اخلاقی پستی بھی پاتال کو چھو رہی ہے۔ پھر ہتھیاروں کے ساتھ جہاد کا فیصلہ انفرادی نہیں، اجتماعی اور قومی سطح ہی پر کیا جاسکتا ہے۔

اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرنا تو ضروری ہے ہی لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ مسلمان پہلے اپنے خدا، اس کائنات، اس میں کارفرما اصولوں اور اپنی روح کے درمیان حائل پردوں کو چاک کریں۔ ہم خدا سے جتنے دور ہوتے ہیں اتنے ہی کمزور ہوتے ہیں، اتنے ہی بے علم ہوتے ہیں، اتنے ہی بے اخلاق ہوتے ہیں، اتنے ہی مایوس ہوتے ہیں اور اتنے ہی نامراد رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت جہاد کا نہیں، جہاد کی تیاری کا ہے۔

اس تیاری کے تین بڑے دائرے ہیں:

(1) امریکہ کی مرضی کی جمہوریت نہیں، اسلام کی سیاسی اور اقتصادی تعلیم کے مطابق وہ جمہوریت اپنائی جائے جس میں آزادی بھی ہو اور مساوات بھی۔ ہر انسان کو آزادانہ ووٹ کا حق بھی ہو اور عزت کی روٹی کا بھی۔

(2) علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر جدید ترین سائنسی، تکنیکی، انسانیاتی، حیاتیاتی اور ارضیاتی علوم حاصل کرنے کے لیے جان ماری جائے۔

(3) رب العالمین کے بندوں اور رحمۃ للعالمین کے پیروکاروں کے طور پر وحدتِ انسانی اور امن کے علمبردار بنایا جائے۔ یہاں تک کہ ہماری جنگ، جنگ برائے جنگ نہیں، جنگ برائے امن ہو۔

مندرجہ بالا تینوں کاموں کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان جہاد! جہاد!! کرتے اور کس مپرسی میں مرتے چلے جانے کے بجائے یہ سوچیں کہ آخر ہم نے کہاں کہاں اور کون کون سی غلطی کی جس نے ہمیں قوموں کی امامت سے اٹھا کر آج کے فرعونوں اور نمردوں کے تلوے چاٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔

ہم سے ایک ہی غلطی ہوئی ہے کہ ہم نے اجتہاد کو نظر انداز کر دیا۔

اجتہاد کیا ہے؟

ہم نے خدا کے احکامات اور رسولِ خدا کی سیرت کو ماضی کے ایک خوبصورت مقبرے کی شکل دے دی۔ ہم نے خدائی احکامات اور سیرتِ رسول کو بدلتے ہوئے زمانے میں پھیلتے ہوئے علم کی روشنی میں سمجھنے کے بجائے انھیں رسولِ خدا کی نبوت شروع ہونے والے سال (610ء) سے لے کر آپ کی وفات والے سال (632ء) تک محدود کر دیا۔ ہم نے اس حقیقت کو اپنے اور اپنے دین کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تو سمجھا کہ قرآنِ حکیم خدا کی آخری کتاب ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں اور یہ بھول گئے کہ اگر اب وحی کا پیغمبری سلسلہ بند ہو گیا ہے تو پھر انسانوں

Marfat.com

نے تا قیامت قرآنِ حکیم ہی سے ہدایت پانی ہے اور رسولِ خدا ہی کی سیرت پر اپنے اپنے زمانے میں عمل کرنا ہے۔ اس لیے ہر دور میں قرآنِ حکیم کو آئین قرار دے کر اس کی روشنی میں اور زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہمیں نئے قوانین بنانے ہوں گے اور دیکھنا ہوگا کہ اگر رسولِ خدا آج دنیا میں موجود ہوتے تو قرآنی احکامات پر کس انداز سے عمل کرتے۔

ہم نے بت بدلتے ہوئے زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کو کیا سمجھنا تھا، ہم نے تو اجتہاد کو ترک کرنے کے نتیجے میں اپنے ذہن ہی بند کر لیے، اپنے کان اور اپنی آنکھیں ہی بند کر لیں۔ یوں وہ مسلمان جو ستاروں پر کمند ڈالنے کی صلاحیت اور ہمت وحوصلہ رکھتے تھے ستاروں سے اپنی قسمت پوچھنے بیٹھ گئے۔ ہمیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ''ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا، وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں''۔ اور وہ زمانہ جس کی چال ڈھال پہچان کر ہم نے اسے اپنی سواری بنانا تھا وہ الٹا ہم پر سوار ہو گیا۔ اب ہمارے لیے سب سے آسان راستہ یہی رہ گیا کہ ہم اپنی ساری خرابیوں، ذلتوں اور رسوائیوں کا الزام زمانے پر ڈال دیں اور فتویٰ صادر کر دیں کہ بُرا زمانہ آ گیا ہے۔ اب ہمارے نزدیک وہ زمانہ بُرا ہو گیا جس کی صداقت، اہمیت اور طاقت کی خدا نے ''وَالعَصر'' کہہ کر قسم کھائی تھی۔ جہاد کے وقت بھی اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب ہم اجتہاد کو ترک کر کے جہاد کے قابل ہی نہ رہے تو صرف اجتہاد ہی ہے جسے زادِ راہ بنا کر ہم اپنی ملّی بے مقصدیت اور فکری انتشار پر قابو پا سکتے ہیں اور اپنی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی، ثقافتی، اخلاقی اور تہذیبی کمزوریوں کو دُور کر سکتے ہیں۔

مشکل کیا ہے؟

مشکل یہ ہے کہ ہم اوّل تو محض زبانی، ورنہ زیادہ سے زیادہ عقلی سطح پر ایک زندہ خدا کے قائل ہیں۔ لیکن روحانی طور پر مُردہ ہو جانے کے باعث ہم خدا کو عرصہ دراز ہُوا دفن کر چکے ہیں۔ مغرب میں نٹشے (Nietzsche) کا تراشا ہُوا یہ جملہ مشہورِ خاص وعام ہے کہ خدا مر چکا ہے (God is dead)۔ عجیب بات ہے کہ اسی مغرب میں اب روحانیت کا چرچا بھی بڑھ رہا ہے۔ رومیؒ اِس وقت یورپ اور امریکہ میں سب سے مقبول شاعر ہے۔ اب امریکہ اپنے مقاصد کی خاطر دنیائے اسلام میں ''دہشت گردی کے خاتمے'' کے نام سے جہاد کی مذمت اور تصوف کے پرچار پر خصوصی توجہ اور اچھی بھلی رقم خرچ کر رہا ہے۔ کارل مارکس نے مذہب کو عوام کے لیے افیون قرار دیا تھا۔ امریکہ ہمارے یہاں جس تصوف کو رائج کرنا چاہتا ہے وہ خانقاہیت (یا افیون) کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں اقبالؒ کی اس پکار کو کوئی دخل نہیں ہوگا کہ ''نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری'' یا ''نہ محتاجِ سُلطاں نہ مرعوبِ سلطاں، محبت ہے آزادی و بے نیازی''۔

جب تک ہم روحانیت کی سب سے بنیادی شرط پوری نہیں کرتے، ہم نہ جہاد کر سکتے ہیں اور نہ اجتہاد۔ وہ بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم خدا کو خدائے زندہ تسلیم کریں، اس کے کلام کو زندہ کلام سمجھیں، اور محمدؐ رسول اللہ کی نبوّت کو زندہ نبوّت قرار دیں۔ چونکہ خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے اس لیے پہلے تو ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہم زندہ ہیں۔ ویسے دیکھنے

Marfat.com

میں تو زندہ ہی ہیں؛ ایک لکھ رہا ہے، دوسرا پڑھ رہا ہے۔ لیکن غالباً ہم صرف جسمانی طور پر زندہ ہیں۔ شاید ہمارا دماغ بھی کچھ کام کر رہا ہے لیکن دل البتہ خواہشوں اور ارمانوں کے ہجوم میں کچلا جا چکا ہے۔ اور روح؟ کیا جسم، دل اور دماغ کے علاوہ ہم میں رُوح نام کی کوئی چیز بھی ہوتی ہے؟ اِن دنوں نظر تو نہیں آتی!

ہماری حالت تو ارنسٹ رینان (Ernest Renan) کے الفاظ میں اس مشکوک دین دار کی ہے جو یہ دُعا مانگ رہا ہوتا ہے، ''یا خدا...... اگر خدا ہے تو، میری رُوح بچا لے...... اگر رُوح ہوتی ہے تو۔ آمین''۔ اگر ہم حقیقتاً خدا کو زندہ محسوس کریں اور حاضر و ناظر جانیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُس کے احکامات اور ہدایات کو گزرے ہوئے کل کے حالات سے مخصوص سمجھ کر آج کے حالات سے آنکھیں پھیر لیں۔ اجتہاد یہی ہے کہ ہم یہ ایمان رکھیں کہ خدا زندہ ہے، اس کا زندہ کلام ہم پر اسی طرح آج نازل ہو رہا ہے جیسے کل ہُوا تھا، اور رسُولِ خدا کی زندہ نبوّت کے تقاضے کے طور پر ہم اس حقیقت کی تلاش کریں کہ اگر آپؐ آج، اس وقت، دنیا کے موجودہ حالات میں، ہمارے درمیان ہوتے تو قرآنِ حکیم کے احکامات اور ہدایات پر کس طرح عمل کرتے؟

جیسے جیسے ہم روحانی طور پر مرتے گئے، اجتہاد کا دروازہ اتنی ہی شدت سے بند ہوتا گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا اور جو فقہ امام ابو حنیفہؒ یا امام مالکؒ یا امام شافعیؒ یا امام حنبلؒ مرتب کر گئے وہ آئندہ تمام زمانوں کے لیے کافی ہے، وہ ذرا رک کر یہ تو سوچیں کہ اگر قرآنِ حکیم کے نزول اور رسُولِ خدا کی وفات کے سیکڑوں سال بعد یہ چار امام یہ حق رکھتے تھے کہ اپنے عہد کے تقاضوں کے پیشِ نظر خدا کے احکامات اور رسولِ خدا کی سُنّت کی نئی تشریح کر لیں تو یہ حق آج کے مسلمانوں کو کیوں حاصل نہیں ہونا چاہیے؟ شیعہ مسلمانوں نے تو کسی نہ کسی سطح پر اپنے مجتہدوں کو یہ حق دے رکھا ہے اور وہ آج، خصوصاً ایران میں، دین اور دنیا کے درمیان تھوڑا بہت رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں اگرچہ وہاں بھی رفسنجانی اور خاتمی جیسے روشن خیال قائدین خامنائی جیسے قدامت پرستوں کے نرغے میں ہیں۔ لیکن بقیہ عالمِ اسلام پر تقریباً مُردنی چھائی ہوئی ہے اور وہاں بادشاہت، آمریت اور ملائیت نے تسلط جما رکھا ہے۔

ہمارے جو روشن خیال لوگ سر سیدؒ اور اقبالؒ کے تتبع میں اجتہاد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں، وہ اپنے ذہن میں یہ بات لیے بیٹھے ہیں کہ اجتہاد ایک مذہبی اور فقہی یا قانونی مسئلہ ہے جسے تدبر اور تفکر سے حل کیا جاسکتا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ اجتہاد بنیادی طور پر ایک روحانی مسئلہ ہے۔ جب تک ہم آج، اس وقت، موجودہ دنیا کے تمام سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عسکری حالات میں، ایک زندہ خدا، اس کے زندہ کلام اور تا قیامت جاری و ساری نبوّتِ محمدیؐ کو روحانی سطح پر اپنا شریکِ حال نہیں بناتے، ہم اجتہاد کر ہی نہیں سکتے۔

ہمارے ملاؤں نے اپنی طرف سے خدا، قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چودہ سو سال پہلے دفنا دیا تھا۔ رہے ہمارے پیر اور پیرزادے، تو وہ چلتے پھرتے مزار ہیں۔ احساس کی دولت نہ ملا کو حاصل ہے نہ صوفی کو۔ اقبالؒ اسی لیے روتا تھا کہ ''کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی، ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے''۔ چاک داماں تو صرف اور صرف

Marfat.com

روحانی طور پر زندہ لوگوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ یہ وہ زندہ دل لوگ ہوتے ہیں جو''یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک'' کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ انھی لوگوں کو صاحب حال کہا جاتا ہے۔ یہ خدا کو کل کا کفن نہیں پہناتے۔ یہ اُسے آج اپنے اور اپنی دنیا کے حالات میں اپنے آس پاس مصروف عمل دیکھتے ہیں۔ ان کا عشقِ رسولؐ ہر لحظہ یہ محسوس کرتا ہے کہ آج اس وقت، دنیا کے ان حالات میں رسولِ خدا ہمارے آگے آگے چل رہے ہیں اور ہمیں اپنی مثال سے بتا رہے ہیں کہ آج، اس وقت، دنیا کے ان حالات میں ہمیں خدا کے زندہ کلام کو کس طرح کا نیا لباسِ عمل پہنانا چاہیے۔

لامحدود خدا کو جاننے کی کوشش کا نتیجہ اسے محدود کر کے رکھ دیتا ہے۔ خدا کو جاننے سے صرف بُت پرستی پیدا ہوتی ہے۔ اسی کوشش نے مذہبوں اور فرقوں کے الگ الگ خدا بنا دیے ہیں ورنہ ایک خدا کو ماننے والے اس کے ''بچوں'' کو قتل کر کے کس مُنہ سے اس کے سامنے جا سکتے ہیں۔ خدا کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور یہ صرف روحانی طور پر زندہ لوگوں کا شرف ہے۔ احساس کی اس دولت کے بغیر اجتہاد نہیں ہو سکتا۔

اقبالؔ نے اپنے خطبات میں اجتہاد کا حق اسلامی ریاست کی منتخبہ پارلیمنٹ کو دیا تھا۔ لیکن جب ہم پاکستان جیسی کسی پارلیمنٹ کو دیکھتے ہیں تو نہ وہ آزادانہ اور شفاف انتخابات کے نتیجے میں بنی ہوتی ہے اور نہ اس کے ارکان کا علمی اور روحانی مرتبہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ انھیں اجتہاد کا اختیار دیتے ہوئے سو طرح کے خدشات دل میں نہ آئیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کا کوئی بنیادی اصول تلاش کیا جائے تاکہ گمراہی کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ دورِ حاضر میں خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر فضل الرحمٰن، جناب غلام احمد پرویزؔ، ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر منظور احمد اور پروفیسر حمزہ علوی جیسے روشن خیال، بیدار مغز اور روشن ضمیر علمائے اسلام نے اپنے ذاتی تدبر اور تفکر کے علاوہ اپنے دور سے پہلے شاہ ولی اللہؒ، علامہ اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے بلند پایہ اور مسلّمہ مفکرینِ اسلام کے افکار کی روشنی میں یہ اصول واضح کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔

اس اصول کے مطابق قرآنی احکام، سنتِ نبوی اور فقہی قوانین کی مصلحت، مقصد یا رُوح کو ان کے الفاظ سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ مثلاً اگر آج کے دَور میں عورتوں کی نصف گواہی سے یا وراثت میں مردوں کے مقابلے میں نصف حصے سے عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا تو اِن احکامات کے الفاظ پر نہیں، ان الفاظ کے پیچھے جو مصلحت یا مقصد تھا اسے پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ یاد رہے کہ انصاف کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انصاف نہ صرف ہونا چاہیے بلکہ ہوتا ہُوا نظر بھی آنا چاہیے۔ آج ان احکام سے انصاف ہوتا ہُوا نظر نہیں آتا۔ اس لیے اگر ان احکام کی روح اور ان کا اصل مقصد عورتوں سے انصاف کرنا تھا تو احکام کے الفاظ سے آگے بڑھ کر انصاف کے مقصد کے تحت عورتوں کی پوری گواہی اور وراثت میں ان کا پورا حصہ قانونی طور پر تسلیم کر لینا چاہیے۔

رُوحانیت اور ہماری ذاتی وحدت

روحانی طور پر بیدار انسان ایک سطح پر تو اپنی ذات سے، دوسرے لوگوں سے، اور دُنیا و مافیہا سے آزاد اور بے تعلق ہوتا ہے مگر دوسری سطح پر ان سے مربوط اور متعلق ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا خدا کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے البتہ پہلی صورت کا تعلق دوسری صورت کے تعلق سے جوہری طور پر (Qualitatively) مختلف ہوتا ہے۔

اپنی ذات، دوسرے لوگوں، اور دُنیا و مافیہا سے بے تعلقی رُوحانیت کی ابتدا ہے اور ان سے تعلق داری روحانیت کی انتہا ہے۔ عام طور پر روحانیت کے بارے میں اس سے الٹ تصور رکھا جاتا ہے۔ ''پہنچے ہوئے'' لوگوں سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی ذات سے بالا ہو کر، دوسرے لوگوں کی رائے سے بے پروا اور دنیا اور اس کے لوازمات اور ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو جائیں گے۔ بے شک روحانی طور پر زندہ و بیدار اشخاص پر یہ واردات گزرتی ہے لیکن جب وہ بے تعلقی کی منزل سے گزر جاتے ہیں تو خدا سے ان کا تعلق پہلے سے کہیں زیادہ گہرا ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جہاں پہنچنا چاہتے تھے وہاں پہنچ گئے ہیں۔ یہ عام صوفیوں کی حالت ہے اور وہ اس حالت سے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ اتنی مشکل سے ملا ہوا خدا کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

مگر پیغمبروں اور حوصلہ مند اور جواں مرد صوفیوں کا یہ شعار یا شیوہ نہیں۔ وہ خدا سے قربت کو خدا سے محبت میں بدل دیتے ہیں اور یوں اپنی ساری مخلوق کے ساتھ محبت رکھنے والے خدا کے رنگ میں رچ کر خود بھی اس کی ساری مخلوق کے ساتھ محبت کے تعلق میں بندھ جاتے ہیں۔ پہلی حالت ''فنا'' کی ہے۔ دوسری حالت ''بقا'' کی ہے۔ پہلی حالت لا کی ہے دوسری حالت اِلّا کی ہے۔ پہلی حالت نفی یا انکار کی ہے، دوسری حالت اثبات یا اقرار کی ہے۔ پہلی حالت کی انتہا ''وحدت الوجود'' ہے۔ ہم ہر شے کی نفی کر کے خدا تک پہنچ گئے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ خدا کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری حالت کی انتہا ''وحدت الشہود'' ہے۔ ہم اعلان کر دیتے ہیں کہ ہر شے خدا کی شہادت (گواہی) دے رہی ہے۔ پیغمبروں میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی دونوں حالتیں ہر وقت موجود ہوتی ہیں۔ اسی لیے آدمؑ سے محمدؐ تک ہر پیغمبر کا بنیادی کلمہ ہمیشہ ہمیشہ یہی رہا ہے: لاالہ الا اللہ ۔ اس کلمے میں نفی اور اثبات، وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں شامل ہیں۔ ہر پیغمبر کے سچے پیروکار یہی کلمہ پڑھتے رہے ہیں۔ مثلاً آلِ ابراہیم کا کلمہ یہ ہوگا: لا الہ الا اللہ ، ابراھیم خَلِیلُ اللہ آلِ موسیٰؑ کا کلمہ یہ ہو سکتا ہے: لاالہ الا اللہ ، مُوسیٰ کلِیمُ اللہ۔ آلِ عیسیٰؑ کا کلمہ شاید یہ ہو: لاالہ الا اللہ عیسیٰ رُوحُ اللہ ۔ جس جس نے اپنے وقت میں یہ کلمہ ادا کیا وہ اتنا ہی مسلمان ہے جتنا لا اِلٰہ اِلاّ اللہ محمد رسُولُ اللہ پڑھنے والا کوئی ہمارے جیسا مسلمان۔

جب خدا سے قربت خدا کی محبت میں بدل جاتی ہے تو ہماری اپنی ذات بھی محترم ہو جاتی ہے۔ وہی ذات جس کی خواہشوں سے بالا ہو کر خدا سے قربت نصیب ہوئی تھی اب خدا کا گھر بن جاتی ہے کیونکہ اب خدا دور کہیں آسمانوں میں

Marfat.com

نہیں، ہمارے دل میں رہتا ہے۔ اب ہم اپنے من میں ڈوب کر صرف سراغِ زندگی ہی نہیں، زندگی دینے والے خدا کا سراغ بھی پاتے ہیں اور ہم پر یہ راز کھلتا ہے کہ اَلحیّ ہوتے ہوئے خدا اور حیات (زندگی) میں کوئی فاصلہ یا پردہ نہیں۔ اب ہم اپنے دل کی دھڑکن میں تمام تر زندگی کو دھڑکتا محسوس کرتے ہیں اور اس دھڑکن میں خدا کی آواز بھی سننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ پہلے ہمارا دل خواہشوں کی قید میں تھا، فیض احمد فیض کے خوبصورت الفاظ میں اس کی کیفیت یہ تھی:

کئی بار اِس کا دامن بھر دیا حُسنِ دو عالم سے

مگر دل ہے کہ اِس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

اب ہمارا دل دھڑکتا ہی اُس بات پر ہے جو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی امین ہو اور جس سے دل میں خانہ ویرانی کے بجائے رونق پیدا ہو جائے۔

اب ہمیں بھرے بازار میں چھاتی ننگی کر کے بچے کو دودھ پلانے والی دیہاتی ماں کی مامتا میں خدا نظر آنے لگتا ہے اور دل خدا کے نور سے جگمگا اٹھتا ہے۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر اُگے ہوئے سادہ سے پھول کو دیکھ کر زندگی کی طاقت پر ایسا یقین آتا ہے کہ دل کی اگلی پچھلی ساری اُداسیاں دور ہو جاتی ہیں۔ برسات میں آم کے درخت میں چھپی بیٹھی کوئل کوکتی ہے تو اس کی تانوں سے آنکھیں بہہ نکلتی ہیں اور دل کا سارا میل دھو ڈالتی ہیں۔ اب خدا اور ہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اب ہاتھ ہمارے ہوتے ہیں اور سارے کام خدا کر رہا ہوتا ہے۔ اب آنکھیں ہماری ہوتی ہیں اور دیکھ وہ رہا ہوتا ہے۔ کان ہمارے ہوتے ہیں اور سن وہ رہا ہوتا ہے۔ ہماری وہی ذات جو کبھی خدا اور ہمارے درمیان ایک سنگین دیوار تھی، اب ایک پائیدار پل بن جاتی ہے، مسجد بن جاتی ہے کعبہ بن جاتی ہے اور قبروں کے اندر سے میاں محمد صاحب بول اٹھتے ہیں:

مسجد ڈھادے، مندر ڈھادے، ڈھادے جو کُجھ ڈھیندا

اک بندے دا دل ناں ڈھاویں، ربّ دِلاں وچ رہندا

اب ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی روز مرّہ زندگی سے وقت نکال کر اس پل سے گزر کر اس مسجد، اس کعبے میں کچھ وقت گزاریں۔ اسے استغراق کہیں یا مراقبہ، یا Meditaion، یہ ہمیں زندگی کی دوڑ دھوپ سے رُک کر تازہ دم ہونے کا موقع دیتی ہے۔ باہر کے بجائے اپنے اندر دیکھنے کے یہ لحات ہمیں اپنی روحانی اصلیت اور اپنی خودی کو پہچاننے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم اکیلے نہیں، تمام تر قوتوں اور خزانوں کا مالک خدا ہماری حوصلہ افزائی اور مدد کے لیے بالکل ہمارے قریب موجود ہے۔ ان لحات میں ہم پر یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات اور دنیا، اوپر اوپر سے ہماری کتنی ہی مخالف نظر آئے، حقیقت میں ہماری دوست ہی ہے۔ اسی موقع پر ہماری سمجھ میں یہ بات بھی آتی ہے کہ خود ہمیں بھی فطرت اور دنیا کو فتح کرنے کے بجائے اس کا دوست ہونا چاہیے۔ تب ہر آواز آوازِ حق معلوم ہوتی ہے، تب ہر آواز آوازِ دوست محسوس ہوتی ہے۔

خدا پر ایمان رکھنے والے فرد کے ایمان کا ایک ہی ثبوت ہے کہ اس کے حواس، اس کے جذبات، اس کے

Marfat.com

خیالات اور اس کے عقائد آپس میں ٹکرانے کے بجائے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں۔ انسانی زندگی میں ایمان اور اطمینان پیدا ہی تب ہوتا ہے کہ ہمارے قول و فعل میں تضاد نہ ہو اور ہم جسمانی، قلبی، ذہنی اور روحانی اعتبار سے ایک ہی راستے کے مسافر ہوں۔

خدا نے آدمؑ کے سامنے تمام فرشتوں کو سجدہ ریز کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ خدا اور شیطان کے سوا ہر شے انسان کی حکم بردار ہے۔ شرط یہ تھی کہ وہ یاد رکھے کہ خدا نے اس کے اندر اپنی روح پھونک رکھی ہے اور اسے ہر شے کی حقیقت جاننے کا علم دے رکھا ہے۔

جب آدم اور حوا نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لیا تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسان ایک صاحب اختیار مخلوق ہے اور وہ کائنات کی تمام دوسری مخلوقات کے برعکس خدا کی نافرمانی بھی کر سکتا ہے۔ آدم و حوا اور شیطان، ان تینوں نے خدا کی نافرمانی کی تھی۔ تینوں کو سزا ملی۔ آدم و حوا کو جنت سے نکال دیا گیا، شیطان کو مردود قرار دے دیا گیا۔ مگر آدم و حوا نے توبہ کر لی اور اپنی غلطی کی معافی چاہ لی۔ خدا نے انھیں معاف کر دیا اور وحی کے ذریعے سے آنے والی ہدایت پر صدقِ دل سے ایمان لانے اور اس کی روشنی میں زندگی گزارنے کی راہ کھول دی۔ ساتھ ہی اس نے شیطان کو قیامت تک کے لیے مہلت دے دی کہ انسان کو اس راہ سے بھٹکاتا رہے۔ یوں ازل سے ابد تک کے لیے ایک زبردست انسانی ڈراما چل نکلا جو کبھی المیہ، کبھی طربیہ اور اکثر المیے اور طربیے کا امتزاج بن جاتا ہے۔

دراصل انسان کے اندر اپنی روح پھونک کر خدا نے ہمارے وجود میں ایک پیمانہ یا ترازو (میزان) رکھ دی ہے جس پر ہمارے ہر قول و فعل کی نیکی بدی تلتی رہتی ہے۔ خدا نے کائنات اور انسان، دونوں کو ایک جیسے فطری اصولوں کے مطابق تخلیق کیا ہے۔ کائنات اور اس کے تمام مظاہر چاہتے نہ چاہتے ہوئے (طوعاً و کرہاً)، ان اصولوں پر عمل کرنے کے پابند ہیں جبکہ انسان کو اختیار ہے کہ ان سے انحراف کر سکے۔ خدا نے انسان کو جو دین دیا ہے وہ بھی دینِ فطرت ہی ہے۔ جیسے ہی انسان شیطان کی ترغیب کے باعث اس دین سے انحراف کر کے کوئی غلط کام کرتا ہے، اس کے وجود میں نصب شدہ روحانی ترازو کا بدی والا پلڑا جھک جاتا ہے اور اس کے ضمیر یا دل میں ایک کانٹا سا ابھر آتا ہے جو اسے اندر ہی اندر کچوکے دینے لگتا ہے۔

بعض اوقات انسان ان کچوکوں کو فوری طور پر محسوس نہیں کرتا لیکن جس طرح کئی بیماریوں کی علامات دیر سے واضح ہوتی ہیں اور اگر علاج نہ کیا جائے تو بیماری اندر ہی اندر بڑھتی رہتی ہے اسی طرح خدا، فطرت اور دین سے انحراف کو جتنی جلدی ترک کر دیا جائے انسان کی جسمانی، قلبی، ذہنی اور روحانی صحت کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ ہمارے اندر کا یہی روحانی ترازو ہمارے ہر صحیح قول و فعل پر ہمارے ضمیر یا دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔ خدا نے چونکہ برائی کی سزا برائی کے برابر اور اچھائی کی جزا اچھائی سے کئی گنا زیادہ رکھی ہے اس لیے جو انسان اپنی زیادہ تر زندگی خدا کے مقرر کردہ فطری اور دینی اصولوں کے مطابق گزارتا ہے، دوسرے انسانوں کے مقابلے میں اسے کہیں زیادہ خوشی اور اطمینان

Marfat.com

حاصل ہوتا ہے۔

جیسے جیسے انسان اپنے اندر کی اس روحانی ترازو کے وجود اور تاثیر سے واقف ہوتا ہے، اُس پر ایک عجیب وغریب انکشاف ہوتا ہے۔ پہلے وہ شیطان کو دنیا اور دوسرے انسانوں میں ڈھونڈتا اور پہچانتا رہتا تھا۔ اب اسے پتا چلتا ہے کہ شیطان اس کے وجود سے باہر کہیں اور نہیں، بلکہ اس کے اپنے اندر موجود ہے۔ جس شیطان نے آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے انکار کیا تھا وہ محض ایک رمز یا علامت (Symbol) تھا۔ خدا نے تو انسان کو بااختیار بنانے کا فیصلہ اس کی تخلیق سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ جس مخلوق کو نیکی اور بدی کا اختیار ہو اُسے نیکی کے بجائے بدی پر اکسانے والا شیطان کہیں باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہی موجود ہوتا ہے۔ انسان کے لیے شیطان کی اس کے سوا کوئی حقیقت نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کے اختیار ہی کا وہ حصہ (نفسِ بد) ہے جو اسے بدی اور برائی کی طرف جھکا دیتا ہے۔

روحانی طور پر زندہ و بیدار انسان، اپنے روحانی سفر کے ہر نئے قدم پر پہلے سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ شیطان کائنات، زمانے، فطرت، دنیا، ماحول، معاشرے اور دوسرے انسانوں میں چھپ کر اس پر حملے نہیں کرتا بلکہ وہ تو اس کا اپنا نفسِ بد ہے جو بدی اور برائی کا اختیار رکھنے کے باعث اس کے اندر سے اس پر چھاپے اور شب خون مارتا رہتا ہے۔ وہی انسان جو پہلے ہر وقت خدا اور خدا کی خدائی کو کوستا رہتا تھا اور دوسرے انسانوں کو برا بھلا کہتا رہتا تھا، اب خود آگاہی کی ایک نئی، گہری، بلند اور وسیع صلاحیت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان کر حیران ہوتا ہے کہ اس کا شیطان تو اس کے ساتھ ہی پیدا ہُوا تھا اور ساتھ ہی مرے گا۔ ساتھ ہی اسے یہ حیرانی ہوتی ہے کہ بدی اور برائی کی جڑ تو اس کے اپنے اندر ہی ہے اور اگر وہ اپنی اصلاح کر لے تو وہ دو بہت اہم کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ ایک تو وہ خوشی اور اطمینان جسے انسان باہر ڈھونڈتا رہا تھا اس کا سرچشمہ اپنے اندر ہی دریافت ہو جائے گا۔ دوسرے اس کے لیے فطرت، دنیا اور دوسروں کو معاف کرنا بہت آسان ہو جائے گا کیونکہ اب ''ہم الزام ان کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا'' والا معاملہ ہو جائے گا۔

روحانی سفر کی خوبصورتی اور یکتائی یہی ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کیفیت کو اردو کے صاحب طرز شاعر شہزاد احمد نے یوں ادا کیا ہے:

یہ ایک سفر کی انتہا ہے
اور ایک سفر کی ابتدا بھی

اسی سلسلے میں عہدِ حاضر کے ممتاز شاعر منؔیر نیازی کا ایک شعر بھی سن لیجیے:

جب ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا
اک اور دریا کا سامنا تھا منؔیر مجھ کو

اس سفر میں ہر منزل ایک نئی منزل کا نقطۂ آغاز ہوتی ہے۔ جب ہم خیر و شر کی قوتوں کو اپنے اختیار کے دو حصوں

(نفسِ نیک اور نفسِ بد) کے طور پر پہچان لیتے ہیں تو اگلی منزل کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ احساسِ ذمہ داری کی منزل ہے۔ جو کچھ ہمارے ساتھ بیتتا ہے، زندگی میں جو کچھ ہمیں حاصل ہوتا ہے اور وہ سب کچھ جس سے ہم محروم رہ جاتے ہیں اس کا انحصار بڑی حد تک ان فیصلوں پر ہوتا ہے جو خود ہم نے کیے ہوتے ہیں۔ اب ہم اپنے غلط فیصلوں پر دوسروں کو آسانی کے ساتھ موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ایک مسلمان کے طور پر ہمیں قرانِ حکیم کی اس آیت میں اپنے اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر اپنی ذمہ داری کو کھلی آنکھوں سے پہچاننے کی صلاحیت نصیب ہوتی ہے:

''جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی خود اس کے اپنے لیے باعث راحت ہے اور جو سیدھے راستے سے انحراف کرے اس کی گمراہی کی ذمہ داری خود اس کی اپنی ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی غلطیوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا'' (17:15)۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کو خدا کی کتاب ماننے والے اور انسان کی عظمت کا پورا شعور رکھنے والے مسلمان سے زیادہ کوئی شخص اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کر سکتا۔ اس کا احساسِ ذمہ داری اب اسے ایک اور منزل کا مسافر بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر جھانکتا ہے، اپنے قول و فعل کا محاسبہ کرتا ہے، وہ وجہ دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے باعث اس نے اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتے ہوئے غلط فیصلے کیے۔ اب اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ جب تک اس کی جبلتیں، احساسات، جذبات، خیالات، اور عقائد ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں زیرِ عمل آتے رہیں گے اس سے غلطیاں، برائیاں، خرابیاں، جرائم اور گناہ سرزد ہوتے رہیں گے۔ یہ انکشاف مسلمان کو بڑی حد تک ''وجودیت'' (Existentialism) سے قریب لے آتا ہے جس کی روح یہی ہے کہ اپنے فیصلوں کے ذمہ دار ہم خود ہوتے ہیں۔

منفی اعمال سے بچنے کی کوئی سبیل؟ ان کی جگہ مثبت اعمال کی کوئی توفیق؟

کیوں نہیں! جب تک ہمیں خدا پر پورا ایمان نہ ہو ہم عقیدے کے طور پر ایک راستے کو درست سمجھیں گے لیکن ہمارا دماغ، ہمارا دل، ہمارا جسم اسے قبول نہیں کرے گا۔ چنانچہ اگر ہم دل سے کسی بات کے قائل ہوں اور ہمارا دماغ اس کا قائل نہ ہو تو ہم خلجان (Confusion) کا شکار ہو جائیں گے۔ منفی اعمال سے بچنے اور ان کی جگہ مثبت اعمال انجام دینے کا ایک ہی حل ہے کہ ہم واحد سچے اور حقیقی خدا پر صرف زبان سے نہیں، پورے جسم و جان سے اور پورے دل و دماغ سے ایمان لائیں اور اپنے ایمان پر اپنی زندہ و بیدار روح کو گواہ بنائیں۔ ہماری روح چونکہ خدا کی اپنی رُوح ہے اس لیے ہماری روح جس قدر زندہ و بیدار ہو گی ہم اتنا ہی خدا کو حاضر و ناظر جان سکیں گے۔ جب خدا یہ کہتا ہے کہ میں تمھاری شہ رگ سے بھی قریب تر موجود ہوتا ہوں تو دراصل وہ یہ بات ہماری روح ہی کے حوالے سے کہہ رہا ہوتا ہے کیونکہ ایک ہماری روح ہی تو ہے جو ہر لحظہ اور ہر حالت میں ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر موجود ہوتی ہے۔ یہی رُوح دراصل ہماری زندگی ہے اور جیسے ہی یہ ہمارے جسم سے پرواز کر جاتی ہے ہم بدبودار مٹی کا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں۔

خدا پر ہمارے مکمل ایمان کا ثبوت؟

خدا پر ہمارے مکمل ایمان کا ثبوت یہ ہے کہ اب ہماری ذات کے عناصر ترکیبی...... جبلتیں، احساسات، جذبات، خیالات اور عقائد مختلف سمتوں میں نہیں، ایک ہی سمت میں آگے بڑھنے لگتے ہیں۔ اس سمت کا قرآنی نام صراطِ مستقیم ہے۔ جب ہم اپنی ذات کے تمام دھاروں کو خدا کے بتائے ہوئے اور رسولؐ خدا کے اجاگر کیے ہوئے سیدھے راستے پر ڈال دیتے ہیں تو ہماری کیفیت اُس دریا جیسی ہو جاتی ہے جس کے پانی سے پہلے نہ تو کھیتیاں سیراب ہو رہی تھیں اور نہ بجلی ہی پیدا ہو رہی تھی اور جس کا پانی، خصوصاً طغیانیوں کے موسم میں، سمندر میں بےکار گر رہا تھا لیکن جسے اب ایک بند باندھ کر ایک جھیل کی صورت میں جمع کر لیا گیا ہے۔ اس جھیل کی طرح ہماری بکھری بکھری ذات بھی ایک وحدت اختیار کر لیتی ہے۔

اپنی ذات کی وحدت کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے اس جھیل پر ایک گہری نظر ڈالیے۔ ایک بہتے دریا سے بننے والی یہ جھیل جب بھر جائے گی تو اس کا فالتو پانی دریا کے قدیم راستے پر چل نکلے گا لیکن اب اس پر بندھے ہوئے بند کی بدولت اس کے پانی سے دو کام لیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو زراعت کے لیے نہریں نکالی جا سکتی ہیں، دوسرے اسے ایک تیز رفتار دھارے میں بدل کر اس سے بجلی کی بہت بڑی مقدار پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہماری ذات کے عناصر بھی جب ایک وحدت میں ڈھل جاتے ہیں تو وہ نت نئی تخلیق کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دریا کے پانی میں نہ روشنی تھی اور نہ گرمی یا سردی۔ لیکن اسے ایک دھارے میں لا کر اور ایک مخصوص سمت میں بہا اور گرا کر جناتی سائز کی ٹربائنیں (Turbines) چلا دی جاتی ہیں جن سے وہ بجلی پیدا ہو جاتی ہے جس سے کروڑوں انسان روشنی، گرمی اور ٹھنڈک پا سکتے ہیں۔ اس بجلی میں اتنی طاقت (Energy) ہوتی ہے کہ سیکڑوں چھوٹے بڑے کارخانے چل جاتے ہیں۔ یہی معجزہ ہماری ذات کی وحدت سے رُونما ہو سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے جو لوگ اپنی روحانی بیداری کو خدا پر پورے ایمان تک پہنچا کر اپنی ذات کے مختلف عناصر کو ایک وحدت میں ڈھال لیتے ہیں، وہ کپڑے بھی جھاڑ دیں تو دو چار معجزے رونما ہو جاتے ہیں۔

روحانیت اور انسانی وحدت

انسانی وحدت کا سب سے بڑا دشمن جنگ ہے۔ جنگ کا ایک دائرہ تو مذہبوں کے درمیان کشمکش سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دائرہ خود بڑے بڑے مذہبوں کے اندر فرقہ وارانہ جنگ یا فساد سے متعلق ہے۔ لیکن جنگ کا ایک بہت بڑا دائرہ قومی اختلافات اور مفادات سے وجود میں آیا ہُوا ہے۔ بے شک قوم پرستی (Nationalism) نے منتشر عوام میں یک جہتی پیدا کرنے، ان کی ریاستوں کی تشکیل کرنے اور انھیں غیر ملکی تسلط سے نجات دلا کر آزادی حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ قوم پرستانہ تحریکوں نے 19 ویں صدی میں یورپ کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیسویں صدی کے آغاز سے قوم پرستی نے ایشیاء اور افریقہ میں سر اٹھایا اور پاکستان اور بھارت سمیت کتنے ہی ملکوں کی آزادی کا باعث ثابت ہوئی۔ اسی طرح قوم پرستی کے تحت 1980ء کے بعد مشرقی یورپ اور وسط ایشیا (Central Asia) کے

Marfat.com

بہت سے ممالک روسی تسلط سے آزاد ہوئے۔ قوم پرستی نے عوام کی گردنوں پر سے بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کا بوجھ کم کرنے اور تعلیم کو عوام تک پہنچانے میں بھی حصہ لیا۔

لیکن اب یہی قوم پرستی قریب قریب خود ایک مذہب بن گئی ہے۔ اس طرح کے نعرے تو آپ نے سنے ہی ہوں گے، ''غلط یا صحیح، میری قوم، میرا ملک''۔ یعنی ہمارا ملک یا ہماری قومی ریاست غلط بھی ہو تو ہم اسی کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ قوم پرستی نے قومی ریاستوں کے باشندوں کو بندروں کے ٹولے بنا کر رکھ دیا جو اپنے اپنے علاقے (Territory) کی حفاظت کرتے ہیں اور اُن بندروں کو ہلاک کر دیتے ہیں جو ان کے علاقے میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ قرآنِ حکیم میں تین مختلف مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے نافرمانوں، خصوصاً ظلم پر اصرار کرنے والوں کو بندر یا سؤر بنا دیا گیا ہے۔ حد سے گزری ہوئی تنگ نظر قوم پرستی نے آج انسانوں کو واقعی انسانیت کے درجے سے گرا دیا ہے۔

افراد ہوں یا قومیں، جب بھی وہ روحانی اقدار کے مطابق محبت کو آئینِ زندگی تسلیم کرنے سے انکار کر کے محض مذہب، نسل یا نظریے کے فرق کی بناء پر ایک دوسرے کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو انسانیت کی جگہ وحشیانہ جانوریت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اگر مذہب جیسے مقدس ادارے میں اس بات کی مناہی ہے کہ آپ اپنے خداداد مذہب کو بھی دوسروں پر جبری طور پر مسلط نہیں کر سکتے تو امریکہ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کے نام پر نیپام اور کلسٹر بموں کی مدد سے اپنا سیاسی نظریہ اور اپنی مرضی کی حکومتیں دوسروں پر مسلط کر دے؟ اندھی طاقت نے!

اسی طرح افریقہ میں سوڈان کے سفید فام مسلمان اپنے ہم مذہب غریب، کالے اور کمزور مسلمانوں پر جو ظلم ڈھا رہے ہیں اس کی اجازت کس نے دی ہے؟ کیا یہ اجازت اُس اسلام نے دی ہے جو آج تک یہ فخر کرتا تھا کہ اس میں نسلی امتیاز نہیں؟ ٹوئن بی (Toynbee) جیسے عظیم تاریخ نویس نے سوڈان میں مسلمانوں کو نسلی بنیاد پر دوسرے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرتے ہُوئے دیکھا ہوتا تو یہ کہنے کی غلطی نہ کرتا کہ ''اہلِ دنیا کو اسلام سے سیکھنا چاہیے کہ نسلی امتیاز کو کس طرح ختم کیا جاتا ہے''۔ سوڈان سے پہلے افریقہ کے ملک روانڈا میں ہُوتو اور ٹُوٹسی قبائل میں جو قتل و غارت ہُوئی تھی اس نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ احسنِ تقویم (بہترین خوبیوں) کا حامل انسان گرنے پر آتا ہے تو واقعی بندروں اور سؤروں (اسفل سافلین ......گھٹیا سے گھٹیا مخلوق) کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ انسانوں کو اس ذلت سے کون سی چیز بچا سکتی ہے؟ صرف اور صرف روحانیت۔ وہ روحانیت جو مذہب، قوم، رنگ اور نظریے کے فرق سے بالا ہو کر خدا کے حکم کے مطابق انسان کی انسان ہونے کے ناتے تکریم کرے اور زندگی کے تمام معاملات میں ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کو اوّلیت دے۔

شاید آج کے انسان کو روحانیت سے زیادہ سائنس پر یقین ہو اس لیے آیئے انسانی وحدت اور مذہبی رواداری کی خاطر ایک سائنسی دریافت کا سہارا لینے کی جسارت کریں۔ انسان جن خلیوں اور نسلی خصوصیات سے مل کر بنا ہے ان کے متعلق ابھی حال ہی میں انقلابی معلومات کا اضافہ ہُوا ہے اور انسانی جین (Human Gene) کے تمام ممکنہ مرکبات

Marfat.com

کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انسان کالا ہو یا گورا، سرخ ہو یا پیلا یا ہماری طرح بھورا، وہ 99.99 فیصد ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس کا صرف ایک فیصد کا بھی ایک فیصد (.001%) حصہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ افسوس کہ انسان نے اپنے اس .001% فرق کی بنیاد پر قابیل اور ہابیل سے لے کر آج تک دنیا کو قتل، ظلم، فساد اور جنگ کی بھٹی بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے اپنی 99.99% مشترکہ بنیاد کو تو بھلا دیا ہے لیکن اپنے معمولی ترین اختلاف کے باعث دوسرے انسانوں کو برابر کا انسان سمجھنے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ ان کا رنگ اور ہے یا نتھنے چوڑے یا آنکھیں نیلی یا کالی ہیں۔

چلتے چلتے: (1) ہمارے عہد کے سب سے بڑے سائنس دان آئن سٹائن نے کہا تھا، ''قوم پرستی وہ بیماری ہے جو بچپن میں ہوتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ قوم پرستی انسانیت کا خسرہ (Measels) ہے۔''

(2) وباؤں، زلزلوں، سُنامیوں، ایٹمی ملبوں اور فضائی آلودگیوں کے لیے قومی سرحدوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ان تمام آفات کا انسان کے پاس صرف ایک علاج ہے: روحانیت۔ روحانیت ہی وہ نعمت ہے جو قوم، ملک، سلطنت، مذہب، نسل اور نظریے کی دیواروں سے بالا ہو کر پوری انسانیت کو دردِ دل کے حوالے سے ایک دوسرے کے دکھ کا دارُو بنا دیتی ہے۔

روحانیت اور دینی وحدت

قرآنِ حکیم میں کم از کم بارہ مرتبہ خدا نے یہ کہا کہ ہم نے تمام انسانوں کو ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا ہے گویا تمام انسان ایک ہی اُمت تھے البتہ وہ باہمی اختلافات کے باعث مختلف قوموں اور مذہبوں میں بٹ گئے۔ مثال کے طور پر سورہ الانبیاء کی 92ویں اور 93ویں آیت ملاحظہ فرمائیں: ''(اے لوگو) یہ تمھاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں لہٰذا تم سب کے سب میری ہی عبادت کرو۔ البتہ یہ تمھاری اپنی کارستانی ہے کہ تم نے دینِ واحد کو آپس میں مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر لیا''۔

تاریخ میں آج تک خدا اور مذہب کے نام پر جتنا ظلم وستم اور قتل وغارت ہُوا ہے اس کا تقاضا ہے کہ جو لوگ آج بھی اِسی روش پر اصرار کر رہے ہیں ان کے سامنے قرآنِ حکیم کی چند چیدہ چیدہ آیات کھول کر رکھ دی جائیں، شاید کہ وہ اپنی روش بدلنے پر مائل ہو جائیں۔ لیکن پہلے ایک وضاحت مناسب ہوگی۔

دوسرے مذاہب کے لوگ خدا کے ان ارشادات کی تعمیل کرتے ہیں یا نہیں، کم از کم اُن مسلمان کہلانے والوں کو تو کچھ خدا کا خوف کرنا چاہیے جو رحمۃ اللعالمینؐ کے پیروکاروں کے بجائے ہلاکو خان کی اولاد بنے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے اس جرم کا کوئی جواز نہیں کہ اگر موسیٰ، عیسیٰ اور کرشن کے پیروکار بے گناہ مسلمانوں کو ظلم وستم اور قتل وغارت کا نشانہ بناتے ہیں تو ہم بھی ادلے کا بدلہ لینے کے لیے بے گناہ یہودیوں، بے گناہ مسیحیوں، اور بے گناہ ہندوؤں کے ساتھ یہی سلوک کریں۔ اگر وہ دینِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو کیا ہم پر بھی لازم آتا ہے کہ ہم بھی یہی کچھ کریں۔ اور

Marfat.com

اس سلسلے میں بھی ذرا اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہیے کہ ہم خود، مسلمان کہلاتے ہوئے، شیعہ اور سُنی عبادت گاہوں میں کیا کرتے پھرتے ہیں؟

پھر سوڈان کے صوبے دارفور کو دیکھ لیجیے جہاں ایک مسلمان حکومت کی آنکھوں تلے سفید فام عرب مسلمان (Jenjuede) سیاہ فام مسلمانوں کو کس بے دردی سے قتل کر کے، ان کی مسلمان بیویوں اور بیٹیوں کی عزت لوٹ کر اور ان کے گاؤں کے گاؤں جلا کر، انھیں گِدھوں کی غذا بنا کر، صحرائے اعظم میں دھکیل رہے ہیں۔ اس وقت تک وہاں سفید فام مسلمانوں کے ہاتھوں ایک لاکھ سے زیادہ سیاہ فام مسلمان قتل ہو چکے ہیں اور بیس لاکھ مسلمان بوڑھے، مرد، عورتیں اور بچے مہاجر کیمپوں میں بھوک سے مر رہے ہیں سوائے اس کے کہ کچھ غیر مسلمان انھیں موت کے مُنہ سے بچانے کی جان توڑ لیکن ادھوری کوشش کر رہے ہیں۔ کل کی بات ہے، بوسنیا میں یہی کچھ ہو رہا تھا۔ کتنے مسلمان ملکوں نے ان کی مدد کی تھی؟ ڈوب مرنے کا مقام ہے یا نہیں کہ وہ امریکہ جس نے آج مسلمان ملکوں کو سدھائے ہوئے جانور بنانے کی ٹھانی ہوئی ہے، بالآخر نیویارک کے یہودیوں کے اصرار پر بوسنیا کے مسلمانوں کی مدد کو پہنچا۔ بوسنیا اور دارفور تو دُور کے علاقے ہیں، کیا ہم نے کل خود اپنے ملک کے ایک حصے، مشرقی پاکستان، میں کم و بیش یہی کھیل نہیں کھیلا تھا جو آج اِن علاقوں میں کھیلا جا رہا ہے۔ دِل تو نہیں مانتا، مگر سنتے یہی ہیں۔

اس وضاحت اور یاد دہانی کے بعد ہم شاید، نفسیاتی سطح پر مندرجہ ذیل قرآنی آیات کو بہتر انداز سے سمجھ سکیں۔ اور کیا عجب ہے کہ ان پر عمل بھی کر سکیں:

(1) (اے ایمان والو) علی الاعلان کہہ دو کہ ہم خدا اور اس کی ہدایت (قرآنِ حکیم) پر ایمان لائے جو ہماری جانب نازل ہوئی ہے اور اُس ہدایت پر بھی ایمان لائے جو ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور یعقوبؑ کی اولاد کی طرف بھیجی گئی تھی اور موسیٰؑ کو (تورات و زبور کی صورت میں) اور عیسیٰؑ کو (انجیل کی صورت میں) اور دوسرے پیغمبروں کو (جن کا قرآنِ حکیم میں ذکر نہیں) اُن کے ربّ کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم خدا کے حکم بردار (مسلم) ہیں (2:136)۔

(2) خدا اور اس کے فرشتوں، اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور آخرت پر ایمان لانے والوں کا اعلان یہ ہے کہ ''ہم خدا کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھتے'' (4: 152)۔ وہ عاجزی کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے رب! اس سلسلے میں ہم سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو ہم معافی کے خواستگار ہیں''۔ اور وہ کہتے ہیں، ''ہمیں علم ہے کہ ہمیں خدا کی طرف پلٹنا ہے'' (جہاں محاسبہ ہوگا کہ ہم نے پیغمبروں میں کوئی فرق تو نہیں کیا تھا)۔

(3) خدا نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جو نُوحؑ کو دیا تھا اور (اے محمدؐ) جو آپؐ کے خدا نے آپ کی طرف وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اور یہ وہی دین ہے جو (آپؐ سے پہلے) ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا اور تاکید کی گئی تھی کہ اس میں نہ تو فرق کیا جائے اور نہ ہی فرق ڈالا جائے'' (42:13)۔

Marfat.com

یاد رہے کہ خدا نے ہر بستی اور ہر قوم کی جانب مختلف پیغمبروں کے ذریعے یہی ایک دین بھیجا تھا اور اس بات کا پورا پورا امکان ہے کہ تمام براعظموں کی ہزارہا چیدہ چیدہ بستیوں میں خدا کی جانب سے ہزارہا پیغمبر بھیجے گئے ہوں۔ اس لیے جب ہم قرآنِ حکیم کی یہ آیت دیکھتے ہیں کہ "اے اہلِ کتاب، آؤ کم از کم ان باتوں پر باہم متفق ہو جائیں جو ہم میں اور تم میں یکساں ہیں" تو ہمیں اپنی نظر اور دل و دماغ کو ایک صرف فلسطین تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ ساری دنیا کے سارے انسانوں کی طرف آنے والے تمام پیغمبروں تک پھیلانے کی ہمت کرنی چاہیے خواہ ان کا ذکر قرآنِ حکیم میں آیا ہو، یا جیسا کہ خدا نے خود کہہ رکھا ہے، نہ آیا ہو۔

معذرت: انسانی وحدت کی وضاحت کرتے ہوئے ہو سکتا ہے تھوڑی تکرار ہو جائے لیکن اس موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ تکرار کو اہمیت پر قربان کر دیا جائے۔ ویسے تکرار سے تو خدا جیسے قادر الکلام "مصنف" نے بھی پرہیز نہیں کیا بلکہ اسے وضاحت ہی نہیں فصاحت کے مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مثال: سورہ الرحمٰن میں "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن" کا جملہ 31 مرتبہ اور پورے قرآن میں "اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" کا ٹکڑا 33 مرتبہ دہرایا گیا ہے۔

انسانی اور مذہبی وحدت کی بنیاد تو یہی ہے کہ خدائے واحد نے تمام انسانوں کو نفسِ واحد سے پیدا کیا۔ گویا کالے اور گورے، لال اور پیلے یا بھورے انسان، سب آدم کی اولاد ہیں۔ آگے بڑھیں تو خدا نے قرآنِ حکیم کی پہلی ہی آیت میں اپنا تعارف رب العالمین کے طور پر کرایا ہے۔ گویا وہ تمام موجود جہانوں اور قوموں کے ساتھ ساتھ گزرے ہوئے اور آنے والے جہانوں اور قوموں کا بھی پالنہار ہے۔ اس نے قرآنِ حکیم کی بھی یہی صفت بیان کی ہے کہ وہ ذکر للعالمین ہے۔ ذکر = نصیحت، ہدایت۔ اور اب زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نُطق نے بوسے مری زبان کے لیے، رسولِ خدا محمدؐ کو بھی اس نے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا چنانچہ آپؐ صرف مسلمانوں کے نبی نہیں بلکہ آپ کی نبوت تمام زمانوں، جہانوں اور قوموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے قرآنِ حکیم کی یہ آیت ملاحظہ فرمائیے: قُلْ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (7:158) ترجمے کی ضرورت تو نہیں پھر بھی: "(اے محمدؐ) اعلان کر دو کہ اے تمام انسانو! خدا نے مجھے تم سب کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے"۔

مذہب کے ظاہری فرق کی بناء پر تو بڑی دیر سے جنگیں ہوتی آئی ہیں اور مذہبی اکثریت رکھنے والے، مذہبی اقلیتوں پر ظلم و ستم ڈھاتے آئے ہیں۔ اس سلسلے میں پوپ اربین دوم (Urban II) نے 1095ء میں "مسیحی جہادوں" (Crusades) کا حکم دے کر مذہبی بنیاد پر قتل و غارت کو جائز ہی نہیں ضروری قرار دے دیا۔ چنانچہ "مسیحی مجاہدوں" نے 1099ء میں یروشلم (بیت المقدس) فتح کر کے وہاں کی تمام تر مسلمان اور یہودی آبادی کو بے دردی سے ذبح کر دیا۔ آج جب امریکہ کے صدر بش نے افغانستان اور عراق پر حملے کی ٹھانی تو اپنے اس اقدام کے لیے اس کے مُنہ سے بھی دانستہ یا نادانستہ کروسیڈ (مسیحی جہاد) کا لفظ نکل گیا۔ مغربی مبصر صبح و شام "اسلامی جہاد" کے الفاظ ایک سیاسی گالی کے طور پر

Marfat.com

استعمال کرتے نہیں تھکتے لیکن گریبان میں جھانک کر یہ نہیں دیکھتے کہ مذہبی جہاد کا آغاز (اوراب اعادہ) کس نے کیا ہے؟

جہاں تک مذہبی اقلیتوں پر مذہبی اکثریت رکھنے والوں کے ظلم وستم کا تعلق ہے اس کی انتہا بھی مسیحی دنیا ہی میں ہوئی جب پروٹسٹنٹ مسیحیوں کے امامِ اعظم، مارٹن لُوتھر کی جنم بھومی، جرمنی میں ہٹلر کے حکم سے یہودیوں کو بھوک، تشدد اور جان لیوا مشقت کے ذریعے سے اور بجلی کی بھٹیوں میں زندہ جلا کر ہلاک کیا گیا۔ خود مسیحی تاریخ دانوں اور مبصروں کے اپنے تسلیم شدہ اعداد وشمار کے مطابق ساٹھ لاکھ یہودیوں کو بے دردی اور سفاکی سے مار کر ان کی لاشوں کو بلڈوزروں سے کوڑے کرکٹ کی طرح گڑھوں میں دھکیل دیا گیا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ پوپ جان پال دوم مرحوم نے یہودیوں سے اس بات کی معافی چاہی تھی کہ جب جرمنی اور پولینڈ میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو بقیہ مسیحی دنیا نے اس ظلم وستم پر کوئی اظہارِ رنج یا احتجاج نہ کیا تھا۔

نیک دل مذہبی لیڈر لاکھ کہتے رہیں کہ ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیَر رکھنا'' لیکن مذہبی اختلافات کے باعث جنگوں، فسادوں اور ظلم وستم کے واقعات سے تاریخ اٹی ہوئی ہے۔ اگر چہ مسلمانوں کا دامن اِکا دُکا، چھوٹے موٹے واقعات کو چھوڑ کر ''کروسیڈز'' (Crusandes) اور ''ہولوکاسٹ'' (Holocaust) جیسی وارداتوں سے داغدار نہیں لیکن عثمانؓ، علیؓ اور حسینؓ کے وقت سے شروع ہونے والے گروہی فتنوں اور جنگوں سے لے کر آج سوڈان میں سفید فام مسلمانوں کے سیاہ فام مسلمانوں کے صفایے (Genocide) تک، ہم بھی جو کچھ کرتے آئے ہیں اور کرتے جا رہے ہیں وہ ہرگز قابلِ فخر نہیں۔ پاکستان سے لے کر عراق تک، ہر روز مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے خون کی خبروں سے ہر درد مند مسلمان کا دل خون ہوتا رہتا ہے۔

روحانیت اور ہماری دُنیا

وہی دُنیا پہلے جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ہم اپنی اصلیت اور خدا سے اپنا تعلق توڑ بیٹھے تھے اور جسے پھلانگ کر ہم خدا سے قریب ہوئے تھے اب ایک نئی سج دھج سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ پیارے خدا کی پیاری زمین اور پیارے خدا کی پیاری مخلوق ہمیں کیوں پیاری نہ ہوگی! اب ''جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے'' والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ پہلے ہم ہر شے اور ہر شخص میں کیڑے نکالتے رہتے تھے، ہماری نظر میں کوئی جچتا ہی نہیں تھا، ہم اپنی اونچی ناک پر فخر کرتے تھے اور تھو تھو کرتے زبان تھک جاتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کو سوتے وقت دل ودماغ پر بدمزگی چھائی ہوتی تھی۔ جب خدا سے قربت اس کی محبت میں بدلی اور فطرت اور خلقِ خدا سے دوستی کا راستہ کھلا تو اندازہ ہُوا کہ ہمیں یہاں تک پہنچانے میں ہمارے ماحول، ہمارے تجربات، ہمارے دُکھ سُکھ، ہماری کامیابیوں، ہماری ناکامیوں، ہمارے ماں باپ، ہمارے استادوں، ہمارے عزیز واقارب، اور ہمارے دوست احباب کا کتنا گراں قدر حصہ ہے۔ ان سب کے بغیر نہ تو ہم پیدا ہو سکتے تھے، نہ پروان چڑھ سکتے تھے اور نہ وہ کچھ بن سکتے تھے جو ہم بن چکے ہیں۔ ہمیں ان سب سے گلے شکوے تو بہت

تھے اور ہم نے ان گلے شکووں پر خاصی اونچی آواز سے واویلا بھی کیا تھا لیکن ان کا شکریہ تو دبی زبان سے بھی ادا نہیں کیا تھا۔

اب فطرت اور خلقِ خدا سے دوستی ہمارے شکایتی تعلق کو شکریے میں بدلنے لگتی ہے۔ بے شک معافی کا حق صرف زبانی طور پر ''سوری'' کہہ دینے سے ادا نہیں ہوتا۔ اسی طرح شکریہ زبانی زبانی ''تھینک یُو'' سے نہیں، عملی طور ہی پر ادا ہوتا ہے۔ ہماری غفلت سے کسی کو چوٹ لگ جائے، وہ بھلا آدمی زمین پر پڑا کراہ رہا ہو اور ہم او ہو، معاف کیجیے، آئی ایم سوری وغیرہ کہہ کر چلتے بنیں۔ کیا اس سے معافی کا حق ادا ہو گیا؟ نہیں! معافی کا حق تو اس طرح ادا ہو گا کہ ہم اُس شخص کو زمین سے اٹھائیں، قریبی کلینک سے اس کی مرہم پٹی کروائیں، اگر وہ غریب ہو تو اس کے مانگے بغیر خاموشی سے اسے کچھ رقم پیش کریں اور پھر صدقِ دل کے ساتھ اس سے معافی چاہیں۔ فطرت، ماحول، ماں باپ، استادوں، عزیز و اقارب اور دوست احباب کا شکریہ بھی اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اب ہم ان سے اپنے یک طرفہ تعلق کو دو طرفہ بنالیں۔ جس طرح کبھی انھوں نے ہماری نگہداشت اور دلداری کی تھی، اب ہم بھی انھیں، محبت، احترام اور خدمت کا نذرانہ پیش کریں۔

ہمارا یہ نیا تعلق ہماری سوچ اور ہمارے عمل میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ یہ زمین جس نے اپنی پیداوار سے ہمیں پالا، یہ دریا، تالاب اور کنویں جن کا پانی پی کر ہم جوان ہوئے، وہ ہوا جس میں ہم نے سانس لیا، وہ درخت جنھوں نے ہوا میں آکسیجن کا اضافہ کر کے ہماری زندگی کی ضمانت دی...... ہم نے ان سب کے لیے کیا کیا؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ ہماری غفلت سے تو ہمارے ماحول میں اتنی آلودگی پیدا ہو چکی ہے کہ ہم نے اس کے تدارک کے لیے جلد ہی مؤثر عملی اقدامات نہ کیے تو ہم اپنی دھرتی ماں (MotherEarth) کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیں گے۔

اب خدا کی محبت ہمیں توفیق دیتی ہے کہ ہم نہ صرف آلودگی (Pollution) پیدا کرنے کے ہر چھوٹے بڑے جُرم سے بچنے کی کوشش کریں بلکہ ماحول (Environment) کا ہر ممکن تحفظ (Conservation) بھی کریں۔ آج دُنیا میں تیل کی خاطر جنگیں ہو رہی ہیں۔ اندھوں کو بھی نظر آ رہا ہے کہ امریکہ کو افغانستان میں وسط ایشیائی ریاستوں کے تیل نے اور عراق میں مشرقِ وسطیٰ کے تیل نے بلایا ہے۔ لیکن کل پانی کے مسئلے پر جنگیں ہوں گی۔ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی جلد ہی پانی کو ترسے گی۔ آلودگی کے باعث زمین کا درجۂ حرارت بڑھ رہا ہے، بحرِ منجمد شمالی اور بحرِ منجمد جنوبی کے برفانی دریا اور تودے (Glaciers) تیزی سے پگھل رہے ہیں، موسموں میں تبدیلی آ رہی ہے۔ اب گرمیوں میں دریاؤں کی طغیانی اور بارشوں کی کثرت پہلے سے زیادہ ہُوا کرے گی اور سردیوں میں پانی کی کمی پہلے سے زیادہ ہو گی۔ جو ملک گرمیوں کے فالتو پانی کو محفوظ نہ کر سکیں گے وہ سردیوں میں بوند بوند کو ترسیں گے۔ پاکستان میں تربیلا ڈیم 1975ء میں مکمل ہُوا تھا۔ اس کے بعد ہماری غفلت یا ہماری لے دے کے باعث ایک بھی بڑا ڈیم نہیں بنا۔ اور ابھی سے موجودہ پانی کی راشننگ شروع ہو چکی ہے اور صوبے آپس میں اور وفاقی حکومت سے دست و گریباں ہیں۔

یہ کھیتوں کے پانی کی بات تھی، پینے کے پانی کی حالت یہ ہے کہ اوّل تو وہ پینے کے لائق نہیں، اوپر سے کراچی

Marfat.com

جیسے اہم ترین اور امیر ترین شہر کے غریب اور درمیانے طبقے کے لوگوں کو وہ بھی میسر نہیں۔ ان حالات میں بھی امیر گھرانوں کی ایک موٹر دھونے پر اتنا پانی خرچ کر دیا جاتا ہے جس سے سیکڑوں گھرانے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ روحانی طور پر مردہ لوگوں کو بڑے بڑے شہروں کے سرکاری نلکوں پر غریب بچوں، بچیوں اور عورتوں کی لمبی قطاریں نظر ہی نہیں آتیں اور اگر آتی ہیں تو اُن کے ضمیر میں کوئی بحران پیدا نہیں ہوتا۔

روحانی طور پر زندہ و بیدار شخص سے خدا کی محبت تقاضا کرتی ہے کہ وہ پانی جیسی بے بہا نعمت کے تحفظ اور اسے ہر ضرورت مند تک پہنچانے کے لیے آواز بھی اٹھائے اور عملی طور پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرے۔ یہی حال دنیا میں خوراک کا ہے۔ امریکہ جیسے ملکوں میں اتنی خوراک ہر روز ضائع کر دی جاتی ہے جس سے کئی چھوٹے غریب ملک مہینوں پل سکتے ہیں۔ ہر دوسرے امریکی گھر میں ایک دو کتے بھی پل رہے ہوتے ہیں۔ ایک کتے کی دس سالہ زندگی میں وہاں اوسطاً 48 ہزار ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ اس حساب سے سال میں 4800 ڈالر، ہر مہینے 400 ڈالر اور ہر روز تقریباً 14-13 ڈالر بنے۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ایشیا اور افریقہ میں کتنے کروڑ انسانوں کو ایک ڈالر (تقریباً ساٹھ روپے) روزانہ بھی میسر نہیں۔ امریکہ میں اس طرح کی رفاہی تنظیمیں بھی بنی ہوئی ہیں کہ انسانوں کے استعمال میں آنے والی دواؤں کے سلسلے میں چوہوں پر ہونے والے تجربات بند کیے جائیں کیونکہ ان سے جانوروں پر ظلم ہوتا ہے۔

اس کے برعکس ہمارے سیاسی اور مذہبی لیڈر حضرت عمرؓ کا یہ قول دہرا کر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ "اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو مجھے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا" جبکہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہر روز بیسیوں انسان تنگدستی اور بھوک کے ہاتھوں مر رہے یا خودکشی کر رہے ہوتے ہیں۔ خدا کی محبت کا پہلا ثبوت ہی یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے نہیں، ہمارے اپنے غلط معاشی نظام نے زندگی کی ضرورتوں اور سہولتوں سے محروم کر رکھا ہے ہم انھیں اپنے قدموں پر کھڑا کرنے کے لیے کس طرح کے ٹھوس اقدامات کرتے ہیں۔ خدا کا نام لینے والے، بہت ہوتا ہے تو خیرات کے طور پر کچھ روپے، پھٹے پرانے کپڑے اور جوتے یا روکھی سوکھی روٹی غریب کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ لیکن خدا سے محبت کرنے والے اپنے آپ سے، اپنے معاشرے سے اور اربابِ اختیار سے یہ بھی پوچھنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ غریب کو کس نے غریب بنایا ہے؟

مگر جیسے ہی کوئی یہ سوال اٹھاتا ہے، خوشحال طبقوں، ان کے نمائندوں اور ان کے پروردہ مذہبی لیڈروں کی طرف سے اُسے سوشلسٹ، کمیونسٹ اور دہریے کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ سوویٹ یونین کے ٹوٹ پھوٹ جانے، مشرقی یورپ سے کمیونسٹ حکومتوں کے خاتمے اور چین کی سوشلزم میں مارکیٹ کا سرمایہ دارانہ طریقہ شامل ہو جانے کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ جو کچھ کہتے اور کرتے آئے تھے سب غلط تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اب اس فلسفے میں پہلے کا ساز ور نہیں رہا لیکن جب تک دنیا میں غریبی، محرومی اور بے چارگی موجود ہے یہ سوال بھی موجود رہے گا کہ غریبوں، محروموں اور افتادگانِ خاک یا بے چارگانِ زمین (Wretched of the Earth) کو کس نے اس حالت پر

پہنچایا؟ خدا نے؟ یا اِن لوگوں نے خود اپنے لیے یہ حالت پسند کی تھی؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ مغرب میں بے روح سرمایہ داری نظام نے، مشرق میں جابرانہ جاگیرداری نظام نے اور عالمِ اسلام میں ملوکیت اور بادشاہیت نے ان کی یہ گت بنائی ہے اور تینوں جگہ ان نظاموں کے پروردہ مذہبی لیڈروں نے خدا کے نام پر امیر کو امیر اور غریب کو غریب رکھنے میں مدد دی ہے۔

روحانی طور پر زندہ و بیدار افراد نہ صرف اس صورتِ حال سے رنجیدہ ہوتے ہیں، وہ اس صورتِ حال کو بدلنے کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ وہ مدر ٹریسا (Mother Teresa) جیسی نیک دل خواتین اور عبدالستار ایدھی جیسے نیک نفس حضرات کی قدر کرتے ہیں کہ ان کی رضا کارانہ خدمت گزاری سے ہزاروں بھوکوں کو روٹی، بیماروں کو دوا اور لاوارث لاشوں کو کفن دفن نصیب ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ سے اور اپنے معاشرے سے یہ سوال بھی ضرور پوچھتے ہیں کہ کیا اس طرح کی خدمات امیروں کو امیر رکھنے اور غریبوں کو غریب رکھنے کا ذریعہ تو نہیں بن جاتیں؟ یوں کہیے کہ وہ ان خدمات کو اچھا کہتے ہوئے بھی کافی نہیں سمجھ سکتے۔ اور پھر ان کی سوچ یہ فیصلہ سناتی ہے کہ ہمیں نہ صرف غریبوں کی فوری اور ہنگامی ضروریات ہی پوری کرنی چاہئیں بلکہ ہمیں موجودہ انتہائی امیری اور انتہائی غریبی کی تفریق کو ختم کرنے کا علمبردار اور وسیلہ بھی بننا چاہیے۔

روحانی طور پر بیدار لوگوں کا یہ فیصلہ بالآخر انھیں اس میدان میں لے آتا ہے جسے سیاست جیسا بدنام نام دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں جہاں غریب اور متوسط طبقے کے لوگ شامل ہوتے ہیں وہاں خال خال ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جو یا تو خوشحال طبقے سے تعلق رکھتے ہیں یا اپنی محنت اور لیاقت سے خود خوشحال ہو چکے ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ سیاست سے کچھ لینے نہیں بلکہ کچھ دینے کے لیے آتے ہیں۔ خوشحال طبقوں سے سیاست میں آنے والے روحانی طور پر بیدار افراد کی تین قریبی مثالیں: (1) سابق وزیراعظم چین، چواین لائی (2) سابق وزیراعظم بھارت، جواہر لال نہرو، (3) سابق وزیراعظم پاکستان، ذوالفقار علی بھٹو۔ اور اپنی محنت اور لیاقت سے خوشحال ہو کر سیاست میں آنے والوں کی ایک بہترین مثال: بانیٔ پاکستان، محمد علی جناحؒ۔

عجیب بات یہ ہے ہمارے نیک اور شریف لوگ بہت کم سیاست کا رُخ کرتے ہیں۔ ان کے بقول یہ گندہ کام ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ پھر رسولِ خدا نے ایک ریاست کی بنیاد کیوں رکھی تھی اور اس کے سربراہ کیوں بنے تھے؟ پھر ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور حیدر کرارؓ خلیفہ بننے پر کیوں تیار ہو گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ سیاست میں آئیں گے تو موجودہ ظالمانہ اور استحصالی نظام بدلے گا جس نے غریب اور شریف لوگوں کی مٹی پلید کر کے رکھ دی ہے اور عالمِ اسلام کے عوام اور اقوام کو ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں دیا۔

روحانیت اور عالمی امن

روحانی طور پر زندہ و بیدار لوگ جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے مقابلے میں امن کے علم بردار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ

Marfat.com

ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھے ہوتے بلکہ امن کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ امن کے پجاری نہیں، امن کے سپاہی ہوتے ہیں۔ انگریزی میں یہ کہیں گے کہ وہ Pacifists نہیں، Activists ہوتے ہیں۔ وہ امن کے لیے صرف سوچتے ہی نہیں، اس کے لیے صرف دعائیں ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے بولتے، لکھتے، احتجاج کرتے، تحریکیں چلاتے، اور اگر جنگ ناگزیر ہو جائے تو ثابت قدمی سے لڑنے مرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ خدائے رحمان ورحیم اور محمدؐ رحمۃ للعالمین سے زیادہ امن کا کون علمبردار ہوگا لیکن یہی رحمان ورحیم خدا قرآنِ حکیم میں رسولِ خدا کو حکم دیتا ہے کہ ''تم، جہاں تک تمھارا بس چلے، قوت اور سامانِ جنگ تیار رکھو تاکہ خدا کے دشمن اور تمھارے دشمن تم پر حملہ کرتے ہوئے خوفزدہ ہوتے رہیں'' (8:60)۔ دشمن کی خوف زدگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ جنگ نہ ہو اور اگر بدی اور برائی کی طاقتیں جنگ پر مجبور ہی کر دیں تو نیکی اور اچھائی کے علمبرداروں پر غالب نہ آسکیں۔ اسی فلسفے اور نظریے کو ہمارے دور میں بہت سے ایسے لوگوں نے بھی اپنایا جو بنیادی طور پر امن پسند تھے۔ سب سے قابلِ ذکر مثال سویڈن کے مشہور سخی داتا، الفریڈ نوبل (Alfred Nobel) کی ہے۔ وہ اسلام سے تو واقف نہیں تھا لیکن اسے یہ قدیم رومن کہاوت یاد تھی کہ ''جو امن چاہتا ہے اُسے جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے''۔ وہ اس سوچ کا سپاہی بن گیا۔ مگر اس کے اس عمل کے پیچھے ایک ایسی روحانی واردات کا گہرا ہاتھ تھا جس سے اکیسویں صدی کے لوگ کم ہی واقف ہیں۔

اکثر لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ نوبل نے دھماکا خیز مواد (Dynamite) ایجاد کیا تھا لیکن اس بات کا آج کل ذکر نہیں ہوتا کہ جن دنوں وہ ڈائنامائیٹ کے تجربات کر رہا تھا تو ایک تجربے کے دوران ایسا حادثہ پیش آیا جس میں اس کا اپنا سگا بھائی ہلاک ہو گیا۔ بے شک نوبل اپنے زمانے میں دنیا کا ایک امیر ترین شخص تھا لیکن اس نے یہ ساری دولت ہلاکت خیز ڈائنامائٹ کی ایجاد اور ہتھیاروں کی سمگلنگ سے حاصل کی تھی۔ اس کے اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کی موت نے اس کے اندر ضمیر کا ایسا بحران پیدا کر دیا کہ اُس نے اپنی ساری دولت فزکس، کیمسٹری، میڈیسن (طب) ادب، اور امن کے فروغ کے لیے وقف کر دی۔ چنانچہ 1901ء سے ہر سال کئی کروڑ روپے ان شعبوں میں قابلِ قدر اضافہ کرنیوالوں کے درمیان ''نوبل پرائز'' کے نام سے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امن کا انعام افراد کے علاوہ کئی تنظیموں کو بھی دیا جا چکا ہے جن میں اقوام متحدہ کی سپاہِ امن (Peacekeeping Force) خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں یورپ میں بہت سے ''امن اجلاس'' (Peace Congresses) منعقد ہوئے تھے۔ ان سب میں اس بات پر اصرار کیا گیا تھا کہ دنیا میں پائیدار امن کے حصول کا یہی طریقہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کی اصلاح کی جائے اور قوموں کے درمیان ایسے جھگڑوں میں ثالثی کرنے والے ادارے قائم کیے جائیں جن سے جنگ کا خطرہ ہو۔ اس دور کے کچھ نیک دل لوگوں کا ہمارے دور کے کچھ نیک دل لوگوں کی طرح یہ خیال تھا کہ تعلیم اور تلقین سے دنیا بھر کے انسانوں کی اس طرح اصلاح کی جائے کہ وہ جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کی جانورانہ جبلّت کو ترک کر دیں اور اس کی جگہ امن وامان کی طرف مائل ہو جائیں۔

Marfat.com

نوبل کو ان دونوں تجویزوں سے اختلاف تھا۔ اس نے 1890ء کی پیرس میں منعقد ہونے والی امن کانگریس میں بڑی شدومد سے یہ خیال پیش کیا کہ ''اگر ہم جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ایسے ہلاکت خیز ہتھیار بنانے چاہئیں جن سے صرف محاذِ جنگ پر لڑنے والی فوجوں ہی کا قلع قمع نہ ہو بلکہ ساتھ ہی جنگ کا فیصلہ کرنے والی پوری کی پوری قوموں کا خاتمہ ہو جائے''۔ نوبل نے اپنے اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے تجویز پیش کی کہ ہر قوم اور ریاست کے پاس ایسے ہلاکت خیز ہتھیار ہونے چاہئیں کہ کوئی اور قوم یا ریاست اس پر حملہ کرنے کی جسارت ہی نہ کرے۔ نوبل انعامات تقسیم کرنے والی نوبل فاؤنڈیشن اسی مقصد کے لیے قائم کی گئی تھی کہ اس طرح کے ہتھیاروں کی تیاری کے لیے تحقیق میں مدد دے۔ نوبل نے ایٹم بم ایجاد تو نہیں کیا لیکن اس کے امن پرور استعمال کا خواب سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا اور اس کے لیے زبانی اور عملی سطح پر آواز اٹھائی تھی۔

1945ء میں دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے میں ایٹم بم نے جو کردار ادا کیا اس سے نوبل کے اس خیال کی تائید ہو گئی۔ جاپان کے دو شہر، ہیروشیما اور ناگاساکی تو ایٹم بم کی نذر ہو گئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت سے آج تک سیکڑوں چھوٹی موٹی جنگوں کے باوجود کوئی جنگِ عظیم نہیں ہوئی۔ نوبل کی یہ تجویز تو زیرِ عمل نہیں آئی کہ ہر ملک کے پاس ایسے ہتھیار ہونے چاہئیں لیکن جیسے ہی امریکہ کے بعد چند دوسرے ملکوں، خصوصاً سرد جنگ کے دوران امریکہ کے حریف رُوس نے بھی ایٹم بم بنالیا تو ایٹم بم کا پھیلاؤ جنگ کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔ انگریزی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ The proliferation of the Atomic bomb became a deterrent۔ چین، بھارت اور پاکستان نے اسی نظریے کا سہارا لے کر ایٹمی طاقتیں بننے کا جواز پیش کیا تھا اور آج ایران اور شمالی کوریا بھی اسی راستے پر گامزن ہیں۔ لیکن جُوں جُوں ایٹم بم کے حامل ملکوں میں اضافہ ہو رہا ہے یہ خطرہ بھی بڑھ رہا ہے کہ کسی ملک کی لاپروا قیادت آگا پیچھا سوچے بغیر یہ ہتھیار استعمال کر بیٹھے تو پھر جواب الجواب کارروائی سے ہماری یہ ساری زمین، اس کے زندگی افروز وسائل اور اس پر آباد ساری انسانیت تباہ ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مرفی کے قانون (Murphy's Law) کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کے مطابق ''جس چیز کا غلط استعمال ہو سکتا ہو، ایک نہ ایک دن اس کا غلط استعمال ہو ہی جاتا ہے''۔

ہمارے دَور میں جن روحانی طور پر زندہ و بیدار لوگوں نے ہلاکت خیز ہتھیاروں کی تیاری کی سب سے زیادہ اور مدلّل مخالفت کی ان میں مشہور حساب دان، فلسفی اور معاشرتی مبصر برٹرینڈ رسل پیش پیش تھے۔ جیسے ہی ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرا، رَسل نے ''بم اور تہذیب'' (The Bomb and Civilization) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر ہم انسانی تہذیب کو بچانا چاہتے ہیں تو امریکہ سمیت ہر اُس ملک کو جو ایٹم بم بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے اپنی تحقیقات کسی عالمی ادارے کے سپرد کر دینی چاہئیں۔ اسی سال ایک ایسا عالمی ادارہ ''اقوامِ متحدہ'' کے نام سے بن تو گیا لیکن ایٹمی تحقیقات اس کے سپرد نہ ہوئیں اور یوں بالآخر روس، برطانیہ، فرانس، چین، بھارت، پاکستان اور برازیل جیسے کئی ممالک نے ایٹمی ہتھیار بنالیے۔ رسل کی خواہش اور خیال تھا کہ امریکہ اس معاملے میں ایسا قائدانہ

کردار ادا کر سکے گا جس سے ایٹمی ہتھیار اقوامِ متحدہ جیسے کسی عالمی یا بین الاقوامی ادارے کی تحویل میں آجائیں گے۔ مگر ایسا بالکل نہ ہو سکا۔

امریکہ آج کل دوسرے تمام ملکوں پر تو زور ڈالتا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکنے کے بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر دیں لیکن ابھی تک اس نے خود اپنے دستخط نہیں کیے۔ الٹا اس کا کردار یہ ہو گیا ہے کہ اس نے جنگ کا ایک خطرناک نظریہ گھڑ لیا ہے جس کے مطابق کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر یہ کہہ کر پیشگی (Pre-emptive) حملہ کر سکتا ہے کہ اُسے اُس ملک سے حملے کا خطرہ تھا۔ اس نے افغانستان پر حملہ تو گیارہ ستمبر 2001ء میں نیویارک کے ورلڈ ٹاورز اور واشنگٹن میں پنٹگون (محکمہ دفاع) پر اسامہ بن لادن کی تنظیم القاعدہ سے وابستہ دہشت گردوں کے ''جہازی حملے'' کے جواب میں کیا تھا لیکن عراق پر حملے کے لیے اسے ''پیشگی جنگ'' کا یہ نظریہ گھڑنا پڑ گیا۔

برٹرینڈ رسل نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال عالمی امن کے امکانات اور اس کو درپیش خطرات کو واضح کرنے میں صَرف کر دیئے۔ اس بظاہر عقل پرست دہریے نے انسانیت کی بقاء کے لیے ایسی اخلاقی قدروں کی افزائش پر زور دیا جو عموماً آسمانی صحیفوں، پیغمبروں اور روحانی پیشواؤں سے مخصوص ہیں۔ اس دہریے نے تو بیس سال تک زبانی اور تحریری سطح پر امن کی جنگ لڑی۔ لیکن افسوس کہ خدا کو ماننے کا دعویٰ کرنے والوں نے خدا کے نام پر خدا کے بندوں کو جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کا مسلسل نشانہ بنائے رکھا۔

انسان ہمیشہ ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور اپنا سب سے بڑا دشمن رہا ہے۔ فرشتوں نے آدمی کی تخلیق کے موقع پر خدا سے احتجاج کیا تھا کہ جناب آپ یہ کیا کرنے چل دیئے ہیں، یہ خدا کا بندہ تو بہت خون خرابہ کرے گا۔ آدم کی پہلی پہلی اولادوں میں قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل وہ نقطۂ آغاز ہے جس کے انجام کے طور پر پوری دنیا اور ساری انسانیت تباہ ہو سکتی ہے کیونکہ اتنے ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنائے جا چکے ہیں کہ انسان اپنے ہاتھوں خودکشی کر سکتا ہے۔ یہی وہ امکان ہے جو روحانی طور پر زندہ و بیدار لوگوں کے لیے ایک چیلنج بن چکا ہے کہ وہ، ایک دو نہیں، تمام کے تمام، امن کے سپاہی بن جائیں۔

روحانیت اور خدا کی رفاقت

جب ہمارا روحانی سفر ہمیں اپنی ذات کے تمام اجزائے ترکیبی......جبلتوں، احساسات، جذبات، خیالات، اور عقائد......کو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کے بجائے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور ہماری ذات ایک وحدت میں ڈھل جاتی ہے تو ہم اپنے ماحول، اپنے معاشرے اور اپنی دُنیا میں خدا کے رفیق بن جاتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے دل اور دماغ کے بارے میں ایک وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔ دل صرف محبت، نفرت، حسد، رقابت، دوستی، رحم اور ترس جیسے جذبات کی آماجگاہ نہیں، اس میں تمنائیں، آرزوئیں اور خواہشیں بھی پلتی رہتی

Marfat.com

ہیں۔ اسی طرح دماغ میں بھی صرف حافظہ، یادیں، نظریات اور خیالات نہیں ہوتے، خواب اور تخیلات بھی ہوتے ہیں۔ انسان اپنے تخیل کے ذریعے سے اپنے دل و دماغ کی دوسری صلاحیتوں سے کام لے کر ایسی تخلیقات کو جنم دے سکتا ہے جن کی کوئی مادی بنیاد نہ ہو۔ ادب، شاعری، موسیقی اور مصوری اس کی مثال ہیں۔ لوگ ایسی تخلیقات کو ''ہوائی قلعے'' کہہ کر نظر انداز بھی کر سکتے ہیں لیکن یہ ہوائی قلعے جہاں انسانی تہذیب کی جان ہوتے ہیں وہاں انسان اور خدا کے درمیان مشترکہ قدر بھی سمجھے جاتے ہیں۔

خدا کی جس صفت (Attribute) کے حوالے سے انسان خدا کا رفیق بنتا یا بن سکتا ہے وہ تخلیق ہے۔ خدا نے اپنے آپ کو ''الخالق'' یعنی (The Creator) ضرور کہا ہے جس کا مطلب ہے کہ تخلیق کا سرچشمہ خدا ہی ہے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو ''احسن الخالقین'' (سب خالقوں سے بہتر خالق) کہہ کر یہ گنجائش بھی پیدا کردی ہے کہ ''کوئی اور'' بھی تخلیق کر سکتا ہے اگر چہ وہ خدا کے پائے کا خالق نہیں ہو سکتا۔ یہ ''کوئی اور'' انسان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تخیل یا قوتِ متخیلہ (Imagination) جو ہر تخلیق کی بنیاد ہوتی ہے خدا کی تمام تر مخلوقات میں (کم از کم فی الحال) صرف اور صرف انسان ہی کو نصیب ہے۔

(چلتے چلتے: وہ خدا جو غلط کار انسانوں کو بندروں اور سؤروں میں بدل جانے کا حکم دے سکتا ہے (القرآن 5:60)، وہ نیکوکار ہاتھیوں یا گھوڑوں کو وہ علمی اور روحانی صلاحیتیں بھی عطا کر سکتا ہے جنھیں انسان نے خیر و خوبی پیدا کرنے کے بجائے بدی اور بدصورتی پیدا کرنے پر لگا رکھا ہے)۔

ہوا کے پرندے ہوں یا جنگل کے چرندے اور درندے، یہ سب تعمیر کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن تخلیق کی نہیں۔ چڑیاں نہ جانے کتنی ہزار صدیوں سے اپنا گھونسلا بنا رہی ہیں لیکن جیسا گھونسلا انھوں نے دس ہزار سال پہلے بنایا تھا آج بھی وہ ہو بہو اسی کی نقل کیے جا رہی ہیں۔ پھر ایک قسم کی چڑیا ایک ہی جیسا گھونسلا بناتی ہے۔ یہ انسان ہے جو صرف گھر ہی نہیں، آئے دن گھر میں استعمال کی ہر شے کو نئے سے نئے انداز سے بناتا رہتا ہے۔ اسی طرح سفر کے لیے اس نے گھوڑوں، گدھوں، خچروں اور اونٹوں پر اکتفا نہیں کی بلکہ گاڑی بنا کر ان سب کو گاڑی میں جوت ڈالا ہے۔ یہی نہیں، اس نے سائیکل، موٹر سائیکل، کار، کشتی، بادبانی جہاز، بھاپی جہاز، ہوائی جہاز اور خلائی جہاز (Space Shuttle) بھی ایجاد کر لیے ہیں۔

جھونپڑیوں سے محلات تک انسان کی رہائش گاہ نے کیا کیا شکل نہیں بدلی۔ اسی طرح لباس کے سلسلے میں فیشن انڈسٹری کسی اور مخلوق کے یہاں نظر نہیں آتی۔ پھر یہ انسان ہی ہے جس نے اپنے آپ کو تباہ کرنے کے لیے جدید ترین اور مہلک ترین ہتھیار بھی بنا لیے ہیں اور کروڑوں انسانوں کی بھوک ننگ اور بیماری سے آنکھ چرا کر وہ اپنے وسائل کا زیادہ حصہ مزید مہلک ہتھیاروں کی تیاری پر صرف کر رہا ہے۔ انسان کی یہ سب اچھی بُری تخلیقات اس کے تخیل کا کارنامہ ہیں جس میں اس کی تمنائیں، آرزوئیں، خواہشیں اور خواب ''خام مال'' کا کام کرتے ہیں۔ اب یہ صاحب اختیار انسان کا اپنا فیصلہ

Marfat.com

ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے مثبت کام لے یا منفی، انھیں دنیا کو جنت نظیر بنانے پر لگائے یا جہنم زار بنانے پر۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان روحانی طور پر جس قدر زندہ و بیدار ہوگا اتنا ہی وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی سرکردگی میں اپنی ذات کی تمام صفات کو یکجا کر کے اور انھیں ایک دھارے کی شکل دے کر، ایسی ایجادات اور تخلیقات پر صَرف کرے گا جن سے اسے نہ صِرف خود فائدہ ہو، دوسرے انسانوں بلکہ زمین اور زمین پر آباد تمام مخلوقات کو فائدہ ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں صاحب تخلیق انسان احسن الخالقین خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ خدا انسان کی زبان سے بولتا ہے، اس کے قلم سے لکھتا ہے، اس کے ہاتھ سے کام کرتا ہے، اس کے دل سے محسوس کرتا اور اس کے ذہن سے سوچتا ہے۔ اب انسان کے اندر خدا کی روح کا تار، روحِ خداوندی سے جُڑ جاتا ہے۔ پیغمبر اس مقام پر وحی سے نوازے جاتے ہیں، بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کو کشف و الہام نصیب ہوتا ہے اور سائنس دانوں، فلسفیوں، ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور رہبروں کو وجدان کی نعمت ملتی ہے۔ وہ تمام لوگ جنھیں ایجاد و تخلیق کا شرف حاصل ہے، گواہ ہیں کہ ان کی تحقیق و تلاش کو وجدان کا شعلہ ہی تخلیق کا درجہ عطا کرتا ہے۔ تخیل انسان کی آخری حد ہے۔ وجدان خدا کا پہلا قدم ہے۔ دونوں جس مقام پر باہم ملتے ہیں اُسے تخلیق کہا جاسکتا ہے۔

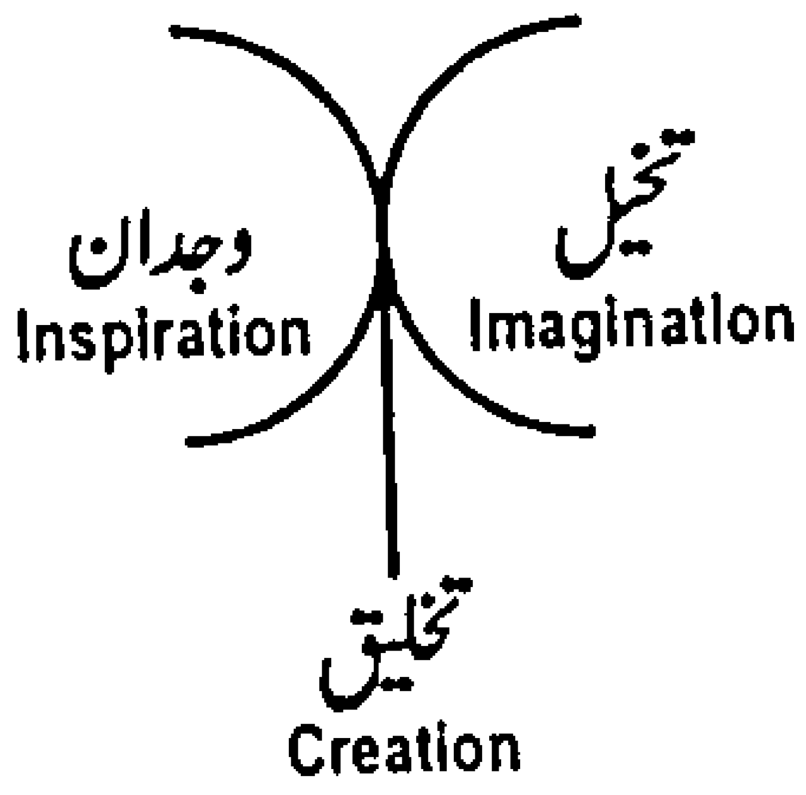

اقبالؔ اپنے تیسرے انگریزی خطبے: ''خدا کا تصور اور دعا کے معنی'' میں وضاحت کرتا ہے کہ اپنے آس پاس اور اِردگرد کی چیزوں اور جانداروں کے مقابلے میں انسان اپنی ذات کی یکسوئی کی بدولت خدا کی قوتِ تخلیق میں ایک مرکزی مقام رکھتا ہے۔ چنانچہ جب انسان اپنی ذات کا پورا پورا شعور حاصل کر کے اپنے تشخص کو مستحکم کر لیتا ہے تو اس کی ''حقیقت'' بھی مستحکم ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> ''خدا کی تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی اس قابل ہے کہ اپنے خالق کی تخلیقی زندگی میں شعوری طور پر حصہ لے سکے۔ انسانیت کے لامتناہی سفر میں انسان کو زندگی کی جن گوناگوں صورتوں سے سابقہ پڑتا ہے، اس کی ذات، اپنے یگانہ اور ہمہ گیر تشخص کی خاطر ان سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہتی ہے کیونکہ تخیل کی طاقت سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر وہ ایک بہتر زندگی کا تصور کر سکتی ہے اور ''جو ہے'' کو ''جو ہونا چاہیے'' کی شکل دے سکتی ہے۔''

Marfat.com

اقبال نے اپنے اس خیال کو اپنی ایک فارسی نظم: ''محاورہ مابین خدا اور انسان'' میں یہ الفاظ دیے ہیں:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(تو نے رات بنائی، میں نے چراغ بنادیا۔ تو نے مٹی کا پیالہ بنایا، میں نے ساغر بنادیا۔ تو نے بیابان، پہاڑ اور جنگل بنائے، میں نے کیاریاں، گلزار اور باغ بنادیے۔ میں وہ ہوں جس نے پتھر سے آئینہ بنا دیا۔ میں وہ ہوں جس نے زہر سے مشروب بنادیا)۔

عام طور پر صوفی اور صوفی منش لوگ روحانیت کی انتہا یہ سمجھتے ہیں کہ حال پر راضی رہا جائے۔ حال پر راضی رہنا ایک بہت اہم مقام ہے۔ ماضی کی یادوں اور مستقبل کے خوابوں میں گھرا ہوا انسان اکثر حال سے غافل ہوجاتا ہے اور خدا نے حال پر جو کچھ عطا کر رکھا ہوتا ہے نہ تو اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اور نہ ہی حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ برگزیدہ صوفیوں کو اسی لیے صاحبانِ حال کہا جاتا ہے کہ وہ حال کی عطا پر خدا کے شکرگزار بھی ہوتے ہیں اور خدا کے ازلی و ابدی احکامات پر حال کے تقاضوں کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے اپنے دائرۂ اثر میں ان دو باتوں کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

لیکن حال پر شکرگزاری اور حال کے تقاضوں کے مطابق خدا کے احکامات پر عمل کا یہ مطلب نہیں کہ ہم حال مست اور کھال مست ہوجائیں۔ حال مستی اور کھال مستی ہی کا دوسرا نام خانقاہیت ہے۔ یہ رویہ ان لوگوں کے لیے شاید درست ہو جن کا خدا چھ دنوں میں تخلیقِ دنیا اور تخلیقِ آدم کرنے کے بعد ساتویں دن فارغ ہوکر آرام کرنے بیٹھ گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں کا خدا ہر لحظہ نئی سے نئی تخلیق میں مصروف ہے وہ اس کی پیروی میں خود بھی مستقبل کو حال سے بہتر بنانے کے لیے دُعا کرنے، خواب دیکھنے، منصوبے بنانے اور پھر ان دعاؤں، خوابوں اور منصوبوں کو عملی سطح پر آگے بڑھانے میں اپنی ذمہ داری نباہنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔

مستقبل کیا ہے؟

روحانی طور پر زندہ و بیدار انسان کے لیے مستقبل اور آخرت میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ آخرت ہمارے مرنے کے بعد شروع نہیں ہوتی، حال کے اگلے لمحے سے شروع ہوجاتی ہے۔ ہم جو اچھا یا بُرا، صحیح یا غلط قول و فعل انجام دیتے ہیں اس کے نتائج اگلے لمحے سے شروع ہوجاتے ہیں۔ ہم کسی کو گالی دیتے ہیں، اگلے ہی لمحے اس کے جواب میں ہمارے مُنہ پر

Marfat.com

ایک تھپڑ پڑ جاتا ہے۔ ہم آج ایک پودا لگاتے ہیں، چند روز میں اس پر پھول آجاتے ہیں۔ کوئی چوری، ڈاکا، قتل، آتش زنی یا دہشت گردی کرتا ہے، ممکن ہے اُسے عدالتوں سے سزا ملنے میں کچھ دیر بھی ہو جائے لیکن اُس کا ضمیر اُسے دوستوایفسکی (Dostoevsky) کے ناول "جرم و سزا" کے ہیرو کی طرح سزا ہونے سے پہلے ہی سزا دینے لگتا ہے۔ اسی طرح بدکاری اور بے حیائی کرنے والوں کے جسموں پر بادلیئر (Baudelaire) کے الفاظ میں "بدی کے پھول" بھی اپنے آپ ہی کِھل اٹھتے ہیں، عدالتیں سزا دیں یا نہ دیں۔

بے شک آخرت صرف دُینوی زندگی کے زمانۂ مستقبل تک محدود نہیں بلکہ موت کے بعد کی زندگی تک پھیلی ہوئی ہے لیکن شروع یہ حال کے فوراً بعد ہی ہو جاتی ہے۔ اس لیے روحانی طور پر زندہ و بیدار انسان حال پر راضی رہنے کے باوجود اُن باتوں پر سوچتا رہتا ہے جن سے نہ صرف اس کے اپنے حالاتِ زندگی بہتر ہو جائیں بلکہ اس کے اردگرد بسنے والے دوسرے انسانوں کا بھی بھلا ہو جائے۔ یہی نہیں، وہ اپنی سوچ کو لباسِ عمل پہنانے کے لیے دل و جان سے کوشش اور جدوجہد بھی کرتا ہے۔ صرف اسی طرح انسان اپنے زندہ خدا کی رفاقت کا حق ادا کر سکتا ہے۔

روحانیت اور ہماری روح

روحانیت میں سب سے مقدم اور سب سے اہم بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہم اپنے خالق و رازق خدا سے محبت کریں۔ اس محبت کی بنیاد ہمارا یہ ایمان ہے کہ خدا خیر، صداقت اور حُسن کی انتہا ہے...... وہ اچھا ہے، سچا ہے، پیارا ہے۔ خدا سے ہماری محبت اور خدا کے اچھے، سچے اور پیارے ہونے پر ہمارے ایمان کا صرف اور صرف ایک ثبوت ہے کہ ہم انسانیت سمیت خدا کی ہر تخلیق کو اچھا، سچا اور پیارا سمجھیں۔ ہمارا یہ رویہ جہاں خدا پر ہمارے ایمان کا ثبوت ہے وہاں وہ انسانوں کے درمیان امن کا ضامن بھی ہے۔

کسی ایک آیت کو اگر قرآنِ حکیم کا دِل اور روحانیت کی روح قرار دینا ہو تو سورہ الروم کی تیسویں آیت شاید اس اعزاز کی سب سے زیادہ حقدار ٹھہرے:

> "(اے محمدؐ اور محمدؐ کے نقشِ قدم پر چلنے والو) ہر شے سے نظریں ہٹا کر پوری یکسوئی سے اُس دین پر جما دو جسے خدا نے اُسی فطرت کے مطابق قائم کیا ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کے طریقِ تخلیق میں کبھی تبدیلی نہیں آتی۔ یہی قائم و دائم رہنے والا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے لاعلم ہیں۔"

اس عظیم الشان آیت میں معنی کا ایک جہان چھپا ہُوا ہے مگر اس کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ وہ خدا جو تمام تر تعریف کے لائق ہے (الحمدللہ) اُس سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اس کے کام میں کوئی عیب ہو اس لیے اس نے جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے وہ بھی لائقِ تعریف ہے۔ جن فطری اصولوں اور قوانین کے مطابق ساری خدائی وجود میں آئی، اسلام اور انسان بھی

Marfat.com

انھی اصولوں اور قوانین کے مطابق تخلیق ہوئے ہیں۔ گویا خدا بھی اچھا سچا اور پیارا ہے۔ یہ ہماری کائنات، فطرت اور دُنیا بھی اچھی، سچی اور پیاری ہے۔ سب انسان بھی اچھے، سچے اور پیارے ہیں۔ اسلام بھی اچھا، سچا اور پیارا ہے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ انسان انھی اصولوں اور قوانین کے مطابق پیدا کیا گیا جن سے خدا نے ساری خدائی بنائی ہے تو پھر ذرا یہ یاد کیجیے کہ انسان کی تخلیق کی بابت خدا نے یہ وضاحت بھی کر رکھی کہ '' لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (95:4) یعنی ''ہم (خدا) نے انسان کو بہترین حُسنِ توازن کے ساتھ پیدا کیا ہے''۔ اگر انسان گناہ، بدی اور عیب سے پاک پیدا ہُوا ہے تو یہ کائنات بھی گناہ، بدی اور عیب سے پاک ہے۔ ہم تو اچھے تھے ہی، اچھے خدا کی اس اچھی دنیا میں آباد خدا کی ساری مخلوق بھی اچھی ہے۔

اور آیئے، اس دلیل کی صداقت پر کائنات کے سب سے سچے انسان کی گواہی بھی سن لیں: رسُولِ خدا کا ارشاد ہے، ''انسان کا ہر بچہ پاکیزگی اور اطاعتِ خداوندی کی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے''۔ (بخاری)

پھر یہ بے ایمانی، گناہ، بدی، برائی، جھوٹ، بدامنی، بدصورتی کہاں سے آجاتی ہے اور انسان انسان کا دشمن کیوں بنا ہُوا ہے؟

یہ سب کچھ انسان کے اس اختیار سے پھوٹا ہے جس کی بناء پر وہ اپنی فطرت کے مطابق، فطری اصولوں اور قوانین کی پیروی کرتے ہوئے صراطِ مستقیم پر بھی چل سکتا ہے اور اس سے انحراف بھی کر سکتا ہے۔

انگریزی کا ایک عوامی محاورہ ہے کہ ''اگر تمھیں مجھ سے محبت ہے تو پھر تمھیں میرے کُتّے سے بھی محبت کرنی پڑے گی''۔ عجیب بات ہے کہ ہم اس عوامی محاورے کے وسیع تر معنی کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ خدا سے محبت کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ''اگر خدا سے محبت ہے تو بندگانِ خدا سے بھی محبت کرو''۔ یہی آخری جملہ روحانیت کی رُوح ہے: اگر خدا سے محبت ہے تو بندگانِ خدا سے بھی محبت کرو......

چونکہ بندگانِ خدا سے محبت کی بات روحانیت کے حوالے سے ہو رہی ہے اس لیے یہ دہرانے میں کوئی حرج نہیں کہ انسانوں کے درمیان جتنے بھی مذاہب رائج ہیں، ان میں روحانیت سب سے قابلِ ذکر قدرِ مشترک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت کو آلڈس ہکسلی (Aldous Huxley) سے لے کر فرتھ جاف شوآن (Frith Joff Schuan) تک، تمام اہلِ نظر نے ''دائمی فلسفہ'' (Perennial Philosophy) کا نام دیا ہے جو مذہبوں کے درمیان کھنچی ہوئی انسان ساختہ (man made) دیواروں کو نظر انداز کر کے ان کی مشترکہ قدروں اور بنیادوں کو اجاگر کرتا ہے۔ جو دعوت قرآنِ حکیم نے اہلِ کتاب کو دی تھی کہ '' یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ، تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ '' (اے اہلِ کتاب، آؤ اُس بات پر مل بیٹھیں جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، 3:64) روحانیت وہی دعوت تمام انسانوں کو دیتی ہے۔ روحانیت کہتی ہے: ''اے انسانو! جب یہ طے ہے کہ خدا، خدا کی ساری خدائی، خدا کے سارے بندے اچھے ہیں تو آؤ ایک دوسرے سے نفرت کرنے اور ایک دوسرے کو دُکھ دینے کے بجائے تمام بندگانِ خدا کے لیے ایک ایسی دنیا تعمیر

کرلیں جس میں ایمان، محبت، خیر، صداقت، اور امن ہو"۔

مسلمان ہونے کے ناتے ہم جانتے ہیں کہ ہمارا خدا صرف ہمارا ربّ نہیں، سب کا ربّ ہے کیونکہ، وہ ربّ المسلمین نہیں بلکہ ربّ العالمین ہے۔ اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے رسُولِ خدا صرف مسلمانوں کے لیے رحمت بن کر نہیں آئے بلکہ رحمۃ لِلعالمین ہونے کی بناء پر تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں۔ اور اسی طرح قرآنِ حکیم بھی صرف ہمارے لیے ذکر (ہدایت) نہیں بلکہ ذکر للعالمین ہوتے ہوئے تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ رسُولِ خدا کی وفات کے بعد یہ ان کے پیروکاروں کی ذمہ داری ہے کہ خدا کی ربوبیّت، محمدؐ کی رحمت اور قرآن کی ہدایت کو ہر دور میں ہر قوم، ہر مذہب اور ہر عقیدے سے وابستہ انسانوں تک پہنچائیں۔ اپنے دور میں رسُولِ خدا نے یہ کام محبت، برداشت، درگزر اور اخلاق واخلاص سے کیا تھا۔ ہمیں بھی یہ کام اسی انداز میں کرنا ہوگا۔ پھر جس طرح رسُولِ خدا نے دوسروں کو کوئی تلقین کرنے سے پہلے اس تلقین پر خود دوسروں سے بھی بڑھ کر عمل کیا تھا اسی طرح خود ہمیں بھی اپنے ایمان اور اعتقاد کی عملی تصویر بننا ہوگا۔

چونکہ رُوحانیت ہی وہ قدرِ مشترک ہے جو دنیا بھر کے انسانوں کے مذاہب اور عقائد کے درمیان پُل کا کام دے سکتی ہے اس لیے ہمارے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم روحانیت کی روح سے واقف ہوں اور ہمارا وجود اس روح کی چلتی پھرتی مثال ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم دوسرے انسانوں کے مذاہب اور عقائد کے ان پہلوؤں اور گوشوں سے بھی شناسا ہوں جو روحانیت کی رُوح سے قریب تر ہیں۔ ان پہلوؤں اور گوشوں کی مدد سے گویا ہم ان مذاہب اور عقائد کے پیروکاروں کی نبض پر ہاتھ رکھ سکیں گے اور یوں دنیا کو محبت، خیر، صداقت اور امن کا گہوارہ بنانے میں مدد دے سکیں گے۔

عام طور پر ہم دوسرے مذاہب اور عقائد سے ان کے گھٹیا درجے کے ترجمانوں کے ذریعے سے واقف ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کی دوسروں کے مذاہب سے واقفیت اِدھر اُدھر سے سُنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر مسلمان یہ خواہش رکھتے ہیں کہ اسلام اور رسُولِ خدا کے بارے میں صحیح واقفیت کے لیے دوسرے لوگ قرآنِ حکیم اور رسُولِ خدا کی مستند سوانح حیات سے رجوع کریں تو ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم ان کے مذاہب اور عقائد کے بارے میں ان کی بنیادی کتابوں سے استفادہ کریں۔ ورنہ وہی ہوتا رہے گا جو ہو رہا ہے کہ وہ اور ہم اپنے اپنے بہترین لوگوں کا ایک دوسرے کے بدترین لوگوں سے موازنہ کرکے اپنی اپنی جگہ فخر کرتے اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہیں گے۔

روحانیت کے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترنے والے افراد کے لیے اسلام میں "انسانِ کامل" کا تصور خاصا جانا پہچانا ہے۔ دوسرے مذاہب میں ایسے افراد کے لیے سینٹ، سیج، سنت، مہاتما، سِدھ، اور بدھ جیسے القاب استعمال ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کی خدائی کے ساتھ مکمل طور پر راضی اور ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی جڑیں ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن میں گہری گڑی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو دل وجان سے سنوارتے تو ہیں لیکن دنیا کے پیچھے بھاگتے نہیں۔ وہ اس صداقت کی عملی تصویر ہوتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اپنے جیسا "چہرہ مُہرہ"

Marfat.com

دے کر پیدا کیا تھا۔ ظاہر کہ یہاں چہرے مُہرے سے مراد خدا کی وہ صفات ہیں جو انسان میں اس وقت ظاہر ہو جاتی ہیں جب وہ اس حقیقت کو ایمان اور عمل کی سطح پر کبھی فراموش نہ کرے کہ خدا نے اس کے اندر اپنی رُوح پھونک رکھی ہے اور اُسے اپنی جبلتوں، احساسات، جذبات، خیالات، تخیلات اور عقائد کو اس رُوح کی کسوٹی پر پرکھنا اور اس کی روشنی میں استعمال کرنا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ اسلام اور دوسرے مذاہب اس سلسلے میں کس حد تک ہم خیال ہیں کہ خدا کے رستے پر چلنے والے اور خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگوں کا چہرہ مہرہ کیسا ہوتا ہے:

''وہ اہلِ ایمان یقیناً کامیاب ٹھہریں گے جو اپنی دعاؤں اور نمازوں میں خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور ہر طرح کی لغویات سے دور رہتے ہیں، اپنے مال اور جائیداد سے غریب لوگوں کے لیے زکوٰۃ نکالتے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنے نکاح میں آئی ہوئی عورتوں کو چھوڑ کر دوسری کسی عورت سے جنسی تعلق پیدا نہیں کرتے، اور امانتوں اور عہد و پیمان کا پورا پاس کرتے ہیں'' (القرآن، 8-1 : 23)۔

جو انسان وہی کرتا اور وہی کرنا چاہتا ہے جو اسے کرنا چاہیے، خدا اُسے مخاطب کر کے فرماتا ہے، ''اے نفسِ مطمئن! اپنے ربّ کی جانب اس اطمینان کے ساتھ آ کہ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ آ اور میرے (خدا کے) نیک بندوں میں شامل اور میری (خدا کی) خصوصی جنت میں داخل ہو جا'' (القرآن، 30-27:90)۔

''اے اہلِ ایمان! اپنے آپ کو خدا کے کردار میں ڈھال لو۔ جس طرح وہ سب سے محبت کرتا ہے، تم بھی سب سے محبت کرو'' حدیث، محمدؐ رسول اللہ (ابونعیم)۔

''جو شخص کردار میں کامل ہے، وہی ایمان میں کامل ہے'' حدیث، محمدؐ رسول اللہ (ابوداؤد)۔

''خدا کے تمام بندے خدا کے بچوں کی طرح ہیں اور جو لوگ خدا سے قریب تر ہوتے ہیں وہ خدا کے بچوں کے ساتھ خدا ہی کی طرح محبت کرتے ہیں''۔ حدیث، محمدؐ رسول اللہ (بیہقی)

''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس پر کسی کو قدرت حاصل نہیں؟ انسان فخر سے کہتا ہے کہ اس کے پاس غلط کاموں پر اُڑانے کے لیے بہت مال ہے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا محاسبہ کرنے والا کوئی نہیں؟ کیا ہم نے اُسے (عقل شعور حاصل کرنے کے لیے) دو آنکھیں اور (حق گوئی کے لیے) زبان اور ہونٹ نہیں دیے؟ اور کیا ہم نے اس پر حق اور باطل کے دو الگ الگ راستے واضح نہیں کر دیے؟ لیکن اس نے حق کا دشوار راستہ اختیار نہ کیا۔ اور میں بتاؤں کہ دشوار راستے سے کیا مراد ہے؟ یہ غلاموں کی گردنوں سے غلامی کا طوق اتارنا ہے، یہ تنگ دستی اور فاقہ کشی کے دنوں میں لاوارث رشتہ داروں اور بے یار و مددگار مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اور ان اہلِ ایمان میں شامل ہونا ہے جو ایک دوسرے کو بردباری اور رحم دلی کی تلقین کرتے ہیں۔ وہی ہیں جو راہِ حق پر ہیں'' (القرآن، 18-5:90)۔

''جو خدا سے محبت کرتا ہے، خدا اس سے محبت کرتا ہے اور جب خدا اپنے بندے سے محبت کرتا ہے تو خدا ہی اس

Marfat.com

کے کان بن جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے، خدا ہی اس کی آنکھیں بن جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے، خدا ہی اس کے ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ کام کرتا ہے اور خدا ہی وہ قدم بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے" حدیث، محمدؐ رسول اللہ (نوائی، 38)

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ" آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" لیکن میں (عیسیٰؑ) تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ (شر سے) نہ کرنا بلکہ جو کوئی تمھارے دہنے گال پر طمانچہ مارے تم دوسرا گال بھی اس کے آگے کر دو اور اگر کوئی تم پر نالش کر کے تمھارا کرتا لینا چاہے تو تم اپنا چوغہ بھی اُسے لے لینے دینا۔ اور جو کوئی تمھیں ایک میل بیگار میں لے جائے، اُس کے ساتھ دو میل چلے جانا۔ جو کوئی تم سے مانگے اُسے دو اور جو تم سے قرض چاہے اُس سے مُنہ نہ موڑنا۔

''تم یہ بھی سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا، '' اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت"۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے بھی دعا کرو تا کہ تم اپنے آسمانی باپ کی اولاد کہلاؤ۔ دیکھو، ہمارا آسمانی باپ اپنے سورج کو نیکوں اور بدوں، دونوں پر چمکاتا ہے۔ اسی طرح وہ بارش برساتا ہے تو نیکوں اور بدوں، دونوں پر برساتا ہے۔ اگر تم نے صرف اُن سے محبت کی جو تم سے محبت کرتے ہیں تو تم نے کیا تیر مارا؟ کیا لوگوں سے پیسے بٹورنے والے بھی ایسا ہی نہیں کرتے؟ اور اگر تم صرف اپنے بھائیوں کو سلام کرو (صرف انھی کے ساتھ امن سے رہو) تو تم میں اور غیر قوموں میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا تمھیں چاہیے کہ جس طرح تمھارا آسمانی باپ کامل ہے، تم بھی اسی طرح کامل ہو جاؤ" انجیل مقدس، متّی (5:38-48)۔

''سب سے بڑی حقیقت (پرماتما، خدا) اپنے آپ کو ان لوگوں کے شعور میں ظاہر کرتی ہے جنھوں نے اپنے آپ پر قابو (ضبطِ نفس) پایا ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سردی اور گرمی، دکھ اور سکھ، اور تعریف اور بد تعریفی میں یکساں مطمئن رہتے ہیں۔ اپنے ضبطِ نفس سے یہ لوگ انسانی شعور کی چوٹی پر جا پہنچتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے مٹی، پتھر اور سونے کے ڈھیلے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ اپنے گھر والوں، دوستوں، اور دشمنوں کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے اونچے مرتبے کا راز ہی یہ ہے کہ وہ پرماتما کی طرح اچھے، بُرے سب کے لیے برابر ہوتے ہیں" بھگوت گیتا (6:7-9)۔

''کسی نے مہاتما بدھ سے پوچھا، اچھائی کیا ہے اور بُرائی کیا ہے؟ آپ نے کہا، ''صراطِ مستقیم (The Way) پر چلنا اور سچ کو سینے سے لگائے رکھنا اچھائی ہے۔ اور جب انسان کا شوق اور ارادہ صراطِ مستقیم سے ہم آہنگ ہو تو وہ بُرائی ہے" بدھ مت سُوتر (42:15)۔

''سچا اسے کہیں گے جو دل سے سچا ہو۔ سچا اسے کہیں گے جو سچائی سے محبت رکھتا ہو" سِکھ مت، (آدگرنتھ)۔

''جو شخص تورات کو ذاتی اغراض سے بالا ہو کر خدا کی خاطر پڑھتا اور اس پر غور و فکر کرتا ہے اسے بہت ثواب اور اُجر ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ساری دنیا اس کی شکر گزار ہوتی ہے کیونکہ اب وہ سب کا دوست بن جاتا ہے، محبوب بن جاتا ہے، خدا کی ساری خدائی سے محبت رکھتا ہے، ساری انسانیت سے پیار کرتا ہے۔ تورات کا مطالعہ اور اس پر غور و فکر کے نتیجے میں وہ مجسم انکسار بن جاتا ہے اور وہ ہر شے اور ہر انسان سے عقیدت رکھتا ہے۔ اب انصاف، پاکیزگی، یکسوئی، حق گوئی اور

Marfat.com

وفا شعاری اس کا اوڑھنا بچھونا بن جاتے ہیں۔ برائی اور گناہ اس سے بھاگ جاتے ہیں اور اچھائی اور نیکی اس کے قریب آجاتے ہیں'' یئو دیت (بشناہ)۔

''اگر آپ کا پاؤں بازار میں کسی اجنبی کے پاؤں پر پڑ جائے تو اُس سے لمبی چوڑی معافی مانگنی پڑ جاتی ہے۔ اگر آپ اپنے بھائی کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیں تو ایک پیار بھری تھپکی سے بات بن جاتی ہے۔ اور اگر آپ کا پاؤں آپ کے والد یا والدہ کے پاؤں پر پڑ جائے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آپ کو پہلے ہی معاف کیا جا چکا ہے۔ یہی حال درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے لوگوں کا ہوتا ہے۔ جس نظر سے ماں باپ اپنے بچے کو دیکھتے ہیں، انسانِ کامل بھی ہر کسی کو اسی نظر سے دیکھتا ہے''

تاؤمت/ابدھ مت

اب آیئے، واپس قرآنِ حکیم کی جانب چلتے ہیں اور اس گفتگو کو خدائے رحمان ورحیم کے اِن عظیم الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

''خدائے رحمان کے خاص الخاص بندے وہی ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور اگر جاہل اور اکھڑ لوگ اُن کے مُنہ آئیں تو اُن سے اُلجھتے نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی راتیں اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں گزرتی ہیں اور جو دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا لے اس لیے کہ یہ عذاب بہت دردناک ہے اور وہاں ٹھہرنا بہت ہی دشوار ہے۔ وہ خرچ کرتے ہوئے نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں، نہ بخیلی بلکہ وہ ان دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔ وہ خدا کی محترم قرار دی ہوئی کسی (انسانی) جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے......

''اور خدائے رحمان کے خاص الخاص بندے وہ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور اگر کسی لغو (واہیات) صورتِ حال (Situation) سے ان کا گزر ہو جائے تو اس میں دلچسپی لیے اور شرکت کیے بغیر گزر جاتے ہیں

''خدائے رحمان کے خاص الخاص بندے وہی ہیں جنھیں خدا کا کلام سنا کر نصیحت کی جائے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر گر نہیں جاتے بلکہ اس پر غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ دُعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہمارے ازواج (خاوندوں، بیویوں Spouces) اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے اور ہمیں شرف دے کہ ہم ان سب لوگوں سے بڑھ جائیں جو خوشدلی سے تیری حکم برداری کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے صبر کا پھل اپنے بلند مقام (جنت) کی صورت میں پائیں گے جہاں ان کا عزت واحترام کے ساتھ استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ اور ٹھہرنا اور رہنا تو اس جنت پر ختم ہے'' (القرآن، 75-62:25)۔

حاصل کلام۔ اگر خدا سے محبت ہے تو بندگانِ خدا سے محبت کرو۔ اس سلسلے میں اقبالؔ کا ایک شعر بھی سن لیجیے:

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں، بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

Marfat.com

پندرھواں باب

رُوحانیت اور خواتین

''جس کی لاٹھی، اس کی بھینس'' کے مفروضے پر قائم ہونے والے معاشروں میں جسمانی طور پر طاقتور مرد نے عورت کو پیچھے دھکیل کر نہ صرف سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر چودھراہٹ سنبھال لی بلکہ عورت کو بھی یقین دلا دیا کہ وہ مرد سے کمتر ہے۔ اس بحث کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف رکھتے ہوئے کہ کیا خدا نے بھی عورت کو کمتر مقام دیا تھا اور کیا عورت فطری طور پر مرد سے کمتر تھی، ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پیغمبروں کی صف سے عورت کیوں غائب ہے اور روحانی میدان میں اس کا ذکر کیوں بہت مختصر ہے؟

یوں معلوم ہوتا ہے کہ جن قوموں میں زندگی کے ہر شعبے کی سربراہی مردوں کے ہاتھ میں تھی اس میں بہتری کی خاطر خدا نے مرد پیغمبروں ہی کو بھیجنا مناسب سمجھا ہوگا۔ اوّل تو مرد پیغمبروں سے بھی ان قوموں نے کوئی بہت اچھا سلوک نہ کیا تھا، پھر اگر ان کی جگہ خدا نے عورتوں کو بھیجا ہوتا تو رہی سہی کسر بھی نکل جاتی۔ مگر دنیا کی تاریخ میں کئی علاقوں میں ایسی قومیں بھی آباد تھیں جن میں عورتوں کی سربراہی رہی ہے۔ قرآنِ حکیم میں خدا نے وضاحت کی ہے کہ ''(اے محمدؐ) ہم نے تم سے پہلے بھی کئی رسول بھیجے تھے، جن میں سے کچھ کے حالات ہم نے تمھیں بتائے ہیں اور کچھ کے نہیں بتائے'' (40:78)۔ پھر خدا نے یہ بھی کہہ رکھا ہے کہ ''ہم نے ہر قوم کے لیے رسول بھیجے تھے'' (10:48)۔ اس لیے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ''عورتوں کی سربراہی والے معاشروں یا قوموں'' (Matriarchies) میں عورتوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہوگا۔ البتہ ان کے حالات قرآنِ حکیم میں درج نہیں کیے گئے۔

(چلتے چلتے: قرآنِ حکیم میں تو امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ، یورپ، روس، چین، اور ہندوستان کے مرد پیغمبروں کا بھی ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ ہر قوم کی جانب رسول بھیجنے والا خدا جغرافیے میں اتنا کمزور تو نہیں تھا کہ اُسے ان علاقوں میں آباد قوموں کے بارے میں علم ہی نہ ہو)

جس ایک بات نے مردانہ معاشروں میں عورت کو روحانی میدان میں بھی پیچھے رکھا وہ مردوں کی طرف سے عورتوں پر یہ الزام تھا کہ وہ تو ہمیشہ سے گناہ کی ترغیب دیتی آئی ہیں۔ اس جھوٹ کے ثبوت کے طور پر کہا گیا کہ آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ (The Forbidden Tree) کا پھل کھانے پر حوا نے راضی کیا تھا۔ اس جھوٹے الزام نے یہودی اور مسیحی معاشروں میں تو عورتوں کو کمتر ٹھہرایا ہی تھا، اس نے مسلمان معاشروں کو بھی بے حد متاثر کیا اور آج تک کر رہا ہے۔ ہمارے جیسے غیر عرب معاشروں کو تو پھر بھی معاف کیا جا سکتا ہے کہ ہم وہ عربی زبان نہیں جانتے جس میں قرآنِ حکیم نازل ہُوا تھا۔ لیکن عربی جاننے والے مسلمانوں پر افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآنِ حکیم کی صریح ترین وضاحت کے

Marfat.com

باوجود اس جھوٹے تصور کو آج تک کیوں پلّے باندھ رکھا ہے اور اس کے نتیجے میں عورتوں کو کئی انسانی حقوق سے کیوں محروم کر رکھا ہے۔

قرآنِ حکیم کی متعلقہ آیات کو دہرانے سے پہلے عربی گرامر کی ایک خصوصیت کا ذکر ضروری ہے۔ عام زبانوں، مثلاً اردو اور انگریزی میں تعداد بیان کرنے کے لیے صرف دو صیغے استعمال ہوتے ہیں: ایک کے لیے واحد اور ایک سے زیادہ کے لیے جمع۔ لیکن عربی میں ''دو'' کے لیے ایک خصوصی صیغہ رائج ہے جسے ''تثنیہ'' کہتے ہیں (اسی لفظ کا بھائی بند لفظ ''ثانی'' اردو میں بھی ''دوسرے'' کے معنی میں عام استعمال ہوتا ہے)۔ اب ہم قرآنِ حکیم میں قصۂ آدم کی طرف چلتے ہیں جس میں خدا نے تکرار اور اصرار کے ساتھ تثنیہ کا صیغہ استعمال کر کے بتایا ہے کہ شجرِ ممنوعہ کے سلسلے میں نافرمانی کرنے میں آدم اور حوا ''دونوں'' برابر کے شریک تھے۔

> ''پھر ہم (خدا) نے آدم سے کہا، ''تم اور تمھاری بیوی ''دونوں'' جنت میں رہو اور وہاں ''تم دونوں'' جو چاہو اور جتنا چاہو کھاؤ پیو لیکن ''تم دونوں'' اُس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ''تم دونوں'' ظالم (حد سے گزر جانے والے) قرار پاؤ گے۔ مگر (حوا نے آدم کو نہیں) شیطان نے ''ان دونوں'' کو ترغیب دی کہ ''وہ دونوں'' خدا کی حکم عدولی کریں۔ چنانچہ ہم نے ''ان دونوں'' کو (جنت سے) نکال دیا'' (2:35-36)۔

افسوس، ہمارے نام نہاد ''اسلام پسند'' عورت کو ''گناہ کی ترغیب'' کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور سڑکوں پر لگے ہوئے بورڈوں پر بنے عورتوں کے چہروں پر کالک پھیر کر ساری دنیا میں اس عظیم دین کے چہرے پر کالک پھیر رہے ہوتے ہیں جس نے تاریخ انسانیت میں سب سے پہلے اور ہر دوسرے مذہب سے بڑھ کر عورت کو عزت اور انسانی حقوق سے نوازا تھا۔ ہم مسلمانوں کو بہت شوق ہے کہ یہودیوں اور مسیحیوں کو طعنہ دیں کہ انھوں نے خدا کے کلام میں لفظی ترمیم (تحریف) کر لی ہے۔ افسوس، ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے خدا کے کلام کے لفظ تو نہیں بدلے مگر معنی ضرور بدل دیے ہیں۔

قرآنِ حکیم اوّل تو صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں، اس کے مخاطب آج اور آئندہ کی تمام انسانی نسلیں ہیں۔ ظاہر ہے ان نسلوں کی آدھی نفری عورتوں پر مشتمل ہے اور آئندہ بھی ہوگی۔ اسی طرح رسُولِ خدا کی نبوت، تعلیم، تلقین اور تربیت کا رخ بھی صرف مردوں کی طرف نہیں، عورتوں کی طرف بھی ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ مرد تو قرآنِ حکیم کے احکام اور رسُولِ خدا کی سیرت سے متاثر ہوئے تھے اور ہوتے ہیں مگر عورتیں نہیں، قرآنِ حکیم اور رسُولِ خدا کی شان میں گستاخی کی انتہا ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ گواہ ہے کہ اگر قرآنِ حکیم کے احکام اور رسُولِ خدا کی سیرت نے مردوں میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ جیسی عظیم الشان ہستیوں کو روحانی بلندیوں پر پہنچا دیا تو عورتوں میں خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ اور زینبؓ جیسی بے بدل شخصیتوں کو بھی روحانی عظمتوں سے نوازا۔

قرآنِ حکیم کے نزول سے پہلے اور بعد، آج تک عربی، فارسی، اور اردو ہی نہیں انگریزی میں بھی یہ رواج چلا آتا ہے کہ جب انسان کا ذکر کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ مغربی خواتین کے شدید احتجاج کے باعث انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں کچھ مصنفین اب یہ احتیاط کرنے لگے ہیں کہ جنسی تخصیص کرنے والے الفاظ استعمال نہ کریں۔ مثلاً آج اگر انسان کے لیے انگریزی میں Man اور انسانیت کے لیے Mankind کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو مغربی خواتین کو ان سے جنسی تخصیص کی بُو آتی ہے۔ چنانچہ محتاط مصنفین Man کی جگہ Human اور Mankind کی جگہ Humankind لکھ رہے ہیں۔ اس کے برعکس عربی، فارسی اور اردو شاعری میں آج تک عورت ہونے کے باوجود محبوب کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال ہو رہا ہے۔ اردو نظم میں اختر شیرانی جیسے کچھ شاعروں نے ضرور یہ کوشش کی کہ محبوب کی جگہ محبوبہ کا ذکر کیا جائے لیکن غزل میں محبوبہ ابھی تک محبوب ہی ہے۔ ناصرؔ کاظمی کے دو خوبصورت شعر سنیے:

موتی جیسی شکل بنا کر
آئینے میں تکتا ہو گا
میرے چومے ہوئے ہاتھوں سے
اوروں کو خط لکھتا ہو گا

اگر ہم اپنے شاعروں کا کلام پڑھتے ہوئے آسانی سے سمجھ لیتے ہیں کہ محبوب میں محبوبہ چھپی ہوئی ہے تو قرآنِ حکیم میں انسان کے ذکر میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شامل سمجھنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ پھر بھی قرآنِ حکیم کو آسان بنانے والے (وَلَقَدْ یَسَّرْ نا القرآن، 54:18) مہربان خدا نے ہم کم فہموں کی خاطر کئی مقامات پر کھول کھول کر واضح کر دیا کہ جب وہ انسانوں یا اہلِ ایمان سے خطاب کرتا ہے تو اس سے خواتین و حضرات، دونوں مراد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورہ ''الاحزاب'' کی 35ویں آیت ملاحظہ کیجیے:

> ''یقیناً وہ سب مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، خدا خوف مرد اور خدا خوف عورتیں، صدقہ شعار مرد اور صدقہ شعار عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، حیادار مرد اور حیادار عورتیں، اور خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور خدا کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں ہی ہیں جن کے لیے خدا نے بخشش اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

مسلمان خواتین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف رسُولِ خدا کی زندگی میں روحانی بالیدگی کا ثبوت دیا بلکہ عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک، ہر تعصّب اور بدسلوکی کے باوجود، روحانی طور پر زندہ و بیدار ہونے کا مظاہرہ کیا ہے۔ خود رسُولِ خدا، زندگی کے آخری سانس تک، خواتین سے حسنِ سلوک بلکہ ''مروّت'' کی تلقین فرماتے

Marfat.com

رہے جس کا مطلب تھا کہ خواتین کو ان کے حق سے بھی کچھ زیادہ دینا چاہیے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے، خدا کی ہستی پر ہر مذہب کے مفکروں نے غور کیا ہے۔ اسلام سمیت اکثر مذہبوں میں خدا کے جلال اور خدا کے جمال کی بات ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ جو شریعت یا قانون پر بہت زور دیتے تھے انھیں خدا کا ''رُخِ جلال'' اور حضرت عیسیٰؑ جو طریقت یا محبت پر بہت زور دیتے تھے انھیں خدا کا ''رخِ جمال'' سمجھا جاتا ہے۔ رسُولِ خدا، خدا کے جلال اور جمال دونوں کا مظہر تھے۔ جلال کو انسانی فطرت کا مردانہ پہلو (Masculine Principle) اور جمال کو نسائی پہلو (Feminine Principle) کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح شریعت، خوفِ خدا، یا قانون کو دین کا مردانہ پہلو اور طریقت، خدا کی محبت یا روحانیت کو دین کا نسائی پہلو قرار دیا جائے گا۔ لغوی اعتبار سے بھی اگر انسان کا دل اور دماغ مذکر ہیں تو جان اور رُوح مؤنث ہیں۔ گویا فطری طور پر مرد شریعت سے قریب اور عورت روحانیت سے قریب ہوتی ہے۔ اس طرح مردوں کو تو روحانیت کے سفر میں شعوری محنت کرنی پڑتی ہے جبکہ خواتین رُوحانیت کی راہ میں فطری طور پر آسانی محسوس کرتی ہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ روحانی تذکروں میں مردوں کے مقابلے میں خواتین بزرگانِ دین کا ذکر بہت کم آتا ہے؟

وجہ سیدھی ہے۔ عورت فطری طور پر مرد سے بہت برتر ہے۔ وہ فطرت (مؤنث) کی چہیتی بیٹی ہے۔ مرد سے زیادہ عمر پاتی ہے، گنجی اور پاگل بھی کم ہوتی ہے، جذباتی طور پر مرد سے بہت پہلے بالغ ہو جاتی ہے، مرد سے زیادہ حساس ہوتی ہے، شراب سے کم رغبت رکھتی ہے اور خودکشی بھی کم کرتی ہے۔ (دلچسپی ہو تو ایشلی مان ٹیگو Ashley Montagu کی کتاب The Natural Superiority of Women ''عورت کی فطری برتری'' کا مطالعہ مناسب رہے گا)۔ آپ کو خرگوش اور کچھوے کی دوڑ والی کہانی تو یاد ہی ہو گی، بس یہ سمجھ لیجیے کہ فطرتاً عورت خرگوش اور مرد کچھوا ہے۔ کہانی کے خرگوش کی طرح عورت تن آسان ہے اور اس خیال سے راستے میں سو جاتی ہے کہ جب چاہوں گی دو چھلانگوں میں کچھوے سے آگے نکل جاؤں گی۔ مرد بیچارہ کچھوے کی چال چلتا چلا جاتا ہے اور اپنی محنت، مشقت اور مستقل مزاجی سے دوڑ جیت جاتا ہے۔ لیکن جب بھی عورت تن آسانی ترک کر کے اپنی فطری صلاحیتوں کو پورے عزم و استقلال سے بروئے عمل لے آتی ہے تو مرد اس کی ہوا کو بھی نہیں پہنچ پاتا۔ آپ ذرا اپنے اردگرد، آج کی دنیا پر، نظر ڈالیں تو آسانی سے اندازہ کر لیں گے کہ عورت ہر شعبۂ حیات میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے لیے آغازِ سفر کر چکی ہے۔

اسلام کی روحانی تاریخ میں خواتین کا کردار واضح کرنے سے پہلے یہ تمہید اس لیے ضروری تھی کہ اپنے انسانی حقوق کے لیے سرگرم آج کی مسلمان عورت کو تھوڑا مزید حوصلہ دیا جائے کہ جہاں وہ سیاست، معیشت اور معاشرت میں آگے بڑھ رہی ہے وہاں وہ مردوں کے مذہبی تعصبات سے بھی دامن چھڑا لے اور خدا، رسولؐ اور قرآن نے ان کے لیے جو بلند مقام و مرتبہ کھلا رکھا ہے اسے پا لے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ عورت کی روحانی اور اخلاقی بالیدگی پورے کنبے اور خاندان پر مثبت اثر ڈالتی ہے۔ پھر جس طرح بقیہ دنیا میں تدریس کا شعبہ، خصوصاً ہائی سکول تک، قریب قریب خواتین کے لیے مخصوص ہو گیا ہے، اس لیے آج نہیں تو کل ہمارے یہاں بھی یہی ہو کر رہے گا۔ اس صورت میں روحانی طور پر

Marfat.com

زندہ و بیدار خواتین گھر کے اندر اور گھر کے باہر، دونوں دائروں میں نو خیز و نوجوان بچے بچیوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت اور کردار سازی کر سکیں گی۔

آیئے، قرآنِ حکیم اور تاریخ اسلام میں غوطہ لگائیں اور چند ایسی محترم خواتین سے تعارف حاصل کریں جو روحانی طور پر ممتاز حیثیت کی مالک ہیں:

حضرت مریمؑ

خدا نے رسولِ خدا کی نبوت سے پہلے کی تین خواتین کا قرآنِ حکیم میں تعریفی انداز میں ذکر کیا ہے:

(1) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدۂ محترمہ حضرت مریمؑ، (2) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ اور (3) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پالنے والی فرعون کی بیوی۔

حضرت مریمؑ واحد خاتون ہیں جن کا ذکر قرآنِ حکیم میں نام لے کر کیا گیا ہے اور یہ نام کوئی ایک مرتبہ نہیں، 34 مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ یہی نہیں قرآنِ حکیم کی ایک اچھی خاصی طویل سورہ کا نام بھی ''مریم'' ہے۔ اس طرح اگر خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو رسولِ خدا کے لیے مثال بنایا تھا تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حضرت مریم کی پاکیزگی اور ''دنیا والوں کے مقابلے میں ان کی خدا خوفی'' کا تفصیلی ذکر کر کے انھیں تمام اہلِ ایمان خواتین کے لیے مثال بنایا تھا۔

ذرا خدا کے الفاظ سنیے:

> ''پھر وہ وقت آیا جب فرشتوں نے آ کر کہا، ''اے مریم! خدا نے تجھے برگزیدہ بنایا ہے اور پاکیزگی عطا کی ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر ترجیح دے کر تجھے اپنی خدمت کے لیے چُن لیا ہے'' (3:42)۔

جس خاتون کو خدا نے تمام دنیا کی عورتوں پر ترجیح دی ہو اور اپنی خدمت کے لیے چُن لیا ہو وہ یقیناً عہدِ نبوی کی مسلمان خواتین کے لیے بھی بہترین مثال قرار پائی ہوں گی۔ پھر چونکہ قرآنِ حکیم کے مطابق خدائے واحد نے سب پیغمبروں کو ایک ہی دین دے کر بھیجا تھا اس لیے بظاہر مسیحیت سے تعلق رکھنے کے باوجود حضرت مریمؑ اسی طرح پوری مسلمان تھیں جس طرح خدا نے حضرت ابراہیمؑ کے بارے وضاحت کی تھی کہ وہ نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی (مسیحی) بلکہ مسلم تھے۔ بلا خوف تردید حضرت مریم کو بھی مسلمان ہی سمجھنا چاہیے۔

وہ کونسی صفات ہیں جن کے باعث خدا نے حضرت مریم کو ایسا زبردست خراجِ تحسین پیش کرنا مناسب سمجھا؟

ان صفات کا ذکر بھی خدا ہی کے الفاظ میں سنیے:

> ''اور عمران (خاندان) کی بیٹی، مریمؑ نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ پھر ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح میں سے رُوح پھونک دی اور اس نے اپنے ربّ کے ارشادات اور

Marfat.com

اس کی طرف سے آنے والے آسمانی صحیفوں کی تصدیق کی اور یوں خدا کے حکم بردار بندوں میں شامل ہوگئی'' (66:12)۔

قرآنِ حکیم کے طالب علم جانتے ہیں کہ یہودیوں نے حضرت مریم کی پاکیزگی اور پاکبازی کو تسلیم کرنے کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے حوالے سے ''بہتانِ عظیم'' لگایا تھا (4:156) کہ ان کا حمل کسی گناہ کا نتیجہ تھا۔ خدا نے اس بہتانِ عظیم کی یکسر تردید کرتے ہوئے واضح کیا کہ مریم کو تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں تھا اور ان کا حمل خالصتاً خدا کی خصوصی مشیت کے تحت عمل میں آیا تھا۔ حضرت مریم کی برگزیدگی اس حقیقت میں تھی کہ جب وہ اپنے کنوارپنے میں خدا کے ایک معجزے کے طور پر حاملہ ہوگئیں اور یوں خدا نے ایک پاکیزہ ترین کنواری خاتون کو ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا تو انھوں نے ملامت کرنے والوں، طعنے دینے والوں اور انگلیاں اٹھانے والوں کی فکر نہ کی اور اپنے جسم و جان اور عزت و آبرو کو خدا کی مرضی کے سامنے جھکا دیا۔

مسیحیوں کے رومن کیتھولک فرقے میں حضرت مریم کی بے حد تعظیم کی جاتی ہے لیکن پروٹسٹنٹ فرقے میں آپ کا ذکر بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پروٹسٹنٹ مسیحیوں کے مقابلے میں ہم مسلمان حضرت مریم کی کہیں زیادہ عزت کرتے ہیں۔ عالمِ اسلام میں آج بھی لاکھوں مسلمان بچیوں کا نام مریم رکھا جاتا ہے۔ خود رسولؐ خدا کی ایک بیوی کا نام مریم (یا ماریہ) تھا جس سے خدا نے آپ کو نرینہ اولاد عطا کی۔ اس بچے کا نام ابراہیم تھا جو کچھ کم دو سال کی عمر میں وفات پا گیا۔

رومن کیتھولک مسیحیوں میں حضرت مریم کی بابت اس تصور کو بہت اہمیت دی جاتی ہے کہ وہ ازلی گناہ (Eternal Sin) سے پاک پیدا ہوئی تھیں اور ہمیشہ بے گناہ رہیں، خصوصاً جب وہ جنسی عمل دخل کے بغیر خالصتاً خدا کی قدرت سے حاملہ ہوگئیں۔ اس تصور کو ''پاک حمل'' (Immaculate Conception) کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم مسلمان اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ اس تصور کی جتنی واضح تائید اور مؤثر بنیاد قرآنِ حکیم نے پیش کی ہے خود انجیلِ مقدس نے بھی نہیں کی۔

حضرت موسیٰؑ کی والدۂ محترمہ

قرآنِ حکیم میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ محترمہ کا ذکر سورہ القصص میں آیا ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ فرعونِ مصر نے بنی اسرائیل کو کس طرح اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ یاد رہے کہ بنی اسرائیل حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے پیروکار تھے جو حضرت یوسفؑ کے وقت میں فلسطین سے جا کر مصر میں آباد ہو گئے تھے۔ جب حضرت یوسفؑ وفات پا گئے تو بنی اسرائیل کے ساتھ مصریوں کے سلوک میں تبدیلی آگئی۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل مصر میں تقریباً غلاموں جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ ان سے جان لیوا مشقت لی جاتی تھی۔ ایک وقت ایسا

بھی آیا کہ فرعون نے حکم دے دیا، آئندہ ان کی نرینہ اولاد کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل کی ایک خاتون کے یہاں لڑکا (موسیٰ) پیدا ہُوا تو وہ ڈری کہ فرعون کے گماشتے اس کے لختِ جگر کو قتل کر دیں گے۔ تب خدا نے موسیٰ کی والدہ پر وحی بھیجی:

''بچے کو دودھ پلاتی رہنا، اور جب تمھیں اس کی جان کا خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا۔ تم کوئی غم نہ کرنا اور نہ ہی خوفزدہ ہونا، ہم اُسے تمھارے پاس دودھ پلانے کے لیے واپس لے آئیں گے اور اُسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔''

حضرت موسیٰ کی والدۂ محترمہ کی روحانی عظمت یہی نہیں ہے کہ ربّ العالمین نے ان پر ''وحی'' نازل فرمائی بلکہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے دوسری ماؤں کی طرح اپنے بیٹے کو اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش نہ کی اور خدا کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی۔ قرآنِ حکیم اس واقعے سے قبل بتا چکا ہے کہ اسی طرح کا کڑا امتحان حضرت ابراہیمؑ کو بھی پیش آیا تھا جب وہ اپنے ایک خواب کی تعبیر کے طور پر اپنے بڑھاپے کے سہارے اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ابراہیمؑ تو ایسے جلیل القدر پیغمبر تھے کہ خدا نے انھیں اپنا دوست کہہ کر پکارا ہے اور انھیں فخرِ کائنات محمدؐ رسول اللہ کے لیے مثال قرار دیا ہے۔ موسیٰؑ کی والدہ تو ایک سیدھی سادھی خاتون تھیں اور پھر باپ کے مقابلے میں ماں کا دل تو اور بھی نرم ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو دریا میں بہاتے ہوئے ان کے دل پر کیا قیامت نہ گزری ہوگی؟ اُن کی اس کیفیت کو قرآنِ حکیم نے اِن خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے، ''موسیٰؑ کی ماں کا دل اڑا جا رہا تھا''۔ بہرحال اس روحانی طور پر عظیم خاتون نے اپنے دل کی نہیں، اپنے ربّ کی بات مانی اور صندوق (تابوت) میں موسیٰ کو لٹا کر بظاہر دریائے نیل کی موجوں کے لیکن دراصل خدا کے سپرد کر دیا۔

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ نیل کی موجیں موسیٰؑ کو فرعونِ مصر کے محلات تک لے گئیں جہاں فرعون کی بیوی نے انھیں پال لیا۔ تب سوال پیدا ہُوا کہ بچے کو دودھ کون پلائے گا (ابھی لوگ ہماری طرح ''چالاک'' نہیں ہوئے تھے کہ بوتل سے دودھ پلا دیتے) اور پھر یہ ہُوا کہ موسیٰ نے اپنی والدہ کے علاوہ کسی دوسری خاتون کا دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

''اس طرح ہم (خدا) موسیٰ کو اس کی اپنی ماں کے پاس واپس لے آئے تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور اس پر واضح ہو جائے کہ خدا کا وعدہ سچا تھا اور اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے'' (28:13)۔

چونکہ ''اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے'' اس لیے بہتر ہے کہ روحانیت کی راہ کے تمام مسافر حضرت مُوسیٰ کی والدۂ محترمہ کے حوالے سے خدا تعالیٰ کے حُکم کی تعمیل اور اس تعمیل کے نیک انجام کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔

Marfat.com

حضرت موسیٰؑ کو پالنے والی، فرعون کی بیوی

قرآنِ حکیم کی سورہ ''التحریم'' میں خدا نے دو پیغمبروں......نوحؑ اور لوطؑ ......کی نافرمان بیویوں کے کردار کو ایک بُری مثال کے طور پر پیش کرنے کے بعد دو خواتین کے کردار کو ایک اچھی مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ آخر الذکر دو خواتین میں سے ایک حضرت مریم ہیں اور دوسری فرعون کی بیوی ہے جس نے حضرت موسیٰ کو پالا تھا۔ حضرت مریم کا ذکر اس باب میں پہلے ہو چکا ہے۔ اب قرآنِ حکیم کے الفاظ میں فرعون کی بیوی کا ذکر سنیے:

> ''خدا اپنی حکم عدولی کرنے والوں (کافروں) کی مثال کے طور پر نُوحؑ ور لُوطؑ کی بیویوں کو پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے نیک بندوں میں سے دو بندوں کی زوجیت میں تھیں۔ مگر انھوں نے (راہِ حق میں اپنے خاوندوں کا ساتھ دینے کے بجائے دشمنانِ دین کا ساتھ دے کر) خیانت کی۔ دونوں پیغمبروں نے انھیں بہت بچانا چاہا لیکن ان نافرمان عورتوں کو وہ بھی خدا کے غضب سے نہ بچا سکے۔ ان دونوں عورتوں سے کہہ دیا گیا کہ'' جاؤ دوسرے جہنمیوں کی طرح تم بھی جہنم رسید ہو جاؤ''۔ اور اب خدا اپنے اوپر ایمان رکھنے والوں کی ایک اچھی مثال کے طور پر فرعون کی بیوی کو پیش کرتا ہے جس نے خدا سے یہ دعا کی تھی،'' اے میرے ربّ! مجھے اپنے ہاں جنت میں گھر عطا کر دے اور مجھے فرعون اور اس کے بُرے عمل سے بچا لے اور ظالموں کی قوم میں شمار نہ کر'' (66:10-11)۔

اس سے پہلے قرآن ہمیں اشارتاً بتا چکا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کی والدۂ محترمہ نے انھیں ایک صندوق میں لٹا کر دریائے نیل میں بہا دیا جو بہتے بہتے فرعونِ مصر کے محلات تک جا پہنچا تو شاہی کارندوں نے بچے کو فرعون کی خدمت میں پیش کر دیا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ بچہ بنی اسرائیل ہی میں سے کسی کا ہے چنانچہ فرعون نے اُسے قتل کروانا چاہا۔ پھر کیا ہُوا، قرآنِ حکیم کے اپنے الفاظ میں سنیے:

> ''فرعون کی بیوی نے فرعون سے کہا،'' یہ بچہ (جو اتنا خوبصورت ہے) میرے اور تمھارے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتا ہے، اسے قتل نہ کرواؤ۔ ہوسکتا ہے یہ ہمارے لیے مبارک ثابت ہو اور ہم اسے اپنا بیٹا ہی بنا لیں''۔ مگر وہ دونوں (فرعون کی بیوی اور اس کی بات مان لینے والا فرعون) یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔''

بہر حال اب تو ساری دنیا جانتی ہے کہ فرعون کی بیوی کی رحمدلی کے نتیجے میں خدا نے موسیٰؑ کو فرعون کی گود میں پال کر واضح کر دیا کہ ظلم کرنے والے، خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ فرعون کی بیوی کا اس منصوبہ بندی میں خدا کا آلہ کار بننا اپنی جگہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے اور یہی وجہ ہے کہ دو پیغمبروں کی ایسی بیویوں کی مثال دے کر جو خدا کی راہ پر

Marfat.com

چلنے کے بجائے اُلٹے راستے پر چل دی تھیں، خدا نے فرعون کی بیوی کا ذکر کیا جو کفر کے بجائے خدا پر ایمان رکھتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح پیغمبروں کے اپنے گھروں میں خدا کے نافرمان موجود ہو سکتے ہیں، اسی طرح ظالموں کے گھروں میں خدا کے فرماں بردار بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

فرعون کی بیوی کی رحمدلی یقیناً اس کی روحانی بالیدگی کی دلالت کرتی ہے لیکن اس نیک خاتون کی جو دُعا خدا نے پیغمبروں کی نافرمان بیویوں کے مقابلے میں اس کی برتری کے ثبوت میں پیش کی ہے اس سے اس خاتون کی روحانی عظمت کا ایک اور اہم تر پہلو بھی سامنے آجاتا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ بالغ ہو گئے اور انھیں پتا چل گیا کہ وہ مصر کے شہزادے نہیں بلکہ مصریوں کے غلام بنی اسرائیل میں سے ہیں تو انھوں نے بنی اسرائیل پر ڈھائے جانے والے مظالم پر احتجاج کرنا شروع کر دیا۔ تب وہ فرعون کے زیرِ عتاب آگئے۔ اس تمام عرصے میں یقیناً فرعون کی بیوی کی ہمدردیاں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ رہی ہونگی۔ اور آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خاوند کے مقابلے میں، جو بادشاہِ وقت تھا، لے پالک بیٹے کی حمایت کتنی مشکل ہوگی؟

پھر جب حضرت موسیٰ ایک طویل جلاوطنی کے بعد خدا کے پیغمبر اور بنی اسرائیل کے نجات دہندہ کے طور پر مصر میں واپس آئے تو اس وقت تک پہلا فرعون مر چکا اور نیا فرعون برسرِ اقتدار آچکا تھا۔ یہ نیا فرعون بے حد ضدی اور خودسر تھا۔ موسیٰؑ بار بار اس فرعون کو خدا کے عذاب سے ڈرانے شاہی محلات میں آتے جاتے تھے۔ قرآنِ حکیم کی سورہ طٰہٰ میں فرعون کے ساحروں (ساحِرُون کا لفظ علما کے لیے استعارے کے طور پر استعمال ہُوا ہے) اور موسیٰؑ کے درمیان مناظرے کا تفصیلی ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ مناظرہ ہزاروں لوگوں نے دیکھا اور سنا تھا جن میں فرعون، فرعون کا خاندان اور اس کے درباری بھی شامل تھے۔ جن عالموں یا ساحروں نے حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کیا تھا وہ سب کے سب خدا تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔ اسی طرح سورہ ''المومن'' میں جس معزز و محترم ہستی کے ایمان لانے کا ذکر ہے وہ بھی فرعون کا کوئی ممتاز درباری ہی ہو سکتا ہے جو بھرے دربار میں فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ فرعون کی بیوی کی قرآنی دُعا سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اپنے مُنہ بولے بیٹے، موسیٰؑ کی تلقین سے خداوند کریم پر پورا پورا ایمان لا چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ماں بیٹے میں الگ ملاقاتیں بھی ہوتی رہی ہوں۔ لیکن فرعون کے دربار میں اور پھر جشن کے موقع پر منعقد ہونے والے ساحروں کے ساتھ مناظرے میں تو اس محترم خاتون نے ضرور خدا کے وجود اور اس کے سچے دین کے حق میں حضرت موسیٰ کی دلیلیں سنی ہوں گی۔

اس خاتون کو اپنے عظیم منصوبے کا ذریعہ بنا کر خدا نے اسے جو عظمت بخشی تھی، جب اس عظمت میں خدا پر ایمان کی نعمت بھی شامل ہو گئی تو یقیناً اس کا رُوحانی درجہ اتنا بلند ہو گیا کہ خدا نے اسے تمام اہلِ ایمان کے لیے ایک اچھی مثال کے طور پر چُن کر اس کا قرآنِ حکیم میں ذکرِ خیر کیا اور یوں اُسے رہتی دنیا تک کے لیے یادگار بنا دیا۔ بے شک اقتدار کے ایوانوں میں رہنے والے عموماً زیادہ رحمدل اور نرم مزاج نہیں ہُوا کرتے لیکن فرعون کی صاحبِ ایمان بیوی نے ثابت

کر دیا کہ محلات کی پتھریلی دیواروں کے پیچھے بھی خدا اور خدا کی مخلوق سے محبت کرنے والے موجود ہو سکتے ہیں۔ خدا خوفی کی طرح خدا کی محبت پر کسی کی اجارہ داری نہیں...... وہ امیر ہو یا غریب، کالا ہو یا گورا، مرد ہو یا عورت۔

اُمّت کی مائیں

قرآنِ حکیم نے رسولِ خدا کی بیویوں کو اہلِ ایمان (مسلمانوں) کی ماؤں (اُمہات المومنین) کا لقب دیا ہے۔ بچے غیر شعوری طور پر عموماً اپنی ماؤں ہی سے محبت، رحمدلی، انکسار اور خدمت جیسی انسانی، اخلاقی اور روحانی قدریں سیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہی مائیں بچوں کو یہ قدریں بہتر طور پر سکھا سکتی ہیں جن کا اپنا کردار ان قدروں کا حامل ہو۔ چنانچہ ہم قرآنِ حکیم کے اس لقب کے مطابق یہی سمجھتے ہیں کہ رسولِ خدا کی تمام بیویاں۔ خدیجہ، سودہ، عائشہ، حفصہ، زینب بنت خذیمہ، اُمِ سلمٰی، زینب بنت جحش، جویریہ، اُمِ حبیبہ، صفیہ، میمُونہ، ریحانہ اور مریم (ماریہ) عام مسلمان خواتین کے لیے بلند کرداری اور رُوحانی عظمت کا بہترین نمونہ تھیں۔ ایک مثال: زینبؓ بنت خذیمہ اپنے دور میں ''اُمّ المساکین'' کے لقب سے یاد کی جاتی تھیں کیونکہ آپ بے حد غریب نواز اور فیاض تھیں۔

یہ لمبی بحث ہے کہ رسولِ خدا نے اتنی شادیاں کیوں کیں۔ متواتر جنگوں میں مرد مسلمانوں کی شہادت سے معاشرے میں بیواؤں اور یتیموں کو کھپانے سے لے کر قبائل کے درمیان یک جہتی پیدا کرنے کی مصلحتیں جانی پہچانی ہیں۔ اس کتاب کے مقاصد کے تحت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک مصلحت یہ تھی کہ یہ محترم اور معزز بیبیاں دوسری خواتین کی دینی اور روحانی تعلیم میں مدد دے سکتی تھیں کیونکہ انھیں رسُولِ خدا سے براہِ راست دین کی تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل تھا۔ عورتوں کی تعلیم آج تک مسلمان معاشروں میں نظر انداز ہوتی چلی آ رہی ہے۔ دورِ نبویؐ میں عام مسلمان عورتوں کی تعلیم کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ وہ اپنے سے بہتر علم رکھنے والی ''امت کی ماؤں'' سے علم حاصل کر سکیں۔ اس دور میں رسُولِ خدا کا یہ ارشاد کہ ''علم کا حصول ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت پر فرض ہے'' صرف اسی طور پر عمل میں لایا جا سکتا تھا۔

امہات المومنینؓ میں سے یہاں صرف دو کا تھوڑا تفصیلی ذکر کیا جا رہا ہے۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ

بی بی خدیجہؓ رسُولِ خدا کی پہلی بیوی تھیں۔ وہ عرب کی ایک بہت مالدار خاتون تھیں اور رسُولِ خدا کے ساتھ شادی سے پہلے دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ بیوگی کے باوجود وہ وسیع پیمانے پر خود تجارت کر رہی تھیں۔ ان کا سامانِ تجارت لے کر بڑے بڑے کاروان عراق اور شام جیسے قریبی ملکوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ رسُولِ خدا اپنے چچا ابو طالبؓ کے ہمراہ تجارتی کاروانوں کے منتظم (منیجر) کے طور پر خود بھی کئی سفر کر چکے تھے۔ آپؐ کے بارے میں مشہور ہو چکا تھا کہ آپ بے حد دیانتدار اور باصلاحیت نوجوان ہیں چنانچہ بی بی خدیجہؓ نے آپ کو اپنے ایک تجارتی کاروان کے منتظم کے طور پر منتخب کر لیا۔ جب آپ سفر سے واپس آئے اور آپؐ نے بی بی خدیجہؓ کو حساب کتاب دیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ آپ

Marfat.com

نہ صرف انتہائی دیانت دار تھے بلکہ بے حد معاملہ فہم بھی تھے اور آپؐ نے سامانِ تجارت کے انتخاب اور اسکی خرید و فروخت کے ہر مرحلے پر سلیقہ مندی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ آپؐ کے حسنِ کردار سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انھوں نے آپ کو شادی کا پیغام بھیج دیا۔ رسُولِ خدا نے اپنے چچا ابو طالبؓ اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے مشورے سے یہ پیغام قبول کرلیا۔

جس وقت (595ء) یہ شادی ہوئی رسُولِ خدا کی عمر 25 سال اور بی بی خدیجہؓ کی عمر 40 سال تھی۔ آپ 65 سال کی عمر کو پہنچ کر 619ء میں فوت ہوگئیں۔ تقریباً 25 سال رسُولِ خدا اور بی بی خدیجہؓ نے میاں بیوی کے طور پر ایک ساتھ گزارے۔ اس تمام عرصے میں رسُولِ خدا نے کوئی اور شادی نہیں کی۔ گویا آپؐ نے 25 سے 50 سال کی بہترین عمر (Prime Life) صرف اور صرف اس دِل افروز اور محترم و معزز خاتون ہی کے ساتھ گزاری۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ اپنی عمر کے بقیہ 13 سالوں میں ہمیشہ اپنی اس زوجۂ محترمہ کو محبت اور عزت کے ساتھ یاد کرتے رہے حالانکہ یہی وہ دور ہے جب آپؐ نے کئی اور خواتین سے رشتۂ نکاح استوار کیا۔

تاریخِ اسلام بی بی خدیجہ کو حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے نام سے یاد کرتی ہے جس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عمر میں بڑی تھیں بلکہ کردار کے اعتبار سے بڑی یا عظیم تھیں۔ آپ کی بڑائی اور عظمت کی پہلی نشانی تو یہی ہے کہ جب دنیا میں ابھی شاید ہی کسی اور نے اتنے واضح انداز میں رسُولِ خدا کے جوہر کو پہچانا ہو تو آپ نے نہ صرف اسے پہچانا بلکہ اپنی زندگی، اپنی محبت، اپنا مال و دولت بلکہ اپنا سب کچھ رسُولِ خدا پر نچھاور کر دیا۔ نبوت سے پہلے کے پندرہ سال اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب رسُولِ خدا تلاشِ حق میں سرگرداں تھے۔ قرآنِ حکیم نے اس دور کو یہ الفاظ دیے تھے وَوَجَدَکَ ضَآلًا فَھَدٰ ......کیا خدا نے تمھیں ہدایت سے ناواقف پا کر ہدایت نہیں دی؟ (97:7)۔ وہ کون تھا جس سے آپؐ اپنی روحانی جستجو کے حوالے سے پیش آنے والی مشکلات اور مسائل بیان کرتے ہوں گے اور جو آپ کی ''روح کی اس اندھیری رات'' (The Dark Night Of the Soul) میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو حوصلہ دیتا ہوگا؟

بی بی خدیجہؓ سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے!

یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسُولِ خدا کے روحانی سفر کے اس پہلے مرحلے پر جو تلاشِ حق سے شروع ہُوا اور پہلی وحی کے نزول پر ختم ہُوا، صرف تین ہستیاں تھیں جنھیں اس بات کی خبر تھی کہ آپ کی روح کس کس طرح کے طوفانوں سے دوچار تھی اور یہ جو آپ کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں غارِ حرا میں تن تنہا مراقبے کی حالت میں بیٹھے رہتے ہیں تو آپ کو اپنی زندگی میں کونسی کمی محسوس ہورہی تھی۔ ان تین لوگوں میں سرِ فہرست آپ کی بیوی خدیجہؓ تھیں، پھر آپؐ کے یارِ غار ابوبکرؓ تھے یا پھر آپ کے چچازاد علیؓ تھے جو آپ کے گھر میں بیٹوں کی طرح پرورش پا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک بابرکت رات (لیلۃ القدر) کے دوران خداوند کریم نے آپ کو نبوت سے نوازا اور جبرائیل فرشتے نے آپ کو دو مرتبہ سینے سے بھینچ کر آپ کا سینہ خدا کا پیغام وصول کرنے کے لیے کھولا (اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ، 94:1) اور آپؐ اس روحانی واردات سے دہشت زدہ ہوکر غارِ حرا سے کپکپی کی حالت میں گھر آئے تو جس ہستی نے آپ کی نہ صرف دلداری

Marfat.com

کی بلکہ آپ کی رسالت پر فوراً اپنے ایمان کا اظہار کر دیا، وہ بی بی خدیجہؓ ہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آپ کی محرم راز ہونے کے ناتے اس لمحے کے لیے روحانی طور پر تیار بیٹھی تھیں۔

لیلۃ القدر کی فضیلت یہ ہے کہ اس میں قرآنِ حکیم نازل ہونا شروع ہُوا تھا۔ اگرچہ ہم مسلمان ہر سال رمضان کی آخری طاق راتوں (21,23,25,27,29) میں اسے تلاش کرتے ہیں لیکن ذرا اس پہلی پہلی لیلۃ القدر کی شان دیکھیے کہ خدا کا ایک برگزیدہ بندہ نبوت سے نواز جا رہا ہے اور خدا کی ایک برگزیدہ خاتون اس کی نبوت پر ایمان لا رہی ہے۔ کائنات کی تاریخ میں نہ ایسی رات ہی پھر آئے گی، نہ ایسا نبیؐ ہی پھر آئے گا اور نہ وہ اعزاز کسی اور کو حاصل ہوگا جو خدیجہ کو حاصل ہُوا اور جس نے اسے خدیجہ سے خدیجۃ الکبریٰؓ (Khadija, the Great) بنا دیا۔

خدیجۃ الکبریٰؓ کی فضیلت یہ ہے کہ جس طرح انھوں نے رسُولِ خدا کی تلاش حق کے دوران آپؐ کا پورا پورا ساتھ دیا اسی طرح نبوت کے بعد اپنی عمر کے آخری دن تک ہر مشکل سے مشکل مرحلے پر آپ کی اور اسلام کی تن مَن دھَن سے خدمت کی۔ آپ ہجرت سے تقریباً تین سال پہلے فوت ہوئیں۔ یہ سارا عرصہ رسُولِ خدا اور اسلام کے لیے مصائب وآلام سے پُر تھا۔ بے شک اس دور میں حمزہؓ، ابوطالبؓ، ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ جیسے روحانی جوانمردوں نے بھی دل و جان سے رسُولِ خدا کا ساتھ دیا ہوگا لیکن جس ایک ہستی نے خدا کے بعد سال بہ سال، ماہ بہ ماہ، روز بہ روز، شب بہ شب، بلکہ لحہ بہ لحہ آپ کا ساتھ نباہا وہ صرف اور صرف خدیجۃ الکبریٰؓ تھیں۔ ان کی رسُولِ خدا سے محبت کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ عرب کی اس ایک امیر ترین خاتون کی ساری دولت اور کاروبار غریب مسلمانوں پر خرچ ہو گیا اور جب اس کی پیاری بیٹی فاطمہؓ کی علیؓ سے شادی ہوئی تو جہیز میں آٹا پیسنے کی چکی اور ایک چٹائی دی گئی تھی۔

خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے خدا نے رسُولِ خدا کو دو بیٹے بھی دیے تھے۔ ایک کا نام قاسم اور دوسرے کا عبداللہ تھا۔ مگر دونوں نوعمری ہی میں وفات پا گئے۔ البتہ چار بیٹیوں...... زینبؓ، رقیہؓ، فاطمہؓ اور اُمِ کلثومؓ...... نے مناسب عمر پائی۔ خدیجۃ الکبریٰؓ مکّے میں ''المعلیٰ'' نامی قبرستان میں دفن ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ

حضرت عائشہ صدیقہؓ رسُولِ خدا کے جگری دوست ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی تھیں۔ عرب کے قبائلی رسم ورواج میں دوستی کی مضبوطی اور گہرائی کا ایک اظہار یہ بھی تھا کہ اپنی بیٹی کی شادی اپنے دوست سے کر دی جائے۔ جب خدیجۃ الکبریٰؓ وفات پا گئیں تو ابوبکرؓ نے آپ کی دلداری کے طور پر اپنی نوعمر بیٹی عائشہ کا رشتہ پیش کر دیا۔ اس وقت عائشہ کی عمر تقریباً چھ سال تھی مگر جب تک شادی کی مروّجہ عمر کو نہ پہنچیں، وہ اپنے والد ہی کے گھر میں رہیں۔ ابوبکرؓ کی طرح عمرؓ کی ایک بیٹی حفصہؓ کی شادی بھی رسُولِ خدا کے ساتھ ہوئی تھی اور اس وقت حفصہؓ کی عمر 18 سال تھی۔ اسی طرح رسُولِ خدا کی ایک بیٹی کی شادی عمرؓ کے ساتھ اور دو بیٹیوں کی شادی عثمانؓ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کیونکہ عموماً عائشہ کی کم عمری کے بارے میں خود مسلمانوں میں مغالطہ پایا جاتا ہے۔ اس شادی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے

Marfat.com

علاوہ اپنی جاذب عمر(Impressionable Age) کے باعث عائشہؓ نے رسُولِ خدا سے روحانی، قلبی اور ذہنی فیض پایا۔ اور جب ایک مرتبہ آپؓ کی خدا داد صلاحیتوں کو اتنی اعلیٰ بنیاد مل گئی تو رسُولِ خدا کی وفات کے بعد بھی آپؓ کی روحانی اور علمی نشوونما جاری رہی۔

عائشہؓ نے چاروں خلفائے راشدہ......ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ......کے عہد میں مسلمان مردوں کی عموماً اور مسلمان خواتین کی خصوصاً روحانی اور دینی تعلیم وتربیت میں گراں قدر حصہ لیا تھا۔ خدیجہؓ کے بعد عائشہؓ ہی رسُولِ خدا کی وہ بیوی ہیں جن کی موجودگی میں بھی جبرائیلِ امین وحی لے کر آجاتے تھے۔ خدیجہ ہی کی طرح رسُولِ خدا عائشہ سے بھی خصوصی قلبی تعلق محسوس کرتے تھے۔ آج بھی مسلمانوں کی رسمِ نکاح کے موقع پر مانگی جانے والی دُعا میں یہ الفاظ شامل ہوتے ہیں کہ ''ربّ العزت! نکاح کے رشتے میں بندھنے والے اس جوڑے میں ویسی ہی محبت پیدا فرمادے جیسی محبت رسُولِ خدا اور خدیجۃ الکبریٰؓ کے درمیان یا رسُولِ خدا اور عائشہ صدیقہؓ کے درمیان تھی''۔ خدیجہؓ تو ہجرت سے تین سال پہلے ہی وفات پا گئی تھیں۔ خلفائے راشدہ کے عہد میں عائشہؓ ہی وہ مستند ترین ماخذ تھیں جس کی طرف یہ معلوم کرنے کے لیے رجوع کیا جاتا تھا کہ کس مسئلے یا صورتِ حال میں رسُولِ خدا نے کیا کہا یا کیا تھا اور آج کے اس مسئلے اور صورتِ حال میں رسُولِ خدا کیا کہتے یا کرتے۔ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ اگر چاروں خلفائے راشدہ کے عہد کو تاریخِ اسلام کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے تو اس دور کی آب وتاب میں مزاج شناسِ رسولؐ کے طور پر عائشہؓ کو برابر کا دخل حاصل تھا۔

عائشہؓ سے بہتر رسُولِ خدا کی ذاتی زندگی، عادات وخصائل اور روحانی تلقین کا ترجمان نہ کوئی اور تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔ انھوں نے رسُولِ خدا کی ذات سے اپنی ذات کو اس حد تک ہم آہنگ کر رکھا تھا کہ وہ رسُولِ خدا کے ان محسوسات، جذبات اور خیالات کو بھی پڑھ لیتی تھیں جنھیں آپؐ نے ابھی الفاظ بھی نہیں دیے ہوتے تھے۔ ذرا عائشہؓ کے اس جملے کو دیکھیے: ''رسُولِ خدا کی آنکھیں تو سوتی تھیں، دل کبھی نہ سوتا تھا''۔ اس جاگتے ہوئے دِل کی وہی محرمِ راز تھیں۔

بے شک رسُولِ خدا کی دوسری محترم اور معزز بیویوں نے بھی آپ کو دیکھا بھالا تھا اور ان میں سے کچھ کے حوالے سے آپ کی چند احادیث بھی موجود ہیں لیکن جو گہری نظر اور قوتِ اظہار (Power of Expression) عائشہؓ کو حاصل تھی، دوسری بیویوں کو نہیں تھی۔ ان بیویوں کی فضیلت اپنی جگہ لیکن یہ عائشہؓ ہی کا شرف ہے کہ ان سے تقریباً 2200 احادیث منسوب ہیں۔ علمِ حدیث کے ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ رسُولِ خدا کے جو ارشادات یا احوال عائشہؓ سے روایت ہوئے ہیں وہ مستند ترین ہیں۔ یاد رہے کہ احادیث جمع کرنے کا کام رسُولِ خدا کی وفات کے ڈیڑھ دوسو سال کے بعد شروع ہُوا اور اس دوران طرح طرح کی احادیث اپنے مخصوص مسلکوں کی حمایت میں اور حکمرانوں کے مفادات میں وضع کرلی گئی تھیں۔ چنانچہ جب بخاریؒ اور مسلمؒ جیسے محدثوں نے کھرے کھوٹے کی پہچان شروع کی تو عائشہؓ سے مروی احادیث کو مستند ترین پایا گیا۔ عائشہ کو اسی بنا پر عائشہ صدِیقہؓ (Aisha, the Truthful) کہا جاتا ہے۔ رسُولِ خدا کی شانِ صداقت دیکھیے، خود صادق الصادقین، یارِ غار ابوبکر صدیقؓ اور بیوی عائشہ صدِیقہؓ۔

Marfat.com

عائشہ کی زندگی کے دو اور واقعات ایسے ہیں جنھوں نے انھیں دینی اور سیاسی طور پر بہت شہرت بخش دی۔ ایک سطح پر ان دونوں واقعات کا آپس میں گہرا تعلق بھی ہے۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ بنو مصطلق کے خلاف غزوے (جہاد) میں رسولِ خدا نے عائشہ کو بھی ہمراہ لے لیا تھا۔ وہ ایک اونٹنی پر، محمل کے اندر، سوار تھیں۔ ایک پڑاؤ پر انھیں احساس ہُوا کہ ان کے گلے کا ہار (Necklace) کہیں گر گیا ہے۔ وہ اس خیال سے کسی کو بتائے بغیر محمل سے نکل کر پچھلے پڑاؤ کی طرف چل دیں کہ شاید راستے میں وہ کہیں گرا پڑا مل جائے۔ اسی دوران رسولِ خدا نے کارواں کو آگے چلنے کا حکم دے دیا۔ عائشہؓ واپس پڑاؤ کی طرف آئیں تو کارواں رخصت ہو چکا تھا۔ نگہداروں نے یہی سمجھا کہ حضرت عائشہؓ محمل کے اندر ہی ہوں گی اس لیے انھوں نے آپؐ کے اونٹ کو بھی چلنے کا اشارہ دے دیا۔ اور یوں اب وہ وہاں اکیلی حیران و پریشان بیٹھی رہ گئیں۔ دن چڑھا تو ایک شخص ادھر سے گزرا جس نے حضرت عائشہ صدیقہ کو رسولِ خدا کے کارواں تک پہنچا دیا۔ باتیں بنانے والوں کو موقع مل گیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک سکینڈل بن گیا اور عائشہ کی پاک دامنی پر انگلیاں اٹھ گئیں۔

رسولِ خدا بہت آزردہ ہوئے۔ قریبی ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ان کی کیا رائے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ علیؓ نے آپؐ کو مشورہ دیا کہ عائشہ کو طلاق دے دی جائے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس بات کا عائشہ کو تمام عمر رنج رہا اور انھوں نے جنگِ جمل (جمل اونٹ کو کہتے ہیں) میں اسی لیے علیؓ کی مخالفت کی۔ بہر حال خداوند کریم نے سورہ النور کی اِن فیصلہ کن آیات کے ذریعے عائشہؓ کو پاکدامن قرار دے دیا اور ان پر بہتان لگانے والوں کو سخت ترین سرزنش کی:

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور اپنی تائید میں چار گواہ لے کر نہ آئیں انھیں اسی کوڑے مارو، اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو...... جو لوگ (عائشہ پر) یہ بہتان گھڑ لائے ہیں (اے نبیؐ اور اس کے پیروکارو) وہ تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں۔ البتہ تم اس واقعے کو اپنے لیے باعثِ شر نہ سمجھو کیونکہ یہ بھی تمھارے لیے باعثِ خیر ہی ہے (جب خدا اس کا دوٹوک فیصلہ کر دے گا تو تمھارے درمیان پھیلا ہُوا شر مٹ جائے گا)۔ جس کسی نے اس بہتان تراشی میں جتنا بھی حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ کیا۔ اور جس شخص نے (مشہور ترین منافق، عبداللہ بن ابی کی طرف اشارہ ہے جو اس بہتان کا اصل بانی تھا) بڑھ چڑھ کر یہ بہتان اپنے سر لیا ہے اس پر تو عذابِ عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے یہ بہتان سنا تھا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اسی لمحے نیک گمان کرتے ہوئے کیوں نہ صاف صاف کہہ دیا کہ یہ صریح جھوٹ ہے؟ بہتان لگانے والے اپنے حق میں چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اور جب وہ چار گواہ لانے سے قاصر رہے ہیں تو خدا کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر دنیا و آخرت میں خدا کا فضل و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں تمھیں ایک بہت بڑا عذاب آن لیتا۔ (ذرا غور تو کرو، اس وقت تم کیسے مغالطے کا شکار ہو گئے

Marfat.com

تھے) جب جھوٹ تمھارے درمیان زبانی (سینہ گزٹ) پھیلایا جا رہا تھا اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے چلے جا رہے تھے جس کا تمھیں دراصل کچھ علم نہ تھا۔ تم اس بہتان تراشی کو معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ خدا کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔ تم نے کیوں نہ اسے سنتے ہی کہہ دیا کہ "خدا پاک کی قسم، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے"۔ اگر تم مومن ہو تو خدا کی نصیحت سُن لو کہ آئندہ کبھی ایسی نازیبا حرکت نہ کرنا...... (24:11-17)۔"

یہ خداوند کریم کا طریقہ ہے کہ وہ زندگی کے اہم مسائل کے بارے میں ہمارے رویے کی درستی کی خاطر اپنے بعض پیارے بندوں پر بیتنے والے واقعات کی مدد سے ہمارے لیے صراطِ مستقیم کو واضح کر دیتا ہے۔ آج بھی نہ صرف مسلمان معاشروں بلکہ دنیا بھر میں عورتوں کے خلاف مردوں کے ہاتھ میں سب سے مؤثر ہتھیار یہی ہے کہ وہ اچھی بھلی پاکباز عورتوں پر بدکاری کا جھوٹا الزام دھر دیں۔ اگر مسلمانوں نے قرآنِ حکیم کی ان آیات پر صدقِ دل سے غور کیا ہوتا اور اندازہ کیا ہوتا کہ خدا کے نزدیک پاک باز خواتین پر بدکاری کا بہتان باندھنا کتنا بڑا گناہ ہے تو نہ صرف مسلمان معاشروں میں عورت کی قدر و منزلت بڑھ جاتی بلکہ ان کی دیکھا دیکھی شاید غیر مسلم معاشرے بھی اپنی اصلاح کر لیتے۔ عورت پر بدکاری کا الزام لگانے والوں کے لیے چار گواہ لانے کی پابندی کی شانِ نزول بھی عائشہؓ کی زندگی کے اس واقعے ہی سے وابستہ ہے۔ دنیا بھر کی عورتوں کو عموماً اور مسلمان عورتوں کو خصوصاً عائشہؓ کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ خدا نے ان کے حوالے سے عورت کے حق میں اتنا واضح فیصلہ سنایا۔ قرآنِ حکیم نے انھی معنوں میں کہا تھا کہ تم اس واقعے کو اپنے حق میں باعثِ شر نہ سمجھو۔ مگر افسوس کہ بدنصیب مسلمانوں کے بے علم اور بدنیت مذہبی "رہنماؤں" نے خدا کے اس فیصلے کو بھی عورت کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے مرد کے حق میں رائج کر رکھا ہے۔

عائشہؓ کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ علیؓ کے دورِ خلافت میں علیؓ کے خلاف اور طلحہؓ اور زبیرؓ کی حمایت میں جنگ میں شمولیت کرنا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ عثمانؓ کے طرزِ حکومت، خصوصاً ان کی نام نہاد اقربا پروری سے نالاں مسلمانوں نے انھیں قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کر دیا تھا۔ اس پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ کچھ لوگ عثمانؓ کے قاتلوں کا محاسبہ چاہتے تھے۔ ایک بہت بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ علیؓ اسے دبانا چاہتے تھے۔ لیکن دو بہت معزز صحابیوں...... زبیرؓ اور طلحہؓ نے بغاوت کر دی۔ یہ دونوں رسولِ خدا کے ارشاد کے مطابق اُن دس خوش قسمت مسلمانوں میں شامل تھے جنھیں مرنے سے پہلے ہی جنتی قرار دے دیا گیا تھا۔ زبیرؓ اور طلحہؓ بھی عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ عائشہؓ ان کی حمایت میں ایک اونٹ پر بیٹھ کر میدانِ جنگ میں شریک ہو گئیں۔ عائشہؓ کے اونٹ کی وجہ سے اس جنگ کا نام ہی "جنگِ جمل" پڑ گیا۔ اس جنگ میں علیؓ فتحمند رہے۔ زبیرؓ اور طلحہؓ شہید ہو گئے۔ عائشہؓ کو احترام کے ساتھ واپس مدینے پہنچا دیا گیا۔

عائشہؓ اور علیؓ کیوں ایک دوسرے کے سامنے آئے؟ دونوں میں سے کون حق بجانب تھا؟ اپنی جگہ یہ

سوال کتنے ہی اہم ہوں اس کتاب کی حد تک ہم اس بحث میں نہیں پڑ سکتے۔ ہمارے لیے تاریخِ اسلام اور رسُولِ خدا کی زندگی میں زبردست اہمیت رکھنے والی یہ دونوں ہستیاں بے حد قابلِ احترام ہیں۔غور طلب بات تو یہ ہے کہ یہی وہ دو ہستیاں تھیں جنھوں نے اپنے لڑکپن میں رسُولِ خدا سے براہِ راست تعلیم و تربیت حاصل کی۔یاد رہے کہ رسُولِ خدا کے والد محترم عبداللہ تو آپ کی پیدائش سے بھی پہلے وفات پا گئے تھے۔پھر چند ہی سالوں میں آپ کی والدۂ محترمہ بھی رحلت فرما گئی تھیں اور یوں رسُولِ خدا کی پرورش کی ذمہ داری آپؐ کے دادا عبدالمطلب کے سر آ گئی تھی۔جب خدا کی مرضی سے وہ بھی زندہ نہ رہے تو آمنہ کے لال کو آپؐ کے مشفق چچا، علیؓ کے والد اور ہم سب کے محسن ابو طالبؓ ہی نے سینے سے لگایا اور پروان چڑھایا تھا۔

جب رسُولِ خداؐ کی شادی خدیجہؓ جیسی امیر کبیر خاتون سے ہوگئی تو آپؐ نے اپنے چچا سے اجازت لے کر ان کے فرزندِ ارجمند علیؓ کو اپنا لیا۔گو خدیجہؓ کے بطن سے آپؐ کے دو بیٹے......قاسم اور عبداللہ...... پیدا ہوئے لیکن وہ نوعمری میں وفات پا گئے اور یوں علیؓ ایک طرح سے رسُولِ خدا کے بیٹے کے طور پر پلے اور انھوں نے ایک ہونہار بیٹے ہی کی طرح آپؐ کے حسنِ اخلاق سے لے کر آپؐ کے طرزِ فکر تک، آپ کی مکمل پیروی کی۔یہی نہیں، انھیں خدیجہؓ اور ابو بکرؓ کی طرح سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف بھی حاصل تھا۔اگر یہ کہا جائے کہ عائشہؓ کی طرح وہ بھی مزاج شناسِ رسولؐ تھے تو غلط نہ ہوگا۔

ان دو ہستیوں نے، جو اپنی اپنی جگہ مزاج شناسِ رسولؐ تھیں، ایک دوسرے سے اس حد تک اختلاف کیوں کیا کہ جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی ہوگئیں؟

شاید اس لیے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ اسلام میں جمہوریت کی پوری پوری گنجائش موجود ہے اور عورتوں کو رائے دینے کے اختیار کے علاوہ اس حد تک آزادی ہے کہ وہ نہ صرف زبانی طور پر حکومتِ وقت سے اختلاف رائے کر سکتی ہیں بلکہ اس کے خلاف ہتھیار بھی اٹھا سکتی ہیں۔گو عائشہؓ نے جنگِ جمل میں ہتھیاروں سے تو کام نہیں لیا تھا اور طلحہؓ اور زبیرؓ کی صفوں میں ان کی شمولیت صرف اخلاقی مدد کے مترادف تھی لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہو گیا کہ اسلام میں خواتین کے لیے زندگی کے ہر میدان میں حصہ لینے کی اجازت ہے۔اگر رسُولِ خدا کی تربیت یافتہ اور معزز و محترم بیوی جسے "امت کی ماں" کی حیثیت بھی حاصل تھی اپنی بصیرت کے مطابق ایک منتخبہ مسلمان خلیفہ......اور وہ بھی رسُولِ خدا کے تربیت یافتہ علیؓ جیسے عظیم الشان خلیفہ......کے خلاف میدانِ جنگ میں جا سکتی ہے تو پھر امتِ مسلمہ کی ہر عورت پر زندگی کے ہر میدان میں کھل کر حصہ لینے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آنی یا لانی چاہیے۔

عائشہؓ کا جنگِ جمل میں حصہ لینا جہاں ان کی روحانی جوانمردی کا واضح ترین اظہار ہے وہاں تمام مسلمان عورتوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کی بہترین وکالت (Advocacy) بھی ہے۔

Marfat.com

حضرت فاطمۃ الزہراؑ

بی بی فاطمہؑ رسولِ خدا کی عزیز ترین بیٹی تھیں۔ مسلمانوں کے تمام فرقے آپ کو انتہائی محبت اور عقیدت سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کو مسلمانوں کے یہاں قریب قریب وہی مقام دیا جاتا ہے جو عیسائیوں میں، خصوصاً رومن کیتھولک عیسائیوں میں، حضرت مریمؑ کو حاصل ہے۔ محمد کی بیٹی، علیؑ کی بیوی اور حسنینؑ (حسنؑ اور حسینؑ) کی ماں کو یہ عزت صرف اُس کے اِن رشتوں ہی کے باعث نہیں، اُس کے اپنے قابلِ قدر، لائقِ تعظیم اور قابلِ تقلید کردار کی بناء پر بھی حاصل ہے۔ اس کردار ہی کا نتیجہ ہے کہ آپ کو فاطمۃ الزہراؑ (فاطمہ پُرنور، Fatimah, the Shining One) اور خاتونِ جنت جیسے القابوں سے یاد کیا جاتا ہے۔ رسولِ خدا فرمایا کرتے تھے کہ ''فاطمہؑ انسانی تاریخ کی چند مثالی خواتین میں سے ہیں''۔

فاطمہؑ اور علیؑ کے جوڑے (Couple) کو یہ بے بدل اعزاز حاصل ہے کہ وہ دونوں رسولِ خدا کے گھر میں ساتھ ساتھ پلے۔ جب دونوں کی آپس میں شادی طے پا گئی تو رسولِ خدا نے شادی کی رات دونوں کے لیے ایک غیر معمولی رسم ادا کی جو آج اسلام سے زیادہ مسیحیت سے منسوب ہے۔ آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے دونوں کے سر میں تیل ڈالا۔ اس رسم (Anointment) کے ذریعے سے کسی کو تقدیس بخش کر خدا کے کاموں کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو مسیح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آپ کے لیے بھی یہ رسم ادا کی گئی تھی۔ مسیح کا مطلب ہے: (The Anointed)۔ رسولِ خدا نے کسی اور شخص یا جوڑے کے لیے ایسا کبھی نہیں کیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رسولِ خدا اس رسم سے اس بات کی تصدیق کر رہے تھے کہ دُولہا اور دُلھن دونوں اپنے اپنے طور پر رُوحانی کمال کو پہنچ گئے ہیں اور اب دونوں مل کر، ایک دوسرے کی رفاقت میں، ایک ایسے کُنبے کی بنیاد رکھ رہے ہیں جس کے ہر فرد کا ہر سانس یہ پکارے گا، اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین (بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ کے لیے وقف ہیں جو تمام جہانوں اور قوموں کا پالنہار ہے)۔

اگرچہ برصغیر پاک و ہند میں رسولِ خدا کی اولاد کو سیّد کہا جاتا ہے لیکن عالمِ عرب میں سیّد کا لفظ جناب، صاحب یا مسٹر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب بھارت کے پہلے وزیر اعظم عرب ملکوں کے دورے پر گئے تو عربی اخباروں میں انھیں ''سیّد نہرو'' کہا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ فاطمہؑ اور علیؑ کے دو بیٹوں، حسنؑ اور حسینؑ سے چلنے والی رسولِ خدا کی اولاد کو دنیائے عرب میں ''سیّد'' کے بجائے ''شریف'' کہا جاتا ہے۔ اثنا عشری شیعہ عقیدے کے مطابق بارہ کے بارہ امام بھی فاطمہؑ اور علیؑ ہی کے نسب سے ہیں۔ حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ فاطمہؑ کے بطن سے علیؑ کا ایک اور بیٹا محسنؑ بھی پیدا ہُوا تھا لیکن وہ نوعمری ہی میں وفات پا گیا تھا۔

بی بی فاطمہؑ رسولِ خدا کی وفات (8-جون 632ء) کے تقریباً چھ مہینے بعد وفات پا گئیں۔ مسجد نبوی میں رسولِ خدا کے روضۂ مبارک کے قریب روضۂ فاطمہ کے نام سے ایک چھوٹا سا مقبرہ موجود ہے۔ کچھ لوگ، خصوصاً شیعہ،

Marfat.com

سمجھتے ہیں کہ فاطمہؑ اسی کے اندر دفن ہیں لیکن دوسروں کے مطابق آپ ''جنت البقیع'' نام کے قریبی قبرستان میں دفن ہیں۔

بی بی فاطمہؑ کے کردار کا وہ کونسا پہلو ہے جو انھیں روحانی اعتبار سے رسُولِ خداؐ کے بقول انسانی تاریخ کی چند مثالی خواتین میں جگہ دیتا ہے؟

ہم اس پہلو کو فقرِ غیور کہیں گے۔ فاطمہؑ ایک بہت امیر خاتون کی بیٹی تھی۔ آپ کی والدہ خدیجۃ الکبریٰؑ عرب کی ایک امیر ترین ہستی تھیں۔ لیکن خدیجہؑ نے تو اپنا سب کچھ رسُولِ خدا اور اسلام پر نچھاور کر دیا تھا۔ خدیجہؑ چاہتیں تو کسی چھوٹے موٹے ملک کی ملکہ کی طرح رہ سکتی تھیں۔ ماں ملکہ کی طرح رہتی تو بیٹی کسی شہزادی کی طرح کیوں نہ رہتی۔ لیکن خدیجہ تو محمدؐ کی بیوی تھیں اور فاطمہؑ محمدؐ کی بیٹی! اور محمدؐ کے گھر میں شام کو اعلان ہوتا تھا کہ ''بی بیو، دیکھو، گھر میں ضرورت سے فالتو کوئی ایسی چیز نہ رہ جائے جس کی گھر سے باہر کسی کو حاجت ہو۔ پیشتر اس کے کہ اس فالتو چیز پر رات گزر جائے، اسے حاجت مند تک پہنچا دینا چاہیے''۔ ایسے گھر میں کسی ملکہ یا شہزادی کا کیا کام ہو سکتا تھا؟ خدیجہؑ اور فاطمہؑ دونوں کی روحانی عظمت یہ نہیں کہ انھوں نے امیری کے پورے پورے امکان کے باوجود غریبی میں وقت کاٹا، ان کی روحانی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے یہ وقت برضا و رغبت اور بخوشی کاٹا۔

کیا فاطمہؑ نے یہ وقت اچھے دنوں کی امید میں کاٹا؟ یہ بھی نہیں۔ نام نہاد اچھے دن تو وہ ''قل العفو'' کی انقلابی تعلیم کے باعث بہت پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔ جب فاطمہؑ کے والد محترمؐ نے مدینے کی ریاست کی بنیاد رکھی تو وہ ریاست کے بانی اور سربراہ ہونے کی حیثیت سے فاطمہؑ کی زندگی میں ضرور کچھ آسانیاں اور سہولتیں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اس دور میں بھی آٹا پیسنے کی جو چکی اسے جہیز میں ملی تھی اسے چلاتے چلاتے فاطمہؑ کے ہاتھوں میں چھالے پڑے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مشقت، مجبوری سے زیادہ اختیاری تھی۔ خدا کے نبی اپنی نبوت کا حق اسی طرح ادا کرتے ہیں کہ خدا انھیں لوگوں کے لیے جو احکام دے وہ سب سے پہلے خود ان احکام کو اپنائیں اور دوسروں کے لیے مثال بنیں۔ جب رسُولِ خدا نے فاطمہؑ کو انسانی تاریخ کی چند عظیم ترین مثالی عورتوں میں شمار کیا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ جس دینِ اسلام کو خدا نے تمام انسانوں کے لیے ہدایت بنا کر بھیجا تھا، فاطمہؑ اس پر صدقِ دل سے عمل کر کے تمام مسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ تمام دنیا کی عورتوں کے لیے ایک مثال قائم کر رہی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ رسُولِ خدا نے خدیجہؑ کی وفات کے بعد ہی دوسری شادیاں کیں۔ آپ کی ان بیویوں کے سامنے خدیجہؑ کی زندہ مثال تو تھی نہیں، صرف ایک فاطمۃ الزہراؑ ہی کی زندہ مثال تھی۔ رسُولِ خدا کی بیویاں تمام مسلمان عورتوں کے لیے مثال تھیں لیکن اُمت کی ان ماؤں کے سامنے ایک ہی مثال تھی اور وہ فاطمۃ الزہراؑ کے فقرِ غیور کی مثال تھی۔ اگر رسُولِ خدا کی چہیتی بیٹی صبر اور شکر سے رہ سکتی تھی تو آپ کی بیویاں بھی رہ سکتی تھیں۔ سلام اس عظیم ہستی کی عظمت پر جو ''امت کی اُن ماؤں'' کے لیے مثال ہو جو سب مسلمان عورتوں کے لیے مثال ہیں۔

Marfat.com

رابعہ العدویہؒ

آیئے اب خاندانِ نبوی سے باہر جھانکیں اور دو ایک ایسی خواتین کا ذکر کریں جو روحانی عظمت کی نمایاں مثال ہوں۔ دو بظاہر متضاد مثالیں ذہن میں آتی ہیں۔ پہلی مثال مشہور و معروف صوفی خاتون رابعہؒ کی اور دوسری عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہؒ کی ہے۔ رابعہ یہ کہتی نظر آتی ہیں ''مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے''۔ زبیدہؒ یہ کہتی سنائی دیتی ہیں: ''مرا جواب فقیری نہیں امیری ہے''۔

رابعہؒ 713ء میں عراق کے شہر بصرہ میں ایک بہت غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں، وہیں قیام پذیر رہیں اور 801ء میں وہیں فوت اور دفن ہوئیں۔ اس بنا پر آپ کو اکثر رابعہ بصری بھی کہا جاتا ہے۔ بچپن ہی میں کسی نے اغوا کر کے آپ کو غلام (لونڈی) کے طور پر بیچ دیا تھا۔ لیکن جب آپ جوان ہوئیں تو آپ کی عبادت گزاری اور پاکبازی سے متاثر ہو کر آپ کے ''مالکوں'' نے آپ کو آزاد کر دیا۔ آپ کا وجود سراپا تقدس تھا۔ نہ صرف صوفی خواتین میں بلکہ تمام صوفیائے کرام میں آپ کو بہت ممتاز مقام حاصل ہے۔ آپ نے تصوف میں ''خدا کی محبت'' اور ''خدا سے محبت'' کے تصور کو بہترین الفاظ دینے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ایک ایک سانس میں اس محبت کو اس خوب صورتی سے رچایا اور بسایا کہ آپ خود بھی سراپا محبت ہی نظر آتی تھیں۔ آنکھ رکھنے والا ہر صاحبِ بصیرت اس محبت میں خدا کے ساتھ ایک گہری نسبت محسوس کرتا تھا جیسے خدا اور رابعہؒ میں کوئی پردہ، کوئی تکلف، کوئی دوسرائیت (Otherness) ہی نہ ہو۔

رابعہؒ کے پُر حکمت اقوال میں جہاں فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے وہاں جذب و شوق کی شدت بھی نمایاں ہے۔ اس وجہ سے وہ ساری دنیائے اسلام میں عموماً اور دنیائے تصوف میں خصوصاً مشہور ہیں۔ آپ کے کچھ اقوال کو تو ضرب الامثال کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ آپ ابھی کم عمر ہی تھیں کہ اپنے عہد کے عظیم صوفی حسن بصریؒ کی خدمت میں ہدایت اور رہنمائی کے لیے پہنچ گئیں۔ لیکن آپ کو شرفِ باریابی حاصل نہ ہُوا۔ بے اختیار ہو کر پوچھا، ''میں آپ کا دیدار کیوں نہیں کر سکتی؟'' جواب ملا، ''میں عورتوں سے ملاقات نہیں کرتا''۔ رابعہؒ نے بے دھڑک کہا، ''خدا کی نظر اور اس کے گھر میں تو مرد اور عورت سب برابر ہیں، آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ ان میں تمیز کریں۔ کیا آپ نے مردوں اور عورتوں کو خدا کے گھر میں حج یا عمرے کے دوران ایک ساتھ طواف کرتے نہیں دیکھا؟'' کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ نے یہ سن کر کہا، ''آؤ بیٹی! تم سے ملنے میں کوئی مضائقہ نہیں''۔

ایک مرتبہ کسی صوفی نے رابعہؒ کی موجودگی میں یہ دعویٰ کیا: ''خدا کا شکر ہے، میں نے عرصۂ دراز سے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا''۔ رابعہ جھٹ سے بولیں، ''تمھارا تو وجود ہی گناہ ہے''۔ اُس بھلے آدمی کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ رابعہؒ نے وضاحت کی، ''وجود تو صرف اور صرف خدا کا ہے، جو کچھ خدا سے ماوراء (الگ یا زائد) ہے وہ حق نہیں، باطل ہے، سچ نہیں، فریب ہے''۔ غالب نے انھی معنوں میں کہا تھا:

Marfat.com

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

رابعہ کی ایک اور بات روحانی حلقوں میں دہرائی جاتی ہے۔ آپ نے خدا سے دعا کی تھی، ''اے میرے رب! اگر میں جنت کی خاطر تجھ سے محبت کروں تو پھر تُو مجھے دوزخ میں ڈال دینا۔ کیونکہ میں تو تجھ سے تیری اور صرف تیری خاطر محبت کرتی ہوں''۔ رابعہ کی اس بات کو بعض تذکروں میں یوں بیان کیا گیا ہے:

ایک روز رابعہؒ اپنے دائیں ہاتھ میں پانی اور بائیں ہاتھ میں آگ لیے جا رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا، ''یہ آپ کیا کرنے جا رہی ہیں''؟ رابعہ نے کہا، ''میں چاہتی ہوں کہ جنت کو آگ لگا دوں اور دوزخ کی آگ بجھا دوں تاکہ راہِ حق کے مسافر کی آنکھوں کے آگے سے جنت کی امید اور دوزخ کے خوف کے دو حجاب دور ہو جائیں اور اس کا مقصد کھل کر اس کے سامنے آجائے۔ جب تک امید اور خوف دامن گیر رہتے ہیں، خدا کے خادم خدا کے دیدار سے محروم رہتے ہیں''۔

آیئے اب روحانی جواں مردی کی اِس نمائندہ ہستی کی کتابِ زندگی کا ایک اور ورق الٹیں۔ اس ایک ورق سے آپ بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ رابعہ کی پوری کتابِ زندگی میں کیسی کیسی کہانیاں درج ہوں گی۔ البتہ ایک بات یاد رکھیے گا کہ ہر اچھی کہانی سچی کہانی ہوتی ہے:

ایک رات رابعہ کی کُٹیا میں ایک چور گھس آیا۔ بے چارہ کوئی بہت ہی نالائق چور تھا جس نے ہوشیار چوروں کی طرح پیشگی تحقیق نہ کی کہ کٹیا میں رہنے والا فرد کس طرح کا فقیر ہے...... بھوکا ننگا رہ کر خیرات کا مال جمع کرنے والا فقیر یا ''تو غنی از ہر دو عالم من فقیر'' الاپنے والا مست مولا فقیر۔ اندھیرے میں چور نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مٹی کی ایک مٹکی میں پانی کے سوا اسے کچھ نہ ملا۔ مایوس ہو کر جانے لگا تو رابعہؒ نے آواز دی، ''یہ اچھی بات نہیں کہ آپ چوری کے مقصد سے آئے ہوں اور خالی ہاتھ چلے جائیں''۔ اکتائے ہوئے چور نے تڑاخ سے جواب دیا، ''بی بی! تیری کٹیا میں ہے کیا جو میں اٹھا لے جاؤں''؟۔ رابعہؒ بولی، ''پانی تو ہے۔ آپ ایسا کریں، اس پانی سے وضو کر لیں اور میں آپ کے لیے مصلّٰی بچھا دیتی ہوں، آپ دو رکعت نماز پڑھ لیں، پھر جو کچھ خدا آپ کو عطا کرے وہ لے کر چلے جائیں''۔

چور نے اس طرح کی بات تو کبھی اپنے بزرگوں سے بھی نہیں سنی تھی۔ ''چوری'' اور ''عطا'' کے باہمی تعلق کی خبر اسے تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی نہیں تھی۔ اسے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں ایسا کوئی گھر بھی نہیں ملا تھا جس کا مالک چوری کے لیے آئے ہوئے شخص سے اس انوکھے تپاک سے پیش آئے۔ اس نے دل میں کہا، ''میرا کیا جاتا ہے، جو کچھ یہ اللہ کی بندی کہہ رہی ہے کیوں نہ کر ہی گزروں''۔ وہ وضو کر کے نماز کے لیے مصلّے پر کھڑا ہو گیا۔ اُدھر رابعہؒ نے بھی خدا کے حضور میں دستِ دعا اٹھا لیا، ''میرے رب! اس بھلے آدمی کو میری کٹیا میں تو کچھ ملا نہیں، میں اسے تیرے دروازے پر لے آئی ہوں، اب اسے ''اپنی جانب سے تُو ہی دے داتا''۔ سب کی سننے والے ''السمیع'' نے رابعہ کی سُن کر اس شخص کا سینہ حق کے لیے کھول دیا، وہ نماز میں اتنا محو ہُوا کہ اندھیری رات مطلع الفجر میں بدل گئی۔ وہ رات گویا اس کے لیے لیلۃ القدر

Marfat.com

بن گئی اور رابعہ کی کوٹھڑی سے اسے خدا مل گیا۔ اور جسے خدا مل جائے تو پھر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اسے سب کچھ مل جاتا ہے۔ آیئے اب رابعہؒ کی کوٹھڑی سے زبیدہؒ کے محل کو چلتے ہیں۔

ہارون الرشید کی بیوی، زبیدہؒ

زبیدہؒ پانچویں عباسی خلیفہ، ہارون الرشید کی چہیتی ملکہ تھی۔ ہارون 764ء میں پیدا ہُوا اور 809ء میں فوت ہُوا تھا۔ اگرچہ ''الف لیلہ ولیلہ'' کی داستانیں اسے افسانوی حیثیت دے چکی ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس کا عہدِ حکومت شاہی شان و شوکت کے علاوہ امن و امان اور حسنِ انتظام کے اعتبار سے بادشاہت کی تاریخ کا ایک سنہری باب تھا۔ ہارون کے اردگرد دو شخصیتیں اور بھی تھیں جنھوں نے اس کی طرح شہرت پائی۔ ایک اس کا ایرانی وزیر جعفر برمکی، دوسری اس کی نیک دل ملکہ زبیدہؒ۔

جس طرح حضرت موسیٰؑ کی والدۂ محترمہ اور حضرت موسیٰؑ کو پالنے والی فرعونِ مصر کی بیوی ہمعصر (Contemporaries) تھیں اسی طرح رابعہؒ اور زبیدہؒ بھی ہم زمانہ تھیں۔ رابعہؒ بصرے کی ایک جھونپڑی میں اللہ ہو کا الاؤ جلائے بیٹھی تھی اور زبیدہؒ بغداد کے عالی شان محلات میں اللہ کے احکام کی تعمیل کر رہی تھی۔ رابعہؒ کا دل خدا کا گھر بن چکا تھا، زبیدہ کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن چکا تھا (ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ)۔ ہارون کے دور میں مملکت کے خزانے بھرے ہوئے تھے۔ بے شک ہارون کے حوالے سے عیش و عشرت کی رنگین داستانوں کا ایک انبار موجود ہے لیکن اس کی ملکہ زبیدہ فرعونِ موسیٰ کی اس ملکہ کی طرح خدا خوفی کا جیتا جاگتا پیکر تھی جس نے حضرت موسیٰؑ کو پالا اور پھر ان کی تعلیم و تلقین کے مطابق خدائے واحد پر ایمان کا اظہار کر دیا تھا۔ زبیدہ کا ہاتھ جہاں تک پہنچتا تھا وہ مملکت کے خزانوں سے مملکت کے بے کس، بیمار، لاچار اور نادار باشندوں کی بہبود پر خرچ کر دیتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ محض افسانہ ہو کہ خلیفہ ہارون الرشید بھیس بدل کر راتوں کو بغداد کی گلیوں میں لوگوں کا حال احوال دیکھنے جاتا تھا۔ لیکن تاریخ زبیدہؒ کی سخاوت، مروّت اور عفو و درگزر کی صداقت پر بار بار شہادت دیتی ہے۔

سیکڑوں بلکہ ہزاروں میں سے یہاں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ہارون کے بعد مسلمانوں کی بادشاہی تاریخ ''مامون'' پر توجہ مرکوز کر لیتی ہے حالانکہ ان کے درمیان ہارون اور زبیدہؒ کا بیٹا ''امین'' بھی خلیفہ بنا تھا۔ امین زبیدہؒ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مامون اس کے برعکس ہارون کی ایک ایرانی کنیز کے بطن سے تھا۔ لیکن زبیدہؒ نے کبھی امین اور مامون میں امتیاز نہ برتا تھا۔ جب ہارون کی وفات کے بعد امین خلیفہ بنا تو اس وقت مامون مرو کا گورنر تھا۔ مامون نے امین کے خلاف بغاوت کر دی۔ جب دونوں بھائیوں میں اقتدار کی جنگ چل رہی تھی تو زبیدہؒ نے امین کی فوجوں کے سپہ سالار کو بلایا اور اسے تلقین کی کہ ''دیکھو، مامون بھی ہارون کا بیٹا اور امین کا بھائی ہے لہٰذا اس کے ساتھ کوئی ناواجب اور نازیبا حرکت نہیں ہونی چاہیے''۔

Marfat.com

امین کو شکست ہوئی اور وہ مامون کے ہاتھوں مارا گیا۔ زبیدہؒ کو فطری طور پر اس کا بے حد رنج تھا اور اگر اس وجہ سے اس کے دل میں مامون کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی تو کوئی عجیب بات نہ ہوتی۔ لیکن عجیب بات تو یہ ہوئی کہ اس نے مامون کو دل سے معاف کر دیا۔ مامون بچپن ہی سے زبیدہؒ کی بے حد عزت کرتا تھا۔ امین کی موت کے بعد وہ خلیفہ بنا تو زبیدہؒ کی خدمت میں اظہارِ افسوس کے لیے گیا۔ زبیدہؒ نے کہا، ''میرا بیٹا امین خلیفہ تھا، وہ اب خلیفہ نہیں رہا۔ اب میرا دوسرا بیٹا مامون خلیفہ بن گیا ہے۔ میری نیک دعائیں تمھارے ساتھ ہیں، پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ امین اور تم آخرت میں ایک دوسرے سے ملو گے۔ میری دعا ہے کہ خدا تم دونوں کو معاف فرما دے''۔

ہارون کا شاندار عہدِ حکومت اس کی زندگی ہی میں زوال پذیر ہو گیا تھا۔ جب اس نے برمکی خاندان کو امورِ سلطنت سے خارج کر دیا تو اچانک نظم و نسق میں فتور پیدا ہو گیا۔ ایرانی نژاد برمکی وزیروں نے ایک عرصے سے انتہائی سلیقے سے امورِ مملکت چلائے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے بغداد کے ایک طرف چین کے شہنشاہ سے اور دوسری طرف مغربی یورپ کے شہنشاہ شارلیمان سے سفارتی روابط قائم تھے اور یوں بین الاقوامی سطح پر امن کا دور دورہ تھا۔ برمکیوں کے جانے، ہارون کی وفات کے بعد امین کے آنے اور مامون اور امین کے درمیان خانہ جنگی نے بغداد کی سیاسی اور ثقافتی رونقیں مٹا دی تھیں۔ اگر زبیدہؒ روحانی طور پر ایسے اعلیٰ مقام تک نہ پہنچی ہوتی اور مامون کے خلاف دوسرے رشتہ داروں کی طرح سازشوں میں شریک ہو جاتی تو بغداد کی رونقیں کبھی واپس نہ آتیں۔ یاد رہے کہ مامون کے عہدِ حکومت میں زبردست علمی ترقی ہوئی۔ بیت الحکمت کے نام سے سائنسی ترقی کے لیے ایک رصدگاہ (Observatory) بنائی گئی اور قسطنطنیہ (استنبول) سے یونانی مسودات حاصل کر کے ان کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ مامون کا واحد دورِ حکومت ہے جب ''اشعری'' مفکروں کی جگہ ''معتزلہ'' مفکروں (عقلیت پسندوں) کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ بغداد کے زوال کے بعد اس کے نئے عروج میں مامون کی محنت اور لیاقت کے ساتھ زبیدہؒ کی سخاوت اور مروّت بھی شامل تھی۔

زبیدہؒ کی سخاوت صرف ذاتی سطح پر نہیں تھی۔ وہ صرف یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، اپاہجوں اور بے سہارا بوڑھے مردوں اور عورتوں ہی کی دیکھ بھال نہیں کرتی تھی۔ وہ بچوں کے ساتھ ساتھ بچیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتی تھی اور اس تعلیم میں دُنیوی اور دینی معاملات دونوں شامل تھے۔ اس کے محل میں جہاں ساری مملکت کے مسائل زیرِ بحث آتے تھے وہاں ہر وقت ایک سو مسلمان بچیاں خوش الحانی سے قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ زبیدہؒ نے اپنی زندگی میں چھ حج کیے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ حاجیوں کو دور دراز کے علاقوں سے مکہ پہنچنے میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں، اس نے حاجیوں اور دینی طالب علموں کے لیے سڑکوں کی تعمیر اور مرمت کے علاوہ جگہ جگہ سرائیں، علاج گاہیں، طعام خانے اور غسل خانے بنانے کا انتظام کیا تھا۔ بغداد سے مکہ جانے والی سڑک نے صدیوں تک زبیدہؒ کا نام زندہ رکھا۔

مکے کو تو خدا نے خود وادیٔ غیر ذی زرع (وہ وادی جہاں کچھ نہ اگتا ہو) کا نام دیا ہے۔ وہاں زرعی ضروریات کے لیے پانی تو در کنار انسانوں اور مویشیوں کے پینے کے پانی کی بھی بہت کمی تھی۔ زمزم کے مقدس پانی کا چشمہ بھی بہت

Marfat.com

محدود مقدار میں پانی مہیا کرسکتا تھا۔ زبیدہؒ نے نہ صرف زمزم کے چشمے کو گہرا کھدوا کر پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ پانی پیدا کرنے کے قابل بنایا بلکہ شہریوں کے عام استعمال کے لیے مکے تک پانی کی ایک نہر بھی پہنچادی۔

محلات میں رہنے والی ملکہ زبیدہؒ نے اپنی مثال سے اقتدار (Power) کو ایک گالی کے بجائے ایک نعمت بنا کر رہتی دنیا کو بتا دیا کہ اقتدار اپنی جگہ برا نہیں ہوتا۔ لارڈ ایکٹن (Lord Acton) کا یہ قول دہرانا فیشن بن چکا ہے کہ اقتدار سے بداعمالی اور کامل اقتدار سے کامل بداعمالی پیدا ہوتی ہے:

Power corrupts and absolute power corrupts absolutely

نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو داؤدؑ اور سلیمانؑ جیسے عظیم پیغمبر بادشاہ نہ ہوتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ریاست کی بنیاد رکھ کر اس کے پہلے حاکم نہ بنتے اور نہ ہی ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے روحانی طور پر زندہ و بیدار لوگ خلیفہ بنتے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ اقتدار ہوتا کیا ہے؟ اقتدار تبدیلی لانے کی اہلیت کا نام ہے۔ اگر آپ اقتدار کے ذریعے سے غلامی سے آزادی، استحصال سے مساوات، برائی سے اچھائی یا جہالت کے اندھیرے سے علم کے نور کی جانب تبدیلی لے آتے ہیں تو اقتدار انسانیت کے لیے نعمت ہے۔ اور اگر اقتدار کے حامل لوگ اس سے الٹ ڈگر پر چل نکلتے ہیں تو ان کا اقتدار انسانیت کے لیے ایک لعنت ہے۔ زبیدہؒ نے اپنے رویے اور عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ اقتدار انسانیت کی خدمت اور پرورش کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ اس طرح روحانی طور پر زندہ زبیدہؒ نے تمام اربابِ اختیار اور اربابِ اقتدار کے لیے صراطِ مستقیم اور حُسنِ عمل کی ایک زندہ و پائندہ مثال قائم کر دی۔

Marfat.com

سولھواں باب

خُدا، شرِیعت، طریقت، حقیقت، رُوحانیّت

خدااور شریعت

شریعت ہو، تصوف ہو، حقیقت ہو یا روحانیت، انسان نے ان چاروں کے حوالے سے خدا ہی کی تلاش کی ہے۔ اس تلاش میں اہلِ شریعت، یا مذہبی لوگوں کو جو خدا ملا ہے، وہ خدائے بالاو برتر ہے۔ انگریزی میں اسے (Transcendental God) کہیں گے۔ عربی میں اسے اللہ کہتے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ مذہب کے اجارہ دار علماء نے اللہ کے تصور سے ''ربّ العالمین'' اور ''الرحمٰن الرحیم'' منفی کر دیے ہیں۔ اس خدا تک بندگانِ خدا کی رسائی ناممکن ہے اور چونکہ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے لہٰذا اب یہ بالا و برتر خدا کسی بندۂ خدا سے ہم کلام نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی بندۂ خدا اُس سے براہِ راست بات کر سکتا ہے۔

بندگانِ خدا صرف دو صورتوں میں اس خدا سے تعلق رکھ سکتے ہیں کہ وہ (1) خدا کے اس دین پر کار بند ہو جائیں جو قرآنِ حکیم میں زیر زبر کے فرق کے بغیر، خدا کے اپنے الفاظ میں، ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے اور جس کی عملی شکل رسولِ خدا نے اپنے عمل سے واضح کر دی تھی۔ (2) وہ ہاتھ یا جھولی پھیلا کر خدا سے دعا کر سکتے ہیں کہ سب کی سننے والا خدا ان کی جائز ضرورتیں، خواہشیں اور خواب پورے کر دے یا ان کی لغزشیں، غلطیاں، کمیاں، کوتاہیاں، جرم اور گناہ معاف فرما دے۔

یہ خدا چونکہ انسان کی پہنچ سے باہر ہے اس لیے اسے ''غیر ذاتی خدا'' (Impersonal God) سمجھنا چاہیے۔ انسان اس خدا کی ذات تک نہیں پہنچ سکتا، اسے صرف اس کی صفات کے حوالے سے جان سکتا ہے۔ اس خدا سے انسان ذاتی تعلق نہیں پیدا کر سکتا، بس اس پر بالغیب ایمان لا سکتا ہے، اس کی حکم برداری کر سکتا ہے، اس سے مدد اور معافی مانگ سکتا ہے۔ یہ خدا شریعت یا قانون کے ذریعے سے ہم پر حکومت کرتا ہے۔ ہم اس سے محبت نہیں خوف کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ خوف کا دوسرا نام محبت کی نفی ہے۔ ہمارا ہر عمل اس خدا کی نظر میں جانچا پرکھا جا رہا ہوتا ہے۔ ہم اس کے قانون کے مطابق چلتے ہیں تو ہمیں جزا ملتی ہے اور ہم مرنے کے بعد جنت کے حقدار ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارا عمل اس کے قانون کے برعکس ہو تو ہمیں جزا کے بجائے سزا ملتی ہے اور ہم مرنے کے بعد جہنم رسید ہو جاتے ہیں۔

اس خدا کو سب سے زیادہ یہودیوں نے مانا اور پُوجا۔ قانون کی فطرت ہے کہ وہ ''یہ کرو یا Do'' کے بجائے ''یہ نہ کرو یا Don't'' پر زور دیتا ہے۔ قانونِ زندگی کے ہر میدان میں ہمارے عمل کی ایک حد مقرر کر کے واضح کر دیتا ہے

Marfat.com

کہ اگر ہم نے یہ حد پار کی تو قانون کی پکڑ میں آ جائیں گے۔ قانون کہتا ہے، اور جو کچھ چاہو کرو لیکن یہ حد نہ پھلانگنا۔ اس طرح وہ ہمارے لیے نیکی کی آخری حد نہیں، اس کی کم سے کم حد مقرر کر کے ہم سے "گزارے لائق" نیک رویّے کا مطالبہ کرتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ قانون نیکی کے سو نمبروں میں سے وہ 30% یا 40% نمبروں کی حد مقرر کر کے کہتا ہے کہ اگر تم نے اتنے نمبر لیے تو تم پاس ہو جاؤ گے اور اگر اس سے کم نمبر لیے تو تم نیکوں میں شمار نہیں ہو گے بلکہ تمھارا شمار گنہگاروں میں ہو جائے گا۔ ایک اور مثال لے لیں: اگر ہم کسی کو ناحق قتل کر دیں تو ہم گنہگار ہوں گے۔ البتہ ہم اس شخص کے بارے میں دل میں کینہ یا حسد پالتے رہیں اور اس سے نفرت کرتے رہیں تو ہم قانون کی زد میں نہیں آئیں گے۔ اسی طرح اگر ہم کسی شخص کے گھر میں چوری کرنے یا سرکاری ملازم ہونے کے ناتے اپنے محکمے میں غبن کرنے کے منصوبے بناتے رہیں لیکن موقع نہ ملنے یا موقع پر ہمت نہ پڑنے کے باعث چوری یا غبن نہ کریں یا نہ کر سکیں تو قانون ہمیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قانون ہمیں اس وقت بھی کچھ نہیں کہہ سکتا جب ہم ہر طرح کی بدکاری "چوری چھپے" کرتے رہیں۔ قانون صرف ہمارے ظاہر پر پہرہ دیتا ہے، اسے ہماری دلی کیفیت اور باطن سے کوئی سروکار نہیں۔

ہمارے نام نہاد راسخ العقیدہ (Orthodox) مسلمان، ہمارے علمائے کرام، ہمارے فقیہہ اور ہمارے وہ فرقے جو شریعت کا کلمہ پڑھتے ہیں دراصل "کم سے کم" (Minimum) اسلام کے عامل اور علمبردار ہیں۔ ہماری مذہبی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں ہمارے علماء اپنے دور کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو یہی مشورہ دینے پر مامور تھے کہ وہ کس طرح شریعت کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں۔ مثلاً زکوٰۃ کے قرآنی حکم سے بچنے کا آسان شرعی طریقہ یہ تھا کہ آپ کے مال و دولت پر آپ کی ملکیت میں آئے ہوئے ایک سال نہیں گزرنا چاہیے۔ چنانچہ سال گزرنے سے پہلے آپ اپنی ساری ملکیت کو اپنے کسی قابلِ اعتماد رشتہ دار (بیوی، خاوند، بھائی، بہن) کے نام کر دیں اور جب اس ملکیت کو اس رشتہ دار کی تحویل میں آئے ہوئے سال پورا ہونے والا ہو تو اسے واپس اپنے نام کر لیں تو آپ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ وہی کام جو آج کی دنیا میں اونچے درجے اور بھاری فیسوں والے وکیل قانون کی پکڑ سے بچنے کے لیے، اور ماہر مالی مشیر ٹیکس بچانے کے راستے سُجھا کر کرتے ہیں، صدیوں سے ہمارے اکثر و بیشتر ماہرینِ شریعت کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ خدا کے قانون پر زور اور خدا کی محبت سے لاتعلقی نے اسلام جیسے کامل اور یک جان دین میں کھٹن اور تفریق پیدا کر دی ہے اور وہ بڑی حد تک ملائیت بن کر رہ گیا ہے۔ اور جنھیں یہ ملائیت قبول نہ تھی وہ خانقاہوں میں پناہ گزین ہو گئے ہیں۔

یہودیوں کے "کم سے کم مذہب" کے ردِعمل کے طور پر یہودیت کے اندر سے مسیحیت کے نام سے ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس نے خدا کے قانون کے مقابلے میں خدا کی محبت پر زور دیا۔ اسلام کی تاریخ میں رسُولؐ خدا اور خلفائے راشدہ کا مختصر سا عرصہ ایسا ہے جب خدا کا قانون اور خدا کی محبت ایک دوسرے کے ردِعمل کے بجائے ایک دوسرے کے جزولاینفک (Integral parts) بن گئے۔ جوں جوں خلافت کا تصور دھندلا پڑنے لگا، خدا کے قانون

Marfat.com

اور خدا کی محبت یا شریعت اور طریقت میں شیر وشکر کا رشتہ باقی نہ رہا تو اسلام ملائیت اور خانقاہیت کے عنوانوں سے دو متوازی دھاروں میں بٹ گیا۔ اگرچہ متوازی دھارے اصولاً آپس میں کبھی نہیں ملتے البتہ اصول کو برحق ثابت کرنے کے لیے کبھی کبھی کوئی استثنا (Exception) بھی وجود میں آ جاتا تھا۔ افسوس کہ آج جس اسلام کا نام نہاد احیاء ہو رہا ہے وہ اسلام کا وہ دھارا ہے جس میں شریعت کے نام پر خدا کا خوف، ظاہرداری کے تمام لوازمات کے ساتھ نمایاں نظر آ رہا ہے۔ البتہ دردمندی، رحمدلی، شفقت، معافی، درگزر، برداشت جیسی کوئی خصوصیت جو خدا کی محبت کا نتیجہ ہو، اس میں قریب قریب ناپید ہے۔

بظاہر اس قانونی، شرعی یا فقہی اسلام سے اور کچھ نہیں تو انصاف ضرور پیدا ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا۔ آپ اپنے اردگرد نظر دوڑا کر دیکھیں، آپ کو ٹالسٹائی کے شہکار ناول 'جنگ اور امن' میں ایک کسان کے مُنہ سے نکلا ہُوا یہ جملہ مبنی برحقیقت معلوم ہوگا کہ "جہاں صرف قانون ہو وہاں لازماً ناانصافی بھی ہوگی"۔ جذبے کے مقابلے میں عقل پر زور دینے والوں کے پیر استاد ارسطو (Aristotle) سے یہ اقرار چلا آ رہا ہے کہ قانون کی بنیاد جذبے پر نہیں، عقل پر ہوتی ہے۔ لیکن کیا عقل اور دماغ ہی سب کچھ ہیں اور انسانی زندگی میں جذبے اور دل کو کوئی دخل نہیں؟

وہ معاشرے جن میں جذبے اور دِل کو اہمیت نہیں دی جاتی وہاں ڈنڈے کے زور پر امن وامان تو قائم ہو سکتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غیر تخلیقی معاشرے ہوتے ہیں۔ سٹالین کے زمانے کا سوویٹ یونین ہو، طالبان کے عہد کا افغانستان ہو یا ہمارے دور کی عرب بادشاہتیں، اِن میں جبر یا ڈنڈے کے زور پر امن وامان قائم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن امن وامان تو قبرستانوں میں بھی ہوتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جہاں خوف ہوگا وہاں تخلیق نہیں ہوگی۔ کبھی آپ نے سنا کہ دولت کی تمام تر ریل پیل اور مکمل امن وامان ہوتے ہوئے بھی آج کی عرب بادشاہتوں نے علم، فلسفہ، فن، ادب یا ٹیکنالوجی میں کوئی جوہرِ قابل پیدا کیا ہو؟ جہاں چھپ کر ہر شرعی عیب کیا جاتا ہے وہاں منافقت تو پل سکتی ہے، صداقت نہیں۔ عیاشی تو پل سکتی ہے، مسرت نہیں۔ محبت کے بغیر مسرت کیا خاک ہوگی؟ اور خدا سے تعلق کے بغیر اس پر ایمان کیا خاک ہوگا؟ اور ایمان کے بغیر عمل کی اصلاح کیا خاک ہوگی؟

خدا اور طریقت

قانون یا شریعت پر زور دینے والے مذہبی لوگوں کے خلاف اسلام کے اپنے اندر سے تصوف کے نام سے ایک ردِعمل پیدا ہو گیا۔ تصوف میں خدا کے خوف سے زیادہ خدا کی محبت پر زور دیا جاتا ہے۔ رسُولِ خدا اور خلفائے راشدہ کے عہد میں شریعت، جو خدا کے خوف پر مبنی تھی اور طریقت، جو خدا کی محبت پر منحصر تھی، دونوں باہم شیر وشکر تھے۔ لیکن جب حکمرانوں، حکمران طبقوں اور ان دونوں کو شریعت کی پکڑ سے بچنے کی راہیں سُجھانے والے علما کے دلوں میں خدا کی محبت کمزور پڑ گئی اور دین صرف ظاہرداری بن کر رہ گیا تو کچھ نیک دل لوگوں نے خدا کی محبت سے پھوٹنے والی انسانی، اخلاقی

Marfat.com

اور روحانی قدروں کی بحالی پر زور دینا شروع کیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے محسوس کیا کہ رائج الوقت شرعی قوانین سے انصاف پیدا نہیں ہو رہا اور حکمرانوں میں نیکی، پرہیزگاری، خلقِ خدا سے مروت اور غریب عوام کی بہبود کی جگہ جاہ و جلال اور طلب دُنیا نے لے لی ہے تو وہ علانیہ اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھانے لگے۔ لیکن جن لوگوں میں ابوذرؓ جیسی ہمت نہیں تھی انھوں نے بڑی حد تک مملکت کے امور اور حکمرانوں کے احوال سے کنارہ کش ہو کر اُس خدا کی تلاش شروع کر دی جو کتاب و حکمت (قانون کے نفاذ اور قانون کے جواز) سے پہلے تزکیے یا دل کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے اور غیر ذاتی (Impersonal) کے بجائے ذاتی (Personal) خدا ہوتا ہے جس سے انسان تعلق جوڑ سکتا اور جس پر پورا پورا اعتماد کر سکتا ہے۔

یہ خدا انسان کے حالات (Human Condition) سے غافل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ دور کہیں آسمانوں پر بُرے لوگوں کے لیے ایک دوزخ دہکائے نہیں بیٹھا تھا بلکہ ہر کوشش کر رہا تھا کہ لوگ صرف سزاؤں کے خوف سے برائی کرنے سے باز نہ رہیں بلکہ خدا کی محبت کے نتیجے میں برائی کی خواہش پر قابو پا لیں اور تمام مخلوقِ خدا سے رحمدلی، انصاف اور احسان سے پیش آئیں۔ یہ خدا، انسان کی زندگی اور اس کی دنیا سے کہیں دور (Transcendent) نہیں بلکہ اس کی شہ رگ سے بھی قریب تر اس کی زندگی اور دنیا میں ہمہ وقت مصروفِ عمل تھا۔ یہ وہ خدا تھا جس نے انسان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ تم مجھے یاد کرو گے تو میں بھی تمھیں یاد کروں گا (2:152)۔ اس قریبی اور قابلِ رسائی (Immanent) خدا کو ہر بندۂ خدا خطاب کر سکتا تھا اور ہر پکارنے والے کی پکار سننے والا یہ ''السمیع'' خدا اور ہر پریشان حال (مضطر) کی تکلیف رفع کرنے والا یہ ''المجیب'' خدا اس کے درد کا مداوا کر سکتا تھا۔

وہ لوگ جو خلافت کو بادشاہت یا ملوکیت میں بدل دینے کے باوجود اپنے آپ کو ''خلیفہ'' کہے چلے جا رہے تھے اور خلقِ خدا کے درد و غم سے بے تعلق ہو چکے تھے، یہ خدا انھیں واضح الفاظ میں بتا رہا تھا کہ ہم نے کسی ایک شخص کو نہیں، تمام انسانوں کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے (وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الأرض 27:62)۔ یہ وہ خدا تھا جو تمام تر مخلوق کا پالنہار (رب العالمین) اور اپنے بندوں پر بر وقت اور ہر وقت رحم کرنے والا رحمان و رحیم تھا۔ اس خدا کے بندگان پر کوئی شخص ان کی خوشدلانہ مرضی کے بغیر، اپنی اندھی طاقت کی بنا پر، ایک چھوٹا موٹا خدا بن کر حکومت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بندگانِ خدا تو خدائے واحد کے سوا کسی اور خدا کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے تھے۔

افسوس کہ جن صوفیاء نے اس ذاتی اور قریبی خدائے محبت کو تلاش کیا وہ اس تلاش کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی پہلوؤں کو بڑی حد تک نظر انداز کر کے صرف خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق کو اہمیت دیتے رہے اور یوں وہ آہستہ آہستہ کارزارِ دنیا سے کٹتے چلے گئے اور تصوف کے نام پر وہ خانقاہیت اور رہبانیت پیدا ہونے اور پرورش پانے لگی جس سے اسلام نے پرہیز سکھایا تھا۔ خدا کی محبت کے حوالے سے خدا سے ذاتی تعلق کی تان یہاں جا کر ٹوٹی کہ خدا کے سوا کوئی حقیقت نہیں اور ''جو کچھ ہے'' وہ خدا ہی ہے اور اس ''جو کچھ ہے'' میں ہم بھی شامل ہیں۔ بظاہر اس رویّے میں اپنی

Marfat.com

ذات کی نفی کی گئی تھی لیکن شاہ حسینؒ کے ''میں ناہیں سب توں'' کے اعلان نے بار بار اور طرح طرح سے منصور حلاجؒ کے ''نعرۂ انا الحق'' کی صورت بھی اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ خدا اور بندے کا تعلق اتنا گہرا ہو گیا کہ ان میں تمیز ہی نہ رہی۔ یہ قربت ''بندہ و صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے'' کی حد تک تو خوب تھی لیکن بندے اور خدا کو ایک سمجھنے میں خاصی خرابی تھی کیونکہ جس طرح کچھ دُنیادار حکمران خدا بن بیٹھے تھے اب اس طرح کچھ صوفی بھی خدا بننے لگ گئے۔

اس رویے کے حامل اور عامل بزرگوں کو تاریخ وجودی صوفی کا نام دیتی ہے جو وحدت الوجود کے قائل تھے اور ہیں۔ ان کے مطابق وجود چونکہ صرف خدا ہی کا ہے اس لیے جو کچھ موجود ہے وہ بھی خدا کی طرح پاک اور مقدس ہے۔ تمام اعتراضات کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ''وحدت الوجود'' کے قائل صوفیاء نے مذہب، نسل اور وطنیت کے فرق کے بغیر ساری مخلوقِ خدا سے خدا ہی کی طرح محبت کی۔ وہ بھولے بھٹکے، غریب، نادار، کمزور، بے کس اور بے سہارا لوگ جن کی اقتدار کی بارگاہوں میں کوئی پہنچ یا شنوائی نہیں تھی انھیں وحدت الوجودی صوفیاء نے سینے سے لگایا اور اپنی محبت بھری توجہ سے ان کا تزکیۂ نفس کیا اور انھیں عزتِ نفس سے بہرہ مند کیا۔ اسی طرح اگر کوئی سر پُرغرور اُن کے قریب آیا تو اُنھوں نے اسے ایثار، قربانی، عدل، احسان اور انکسار جیسی قدروں سے متعارف کرایا۔ یوں بظاہر معاملاتِ دنیا سے کنارہ کش ہوتے ہوئے بھی انھوں نے معاشرت کی اصلاح میں بالواسطہ (Indirect) مگر قابلِ قدر حصہ لیا۔

ذاتی خدا کے صوفیانہ تصور نے دُنیا سے لاتعلقی کے باوجود دُنیا کو بہت کچھ دیا۔ آج بہت سے لوگ اس تصور کی بنا پر کہتے ہیں کہ اسلام کی حقیقت سب سے بہتر وحدت الوجودی صوفیاء ہی نے اُجاگر کی۔ ان کے خیال میں اسی تصور نے مغرب میں روشن خیال انسان دوستی (Liberal Humanism) کو جنم دیا اور اگر عالمِ اسلام میں یہ تصور زیادہ مقبولیت حاصل کر لیتا تو اس کی صفوں میں کبھی کٹ ملائیت، انتہا پسندی اور دہشت گردی نہ پیدا ہوتی۔ اس تصور نے روشن خیال انسان دوستی کی اقدار کو انسان کے ساتھ ساتھ خدا پر بھی لاگو کر دیا۔ اس طرح سے یہ کہنا اور سمجھنا ممکن ہو گیا کہ اگر خدا نے انسان کی ساخت اپنے رنگ میں کی تھی تو انسان نے بھی خدا کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اب خدا انسان کی طرح دیکھتا، سنتا، محبت کرتا، رحم کرتا، انصاف کرتا، معاف کرتا، پردہ پوشی کرتا اور تخلیق کرتا تھا۔ یہ خدا انسان کی آزادی، اس کی صفوں میں انصاف اور مساوات، اور اس کی انفرادی تکریم اور عزتِ نفس کا قائل تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آج دُنیا میں جس حد تک بھی انسانی حقوق کا احترام ہوتا ہے وہ اسی ذاتی خدا کے تصور کی وجہ سے ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے اس ذاتی خدا پر ایمان سے کچھ قباحتیں بھی پیدا ہو سکتی تھیں اور ہُوئیں۔ انسان اس خدا کو اپنی ذاتی ضرورتوں، خوابوں اور خواہشوں کے مطابق موم کی ناک کی طرح کوئی شکل بھی دے سکتا تھا۔ جیسے جیسے خدا اور انسان کا فاصلہ اور فرق کم ہوتا گیا، انسان کے لیے یہ سمجھ لینا بہت آسان ہو گیا کہ خدا کی پسند بھی وہی ہے جو میری پسند ہے۔ اسی طرح وہ اپنے تعصبات کو خدا پر تھوپ کر اس کوشش سے غافل ہو سکتا تھا کہ اپنے تعصبات سے چھٹکارا حاصل کرلے۔ اب ہر ناقابلِ قبول صورتِ حال کو یہ کہہ کر قبول کیا جا سکتا تھا کہ خدا کی یہی مرضی تھی۔ اس طرح کا ذاتی خدا

Marfat.com

ہمارے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمیں ہماری کمزوریوں اور نااہلیوں سے باہر نکالنے کے بجائے ہمیں انھی میں گرفتار رہنے دیتا تھا۔

ابن عربیؒ، بایزید بسطامیؒ اور منصور بن حلاجؒ نے ''وحدت الوجود'' کا جو تصور پیش کیا اس کے مطابق خدا کی ذات اور انسان کی ذات میں کوئی فاصلہ اور فرق نہیں تھا اور خدا کی محبت کا تقاضا تھا کہ انسان کی ذات خدا کی ذات میں فنا ہو جائے۔ لیکن جن قباحتوں کا ہلکا سا خاکہ ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے ان کی اصلاح کے لیے جنید بغدادیؒ سے لے کر برصغیر پاک و ہند کے شیخ احمد سرہندیؒ (مجدد الف ثانی) تک کے صوفیائے کرام نے ''وحدت الشہود'' کا تصور پیش کیا۔ اس تصور کے مطابق بے شک خدا اپنے بندوں سے لاتعلق نہیں بلکہ خدا کا مقام خالق کا اور انسان کا مقام مخلوق کا ہے۔ اس لیے خدا کی محبت میں فنا ہو جانا روحانیت کی آخری منزل نہیں بلکہ انسانی ذات کی فنا کے بعد انسانی ذات کی بقا کی منزل آتی ہے اور یہی وہ منزل ہے جو پیغمبروں کو عام صوفیوں سے ممتاز کرتی ہے۔

شاید ہی کسی اور انسان کو خدا سے اتنی قربت حاصل ہوئی ہو جتنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے دوران حاصل ہوئی تھی۔ اس قربت کے بعد آپؐ کی ذات فنا ہونے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو کر بقا پا گئی اور آپؐ واپس دنیا میں آ کر دین کی روشنی میں دُنیا کو سنوارنے لگے۔ اگر دین سے دنیا نہیں سنورتی، اس میں ایمان، محبت، صداقت، خیر اور امن کی نشو و نما نہیں ہوتی تو دین کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ''وحدت الوجود'' کے قائل صوفی کلمے کے صرف اس حصے پر عمل کر رہے تھے کہ لا الہ الا اللہ۔ ''وحدت الشہود'' کے قائل صوفیوں نے کلمے کو مکمل کرنے کی کوشش کی اور پکارا کہ لا الہ الا اللہ، محمدٌ رسول اللہ۔

تصوف کی پہلی صورت ''وحدت الوجود'' اسلام اور بعض دوسرے مذاہب خصوصاً ہندومت کے ویدانی تصوف سے ہم آہنگ تھی۔ تصوف کی دوسری صورت ''وحدت الشہود'' نے اسلامی تصوف کو جداگانہ حیثیت دے دی۔ ذات کی فنا کے برعکس ذات کی بقا ہی وہ تصور ہے جسے ہمارے عہد کے سب سے قابلِ ذکر فلسفی اور صوفی علامہ اقبالؒ نے خودی اور بے خودی کے زندگی افروز نظریے کے ذریعے قبولِ عام بخشا۔ اس نظریے کے مطابق ساری کائنات خدا کے بندے کے سامنے جھکی ہونی چاہیے اور خدا کا بندہ خدا کے سامنے جھکا ہونا چاہیے۔ اس تصور کے سب سے مشہور ترجمان مولانا جلال الدین رومیؒ تھے جنھیں اقبالؒ نے اپنا مرشد قرار دیا تھا۔

رومیؒ نے ''وحدت الوجود'' کی اچھی باتوں کو ''وحدت الشہود'' کی اچھی باتوں میں اس طرح جمع کیا تھا کہ دونوں تصوروں کی قباحتیں دور ہو گئی تھیں۔ ''وحدت الوجود'' کی قباحتوں کا ذکر ہو چکا، ''وحدت الشہود'' کے ماننے والوں میں خود رائیت (Self Righteousness) پیدا ہو جاتی تھی۔ اگر وحدت الوجودی نیک و بد کی تمیز کھو بیٹھتے تھے تو وحدت الشہودی اپنی ذات کے استحکام کے بعد اپنے آپ کو پیغمبروں کی طرح درست سمجھ کر ہر دوسرے انسان، بلکہ ہر دوسرے مسلمان کو اپنے عقیدے کے مطابق از سرِ نو مسلمان بنانے چل دیتے تھے۔ یوں اپنی انتہا کو پہنچ کر ان کا نظریہ

Marfat.com

شریعت پسندوں اور کٹ ملاؤں سے جاملتا تھا۔ ایک مثال یہی ہے کہ شیخ احمد سرہندیؒ شیعہ عقیدہ رکھنے والے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے تھے۔ آج پاکستان جیسے ملک میں شیعہ سنّی فسادات اِسی رویّے کا تازہ ترین شاخسانہ ہیں۔

رومیؒ نے تصوف کے اندر سے ایک نئی روایت کو جنم دیا جسے ہم روحانیت (Spirtuality) کہتے ہیں۔ شریعت پسند علمائے کرام اور وہابیت نے خدا کو بندگانِ خدا سے اتنا اونچا اٹھا دیا تھا کہ وہ عام مسلمان کی پہنچ سے باہر ہو گیا تھا اور یوں عام مسلمان کو جابر، غاصب اور آمر حکمرانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب ''قانون کی حکمرانی'' (Rule of Law) جیسے مغالطہ خیز تصورات گھڑے گئے جو بظاہر بے حد دلکش معلوم ہوتے ہیں اور عام مسلمانوں سے یہ خداداد صلاحیت چھین لی گئی کہ وہ یہ پوچھ سکیں کہ قانون بنائے گا کون؟ ہم یا ہمیں لوٹنے کھسوٹنے والے ہمارے جابر لیکن نااہل حکمران؟ صوفیوں نے خدا کو آسمانوں سے زمین پر اتار کر ایک مرتبہ پھر انسان کی حرمت، تکریم اور عزتِ نفس بحال کی تھی۔ اس طرح اللہ کی ذات کو اس کی صفات سے قریب تر کر دیا گیا تھا اور یوں وہ رب العالمین اور رحمان و رحیم کے روپ میں انسان کے دکھ درد میں شریک ہو گیا تھا۔ لیکن '' وحدت الوجود'' کا تصور خانقاہیت میں بدلتا گیا اور ''وحدت الشہود'' کا تصور تلوار بدست اور کفن بردوش لیکن خودرائیت کے عادی ''مجاہدین'' پیدا کرنے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر سے سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریکِ مجاہدین تک کی تاریخ اس صورتِ حال کی گواہ ہے۔

رومیؒ نے ابن رشد جیسے تعقل پسند فلسفیوں اور ابن عربیؒ جیسے صوفی فلسفیوں کے برعکس اسلام اور اسلامی تصوف کی ایک سراسر نئی تشریح پیش کی جس کے مطابق خدا کے بارے میں فلسفیانہ بحثوں اور ''انسانی ذات کی فنا اور بقا'' جیسے تصورات میں پڑے بغیر انسان کے روحانی ارتقا کو بیک وقت مستحکم لیکن قابلِ عمل بنیادوں پر نئی سے نئی منزل تک پہنچایا جاسکتا تھا۔ صوفیوں نے اللہ تعالیٰ اور اللہ جل شانہٗ کو ''رب العالمین'' اور ''الرحمٰن الرحیم'' تک پہنچا کر انسان کے لیے ممکن بنا دیا تھا کہ وہ اس خدا سے ذاتی تعلق پیدا کر لے۔ رُومیؒ نے اللہ تعالیٰ اور رب العالمین کو رب الناس تک پہنچا کر اس خدا کو تمام انسانیت کے لیے عام کر دیا۔

خدا اور حقیقت

اُندلس کے مشہور فلسفی ابنِ رُشد (1126-1198ء) نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ خدا اور اس کے دین کو فلسفے ہی کی مدد سے پوری طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ تعقل پسندی (Rationalism) اور دین میں کوئی تضاد نہیں۔ لیکن اس کے نظریے کے مطابق خدا تک رسائی صرف چند اہلِ علم ہی کا شرف تھا، عام لوگوں کے لیے یہی بہتر تھا کہ وہ قرآنِ کریم کی گہری معنویت میں پڑے بغیر اس کے لفظی متن ہی پر عمل کریں۔ اور تو اور اس نے فلسفیوں اور دیگر اہلِ علم کے لیے بھی چند شرائط رکھ دی تھیں جن پر ایمان و عمل کے بغیر وہ قرآنِ کریم کی گہرائی میں نہیں اتر سکتے تھے۔ وہ شرائط یہ تھیں:

1۔ اس حقیقت پر ایمان کہ خدا موجود ہے اور وہی دنیا کا خالق اور پالنہار ہے۔

2۔ توحید یا خدا کی وحدانیت پر ایمان۔

3۔ خدا کی ان صفات پر ایمان جو قرآنِ حکیم میں بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ علیم ہے، قادر ہے، سمیع (سننے والا) ہے، بصیر (دیکھنے والا) ہے اور زندگی اور موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔

4۔ خدا یگانہ و یکتا (Unique) ہے یعنی کوئی اور اس جیسا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔

5۔ جو کچھ ہے وہ خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔

6۔ خدا کے نبی برحق ہیں۔

7۔ خدا عادل ہے۔

8۔ حشر کے دن انسان جسمانی طور پر دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔

ابنِ رُشد کو مسلمانوں میں کبھی زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یوں بھی تعقل پسندی کو مسلمانوں نے ذرا کم ہی قبول کیا ہے۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے بیس سالہ عہدِ حکومت کو چھوڑ کر تعقل پسندوں (معتزلہ) کو کبھی سرکاری سرپرستی نہیں ملی۔ پاکستان میں بھی سر سید احمد خانؒ کی تمام تر کوششوں کے باوجود تعقل پسندی اجتماعی طور پر پسند نہیں کی گئی۔ غلام احمد پرویزؒ کی مقبولیت بھی ایک محدود حلقے سے باہر نہیں نکل سکی۔ اس کے برعکس، ابن رشد ہی کے زمانے میں، عراق میں ابنِ عربیؒ اور ایران میں یحییٰ سہروردیؒ نے ایک اور فلسفی ابنِ سینا کی پیروی کرتے ہوئے فلسفے اور صوفیانہ روحانیت کے درمیان جو تعلق پیدا کیا اس نے مسلمانوں پر کہیں زیادہ گہرا اثر چھوڑا ہے۔

ابنِ عربیؒ خود تو خاصے گنجلک اور مبہم مصنف تھے لیکن ان کے پیروکاروں نے ان کے فلسفے کو مسلمان عوام تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ تعقل پسندوں کے برعکس تاریخِ اسلام میں ایسے بہت سے زمانے آئے جب تصوف اقلیت میں نہیں بلکہ اکثریت میں مقبول رہا۔ لیکن یہ تصوف خدا اور انسان کے باہمی تعلق ہی پر زور دیتا رہا اور اس نے انسان اور انسان کے تعلق سے کم ہی تعلق رکھا۔ فلسفے کا اہم ترین منصب ''حقیقت'' (Reality) کی تعریف (Definition) اور اس تک رسائی ہی رہا ہے۔ ادھر مذہب میں خدا ہی واحد حقیقت ہے۔ چنانچہ ابنِ عربیؒ جیسے صوفی فلسفیوں نے یہ نظریہ پیش کیا اگر ہم حقیقت تک پہنچ گئے تو گویا خدا تک پہنچ گئے اور اگر ہم خدا تک پہنچ گئے تو گویا حقیقت کو پا گئے۔ اس نظریے کے مطابق حقیقت کی پانچ سطحیں یا دائرے ہیں جن سے تلاشِ حق کے مسافروں کو گزرنا پڑتا ہے۔ تصوف کی تاریخ میں انہیں ''پانچ حاضرات'' (الحاضرت الالٰہیہ Divine Presences) کا نام دیا جاتا ہے۔ ابن عربیؒ کے علاوہ، تھوڑے بہت فرق کے ساتھ، ان حاضرات کا غزالیؒ اور عبدالکریم الجیلیؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔ یہ پانچ حاضرات یہ ہیں۔

1) ہا ہُوت: یہ لفظ یا اصطلاح خدا کے خصوصی نام ھُو پر مبنی ہے (لا اِلٰـہ اِلّا ھُو 59:22) یہ دائرہ خدا کی ذاتِ مطلق (اللہ) سے مخصوص ہے۔ خدا کی ذات اتنی مکمل ہے کہ اس میں نہ تو کوئی اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کمی کی جا سکتی ہے۔ سورہ اخلاص (قُل ھو اللہُ اَحَد.....) اس دائرۂ حقیقت یا ذاتِ خداوندی کی مکمل تفسیر ہے:

Marfat.com

کہو، اللہ یکتا ہے، اللہ کسی بات کا حاجت مند نہیں، سب اس کے حاجت مند ہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے اور کوئی اس جیسا نہیں ہو سکتا (112:1-4)۔

2) لاہُوت: یہ لفظ یا اصطلاح "اَلاِلٰـــہ" سے بنی ہے۔ اس سے مراد خدا کی ہستی یا وجود (Being) ہے۔ یہ ہاہوت کی طرح خدا کی ذات کامل نہیں جس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ لاہوت کا تعلق خدا کی صفات سے ہے۔ اور صفات ایک دوسرے میں کمی بیشی کر سکتی ہیں۔ مثلاً خدا رحمان اور رحیم ہے لیکن ساتھ ہی وہ منتقم (بدلہ لینے والا) اور جبار بھی ہے۔ وہ اوّل ہے تو آخر بھی ہے۔ ظاہر ہے تو باطن بھی ہے۔ زندگی دینے والا ہے تو موت دینے والا بھی ہے۔ ہاہوت کا دائرہ اگر حقیقتِ مطلق (Absolute Reality) یا خدا کی ذاتِ مطلق سے تعلق رکھتا ہے تو لاہوت کا دائرہ محدود طور پر مطلق ہے کیونکہ وہ اپنی تکمیل کے لیے خدا کی کسی دوسری صفت کا حاجت مند ہے۔ مثلاً القلم کو اپنی تکمیل کے لیے وما یسطرون یا لوحِ محفوظ کی ضرورت ہے۔ ویسے ہی جیسے اقبالؔ کے طائر لاہوتی کو ایسے رزق کی ضرورت ہے جو اس کی پرواز میں کوتاہی نہ پیدا کرے۔ حقیقت کا یہ دائرہ مکمل طور پر بے نیاز نہیں بلکہ یہاں صفات یا (Elements) کی تکمیل کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ یعنی وہ (Interdependent) ہیں۔ خدائے اوّل اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدائے آخر بھی نہ ہو۔ اسی طرح خدائے ظاہر کی تکمیل کا انحصار خدائے باطن پر ہے۔ لاہوت کے دائرہ حقیقت کا انسان پر اطلاق کریں تو دماغ اور دل یا عقل اور نفس کی طرح مرد اور عورت بھی ایک دوسرے کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔ ہاہوت اور لاہوت، دونوں کو ایک ساتھ "عالمُ الغیب المُطلَق" (The World of Absolute Unseen) بھی کہتے ہیں۔

3) جبروت: حقیقت کا یہ دائرہ طاقت یا (Power) سے تعلق رکھتا ہے۔ خدا کے حوالے سے اسے عرشِ معلی یا تختِ بالاتر (The Highest Throne) کہتے ہیں۔ یہ فرشتوں کی دنیا ہے جو خدا ہی کی مخلوق ہیں لیکن غیر مرئی ہیں یعنی ان کا انسان کی طرح یا ہماری دنیا کی دوسری مخلوقات کی طرح جسم نہیں ہوتا کہ اسے چھو کر دیکھا جا سکے۔ یہ فرشتے دراصل خدا کی وہ طاقتیں (Powers) یا فطری اصول (Natural Principles) ہیں جن سے وہ کائنات کا نظم و نسق چلاتا اور اس میں ہر لحظہ ترمیم و اضافہ کرتا رہتا ہے۔ یاد رہے کہ طاقت اِس صلاحیت کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ اس سے تبدیلی لائی جا سکتی ہے (Power is nothing but the ability to bring about a change)۔

حقیقت کے اسی دائرے میں فرشتوں کے علاوہ خدا کے تمام رسول اور انسانِ کامل (مسلمانوں کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی شامل ہیں جن پر خدا وحی نازل کرتا ہے۔ وحی لے کر فرشتے ہی نبیوں اور رسولوں تک جاتے ہیں اور ایک طرح سے وہ خدا اور رسولوں کے درمیان ہرکاروں کا کام کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان فرشتوں سے برتر ہے کیونکہ تخلیقِ آدم کے وقت انسان میں خدا نے اپنی روح پھونک دی تھی اور فرشتے انسان کے آگے سربسجدہ ہو

Marfat.com

کیے تھے۔ جنت بھی اسی دائرہ حقیقت میں شامل ہے۔

4) ملکوت: یہ حقیقت کا چوتھا دائرہ ہے جس سے جنات تعلق رکھتے ہیں۔ جنات فرشتوں کی طرح غیر مرئی (نا قابلِ محسوس) ہیں لیکن انسان کی طرح صاحبِ عقل و فہم ہیں۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک غیر مرئی جسم رکھتے ہیں۔ غیر مرئی ہوتے ہوئے بھی ان کی ایک شکل و صورت ہوتی ہے۔ انسان کی طرح جنات پر بھی وحی آتی ہے۔ اور وہ انسان ہی کی طرح اس وحی پر اپنی پوری صلاحیتوں سے عمل کر کے حقیقت کے برتر اور اعلیٰ ترین دائروں سے تعلق پیدا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ بات عام تسلیم کی جاتی ہے کہ ایسے جنات موجود ہیں جو اسلام لا چکے ہیں جس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کچھ جنات غیر مسلم یا مسیحی، یہودی اور ہندو بھی ہو سکتے ہیں۔ سورہ الرحمٰن کی مشہور آیت "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن" میں مسلسل تثنیہ (دو) کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اس جملے میں خدا صرف انسان ہی سے نہیں بلکہ جنات سے بھی مخاطب ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے قرآنِ حکیم میں 31 مرتبہ دہرائی جانے والی اس آیت کا ترجمہ 31 بار "پس اے جن و انس" ہی کے الفاظ سے شروع کیا ہے۔

اس سلسلے میں سورہ الجن کی مندرجہ ذیل آیات سے جنات یا عالم ملکوت کی حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے:

"اے نبی! لوگوں کو بتاؤ کہ میری طرف خدا کی جانب سے یہ وحی بھیجی گئی ہے کہ جب میں قرآنِ حکیم سنا رہا تھا تو (نظر نہ آنے کے باوجود) جنوں کا ایک گروہ بھی سن رہا تھا۔ (انھوں نے اپنی قوم کی طرف واپس جا کر) کہا، "ہم نے آج ایک بہت عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور آئندہ ہم کبھی اپنے رب، خدائے واحد کے ساتھ کسی کو شریک نہیں سمجھیں گے۔ اور ہمارے ربّ کی شان بہت بلند ہے اور اس کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ بیٹا۔ ہمارے نادان جن بھائی بہن خدا کے بارے میں بہت غلط سلط باتیں کہتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ہم اس خوش فہمی میں تھے کہ انسان اور جن خدا کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ مگر کچھ انسان (اپنی نادانی میں) دوسرے انسانوں کے خلاف جنات کی پناہ مانگنے لگ گئے تھے جس سے جنات کا غرور اور بھی بڑھ گیا۔ جس طرح جنات یہ سمجھتے تھے کہ خدا ان کی ہدایت کے لیے کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا، انسانوں کو بھی یہی غلط فہمی تھی۔ لیکن پھر ہم نے دیکھا کہ آسمان پر ہر طرف پہریدار کھڑے ہیں اور شہابوں (Meteors) کی بارش ہو رہی ہے۔ پہلے تو ہم سُن گُن لینے کے لیے آسمان میں چھپ چھپا کر بیٹھ جاتے تھے لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا کیونکہ ہم میں سے جو کوئی چوری چھپے کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے اس کے تعاقب میں ایک شہابِ ثاقب (ٹوٹا ہوا تارہ) لگ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ معاملہ کیا ہے، خدا اہلِ زمین کو سزا دینا چاہتا ہے یا ان کی ہدایت کا کوئی براہِ راست بندوبست کر رہا ہے۔ خود ہماری اپنی بھی یہ

Marfat.com

حالت ہے کہ ہم میں سے کچھ تو صالح ہیں اور کچھ غیر صالح۔ (انسانوں کی طرح) ہم بھی مختلف راستوں پر چل رہے ہیں۔ بہرحال ہمیں اندازہ ہو چکا ہے کہ ہم نہ تو خدا کو زمین پر عاجز کر سکتے ہیں اور نہ اس کی دسترس سے باہر بھاگ سکتے ہیں۔ البتہ اب ہم (محمدؐ کی زبان سے قرآن سن کر) خدا کی ہدایت پر ایمان لے آئے ہیں اور اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جو کوئی بھی اپنے (سچے) رب پر ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا زیادتی کا خوف نہیں رہے گا۔ اب ہم میں سے کچھ تو مسلمان ہو گئے ہیں اور کچھ ابھی تک اسلام لانے سے گریز کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کسی نے اسلام (خدا کی اطاعت) قبول کر لیا اسے تو راہِ نجات مل گئی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں" (72:1-15)۔

جب رسولِ خدا طائف کے سفر سے واپس آرہے تھے تو رات کے وقت آپؐ نے صحرا میں قرآنِ حکیم کی تلاوت فرمائی تھی جسے جنات کے مذکورہ گروہ نے سنا تھا اور وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے۔ یہ جنات اپنی قوم کی جانب پلٹے اور انھوں نے دوسرے جنات سے وہ گفتگو کی جو سورہ الجن کی مندرجہ بالا آیات میں محفوظ ہے۔ ان کی تلقین سے دوسرے کئی جنات بھی ایمان لے آئے۔ پھر وہ سب مل کر مکے میں رسولِ خدا کی خدمت میں حلفِ وفاداری (بیعت) کے لیے اُس مقام پر آئے جو اُس وقت سے اب تک "مسجدِ جن" کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

ملکوت ہی حقیقت کا وہ دائرہ ہے جس میں جہنم واقع ہے۔ یہ دائرہ عالم المثال بھی کہلاتا ہے۔

5) ناسُوت: یہ حقیقت کا پانچواں اور آخری دائرہ ہے۔ یہ ہماری اپنی دُنیا ہے جسے عالمِ الملک اور حضرۃ الشہادۃ بھی کہتے ہیں۔ یہ ہماری جانی پہچانی، دیکھی بھالی، چھوئی ٹٹولی، روزمرہ کی جسمانی دنیا ہے جو ان پانچ صفات کی حامل ہے: (1) زمان (Time)، (2) مکان (Space)، (3) شکل وصورت یا ہیئت (Form)، (4) اعداد (Numbers) اور (5) مادہ (Matter)۔ آسانی کے لیے اس دائرے کو دائرۂ حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔ صوفیوں نے سائنس دانوں سے بہت پہلے انسانوں، جانوروں اور نباتات سے آگے دھاتوں، پتھروں اور مٹی میں بھی زندگی موجود محسوس کر لی تھی۔ کبھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ زندگی صرف آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے چار عناصر (Elements) سے وجود میں آتی ہے۔ ارسطو نے وجود کے لیے دس صفات ضروری قرار دی تھیں۔ آج کے سائنس دان 109 عناصر کی بات کرتے ہیں۔ جامیؒ اور دوسرے صوفی شاعروں اور مصنفوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مخلوقات یا زندہ چیزیں دراصل وجود کے سمندر کی موجوں اور لہروں سے پیدا ہونے والی جھاگ ہیں۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ انسان اور دوسری ذی حیات مخلوقات اپنا الگ وجود نہیں رکھتیں۔ وجود تو صرف اللہ ہی کی شان ہے۔ انسان اور دوسری مخلوقات محض ایک حادثہ یا رُوگردانی (اعراض) ہیں جو اصل حقیقت (جوہر) سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

خدا یا حقیقتِ مطلق (Absolute Reality) کے بارے میں اگر مسلمان فلسفیوں یا فلسفی صوفیوں نے

Marfat.com

غور وفکر کیا ہے تو دوسرے مذاہب میں بھی اس پر بہت سوچ بچار ہوئی ہے۔ خصوصاً ابراہیمی مذاہب سے تعلق رکھنے والے صوفیوں کی تمام تر روحانی جدوجہد کا تو مقصد ہی ایک رہا ہے کہ خدا تک یا حقیقتِ مطلق تک کیسے رسائی حاصل کی جائے۔ اس سلسلے میں یہودی تصوف (کبالہ Kabbala) میں ہماری دنیا سے خدا یا حقیقتِ مطلق تک پہنچنے کے روحانی سفر میں دس منزلیں آتی ہیں۔ مسلمان صوفیوں میں ابن عربیؒ نے کہا تھا کہ خدا نے اپنی مخلوق کی محبت میں ایک آہ بھری تھی جس نے مخلوق پر خدا کو ظاہر کر دیا تھا۔ مسیحیوں میں، خصوصاً یوحنا رسول کی انجیل کے آغاز میں کلام (Word-Logus) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ''ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ سب چیزیں اسی سے پیدا ہوئیں، کلام میں زندگی تھی اور زندگی آدمیوں کا نور تھی اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان (حضرت عیسیٰؑ کے روپ میں) رہا''۔ اسی طرح کبالی صوفیوں نے بھی یہ تصور اپنایا کہ اگرچہ خدا کو کسی نے دیکھا تو نہیں کیونکہ اسے دیکھا جا ہی نہیں سکتا لیکن وہ اپنے چاہنے والوں (کبالیوں) پر حقیقت کے دس پہلوؤں یا دائروں کے ذریعے سے قابلِ برداشت حد تک اپنا نور ظاہر کر دیتا ہے۔

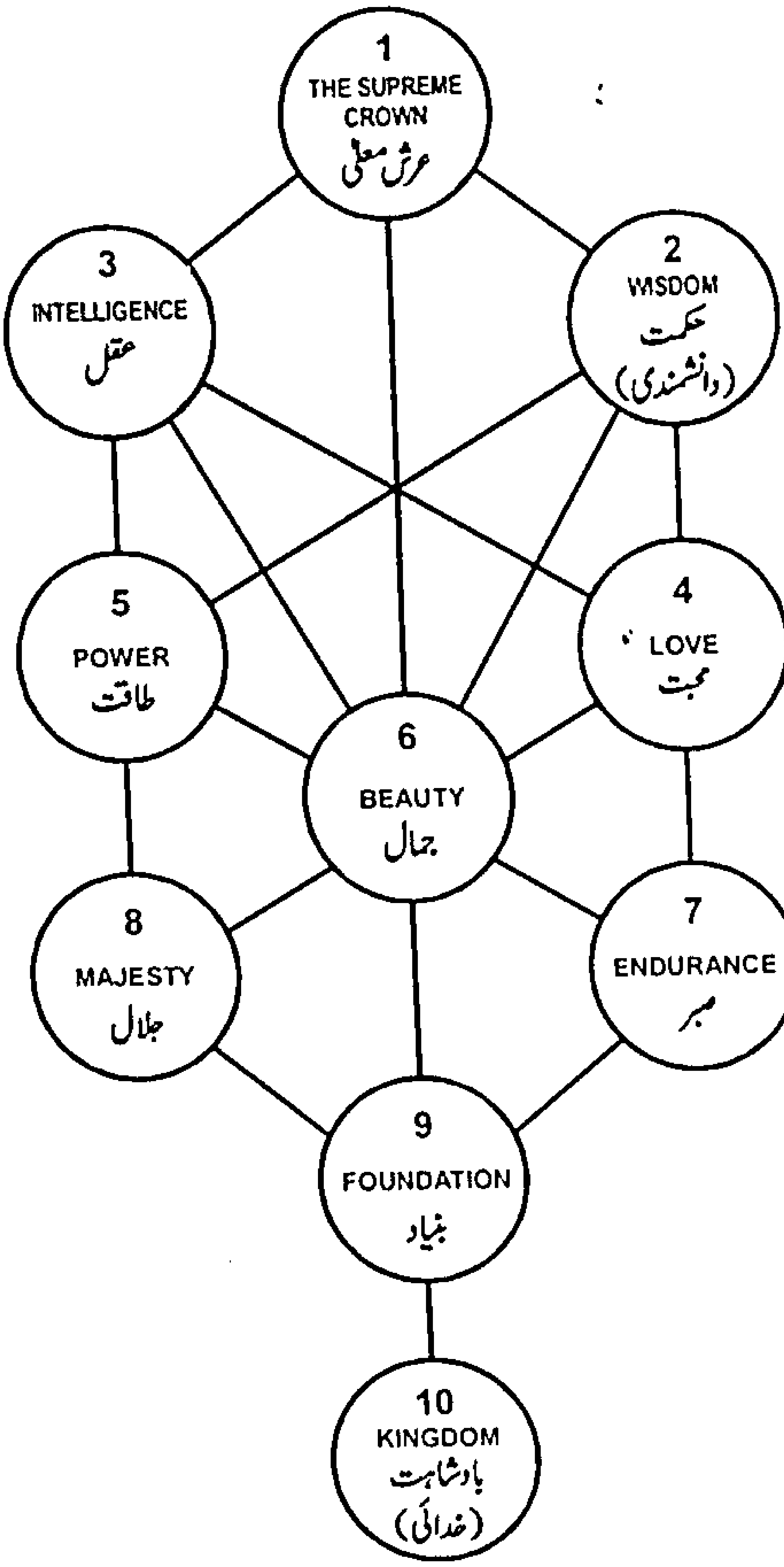

یاد رہے کہ خود قرآنِ حکیم میں حضرت موسیٰؑ کی اس خواہش کا ذکر موجود ہے کہ وہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں (ربِّ اَرِنی اُنظُر الیک)۔ خدا نے پہلے تو یہی کہا کہ تم مجھے نہیں دیکھ پاؤ گے (لن ترانی) البتہ دیکھنا ہی چاہتے ہو تو سامنے اس پہاڑ کو دیکھو، میں اس پر اپنی تجلی ڈال دیتا ہوں۔ اور جب خدا نے پہاڑ پر تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر گئے (7:143)۔

Marfat.com

کبالیہ صوفیوں کے مطابق حقیقت کے ان دس پہلوؤں کو دائروں کے ایک درخت (The Tree of Selfiroth) کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے (گزشتہ صفحہ دیکھیں)۔ حقیقت کا یہ سفر نیچے سے اوپر کی جانب ہوتا ہے لیکن دائیں بائیں اور اوپر نیچے سب دائرے باہم ملے ہوئے ہیں اور مل جل کر ہی عرشِ معلیٰ تک پہنچتے ہیں۔

اس تمام بیان سے آپ دو باتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ (1) صوفیاء نے خدا کی تلاش میں جسے تصوف کی زبان میں تلاشِ حق اور فلسفے کی زبان میں تلاشِ حقیقت کہتے ہیں، مراقبوں، مشاہدوں، کشف والہام کے علاوہ عقل و دانش سے بھی قابلِ قدر کام لیا ہے۔ (2) آج کا مصروف اور ایک طرح سے کاہل انسان ان لمبے چوڑے بکھیڑوں کے بغیر ہی خدا سے تعلق پیدا کرنا چاہے گا۔ کیا اس کا کوئی طریقہ ہے؟

''جی ہاں'' ہے اور اُسے ''روحانیت'' کہتے ہیں۔

خدا اور روحانیت

انسان جسمانی آنول (Umbilical Cord) کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ جو پیدائش کے فوراً بعد ہی کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ آنول بچے کی ماں کے ساتھ بندھی ہوتی ہے اور بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں رہتا ہے اسی آنول کے ذریعے سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ انسان کی دوسری آنول روحانی (Spiritual Cord) ہے جو بچے کی تخلیق سے اس کی موت تک جڑی رہتی ہے۔ یہ آنول اس روح سے تعلق رکھتی ہے جو تخلیقِ آدم کے موقع پر خدا نے اپنی روح میں سے انسان میں پھونکی تھی۔

اسلام نے انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ اس کے اوپر سے ازلی گناہ کا وہ ہمالیاتی بوجھ اتار دیا جو یہودیت اور مسیحیت نے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لینے کے حوالے سے انسان پر ڈال رکھا تھا۔ خدا نے آدم اور حوا کی نافرمانی پر انھیں بے شعوری کی جنت سے تو نکال دیا تھا لیکن ان کی توبہ قبول کر کے انھیں گناہ سے پاک کر دیا تھا۔ چنانچہ اسلام کے مطابق اب ہر انسان کی پیدائش کے موقع پر یہی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ احسنِ تقویم، خوب صورت ترین ساخت اور صلاحیتوں یا The most beautifully balanced structure کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس بات کو یاد رکھے کہ اسے خدا نے نہ صرف بہترین صلاحیتیں عطا کی ہیں بلکہ اس میں اپنی روح بھی پھونک رکھی ہے اور یہی نہیں، اس کے سامنے فرشتوں (کائنات اور فطرت میں کارفرما طاقتوں یا اصولوں) کو سجدہ ریز کر کے اسے زمین پر خلافت بھی دی ہوئی ہے تو اس کے لیے زندگی میں سر اٹھا کر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ اب وہ تلاشِ حق میں نکلتا ہے تو اِس روحانی آنول کے سہارے جس کا ایک سرا خدا کی روح سے اور دوسرا سرا اس کی اپنی روح سے وابستہ و پیوستہ ہے، وہ زندگی کی تمام تر بھول بھلیوں کو عبور کر کے خدا سے ہمکنار اور ''ہم کلام'' ہو سکتا ہے۔

''ہم کلام'' کے لفظ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر وہ انسان جو اپنی روحانی آنول کا شعور رکھتا ہے،

اور اسے عدم استعمال اور بے پروائی کی وجہ سے معطل نہیں ہونے دیتا۔ جب خدا سے دعا کر رہا ہوتا ہے تو دراصل اس سے ہم کلام ہی تو ہو رہا ہوتا ہے۔ خدا سے ہم کلام ہونے کا ایک اور طریقہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس سے انسان کے مقدر (Destiny) کی بابت سوال کرنا ہے۔ ہمارے عہد کے انسان دوست اور خدا دوست شاعر، غالب احمد کی ایک نظم کا یہ حصہ اس طریقے کی خوبصورت مثال ہے:

کبھی آ کر بتا ہی دے
کہ ہم ہیں کون، کب سے اور کہاں ہیں ہم؟
اب ہم کون سے تارے سے اتریں اور کہاں جائیں؟
کہ اب ہم کون سے تارے پہ اتریں اور اماں پائیں؟
زمیں پر زندگی کی فصل کاٹی جا چکی ہے
اب کہاں پر بیج بونے کا ارادہ ہے؟
امید و آرزو کی کشتیاں لے کر کہاں جائیں؟

خدا نے ہر انسان میں اپنی روح پھونک کر اسے یہ ''ڈائرکٹ لائن'' (سیاست میں اسے Hot Line بھی کہتے ہیں) دے رکھی ہے۔ انسان کی بے دھیانی یا لاعلمی کے باعث یہ لائن نظر انداز نہ ہو چکی ہو تو وہ جب چاہے خدا سے بات کر سکتا ہے اور یہ تو خدا کا اپنا وعدہ ہے کہ کوئی اسے پکارے گا تو وہ بھی اسے جواب دے گا۔

خدا سے اس بات چیت کو ہرگز ہرگز وحی کا مقام نہیں دینا چاہیے۔ بہت سے صوفیاء اور مصلحین کو یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ بات چیت بھی وحی کی حیثیت رکھتی ہے۔ تصوف میں اس بات چیت کے لیے ''شطحیات'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ وحی تو غیر ذاتی خدا کی طرف سے پیغمبروں کو ایک بھاری امانت کے طور پر بھیجی جاتی ہے اور اس کا مقصد ان پیغمبروں کی قوموں یا تمام تر انسانیت کی ہدایت اور فلاح ہوتا ہے۔ خدا یہ احتیاط بھی کرتا ہے کہ وحی میں پیغمبروں کی خواہشوں اور سوچوں کو کوئی دخل حاصل نہ ہو لیکن خدا سے عام انسانوں کی بات چیت بڑی حد تک ان کے ذاتی خدا کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہر شخص کا خدا کے بارے میں الگ الگ تصور ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی ضمیر کوئی ایسی چیز نہیں کہ ہر شخص کو یکساں مقدار یا شکل میں ملی ہو اسی طرح ہر شخص اپنی علمی، روحانی اور جذباتی سطح کے مطابق خدا کا ایک مخصوص تصور رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ابن عربی ؒ اور رُومیؒ جیسے صوفیاء کے تجربات اور تلقین کا نچوڑ بھی یہی ہے کہ انسان خدا کو معروضی (Objective) نہیں بلکہ داخلی (Subjective) طور پر ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ابن عربی ؒ کو خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے ایک مشاہدے (Vision) کی صورت میں ''نظام'' نام کی ایک نوجوان خاتون نظر آئی جس کے گرد خدا کے نور کا مقدس ہالہ تھا۔ اس واردات کے دوران ابن عربیؒ پر یہ راز کھلا کہ ''نظام'' حکمتِ خداوندی (Divine Wisdom) کا اوتار تھی (ادب عالیہ کے طالب علموں کو اس واقعے سے دانتے (Dante) کی تخیلاتی محبوبہ بیاترس (Beatrice) یاد آ

Marfat.com

گئی ہوگی)۔اس سلسلے میں رومیؒ نے خدا کے بارے میں ہمارے داخلی تجربے کی شہادت کے طور پر یہ حکایت بیان کی ہے۔

ایک روز موسیٰؑ نے ایک گڈریے کو خدا سے بے تکلفانہ باتیں کرتے سنا۔ وہ خدا کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ خدا ملے گا کہاں؟ گڈریا کہہ رہا تھا، ''اگر تو مجھے مل جائے تو میں تیرے کپڑے دھودوں، تیرے سر سے جوئیں نکال دوں، تجھے سلا کر تیرے ہاتھ پاؤں چوموں......''

گڈریے کی باتیں سن کر موسیٰؑ ہکا بکا رہ گئے، ''ارے میاں گڈریے! بھلا تم کس سے یوں بے تکلف ہو رہے تھے؟ تمھیں کچھ خبر بھی ہے کہ زمین و آسمان کے خالق و مالک خدائے بزرگ و برتر کی کیا شان ہے؟ یوں لگ رہا تھا جیسے تم اپنے چچا سے بات کر رہے ہو''۔

موسیٰؑ کی ڈانٹ ڈپٹ سن کر بے چارہ گڈریا منہ لٹکائے صحرا میں گم ہو گیا۔ اس پر خدا نے موسیٰؑ کی یوں خبر لی: ''مجھے لچھے دار اور گھڑے گھڑائے لفظوں کی نہیں، گرمجوش محبت اور روح پرور انکسار کی ضرورت ہے''۔

یہ حکایت سنا کر رومیؒ نے واضح کیا کہ خدا سے بات کرنے کا کوئی ایک مخصوص طریقہ نہیں ہے۔ اہمیت طریقے کو نہیں، جذبے کی صداقت اور گہرائی کو حاصل ہے۔ چنانچہ وہ خدا کے منہ سے کہتا ہے:

جو تمھیں غلط نظر آتا ہے، خدا کے ہاں مقبول ہو سکتا ہے
جو چیز ایک کے لیے زہر ہو، وہ دوسرے کے لیے شہد ہو سکتی ہے
عبادت میں پاکیزگی یا ناپاکی، سُستی یا محنت سے مجھے کوئی سروکار نہیں
میں ان چیزوں سے بالا ہوں
عبادت کے طریقوں کو اچھے یا برے کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا
ہندو ہندوانہ طریقوں سے عبادت کرتے ہیں
ہندوستان کے نومسلم بھی اکثر وہی کچھ کرتے ہیں
جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ بھی عبادت ہی ہے اور درست ہے
عبادت کے دوران میری شان نہیں بڑھائی جاتی
بلکہ عبادت گزاروں کی شان بڑھتی ہے
جو بھی وہ کہتے ہیں، جن لفظوں اور طریقوں سے کہتے ہیں، میں وہ نہیں سنتا
میں تو ان کے اندر کی عاجزی و انکسار کو دیکھتا ہوں
اصل حقیقت انسان کا خدا کے سامنے صدقِ دل سے جھکنا ہے

Marfat.com

مجھے زباندانی نہیں چاہیے، لفاظی کو چھوڑو

میں تو عشق کی آگ دیکھنا چاہتا ہوں

بس عشق کی آگ!

اس عشق کی آگ سے رشتہ جوڑو

اپنی عقل کو اس میں تپاؤ

حسنِ اظہار کی فکر کو چھوڑو

اور اب پیر رومیؒ کے مرید ہندی، اقبالؒ کا ایک شعر سن لیجیے:

ہے یہی میری نماز ، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

''عام آدمی خدا سے کیسے کلام کر سکتا ہے، یہ تو پیغمبروں ہی کا شرف ہے''۔ یہ وہ خیال ہے جس کی بنا پر عام آدمی اپنا دل مٹھی میں لیے بیٹھا رہتا ہے اور خدا انتظار کرتا رہتا ہے کہ یہ بھلا مانس کچھ مُنہ سے پھوٹے تو اسے جواب دوں۔ بے شک خدا ہمارے دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ ہم زبان ہی سے کچھ کہیں۔ مگر بولے بغیر وہ تو ہماری سن لے گا، ہم اس کی کیسے سنیں گے؟ یہاں ایک واقعہ سن لیجیے۔

پاکستان میں شہری آزادیوں کے لیے جن لوگوں نے واقعی دل و جان سے محنت اور خدمت کی ہے ان میں میاں محمود علی قصوری مرحوم کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ اپنے وقت میں آپ واقعی چوٹی کے وکیل تھے۔ صرف شخصیت ہی ''بھاری'' نہیں تھی، آواز بھی بھاری تھی۔ کمرۂ عدالت میں بولنا شروع کرتے تو لاؤڈ سپیکر کے بغیر آواز برآمدوں میں بھی گونج رہی ہوتی تھی۔ رہائش لاہور میں تھی۔ ایک اہم مقدمے کے سلسلے میں کراچی تشریف لے گئے۔ سندھ ہائی کورٹ میں پیشی تھی۔ آپ نے دلائل دینے شروع کیے۔ جیسے جیسے بولتے جاتے تھے، کیا وکیل اور کیا مؤکل، ساری کچہری کھنچ کر کمرۂ عدالت تک پہنچ گئی۔ اچھی بھلی ''لا اینڈ آرڈر سچوایشن'' پیدا ہو گئی۔ اتنے معزز اور نامور وکیل کو ٹوکنے سے جج صاحب بھی کترا رہے تھے، اشارہ کرنا مناسب سمجھا، کہا، ''میاں صاحب! آپ نے کراچی آنے کی زحمت کیوں اٹھائی، لاہور ہی سے بول دیتے، ہم بآسانی سن لیتے''۔ قصوری صاحب نے برجستہ جواب دیا، ''مائی لارڈ! میں جو کچھ کہتا وہ تو آپ سن لیتے، لیکن آپ جو فرماتے، میں کیسے سنتا''؟

بہر حال خدا سے بات چیت میں آواز استعمال کرنا نہ تو منع ہے اور نہ ضروری۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا تو ہماری ہر حالت میں سن ہی لیتا ہے، ہم اس کی کیسے سنیں؟

خدا کی بات سننے کے لیے روح ہی کے تار کام دیتے ہیں اور ان تاروں سے کام لینے کے لیے یہ ایمان، یقین اور اعتماد ضروری ہوتا ہے کہ وہ واقعی موجود ہے اور ہمارا اس کے ساتھ ماں باپ اور اولاد جیسا

Marfat.com

گہرا تعلق ہے۔ اگلا قدم یہ ہے کہ ہم ان تاروں سے کام لینا شروع کر دیں۔ آج دنیا میں لاکھوں حساس لوگ مذہبی انتہا پسندی سے بددل ہو کر ایک ایسی روحانیت کے قائل ہوتے جا رہے ہیں جس میں خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کی دیواریں گر جائیں اور اقبال کے الفاظ میں یہ فرمانِ خدا پورا ہو جائے:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

چنانچہ آج مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی روحانی آنول یا روح کی بناء پر خدا کے ساتھ ہاٹ لائن کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر خدا سے بات چیت کرنے کی جرأت کر رہے ہیں۔ حال ہی میں نیل ڈانلڈ والش (Neale Donald Walsch) نے ''خدا سے گفتگوئیں'' (Conversations with God) کے عنوان سے کتابوں کا ایک سلسلہ لکھا ہے۔ پہلی جلد کی پہلی گفتگو یوں شروع ہوتی ہے:

بندہ: اے خدا، تُو کس سے بات کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے؟

خدا: میں اپنے ہر بندے سے بات کرتا ہوں اور ہر وقت کرتا ہوں، سوال یہ نہیں کہ میں بات کس سے کرتا ہوں، سوال یہ ہے کہ سنتا کون ہے؟

بندہ: اے خدا، میں سن رہا ہوں، تُو کھل کر بول۔

خدا: چلو، سب سے پہلے تو یہ کرتے ہیں کہ ''بولنے'' کا لفظ ''ابلاغ'' (Communication) سے بدل لیتے ہیں۔ یہ زیادہ بہتر، زیادہ وزنی اور مکمل لفظ ہے جب ہم ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً میں تم سے اور تم مجھ سے کچھ کہتے ہو تو لفظوں کی کوتاہی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں محض الفاظ کے ذریعے ابلاغ (بات کو ایک دوسرے تک پورے مفہوم کے ساتھ پہنچانا) نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں لفظوں پر کم ہی بھروسا کرتا ہوں۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے میں زیادہ تر احساس (Feeling) سے کام لیتا ہوں کیونکہ احساس ہی روح کی زبان ہے۔

اگر تم یہ جاننا چاہو کہ تمھارے لیے کیا صحیح اور کیا غلط ہے تو یہ دیکھو کہ تم اس کے بارے میں کیا محسوس کر رہے ہو۔ بعض اوقات محسوسات کی پہچان مشکل ہوتی ہے اور یہ تو اور بھی مشکل ہوتا ہے کہ تم جو کچھ محسوس کر رہے ہو اس کا اقرار کرو۔ اس کے باوجود بڑی سے بڑی صداقت تمھارے احساس کی گہرائیوں ہی میں کہیں چھپی ہوتی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ احساس کی گہرائیوں تک پہنچا کیسے جائے؟ میں تمھیں اس کا طریقہ بتا سکتا ہوں بشرطیکہ تم یہ طریقہ جاننا چاہو۔

میں تو جاننا چاہتا ہوں۔ لیکن تو نے میرے پہلے سوال کا واضح جواب نہیں دیا۔ مہربانی سے مجھے بتا کہ تو اپنے بندوں تک کیسے کیسے اپنی بات پہنچاتا ہے؟

Marfat.com

خدا:- میں خیال کے ذریعے سے بھی بندوں تک بات پہنچاتا ہوں۔ خیال اور احساس ایک ہی چیز نہیں ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک ہی وقت میں دونوں استعمال ہو رہے ہوں۔ خیال کی حد تک میں اکثر نقوش اور تصاویر سے بھی کام لیتا ہوں۔ چنانچہ صرف الفاظ کے مقابلے میں خیالات زیادہ مؤثر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے بہتر طور پر بات پہنچائی جا سکتی ہے۔

احساس اور خیال کے علاوہ میں تجربے یا واردات (Experience) کا عظیم حربہ بھی استعمال کرتا ہوں اگر احساس، خیال اور واردات، سب ناکام ہو جائیں تو میں آخرِ کار الفاظ استعمال کر لیتا ہوں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ الفاظ سب سے غیر مؤثر ذریعۂ ابلاغ ہیں۔ ان کی بڑی آسانی سے غلط تشریح ہو سکتی ہے اور یہ اکثر غلط فہمی کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ جانتے ہو؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ محض بولے جاتے ہیں، یہ ایک طرح کا شور ہوتے ہیں جو احساس، خیال اور واردات کا متبادل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ علامات، نشانیاں اور طغرے ہوتے ہیں، یہ بذاتہ صداقت نہیں ہوتے۔ یہ اصل چیز نہیں، اصل چیز کا متبادل ہوتے ہیں۔

الفاظ کسی بات کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں جبکہ واردات ٹھوس علم ہوتی ہے۔ لیکن کئی باتیں ایسی ہیں جو واردات نہیں بن سکتیں۔ اس لیے میں نے تمھیں علم کے کچھ اور ذرائع بھی دے رکھے ہیں جنھیں تم خیالات اور احساسات کے نام سے جانتے ہو۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کے باوجود تم سب سے زیادہ زور خدا کے الفاظ پر دیتے ہو اور قلبی و روحانی واردات کو نظر انداز کر جاتے ہو۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب خدا تمھارے قلب اور روح کے ذریعے سے اور واردات کی صورت میں تم سے مخاطب ہوتا ہے اور تمھاری واردات ان الفاظ سے مختلف ہوتی ہے جو تم نے خدا کے بارے میں سن رکھے ہوتے ہیں تو تم بلا سوچے سمجھے اپنی واردات کو غلط اور اُن سنے سنائے الفاظ کو درست قرار دے کر چپ ہو جاتے ہو حالانکہ تمھارا عمل اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔

تو گویا احساس، خیال اور واردات وہ اوزار ہیں جن سے تم کسی معاملے کا حقیقی اور وجدانی علم حاصل کر سکتے ہو۔ جب کہ الفاظ اس علم کا صرف علامتی اظہار کر سکتے ہیں اور اکثر مغالطوں کا باعث بنتے ہیں۔ البتہ ایک بات یاد رکھنا کہ احساس، خیال اور واردات بات پہنچانے کا ذریعہ ہیں، حتمی طریقہ نہیں۔ یعنی تمام احساسات، خیالات یا وارداتیں اور تمام الفاظ ہمیشہ میری طرف سے نہیں ہوتے۔ بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو میرے نام سے بولے گئے ہیں۔ کتنے ہی خیالات اور احساسات کو میرے مقاصد کے برخلاف استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح جھوٹی وارداتیں بھی گھڑی گئی ہیں۔ اس لیے کھرے کھوٹے کی پہچان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس پہچان کو بے حد مشکل بنا دیا گیا ہے۔ لیکن ایک بنیادی اصول پیشِ نظر رہے تو یہ پہچان آسان ہو جاتی ہے۔

بندہ:- وہ اصول کیا ہے؟

Marfat.com

خدا:- میری طرف سے آنے والا خیال تمہارا سب سے بلند خیال ہوگا۔ میری طرف سے آنے والا لفظ تمہارا سب سے واضح لفظ ہوگا۔ میری طرف سے آنے والا احساس تمہارا سب سے اعلیٰ احساس ہوگا۔ ہر وہ خیال، لفظ یا احساس جو کمتر ہو کسی اور کی طرف سے آیا ہوگا۔ تلاشِ حق میں نکلا ہُوا سادہ سے سادہ شخص بھی آسانی سے اپنے بلند ترین خیال، واضح ترین لفظ اور اعلیٰ ترین احساس کو پہچان سکتا ہے۔

بندہ:- پھر بھی بہتر ہوگا کہ ان کی پکی پہچان کے لیے تُو مجھے کچھ ہدایات دے دے۔

خدا:- بلند ترین خیال ہمیشہ وہ ہوتا ہے جس میں مسرت شامل ہو۔ واضح ترین لفظ وہ ہوتا ہے جس میں صداقت موجود ہو۔ اعلیٰ ترین احساس وہ ہوتا ہے جسے تم محبت کہتے ہو۔

بندہ:- گویا تیری طرف سے آنے والے خیال میں مسرت ہوگی، الفاظ میں صداقت ہوگی اور احساس میں محبت ہوگی۔

خدا:- مسرت، صداقت، محبت، ان تینوں کے درمیان ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ ان میں سے ہر صفت دوسری دو کی طرف رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ جہاں مسرت ہوگی وہاں صداقت اور محبت بھی ہوگی۔ جہاں صداقت ہوگی وہاں مسرت اور محبت بھی ہوگی۔ جہاں محبت ہوگی وہاں مسرت اور صداقت بھی ہوگی۔ ایک مرتبہ ان ہدایات کی روشنی میں طے ہو جائے کہ کون سے پیغامات میری طرف سے آئے ہیں تو پھر صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان پیغامات پر عمل بھی کیا جائے گا یا نہیں۔

بندہ:- پیغام تیرا ہو اور اس پر عمل نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

خدا:- میرے زیادہ تر پیغامات پر عمل نہیں ہوتا۔ کچھ پر اس لیے کہ وہ اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ ان پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کچھ پر اس لیے کہ ان پر عمل کرنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔ بہت سے پیغامات پر اس لیے عمل نہیں ہوتا کہ ان کو غلط معنی پہنا دیے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ اس لیے کہ میرے پیغامات وصول ہی نہیں کیے جاتے۔

بندہ:- ایسا ہونا تو نہیں چاہیے۔

خدا:- مگر ایسا ہوتا ہے۔ میرا سب سے طاقتور پیغام بردار "واردات" ہے۔ مگر تم تو اپنی واردات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہو۔ انسان سب سے زیادہ اپنی جسمانی، قلبی، ذہنی اور روحانی واردات ہی کو نظر انداز کرتا ہے۔ تمھاری زندگی اور تمھاری دنیا ایسی نہ ہوتی جیسی ہے اگر تم نے اپنی واردات پر کان دھرے ہوتے۔ اپنی واردات پر دھیان نہ دینے ہی کا نتیجہ ہے کہ تم بار بار وہی کچھ کرتے چلے جاتے ہو جو تم نہیں کرنا چاہتے۔ مگر میرے مقصد کو کوئی پس پشت نہیں ڈال سکتا، میرے ارادے کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ جلد یا بدیر تمھیں میرے مقصد اور ارادے پر توجہ دینی ہی پڑتی ہے۔

بندہ:- تیرے مقصد اور ارادے کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ پھر انسان اسے سمجھنے میں دیر کیوں لگاتا ہے؟

خدا:- میں نے انسان کو اختیار (Free Will) دے رکھا ہے۔ میں اسے مجبور نہیں کرتا۔ وہ چاہے تو میری بات سنے

یا نہ سُنے۔ اور میں اس سے یہ اختیار کبھی واپس بھی نہیں لوں گا۔ اس لیے میں تمھیں بار بار پیغامات بھیجتا رہتا ہوں، تم کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی زمین پر رہو، میری طرف سے تمھیں مسلسل اور متواتر پیغامات بھیجے جا رہے ہوتے ہیں۔ پھر وہ دن آ ہی جاتا ہے جب تمھاری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ تم یہ پیغامات وصول تو کر لیتے ہو لیکن سمجھتے ہو کہ یہ تمھارے اپنے ہی خیالات، الفاظ، احساسات اور تجربات ہیں۔

بندہ:- ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟

خدا:- تم ایسا اس لیے کرتے ہو کہ آنکھیں رکھتے ہو مگر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہو مگر سنتے نہیں، دل رکھتے ہو مگر محسوس نہیں کرتے، ذہن رکھتے ہو مگر غور نہیں کرتے، روح رکھتے ہو مگر زمین سے چمٹے رہتے ہو۔ مگر میرے پاس ازل سے ابد تک کا وقت ہے۔ میں ہزار رنگ میں پیغامات بھیجتا رہتا ہوں، تمھاری زندگی میں لاکھوں لمحات ایسے آتے ہیں جن میں میرے پیغامات موجود ہوتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ صدہا صدیوں تک چلتا رہتا ہے۔ اگر تم واقعی توجہ دو تو انھیں وصول کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ایک مرتبہ تم انھیں واقعی وصول کر لو تو انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بس اس کے بعد ہماری تمھاری گفتگو بھرپور طریقے سے جاری ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے صرف تم مجھ سے بات کیا کرتے تھے، مجھ سے دعا کرتے رہتے تھے، دوسروں کے لیے سفارشیں کرتے رہتے تھے، التجائیں کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب تم بولنے کے ساتھ ساتھ سننے بھی لگ جاتے ہو تو پھر تمھیں میری طرف سے جواب بھی وصول ہونے لگتے ہیں۔

بندہ:- اس وقت تیرے اور میرے درمیان جو گفتگو ہو رہی ہے میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ میرے اپنے تخیل کی تخلیق نہیں بلکہ واقعی خدا کے ساتھ ہو رہی ہے؟

خدا:- اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر میں خیال، الفاظ اور احساس کے ذریعے تم تک بات پہنچا سکتا ہوں تو تخیل کے ذریعے ایسا کرنا میرے لیے کیونکر مشکل ہو سکتا ہے؟ میں کسی بھی خاص موقع پر تمھیں صحیح ترین خیالات، الفاظ اور احساسات عطا کر سکتا ہوں جو اس موقع کی ضرورت سے پوری پوری مطابقت رکھتے ہوں اور یہ کام میں کسی ایک ذریعے سے یا متعدد ذریعوں سے انجام دے سکتا ہوں، تخیل بھی ایسا ہی ایک ذریعہ ہے۔ تمھیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ الفاظ میرے ہیں، تمھارے نہیں۔ کیونکہ تم نے کبھی خود اتنے واضح اور صاف صاف لفظوں میں بات نہیں کی۔ اگر تم نے پہلے بھی اتنے واضح لفظوں میں ان سوالات پر بات کی ہوتی تو ہماری آج کی اس گفتگو کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

بندہ:- تُو کس طرح کے لوگوں سے گفتگو کرتا ہے؟ وہ کوئی خاص لوگ ہوتے ہیں؟ پیغمبر؟ ولی؟ صوفی؟ عالم؟ فلسفی؟ موجد؟ فنکار؟ شاعر؟ اور کیا کوئی خاص موقع ہوتا ہے جب تُو ان خاص لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے؟

خدا:- ہر انسان خاص انسان ہے اور ہر لمحہ سنہری لمحہ ہے۔ ایسا کوئی انسان اور ایسا کوئی لمحہ نہیں جو کسی اور انسان اور کسی

Marfat.com

اور لمحے سے افضل ہو۔ اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ خدا صرف چیدہ چیدہ لوگوں سے اور بڑے اچھوتے طریقے سے گفتگو کرتا ہے۔ اصل میں لوگ اس بات میں آسانی محسوس کرتے ہیں کہ وہ میری بات ہی نہ سُنیں۔ کیونکہ اس طرح اُن پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اس بات پر عمل بھی کریں۔ وہ یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ یہ ذمہ داری کسی اور کے سر پر پڑ جائے۔ ''نہ ہم سنیں گے نہ ہم پر عمل کی پابندی لاگو ہوگی''، یہ سوچ کر وہ کان لپیٹے پڑے رہتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی وجہ ہے جس کے باعث لوگ ذاتی سطح پر مجھ سے ہم کلام نہیں ہوتے۔ اگر تم یہ مان لو کہ تم میرے پیغامات براہ راست وصول کر رہے ہو تو یہ تمھاری ذمہ داری بن جاتی ہے کہ تم ان پیغامات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھو اور انھیں صحیح صحیح عملی جامہ پہناؤ۔ ان پیغامات پر تدبّر اور تفکر کرنے اور پھر دل و جان سے عمل کرنے کے برعکس یہ کہیں آسان اور بے خطر ہے کہ تم اپنے سے پہلے کے کچھ ''خاص'' لوگوں کی اندھی تقلید کرنے لگ جاؤ، خواہ ان لوگوں اور ان کے عہد کو گزرے صدیاں بیت چکی ہوں اور زمانہ اور اس کی ضرورتیں کتنے ہی پلٹے کھا چکی ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایسا کرنے والے سب سے زیادہ روتے دھوتے ہیں کہ ہمیں موجودہ برے حالات کیوں درپیش ہیں، ہماری زندگی اور ہماری دنیا میں جمود کیوں آ گیا ہے، ہم اتنے ذلیل وخوار کیوں ہو گئے ہیں۔

بندہ:- کچھ لوگ، مثلاً عیسیٰؑ ابن مریم، تیری بات دوسروں سے بہتر اور زیادہ کیوں سنتے ہیں۔ اور تُو ان کے ساتھ زیادہ گہری گفتگو کیوں کرتا ہے؟

خدا:- اس لیے کہ عیسیٰؑ جیسے لوگ میری بات واقعی سننا چاہتے ہیں۔ پھر وہ اس وقت بھی میری بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جب وہ بات بظاہر خوفناک یا پاگل پن یا سیدھی سیدھی غلط نظر آ رہی ہو۔

بندہ:- تو کیا ہمیں تیری بات پھر بھی سُننی چاہیے جب وہ غلط نظر آتی ہو؟ تو نے تو کہا تھا کہ تیری بات وہ ہوگی جو ہمارا سب سے بلند خیال، سب سے واضح لفظ اور سب سے اعلیٰ احساس ہوگا۔

خدا:- بہترین خیال، واضح ترین الفاظ اور اعلیٰ ترین احساس کے باوجود غلط نظر آنے والی بات بالکل درست ہو سکتی ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھارا خیال، لفظ یا احساس غلطی سے پاک ہے تو پھر تمھیں مجھ سے گفتگو کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہونی چاہیے۔ چھوڑو اس گفتگو کو! جاؤ، جو صحیح سمجھتے ہو کرو۔ لیکن یہ نہ بھولنا کہ تخلیقِ آدم سے آج تک تم اور تمھارے آباؤ اجداد یہی کچھ تو کرتے آئے ہیں۔ اور یہ بھی دیکھ لو کہ اس طرح دنیا کی تم نے کیا حالت کر دی ہے؟ ظاہر ہے کہ تمھاری سوجھ بوجھ محدود ہے۔ کئی باتیں ہیں جو تم نہیں سمجھ پاتے۔ اور جو باتیں تم سمجھ لیتے ہو وہ تمھیں صحیح معلوم ہوتی ہیں کیونکہ تمھارے نزدیک ہر وہ بات صحیح ہوتی ہے جس سے تمھیں اتفاق ہو۔ اور جو بات تمھاری سمجھ سے بالا ہو وہ اوّل اوّل تمھیں غلط ہی نظر آتی ہے۔

بندہ:- اس صورتِ حال سے بچنے کا کوئی طریقہ؟

Marfat.com

خدا:- صرف ایک طریقہ ہے۔ تم یہ تصور کرو کہ اگر ہر وہ بات صحیح ہو جسے تم غلط سمجھتے ہو تو پھر کیا ہوگا؟ ہر بڑا عالم، فلسفی، سائنس دان یہ بات جانتا ہے۔ جب ان کا ایک خیال، مفروضہ، تجربہ کہیں جا کر رُک جاتا ہے تو وہ اسے ترک کر کے اپنا کام کسی نئے انداز سے شروع کر دیتا ہے۔ تمام بڑی بڑی دریافتیں اس ایک خیال یا احساس سے پھوٹتی ہیں کہ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ اور آج تم نے اپنی ہر سوچ اور عمل کو درست قرار دے کر دنیا کی جو حالت بنالی ہے اس کا بھی یہی علاج ہے کہ تم یہ مان لو کہ ہو سکتا ہے تم غلط ہو۔ تم اُن جانے کو اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک تم یہ سمجھتے رہو کہ تم جانتے ہو۔ خدا کو بھی تم اسی صورت میں پا سکتے ہو کہ تم یہ دعویٰ کرنا بند کر دو کہ تمھیں خدا کا پہلے ہی سے علم ہے۔ تم خدا کی بات تبھی سنو گے جب تم مان لو گے کہ تم نے خدا کی بات ابھی تک نہیں سنی۔ جب تک تم اپنی ہانکتے جاؤ گے، میری کیونکر سنو گے؟ تم تو خود میرے بارے میں مجھے بتانے چل دیتے ہو کہ میں کیا ہوں۔

بندہ:- لیکن جو کچھ ہم تیرے بارے میں کہتے ہیں وہ تیری ہی طرف سے تو آیا ہے۔

خدا:- یہ کس نے کہا ہے؟

بندہ:- بڑے بڑے اہم لوگوں نے بتایا ہے کہ تُو کیا چاہتا ہے۔

خدا:- کون ہیں وہ لوگ؟

بندہ:- علمائے کرام، پادری، راہب، عابد و زاہد، ولی، پوپ۔ آسمانی صحیفے.... تورات، زبور، انجیل۔

خدا:- یہ سب تو حتمی ذرائع نہیں ہیں۔ ان میں تو گڑبڑ ہو چکی ہے۔

بندہ:- کیا واقعی؟

خدا:- ہاں

بندہ:- تو پھر کس پر یقین کیا جائے؟

خدا:- اپنے احساسات کی سنو، اپنے بلند ترین خیالات کی سنو۔ جو جسم و جان، دل و دماغ اور روح پر بیتے اس کی سنو۔ اور جو کچھ تم ان سے سنو وہ اگر اُن الفاظ سے مختلف ہو جو تمھارے استادوں نے تمھیں سکھائے تھے یا تم نے کتابوں میں پڑھے تھے تو اُن الفاظ کو بھول جاؤ۔ الفاظ تو صداقت تک پہنچنے کا سب سے زیادہ ناقابلِ یقین ذریعہ ہیں۔

نیل ڈانلڈ والش کا مذہبی پس منظر اگرچہ مسیحیت ہے لیکن جو سوالات اس نے خدا سے کیے ہیں وہ تلاشِ حق میں نکلے ہوئے اکثر انسانوں کو درپیش آتے ہیں۔ اس طرح جس خدا نے اس کے ساتھ راز و نیاز کیا ہے وہ اگرچہ اس کا ذاتی خدا ہے لیکن جو کچھ اس نے فرمایا ہے وہ روحانی مسافروں کے بہت سے مغالطے دور کر سکتا ہے۔ بہرحال اس گفتگو سے یہ

Marfat.com

اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ انسان اپنی روح کے تاروں پر ''اپنے ذاتی خدا'' سے ہم کلام ہو سکتا اور اپنی زندگی اور دنیا کو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔

مناسب ہی نہیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا پس منظر رکھنے والے نیل ڈونلڈ والش کے علاوہ یہاں اسلام کا پس منظر رکھنے والے کسی روحانی مسافر کی ''اپنے خدا'' سے گفتگو کی ایک جھلک بھی پیش کر دی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اِن صاحب سے واقف ہی ہوں لیکن اُن کی خواہش ہے کہ اُن کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ ہم انھیں ''مسلمان'' کا نام دے لیتے ہیں۔

مسلمان:- رب العزت! میں حاضر ہوں۔

خدا:- تم حاضر ہو یا ہم موجود ہیں؟ تم جب بھی حاضر ہوتے ہو ہم پہلے سے انتظار میں موجود ہوتے ہیں۔

مسلمان:- اسی لیے تو آپ میرے معبود ہیں۔ اسی لیے تو میرے دل میں آپ کی ہیبت اور عزت ہے۔ اسی لیے تو میرے دل میں آپ کے لیے محبت ہے اور یہ محبت ہی تو ہے جو مجھے آپ کی حضوری کا حوصلہ دیتی ہے۔

خدا:- محبت ہی ہمیں بھی تم سے وابستہ رکھتی ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ اپنے دل کے سارے زور کے ساتھ محبت کر سکتے ہو تو ہم بھی اپنے دل کے سارے زور کے ساتھ تم سے محبت کرتے ہیں۔ تمھاری محبت اور ہماری محبت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا تمھارے زور اور ہمارے زور میں ہے۔ یہ ہماری بے کراں محبت ہی ہے کہ ہم اپنے ساتھ بدعہدی کرنے والے انسان سے بھی گفتگو کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔

محبت روح کی زبان ہے۔ ہماری تمھاری روح کی شاہراہِ عظیم پر ہماری تمھاری محبت سفر کرتی رہتی ہے اور ایمان، خیر، صداقت اور امن کے پھول کھلاتی رہتی ہے، امکانات کی نت نئی دنیا آباد کرتی رہتی ہے۔ ہاں بتاؤ کیسے آئے ہو؟

مسلمان:- میں ہمیشہ ایک فقیر، ایک محتاج کے طور پر آپ کی عطا کے لیے حاضر ہوتا رہا ہوں۔ آج میں صرف اور صرف آپ کے لیے حاضر ہُوا ہوں۔ میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں کہوں ''اِنَّ صَلَاتِي وَ نُسُكِي وَ مَحيَایَ وَ مَماتِي لِلّٰه ربِّ العالمين'' اور آپ سنیں۔

خدا:- سن تو ہم تمھارے کہنے سے بھی پہلے لیتے ہیں۔ تم نے ہمارے مُنہ سے نکلا ہُوا یہ جملہ اپنی زبان سے آج تک ہزاروں مرتبہ دہرایا ہے اور ہم نے ہر بار سنا ہے۔ لیکن آج تم اسے دِل سے ادا کر رہے ہو تو ہم صرف سُن ہی نہیں رہے، قبول بھی کر رہے ہیں۔

مسلمان:- میں شکر گزار ہوں۔

خدا:- شکریہ شکایت سے بہتر ہے۔ اس سے تمھیں بھی راحت ملتی ہے، ہمیں بھی راحت ملتی ہے۔ اِدھر تم احسان کے بوجھ سے نکل جاتے ہو، اُڑتے ہوئے پھول کی طرح ہلکے ہو جاتے ہو۔ اُدھر ہماری عطا جڑ پکڑ لیتی ہے اور

Marfat.com

تمھارے وجود کی سرزمین میں ایک ہرے بھرے پودے کی طرح پھوٹ نکلتی ہے۔ پھر جوں جوں تمھارا سارا وجود شکریے میں ڈھلتا جاتا ہے یہ پودا ایک شجرِ طیّب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس پاک درخت کی جڑیں تو زمین کے دل میں اتر جاتی ہیں اور شاخیں میرے عرش کے کنگروں کو چھونے لگتی ہیں۔ اس درخت پر جتنے بے شمار پھول آئیں اتنی ہی تتلیاں منڈلاتی رہتی ہیں، اتنے ہی پرندے چہچہارہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک اکیلا درخت جنت کا پورا باغ بن جاتا ہے۔

مسلمان:- ربّ العزت! میں تو آپ کا عاجز بندہ ہوں، اپنے دل میں اپنی اوقات جانتا ہوں۔ آپ کی اتنی بڑی دنیا میں بے شک آپ کے لاکھوں چاہنے والے ہوں گے، عاشقانِ الٰہی! کیا یہ ممکن نہیں کہ ان سب کی شکر گزاری کے صدقے میں پیدا ہونے والے لاکھوں پاک درختوں سے ہماری اس دنیا میں بھی کچھ رونق ہو جائے۔ ان پاک درختوں کی شاخیں تو ظاہر ہے کہ تیرے عرشِ عظیم تک پہنچیں گی لیکن کیا خوب ہو کہ ان کا سایہ ہم بدنصیبوں کی دُنیا پر بھی پڑ جائے جو بے ایمانی، نفرت، جھوٹ، بدامنی، ناانصافی، دکھ، ظلم اور خود غرضی سے اٹی ہوئی ہے؟

خدا:- تو اب تم شکریے سے شکایت کی طرف چل دیے ہو؟ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے تمھاری دنیا سے آنکھیں پھیر لی ہیں؟

مسلمان:- رب العزت! آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں۔ میری یہ مجال کہ میں آپ پر الزام دھروں۔ بے شک جو دنیا ہمیں نصیب ہوئی ہے اسے بنایا تو آپ ہی نے تھا اور بگاڑا ہمی نے ہے۔ لیکن آپ کے لیے کیا مشکل ہے کہ آپ اسے ایک مرتبہ اور سنوار دیں، راستے پر ڈال دیں، اس میں ایمان، محبت، اچھائی، سچائی، امن، انصاف، راحت، رحمت اور ایثار کی نہریں بہا دیں۔ میں شکایت نہیں کر رہا۔ میں آپ کے عام بندوں میں سے ایک عامی ہوتے ہوئے آپ سے درخواست کر رہا ہوں، التجا کر رہا ہوں، فریاد کر رہا ہوں، اِیّاکَ نعبدُ و اِیّاکَ نستَعِین کہہ رہا ہوں۔ ہم راہِ راست سے اتنی دور نکل گئے ہیں کہ واپسی کا امکان بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جب تک آپ اپنا ہاتھ ڈال کر ہمارا رُخ درست نہیں کر دیتے، ہم اندھا دھند تباہی کی جانب بڑھتے چلے جائیں گے۔

خدا:- ہماری اتنی بڑی کائنات میں اتنی بہت سی دنیائیں ہیں جو وقت کے دھارے میں آباد اور برباد ہوتی رہتی ہیں۔ ایک تمھاری دنیا برباد ہو جائے گی تو کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ لیکن ہمیں اس کا بہت دکھ ہوگا۔ اس دنیا کو شاد و آباد کرنے کے لیے ہمارے اتنے بہت سے پیاروں کا جگر خون ہُوا ہے۔ نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ، کس کس کو گنیں۔ تم نے ان سب کی جان توڑ محنت کی کمائی غارت کر دی۔ مذہب تو تمھیں باہم جوڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا، تم نے اسے توڑنے پھوڑنے پر لگا دیا۔ ہمارے نام پر ہمارے بندوں کو ہماری عبادت گاہوں میں قتل کیا اور پھر ہم سے داد لینے چل دیے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ تم ہم سے کہہ رہے ہو کہ

Marfat.com

اپنا ہاتھ ڈال کر تمھارا رُخ بدل دیں۔ بھلے میاں، تم نے خود تو اپنے ہاتھ جیب میں ڈال رکھے ہیں اور ہمارے ہاتھ کا انتظار کر رہے ہو۔ ذرا جیب میں پڑے پڑے سوئے ہوئے یہ ہاتھ باہر نکالو، پہلے اپنا رُخ بدلو، اپنے گھر کی خبر لو، اپنے عزیزوں کو دعوت دو کہ وہ بھی بدلیں۔ دوست احباب سے کہو، وہ بھی بدلیں۔ اور ایک مرتبہ نہیں، بار بار کہتے جاؤ، کہتے ہی چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ.........................

مسلمان:۔ ربّ العزت! میرے کہنے سے کیا ہوگا؟ مجھے تو لوگ خبطی کہیں گے۔ مجھ سے بہتر جاننے والے موجود ہیں۔ لوگ ان کی نہیں سنتے، میری کون سنے گا؟ پھر میرے سر پر تو مذہبی علوم کی دستار بھی نہیں بندھی، میں تو فقیرِ بےنوا ہوں۔

خدا:۔ نہ تم فقیر ہو اور نہ بےنوا، بس بہانے باز ہو۔ ہم نے تمھیں وہ سب کچھ دے کر بھیجا تھا جو ہم نے اپنے معزز ترین لوگوں کو دیا تھا لیکن تم نے اس کی قدر ہی نہیں کی۔ ہم ہر انسان کو بہترین زادِ راہ دے کر بھیجتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اِمکان کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس اِمکان کو حقیقت کی شکل دینا ہر انسان کی اپنی ترجیح و توجہ اور محنت و استقلال پر منحصر ہے۔ بھلے میاں، ہم نے تو مٹی کے معمولی سے معمولی ذرے کے اندر پورے پورے سورج کی روشنی اور طوفانوں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طاقت رکھ دی ہے۔ تم تو انسان ہو، جس میں ہم نے اپنی روح پھونک رکھی ہے اور جسے ہر شے کی حقیقت کا علم دے کر اس کے سامنے اپنے فرشتوں کو سجدہ ریز کر رکھا ہے۔ تمھیں اندازہ بھی ہے کہ تمھارے اندر کتنی روشنی اور کتنی طاقت موجود ہے؟

مسلمان:۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ لوگوں نے تو آپ کے برگزیدہ پیغمبروں کی نفی کی، انھیں آگ میں جلایا، جلاوطن کیا، تختۂ دار پر لٹکایا، اتنے پتھر مارے کہ سر سے بہنے والے مقدس خون سے ان کی جُوتیاں لبالب بھر گئیں۔ انھیں تو آپ کی تائید بھی حاصل تھی۔ آپ کے فرشتے نہ صرف ان پر وحی لاتے تھے بلکہ ان کے سپاہیوں کے طور پر، ان کے ہمراہیوں کے طور پر جنگوں میں شامل ہوتے تھے۔ قدم قدم پر ان کی رہنمائی ہوتی تھی۔ آپ کے جس قرآن کو ہم نے سینوں سے لگا رکھا ہے اس کی ایک ایک آیت کی شانِ نزول موجود ہے۔ میرے جیسے لوگ تو اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتے، اپنی بری عادات اور ورثے میں پائے ہوئے تعصبات اور غلط عقائد ہی سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ ہم بےچارے کیا کر سکتے ہیں؟

خدا:۔ کان کھول کر سن لو، جو کچھ کرنا ہے بالآخر تمھی کو کرنا ہے، تم جیسے عام انسانوں ہی کو کرنا ہے۔ اور یہ عام اور خاص کی تخصیص تم نے کہاں سے گھڑ لی ہے؟ ہم نے ہر انسان کو لائقِ تعظیم و تکریم بنایا ہے۔ ہماری نظر میں تم سب خاص ہو کیونکہ ہم نے تم میں سے ایک ایک کو خاص بلکہ خاص الخاص حالت میں، احسن تقویم کے مطابق پیدا کیا ہے۔ ہم نے تو تمھیں عزت دی ہے لیکن تم اپنی عزت نہیں کرتے، غرور و تکبر کرتے ہو، اپنی عزت کرتے تو ان ذلیل کاموں میں نہ پڑتے جن میں پڑے پڑے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے۔

مسلمان:۔ (روتے ہوئے) تو آپ ہماری مدد کیوں نہیں کرتے کہ ہم اس ذلت سے نکل جائیں؟

Marfat.com

خدا:- ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں۔ صاحب اختیار انسان کو پہلا قدم خود ہی اٹھانا ہوگا۔ دنیا میں بدی اور برائی پھیلانے میں صرف بدوں اور بُروں کا ہاتھ نہیں۔ وہ تمام نیک اور اچھے انسان جو نیکی اور اچھائی کا دفاع نہیں کرتے، نیکی اور اچھائی کے لیے قربانی دینے پر تیار نہیں، وہ بھی دنیا کی بدی اور برائی میں پوری طرح شامل ہیں۔ تم پہلا قدم اٹھاؤ، جیبوں سے ہاتھ نکالو، نیکی اور اچھائی کی چلتی پھرتی مثال بنو، ایسی مثال نہیں کہ جسے دیکھتے ہی پتا چل جائے کہ تم بادلِ ناخواستہ نیکی اور اچھائی کر رہے ہو اور اندر ہی اندر اس پر خوش نہیں۔ اور ایسی مثال بھی نہیں کہ اپنی نیکی اور اچھائی پر تمھیں اتنا غرور ہونے لگے کہ آپے ہی سے باہر ہو جاؤ۔ نیکی اور اچھائی کی مسکراتی ہوئی مثال بن کر ان کے دفاع اور فروغ کے لیے قدم بڑھاؤ۔ ایک وقت میں ایک قدم بھی بڑھاؤ تو پھر دیکھو کہ ہم تمھاری مدد کرتے ہیں یا نہیں۔

مسلمان:- آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ بہت سے باہمت نیک لوگوں نے ایک نہیں کئی قدم بڑھائے لیکن بات نہ بنی اور وہ تاریک راہوں میں مارے گئے۔ گو مجھے نیکی اور اچھائی کا کوئی دعویٰ نہیں لیکن بساط بھر میں نے بھی بہت پاپڑ بیلے، لیکن سراسر ناکام رہا بلکہ حالات پہلے سے بھی خراب ہو گئے۔

خدا:- دراصل تم حساب میں کمزور ہو (ہنستے ہوئے) جب سے کیلکولیٹر اور کمپیوٹر ایجاد ہوئے ہیں تمھیں تو پہاڑے بھی بھول گئے ہیں۔ اور تو اور اب جمع تفریق جیسے آسان سوال بھی تم سے از خود حل نہیں ہوتے۔ پتا ہے تم کرتے کیا ہو؟ تم نیکی کی جانب چار قدم چلتے ہو، آگے رکاوٹ آ جاتی ہے اور تم چار قدم واپس آ جاتے ہو۔ مگر گنتی یہ کرتے ہو کہ تم آٹھ قدم چلے تھے اور ناکام رہے تھے۔ تم بار بار یہی کرتے ہو۔ نیکی کی جانب چلتے ہو اور رکاوٹ آنے پر واپس آ جاتے ہو۔ تم میں صبر نہیں، استقلال نہیں۔ جمع کرنے کے شوق میں تفریق کرنا بھول جاتے ہو۔ ''چار قدم سیدھے، چار قدم الٹے، یہ ہوئے آٹھ قدم''۔ اپنی ناکامی پر اپنا خون جلاتے ہو اور دل ہی دل میں ہمیں کوستے ہو کہ ہم نے تمھاری مدد نہ کی۔ بھئی، جب تم چار قدم چل کر چار قدم واپس آ گئے تو تم نے تو صفر قدم اٹھایا۔ اب بتاؤ ہم تمھاری کیا مدد کرتے؟ تمھیں رکاوٹ آنے پر وہیں رُک کر انتظار کرنا چاہیے، واپس نہیں آنا چاہیے۔ رکاوٹ کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ رکاوٹ تمھاری محنت کو جڑ لگاتی ہے، استحکام بخشتی ہے۔ پھر جب تمھارے استقلال کے باعث یا زمانے کی گردش کی بناء پر رکاوٹ دور ہو جائے تو تمھیں وہیں سے چار قدم اور آگے بڑھنا چاہیے۔ کوشش اور استقلال کا یہ نسخہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔

مسلمان:- تو آپ ہمیں استقلال کیوں نہیں سکھلا دیتے؟

خدا:- ہم نے تو استقلال تمھاری گھٹی میں ڈال رکھا ہے۔ البتہ تم نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ تمھاری زندگی میں اہم کیا اور غیر اہم کیا ہے۔ روٹی تو تم روز کھاتے ہو، نیکی روز کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ تم روٹی کو افضل اور نیکی کو کمتر سمجھتے ہو۔ ہمیں پتا ہے کہ تم یہ ماننے سے جھجک رہے ہو۔ تم مُنہ سے یہی کہو گے، ہم تو ''نیکی کو ترجیح دیتے

Marfat.com

ہیں''۔لیکن کروگے یہی کہ''نیکی جائے بھاڑ میں، روٹی ضروری ہے خواہ چوری سے ملے یا رشوت سے''!

دیکھو، تم کتنے صبر و استقلال سے، رُکے بغیر متواتر سانس لیتے جارہے ہو۔ کچھ بھی ہو جائے، تم بُرے سے بُرے حالات میں بھی سانس لینا نہیں بھولتے۔ ایک ایک منٹ میں کئی کئی سانس لیتے جاتے ہو۔ چند منٹ سانس نہ لو تو تمھاری جان پر بن جاتی ہے۔ لیکن تمھاری زندگی میں پانچ منٹ چھوڑ، پانچ پانچ سال ایسے آ جاتے ہیں جب تم نیکی کے لیے سرگرم ہونا تو درکنار اس کی بابت سوچتے بھی نہیں۔ جس طرح جہنم کا راستہ اُن نیک ارادوں سے پٹا ہوتا ہے جو ڈھل مل یقینی کی نذر ہو جائیں، اسی طرح دنیا کی بدی اور برائی نیک اور اچھے لوگوں کی بےعملی سے پٹی پڑی ہے۔

مسلمان:۔ ربّ العزت! نجات کا کوئی راستہ، امید کی کوئی کرن؟

خدا:۔ آسان سی بات ہے، اپنی ترجیحات بدل لو۔ اگر نفرت نہیں چاہتے تو محبت کرنی شروع کردو، نفرت اگر ختم نہیں ہوگی تو کم ضرور ہو جائے گی۔ چلو تمھیں ایک بھولا ہُوا گر یاد دلاتے ہیں۔ کاغذ پنسل نکالو اور ایک لکیر کھینچو۔ گویا یہ نفرت کی لکیر ہے۔ اب اس لکیر کے ساتھ اس سے دگنی، تگنی، چوگنی لمبی لکیر کھینچو۔ گویا یہ محبت کی لکیر ہے۔ نفرت کی لکیر چھوٹی ہوگئی یا نہیں؟ تم نے نفرت کی لکیر کو ربر گھس کر تو چھوٹا نہیں کیا لیکن اب وہ چھوٹی ہوگئی ہے۔ ایک اور کام کرو۔ نفرت کی لکیر کے گرداگرد ایک بڑا دائرہ کھینچ دو جو اس لکیر کو چھوئے نہیں۔ گویا یہ محبت کا دائرہ ہے۔ اس دائرے کے اندر نفرت موجود تو ہے لیکن ''ماتحت اور زیرِ سایہ'' حیثیت میں۔ یہی کچھ بےایمانی، نفرت، بدی، جھوٹ، بدامنی، ناانصافی، دکھ، ظلم، اور خود غرضی کے سلسلے میں کرو۔ ان کی لکیروں کو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے دائروں میں یوں سمیٹ لو جیسے روشنی اندھیرے کو سمیٹ لیتی ہے۔ کبھی نہ بھولو کہ رات کتنی بھی اندھیری ہو، ایک جگنو، ایک موم بتی، ایک چراغ، ایک یدِ بیضا اس کے اندھیرے کو نگل جاتا ہے۔ اور دن کی روشنی میں تو اندھیرے کو کہیں پناہ ہی نہیں ملتی۔

Marfat.com

سترھواں باب

اسلام کی پانچ روحانی قدریں

اسلام کی پانچ روحانی قدروں کی وضاحت سے پہلے بہتر ہے کہ ہم اسلام اور انسانیت کے باہمی رشتے کی وضاحت کرلیں۔

اسلام اور انسانیت

قرآنِ حکیم کے مطابق انسان کی انسانیت کا انحصار دو باتوں پر ہے، (1) علم اور (2) روح۔ تخلیقِ آدم کے موقع پر خدا نے انسان کو ایک تو چیزوں کی ماہیت کا علم The Knowledge of the Nature of Things (علم الاسماء) سکھایا اور دوسرے انسان کو بنا سنوار کر اس میں اپنی روح پھونک دی۔ یہ دو خوبیاں یا صلاحیتیں خدا نے کسی امتیاز کے بغیر ہر انسان کے اندر امکانات کی صورت میں رکھ دی ہیں۔ ہر انسان اپنی توجہ، محنت اور استقلال سے انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک لباسِ حقیقت پہنا سکتا ہے۔

ایک ٹھوس مادی دنیا میں رہتے ہوئے انسان فطرت کے رازوں کو آشکار کر کے اسے اسی طرح اپنے سامنے سجدہ ریز کرسکتا ہے جیسے قصۂ آدم میں علم الاسماء جاننے والے آدم کے سامنے فرشتے سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ اپنے اندر خدا کی پھونکی ہوئی روح کو بیدار کر کے انسان فطرت کے ان تمام خزانوں کو جو وہ اس کے علم کی بدولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی ہے، خدا ہی کے رنگ میں خدا کی تمام تر مخلوق کی پرورش، نشو ونما اور عروج کے لیے وقف کرسکتا ہے۔ جب انسان اپنے علم اور اپنی روح کو یوں ہم آہنگ کر لیتا ہے تو اس کی انسانیت کی تکمیل ہو جاتی ہے اور وہ اسلام کے صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے مطابق انسانیت وہ بنیاد ہے جس کے اوپر اسلام کے پانچ ستون...... نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ...... کھڑے ہیں۔ ان پانچ ستونوں کے اوپر اسلام زندگی کی ایک متوازن عمارت تعمیر کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق بسر ہونے والی زندگی میں یہ پانچ بڑے بڑے اصول کارفرما ہوتے ہیں جنھیں ہم اسلام کی پانچ روحانی قدریں کہہ سکتے ہیں:

(1) ایمان، (2) محبت، (3) خیر، (4) صداقت، (5) امن

قرآنِ حکیم کے مطابق خدا کے تمام پیغمبر ایک ہی دین لے کر آئے تھے اور اس دین کا نام اسلام تھا۔ خدا نے سختی سے حکم دیا ہے کہ اس کے پیغمبروں میں فرق نہ کیا جائے (2:136)۔ یہ پانچ اصول خدائے واحد کے دینِ واحد کی جان ہیں اور خدا کے ہر پیغمبر کے پیغام کے بنیادی ارکان ہیں۔ البتہ زمان و مکاں کے فرق کے پیشِ نظر ہر پیغمبر کی شریعت یا

نظامِ قانون (Legal System) الگ الگ تھا اور ہے، جس کی بناء پر اس کا الگ تشخص کیا جا سکتا ہے۔ اس الگ تشخص کو مذہب کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا تمام پیغمبروں کا دین تو ایک ہی تھا مگر مذہب الگ الگ تھا۔ چونکہ اسلام سب پیغمبروں اور ان کی مقدس کتابوں کو من جانب اللہ تسلیم کرتا ہے اس لیے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ تکثیر (Pluralism) اسلام کا لازمی جز ہے۔ اور جس طرح خدائے واحد تہذیبوں، ثقافتوں، اور نسلوں کے فرق کے باوجود سب کا خدا ہے اسی طرح اسلام کے دامن میں بھی ان سب کے لیے جگہ ہے۔

شرط صرف یہ ہے کہ اسلام کے دائرے میں آنے والے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ کو دین کا چہرہ سمجھیں اور لباس، حلیے، طرزِ رہائش، زبان اور علاقائی رسم و رواج کے ظاہری فرق کے باوجود ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی روحانی قدروں کو دین کی روح کے طور پر دل و جان سے اپنا لیں۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ ''مسلمان'' وہی شخص ہو سکتا ہے جو ''انسان'' بھی ہو۔ کوئی شخص ایک اچھا انسان بنے بغیر ایک اچھا مسلمان نہیں بن سکتا۔ مسلمان کی زندگی کی عمارت کی پہلی منزل انسانیت ہے جس کے اوپر اسلام کی دوسری منزل تعمیر ہوتی ہے۔ دوسری منزل کا وجود اور استحکام پہلی منزل کے وجود اور استحکام پر منحصر ہے۔ اگر پہلی منزل موجود ہی نہ ہو تو دوسری منزل کا وجود ناممکن ہے۔ پہلی منزل کمزور ہو تو دوسری منزل ایک نہ ایک دن دھڑام سے گر جاتی ہے خواہ اس کی تعمیر میں کتنے ہی نیک جذبات، محنت اور سرمایہ خرچ آیا ہو۔

ایمان

ایمان ایک وسیع، پر معنی اور پہلودار اصطلاح (Term) ہے۔ اس کا سب سے اہم پہلو ایک ایسے خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ہے جو واحد ہے اور انسان، زمین و آسمان، اور تمام مخفی و ظاہر مخلوقات اور حقیقتوں کا خالق و مالک اور پروردگار ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں وہ سب کچھ جانتا ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے، ہر جگہ موجود ہے، جزا اور سزا دے سکتا ہے، لیکن اول و آخر رحمان و رحیم ہے۔ خدا پر ایمان اسی صورت میں مکمل ہو سکتا ہے کہ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے پیغمبروں اور موت کے بعد زندگی (آخرت) پر بھی ایمان لایا جائے۔

قرآن حکیم خدا کے حاضر و ناظر ہونے کے بعد جس ایک بات پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے وہ آخرت ہے۔ آخرت کے بہت سے مفہوموں میں سب سے اہم مفہوم یہ ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے والا انسان (مسلمان) جو کچھ بھی کرے محض اپنے فوری فائدے کے لیے نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسے اعلیٰ مقاصد کے لیے کرے جن کے نتائج بے شک آنے والے وقت میں نکلیں، خواہ آنے والا یہ وقت موت کے بعد کی زندگی تک پھیلا ہوا ہو۔

خدائے واحد پر ایمان اور تمام دوسرے (جھوٹے) خداؤں کے انکار کا سب سے بڑا اجر آزادی ہے۔ لا الٰہ الا اللہ ایمان کا بہترین اظہار ہے اور آزادی اس کا بہترین انعام۔ ایک سچے خدا کو مان کر انسان تمام خود ساختہ جھوٹے اور ''انسان دشمن'' خداؤں سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ جو شخص زبان ہی سے نہیں، اپنے دل، اپنے علم، اور اپنی روح کی

Marfat.com

ساری قوت سے یہ کلمہ ادا کرتا ہے وہ خود تو خدا کے سامنے جھکا ہوتا ہے لیکن خدا کی ساری خدائی، یہ ساری کائنات، یہ فطرت، اور اس فطرت میں کارفرما فطری اصول (فرشتے) اس کے آگے سر بسجدہ ہو جاتے ہیں۔ سچے خدا کے آگے وہ ایک سجدہ جسے آج کا خدا ناشناس انسان گراں سمجھتا ہے اسے اُن ہزاروں سجدوں سے نجات دلا سکتا ہے جو وہ دورِ حاضر کی خدا ناشناس دنیا میں قدم قدم پر کرنے کے لیے مجبور ہے۔

ایمان کا ثبوت؟

ایمان کا سب سے حتمی ثبوت ہے، محبت۔ محبت ہی وہ عمل ہے جو بیک وقت خدا کے وجود اور انسان کے ایمان کی شہادت دیتا ہے۔ محبت قانونِ فطرت نہیں، دینِ فطرت ہے۔ بلکہ دین کا وجود بھی محبت ہی کا نتیجہ ہے۔ محبت ہی خدا اور انسان کے درمیان وہ پُر اعتماد تعلق پیدا کرتی ہے جو ماں باپ اور اولاد کے درمیان ہوتا ہے۔ اس تعلق کے بغیر ایمان کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ جس خدا نے قرآن سکھایا اور انسان کو تخلیق کیا وہ محبت کرنے والا رحمان ہے، الرحمٰن. علّم القران. خلق الانسان (55:1-3)۔ یہ خدائے رحمان کی محبت ہی کا تقاضیٰ تھا کہ اس نے انسان کو تخلیق کر کے گمراہی کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے کے لیے نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی رہنمائی اور عروج و ارتقاء کے لیے واضح ہدایات دے کر برگزیدہ پیغمبر بھیجے۔

محبت

محبت دین کی روح اور روح کی زبان ہے۔ محبت دستور ہے، شریعت قانون ہے۔ قانون اگر دستور کے مطابق ہو تو لائقِ عمل ہوتا ہے، اگر دستور کے مطابق نہ ہو تو اسے کالا قانون کہہ کر رد کر دینا واجب ہے۔ وہ قوانین جو اسلام سمیت مختلف مذاہب میں دستورِ محبت کی روح سے بعید ہیں وہ گویا حد سے گزر جانے کے باعث ظلم بن چکے ہیں۔ یہ قوانین خدا کی انسان کے ساتھ محبت کی نفی کرتے ہیں۔ ہر انسان کو عموماً اور ہر مسلمان کو خصوصاً ان خلافِ محبت قوانین کی نہ صرف مخالفت بلکہ ان کے تدارک کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔

محبت کا آغاز خدا کی انسان کے ساتھ محبت سے ہوتا ہے۔ اس کی نشو و نما کے البتہ تین بڑے دھارے ہیں:

(1) انسان کی خدا سے محبت (2) انسان کی انسان سے محبت (3) انسان کی تمام مخلوقِ خدا، خاص طور پر ارضی مخلوق سے محبت۔ دراصل انسان کی خدا سے محبت کا عملی اظہار دوسرے انسانوں اور ارضی مخلوق کے ساتھ محبت ہی سے ہوتا ہے۔ اُس شخص سے بڑھ کر کوئی منافق نہیں جو خدا سے محبت کا دعویٰ تو کرے مگر خدا کے بندوں اور تمام تر زمینی مخلوق سے محبت نہ کرے۔ یہاں ذرا سی تفصیل ضروری ہے۔

خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا۔ خلیفہ تو اس کا ہوتا ہے جو خود فوت ہو جائے اور کوئی اس کی جگہ لے لے۔ جب رسولِ خدا وفات پا گئے اور ابو بکرؓ آپ کی جگہ سربراہ مملکت منتخب ہوئے تو انھیں خلیفۂ رسول کہا گیا۔ ابو بکرؓ کی وفات

Marfat.com

پر عمرؓ سربراہِ مملکت بنے تو شروع میں انھیں خلیفۂ خلیفۂ رسولؐ (رسولؐ کے خلیفے کا خلیفہ) کہہ کر پکارا گیا۔ عمرؓ نے آسانی کی خاطر اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے "امیرالمومنین" کا لقب اختیار کر لیا۔

خدانخواستہ خدا تو فوت نہیں ہُوا، یا اس نے اپنی خدائی تو کسی کو نہیں سونپ دی۔ خدا سب کچھ کر سکتا ہے لیکن خدا ہونا نہیں چھوڑ سکتا۔ اور نہ ہی اپنی خدائی سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ خدا ہے تو سب کچھ ہے۔ خدا نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ غالب نے اس صورت حال کو یوں بیان کیا تھا:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جب خدا نے فرشتوں سے یہ کہا تھا کہ "انی جاعل فی الارض خلیفه" تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں زمین کے تمام معاملات کا مختارِ کل انسان کو بنا رہا ہوں، اب وہ سیاہ کرے یا سفید، میں اس کے حق میں تمام اختیارات سے دست بردار ہو رہا ہوں۔ اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ انسان تمام زمینی مخلوقات کی ارتقائی منزل ہے اور میں اسے چیزوں کی ماہیت کا علم دے کر اس میں اپنی روح پھونک رہا ہوں تا کہ وہ زمین پر ایک ذمہ دار منتظم کے طور پر زندگی گزارے۔ دوسرے لفظوں میں زمین کا خالق و مالک آج بھی خدا ہی ہے اور زمین پر آج بھی اسی کا حکم چلتا ہے البتہ خدا نے انسان کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی تھی کہ وہ صرف اپنی ہی نہیں، تمام ارضی مخلوقات کی بھی نگہداشت کرے جن میں ہوا، فضاء، پانی، جنگلات اور ان میں بسنے والی ہر طرح کی مخلوق شامل تھی اور ہے۔

آج انسان جہاں انسان کا دشمن بنا ہُوا ہے وہاں اس نے گذشتہ کچھ صدیوں سے نام نہاد ترقی کے نام پر زمین کے قدرتی وسائل کو اس بے دریغ انداز سے خرچ اور ضائع کیا ہے کہ زمین پر زندگی کے آثار مٹنے کا خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ اوپر سے اس نے ایسے ہلاکت خیز ہتھیار بنا لیے ہیں کہ ذرا سی بے احتیاطی سے نہ صرف انسان بلکہ یہ زمین بھی صفحۂ ہستی سے مٹ سکتی ہے۔ ان حالات میں نہایت ضروری ہے کہ خدا پر ایمان اور اس کی محبت کا دعویٰ کرنے والے تمام لوگ چند لمحوں کے لیے موجودہ دنیا کی بندر بانٹ اور چوہا دوڑ (Rat Race) سے الگ ہو کر سوچیں کہ کیا وہ خدا پر ایمان اور اس کی محبت کے تقاضے پورا کر رہے ہیں۔

یہ تقاضے کیا ہیں؟

سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ زمین، اس کے زندگی افروز ماحول، اور اس پر آباد خلقِ خدا کی حفاظت اور پرورش کی جائے۔

دوسرا اہم تقاضا یہ ہے کہ خلقِ خدا کی حفاظت اور پرورش، خوف کے ذریعے سے نہیں، آزادی کی فضا میں کی جائے۔

تیسرا اہم تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان عدل اور احسان سے کام لیا جائے۔

Marfat.com

(1) جس طرح انسان بنے بغیر مسلمان بننا ممکن نہیں اسی طرح زمین اور اس کے ماحول کی حفاظت کے بغیر انسان اور دوسری مخلوقات کی زندگی ناممکن ہے۔ مغرب نے صنعتی ترقی کے نام پر اور مشرق نے آبادی میں بے تحاشا اضافے اور ناداری کے باعث زمین کے وسائل کو بے دردی کے ساتھ یا تو خرچ کر دیا ہے یا برباد کر دیا ہے۔ طرح طرح کے زہریلے کیمیکلز (Chemicals) کے بے تحاشا استعمال اور تجرباتی ایٹمی دھماکوں سے جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں کو آلودہ کر دیا گیا ہے۔ زرعی زمینیں بار بار کے استعمال سے بنجر اور کلر ہو گئی ہیں۔ جنگلات یا تو نئی بستیاں بنانے کے لیے یا ایندھن کا کوئی اور متبادل نہ ہونے کی وجہ سے آگ جلانے کی خاطر کاٹ دیے گئے ہیں۔ یورپ، جاپان اور امریکہ کی صنعتی ترقی اور اقتصادی خوشحالی نے کارخانوں، گاڑیوں، اور ایرکنڈیشننگ کے لیے تیل کی جو کھپت بڑھائی تھی، اب اس میں چین اور بھارت جیسے وسیع آبادی کے ترقی پذیر ملکوں کی ضروریات بھی شامل ہو گئی ہیں۔

کلورو فلورو کاربن (Chlorofluorocarbon) میں اندھا دھند اضافے نے زمین کو گرم کرنا اور فضا میں آزون (Ozone) گیس کے حفاظتی حصار کو توڑنا شروع کر دیا ہے جس سے سورج کی انفراریڈ (Infra Red) شعاعیں زیادہ مقدار میں زمین تک پہنچنے لگی ہیں۔ گلیشیر پگھلنے لگے ہیں۔ موسم بدلنے لگے ہیں۔ جہاں زیادہ بارشیں ہوتی تھیں وہاں اور زیادہ بارشیں ہو رہی ہیں۔ جہاں خشک سالی تھی اس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ آئندہ کچھ صدیوں میں کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے اور بعض ملکوں کے بڑے بڑے حصے پانی میں ڈوب جائیں گے۔

انسان اپنی فوری اغراض پوری کرتے کرتے خودکشی پر اتر آیا ہے۔ وہ جس زمین سے رزق حاصل کرتا ہے اسی کو تباہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ جس شاخ پر اس کا بسیرا ہے اسی کو کاٹ رہا ہے۔ ہمیں خدا سے محبت کا دعویٰ ہے مگر ہم رُک کر یہ نہیں سوچ رہے کہ ہم خدا کی زمین اور خلقِ خدا کے ساتھ کیا ظلم کر رہے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ہم کسی کی اولاد کو قتل کر کے یہ سمجھیں کہ ہم نے اس کی محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔ حقیقتاً یہ ظلم خدا سے بدعہدی اور انسان کی اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے۔

جہاں تک زمین، اس کے ماحول اور اس پر آباد مخلوقِ خدا کی حفاظت اور پرورش کا تعلق ہے انسان نے اس کا دعویٰ زیادہ کیا ہے، کامیابی کم حاصل کی ہے۔ ریاست (State) کا ادارہ دراصل اسی کام کے لیے وجود میں آیا تھا۔ تاریخِ انسانی میں طرح طرح کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی تجربات ہوئے۔ مذہبی، شخصی، موروثی بادشاہتوں میں جبر سے بہت کام لیا گیا اور عوام الناس کی کم ہی پروا کی گئی۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ ریاستوں میں بھی جبر تو بہت ہوا لیکن عوام کو روٹی، روزگار اور رہائش جیسی کچھ بنیادی سہولتیں ضرور مل گئیں۔ سرمایہ داری نظام میں جمہوریت کی وجہ سے عوام کو سیاسی آزادی تو ملی لیکن معاشی اور سماجی ناہمواری کی وجہ سے امیر اور غریب کا فرق بہت بڑھ گیا۔

اسلام نے درمیانی راستہ نکالا جس میں آزادی اور مساوات دونوں موجود تھے۔ لیکن بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے اسالیب کی تبدیلی کے لیے جس اجتہاد (فکرِ نو) کی ضرورت تھی اس سے مُنہ پھیر لینے کے باعث مسلمان ریاستیں جمود کا شکار ہو گئیں اور ان میں نہ آزادی رہی، نہ مساوات۔ لا الہ الا اللہ محض ایک نعرہ بن کر رہ گیا۔ سچے خدا کا

Marfat.com

اقرار اور تمام جھوٹے خداؤں کا انکار کرنے والے جن مسلمانوں کے آگے ساری کائنات جھکی ہونی چاہیے تھی وہ دنیا بھر کے جھوٹے خداؤں کے سامنے گڑگڑاتے اور جھولیاں پھیلاتے نظر آئے۔

(2) اوّل تو انڈونیشیا اور ملائیشیا کو چھوڑ کر زیادہ تر مسلمان ملکوں میں بادشاہیت (Kingship) اور آمریت (Dictatorship) مسلط ہے۔ پھر پاکستان اور ترکی میں بھی در پردہ فوج ہی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ایران میں ایک مخصوص مذہبی قسم کی ''جمہوریت نما آمریت'' قائم ہے۔ اب دنیا کے خدائی فوجدار، امریکہ نے بموں کی بارش کر کے افغانستان اور عراق میں ''جمہوریت بالجبر'' نافذ کرنے کی ایک نئی کوشش شروع کی ہے جو جمہوریت کے مُنہ پر تھوکنے کے مترادف ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی بے بسی اور اخلاقی بے حسی کا سب سے افسوسناک اور دردناک منظر دیکھنا ہو تو او آئی سی (Organisation of the Islamic Conference) کا کوئی ایک اجلاس دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے عوام، اپنی اقلیتوں اور اپنی عورتوں کے حقوق دبانے والی نام نہاد مسلمان ریاستوں میں سے زیادہ تر، چھینک مارتے وقت بھی یہ دیکھتی ہیں کہ ان کے ملک میں امریکی سفیر کے ماتھے پر بل تو نہیں پڑ گئے۔ اب کچھ عرب ممالک کے عوام کو چھوٹی چھوٹی قسطوں میں جمہوری حقوق اور آزادی مل رہی ہے مگر اس لیے نہیں کہ خدا نے انسان کو حقوق اور آزادی دی تھی بلکہ اس لیے کہ ''اسامہ بن لادن اور دوسرے عرب دہشت گردوں'' کے ہاتھوں ستایا ہُوا امریکہ اس کے لیے اصرار کر رہا ہے۔

(3) اگر یہودیت کی پہچان شریعت پر زور ہے، مسیحیت کی پہچان محبت پر زور ہے۔ اسلام کی پہچان انصاف پر اصرار ہے۔ عدل انصاف کا پہلا درجہ ہے تو احسان آخری درجے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدل اور احسان کے لیے قرآنِ حکیم نے صرف تلقین نہیں کی، حکم دیا ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمان ملکوں میں عدل اور احسان ذرا کم ہی ملے گا۔ بادشاہیت اور آمریت اپنی جگہ عدل اور احسان کی نفی ہیں۔ مسلمان ممالک میں جو تاریخ سینہ بہ سینہ (خصوصاً اَن پڑھ عوام میں) رائج ہے یا جو مذہبی مدرسوں، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ قوموں کی تاریخ نہیں، شخصیتوں بلکہ غاصبین اور فاتحین کی تاریخ ہے۔ مسلمان فقیہوں کا یہ فیصلہ مسلمانوں کی جڑوں میں بیٹھ گیا ہے کہ جو شخص حکومت پر قبضہ کر لے اسے جائز حکمران تسلیم کر لینا چاہیے۔ پاکستان جیسے ملک میں جو خالصتاً جمہوری عمل سے بنا تھا، اس کی تاریخ کا آدھے سے زیادہ عرصہ کسی نہ کسی وردی پوش یا بے وردی فوجی کی عملداری میں گزرا ہے۔ وہ عدالتیں جو عدل کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں، ہر نئے فوجی تسلط کو جائز قرار دے کر عدل کی مٹی پلید کر دیتی ہیں۔

ہم لوگ غاصبوں، آمروں اور موروثی بادشاہوں کو کیوں قبول کر لیتے ہیں؟

ہمارا تاریخی شعور ہمیں سکھاتا ہی یہ ہے!

عدل یہ ہے کہ جو شخص جتنی محنت کرے یا لیاقت دکھائے اسے اتنا اجر مل جائے۔ کسی نے دس گز زمین کھودی ہے اور اگر فی گز دس روپے اجرت طے ہے تو اسے 10x10 کے حساب سے 100 روپے دے دیے جائیں اور کسی دوسرے نے

Marfat.com

اگر پانچ گز زمین کھودی ہے تو اسے 5x10 کے حساب سے 50 روپے مل جائیں۔ احسان یہ ہے کہ اگر دس گز والے کی ضرورت پچاس روپے ہے اور پانچ گز والے کا کنبہ بڑا ہے لہٰذا ضرورت بھی زیادہ ہے تو دس گز والا 50 روپے اپنے لیے رکھ کر بقیہ 50 روپے بخوشی پانچ گز والے ضرورت مند کو دے دے۔ کیا کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ آج کی کسی مسلمان یا نام نہاد اسلامی ریاست میں ایسا ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے؟ جہاں عدل کے لالے پڑے ہوں وہاں احسان کی توفیق کس کو ہوگی؟ اور جو معاشرہ عدل واحسان سے محروم ہو اس میں محبت کا کیا سوال؟

محبت سے خیر کی جانب بڑھنے سے پہلے محبت کے بارے میں ایک دلچسپ مکالمہ اور دو مختصر نظمیں ملاحظہ فرمایئے:

خدا نے کہا

میں نے کہا ، یا خدا! مجھ سے میرا تکبر چھین لے۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! یہ میرا کام نہیں کہ میں تمھارا تکبر چھینوں، یہ تو تمھیں خود ہی ترک کرنا پڑے گا۔
میں نے کہا، یا خدا! میرے اپاہج بچے کو صحیح وسالم کر دے۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! تمھارے بچے کی روح صحیح وسالم ہے، جسم تو عارضی چیز ہے۔
میں نے کہا، یا خدا! مجھے صبر عطا کر دے۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! صبر تو آزمائشوں سے گزرنے پر حاصل ہوتا ہے، عطا نہیں کیا جاتا۔
میں نے کہا، یا خدا! مجھے خوش رہنا سکھا دے۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! میں نے تمھیں خوش ہونے سے کب روکا ہے؟ سچی خوشی صرف شکر گزاروں کو حاصل ہوتی ہے
میں نے کہا، یا خدا! مجھے مصائب وآلام سے بچا لے۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! مصائب وآلام ہی تو تمھیں دنیا سے دُور اور میرے قریب لاتے ہیں۔
میں نے کہا، یا خدا! میں ادھورا ہوں، مجھے پورا کر دے۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! تمھیں اپنی تکمیل خود کرنی ہوگی البتہ میں وقتاً فوقتاً تمھاری تراش خراش (Pruning) کرتا رہوں گا تا کہ تم پھول پھل لا سکو۔
میں نے کہا ، یا خدا! مجھے نعمتوں سے مالا مال کر دے تا کہ میں زندگی سے لطف اندوز ہو سکوں۔
خدا نے کہا، ہرگز نہیں! میں تمھیں زندگی دے رہا ہوں تا کہ تم میری نعمتوں سے لطف اندوز ہو سکو۔
میں نے کہا، یا خدا! مجھے توفیق دے کہ میں دوسروں سے محبت کر سکوں۔
خدا نے کہا، یہ ہوئی نا بات! تمھارا یہ خیال مجھے اچھا لگا ہے۔

Marfat.com

خدا کے شایانِ شان

اے خدا! میں نے تیرے ساتھ دو طرح سے محبت کی ہے
پہلی، خود غرضانہ محبت
دوسری، تیری شان کے لائق محبت
جہاں تک خود غرضانہ محبت کا تعلق ہے
میں نے صرف ''تیرے اور میرے'' درمیان محبت چاہی،
اس میں میرے سوا کوئی اور شامل نہ تھا۔
لیکن وہ محبت جو تیرے شایانِ شان ہے، وہ تو وہی ہے
جس میں صرف میں نہیں وہ سب کچھ، اور وہ سب شامل ہوں
جنھیں تو نے پیدا کیا ہے۔

رابعہ العدویہؒ

محبت کی طاقت

صرف اور صرف محبت ہی ہے
جو تمام زندہ مخلوقات میں وحدت پیدا کر سکتی ہے
تا کہ وہ اپنا اپنا ارتقاء اور تکمیل کر سکیں
کیونکہ محبت ہی ان کی مشترکہ روح کے ذریعے سے
انھیں آپس میں مربوط کر سکتی ہے۔
ہمارا کام صرف اتنا ہے
کہ اپنے اندر موجود محبت کی لامحدود طاقت کو
اپنے بازو پھیلانے دیں، یہاں تک کہ وہ
زمین پر آباد تمام تر انسانوں کو اپنی آغوش میں لے لے۔

تیل ہارد دے شاردان

خیر

خیر یا اچھائی بھی ایمان اور محبت کی طرح بہت وسیع علمی اور عملی میدان ہے۔ اخلاقیات کے عنوان سے اس موضوع پر صدیوں سے سوچ بچار ہو رہا ہے اور انسان کو عمر بھر اور آئے دن یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔

Marfat.com

خدا پر ایمان رکھنے اور اس سے محبت کرنے والے انسان کے لیے یہ فیصلہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے: ''خدا ہم سے جو کہتا اور چاہتا ہے وہ اچھا ہے، جس سے منع کرتا ہے وہ بُرا ہے''۔ لیکن آج کے دور میں نہایت تیزی سے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ انسان کو بار بار ایسی صورت حال سے گزرنا پڑتا ہے جب اسے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس موقع پر خدا اس سے کیا چاہتا ہے۔ ایسے موقعوں کے لیے رسولِ خدا نے فرمایا تھا:

> کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ خیر کیا اور شر کیا ہے؟ یہ سوال ایک بار اپنے دل سے پوچھو، دوسری بار اپنے دل سے پوچھو، تیسری بار اپنے دل سے پوچھو۔ خیر تمھارا وہ عمل ہے جس سے تمھارے دل کو تقویت کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی نصیب ہو۔ شر تمھارا وہ عمل ہے جس سے تمھارے دل میں شک وشبہ اور بے اطمینانی پیدا ہو، خواہ لوگ تمھارے اس عمل کو درست ہی قرار دیں۔

جو شخص یہ چاہے کہ اس کی زندگی خیر سے پُر اور شر سے خالی ہو وہ ان چار باتوں پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی گزارتا ہے۔

1- خدا اچھا ہے اور اچھائی کو پسند کرتا ہے۔
2- خدا کی خدائی، یہ زمان ومکاں (Time and Space)، یہ جہان (Universe) اور اس میں آباد خلقِ خدا بھی اچھی ہے۔
3- خدا نے انسان کو گناہ کے بوجھ سے آزاد اور بہترین حسنِ توازن (احسنِ تقویم) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔
4- برائی کے مقابلے میں اچھائی کی طاقت اسی طرح بہت زیادہ ہے جیسے اندھیرے کے مقابلے میں روشنی کی طاقت۔

ان چار باتوں پر ایمان سے انسان کو خیر پر اعتماد حاصل ہو جاتا ہے اور وہ ہر دوسرے شخص کو برا سمجھنے اور، اُردو اور فارسی شاعروں کی طرح، آسمان یا فلک یا زمانہ یا دنیا کو اپنا دشمن جاننے کے بجائے انھیں اچھا اور اپنا ہمدرد سمجھتے ہوئے زندگی گزارتا ہے۔ ایسے شخص کی زندگی میں بھی بُرے حالات اور بُرے افراد آتے ہیں لیکن وہ انھیں ''خیر کے اصول کی استثنائیں'' (Exceptions to the Principle of Good) سمجھ کر اس اعتماد سے آگے بڑھ جاتا ہے کہ:

غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی   وقت اچھا بھی آئے گا ناصر

صداقت

عام آدمی کے لیے صداقت کا تعین بھی بہت مشکل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعین تو کبھی بڑے بڑے عالموں اور فلسفیوں کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا۔ عام آدمی تو یہی چاہتا ہے کہ اسے عالموں اور فلسفیوں کی طرح سوچنا نہ پڑے بلکہ اسے کسی قابلِ اعتماد ہستی کی طرف سے سوچا سمجھا، دیکھا بھالا نسخہ مل جائے کہ یہ سچ ہے اور یہ جھوٹ ہے۔ لیکن وہ

Marfat.com

لوگ جو عالم اور فلسفی نہ ہونے کے باوجود سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنا چاہیں تا کہ وہ سچ کو اپنا لیں اور جھوٹ کو رد کر دیں، ان کے لیے کئی راستے کھلے ہیں۔

پہلا اور بہترین راستہ یہ ہے: تمام تر سچ چونکہ صرف اور صرف خدا ہی کو معلوم ہے اس لیے جو کچھ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے ہماری رہنمائی کے لیے بھیجا ہے اسے دِل و جان سے سچ تسلیم کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں قرآنِ حکیم دو باتوں کی کسوٹی ہے۔ خدا کی دوسری کتابیں اور رسُولِ خدا سے منسوب احادیث۔ قرآنِ حکیم کو خدا نے زیر زبر کے فرق کے بغیر محفوظ کر رکھا ہے۔ دوسری الہامی کتابوں کو مقدس جانتے ہوئے اگر ان میں اور قرآنِ حکیم میں کہیں تضاد یا اختلاف ہو تو قرآنِ حکیم کو قبول کرنا چاہیے۔ البتہ وہ غیر متضاد اور غیر اختلافی بیانات جو قرآنِ حکیم میں موجود نہیں اور صرف دوسری الہامی کتابوں میں درج ہیں وہ ہمارے پورے پورے احترام، توجہ، غور و فکر اور قبولیت کے مستحق ہیں کیونکہ خدا نے اہلِ ایمان کے لیے یہ شرط ٹھہرائی ہے کہ ''وہ نہ صرف رسُولِ خدا کی وحی (قرآنِ حکیم) پر بلکہ آپ سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہونے والی وحی پر بھی ایمان رکھتے ہیں'' (وَالَّذِینَ یُوءْمِنُونَ بِمَا اُنزِلَ اِلَیکَ وَمَا اُنزِلَ مِن قَبلِک، 2:4)۔

اسی طرح ایک مسلمان کے لیے قرآنِ حکیم کے بعد رسُولِ خدا کے ارشادات سے بڑھ کر کوئی کلام محترم نہیں ہو سکتا۔ احادیث کو یکسر رد کر دینے والے نام نہاد ''اہلِ قرآن'' کی سب سے بڑی کمزوری اور نادانی یہ ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے بوکھلا گئے کہ احادیث میں خود غرضانہ مفادات (Vested Interests) کے تحت خود ساختہ احادیث بھی شامل کر دی گئی تھیں۔ بے شک ایسا ہُوا تھا لیکن اس قباحت کا علاج بھی تو موجود تھا۔ کسی نبی کا قول یا فعل اس کی وحی سے الٹ نہیں ہو سکتا۔ ہر نبی اپنی وحی کا سب سے پہلا اور محکم ترین پابند ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو آدمؑ کی طرح جنت سے نکال کر یونسؑ کی طرح مچھلی کے مُنہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی محفوظ ترین کسوٹی کی موجودگی میں ہر اس خود ساختہ (وضعی) حدیث کو اسی طرح الگ کیا جا سکتا ہے جیسے امام محمد ابن اسمٰعیل بخاریؒ اور امام ابوالحسن مسلمؒ نے احادیث کے ''صحیح'' (Authentic) مجموعے مرتب کرتے ہوئے کیا۔ جس طرح ہر حدیث کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ قرآنِ حکیم سے متضاد ہو، اسی طرح ہر حدیث کو آنکھ بند کر کے رد بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کے اصولی ارشادات کی بہترین تفسیر ہو۔

صداقت ہو یا خیر، خدا نے انسان کی روح اور اس کے دل میں ایک طرح کی میزان (ترازو) قائم کر رکھی ہے۔ رسُولِ خدا نے اسی لیے تین بار دہرا کر تاکید کی تھی کہ صداقت اور خیر کے متلاشیوں کو اپنے دل سے رجوع کرنا چاہیے۔ انسان کی روح ہو یا اس کا دل، اگر وہ زندہ و بیدار ہوں تو وہ گواہی دے دیتے ہیں کہ کیا سچ اور اچھا ہے یا کیا جھوٹ اور بُرا ہے۔ خود خداوند کریم نے بھی قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر اہلِ خیر اور اہلِ صداقت کے ''لازم و ملزوم تعلق'' کی گواہی دی ہے۔ مثلاً سورہ القمر کی آخری دو آیتیں ملاحظہ فرمایئے۔ ''یقیناً اہلِ خیر (متقی The Righteous) ایسی جنتوں

میں ہوں گے جن میں نہریں بہہ رہی ہوں۔ وہاں تمام تر طاقت کے مالک خدا کی موجودگی میں تمام سچے لوگوں کا اجتماع ہوگا'' (54:54-55)۔

صداقت کے بارے میں دو اہم باتیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہئیں۔ صداقت کبھی شر نہیں ہو سکتی، وہ ہمیشہ خیر ہی ہو گی۔ جو سچا ہے وہ اچھا ہی ہوگا۔ رسولِ خدا کی مثال لے لیجیے۔ آپؐ اُتنے ہی سچے تھے جتنے اچھے تھے، نہ کوئی آپ سے زیادہ سچا تھا، نہ کوئی آپ سے زیادہ اچھا تھا۔ دوسرے، جس طرح صداقت اور خیر میں لازم وملزوم کا تعلق ہے، اسی طرح صداقت اور حُسن بھی لازم وملزوم ہیں۔ کسی عاشقِ رسولؐ سے پوچھ کر دیکھیے، نہ کوئی آپؐ سے بڑھ کر سچا تھا، نہ کوئی آپؐ سے بڑھ کر حسین تھا۔ آپ کی ذاتِ مبارک اس بات کا ثبوت ہے کہ خیر، صداقت اور حُسن باہم شیر وشکر ہیں۔ ادب عالیہ کے طالب علموں کو صداقت اور حُسن کے باہمی تعلق کے بارے میں انگریزی شاعر کیٹس (Keats) کے یہ دو مصرعے ضرور یاد ہوں گے:

Beauty is truth, truth is beauty - that's all

Ye know on earth, and all ye need to know.

(حُسن صداقت ہے، صداقت حُسن ہے، بس یہی وہ بات ہے جو انسان اپنی

زمینی زندگی میں جان پاتا ہے، اور یہی وہ بات ہے جسے جاننے کی ضرورت ہے)

بہرحال تمام اہم اور بنیادی صداقتیں ہر انسان کا پیدائشی ورثہ ہیں۔ ہم ان پر عمل کریں یا نہ کریں، یہ دوسری بات ہے لیکن ہمیں ان کا علم، شعور اور احساس ضرور ہوتا ہے۔ جس اچھے، سچے اور خوبصورت خدا نے ہم میں اپنی روح پھونک رکھی ہے، اس نے اس روح میں اچھائی، سچائی اور خوبصورتی کا علم، شعور اور احساس بھی رکھ دیا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رُوح تو خدا کی ہو اور اس میں خیر، صداقت اور حسن کا علم، شعور اور احساس نہ ہو۔

انسان صداقت سے صرف اس وجہ سے نفرت کرتا ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کے بُرے اعمال خصوصاً اس کے جھوٹ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ورنہ صداقت سے نفرت کا تو صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ وہ خدا سے نفرت کرتا ہے۔ آج کے دور کے انسان نے دولت اور طاقت یا اقتدار کو خدا بنا لیا ہے۔ وہ مُنہ سے یہی کہتا چلا جاتا ہے کہ میں سچے خدا کو مانتا ہوں لیکن عملاً دُنیوی کامیابی کی خاطر دولت اور اقتدار کے جھوٹے خُداؤں کو پوج رہا ہوتا ہے۔ اسے سچ کی تلاش نہیں ہوتی، اسے حق کی تلاش نہیں ہوتی، اسے تو وہ علم اور طریقہ درکار ہے جو اسے کامیابی کی کالی دیوی تک پہنچا دے جو اس سے دل اور روح کی قربانی مانگتی ہے۔

مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا، ''اس شخص نے کیا کمایا جس نے ساری دنیا فتح کر لی لیکن اپنی روح گنوا بیٹھا''۔ اگر تعصب کی عینک اتار کر دنیا کی اصل صورتِ حال دیکھیں تو پتا چلے گا کہ آج بھی مسیحی دنیا میں ہزاروں نہیں، لاکھوں ایسے عالم، فلسفی، سائنس دان، محقق اور خادمانِ خلق مل جائیں گے جو زندگی کے مختلف

میدانوں میں حقیقت (Reality) اور صداقت (Truth) کی تلاش میں تن من اور دھن سے مصروف ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی دنیا میں آپ کو اکثر و بیشتر وہ برخود غلط لوگ ملیں گے جو "آتا جاتا خاک نہیں اور نام محمد فاضل" کی شرمناک اور افسوس ناک مثال ہیں۔

آج کوئی ایک عملی میدان ایسا نہیں جس کی قیادت کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو۔ اگر یہ سچ ہے کہ صداقت سے نفرت خدا سے نفرت کے مترادف ہے تو بلا خوف تردید یہ بھی کہا جا سکتا ہے مسلمانوں کی صداقت ناشناسی اور صداقت بیزاری دراصل خدا ناشناسی اور خدا بیزاری ہے۔ آج سے کوئی ایک صدی پہلے "نٹشے" نے نعرہ لگایا تھا کہ "خدا مر چکا ہے اور اب انسان اپنی اخلاقی قدریں خود بنانے کے لیے آزاد ہے"۔ یورپ اور امریکہ کا خدا مرا ہو یا نہ مرا ہو، مسلمانوں نے اپنے خدا کو عملاً خانہ کعبہ میں دفن کر دیا ہے کیونکہ اب وہ انھیں زندگی کے کسی شعبے میں رہنمائی نہیں بخش رہا۔ زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی ذلت آمیز پسماندگی اس طنز کو حق بجانب ثابت کر رہی ہے۔ آج کا مسلمان علم و عرفان سے اس حد تک بے بہرہ نظر آتا ہے کہ یہ یقین کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے کہ وہ اُس آدم کی اولاد ہے جسے خدا نے چیزوں کی حقیقت کا علم عطا کیا تھا جس میں اپنی روح پھونکی تھی اور جس کے آگے فرشتوں کی صورت میں فطرت میں کارفرما قوتیں سجدہ ریز ہوئی تھیں۔

کبھی آپ نے ہمت کر کے اپنے کسی مذہبی یا غیر مذہبی عالم کی باتیں سنی ہیں۔ گھنٹوں اِدھر اُدھر کی ہانکتے چلے جائیں گے اور آپ کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔ لفاظی، لفاظی، لفاظی۔ جنھیں سمجھانے کا گُر آتا ہے اور جو سمجھنے کی پیاس رکھتے ہیں ان کی بابت تو پنجاب کے عظیم صوفی شاعر بُلھے شاہؒ نے یہ شعر کہے تھے:

عِلموں بس کریں اور یار — اکّو اَلف تیرے درکار
پڑھ پڑھ شیخ مشائخ کہاویں — اُلٹے مسئلے گھروں بناویں
بے عِلماں نُوں لُٹ لُٹ کھانویں — جھوٹے سچے کریں اقرار

علموں بس کریں او یار

(اے میاں زیادہ علم نہ بگھارو۔ تم نے کچھ سیکھنا ہوتا تو ایک "الف" بھی تمھارے لیے بہت تھا۔ پڑھ پڑھا کر تم مولانا تو کہلوانے لگے ہو لیکن کرتے یہ ہو کہ اپنے پاس سے الٹے سیدھے مسئلے گھڑ لیتے ہو، بے علموں کو لوٹ لوٹ کر کھاتے ہو اور جھوٹے سچے وعدے کرتے رہتے ہو۔ بس بہت ہو لیا، ایسے علم سے ہم بھر پائے)

صداقت کی زبان بے تکلف اور سادہ ہوتی ہے۔ کیسی عجیب اور دردناک بات ہے کہ کائنات کا سب سے بڑا سچ، قرآنِ حکیم اور انسانی تاریخ کے سب سے سچے انسان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والے، بلکہ ان دونوں کی حرمت پر کٹ مرنے والے مسلمان آج سچ سے اتنے بے گانہ اور چیزوں کی حقیقت سے اتنے بے خبر ہو چکے ہیں کہ ان کے 57 ملکوں کے علمی میدانوں میں ہُو کا عالم طاری ہے۔

Marfat.com

کیوں؟

وہ سچ کی قبولیت اور پرورش کی یہ چند بنیادی شرطیں پوری نہیں کرتے:

1- تقلید پرستی سے انکار جس میں آباء واجداد کے تعصبات اور غلط عقائد سرِ فہرست ہیں۔

2- نہ جانتے ہوئے بھی یہ دعویٰ کرنا کہ ہم جانتے ہیں۔ اپنی لاعلمی کے عاجزانہ اقرار سے انکار۔

3- علم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھتے ہوئے آفاق وانفس میں کارفرما خدا کی نشانیوں کی مسلسل تلاش، خواہ یہ تلاش چین لے جائے یا یورپ یا آسٹریلیا یا امریکہ یا افریقہ یا قطب شمالی یا قطب جنوبی یا چاند پر یا کسی سیارے یا ستارے پر۔

صداقت کا موضوع محض علمی نہیں، عملی بھی ہے۔ جو علمی صداقت عمل میں باطل ثابت ہو جائے وہ صداقت کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہے۔ بے شک بڑی بڑی صداقتیں اپنی حقانیت ثابت کرنے کے لیے کچھ وقت لیتی ہیں بلکہ بعض اوقات تو ان صداقتوں کے علمبردار باطل کی تاریک راہوں میں مارے بھی جاتے ہیں۔ لیکن صبر اور استقلال سے صداقتوں کی آبیاری کی جائے تو بالآخر یہ لازماً پوری آب وتاب سے اپنا رنگ جماتی ہیں۔ آیئے سچے خدا کے سچے کلام میں غوطہ لگاتے ہیں اور اس سوال کا جواب مانگتے ہیں کہ سچ کیا اور جھوٹ کیا ہے، حق کیا اور باطل کیا ہے:

> ''خدا نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نالہ اپنی بساط کے مطابق یہ پانی لے کر چل پڑا۔ پھر جب سیلاب آیا تو پانی کی سطح پر جھاگ بھی آ گئے۔ اور اسی طرح کے جھاگ ان دھاتوں پر بھی آ جاتے ہیں جنھیں لوگ زیور اور برتن بنانے کے لیے پگھلاتے ہیں۔ اس مثال سے خدا تمھیں حق اور باطل کا فرق سمجھانا چاہتا ہے۔ جو باطل ہے وہ جھاگ کی طرح اُڑ جاتا ہے، جو حق ہے وہ انسانوں کے لیے نفع بخش ہے اور وہ زمین میں باقی رہ جاتا ہے۔ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17)۔''

امن

جب بھی کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان یا انسان سے ہم کلام ہوتا ہے تو اس کی زبان سے پہلے یہ دعائیہ کلمہ نکلتا ہے: السلام علیکم۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہوگا: ''آپ پر سلام ہو'' یعنی میں آپ کی سلامتی چاہتا ہوں اور آپ کو میری طرف سے مطمئن رہنا چاہیے کہ میں آپ سے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتا بلکہ آپ کے ساتھ امن سے رہنا چاہتا ہوں۔ اس سارے مفہوم کو انگریزی میں یوں ادا کیا جاتا ہے: Peace be upon you

مسلمان کے مُنہ سے رسولِ خدا کا اسم گرامی ''محمد'' ادا ہوتا ہے تو وہ فوراً ہی زبان یا دل سے صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتا ہے۔ یعنی اللہ آپ کو برکت اور سلامتی عطا فرمائے۔ اس کا صحیح انگریزی ترجمہ تو یہ ہے: May God bless him

Marfat.com

لیکن رائج الوقت ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: Peace be upon him and give him peace۔ وہ صاحب ایمان جو اپنی زندگی میں دوسروں کو کلمۂ امن پیش کرتا رہا ہو اور جس کے ہاتھوں دوسروں کو عملاً امن حاصل ہوتا رہا ہو جب خدا کے وعدے کے مطابق جنت میں قدم رکھتا ہے تو وہی کلمۂ امن جو وہ اپنی زندگی میں دوسروں کو پیش کرتا رہا تھا اب خود خداوند کریم کی طرف سے اسے پیش کیا جاتا ہے: سلام" قولاً مِّن ربٍّ رَّحیم (36-58)۔

مسلمان جب بھی کسی کام، منصوبے یا مہم کا آغاز کرتا ہے تو پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھتا ہے۔ اس موقع پر وہ جبار و قہار، یا منتقم خدا کو نہیں، رحمان و رحیم خدا کو یاد کرتا ہے اور اپنے آپ پر اور ساری دنیا پر واضح کر دیتا ہے کہ میرے کام، منصوبے یا مہم کا تعلق رحمت سے ہے، زحمت سے نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی روزمرہ زندگی کا کوئی مقصد ہو سکتا ہے تو وہ امن ہے۔ اس کے تو دین کا نام بھی "اسلام" ہے۔ جس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے مسلمان سے تمام انسان اور تمام مخلوقِ خدا سلامتی اور امن کی توقع کر سکتی ہے۔

اگر امن ہی مسلمان کا مقصدِ حیات ہے تو اس کی زندگی میں جہاد کا کیا مقام ہے؟

مسلمان کی زندگی میں جہاد کا بڑا اہم مقام ہے۔ سب سے اہم جہاد تو وہ اپنے نفس کے خلاف کرتا ہے اور مسلسل کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کا نفس ہی وہ شیطان ہے جو اسے بہکاتا اور برے کاموں کے لیے اکساتا ہے۔ اس انفرادی جہاد کی صرف ایک اور شکل ہے۔ جب مسلمان کے اردگرد ایسے لوگ موجود ہوں جو خدا کے دین سے یکسر منحرف ہوں تو وہ مقدور بھر کوشش کرتا ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے لیکن وہ یہ کوشش ڈنڈے کے زور پر نہیں، رسولِ خدا کی پیروی میں محبت اور اخلاق سے کرتا ہے۔ وہ یہ کوشش (جہاد) اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک اس کی جان کے لالے نہ پڑ جائیں۔ اس صورت میں وہ وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے۔ رسولِ خدا اور آپؐ کے ابتدائی ساتھیوں کی مکی زندگی اور پھر مدینے کی جانب ہجرت اس کی بہترین مثال ہے۔ یاد رہے کہ مکی دور میں آپؐ نے کبھی ہتھیار نہیں اٹھائے حالانکہ آپؐ کے بعض ساتھی اس کے لیے اصرار کرتے تھے۔

جنگی جہاد کا آغاز مدینے کی ریاست کی بنیاد رکھنے کے بعد ہُوا تھا اور اس سے ثابت ہے کہ انفرادی سطح پر جنگی جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ انفرادی سطح پر جہاد صرف اپنے نفس کو صراطِ مستقیم کا پابند بنانے یا اپنے ماحول کی اصلاح تک محدود ہے۔ جنگی جہاد صرف اور صرف اجتماعی سطح پر ہو سکتا ہے اور اس کا مقصد بھی امن ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم تاکیداً اور دوٹوک الفاظ میں یہ واضح کر دیتا ہے کہ جیسے ہی امن ممکن ہو جائے، جنگ بند کر دینی چاہیے (8:61)۔ آج کل امریکہ نے "جنگ برائے امن" کو ایک منافقانہ ڈھکوسلا بنا کر رکھ دیا ہے لیکن خدا اور اس کی مخلوق کے ساتھ محبت رکھنے والے اہلِ ایمان کے لیے جنگ کا امن کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا۔

جو قارئین عربی زبان کی ساخت سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ عربی میں ہر لفظ کی ایک بنیاد ہوتی ہے جسے مادّہ کہتے ہیں۔ مثلاً محمد کا مادہ "ح م د" ہے۔ اس مادّے سے کئی اور الفاظ بن جاتے ہیں جن کے بنیادی معنوں میں "حمد"

Marfat.com

کا مفہوم موجود ہوتا ہے۔ مثلاً محمد کے علاوہ حمد ہی کے مادے سے محمود، حامد، احمد، حمید، حماد بھی بنے ہیں۔ ایمان اور امن کا مادہ بھی ایک ہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اہلِ ایمان کو ایمان کے تقاضے پورے کرنے پر خداوند کریم سے جو انعام ملتا ہے وہ امن ہے۔ مثال کے طور پر قرآنِ کریم کی یہ دو آیات ملاحظہ فرمایئے: اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ o اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ آمِنِيْنَ o ''بے شک متقی لوگ (اہلِ ایمان) ایسی جنتوں میں رہیں گے جن میں پانی کے چشمے ابل رہے ہوں۔ ان سے کہا جائے گا، ان میں پُرامن سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ (15:44-45)۔ گویا تقوے کا مقصد ایمان ہے اور انجام پُرامن سلامتی ہے۔

اسی ضمن میں قرآنِ حکیم کی یہ آیت ایمان اور امن کا باہمی رشتہ واضح کرتی ہے۔ یاد رہے کہ امن کا الٹ فساد ہے اور خدا نے بار بار فساد اور مفسدوں کی شدید ترین مذمت کی ہے:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ...... (یہ ممکن نہیں کہ خدا ایک طرف اہلِ ایمان اور اہلِ خیر اور دوسری طرف فساد پھیلانے والوں میں کوئی فرق نہ کرے (38:28)۔

اس آیت میں خدا نے والذین آمنوا کے ساتھ والذین عملوا الصالحات کا ذکر کر کے انھیں مفسدوں سے علیحدہ تشخص دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی طرح اہلِ خیر (جو صالح عمل کرتے ہیں) بھی فساد کے بجائے امن ہی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اگر ایمان کا مقصد اور انجام امن ہے تو خیر کا مقصد اور انجام بھی امن ہی ہے۔

ایمان اور خیر کی طرح محبت اور صداقت کا حاصل بھی امن ہی ہے۔ اہلِ ایمان ہوں، اہلِ خیر ہوں یا اہلِ محبت، سب کی تمنا، دعا اور کوشش ہوتی ہے اور ہونی چاہیے کہ خدا ان کا شمار مفسدوں میں نہ کرے۔ خدا سے محبت کرنے والے خدا کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگے ہوتے ہیں۔ اگر خدا مفسدوں سے محبت نہیں کرتا (5:64/28:77) تو عاشقانِ الٰہی اور اہلِ محبت بھی فساد پھیلانے والوں سے محبت نہیں کر سکتے۔ یہی حال اہلِ صداقت کا ہے۔ صادق (سچے انسان) کے الٹ معنوں (Antonym) میں خدا نے قرآنِ حکیم میں کاذب (جھوٹے انسان) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآنِ حکیم کے بالکل آغاز میں خدا فرماتا ہے:

> بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا اور حشر کے دن پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ (درحقیقت) وہ ایمان نہیں لائے ہوتے۔ وہ اپنی طرف سے خدا اور خدا پر ایمان رکھنے والوں کے ساتھ دھوکا کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ ان کے دِلوں کو (جھوٹ اور منافقت کی) بیماری لگ چکی ہے اور (جوں جوں وہ جھوٹ بولتے اور منافقت کرتے چلے جاتے ہیں) خدا ان کی بیماری میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کے لیے اس جھوٹ اور منافقت کی سزا دردناک عذاب ہے۔ ان سے جب بھی کہا گیا کہ زمین

Marfat.com

میں فساد نہ مچاؤ تو انھوں نے (اسی جھوٹ اور منافقت سے کام لیتے ہوئے) یہی کہا کہ نہیں، ہم تو اصلاح کر رہے تھے۔ خبردار، یہ جھوٹے اور منافق لوگ مفسد ہیں، یہ الگ بات ہے کہ انھیں اس کا شعور نہ ہو (2:8-12)۔

اسی سورہ البقرہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے:

انسانوں میں کوئی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس کی باتیں تمھیں دنیا کی زندگی میں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ جب اسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو دنیا میں اس کی ساری دوڑ دھوپ کا مقصد فساد پھیلانا ہوتا ہے۔ وہ کھیتیوں کو غارت اور نسلِ انسانی کو تباہ کرتا ہے حالانکہ جس خدا کو وہ گواہ بنا رہا تھا وہ تو فساد کو سرے سے پسند ہی نہیں کرتا۔ اور جب اس فساد مچانے والے شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈر تو وہ اپنے دُنیوی وقار کے خیال سے اپنے گناہ پر جما رہتا ہے۔ ایسا شخص تو بس جہنم ہی کا مستحق ہے اور جہنم بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ اس کے برعکس لوگوں میں کوئی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو خدا کی رضا کے بدلے اپنی جان کا سودا کر لیتا ہے اور اللہ ایسے لوگوں پر بہت شفقت فرماتا ہے (2:204-7)۔

یہ مشہور اور محکم آیات واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ کذب اور کاذبین (جھوٹ اور جھوٹوں) کا فساد اور مفسدوں کے ساتھ چولی دامن کا تعلق ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صداقت اور اہلِ صداقت (سچ اور سچوں) کا اتنا ہی گہرا رشتہ امن اور اہلِ امن سے ہے۔

ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن میں ایمان کی حیثیت ''آغاز'' کی اور امن کی حیثیت ''انجام'' کی ہے۔ لیکن یہ آغاز اور انجام، محبت، خیر اور صداقت کے پُلوں کے ذریعے سے باہم گھُلے ملے ہیں۔ عملاً ان میں تقدیم اور تاخیر کی حد بندی نہیں پائی جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بند دائروں یا ہم مرکز دائروں کی شکل میں الگ الگ حدود نہیں رکھتے بلکہ ایک پھیلتے ہوئے دائرے کی صورت میں کارفرما ہوتے ہیں۔

یہاں ایک وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے:

سائنس دانوں نے تو کہیں بیسویں صدی میں، خصوصاً آئن سٹائن (Einstein) کے نظریۂ اضافیت (Relativity Theory) کے بعد اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ کائنات ساکت نہیں بلکہ مسلسل پھیلتی چلی جا رہی ہے اور اس کی شکل بند دائرے (Closed Circle) کی نہیں، ایک پھیلتے ہوئے دائرے (Spiral) کی ہے۔ لیکن صوفیوں نے بہت پہلے یہ محسوس کر لیا تھا کہ خدا چونکہ زندہ ہے اس لیے نہ تو وہ خود ساکت ہے اور نہ ہی اس کی پیدا کی ہوئی کائنات ہی ساکت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ زندہ خدا تو ہر وقت تخلیق میں مصروف رہتا ہے اس لیے کائنات میں بھی ہر لحظہ اضافہ

Marfat.com

ہو رہا ہے۔ ہمارے دور کے فلسفی اور صوفی شاعر اقبالؔ نے سائنس دانوں کی تحقیق اور صوفیوں کے احساس کو یہ خوبصورت اور جانے پہچانے الفاظ دیے تھے:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

اس حقیقت کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ کائنات کسی دائرے کی طرح بند نہیں ہے۔ اگر ہم ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے باہمی تعلق کو تصویری زبان میں بیان کرنا چاہیں تو اس کی صورت یہ ہوگی۔ اور یہ صورت خدا، حقیقت، اور کائنات سے بھی مکمل طور پر ہم آہنگ ہے

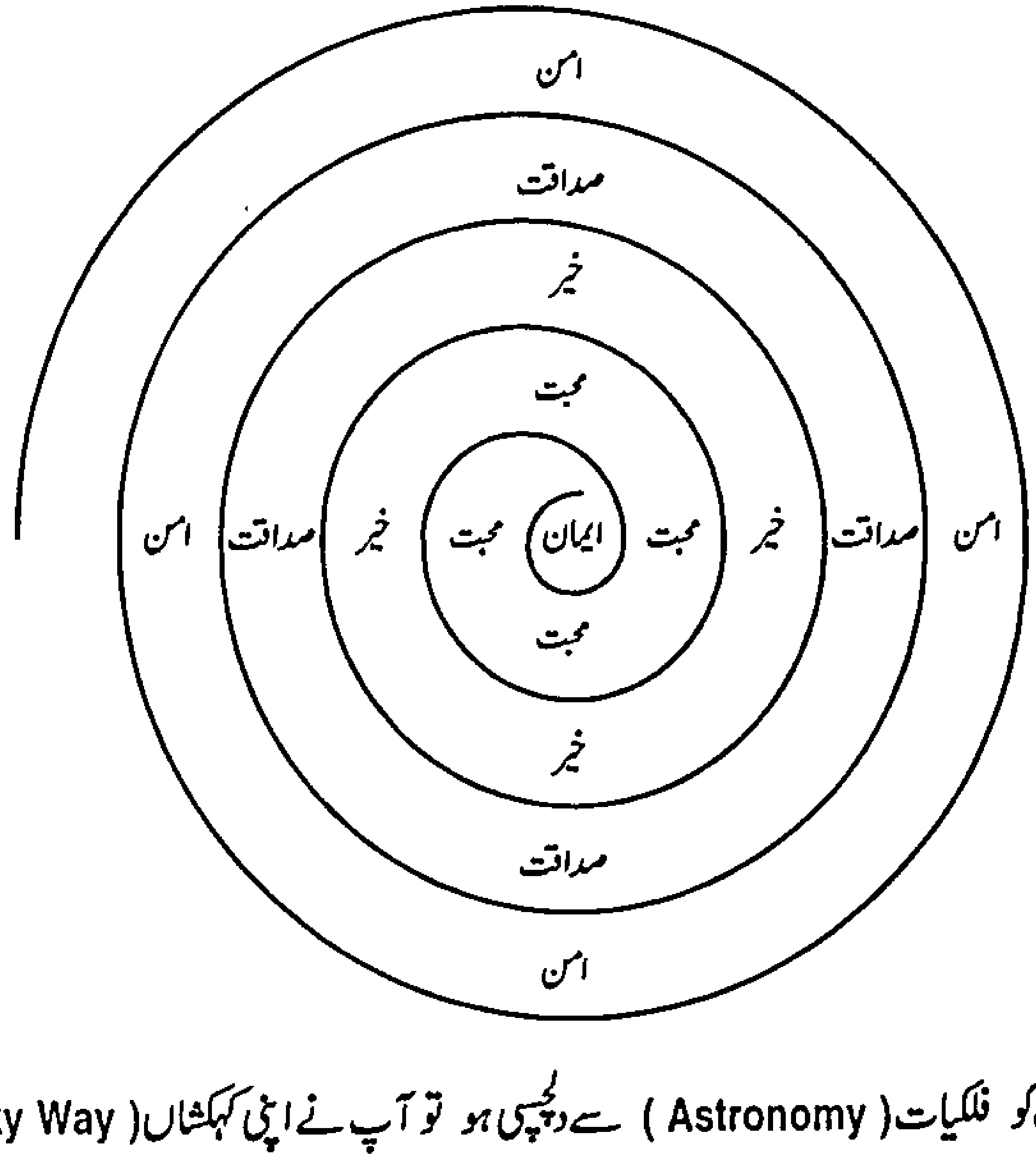

آپ کو فلکیات (Astronomy) سے دلچسپی ہو تو آپ نے اپنی کہکشاں (Milky Way) کی تصویر ضرور دیکھی ہوگی اور اس کے اندر ستاروں کی گردش کا رُخ بھی دیکھا ہوگا جو دائرے کے بجائے کسی سپرنگ سے ملتا جلتا ہے۔ مصوری سے دلچسپی رکھنے والے قارئین مشہورِ زمانہ مجذوب مصور، وان گو (Van Gogh) کی بنائی ہوئی ''ستاروں بھری رات'' کو یاد کریں تو انھیں اس میں بھی کسی سپرنگ یا زینۂ پیچاں (Spiral Staircase) جیسی حرکت (Movement) نظر آئے گی۔ چلیے اس صورتِ حال کو یوں بیان کر کے دیکھتے ہیں کہ کائنات کسی بُلبُلے کی طرح نہیں پھیل رہی بلکہ برف کے اس گولے (Snowball) کی طرح پھیل رہی ہے جو جیسے جیسے لڑھکتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کے گرد مزید برف چمٹتی جاتی ہے اور وہ بڑے سے بڑا ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ وضاحت دو وجہ سے ضروری تھی۔ ایک تو اس لیے کہ اسلام کو خدا نے دینِ فطرت قرار دیا ہے۔ اگر فطرت کی حرکت زینۂ پیچاں کی طرح ہو اور اسلام اور مسلمان بند دائرے میں محوِ سفر ہوں تو ان کے درمیان اس تضاد کا لازمی نتیجہ وہی نکلے گا جو آج ہماری بدقسمتی کی صورت میں نکل چکا ہے۔ ہم جمود، سکوت اور بالآخر زوال کا شکار ہو جائیں گے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی پانچ روحانی قدروں اور اسلام کے مشہور ''پانچ ستونوں'' کا جائزہ لے کر ان کا باہمی رشتہ تلاش کیا جا سکے۔

Marfat.com

اٹھارھواں باب

اسلام کے پانچ ستون

اسلام تو ایک روحانی اور دُنیوی انقلاب تھا جسے ہمارے اُن علماء نے بند پانی کا ایک تالاب بنا کر رکھ دیا جو خدا، رسولؐ اور قرآن کے پاسدار نہیں، بادشاہوں، فاتحین، غاصبوں اور حکمران طبقوں کے تنخواہ دار تھے۔ اسلام کے ساتھ اس سے بڑا کوئی اور ظلم اور فریب نہیں کیا گیا کہ روحِ اسلام کی سراسر نفی کرتے ہوئے اسلام کو''اسلام کے پانچ ستونوں کے نام پر''صرف اور صرف نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور کلمے تک محدود کر دیا جائے اور ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کا نام بھی نہ لیا جائے اور نہ ہی یہ یاد رکھا جائے کہ اسلام کی بنیاد انسانیت پر رکھی گئی ہے جو علم اور روح کے سرچشموں سے فیض یاب ہوتی ہے۔

نتیجہ:

نتیجہ یہ ہے کہ آج کا عام مسلمان کلمہ تو پڑھ سکتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ یہ کلمہ اُسے جہاں دنیا بھر کے جھوٹے خداؤں سے آزادی بخشتا ہے وہاں اُسے اِس دُنیا کو اندھیروں، مغالطوں، مفسدوں، ظالموں، جابروں اور بدمعاشوں سے پاک کرنے کی گراں بار ذمہ داری بھی سونپ دیتا ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں نے یہ تو سُن رکھا ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ''لا الہ الا للہ'' لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ ''لا الہ الا للہ'' کا مطلب کیا ہے۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچیے، آج کے ایک ارب اور بیس کروڑ مسلمانوں میں، ان کے حکمرانوں اور لیڈروں سمیت، کتنے افراد ایسے ہیں جو دیانتداری سے کہہ سکیں'' کہ یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند، بتانِ وہم و گماں لا الہ الا للہ''۔

آج کا مسلمان اس کلمے کو محمد رسول اللہ کہہ کر زبانی طور پر تو مکمل کر دیتا ہے۔ یہی نہیں وہ رسولِ خدا کے نام پر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے پوچھ کر دیکھیے کہ وہ رسولؐ خدا کی شخصیت، کردار اور روحانی اور تاریخی کارناموں کے بارے میں کیا جانتا ہے اور وہ آپؐ کے کس کس عمل کی پیروی کر رہا ہے؟ سو میں سے نوے مسلمان بغلیں جھانکتے ہوئے اس سوال کا جواب صفر میں دیں گے۔ کیا آج کا مسلمان اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ایک لمحے کے لیے بھی رُک کر اپنے آپ سے یہ پوچھتا ہے کہ اِس وقت میں جس صورت حال یا مسئلے سے دوچار ہوں، اگر میری جگہ رسولِ خدا ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ نہیں، الا ماشاء اللہ آج کا کوئی مسلمان شاید ہی ایسا کرتا ہو۔ عام مسلمان کو چھوڑیے، ہمارے کتنے حکمرانوں اور لیڈروں نے زندگی میں ایک بار بھی یہ سوچا ہوگا؟

نماز کو لے لیجیے۔ اوّل تو ہماری ایک نہایت معمولی تعداد باقاعدہ نماز پڑھتی ہے۔ ہاں دو عیدوں، لیلۃ القدر

Marfat.com

اور جمعۃ الوداع کو مسجدوں میں ضرور رونق ہوتی ہے۔ یا پھر رمضان کے دوران اور جمعے کے روز اچھا اجتماع ہو جاتا ہے۔ نماز میں کیا پڑھا جاتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے اور اس سے ہمارے طرزِ فکر وعمل میں کیا تبدیلی آنی چاہیے۔ کتنے نمازی ہوں گے جنھیں یہ سوال ستاتا ہو اور سونے نہ دیتا ہو؟

کتنے نمازی اس حالت میں قیام، رکوع اور سجود کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے روبرو پاتے ہوں؟ اور پھر ہم سوچتے ہیں کہ ہماری نمازوں اور دعاؤں میں اثر کیوں نہیں؟ اثر تو ہے۔ جب ہم نماز پڑھتے ہیں مگر حتی المقدور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری نہیں کرتے، بے بسوں اور بے یار ومددگاروں کو دھکے دیتے ہیں، زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کی مدد نہیں کرتے تو خدا ہمارے بارے میں دو اعلان کرتا ہے:

1- تمھی وہ لوگ ہو جو دین کو جھٹلاتے ہو (107:1)۔

2- میں تم پر تباہی (ویل) بھیجنے والا ہوں (107:4) ۔

کاش ہم نماز کی روح سے واقف ہونے کے لیے قرآنِ حکیم کی ایک چھوٹی سی سورہ الماعون ہی پڑھ لیتے اور اس کے سبق کو اپنا وتیرہ بنالیتے۔ اقبالؔ کا ایک اور شعر سن لیجیے، پھر آگے چلتے ہیں:

مسجد تو بنادی شب بھر میں، ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

کلمے اور نماز کے بعد رمضان میں روزے رکھنے کو اسلام کا تیسرا ستون قرار دیا جاتا ہے۔ روزے اور فاقے میں زمین آسمان کے فرق کو ختم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ روزہ صرف پیٹ ہی کا تو نہیں تھا، آنکھ، کان، دل، دماغ اور ہاتھ پاؤں کا بھی تو تھا۔ اوّل تو ہر مسلمان روزہ نہیں رکھتا اور رکھتا ہے تو زیادہ تر صرف پیٹ کا روزہ رکھتا ہے۔ بس کھاتا پیتا نہیں، باقی اسے کسی چیز کا کم ہی پرہیز ہوتا ہے۔ کھانے پینے کے علاوہ وہ جنسی عمل سے ضرور پرہیز کرتا ہے البتہ اس کی خواہشوں، سوچوں، ارادوں پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ کیا خدا کو ہمارے خوراکی اور جنسی روزے ہی سے غرض تھی یا وہ ہمیں بھوکوں کی بھوک یاد دلا کر ان کی طرف دھیان دلانا چاہتا تھا؟ کیا رمضان کے دوران کم کھا کر اور اپنے نفس پر قابو پا کر پرہیزگاری مقصود تھی یا پہلے سے بھی زیادہ خوش خوراکی؟ ماشاءاللہ اِدھر رمضان کی آمد آمد ہوئی اور اُدھر آٹا، دال، گھی، شکر کا کال پڑا اور ان کی قیمت چڑھ گئی۔

کیوں؟

اس لیے کہ رمضان میں روزے دار مسلمان کم کھانے کے بجائے پہلے سے کہیں زیادہ کھاتا ہے۔ عہدِ نبویؐ کی پہلی جنگ، بدر کے مقام پر ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو یہ تو یاد ہے لیکن یہ بھول گیا ہے کہ جنگِ بدر رمضان کے دوران ہوئی اور رسولِ خداؐ سمیت تین سو تیرہ مجاہدوں کے ہاتھ میں تلوار اور مُنہ میں روزہ تھا۔ ذرا آج عرب ممالک میں رمضان کے مہینے کا نقشہ دیکھیے۔ ساری قوم دن کے اوقات میں ایرکنڈیشنڈ کمروں میں آرام دہ بستروں میں سوتی رہتی ہے۔ ان ممالک میں

Marfat.com

دن کے وقت ہُو کا عالم ہوتا ہے، دفتر بند، دکانیں بند، بازار بند، ٹریفک بند اور روزہ دار اور غیر روزہ دار مسلمان آرام دہ کمروں میں بند۔ جب کہ روزہ داروں کے لیے زندگی کی جدوجہد میں شرکت مقصود تھی تاکہ وہ روزے کی وجہ سے اندازہ کر سکیں کہ جن غریبوں کے پیٹ اور گھر میں روٹی نہیں ہوتی اور انھیں اپنے بچوں کے منہ میں دو نوالے ڈالنے کے لیے دن کی گرمی سردی میں محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے ان کے جسم و جان پر کیا گزر رہی ہوتی ہے۔

آیئے اب زکوٰۃ کا حال بھی دیکھ لیتے ہیں۔ جس طرح مغرب میں ٹیکس بچانے کی ہر جائز و ناجائز کوشش کی جاتی ہے۔ (یہ بے وقوف لوگ پتا نہیں پاکستان سے کیوں کچھ سیکھ نہیں لیتے، جہاں صرف ایک فیصد لوگ ٹیکس دیتے ہیں جبکہ مغرب میں ہر بالغ اور باروزگار شخص ٹیکس دیتا ہے اور اگر نہیں دیتا تو بتاتا ہے کہ میں کیوں نہیں دیتا یا دے سکتا)۔ بہرحال بات زکوٰۃ کی ہو رہی تھی۔ جنرل ضیاء الحق نے بنکوں کو حکم دے دیا کہ جس شخص کے پاس نصاب (وہ رقم جس سے زائد پر زکوٰۃ فرض بن جاتی ہے) سے زیادہ رقم ہو اس کے اکاؤنٹ سے ہر سال ایک خاص دن 2½ فیصد الگ کر کے زکوٰۃ فنڈ میں جمع کرا دیا جائے۔ اگرچہ اب بھی کچھ بھلے لوگوں کی مہربانی، سُستی یا ''نالائقی'' کے باعث چند سو کروڑ روپے اس مد میں جمع ہو جاتے ہیں مگر زیادہ تر بڑی اسامیاں عین موقع پر اپنی رقمیں نکلوا کر ایک دو دن بعد پھر جمع کرا کے زکوٰۃ کٹنے سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ زکوٰۃ صرف نقد مال ہی پر تو نہ تھی، تمام جائیداد اور سونے چاندی اور کاروباری سٹاک پر بھی تھی۔ کتنے مسلمان ملکوں کے حکمران اور قائدین اپنی ساری جمع پونجی پر زکوٰۃ دیتے ہیں؟ کچھ کاروباری حضرات آٹے اور رضائیوں کی صورت میں زکوٰۃ بانٹ کر اپنی نیکی اور سخاوت کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہوتے ہیں۔ باقی حضرات اپنے بارے میں بنکوں میں چپکے چپکے یہ اندراج کرا رہے ہوتے ہیں کہ وہ شیعہ فرقے سے یا احمدی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کی رقموں سے زکوٰۃ نہ کاٹی جائے کیونکہ وہ اپنے طور پر اپنی شرع اور شرح کے مطابق زکوٰۃ دینا (اصل میں نہ دینا) چاہتے ہیں۔

آخر میں حج کی بھی سن لیجیے۔ خدا نے حج کو محض ایک رسم نہیں، ایک قلبی واردات کے طور فرض قرار دیا تھا۔ بندہ اپنے گھر بار، آل اولاد اور وطن سے کٹ کر خدا کے گھر میں حاضر ہوتا ہے جس کے گرد دو چادروں میں لپٹے عورت اور مرد، کمزور اور طاقتور، کالے اور گورے، امیر اور غریب ایک ساتھ طواف کر رہے ہوتے ہیں۔ حج سے یہ بتانا مقصود تھا کہ خدا کے ہاں عورت اور مرد، کمزور اور طاقتور، کالے اور گورے، امیر اور غریب کا کوئی فرق نہیں۔ اگر ہم یہ ایمان رکھتے ہوں کہ بالآخر خدا کے سامنے پیش ہونا ہے تو اپنے دِل سے اور اپنے عمل سے یہ امتیازات (Discriminations) مٹا کر حج کے لیے آنا اور واپس جانا چاہیے۔ مگر ہوتا کیا ہے، اِدھر حج کی رسم ادا ہوئی، اُدھر پھر وہی تفریق، تعصب اور درجہ بندی شروع۔ حج تو ہجرت کا روحانی تجربہ تھا جس کے دوران انسان اپنے ربّ کی طرف یہ کہتے ہوئے پلٹتا ہے کہ اے رب العالمین! میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت، سب کچھ تیرے لیے ہے۔ یہ تجربہ کچھ حاجیوں کو ضرور نصیب ہوتا ہے اور ان کی زندگی ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی روحانی بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہے لیکن باقی کی

Marfat.com

اکثریت کے لیے حج محض ایک مقدس سفر، ایک اعزاز اور چند روز کی رسمی عبادت سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ جیسے ہی حج کے مناسک (طے شدہ رسمیں) ختم ہو جاتے ہیں زیادہ تر لوگ اپنی پرانی بندر بانٹ اور چوہا دوڑ والی زندگی میں واپس آ جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کلمہ کے پانچ ارکان یا ستونوں (Pillars) میں محدود کر دینے سے دورِ حاضر کے مسلمان کی زندگی ظاہرداری کا ایک کھوکھلا مظاہرہ بن کر رہ گئی ہے۔ کوئی یہ بتانے اور جاننے کی زحمت ہی نہیں کرتا کہ کیا یہ ستون ہوا میں کھڑے ہیں یا ان کی کچھ بنیادیں بھی ہیں۔ پھر ستون تو کسی عمارت کے نیچے بنائے جاتے ہیں، وہ عمارت کیا ہے جس کے یہ ستون ہیں؟ نہ تو علم اور روح کا ذکر ہوتا ہے جن کا مقام اِن ستونوں کی بنیادوں کا ہے اور نہ ہی اِن ستونوں کے اوپر استوار ہونے والی اسلام کی اُس عمارت کا نقشہ کھینچا جاتا ہے جو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے ایوانوں پر مشتمل ہے۔

تاریخ اور وقت بہت آگے نکل گئے ہیں اور مسلمان حیران و پریشان کھڑا اپنی حالتِ زار پر کُڑھ رہا ہے۔ وقت کسی مُنہ زور گھوڑے کی طرح بھاگ رہا ہے اور مسلمان کا "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"۔ پسماندگانِ تاریخ اکثر و بیشتر اس رویے میں پناہ ڈھونڈتے ہیں کہ یا تو ان کی قسمت بُری تھی یا پھر کسی اور نے (کل تک یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں (Colonial Powers) یا آج کے خدائی فوجدار امریکہ نے) ان کے ساتھ ظلم اور فریب کر ڈالا ہے۔ وہ ایک ایسے بے دست و پا شخص کی طرح جو کسی دشمن کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا، اپنے پھوکے غصے (Impotent Rage) میں اوّل تو اپنا ہی سینہ پیٹتا اور اپنے ہی بال نوچتا رہتا ہے یا پھر آخری حربے کے بطور اپنے جسم پر دھماکا خیز مواد باندھ کر "دشمن" پر جا گرتا ہے اور خود ہلاک ہونے کے ساتھ ساتھ دو چار دس بیس بے گناہ بندگانِ خدا کو ہلاک کر ڈالتا ہے خواہ وہ اس سے بہتر انسان اور مسلمان ہوں۔

مصیبت یہ ہے کہ اکثر یہ سوچا ہی نہیں جاتا کہ دشمن کون ہے؟ پاکستان میں بوڑھے سُنّی مولوی اپنے آپ کو یا اپنے بیٹوں کو نہیں، دوسرے غریب سُنّی نوجوانوں کو شیعہ امام بارگاہوں میں خودکش حملوں کے لیے بھیجتے ہیں اور یوں مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان مرتے رہتے ہیں۔ حسبِ توفیق یہی اہتمام کچھ بوڑھے شیعہ مولوی سُنّی مسجدوں کے لیے کرتے ہیں۔ عراق میں بھی خودکش حملوں میں امریکی کم اور عراقی مسلمان (بچے اور جوان) زیادہ مارے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ جہاں خصوصاً عراق کے نوجوان مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے ہیں وہاں امریکہ کے لیے آسانی پیدا کر رہے ہیں کہ وہ بدامنی کے نام پر عراق میں اپنے قیام کو حسبِ مراد طول دے سکے۔ اور تو اور ان حملوں کے نتیجے میں جلد وہ وقت آ جائے گا کہ خود عراقی حکومت امریکہ سے منت سماجت کرے گی کہ "ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دِل ابھی بھرا نہیں" اور اب تو یہ خدشہ بھی ہے کہ امریکہ کے عراق سے جاتے ہی وہاں شیعہ سُنّی اور کُرد مسلمانوں کے درمیان بندر بانٹ یا خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

اصل میں آج کا مسلمان کسی مثبت یا صالح عمل کے لائق ہی نہیں رہا۔ وہ صرف بُرا بھلا منفی ردِّعمل (Negative Reaction) کر سکتا ہے جو انسان کی شان نہیں، جانوروں کی خصوصیت ہے۔ جو نوجوان دہشت گردوں کا

Marfat.com

آلہ کار بنتے ہیں وہ دراصل اپنی کمزور، نالائق اور ٹوڈی حکومتوں کی بے حسی اور بے عملی کے خلاف ردِ عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ دل میں کہتے ہیں، ''ہمارے حکمران تو مردانگی کھو بیٹھے ہیں ان سے تو کچھ ہوتا نہیں، چلو ہم ہی کچھ کر دیکھیں خواہ اس کا مطلب خودکشی ہی ہو''۔ قرآنِ حکیم کے مطابق مثبت یا صالح عمل صرف اہلِ ایمان ہی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان بیسیوں مقامات پر جہاں صالح عمل کرنے والوں (عَمِلُوا الصَّالِحَات) کا ذکر آیا وہاں پہلے اور لازماً اہلِ ایمان (والذین آمنوا) کا ذکر کیا گیا ہے جس سے ثابت ہے کہ ''صالح عمل'' کا سرچشمہ ''ایمان'' ہے۔

جب ایمان کا ہماری تعلیم وتربیت اور دل ودماغ میں عمل دخل تو کیا ذکر بھی نہیں ہوگا تو اس کی اہمیت، معنویت اور ضرورت ہم پر خاک واضح ہوگی؟ ایمان کی طاقت کے حوالے سے مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ''اگر تم میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان ہو اور تم پہاڑ سے کہو کہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو وہ ہٹ جائے گا''، اگر ہم ایمان کی اس طاقت سے بے بہرہ اور بے پرواہوں گے تو مصائب وآلام کے پہاڑ کیا ہٹیں گے، ہم تو ان پہاڑوں کے نیچے دب کر رہ جائیں گے۔ اور یہی کچھ آج ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

ہمارے تنخواہ دار علماء اور مغرب کے ماہرینِ مشرقیات (Orientalists) کی ملی بھگت سے آج کے نام نہاد پڑھے لکھے مسلمان بھی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ جیسی ''عبادات'' ہی کو پورا اسلام سمجھتے ہیں اور وہ اسلام اور ''زندگی کے معاملات'' کے باہمی تعلق سے سراسر غافل ہو چکے ہیں۔ وہ زندگی کے معاملات کو اسلام کی ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسی روحانی قدروں کے حوالے سے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے کیونکہ ان قدروں کی تو کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ وہ زندگی کے معاملات کو اُن اہلِ مغرب کے دُنیوی رویوں کے مطابق سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنھیں وہ ایک طرف تو اپنا دشمن قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف پیروی کے لائق سمجھتے ہیں۔ یہی وہ تضاد ہے جس کے دو پاٹوں میں آج کے مسلمان پس رہے ہیں۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ خداوند کریم کے وہ احکامات ہیں جن پر صدقِ دل سے عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ لیکن ان احکامات کا تعلق عبادات اور اسلام کے ظاہر سے ہے۔ اسلام صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ تکرار معاف، اسلام کے ان ستونوں کی ایک بنیاد بھی ہے اور وہ ہُوا میں نہیں کھڑے۔ ان ستونوں کے اوپر ایک عمارت بھی ہے۔ یہ ستون اس عمارت کے کھنڈرات نہیں۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ہم ان ستونوں کو پانچ الگ الگ دائروں کی شکل میں دیکھتے ہیں جن کا نہ آپس میں کوئی تعلق ہے اور نہ معاملاتِ زندگی سے۔

کروڑوں مسلمان ایسے ہیں جنھیں صرف کلمہ پڑھنا آتا ہے، ان کا نام روایتی مسلمانوں جیسا ہے اور وہ سؤر نہیں کھاتے۔ بس ان کا اسلام اسی میں پورا ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ کلمے کے علاوہ وقتاً فوقتاً نماز بھی پڑھ لیتے ہیں،

Marfat.com

روزہ بھی رکھ لیتے ہیں، حج بھی کر آتے ہیں، زکوٰۃ بھی دے دیتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم ہوں گے جو یہ پانچوں ارکان یا عبادات باقاعدگی سے بجالاتے ہوں اور انکی روح، معنویت اور اہمیت سے بھی واقف ہوں۔ باقی رہیں ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسی روحانی قدریں، ان کا تو انھوں نے نام بھی نہیں سنا ہوتا۔ بہرحال، ''عبادات'' پھر بھی کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں کے ہاتھ میں رہ گئی ہیں لیکن ''معاملات'' ان کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔

ہماری عبادات، اور وہ بھی چند اور محض وقتاً فوقتاً، اُن بے وزن غباروں کے طور پر ہوا میں اڑتی رہ جاتی ہیں جن میں ہائیڈروجن بھری ہوتی ہے لیکن جن کا دھاگا ہمارے ہاتھ سے چھٹتا چلا جاتا ہے۔ معاملات کا تعلق خدا اور انسان کے رشتے، انسان اور انسان کے رشتے اور انسان اور فطرت کے رشتے سے ہوتا ہے۔ یہ وہ رشتے ہیں جنھیں ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی قدروں کو سمجھے اور اپنائے بغیر نہ تو پائیدار بنایا جاسکتا ہے اور نہ تسلی بخش۔ اسلام جیسے دین کو جو انسان کو درپیش تمام معاملاتِ زندگی میں بہترین عملی رہنمائی مہیا کرسکتا تھا پہلے تو نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور کلمے جیسی چند عبادات تک محدود کردیا گیا اور جب ان عبادات سے معاملاتِ زندگی میں کوئی روشنی نہ ملی تو مسلمان صرف نام کا مسلمان رہ گیا اور بالآخر ان عبادات سے بھی غافل اور بے پروا ہوتا چلا گیا۔

جس طرح اسلام نے نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور کلمے کے ستونوں کے اوپر ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی پانچ روحانی قدروں سے وجود میں آنے والی شاندار اور حسین ترین عمارت کھڑی کی تھی اسی طرح خدا نے اس عمارت کے ستونوں کے نیچے انسانیت کی عظیم الشان بنیاد استوار کی تھی جو علم اور روح پر مشتمل تھی۔ کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان کہلانے اور بننے کا حقدار نہیں جب تک پہلے وہ ایک اچھا انسان نہیں بنتا۔

اسلام دراصل انسانیت کے درخت پر ایک پیوند ہے۔ انسانیت کے اس درخت کی دو جڑیں ہیں۔ اوّل، علم جو تخلیقِ آدم کے وقت عَلَّمَ آدَمَ الاَسماء کے حوالے سے خدا نے انسان کو فطرت کے ہر مظہر کی حقیقت جان کر اسے اپنی زندگی کی بقا اور نشوونما کی خاطر کام میں لانے کے لیے عطا کیا تھا۔ جب تک یہ علم مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، وہ دُنیا کے حاکم تھے اور آج ان کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے تو وہ غیر مسلم اہلِ علم کے سامنے ناک رگڑتے اور گڑگڑاتے رہ گئے ہیں۔ دوم، وہ رُوحِ خداوندی جو تخلیقِ آدم کے وقت وَنَفَختُ فِیہِ مِن رُوحِی کے حوالے سے خدا نے انسان میں پھونکی تھی۔ علم اور روحِ خداوندی کی دو نعمتیں خدا نے ہر انسان کو عطا کر رکھی ہیں۔ ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسے معاملاتی اصول اور روحانی قدریں اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمے جیسی عبادات اُس وقت تک پھول پھل نہیں لاسکتیں جب تک وہ علم اور روح کی انسانی جڑوں سے سیراب نہیں ہوتیں۔

اس صورتِ حال کو ایک جملے میں بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ صاحبِ علم ہو، اس کے اندر روحِ خداوندی زندہ و بیدار ہو، ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن اس کا کردار ہوں اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور کلمہ اس کی عبادات ہوں۔

Marfat.com

اس سے پہلے جب آپ نے یہ جملہ پڑھا تھا کہ "اسلام دراصل انسانیت کے درخت پر ایک پیوند ہے" تو ہوسکتا ہے کہ آپ کچھ حیران ہوئے ہوں۔ پیوند کا لفظ دو حوالوں سے استعمال ہوتا ہے۔ کپڑوں، خصوصاً لباس کے حوالے سے یا پھر باغبانی کے حوالے سے۔ "مخمل میں ٹاٹ کا پیوند" جیسے محاوروں نے پیوند کو منفی نوعیت کے معنی دے دیے ہیں۔ اس کے برعکس باغبانی میں پیوند (Grafting) کے معنی واضح طور پر مثبت ہیں۔ انسانیت کے درخت پر اسلام کے پیوند کا ذکر انھی مثبت معنی میں کیا گیا ہے۔ تمام اعلیٰ تر پھول، خصوصاً گلاب اور تمام اعلیٰ تر پھلدار پودے مثلاً قلمی آم اور طرح طرح کا ترشادا (مالٹا، کینو، لیموں) پیوند کاری کا نتیجہ ہیں۔ جنگلی گلاب پر پیوند لگا کر گلاب کی بیسیوں اعلیٰ تر قسمیں پیدا کر لی گئی ہیں جن کے ڈنٹھل لمبے اور پھول حجم میں بڑے ہوتے ہیں۔ ہر کچھ سال بعد خبر آجاتی ہے کہ کسی نایاب رنگ کا گلاب پیدا کر لیا گیا ہے۔ یہی حال آم کی نئی قسموں کا ہے، انور رٹول، چونسا اور ثمر بہشت جیسی قسمیں پیوند کاری ہی کا نتیجہ ہیں۔ ترشادے میں کینو کی ایجاد بھی پیوند کاری ہی سے ممکن ہوئی ہے۔

باغبانی میں پوری احتیاط کی جاتی ہے کہ پھل اُن شاخوں سے حاصل کیا جائے جن کا پیوند لگایا گیا تھا۔ چنانچہ کوشش ہوتی ہے کہ جس اصل پودے کے اوپر پیوند کیا گیا تھا اس میں سے نکلنے والی شاخوں کو کاٹ دیا جائے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بے احتیاطی میں پیوند کی شاخیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور اصل پودے سے پھوٹنے والی شاخیں درخت پر چھا جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ درخت پر پھل تو آتا ہے لیکن وہ کینو نہیں ہوتا بلکہ کھٹی ہوتا ہے جو دراصل تمام ترشادے کی ماں ہے۔

اسلام کی بابت پیوند کی مثال میں دو باتوں کو بہر صورت پیشِ نظر رکھنا ہوگا:

1- یہ پیوند کپڑے کے پیوند کے بجائے باغبانی کے اس پیوند کی مانند ہے جس کے باعث ایک اعلیٰ تر گلاب اور ایک اعلیٰ تر آم یا کینو پیدا کیا جاتا ہے۔ گویا انسانیت کے پودے پر اسلام کے پیوند سے یہ مراد ہے کہ اسلام دراصل انسانیت کی اعلیٰ تر صورت ہے۔ تھوڑی اور وضاحت درکار ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان وہی ہوتا ہے جو عام انسانوں سے اعلیٰ تر انسان ہو۔

2- باغبانی میں پیوند کاری کی مثال سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ تمام تر اہمیت پیوند ہی کو حاصل ہے اور اس پودے کی پروا نہیں کرنی چاہیے جس کے اوپر پیوند لگایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس سے بڑی بیوقوفی اور بے وفائی نہیں کر سکتے کہ وہ انسانیت کی اصل بنیاد یا اس پودے کو نظر انداز کر دیں جس کے اوپر ان کے دین کی عمارت کھڑی ہے۔ اگر انسانیت کا پودا نہ ہو تو اسلام کے پیوند کا وجود ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ انسانیت کا پودا اسلام کی ماں ہے۔ بس جس طرح ہم ماں کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتے اسی طرح انسانیت اور اس کی دو بڑی جڑوں "علم اور روح" کو نظر انداز کر کے ہم صرف اور صرف خودکشی ہی کر سکتے ہیں جو ہم مسلمان آجکل انتہائی خضوع و خشوع سے کر رہے ہیں۔

انسانیت ہی ہمارے شجرِ حیات (The Tree of Life) کا وہ حصہ ہے جسے تنے کا مُنڈھ کہتے ہیں اور جس کے نیچے درخت کی وہ تمام جڑیں ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ آندھیوں، بارشوں اور ہر طرح کے سیلابوں اور طوفانوں میں سر

Marfat.com

اٹھائے کھڑا رہتا ہے۔ درخت کا کوئی محافظ، مالک یا ہمدرد یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ درخت کا مُنڈھ کھوکھلا ہو جائے یا اس کی جڑیں کٹ یا گل جائیں۔ اگر ہم درخت کے بجائے عمارت کی مثال لے لیں تو انسانیت اس عمارت کی بنیاد کا وہ حصہ بھی ہوتی ہے جو زمین کے اندر ہے اور اس بنیاد کا وہ حصہ بھی ہوتی ہے جو زمین کے باہر ہے اور جسے کُرسی (Plinth) کہتے ہیں۔ کُرسی اِس حساب سے رکھی جاتی ہے کہ بارشوں یا سیلاب کے دوران پانی عمارت کے رہائشی حصے میں نہ آئے۔ جس طرح درخت کا مُنڈھ اور جڑیں درست حالت میں نہ ہونے سے شاندار درخت گر جاتا ہے ہُو بہُو اسی طرح انسانیت اور اس کی دو عظیم صلاحیتوں ..... علم الاشیاء اور روحِ خداوندی، کو نظر انداز کرنے سے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن پر مشتمل اسلام کی عمارت بھی گر جاتی ہے۔

انسانیت کے درخت پر اسلام کا پیوند لگانا ضروری تھا تاکہ انسان علم اور روح کی طاقتوں کا غلط استعمال نہ کرے۔ اکیلا علم دوسروں کو لوٹنے اور زر خرید غلام بنانے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اکیلی رُوح انسان کو خدائی کا دعویٰ کرنے کے راستے پر ڈال سکتی ہے۔

آیئے ایک مرتبہ پھر تعصب کی عینک اتار کر تھوڑا اپنے گریبان میں جھانکیں۔ 1975ء سے ساری دنیا میں شور مچا ہُوا ہے کہ اسلام دوبارہ زندہ ہو رہا ہے یا دوسرے لفظوں میں اس کا احیاء (Revival) ہو رہا ہے۔ اس احیاء کا ایک افسوسناک نقشہ اہلِ پاکستان نے دیکھا اور سہا ہے۔ 1977ء کے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کے قائد ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف حزبِ مخالف ''پاکستان نیشنل الائنس'' (PNA) نے ''نظامِ مصطفیٰ'' کے نام سے تحریک چلائی اور پاکستان کی فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت پر قبضہ کر لیا اور گیارہ سال تک اس بہانے وردی پہنے ملک پر کاٹھی ڈالے رکھی کہ میں اسلام لا رہا ہوں۔

جنرل ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر جمہوریت ختم کر دی، عدالتوں کے اختیارات چھین لیے، نظامِ تعلیم میں دورِ حاضر کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیتیں پیدا کرنے کے بجائے فرسودہ نظریات اور ''جھوٹی تاریخ'' شامل کر دی۔ وہ ملک جو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے خالصتاً جمہوری عمل اور عوامی شرکت کے ذریعے سے حاصل کیا تھا اور جس کے بارے میں انھوں نے بار بار واضح ترین الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ یہاں مُلّا شاہی (Theocracy) نہیں ہوگی، اس میں جنرل ضیاء الحق نے وفاقی شرعی عدالت قائم کر کے عملاً ملائیت نافذ کر دی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ جمہوریت میں منتخبہ پارلیمنٹ کو کُلّی اختیار ہوتا ہے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کو کوئی عدالت ردّ نہیں کر سکتی۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کی بنائی ہوئی وفاقی شرعی عدالت کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے زرعی اصلاحات جیسے غریب نواز قانون کو بھی خلافِ شرع قرار دے کر ردّ کر دیا۔

جنرل ضیاء الحق نے اسلام پھیلانے کے لیے کیسے کیسے زبردست کارنامے انجام دیے اس کی ایک ادنیٰ سی مثال ملاحظہ فرمایئے: میڈیکل کالجوں میں داخلہ خاصی مشکل سے ملتا ہے۔ داخلے کے لیے جو ممتحن (Examiners) چُنے گئے

Marfat.com

انھیں ہدایت کی گئی کہ دیندار لڑکے لڑکیوں کو ترجیح دی جائے۔ دین داری میں ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن جیسی قدروں کو یکسر نظر انداز کر کے ہر طالب علم سے دعائے قنوت سنانے کے لیے کہا گیا۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو کئی کئی ہفتوں اور مہینوں سے میڈیکل کتابوں کو کیڑے کی طرح چاٹ رہے تھے، وہ یہ فرمائش سن کر ہکا بکا رہ گئے۔ یاد رہے کہ جنرل ضیاء الحق اور ان کے حامی سیاست دان احمدی اقلیت کے ساتھ انتہائی بُغض رکھتے تھے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے جیسے عام مسلمانوں کے برعکس احمدی کہیں زیادہ باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں۔ دعائے قنوت عشاء کی نماز کے دوران تین رکعت وتروں میں پڑھی جاتی ہے۔ نتیجہ: ہر احمدی لڑکا اور لڑکی انٹرویو میں کامیاب ہو گیا جب کہ بے شمار ایسے مسلمان لڑکے اور لڑکیاں داخلے سے محروم رہ گئیں جو میڈیکل مضامین میں کہیں اعلیٰ پوزیشن رکھتی تھیں۔

یہ ساری کتھا اس لیے بیان کی گئی ہے تا کہ انسانیت اور اسلام کے لازم و ملزوم تعلق کو واضح کیا جا سکے۔ آج علم سے بے گانگی اور کنارا کشی کے باعث مسلمان دنیا کی پسماندہ ترین آبادیوں میں شمار ہو رہے ہیں۔ اسی طرح مذہب کی چند رسوم اور عبادات کو اپنا کر اور مذہب کی اصل روح، ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن سے غافل ہو کر وہ اسلام کی اخلاقی اور روحانی اساس سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ ان کی دُنیوی پسماندگی نے عسکری، سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی میدانوں میں تو انھیں بے حیثیت بنایا ہی تھا، اپنے اندر خدا کی روح کی موجودگی سے غفلت نے انھیں اخلاقی اور روحانی طور پر بھی بے وقعت کر دیا ہے۔ آج کا مسلمان نہ صرف دنیوی بلکہ اُخروی اعتبار سے بھی مفلس ہو چکا ہے اور اس کی دو بڑی وجھوں میں ایک تو یہ ہے کہ اس نے اسلام کو صرف چند عبادات کی رسمی ادائیگی تک محدود کر دیا ہے اور دوسری یہ ہے کہ جس انسانیت کی بنیادوں پر اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی تھی اس نے اس کی اہمیت اور معنویت کو نہ تو سمجھا ہے اور نہ ہی اس کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل بنایا ہے۔ افسوس، آج کا مسلمان، مسلمان تو درکنار ایک اچھا انسان بھی نہیں رہا۔

حال ہی میں، خصوصاً گیارہ ستمبر 2001ء کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیویارک اور پینٹا گون (امریکہ کے محکمۂ دفاع کا دفتر، واشنگٹن ڈی سی) پر اغوا کردہ ہوائی جہازوں سے حملے کے بعد امریکہ کے ردِ عمل کی بنیاد پر اپنی زبوں حالی کے بارے میں مسلمانوں کی تھوڑی بہت آنکھ کھلی ہے۔ افغانستان اور عراق پر امریکی حملے اور ''قبضے'' کے بعد مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہُوا ہے کہ سیموئل ہَن ٹِنگ ٹَن (Samuel Huntington) کی یہ پیش گوئی ایسی غلط بھی نہیں تھی کہ سوویٹ یونین کے ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد امریکہ اب اسلام کو اپنا دشمن سمجھ لے گا۔ مسلمانوں پر یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ امریکہ کے ہزار انکار کے باوجود کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اسلام کے خلاف جنگ نہیں، یہ جنگ ہر پھر کر اسلام اور مسلمانوں ہی کے خلاف ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن اس تمام تر چشم کشائی سے مسلمانوں کو صرف یہ احساس ہُوا ہے کہ انھیں ٹیکنالوجی سیکھنی چاہیے۔ بے شک ٹیکنالوجی اپنی جگہ بہت اہم ہے لیکن ٹیکنالوجی تو سائنسی علوم میں مہارت سے پیدا ہوتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی توجہ علم کی طرف نہیں، صرف علم کے ایک معمولی سے فائدے پر مرکوز ہو گئی ہے اور وہ یہ بھول گئے ہیں کہ علم کے بغیر ٹیکنالوجی کے پیچھے بھاگنے سے وہ ہمیشہ امریکہ اور یورپ کے محتاج رہیں گے۔ ہم آج ان کی جس ٹیکنالوجی کی نقل

Marfat.com

کرنی شروع کریں گے وہ کل اس سے کہیں بہتر ٹیکنالوجی ایجاد کر چکے ہوں گے۔

پھر مغرب نے سائنسی علوم کے مقابلے میں انسانیاتی علوم (Humanities) کو نظر انداز کر کے جس طرح کی بے روح اور سفاک مشینی معاشرت کو جنم دیا ہے اس میں انسانیت اور روحانی قدروں کا دم گھٹتا جا رہا ہے۔ آج مغرب کا ہر صاحب دل یہ پوچھ رہا ہے کہ ''کیوں نہیں ہوتی سحر حضرتِ انساں کی رات''۔ اس لیے کہ اہلِ مغرب کے پاس علم تو ہے، انھیں یہ شعور نہیں کہ ان کے اندر خدا نے اپنی روح پھونک رکھی ہے۔ اصل میں مغرب، خصوصاً یورپ میں اپنے اندر روح کی موجودگی کا شعور تو کیا ہونا تھا ان کے نزدیک تو خدا ہی مر چکا ہے۔ مغرب سے دشمنی اور اسی مغرب کی تقلید سے مسلمانوں کو پشیمانی اور نامرادی کے سوا کیا حاصل ہوگا؟ کیا وہ یہ دیکھنے سے قاصر ہیں کہ روحِ خداوندی کے شعور اور روحانی قدروں کے بغیر مغربی ٹیکنالوجی ''آدم خور ٹیکنالوجی'' بن جاتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے وہی راستہ بہتر ہے جسے اُن کے رحمان و رحیم خدا نے صراطِ مستقیم کا نام دیا ہے اور جس پر رحمۃ للعالمین محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی پامردی اور خوبصورتی سے چل کر قدم قدم پر اپنے عملِ صالح سے ایسے ایسے مینارِ نور تعمیر کیے ہیں کہ یہ راستہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح تابناک ہے جیسا آپؐ کے مبارک دور میں تھا۔ یہ راستہ انسانیت کی دو متوازی پٹریوں.... ایک علم الاسماء (The Knowledge of the Nature of Things) اور دوسری روحِ خداوندی.... پر آگے سے آگے اور اس سے بھی آگے پھیلتا چلا جاتا ہے۔ خدا نے اس راستے کو تخلیقِ آدم کی دلچسپ اور دلگداز داستان سے اُجاگر کیا تھا۔ رسُولِ خدا نے اس راستے کے ایک جزوِ اعظم ''علم'' کی بنیاد پر اسلام کو دینِ فطرت اور دینِ انسانیت کے طور پر ترتیب دیا۔ آپ نے اس راستے کے دوسرے جزوِ اعظم.... ''روحِ خداوندی'' کی بنیاد پر اسلام کو ایک ایسے دین کی شکل دی جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان حائل ان تمام دیواروں کی مسمار کر دیتا ہے جو دنیا کے جھوٹے خداؤں، نمرودوں، شدّادوں، فرعونوں، پُر تکبر بادشاہوں، سر پھرے آمروں، مذہبی ٹھیکیداروں، پیرانِ کلیسا اور استحصالی طبقوں (Exploiter Classes) نے کھڑی کر رکھی ہیں۔

علم اور روحِ خداوندی کی ان دو پٹریوں ہی پر اسلام کی ریل گاڑی نے آگے بڑھنا ہے۔ یہ پٹریاں انسانوں کی تمام قوموں کے لیے کھلی ہیں۔ ہر قوم اپنی اپنی گاڑی ان پر چلا سکتی ہے۔ محمدؐ رسول اللہ نے ان پٹریوں پر خدا کی جانب سفر (الی مھاجر ''اِلیٰ ربی 29:26، وَ اَنَّ اِلیٰ رَبِّکَ الْمُنْتَھیٰ 53:42) کے لیے جو گاڑی چنی وہ وہی تھی جس پر ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ نے سفر کیا تھا اور خدا نے اس کا نام اسلام رکھ دیا تھا (5:3)۔ آپؐ نے اس گاڑی کو پانچ ایسے ڈبے لگائے جن کے مسافر ہر وقت آپس میں گھل مل سکتے تھے۔ یہ پانچ ڈبے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کہلاتے ہیں اور ان میں بیٹھے ہوئے مسافر مجسم ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے دل کی ہر دھڑکن میں لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کا کلمہ سنائی دیتا ہے، وہ نمازی ہیں رمضان میں روزے رکھتے ہیں، حسبِ توفیق حج کرتے ہیں اور خدا کے عطا کردہ مال سے ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات بھی دیتے ہیں۔

Marfat.com

پانچواں حصہ

دِین اور دُنیا، ایک ساتھ

Marfat.com

Marfat.com

انیسواں باب

رُوحانیت اور دُنیوی کامیابی

کامیابی ہو یا خوشی، اِن کا تعلق بظاہر ہماری دُنیوی اور مادّی زندگی سے ہے۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ان کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ روحانی شخصیات کے بارے میں لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ دُنیوی اعتبار سے اوّل تو ناکام اور بہت ہُوا تو گزارے لائق کامیاب ہوں گی۔ رہی خوشی یا مسرت، تو مذہب سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ ہنسی تو دُور کی بات ہے، مسکراہٹ سے بھی پرہیز کرتے ہیں۔ انھیں مجبوراً مسکرانا پڑ جائے تو ہونٹ بھینچ کر مسکراتے ہیں کہ کہیں ان کے دانت نظر نہ آجائیں۔ اُن کے برعکس، تاریخ گواہی دیتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ رہی کامیابی تو کسی بھی مسلمان کے نزدیک رسُولؐ خدا سے بڑھ کر کون کامیاب ہو سکتا ہے۔ آپ کو خدا نے آپ کی زندگی ہی میں شاندار کامیابی بخش دی تھی۔ وہ سرزمینِ عرب جو قبائلی رقابتوں اور دشمنیوں کے ہاتھوں نفاق، نفرت اور افراتفری (Anarchy) کی بدترین مثال بن چکی تھی، آپؐ کے مبارک ہاتھوں سے خدائے واحد کے نام پر وحدت کا گہوارہ بن گئی۔ آپؐ نے اپنی زندگی ہی میں اس ریاست کو مدینے کی گلیوں سے نکل کر عرب کے سمندری ساحلوں تک پھیلتے، پھولتے اور پھلتے دیکھ لیا تھا۔

خدا کے دو برگزیدہ پیغمبروں، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی بادشاہت بھی تاریخِ انسانیت میں مثالی تھی۔ سلیمانؑ کو تو خداوند تعالیٰ نے خشکی کے علاوہ سمندری اور فضائی مخلوقات ہی نہیں، جنّات پر بھی قدرت عطا فرمائی تھی۔ پھر یوسفؑ کی دُنیوی کامیابی کی کہانی تو خدا نے قرآنِ حکیم کی ایک مفصل سورت کی صورت میں بیان کی ہے اور اسے احسن القصص (سب سے بہتر کہانی) قرار دیا ہے۔ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ یہ چاروں عظیم مسلمان بزرگ اسلامی ریاست کے خلیفہ بنے۔ رسُولؐ خدا کے بعد ان چاروں سے بڑھ کر کون سی روحانی شخصیت ہوگی اور خلافت سے بڑا کون سا دُنیوی اعزاز ہوگا؟ ان چاروں محبانِ نبی کی زندگی بھی اس ایک حقیقت کا اعلان ہے کہ روحانیت اور دُنیوی کامیابی میں کوئی تضاد نہیں۔

''لیکن''؟

جی ہاں، یہاں ایک بہت بڑا ''لیکن'' ہماری توجہ کا پورا پورا مستحق ہے۔

روحانیت اور دُنیوی کامیابی میں بے شک کوئی تضاد نہیں لیکن روحانی طور پر زندہ و بیدار انسان کا مقصدِ حیات کبھی دُنیوی کامیابی نہیں ہوتا۔ اُس کا مقصد اِس ارشادِ خداوندی کے تحت، خدا کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا کہ ''اے انسان تیرا منتہیٰ و مقصود صرف اور صرف خدا ہے'' (وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی، 53:42)۔ روحانی طور پر زندہ و بیدار شخص خدا کی تلاش میں اُیمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی مسافرت پر نکلتا ہے۔ اس راہ میں ہزار ابتدائی رکاوٹوں، تکلیفوں،

Marfat.com

مصیبتوں اور ناکامیوں کے باوجود جب وہ صبر واستقلال سے آگے بڑھتا رہتا ہے تو خدا کے ازلی وابدی اصول کے عین مطابق اسے شاندار اور پائیدار کامیابی عطا ہو جاتی ہے۔ دُنیوی کامیابی کو مقصدِ حیات سمجھنے والا انسان دُنیا تو حاصل کر لیتا ہے لیکن آخرت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے (2:200)۔ اس کے برعکس آخرت کی فکر کرنے والے کو خدا آخرت کے ساتھ ساتھ دُنیا بھی عطا کر دیتا ہے (2:201-2)۔

کامیابی ہی کی طرح خوشی کا بھی روحانیت سے کوئی تضاد نہیں لیکن کامیابی ہی کی طرح خوشی بھی روحانی طور پر زندہ و بیدار انسان کا مقصدِ حیات نہیں ہو سکتی۔ امریکہ میں خوشی کی تلاش (The Pursuit of Happiness) کو اس کے ''اعلانِ آزادی'' (The Declaration of Independence) کے آغاز میں زندگی، آزادی اور مساوات کے ساتھ ساتھ ایسے انسانی حقوق میں شمار کیا گیا ہے جو خدا نے ہر انسان کو عطا کر رکھے ہیں اور جنھیں کوئی نہیں چھین سکتا۔ لیکن یہ بھی ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جب لوگ خوشی کی تلاش میں خود خدا کو اور اس کے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے پانچ اصولوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں تو ان کی عمر بھر کی محنت اور لگن کا حاصل خوشی کے بجائے ناخوشی، مایوسی اور افسردگی (Depression) نکلتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی خوشحال ترین آبادیوں پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں۔ اب تو ان آبادیوں میں تقریباً آدھے سے زیادہ بچوں اور لڑکے لڑکیوں کو بھی افسردگی کی دواؤں پر پالا جا رہا ہے۔ حقیقی اور دیرپا مسرت صرف اور صرف اِس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان مسرت کو اپنا مقصود و منتہیٰ نہ بنائے بلکہ ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی مسافرت اختیار کرے جس کا انجام ہمیشہ سچی اور پائیدار کامیابی کے ساتھ ساتھ حقیقی اور پائیدار مسرت کی صورت میں ہوتا ہے۔

کامیابی ہو یا مسرت، حاصلِ گفتگو یہی ہے کہ انھیں مقصودِ حیات بنانے سے معمولی اور عارضی کامیابی اور مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن خدا کو منتہیٰ و مقصود بنانے اور اس تک پہنچنے کے لیے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کا راستہ اختیار کرنے سے حقیقی اور پائیدار کامیابی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔

یہ ہمارا دعویٰ نہیں، اِس کائنات، ہماری اِس دنیا اور ساری انسانیت کے خالق، ربّ العزت کا وعدہ ہے جس سے محکم تر وعدہ وفا کرنے والا کوئی نہیں۔ آیئے قرآنِ حکیم میں غوطہ لگائیں اور دیکھیں کہ جو لوگ ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی راہ پر چلتے ہیں انھیں کس طرح کی زندگی اور کس طرح کی جنت نصیب ہوتی ہے۔ پہلے کامیابی کے بارے میں خدا کے چند ارشادات ملاحظہ فرمایئے:

1- کامیاب وہی ہے جو آخرت میں دوزخ کی آگ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی متاعِ دنیا، تو وہ محض عارضی دکھاوا ہے (3:185)۔

2- جس نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی اسے عظیم کامیابی حاصل ہوئی (33:71)۔

3- جب اہلِ ایمان پر خدا کا فضل ہوتا ہے تو منافقین کہتے ہیں، کاش ہم نے اہلِ ایمان کا ساتھ دیا ہوتا تو

Marfat.com

ہمیں بھی عظیم کامیابی حاصل ہو جاتی (4:73)۔

4- یہ وہ دن (حشر) ہے جب اہلِ صداقت کو صداقت نفع دیتی ہے۔ان کے لیے ایسی جنتیں (باغات) ہیں جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا ان سے راضی ہُوا، وہ خدا سے راضی ہوئے، یہی عظیم کامیابی ہے (5:119)۔

5- جس شخص نے زمین و آسمان کے خالق کو اپنا سرپرست بنایا اور اس کے آگے سر جھکایا اور حشر کے دن سزا سے بچ گیا گویا خدا نے اس پر رحمت کردی اور اسے نمایاں کامیابی عطا فرمادی (6:14-16)۔

6- ایمان رکھنے والے مردوں اور عورتوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے اندر نہریں بہتی ہوں گی اور وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ان سدابہار باغوں میں ان کے لیے پاک و صاف قیام گاہیں ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی اور یہی عظیم کامیابی ہے (9:72)۔

7- خدا نے اہلِ ایمان سے جنت کے بدلے میں ان کی جان و مال خرید لیے ہیں۔اہلِ ایمان خدا کی راہ میں لڑتے، مرتے، مارتے ہیں۔ خدا نے تورات، انجیل اور قرآن میں پختہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں جنت عطا کرے گا۔اور خدا سے بڑھ کر اپنا وعدہ پورا کرنے والا تو کوئی ہے ہی نہیں۔اے اہلِ ایمان خدا کے ساتھ یہ سودا چکانے پر خوشیاں مناؤ۔اور یہی عظیم کامیابی ہے (9:111)۔

امید ہے یہ چند آیات بطور نمونہ کافی ہوں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا بنیادی پیغام ہی یہ ہے کہ خدا کی راہ پر چلنے والوں کا انجام عظیم کامیابی اور سچی خوشی ہے۔اس خیال سے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی راہ پر چلنے والوں کو صرف مرنے کے بعد ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے، یہاں ایک وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔آخرت سے مراد مرنے کے بعد ہی کا وقت نہیں بلکہ حال سے آگے کا وقت ہے جس میں مرنے کے بعد کا وقت بھی شامل ہے۔اس حقیقت کی سب سے بڑی مثال رسُولِ خدا کی زندگی ہے جس کے دوران ہزار دقتوں اور دشواریوں کے باوجود فتح مکہ کا وہ دن آگیا جب آپ کو اور آپؐ کے رفقاء کو دُنیوی زندگی ہی میں اتنی عظیم کامیابی سے نواز دیا گیا۔

قرآنِ حکیم کی بالکل شروع میں نازل ہونے والی آیات میں خدا نے رسُولِ خدا کو آخرت نہیں، مستقبل بلکہ مستقبلِ قریب میں کامیابی کی بشارت دے دی تھی مثلاً ''اور جلد ہی تمھارا رب تمھیں وہ کچھ عطا کردے گا کہ تم نہال ہو جاؤ گے'' (93:5)۔اس عظیم الشان آیت میں جو دلداری میں ثانی نہیں رکھتی، خدا نے آخرت نہیں ''سَوفَ'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا سیدھا سادہ مطلب ''جلد'' ہوتا ہے۔تھوڑی تکرار معاف فرمادیں تو قرآنِ حکیم کی وہ تین آیات اصل الفاظ اور ترجمے کے ساتھ دہرادی جائیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ خدا ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے حاملوں اور عاملوں کو صرف آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی کامیابی عطا فرماتا ہے:

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ آتِنا فِي الدُّنيا وَ مَا لَهُ فِي الآخِرةِ مِن خَلاقٍ (2:200)۔

Marfat.com

اور لوگوں میں کوئی کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو کہتا ہے، اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں سب کچھ دے دے۔ ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

وَ مِنهُم مَن یَقُولُ رَبَّنَآ آتِنا فِی الدُّنیا حَسَنَۃً وَ فِی الآخِرۃِ حَسَنَۃً وَقِنا عَذابَ النَّار (2:201)۔

اور اُن میں سے کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے، اے ہمارے رب! ہمیں دنیا کی بھلائی بھی دے اور آخرت کی بھلائی بھی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔

اُولٰـئک لَھُم نصیب" مِمَّا کَسَبُوا ، وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الحِسَاب (2:202)۔

ایسے لوگ اپنے اعمال کے مطابق دُنیا اور آخرت دونوں میں حصہ پائیں گے اور خدا کو حساب کرتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

کامیابی کے بعد خوشی کے بارے میں بھی خدا کی رائے سن لیجیے۔ مگر ذہن میں رکھیے کہ جنت میں کوئی شخص ایسا کوئی کام نہیں کرتا یا کرسکتا جو خدا کو ناپسند ہو یا اہلِ ایمان کے لیے دُنیا میں غیر مناسب ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ جنت کا ہر عمل اہلِ دنیا کے لیے پیروی کے لائق ہے۔

1- روزِ حساب کسی ذی روح کے ساتھ ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں کی جائے گی بلکہ اسے اسی عمل کا بدلہ ملے گا جو اس نے دنیا میں کیا ہوگا۔ اس دن جنت کے مستحق لوگ خوشیاں منانے میں مشغول ہوں گے (36:54-55)۔

2- قیامت کے روز ایسا وقت آپڑے گا کہ لوگوں کو اپنے سوا کسی کا ہوش نہیں ہوگا۔ مگر اس روز کچھ چہرے ایسے بھی ہوں گے جو خوشی سے دمک رہے ہوں گے۔ وہ ہشاش بشاش اور خوش وخرم ہوں گے۔ جبکہ اس دن کچھ چہروں پر خاک اڑ رہی ہوگی اور سیاہی چھائی ہوگی۔ یہ کافر اور فاجر لوگ ہیں (80:37-42)۔

آپ نے یقیناً غور فرمایا ہوگا کہ اہلِ ایمان کے چہرے کیسے ہوتے ہیں اور کافروں اور فاجروں کے چہرے کیسے۔ افسوس کہ ہم دُنیا میں مذہب سے لگاؤ رکھنے والوں کے چہروں پر ایمان کا نور تو کم دیکھتے ہیں البتہ نیکی کے غرور میں رعونت اور کرختگی زیادہ پاتے ہیں۔ مسکراہٹ تو دور کی بات ہے، ماشاء اللہ غصے میں تیوری چڑھی رہتی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ جس رسولِ مقبولؐ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کی بابت ان کے ہمراہیوں (صحابۂ کرامؓ) نے یہ گواہی دی ہے کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی اور آپ کی خندہ پیشانی کا دُور دُور شہرہ تھا۔

یہی نہیں آپ کرختگی کے برعکس خندہ پیشانی، نرمی اور نرم گوئی کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔ آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ "تُرش رو انسان کا نیکی سے دُور کا بھی تعلق نہیں"۔ عبداللہؓ بن حارث سے روایت ہے: "میں نے رسولِ خداؐ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا"۔ ایک اور صحابی جریرؓ نے کہا تھا: "میں نے رسولِ خدا کو جب دیکھا، مسکراتے دیکھا"۔ اور اب اپنے پیارے رسولؐ کے بارے خدا کا محاکمہ بھی سن لیجیے: "اے محمدؐ، یہ خدا کی خصوصی رحمت ہے کہ تم لوگوں سے نرمی برتتے ہو۔ اگر تم کرخت مزاج یا تنگ دل ہوتے تو لوگ تمھارے گرد جمع ہونے کے بجائے تمھیں چھوڑ

Marfat.com

جاتے" (3:159)۔ غور فرمایئے، کہ آج ہماری نئی نسلیں کیوں اسلام سے روگردانی کر رہی ہیں؟ یقیناً اس میں مذہب کے ٹھیکیداروں کی کرختگی کا پورا پورا دخل ہے۔

فیض احمد فیض نے علمائے کرام کے برعکس رسُولِ خدا کے وتیرے کا یہ نقشہ کھینچا تھا:

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ

از اشک تر ز دردِ غریباں ردائے تو

(قہر و ملامت سے مُلا کی زبان آگ اُگل رہی ہے جب کہ اے رسُولِ پاک آپ کی چادر غریبوں کے درد میں آنسو بہانے سے بھیگ چکی ہے)

یہ واقعہ مستند تاریخِ اسلام کا حصہ ہے کہ ایک روز محمد مصطفیٰؐ اور علی المرتضیٰؓ آمنے سامنے بیٹھے کھجوروں سے ناشتہ کر رہے تھے۔ رسُولِ خدا ہر کھجور کھانے کے بعد اس کی گٹھلی چپکے سے علیؓ کے آگے رکھ دیتے تھے۔ جب کھجوریں ختم ہوگئیں تو رسُولِ خدا نے اہلِ خانہ کو متوجہ کر کے ازراہِ مذاق فرمایا، "ساری کھجوریں تو علیؓ نے اکیلے کھائی ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے آگے گٹھلیوں کی ڈھیری پڑی ہے جبکہ میرے آگے ایک بھی گٹھلی نہیں"۔ اس پر تمام گھر والے خوب ہنسے (یاد رہے کہ علیؓ لڑکپن سے بلوغت تک رسُولِ خدا ہی کے گھر میں پلے تھے)۔ اس پر علیؓ نے برجستہ کہا، "نہیں نہیں، یہ بات نہیں کہ آپؐ نے کھجوریں نہیں کھائیں۔ بات یہ ہے کہ آپؐ تو کھجوروں کے ساتھ ان کی گٹھلیاں بھی کھا گئے ہیں"۔ اس پر سارا گھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔ شکر ہے کہ اس وقت وہاں کوئی آج کے دور کا تیوری چڑھا مولانا موجود نہیں تھا ورنہ رسُولِ خدا اور علیؓ پر، نعوذ باللہ، جھوٹ بولنے کے الزام میں کفر کا فتویٰ لگا دیتا۔

رسُولِ خدا کی زندگی کے دو واقعات اور سُن لیجیے۔ آپؐ سے ایک بوڑھی عورت نے دُعا کی فرمائش کی کہ وہ جنت میں چلی جائے۔ آپؐ نے فرمایا، "اوہو، جنت میں تو کوئی بڑھیا جا ہی نہیں سکتی"۔ بوڑھی عورت نے تو آزردہ ہونا ہی تھا، تمام حاضرینِ محفل بھی دنگ رہ گئے۔ آپؐ نے ہنس کر کہا، "بی اماں، فکر نہ کرو تم جنت میں جاؤ گی مگر جوان حالت میں جاؤ گی۔ بڑھیا کے ساتھ ساتھ سب حاضرین ہنسنے لگے۔

رسُولِ خدا سے ایک غریب شخص نے کہا، "حضورؐ مجھے سفر پر جانا ہے لیکن میرے پاس سواری نہیں۔ ازراہِ کرم مجھے ایک اونٹ مہیا کر دیا جائے"۔ آپؐ نے کسی ساتھی سے کہا، "اسے اونٹ کا ایک بچہ دے دو"۔ سائل کے ساتھ ساتھ حاضرینِ محفل بھی حیران رہ گئے کہ اونٹ کے بچے پر کیسے سفر کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے ہنس کر فرمایا، "بڑے سے بڑا، اونٹ بھی کسی نہ کسی اونٹ کا بچہ ہی تو ہوتا ہے"۔ وہ شخص خوش ہو گیا اور محفل زعفران کا کھیت بن گئی۔

کفر کے فتوے سے یاد آیا کہ ہمارے علمائے اکرام نے اکثر صوفیائے کرام کو اس اعزاز سے نواز رکھا ہے کیونکہ ان کے درباروں یا ڈیروں پر تُرش روئی نہیں، خندہ پیشانی کا راج ہوتا ہے۔ یہ رسُولِ خدا کی پیروی میں اُن کی خندہ پیشانی اور نرم گوئی ہی کا کرشمہ ہے کہ اسلام دنیا بھر میں پھیل گیا ورنہ علمائے کرام کی تیوری اور کرختگی نے تو مسلمانوں پر بھی کفر کے

Marfat.com

فتوے لگا کر انھیں کافر بنایا ہے۔ اکثر علماء کی خصوصی مہارت (Speciality) تو ہے ہی کافر سازی۔ ان علماء کے بس میں ہوتا تو آج خود ان کے سوا دُنیا میں کوئی مسلمان نہ ہوتا۔ کئی صوفیاء کے تذکروں میں اس طرح کی صورتِ حال بیان ہوئی ہے جب کسی عالمِ دین نے کسی صاحب حال صوفی کو کفر کے فتویٰ سے نوازا تو صوفی نے یہ کہہ کر بات ٹال دی، ''تم مجھے کافر کہتے ہو، اس لیے میں تمھیں مومنِ صادق کہہ دیتا ہوں۔ حساب برابر ہُوا''۔ حساب اس لیے برابر ہُوا کیونکہ جتنا بڑا جھوٹ عالمِ دین نے بولا تھا، اتنا ہی بڑا جھوٹ صوفی نے یہ کہہ کر بولا تھا کہ وہ عالمِ دین مومنِ صادق ہے۔

آپ ہنس رہے ہیں؟ ہنسیے۔ خوش ہونا اور خوشی کا مہذب اور شائستہ اظہار عین سُنتِ رسولِ مقبولؐ ہے اور اگر آپ دنیا میں خوش ہونے اور خوش کرنے کا فن نہیں سیکھیں گے تو مسرت دشمن علماء کی طرح آپ کا داخلہ بھی جنت میں بند کر دیا جائے گا۔ یہ بات کس نے کہی تھی، یہ تو اس وقت یاد نہیں آ رہا لیکن بات کچھ ٹھیک ہی لگتی ہے۔

آیئے اب دورِ حاضر کے ایک غیر مسلم اصول پسند اور روحانیت نواز مصنف سے پوچھتے ہیں کہ کامیابی اور خوشی کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ غیر روحانی غیر مسلموں نے کامیابی کی دیوی اور خوشی کے دیوتا پر بیسیوں نہیں سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں نچھاور کر دی ہیں۔ لیکن ہمیں تو اُس کامیابی اور خوشی کی تلاش ہے جو بے معنی اور عارضی نہ ہو بلکہ حقیقی اور پائیدار ہو۔ اس شعبے میں بھی گزشتہ بیس پچیس سال کے دوران جن چند مصنفین نے قابلِ قدر کام کیا ہے، ان میں سٹیفن کووی (Stephen Covey) سرِ فہرست ہے۔ کووی نے The Seven Habits of Highly Effective People (انتہائی موثر لوگوں کی سات عادتیں) کے عنوان سے اپنی نہایت اعلیٰ کتاب میں صدیوں پرانے اصول ''دیانت داری بہترین حکمتِ عملی ہے'' (Honesty is the Best Policy) کو دورِ حاضر میں بھی اُسی طرح کارگر ثابت کیا ہے جیسے وہ مختلف تہذیبوں کے سنہری ادوار میں کارگر تھا۔ وہ اس مفروضے پر ایمان رکھتا ہے کہ اس پوری دُنیا میں ''کمال'' وہیں نظر آئے گا جہاں کوئی صراطِ مستقیم پر چل رہا ہوگا۔

کووی نے یہ کتاب اسی مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے لکھی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے یہ ثابت کر دکھایا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شخصیت اور کردار کے فرق کو اُجاگر کر کے بتایا ہے کہ آج کے دور میں شخصیت کی تعمیر، نشوونما اور غلبے نے انسان کے ''ظاہری خول'' کو تو بہت مضبوط اور نمایاں کر دیا ہے لیکن اس خول کے اندر کردار کی صورت میں جو اصل پھل یا جوہر تھا اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس طرح مذہب کا ظاہری خول قانون اور عبادات ہیں اور اس کا باطن اور اصلیت روحانیت اور معاملات ہیں اور اگر ظاہری خول ہی بُرا بھلا باقی رہ جائے اور باطن اور اصلیت پر توجہ ہی نہ دی جائے تو وہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو عالمِ اسلام میں پیدا ہو چکی ہے کہ (تکرار معاف) ''رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالیؓ نہ رہی''۔ اسی طرح اگر ساری توجہ اس بات پر مرکوز کر دی جائے کہ ہم دوسروں کو کیسے لگ رہے ہیں، دوسروں کو اپنے مقاصد کے لیے کیسے استعمال کر سکتے ہیں اور ان کو نا کام کر کے خود کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں تو اس سے ہماری شخصیت تو بڑی مرعوب کُن ہو جائے گی لیکن انسانی قدروں کو سخت نقصان پہنچے گا اور بالآخر ہم ایک ایسا معاشرہ بن کر

Marfat.com

رہ جائیں گے جو خود غرض، سفاک، بے انصاف اور بے کردار ہوگا۔

مغرب میں میکیاولی (Machiavelli) سے لے کر ڈیل کارنیگی (Dale Carnegie) تک، کردار کو نظر انداز کر کے شخصیت سازی پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ آج مغربی تہذیب اپنی تمام تر مادّی ترقی کے باوجود اندر سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔ اگر اس نام نہاد مسیحی تہذیب کی حالت پر بے لاگ تبصرہ کرنا مقصود ہو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے جو ہم پہلے بھی دہرا چکے ہیں کہ "اُس شخص نے کیا کمایا، جس نے ساری دنیا فتح کر لی لیکن اپنی روح گنوا بیٹھا"۔ سٹیفن کووی نے ثابت کیا ہے کہ شخصیت کی ظاہر داری کے مقابلے میں کردار کی اصول پرستی کہیں زیادہ مؤثر ہے۔ اس سے صاحب کردار انسان کو نہ صرف کامیابی حاصل ہوتی ہے، اسے عزت، نیک نامی، اطمینانِ قلب اور حقیقی مسرت بھی نصیب ہوتی ہے۔ پھر اس سے صرف صاحب کردار فرد ہی نہیں، اس کی مثال سے متاثر ہو کر معاشرہ بھی مثبت، صحت مند اور زندگی افروز خطوط پر آگے بڑھنے لگتا ہے۔

کووی کے مطابق جن لوگوں نے زندگی میں ایسا باعزت اور مؤثر مقام حاصل کیا ان میں سات عادتیں پائی جاتی ہیں اور ان میں سے ہر عادت دراصل کچھ اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔

انفرادی کامیابی

1- باعملی، ذاتی دیدہ وری کے اصول
2- آخرت کے پیشِ نظر آغاز، ذاتی قیادت کے اصول
3- ترجیحات کا تعین، ذاتی نظم و ضبط کے اصول

اجتماعی کامیابی

4- سب کی جیت، باہمی انحصار کے اصول
5- پہلے سمجھو پھر سمجھاؤ، ہم نفس ابلاغ کے اصول
6- چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کر چلو، تخلیقی تعاون کے اصول

تجدید

7- جوہر کو جلا بخشو، صلاحیتوں کی تجدید کے اصول

انسان عام طور پر "عادت" کو ایک معمولی بات سمجھ کر اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا۔ لیکن غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ہم اپنی عادتوں کے مجموعے کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ ان معنوں میں ارسطو کی کہی ہوئی صدیوں پرانی بات آج بھی پوری طرح درست ہے کہ "ہم وہی کچھ ہیں جو ہم بار بار کرتے رہتے ہیں"۔ چنانچہ اگر ہم صاحبِ کمال ہیں تو ہمارا کمال

Marfat.com

کوئی وقتی عمل نہیں بلکہ ہماری عادت ہے اور اگر ہم بے ہنر ہیں تو ہماری بے ہنری بھی کوئی وقتی عمل نہیں بلکہ ہماری عادت ہے۔ پکی عادت کو اسی لیے خصلت یا فطرتِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ پکی عادت جب واقعی ہماری خصلت یا فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے تو اس میں صبر اور مستقل مزاجی خود بخود شامل ہو جاتی ہے۔ اگر دیانت داری ہماری فطرتِ ثانیہ بن جائے اور ہم دیانت داری پر صبر واستقلال کے ساتھ کاربند ہو جائیں تو گویا ہم کامیابی کے لیے قرآنِ حکیم کی ''اِن کُنتم صابرین'' والی شرط بھی پوری کر دیں گے۔

اب ہم کوشش کریں گے کہ کووی کی بیان کردہ سات عادتوں اور اصولوں میں اپنی تاریخ اور اپنے حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں اس طرح رنگ بھریں کہ ہمارے لیے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کا صراطِ مستقیم واضح تر ہو جائے اور اس پر چلتے ہوئے ہمیں دِقت اور پریشانی کے بجائے آسانی اور اطمینان نصیب ہو اور ہم دنیا اور آخرت، دونوں میں کامیاب بھی ہوں اور خوش بھی۔

آیئے ان عادات اور اصولوں پر ذرا تفصیل سے بات کریں۔

Marfat.com

بیسواں باب

باعمل دیدہ وری

بے روح کامیابی کے لیے نہیں، انسانی اور روحانی قدروں پر استوار ہونے والی کامیابی کے لیے ہمیں پہلی عادت یہ اپنانی ہوگی کہ ہم ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی'' کی روشنی میں اپنے لیے وہ میدانِ عمل چنیں جو ہماری خداداد صلاحیتوں، ہماری روح یا ہماری فطرت کے مطابق ہو۔ ہمارے یہاں صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے کہ شادی کی طرح ہمارے لیے پیشہ یا کام بھی ہمارے والدین ہی طے کر دیتے ہیں۔ اوّل تو ہندوؤں کے ہمسایہ ہوتے ہوئے ''ذات پات'' کا سایہ اس حد تک ہم پر بھی مسلط رہا ہے کہ جو باپ دادا کرتے آئے تھے سو ہم بھی کرتے چلے گئے۔ پھر ماں باپ کی ادھوری خواہشیں بھی ہمیں ہی پوری کرنی تھیں۔ ماں ڈاکٹر نہ بن سکی تھی اس لیے بیٹی کو لازماً ڈاکٹر ہی بننا پڑے گا حالانکہ بیٹی کی خداداد صلاحیتوں اور روح کا تقاضا تھا کہ وہ موسیقی میں نام پیدا کرے۔ یہاں معاشرہ بھی دخل انداز ہو جاتا ہے۔ ہیں؟ موسیقی؟ موسیقی تو شریف زادیوں کا کام نہیں۔

یہ ایک سنگین اور دردناک حقیقت ہے کہ ہم اپنی روح اور فطرت کے مطابق نہیں، معاشرے کے بنائے ہوئے معیاروں کے پیشِ نظر طرزِ زندگی اپنا لیتے ہیں۔ ''لوگ کیا کہیں گے''؟ ہم اُن فرضی یا حقیقی لوگوں کی رائے پر اپنی زندگی اور خداداد صلاحیتوں کو قربان کر دیتے ہیں جنھیں اتنی بھی پروا نہیں ہوتی کہ ہم زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ ہم عمر بھر اُن میدانوں میں محنت مشقت کرتے رہتے ہیں جن کا ہماری روح، فطرت اور خداداد صلاحیتوں یا جوہر (Talent) سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

خدا نے انسان کو با اختیار بنایا ہے اور اس سے صرف اپنی بندگی چاہی ہے اور وہ بھی خوش دلی سے۔ انسان کو اختیار ہے کہ وہ خدا کی بندگی کرے یا نہ کرے لیکن کرے گا تو خود اس کے لیے اچھا ہوگا۔ انسان اپنا اختیار دوسروں کو دے کر انسانیت ہی سے فارغ ہو جاتا ہے۔ اس اختیار کا تقاضا ہے کہ انسان جو کرنا یا بننا چاہتا ہے اس کے انتظار میں نہ بیٹھا رہے بلکہ خود اس کی جانب قدم بڑھائے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ صحیح معنوں میں ''باعمل'' (Pro-active) کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات انسان کا مقصد معاشرے کے معیاروں پر پورا نہیں اترتا یا ان کے برعکس ہوتا ہے۔ لیکن صاحب اختیار انسان، جو باعمل بھی ہو، اپنے اندر جھانک کر کسی بات یا کام کو صحیح سمجھتا ہے تو معاشرے کی پروا کیے بغیر اسے اپنا لیتا ہے اور پورے استقلال سے اسے بہتر سے بہتر طور پر انجام دینے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس کام میں اسے نہ صرف کامیابی بلکہ کمال حاصل ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

تمام بڑے بڑے نظریے، فلسفے، دریافتیں، ایجادات اور تخلیقات اسی طرح جنم لیتی رہی ہیں۔

رسُولِ خدا نے اسلام کی تبلیغ شروع کی تو آپؐ کے معاشرے نے اسے اتنی شدت کے ساتھ رَدّ کیا کہ تیرہ سال تک اپنی جنم بھومی، مکّے میں اپنے بھائی بندوں، دوست احباب اور شہرداروں کو ان کی اپنی زبان، عربی میں تمامتر فصاحت و بلاغت اور بے مثال محبت اور شفقت کے ساتھ خدا کی راہ دکھاتے رہے اور انجام؟ تیرہ سال بعد آپ علی کو اپنی چادر اوڑھا کر اپنی چارپائی پر سُلا کر، ابوبکر کو ساتھ لے کر رات کے اندھیرے میں سفر کرتے اور دن کو غاروں میں پناہ لیتے ہوئے مدینے کی جانب ہجرت کر رہے تھے۔ لیکن پھر کیا ہُوا؟

پھر وہ دن آ گیا کہ آپؐ کے دشمنِ جاں قریش نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور مکّہ فتح ہو گیا، پورا عرب ایک قوم میں ڈھل گیا اور اسلام عرب کی حدوں سے نکل کر باقی دنیا کی طرف چل نکلا۔ ایک مثال اور: خدیجہؓ اور علیؓ تو خیر رسُولِ خدا کے گھر کے لوگ تھے، جب ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ اسلام لائے ہوں گے تو معاشرے نے ان کی کتنی مذمّت کی ہو گی؟ انھیں غلط کار اور آباء و اجداد کا باغی کہا گیا ہو گا، بیوقوف کہا گیا ہو گا۔ بہر حال معاشرے کے انھی باغیوں کو اپنے دل کی بات ماننے اور اس پر جم جانے کی بدولت تاریخِ انسانیت نے دُنیا کے عظیم ترین عقلمندوں میں شامل کر کے باعمل دیدہ وروں کا خوبصورت نام دے دیا۔

باعمل دیدہ وری کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے کہ جب رسُولِ خدا نے اپنے پیغمبر بھائی عیسیٰؑ کی یہ بات سن کر تصدیق کی کہ ''اگر انسان میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان ہو اور وہ پہاڑ سے کہے کہ چل کر میرے پاس آ جا تو پہاڑ ایسا ہی کرے گا'' تو کسی شکّی مزاج نے سوال کیا، ''اور اگر پہاڑ آپؐ کے پاس نہ آیا تو آپ کیا کریں گے''؟ آپؐ نے برجستہ فرمایا، ''تو میں خود پہاڑ کے پاس چلا جاؤں گا''۔

باعمل دیدہ وری کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے مقصد کی جانب پہلا قدم خود اٹھائے۔ اور اگر اس کا قدم غلط ثابت ہو جائے تو کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لے۔ وہ غلطی کی اصلاح کرنے کے لیے راستہ تو بدل لیتا ہے لیکن اپنا مقصد نہیں بدلتا۔ باعمل دیدہ ور مجبوری اور مایوسی کے بجائے امید اور اعتماد کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا، ''ان حالات میں تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا''۔ وہ کہتا ہے، ''چلو، کوئی متبادل طریقہ ڈھونڈتے ہیں''۔ وہ یہ نہیں کہتا، ''میں تو صرف یہ کر سکتا ہوں''۔ وہ کہتا ہے، ''میں کوئی دوسرا راستہ اختیار کر سکتا ہوں''۔ وہ یہ نہیں کہتا، ''اپنی ناکامی پر میں غصے سے پاگل ہو جاتا ہوں''۔ وہ کہتا ہے، ''اپنی کامیابی کے لیے مجھے اپنے غصے پر قابو پانا ہو گا''۔ وہ یہ نہیں کہتا، ''کاش میں لائق ہوتا''۔ وہ کہتا ہے، ''میں لائق بن کر دکھاؤں گا''۔

اس آخری بات پر غور فرمایئے۔ پہلی صورت ''نہ ہونے'' کی ہے اور دوسری صورت ''بننے کی''۔ ہم اکثر بہت سی چیزوں اور باتوں کے نہ ہونے پر ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں لیکن ان کے حصول کے لیے خواہش سے زیادہ کچھ نہیں کرتے۔ کاش میری بیوی اتنی فضول خرچ نہ ہوتی۔ کاش میرا خاوند اتنا بدمزاج نہ ہوتا۔ کاش ہماری اولاد اتنی نافرمان نہ ہوتی۔ کاش،

Marfat.com

کاش، کاش،۔ ہم یہی سوچتے سوچتے عمر گزار دیتے ہیں کہ مصیبت یا پریشانی کا باعث ہمارے بجائے کوئی اور ہے۔ مگر باعمل دیدہ وری ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ دُنیا کو کوسنے کے بجائے ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔

اگر ہم خود نہیں بدلتے تو ہماری دنیا بھی نہیں بدلتی۔ ہماری دنیا وہی ہوتی ہے جو ہم ہیں۔ ہم بدل جائیں تو ہماری دُنیا بھی بدل جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی مثال لے لیں۔ وہ نہ بدلتے تو آج ان کا کوئی نام بھی نہ لیتا۔ وہ اندر سے بدل گئے تو ان کا باہر بھی بدل گیا اور آج تاریخ انھیں دُنیا کے چند عظیم ترین سربراہانِ مملکت میں شمار کرتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی مثال دیکھ لیں، وہ عمر بھر اس بات پر خودترسی (Self Pity) کا شکار رہ سکتے تھے کہ ''برادرانِ یوسف'' نے انھیں کنویں میں پھینک کر حضرت یعقوبؑ سے جا کر یہ جھوٹ بول دیا تھا کہ یوسف کو تو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ لیکن انھوں نے خودترسی کے بجائے اپنی کردار سازی کی۔ انھوں نے نہ صرف تعبیرِ خواب بلکہ نظم ونسق اور اقتصادی منصوبہ بندی میں مہارت حاصل کر کے فرعونِ مصر کے گورنر کا عہدہ سنبھالا اور ایک طویل قحط کے دوران نہ صرف اہلِ مصر بلکہ اردگرد کے علاقوں، خصوصاً کنعان (موجودہ اسرائیل اور فلسطین) کے عوام کو بھی بھوک کے عذاب سے بچایا۔

Marfat.com

Marfat.com

اکیسواں باب

آخرت کے پیشِ نظر آغاز

قرآنِ حکیم کا فیصلہ ہے کہ انسان جلد باز ہے (7:11) اور وہ ہر کام کا اجر فوری طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسے کاموں سے گریز کرجاتا ہے جو دیر سے فائدہ دیتے ہیں۔ جلد بازی کا دوسرا نام دُنیاداری ہے۔ دُنیا کا مطلب ہی جلدی یا فوری فائدہ ہے۔ انسان کو لاکھ بتایا جائے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے لیکن صبر اسے بہت کڑوا محسوس ہوتا ہے۔ پھر بھی صدہا صدیوں سے لوگ وہ درخت لگاتے چلے آرہے ہیں جنھیں مہینوں میں نہیں، برسوں میں پھل آتا ہے لیکن جب آنا شروع کردیتا ہے تو بیسیوں برس پھل آتا رہتا ہے۔ آخرت کے پیشِ نظر کسی کام کے آغاز کی سب سے سادہ مثال یہی ہے کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے بجائے انسان وہ شجرِ طیب بوئے جس پر قرآنِ حکیم کے الفاظ میں ہمیشہ میٹھا پھل آتا ہے، جس کی جڑیں زمین کے دِل میں اور شاخیں عرشِ معلیٰ کو چھورہی ہوتی ہیں اور جو ہر موسم میں سرسبز رہتا ہے۔

اس ضمن میں ہمارے عہد کے ''حرف حرف حقیقت'' کہنے والے خوش کلام صُوفی، واصف علی واصفؒ نے کس خوبی سے دریا کو کوزے میں بند کیا تھا: ''لوگ دُنیا تو فرعونِ مصر کی چاہتے ہیں اور عاقبت حضرت موسیٰؑ کی''۔ آخرت کا درخت تو اسی بیج سے پھوٹتا ہے جو ہم آج اور اس وقت بو رہے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم بوئیں تو آک اور اُگ آئے آم، اور وہ ہو بھی چونسا، ثمر بہشت یا انور رٹول۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ آنے والے کل سے ہم کوئی اچھا کام شروع کردیں گے۔ لیکن آنے والا کل عجیب دن ہے۔ جب وہ آتا ہے تو فوراً ہی اس کا نام کل کے بجائے آج ہوجاتا ہے اور ہم ایک مرتبہ پھر آج کا کام کل پر ڈال دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس نے بھی آخرت کو کل پر ٹالا اس کی آخرت کبھی نہ سنوری۔

اگر ہم صاحب کمال بننا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آج بلکہ ابھی ہم جو کہنے یا کرنے والے ہیں اسے ایک صاحب کمال کی طرح کہیں یا کریں۔ اگر ہم صداقت شعار بننا چاہتے ہیں تو وہ جھوٹ جو ہم ابھی ابھی بولنے والے تھے اسے روک کر اس کی جگہ سچ بول دیں۔ ذرا ایک معمولی درجے کی مثال لے لیں: آپ سگریٹ نوشی چھوڑنا چاہتے ہیں، وہ سگریٹ جو آپ نے ابھی ابھی سلگایا ہے اسے بجھادیں اور سگرٹوں کا پیکٹ ایسی جگہ پھینک دیں جہاں آپ اسے ڈھونڈنے پر بھی نہ پاسکیں۔ اور اب ایک اعلیٰ درجے کی مثال: حضرت عمرؓ جب اپنی بہن اور بہنوئی کو خوب مارپیٹ چکے اور پھر ان سے قرآنِ حکیم کی سورہ طٰہٰ سن کر انھیں اسلام کی حقانیت اور رسُولِؐ خدا کی صداقت کا یقین ہوگیا تو وہ واپس اپنے گھر نہیں چلے گئے بلکہ انھوں نے وہیں سے رسُولِؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلیا اور اس کہاوت کو سچ کر دکھایا کہ نیک کام میں دیر کیا؟

اگر آخرت یا انجام کو مدِّنظر نہ رکھا جائے تو کیا ہوتا ہے؟

Marfat.com

ہونا کیا ہے، بس یہ ہوتا ہے کہ ہم صبح سے شام تک ایک دیوار کھڑی کرتے رہتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ وہ سیدھی بھی اُٹھ رہی ہے یا نہیں۔ دن بھر کی محنت مشقت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ٹیڑھی دیوار خود ہمارے اوپر آ گرتی ہے۔ فوجیوں کو ایک اصول سکھایا جاتا ہے جسے انگریزی میں Maintenance of Aim (ہدف کی برقراری) کہتے ہیں یعنی ایک مرتبہ طے ہو جائے کہ ہم پہنچنا کہاں چاہتے ہیں تو پھر ہمارا ہر قدم اُس منزل کی طرف اٹھنا چاہیے۔ جس طرح دریا کی منزل سمندر ہوتی ہے اور وہ راستے کے پیچ وخم اور اونچ نیچ کے باوجود ہر لحظہ سمندر ہی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، ہمیں بھی ہر قدم اپنے مقصد یا انجام کی طرف ہی بڑھنا چاہیے خواہ دریا کی طرح سو مرتبہ اِدھر سے اُدھر مڑنا پڑ جائے۔ اس ٹیڑھے میڑھے راستے ہی کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ صراطِ مستقیم کوئی فٹے سے کھینچی ہوئی سیدھی لکیر نہیں ہوتا بلکہ وہ راستہ ہوتا ہے جو ہمیں خیر و خوبی سے منزل تک پہنچا دے خواہ یہ راستہ ٹیڑھا میڑھا ہو یا زیادہ وقت لیتا ہو۔ اس بیان کی تصدیق اس فارسی کہاوت سے ہوتی ہے: راہِ راست برو گرچہ دُور است۔

یہاں ایک اور کہاوت کا ذکر مناسب ہوگا جو درزی کھانوں میں بہت مقبول ہے۔ ''دو مرتبہ ناپو، ایک مرتبہ کاٹو'' مطلب یہی ہے کہ ہر اہم کام کی صحیح صحیح منصوبہ بندی کرنی چاہیے اور یہ کام آخرت یا انجام کے پیشِ نظر ہی کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایک مکان بنوانا چاہتے ہیں جس پر آپ کی عمر بھر کی کمائی خرچ ہو جائے گی۔ کیا آپ کچھ راج مزدوروں کو بلا کر انھیں یہ کہہ دیں گے کہ ایک مکان بنا دو یا اس سے پہلے اپنی موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کے تحت کسی مناسب ماہرِ تعمیرات (Architect) سے ایک نقشہ بنوائیں گے؟ بے شک نقشہ بن جانے کے بعد بھی چھوٹی موٹی تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن نقشے کے بغیر تو مکان کی جگہ گودام یا دکان بھی بن سکتی ہے۔ اس طرح گویا ہم تین مرتبہ مکان بناتے ہیں: ایک مرتبہ اپنے ذہن میں، پھر کاغذ پر بنے ہوئے نقشے کی صورت میں اور تیسری مرتبہ اینٹ گارے اور سیمنٹ سریے کے ساتھ۔ مکان کی طرح ہر کام بھی تین مرتبہ کیا جاتا ہے، ایک مرتبہ ذہنی سطح پر، دوسری مرتبہ منصوبہ بندی کی سطح پر اور تیسری مرتبہ عملی سطح پر۔

ایک اور مثال دیکھیے: ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صحت مند، لائق فائق اور خوش اطوار و خوش اخلاق ہو۔ یہ گویا ہمارا ذہنی نقشہ ہے، جس کے مطابق ہمیں اپنی اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کرنی ہے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دس بارہ سال تک تو اولاد کو ہر سطح پر نظر انداز کرتے رہیں اور پھر کسی چُھو منتر سے اُسے اپنے نقشے کے مطابق بنا لیں۔ اگر ہم واقعی سنجیدہ ہیں تو ہمیں آج بلکہ ابھی سے (یا ہر بچے کی پیدائش کے وقت سے) اس کی خوراک، عادات و اطوار، تعلیم اور تربیت کا خیال رکھنا پڑے گا اور دوسرے یہ بھی یاد رکھنا ہوگا کہ ہماری اولاد کے لیے ہم مثال(Role Model) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم خود تو مضرِ صحت خوراک کھائیں، غیر صحت مندانہ عادات اپنائیں یا جاری رکھیں، علم و ادب سے بیزار ہوں، بدتمیز اور بداخلاق ہوں اور ہماری اولاد کی اٹھان ہم سے یکسر مختلف بنیادوں پر ہو۔

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی کا کوئی نقشہ نہیں بنائیں گے تو ہماری زندگی یا تو بیکار اور غیر ضروری کاموں میں گزر جائے گی یا پھر ہم کسی اور کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق جی رہے ہوں گے اور یوں اختیار

Marfat.com

اور آزادی کی وہ عظیم نعمت جو خدا نے اپنی کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کی ہم اس کی برکتوں سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا نے ہمیں جن جھوٹے خداؤں کی بندگی سے بچایا تھا ہم انھی میں سے چند یا کسی ایک کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ یا آلۂ کار بن کر رہ جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری لگام یا باگ ڈور ہمارے اپنے ہاتھ میں نہیں، کسی اور کے ہاتھ میں آ جائے گی اور وہ ہمیں اپنی توپوں کے چارے (Gun Fodder) کے طور پر استعمال کر سکے گا۔ اب ہم قائدانہ کردار ادا نہیں کر سکیں گے، زیادہ سے زیادہ کسی دوسرے کے زیرِ ہدایت اچھے منتظم یا کارکن بن سکیں گے۔ قیادت یہ طے کرتی ہے کہ کرنا کیا چاہیے، منتظم یا کارکن صرف یہ کرتے ہیں کہ جو کام انھیں سونپا جائے اسے مناسب طور پر کر دیں۔

ایک سنجیدہ اور مخلص مسلمان کے لیے اس بات کا تعین بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا مقصدِ حیات کیا ہے؟ اس کا مقصود و منتہیٰ تو صرف خدا ہے جس نے اسے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے صراطِ مستقیم پر پامردی سے چلنے کے لیے قرآنِ حکیم کا قول اور رسولِ خدا کا عمل عطا کر رکھا ہے۔ ہر سنجیدہ اور مخلص مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے ہر زمانے میں یہ سوچ بچار کرے کہ آج کے دن، آج کے حالات میں رسولِ خدا خدا کے احکام پر کس طرح عمل کرتے۔ جب تک مسلمان اس سوچ بچار کے عادی رہے وہ خدا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتے تھے:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے	نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

مگر جب یہ قائدانہ کردار اور یہ سوچ بچار اوروں کا خاصہ بن گئی تو مسلمان تقلید کے پنجرے میں بند اپنی قسمت پر روتے اور یہ خواب دیکھتے رہ گئے کہ کسی طرح اپنے نو آبادیاتی مالکوں کی طرح کامیاب و کامران ہو سکیں۔ ان کی اس خستہ حالی پر خدا کا تبصرہ کچھ یوں تھا:

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو	نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو	بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

اگر ہماری زندگی کا مقصد کسی اور نے طے کرنا ہے، جیسا کہ برصغیر میں انگریز کی غلامی کے دوران ہوتا رہا تھا اور آج امریکہ کی خوشامد اور خوشنودی کی خاطر ہو رہا ہے، اور ہم نے صرف ''مالکوں'' کے طے کردہ مقاصد کو اچھے سلیقہ شعار غلاموں کی طرح پورا کرنا ہے تو اس کی مثال یہ ہوگی جیسے ہم کسی ڈوبتے ہوئے سمندری جہاز کے عرشے پر کرسیاں سیدھی کر رہے ہوں۔ اس مثال کی معنویت یہ ہے کہ اگر مقاصد طے کرنے اور قوانین بنانے والے اندر سے ہمارے مخالف یا دشمن ہوں تو ہم خواہ کتنی توجہ سے ان کے مقاصد کے حصول کے لیے، اُن کے بنائے قوانین کے مطابق عمل کریں، نتیجہ ہماری بربادی ہی کی صورت میں نکلے گا۔

بین الاقوامی سطح پر آج امریکہ کو جو فوجی اور مالیاتی برتری حاصل ہو چکی ہے اس کی موجودگی میں سعودی عرب، مفتوحہ افغانستان یا پاکستان جیسے ملک اس کے مقاصد کی برآوری کے لیے جتنی بھی فِدویانہ خدمات انجام دیں، نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ یہ ملک مزید کمزور ہو جائیں گے اور ان کا امریکہ پر انحصار اور بھی بڑھ جائے گا۔ اور اگر ایک طرف ہم خدا کی

Marfat.com

بندگی کے دعویدار ہوں اور دوسری طرف امریکہ کے سامنے سربسجود ہوں تو ہم سے بڑا منافق کون ہوگا؟ بے شک بین الاقوامی سیاست کے جس تالاب میں ہم جی رہے ہیں اس میں امریکہ کو مگرمچھ کی حیثیت حاصل ہے اور ہم اس سے بَیر رکھنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم خدا کے مقرر کردہ اصولوں کو 'اپنی امریکہ نواز حکمتِ عملی' پر قربان کر دیں اور تاریخ کا یہ سبق بھول جائیں کہ جب اصولوں کو حکمت عملی یا حربوں (Strategy or Tactics) پر قربان کر دیا جاتا ہے تو یہ موقع شناسی نہیں، موقع پرستی بن جاتی ہے جس کا حاصل بالآخر ہماری صفوں میں انتشار، ہمارے دلوں کی افسردگی اور اقوامِ عالم میں ہماری ذلت و رسوائی ہی ہوتا ہے۔ ہم ہوں یا کوئی اور، جب بھی انسان یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ بندۂ خدا ہے یا بندۂ زمانہ تو اس کی حالت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنے والے شخص کی سی ہو جاتی ہے حالانکہ اگر وہ بندۂ خدا بن جاتا تو زمانہ خود ہی اس کے سامنے جھک جاتا۔

جن معاشروں میں نوجوانوں کو رہنمائی کے بجائے تابعداری اور تقلید کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور انھیں چبھتے ہوئے تیکھے سوالات پوچھنے سے روکا جاتا ہے وہ بند پانی کے تالاب بن جاتے ہیں۔ خدا نے قرآنِ حکیم میں بار بار تدبّر اور تفکّر کرنے کی تلقین کی ہے۔ ہر لحظہ تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی نئے سے نئے سوالات پیدا کرتی رہتی ہے۔ تدبّر اور تفکّر کا حاصل نئے جواب نہیں، نئے سوالات ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ سوالات نہ پوچھے جائیں تو نئے جوابات پیدا ہی نہیں ہوسکتے۔ ایک اچھا، واضح اور بخوبی متعین (well defined) سوال وہ بیج ہوتا ہے جس میں جواب ایک پودے کی طرح موجود ہوتا ہے۔ تمام تر صحیح تعلیم کا ایک ہی مقصد ہے کہ طالب علم کا دِل اتنا بیدار اور دماغ اتنا روشن ہو جائے کہ ان میں نئے نئے سوال اُبھرنے شروع ہو جائیں اور طالب علم میں یہ حوصلہ پیدا ہو جائے کہ وہ یہ سوال اپنے آپ سے، اپنے استادوں سے، اپنے معاشرے سے اور اپنے خدا سے پوچھ سکے۔

اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو دل کی بیداری سے انسان کا ضمیر جنم لے لیتا ہے اور دماغ کی روشنی سے تخیل (Imagination) کا دروازہ کُھل جاتا ہے۔ کل تک ہم سمجھتے تھے کہ ہمارا ماضی اور حال ہی سب کچھ ہے۔ اب ہمیں پتا چلتا ہے کہ جو کچھ ہمارے اندر موجود ہے اس کے مقابلے میں ہمارا ماضی اور حال تو کچھ بھی نہیں۔ داستانوں کی زبان میں تخیل وہ ساتواں دروازہ ہے جس کے کھلنے سے سارے اسرار و رموز کھل جاتے ہیں اور ہمارے ہاتھ میں گویا جادو کی چھڑی آجاتی ہے۔ کچھ لوگ ذہن کے مقابلے میں تخیل کو ہوائی قلعے بنانے کا ذریعہ سمجھ کر اسے اپنی زندگی میں کوئی اہم مقام دینے سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ حقیقت نظر انداز کر جاتے ہیں کہ تمام تر تخلیقات اور ایجادات تخیل ہی کا کرشمہ ہیں۔

اور ضمیر؟

ضمیر دل کی زبان ہے اور جوں جوں انسان معاشرے کے بنائے ہوئے رسمی معیاروں سے بلند اور آزاد ہو کر اپنی رُوح کے تقاضوں کے تحت ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوتا چلا جاتا ہے اس کا ضمیر، دل کے ساتھ ساتھ، اس کی روح کا بھی ترجمان بن جاتا ہے۔ اور یوں ہم دوسروں کے

Marfat.com

بنائے ہوئے نقشوں اور دوسروں کے طے کردہ مقاصد کے بجائے اپنے نقشے اور اپنے مقصدِ حیات کے مطابق جینا شروع کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے ہمارا دوسرا جنم ہوتا ہے۔ پہلے ہم کسی اور کی خاطر، کسی اور کی زندگی گزار رہے تھے۔ اب ہم خدا کی خاطر خود اپنی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ پھر حضرت عمرؓ کی تبدیلیٔ دل کی طرف چلتے ہیں۔ اسلام لانے سے پہلے وہ اپنے بُت پرست معاشرے کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق، اُس معاشرے کے ایک آلۂ کار کی زندگی گزار رہے تھے۔ جیسے ہی ان کا دل روشن ہُوا، ان کے اندر تخیل کا ساتواں در کھل گیا۔ بندۂ زمانہ کے بجائے بندۂ خدا بن کر انھیں جونئی زندگی ملی وہ ہزار ہا درخشاں کارناموں سے اٹی پڑی ہے۔ دو مثالیں: اذان کا تصور اور اس کے الفاظ انھی کے تخیل کا نتیجہ ہیں۔ اس اذان نے نہ جانے کتنی ''روحوں کی اندھیری رات'' کو مطلع الفجر میں بدلا ہوگا۔ جنھیں خدا نے کانوں کے بجائے دل سے سننے کی توفیق دی ہے وہ جانتے ہیں کہ آج مسلمان کی رات سحر میں اس لیے نہیں بدل رہی کیونکہ:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود　　　　ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

دوسری مثال عمرؓ کا یہ ایک جملہ ہے جو صرف اور صرف کسی دلِ بیدار اور ذہنِ منور ہی کے تخیل سے پیدا ہو سکتا تھا: ''یہ سوچ سوچ کر راتوں کو نیند نہیں آتی کہ میرے عہدِ حکومت میں دُور فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو میں خدا کو کیا جواب دوں گا''۔ سیاست ہی نہیں، ادب کے طالب علم بھی اس جملے کے پیچھے ضمیرِ انسانی کو کسی متلاطم سمندر کی طرح پیچ و تاب کھاتے دیکھ سکتے ہیں۔

آخرت کے پیشِ نظر آغاز کے لیے اہلِ نظر سب سے مؤثر طریقہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہم اپنے من میں ڈوب کر اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ کر کے یہ طے کریں کہ ہم زندگی میں کیا بننا اور کیا کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بننے (Being) کا تعلق ہمارے کردار سے ہے اور کرنے (Doing) کا تعلق ہمارے اعمال سے ہے۔ لیکن بننا ہو یا کرنا، دونوں کی بنیاد ہمارے مخصوص جوہر اور صلاحیتوں پر ہے۔ اس لیے ہر شخص اپنی زندگی کا جو بھی نقشہ بنائے وہ اس کے جوہر اور صلاحیتوں کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ تمام انسانوں کو خدا نے یکساں علمی اور روحانی صلاحیتیں دے رکھی ہیں تو ان کے نقشے بھی ایک جیسے ہی ہوں گے اور یوں انسانی معاشرے یکسانی (Monotony) کا شکار ہو جائیں گے۔ یہ اعتراض مسلمان کہلانے والے ان معاشروں پر تو ٹھیک بیٹھتا ہے جہاں بیدار دلی اور روشن دماغی کے بجائے تقلید کا سکہ چلتا ہے ورنہ خدا نے ہمارے اندر اپنی روح پھونک کر اور اشیاء کی حقیقت کا علم عطا کر کے ہمیں ہونے اور کرنے کے لامحدود امکانات عطا کر رکھے ہیں۔ ہر انسان خدا کے کسی ایسے مقصد کی تکمیل کے لیے پیدا ہوتا ہے جو اس خاص انسان کے بغیر پورا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ اس ضمن میں اقبال نے خدا سے یہ چبھتا ہُوا سوال یوں ہی نہیں کیا تھا کہ:

ہے نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل　　　　کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

Marfat.com

غور فرمایئے، اس واضح اور متعین سوال میں اس کا واضح اور متعین جواب موجود ہے۔ ظلم و تشدد، قحطوں، دباؤں، جنگوں اور طرح طرح کی خانہ جنگیوں کے باعث آج انسان جس طرح مکھیوں کی طرح مر رہا ہے اس سے واقعی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا مزید انسان کیوں پیدا کرتا جا رہا ہے۔ اس تکرار سے کیا فائدہ؟ لیکن خدا کو مخاطب کر کے یہ سوال کرنے والا شخص بخوبی جانتا ہے کہ خدا نے زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے بیکار یا باطل پیدا نہیں کیا (38:27) ۔ پھر وہ اس انسان کو جو اشرف المخلوقات، مسجودِ ملائک اور روحِ خداوندی کا حامل ہے، کیونکر باطل پیدا کرے گا؟ ہرگز نہیں، انسان بالحق پیدا ہوا ہے اور اس کا تکرار سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی شکل و صورت، آواز، دل، دماغ اور روح میں وحدت کے باوجود کثرت (Diversity) رکھی گئی ہے۔ ہاں اگر وہ بیدار دلی اور روشن دماغی کے بغیر ضمیر اور تخیل سے محروم ہو جائے تو پھر اور بات ہے ورنہ ہر شخص کو خدا نے جداگانہ جوہر عطا کیا ہے جس کے اظہار کے لیے وہ اپنی زندگی میں کچھ بننے اور کرنے کا ایک نقشہ بنا کر ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے صراطِ مستقیم پر چل کر خدا کی جانب طبق در طبق آگے بڑھ سکتا ہے۔

اگر ہم اس صراطِ مستقیم کو، اپنے دلِ بیدار اور ذہنِ منور کو، اور اپنے ضمیر اور تخیل کو پسِ پُشت ڈال کر آخرت کے پیشِ نظر زندگی کا نقشہ بنا کر نہیں چلتے تو ہمارا انجام یہ ہوگا کہ عمر ہاتھوں سے نکل جانے پر ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس وقت ہم پر واضح ہوگا کہ کوئی واضح نقشۂ زندگی یا لائحۂ عمل نہ ہونے کے باعث ہم منزل منزل بھٹکتے رہے اور کہیں بھی نہ پہنچ پائے۔ کبھی اپنی ذات کو مرکز مان کر ذاتی اغراض اور عیش و عشرت کے قیدی بنے رہے، کبھی کام، اور کام کے چکر میں مصروفیت کے ہاتھوں صحت، گھریلو خوشیوں اور سماجی ذمہ داریوں سے غفلت برت گئے اور کام کی دُھن میں زر اور زمین کے بتوں کو پوجتے رہے اور تعلقات کو چیزوں پر قربان کرتے گئے۔ قصہ مختصر، ہماری کیفیت یہ ہوگئی کہ بقول فیضؔ:

ہم جیتے جی مصروف رہے ۔۔۔ کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا ۔۔۔ اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے ۔۔۔ دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

اب مومنؔ اور غالبؔ کی بھی سنیئے:

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ ۔۔۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ ۔۔۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہماری ہی نہیں، ہر مسلمان کی یہی کیفیت ہوگی اگر وہ اپنی زندگی کا محور خدا کے بجائے اپنی ذات، اپنے کام، اپنی ملکیت یا کسی اور دُنیوی بُت کو بنائے گا۔ مسلمان کی زندگی کا محور صرف اور صرف خدا اور اس کی زندگی کا سفر صرف اور صرف ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی شاہراہ ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہی محور اور یہی شاہراہ اسے اپنے مخصوص اور جداگانہ جوہر کے بہترین فروغ اور اظہار کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

بائیسواں باب

ترجیحات کا تعین

مؤثر ترین لوگوں کی یہ تیسری عادت پہلی دو عادتوں کی عملی تکمیل ہے۔ پہلی عادت یہ تھی کہ ہم دوسروں کے بنائے ہوئے نقشے کے بجائے اپنی روح، اپنے عقاید اور اپنے جوہر کے مطابق اپنی زندگی کا نقشہ (A Blueprint of Our Life) خود بنانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ہماری یہ عادت ہمارے تخیل، ضمیر، اختیار اور خود شناسی کی چار مخصوص انسانی صفات کے مناسب استعمال سے وجود میں آتی اور مستحکم ہوتی ہے۔ اس عادت سے ہم معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج اور معیاروں کو رد کر کے اپنی زندگی کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں لینے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔

ہماری دوسری عادت یہ تھی کہ ہم اپنی زندگی کا نقشہ خود بنا کر اپنے آپ کو ایک نیا جنم دے سکیں۔ یہ جنم ہماری پہلی پہلی ذہنی تخلیق ہوتی ہے۔ اس عادت میں ہمارا تخیل اور ضمیر خصوصی کردار ادا کرتے ہیں۔ تخیل کی مدد سے ہماری دیدہ وری ہمیں وہ کچھ دکھا دیتی ہے جسے ابھی ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ اور ضمیر کی مدد سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم کس طرح اپنے دِل اور روح کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے خداداد یگانہ و یکتا جوہر کی بہترین تکمیل کر سکتے ہیں۔

ہماری تیسری عادت ہمارے تخیلاتی جنم کو لباسِ عمل پہنانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یوں کہیے کہ ہم نے پہلی دو عادتوں کے باعث اپنی زندگی کی عمارت کا جو نقشہ بنایا تھا اب اس نقشے کے مطابق اینٹ گارے اور سیمنٹ سریے سے ٹھوس عمارت بننے لگ جاتی ہے۔ یہ ہمارے خیالی یا تصوراتی جنم کے بعد ہمارا عملی یا ٹھوس جنم ہوتا ہے۔

اس تیسری عادت کے ذریعے سے ہم ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کی قدروں کو اپنی عملی جدوجہد کا محور بنا لیتے ہیں اور اس صراطِ مستقیم کے مستقل مزاج راہی بن جاتے ہیں۔ اپنی پہلی دو عادتوں کے بغیر ہم ایسی عملی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتے جو روحانی قدروں سے پوری پوری مطابقت رکھتی ہو۔ ان دو عادتوں ہی کے باعث ہماری تیسری عادت ہمیں روز بہ روز اور لحہ بہ لحہ صراطِ مستقیم پر آگے بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اس تیسری عادت کا ایک اپنا تقاضا بھی ہے اور وہ ہے ذاتی نظم وضبط (Self Descipline)۔

ذاتی نظم وضبط قائدانہ کردار سے کسی حد تک الگ چیز ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو قیادت کے تصورات، نظریات یا فلسفے کو عملی شکل دیتی ہے۔ اس فرق کو دورِ حاضر کے دو عظیم انسانوں کے باہمی تعلق اور فرق سے سمجھا جا سکتا ہے: چینی انقلاب کا رہنما ماوزے تُنگ تھا۔ یہ اس کی قائدانہ صلاحیت کا کرشمہ تھا کہ اس نے جلی قلم سے چینی انقلاب کے ہدف یا مقاصد کا نقشہ بنا دیا۔ لیکن یہ چُو این لائی کا کارنامہ تھا کہ اس نقشے کے مطابق ایک ارب سے زیادہ آبادی کے کمزور اور

Marfat.com

غریب ملک کی سیاست، معیشت، معاشرت، خارجہ پالیسی اور فوجی طاقت کے بڑے سے بڑے تقاضوں اور چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے اینٹ گارے اور سیمنٹ سریے سے چینی انقلاب کی وہ شاندار عمارت تعمیر کردے جو اتنی مضبوط و پائیدار ہو کہ ماؤزے ڈنگ کے ثقافتی انقلاب (Cultural Revolution) کا زلزلہ خیز صدمہ بھی سہہ جائے۔ ماؤزے تنگ پہلی دو عادتوں کی ترجمانی کرتا تھا، وہ ایک دیدہ ور ماہر تعمیرات (Visionary Architect) تھا۔ چواین لائی تیسری عادت کا ترجمان تھا۔ وہ ایک معمار (Builder) تھا۔ ماؤزے تنگ کے بغیر چواین لائی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ چواین لائی کے بغیر ماؤزے تنگ کے سارے منصوبے ہوائی قلعے بن کر رہ سکتے تھے۔

جب نقشے سے ٹھوس عمارت بنانے کا عمل شروع ہو تو سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ ترجیحات کا تعین کرلیا جائے۔ ترجیحات کے تعین اور اس کے مطابق قدم بہ قدم آگے بڑھنے کا دوسرا نام ہمارا ذاتی نظم وضبط ہے۔ ہمیں پتا ہونا چاہیے کہ ہم ایک پختہ بنیاد کے بغیر کسی بڑی عمارت کی دیواریں کھڑی نہیں کر سکتے اور نہ دیواریں کھڑی کیے بغیر چھت ہی ڈال سکتے ہیں۔ ترجیحات کے تعین کا آسان اور سلیس ترجمہ یہ ہے: پہلا کام پہلے۔ ترجیحات کے ایک اور پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے نامور جرمن شاعر، ادیب اور فلسفی گوئٹے کا یہ قول مدد دے سکتا ہے: ''اہم ترین امور کو کسی حالت میں بھی فضول ترین باتوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا''۔ ہم اس ضمن میں اپنے نامدار شاعر، صوفی اور فلسفی اقبال کا یہ مقبولِ عام شعر بھی یاد کرسکتے ہیں:

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل ، طاؤس و رباب آخر

گوئٹے اور اقبال ہماری اس تیسری عادت کے اِس پہلو کو واضح کررہے ہیں کہ جس طرح یہ ضروری ہے کہ پہلا کام پہلے کیا جائے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ اہم تر کام کو غیر اہم کام پر ترجیح دی جائے۔ اس سلسلے کا روحانی پہلو یہ ہے کہ بے شک حقوق اللہ بے حد اہم ہیں لیکن عملاً حقوق العباد کو ترجیح دی جائے۔ کیونکہ حقوق اللہ کی قضا جائز ہے، حقوق العباد کی کوئی قضا نہیں۔ ہم نماز پڑھنے لگے ہوں اور ساتھ کے گھر میں آگ لگ جائے جس سے انسانی جانیں جانے کا خطرہ ہو تو نماز سے پہلے انسانی جانیں بچائی جائیں گی۔ نماز بعد میں بھی پڑھی جاسکتی ہے، انسانی جانیں بعد میں نہیں بچائی جاسکتیں۔

انسانی جسمیات (Physiology) کے ماہروں نے انسانی دماغ کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کررکھا ہے: دایاں دماغ اور بایاں دماغ۔ ہمارے دائیں دماغ سے تدبر اور تفکر، تخیل اور تصور، دیدہ وری اور شاعری، موسیقی اور مصوری جیسے فنونِ لطیفہ پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے بائیں دماغ سے منطق، حساب، جیومیٹری، الجبرا، طبعیات، کیمیا اور دوسرے سائنسی علوم پیدا ہوتے ہیں۔ دایاں دماغ امتزاج (Synthesis) کے ذریعے سے حقائق کو باہم جوڑتا ہے۔ بایاں دماغ تجزیے (Analysis) کے ذریعے سے ہر بات اور چیز کو توڑ توڑ کر جزئیات کا جائزہ لیتا ہے۔ پہلی دو عادتیں دائیں دماغ سے اور تیسری عادت بائیں دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ افسوس کہ زیادہ تر ملکوں، خصوصاً مسلمان ملکوں کے تعلیمی

نظاموں میں دائیں دماغ یا قائدانہ اور دیدوررانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے والے حصہ دماغ کو اوّل تو سرے سے نظرانداز کردیا جاتا ہے یا بہت ہُوا تو نہایت معمولی توجہ کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ نتیجہ: ہم یا تو اپنے گزرے ہوئے زمانے کے قائدین کی اندھی تقلید کرتے رہ جاتے ہیں یا پھر اُس مغرب کی پیروی کرتے پائے جاتے ہیں جس نے دُنیا کی خاطر آخرت گنوادی ہے۔

پیروی مغرب ہی کا اثر ہے کہ نئے متبادلات موجود ہونے کے باوجود ہم وہ تمام غلطیاں دہراتے رہتے ہیں جو مغرب نے اپنی ترقی کی راہ میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے کی تھیں۔ مثلاً مغرب نے اپنی اقتصادی، خصوصاً صنعتی ترقی کے دوران مزدوروں کے ساتھ ظلم وزیادتی کا جو رویہ رکھا اور ماحول کو جس بے دردی سے آلودہ کیا، ہم ان دونوں سے بچ سکتے تھے۔ ہم اقتصادی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے اور ہمارے لیے راستے کی اونچ نیچ کو پہلے سے جانچنا ممکن اور آسان تھا۔ لیکن آج ہم انھی گڑھوں میں گرتے پڑتے چل رہے ہیں جن میں ہراول دستے کے طور پر مغرب کو گرنا پڑ گیا تھا۔

جس طرح انسان اپنے ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ سکتے ہیں اسی طرح ترقی کے سفر میں پیچھے آنے والی قومیں اور ملک آگے جانے والوں سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ آگے آگے چلنے والوں کے لیے غلط اور صحیح میں سے ایک راستے کا انتخاب ضروری ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ غلط راستے پر چل پڑتے ہیں۔ لیکن پیچھے پیچھے آنے والوں کے لیے آسان ہوتا ہے کہ وہ آگے آگے چلنے والوں کے غلط راستے کے بجائے متبادل اور بہتر راستہ چُن لیں۔ اسی طرح ہراول ملکوں نے جن راستوں کو غلطی کے خوف سے ترک کر دیا ہوتا ہے، پیچھے آنے والے ان بظاہر غلط لیکن درحقیقت صحیح راستوں پر چلنے کی جرأت کر سکتے ہیں اور یوں آگے چلنے والوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

ذاتی نظم وضبط میں وقت کا صحیح استعمال کرنا بے حد اہم ہوتا ہے۔ اس اہم کام کا آسان اور آزمودہ طریقہ یہی ہے کہ ہم وقت کو ہمیشہ اپنی ترجیحات ہی کے مطابق تقسیم اور استعمال کریں۔ آج کے دور کے ''بعد از صنعت'' (Post Industrial) معاشروں میں وقت کی تقسیم اور استعمال چار طریقوں سے طے ہوتا ہے:

	ہنگامی	غیر ہنگامی
اہم	بُحران سے دوچار کام شدید دباؤ میں آئے ہوئے کام ایک متعین مدت میں مکمل ہونے والے کام	پرہیزی اور احتیاطی تدابیر تعلقات کی استواری، نئے مواقع کی دریافت منصوبہ بندی، تفریح
غیر اہم	مداخلت، مثلاً اہم ملاقات کے دوران غیر اہم فون ڈاک۔ رپورٹیں۔ ملاقاتیں۔ میٹنگیں۔ ہر دلعزیز سرگرمیاں	اوٹ پٹانگ سرگرمیاں، بے معنی مصروفیت غیر ضروری ڈاک یا ای میل، غیر ضروری ٹیلیفون خوش گپیاں، ہنسی مذاق

یہ عجیب بات ہے کہ ہم ہمیشہ نہیں تو اکثر انتہائی ضروری کاموں کے دوران ٹیلیفون کی گھنٹی پر چونکا اٹھا لیتے

Marfat.com

ہیں۔اسی طرح گھنٹوں کی کاغذی تیاری، غور وفکر، بحث مباحثے کے بعد جب ہم ایک اہم ترین میٹنگ میں شرکت کے لیے ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہو رہے ہوتے ہیں تو ایک ٹیلیفون کال آجاتی ہے اور ہمارا ہاتھ خواہ مخواہ ٹیلیفون پر جا پڑتا ہے اور ہم ایک اہم ترین کام کو ایک انتہائی غیر اہم کام پر قربان کر کے جہاز کو نکل جانے دیتے ہیں۔آپ نے اکثر یہ تماشا بھی دیکھا ہوگا کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ اہم ترین مسئلے کو چھوڑ کر نہایت معمولی باتوں پر اختلاف کے باعث لفظی جنگ پر اتر آتے ہیں۔

اس کی سب سے اچھی مثال باہم محبت کرنے والے میاں بیوی کی ہے جو زندگی کے ہر اہم مسئلے پر اتفاقِ رائے رکھتے ہیں لیکن شوہر کی قمیص کے بٹن نہ ٹانکنے یا بیوی سے وعدے کے مطابق ایک گھنٹہ دیر سے آنے پر ایسا زبردست جھگڑا شروع ہو جاتا ہے جو طلاق کی دھمکیوں تک جا پہنچتا ہے۔بہر حال تمام اہم اور غیر اہم، ہنگامی اور غیر ہنگامی کاموں سے ذاتی نظم وضبط کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہُوا جاسکتا۔بظاہر ہمیں وقت کی صحیح تقسیم اور استعمال سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہماری اصل ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ترجیحات کو یاد رکھیں اور ان کی تکمیل کے لیے ذاتی سطح پر نظم وضبط کے عادی ہو جائیں۔

اس سلسلے میں "نہ" کہنے کی جرأت بھی ہونی چاہیے۔کبھی تو یہ "نہ" اپنے آپ کو کہنی پڑتی ہے اور کبھی دوسروں کو۔ ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی ترجیحات کے مطابق وقت اور توجہ کی تقسیم پر پورا پورا عمل کریں۔لیکن ہمیں مشینوں یا مشینی خادموں (Robots) کی طرح بے لچک بھی نہیں ہونا چاہیے۔موقع محل کے مطابق اپنی تقسیمِ کار میں مناسب لچک پیدا کر لینا کمزوری نہیں، انسانی خوبی ہے۔لیکن معمولی اور غیر ضروری کاموں کے لیے بار بار اپنی ترجیحات کو ترک کرنا محض بہانہ بازی ہوتی ہے اور اس سے یکسر بچنا چاہیے۔

ترجیحات اور ذاتی نظم وضبط کا ایک اور اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام کام خود اپنے ہاتھوں سے کرنے کی کوشش نہ کریں۔تمام بڑے بڑے کام ذمہ داری کو بانٹنے سے انجام پاتے ہیں۔اپنے ہاتھ میں صرف وہ کام رکھنا چاہیے جو صرف آپ کر سکتے ہیں، باقی تمام کام باصلاحیت اور قابلِ اعتماد ماتحتوں میں تقسیم کر دینا چاہیے۔اس اصول پر صرف اس طرح عمل ہو سکتا ہے کہ جہاں ہم اپنی علمی اور عملی صلاحیت میں مسلسل اضافہ کرنے کی کوشش کریں وہاں اپنے عملے اور ارد گرد کے لوگوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت کریں اور اپنے تمام رفقائے کار اور ماتحتوں کے ساتھ اور ان کے درمیان اعتماد کا رشتہ استوار کریں۔اعتماد وہ انسانی، اخلاقی اور روحانی قدر ہے جس کے بغیر ہم ذاتی، گروہی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر نہ تو سیاسی طور پر کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ اقتصادی اور سماجی طور پر۔

باہمی قیادت کے اصول

اب ہم انفرادی کامیابی سے اجتماعی کامیابی کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں جس کے لیے باہمی انحصار (Interdependence) کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن باہمی انحصار کی بنیاد یہ ہے کہ ہم خود بھی اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہوں اور اپنے وجود کے لیے کسی کے محتاج نہ ہوں۔اجتماعی کامیابی سے پہلے انفرادی کامیابی ضروری ہوتی ہے۔انفرادی کامیابی

Marfat.com

پہلی منزل ہے، اجتماعی کامیابی دوسری۔ اپنے نفس پر قابو پائے بغیر اور اپنے کردار کی پختگی کے بغیر اجتماعی کامیابی محض ایک خواب ہوتی ہے یا پھر ناپائیدار ہوتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اور درست کہتے ہیں کہ جب تک ہم اپنے آپ کو پسند نہیں کرتے، دوسروں کو پسند کر ہی نہیں سکتے۔ حضرت عیسیٰؑ کی مشہور تلقین ہے کہ "اپنے ہمسایے سے اس طرح محبت کرو جیسے اپنے آپ سے کرتے ہو"۔ اگر ہم اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوں، یا ہمیں اپنا آپ ہی پسند نہ ہو تو ہم ہمسایے سے کیا خاک محبت کریں گے؟ لیکن اپنے آپ سے محبت اپنے آپ کو پہچانے بغیر، اپنے جوہر کو جلا دیے بغیر اور ضبطِ نفس اور پختگیٔ کردار کے بغیر کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اگر ہو بھی جائے تو وہ بے بنیاد ہو گی اور چار دن میں زمانہ ہمیں الٹا لٹکا کر اور جوتے مار مار کر بتا دے گا کہ میاں صاحب آپ کی اوقات کیا ہے؟ سچی عزتِ نفس پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب ہم پورے اعتماد سے ضبطِ نفس اور پختگیٔ کردار کے دو قدموں پر آزادانہ کھڑے ہوں ورنہ ضمیر ہمیں کچوکے دیتا رہتا ہے یا پھر ہمیں ضمیر سے چھٹکارا حاصل کر کے بے ضمیر بن جانا پڑتا ہے۔

یہ فارسی کہاوت خاصی مشہور ہے کہ "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز" (یک طرح کے پرندے اکٹھے اڑتے ہیں۔ کبوتر کبوتروں کے ساتھ اور باز بازوں کے ساتھ پرواز کرتے ہیں)۔ جس طرح کے انسان ہم خود ہوتے ہیں اسی طرح کے انسانوں سے ہمارے رابطے اور تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ خدا نے بھی فیصلہ کر رکھا ہے کہ "خبیثوں کے لیے خبیث اور پاکدامنوں کے لیے پاکدامن، بُروں کے لیے بُرے اور اچھوں کے لیے اچھے"۔ انگریزی محاورہ بھی خاصا عام ہے کہ A man is known by the company he keeps (آدمی اپنے دوست احباب سے پہچانا جاتا ہے)۔ یہ بجا ہے کہ بُرے لوگ اچھے لوگوں کے بہروپ میں دوسروں کو دھوکا دیتے آئے ہیں لیکن زمانہ ہمیشہ سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بھی کرتا چلا آیا ہے۔

بے شک زندگی کے کچھ شعبے ایسے بھی ہیں جن میں کامیابی کے لیے دوسروں پر انحصار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مثلاً شاعر، ادیب، مصور، وکیل اور ڈاکٹر تنِ تنہا یا نہایت مختصر سے عملے کے ساتھ کام چلا سکتا اور ذاتی سطح پر کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن سیاست، کاروبار اور صنعت میں دوسروں پر انحصار ضروری ہو جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت میں ذاتی سطح پر کام کرنے والوں کا بھی ایک حد تک دوسروں سے رابطہ اور تعلق ناگزیر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اصول سب پر صادق آتا ہے کہ اگر ہم ذاتی نظم و ضبط اور اچھے کردار کے باعث عزتِ نفس رکھتے ہوئے اپنے قدموں پر آزادی اور اعتماد کے ساتھ کھڑے ہوں تو اسی طرح کے دوسرے لوگ بھی ہماری عزت اور ہم پر اعتماد کرنے میں رغبت محسوس کریں گے اور یوں باہمی عزت و اعتماد کی بناء پر ہمارے لیے باہمی انحصار کا راستہ کھل جائے گا۔ اب یہ انحصار ان لوگوں کے درمیان ہو گا جو دوسروں کے محتاج اور طفیلی نہیں ہوتے بلکہ اپنے اپنے قدموں پر کھڑے باصلاحیت، باکردار اور خودمختار (Independent) افراد ہوتے ہیں لیکن عظیم تر مقاصد اور عظیم تر کامیابیوں کے لیے باہمی انحصار کرنا چاہتے ہیں۔

غور فرمائیے کہ باہمی انحصار میں انسانی، اخلاقی اور روحانی قدروں کا کس حد تک دخل ہے۔ ان قدروں کو جذباتی بنک اکاؤنٹ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جس طرح ہم اپنا ایک بنک اکاؤنٹ کھولتے ہیں اور جس قدر زیادہ رقم اس میں جمع ہو ہمیں اتنی ہی آسودگی اور احساسِ تحفظ ہوتا ہے اسی طرح باہمی عزت، اعتماد، دیانت اور صداقت کے ساتھ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شمولیت سے جیسے جیسے ہمارا جذباتی بنک اکاؤنٹ بڑھتا جائے ہمیں ایک دوسرے پر انحصار کرنے میں مزید آسودگی اور احساسِ تحفظ حاصل ہونے لگتا ہے۔

جذباتی بنک اکاؤنٹ میں یہ چھ بڑی بڑی رقمیں جمع کرانے کی ضرورت ہوتی ہے:

(الف) دوسرے فرد کو سمجھنا اور پہچاننا

آپ نے خود اپنے بارے میں محسوس کیا ہوگا کہ لوگ آپ کو سمجھنے اور پہچاننے کی اوّل تو کوشش ہی نہیں کرتے یا پھر اس میں غلطی کر جاتے ہیں۔ یہی شکایت دوسروں کو ہم سے بھی ہوسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ روحانی سبق یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کی ظاہری شخصیت ہی سب کچھ نہیں ہوتی، اس کا باطنی کردار کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ جب تک ہم دوسروں کو پوری طرح سمجھتے اور پہچانتے نہیں ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان کے لیے زندگی اور انسانی تعلقات میں کیا اہم اور کیا غیر اہم ہے۔ جو چیز ہمارے لیے مقصدِ حیات ہو ممکن ہے کسی دوسرے کے لیے بے معنی اور فضول ہو۔ اگر دوسروں کا اعتماد اور ان پر انحصار ہمارے لیے اہم ہے تو ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ترجیحات کیا ہیں، پسند ناپسند کیا ہے، طرزِ فکر و عمل اور انسانی، اخلاقی اور روحانی قدریں کیا ہیں۔ اور ہیں بھی یا نہیں۔

(ب) جزئیات پر توجہ دینا

انسانی تعلقات میں عموماً اور باہمی انحصار میں خصوصاً بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں اکثر اوقات بڑی بن جاتی ہیں۔ مثلاً آپ کے بچے کی سالگرہ تھی اور آپ کے رفقائے کار میں سے کچھ نے دعوت کے باوجود یا تو شرکت نہیں کی یا دیر سے آئے۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی دلآزاریاں بڑی بڑی شکایتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ باہمی انحصار میں جزئیات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ روزمرہ تپاک، دلداری، حوصلہ افزائی، قدر افزائی، موقع موقع پر مناسب تعریف اور اجنبیوں سے آپ کا تعارف کراتے ہوئے کلمۂ خیر جیسی بظاہر معمولی باتیں عمر بھر یاد رہتی ہیں۔ ہمارے عہد کی دو مشہور اور بلند پایہ ادبی شخصیتوں کی مثال: پچاس سال پہلے چین کے دورے کے دوران وفد کے قائد فیض احمد فیض نے احمد ندیم قاسمی کا تعارف کراتے ہوئے صرف یہ بتایا کہ وہ پاکستان کے نامور صحافی ہیں۔ پچاس سال اس بات پر اندر ہی اندر ناراض رہنے کے بعد قاسمی صاحب نے تحریری طور پر فیض صاحب کی ''کم ظرفی'' کا یہ کہہ کر گلہ کیا کہ انھوں نے چین میں یہ نہیں بتایا تھا کہ قاسمی صاحب اردو کے مایہ ناز شاعر بھی ہیں۔ دراصل جذباتی بنک اکاؤنٹ انسان کے دل ہی میں کھلتا ہے اور دل بہت نازک ہوتا ہے۔ اردو کے بے بدل شاعر انیس نے اسی لیے تو اہلِ دل کو مشورہ دیا تھا:

Marfat.com

خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

کبھی اور کسی بھی حالت میں یہ تصور کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارے احباب چونکہ نہ صرف بالغ بلکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لیے وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بالاتر ہو گئے ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں، دلوں کے آبگینوں کو کسی بھی عمر میں ٹھیس لگ سکتی ہے۔

(ج) وعدے کا پاس

وعدے یا عہد کا پاس بہت بڑی رقم ہوتی ہے جس سے جذباتی اکاؤنٹ میں ڈھیروں اضافہ ہو جاتا ہے اور وعدہ خلافی یا عہد شکنی بھی اتنی ہی بڑی رقم ہوتی ہے جس سے اس اکاؤنٹ میں زبردست کمی آجاتی ہے۔ گھر سے باہر کے لوگوں کو چھوڑیے، گھر کے اندر میاں بیوی اور اولاد کے تعلقات ہی کو دیکھ لیجیے۔ وہ وعدے جو ہم بلا سوچے سمجھے کر لیتے ہیں اور انھیں اسی طرح بلا سوچے سمجھے توڑ ڈالتے ہیں، اُن کا صرف یہ اثر نہیں ہوتا کہ ہم گھر والوں کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں، ان کی وجہ سے ان کی جو دِل شکنی ہوتی ہے اسے وہ مشکل ہی سے بھلا پاتے ہیں اور بار بار اس کا افسوس بھرا حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ اس لیے گھر ہو یا باہر، وہی وعدہ کرنا چاہیے جو آپ واقعی پورا کر سکتے ہوں۔ بلکہ ہو سکے تو اس سے بھی ذرا کم! بے شک بعض ناگزیر حالات میں وعدہ پورا نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس کا پاس ہوتا ہے۔ بلا جواز وعدہ خلافی اور عہد شکنی جذباتی سطح پر آپ کا بنک اکاؤنٹ خالی کر سکتی ہے۔ قرآنِ حکیم میں وعدوں اور معاہدوں کے پاس کی خصوصی تاکید کی گئی ہے (5:1)۔

(د) حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین

جس طرح کھیل میں ضروری ہوتا ہے کہ ٹیم کے ہر کھلاڑی کو پتا ہو کہ وہ کس پوزیشن میں کھیلے گا مثلاً فٹ بال یا ہاکی میں وہ گول کیپر ہو گا یا سنٹر فارورڈ، لیفٹ اِن ہو گا یا رائٹ بیک؟ اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہوتا ہے کہ باہمی انحصار میں ہر فریق اور فرد کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین ہو جائے۔ حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین ہمیں بہت سے ایسے جھگڑوں سے بچا لیتا ہے جن کے باعث نہ صرف خاندانوں کی بلکہ سیاسی جماعتوں کی تقسیم در تقسیم اور کاروباروں کے بٹوارے ہوتے رہتے ہیں۔ اور تو اور ملک تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان اس لیے تقسیم ہو گیا کہ مسلمانوں کو مشترکہ وطن میں ہندو اکثریت کے ہاتھوں اپنے حقوق محفوظ نظر نہ آتے تھے۔ پاکستان اس لیے ٹوٹ گیا کہ مشرقی پاکستان کو اپنے جائز حقوق حاصل نہ ہونے کی شکایت تھی۔ بقیہ یا موجودہ پاکستان میں بھی صوبوں اور صوبوں کے درمیان اور صوبوں اور وفاق کے درمیان وفاقی حقوق اور ذمہ داریوں پر جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔

Marfat.com

دورِ حاضر میں انسانی حقوق کا اتنا زیادہ چرچا ہُوا ہے کہ لوگ اپنی ذمہ داریوں کو بھول گئے ہیں اور انھیں صرف اپنے حقوق یاد رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ جو کردار سے عاری شخصیت کے مالک ہوتے ہیں انھیں خصوصاً اپنی ذمہ داریوں سے زیادہ اپنے حقوق کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ لیکن جہاں باہمی انحصار سے چلنا مقصود ہو وہاں صرف حقوق کی فکر اور ذمہ داریوں سے یکسر گریز کے باعث باہمی اعتماد کے بجائے کھینچا تانی اور رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے اور ساجھے کی ہانڈی بھرے بازار میں پھوڑی جاتی ہے۔ حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین سے ایک دوسرے کے ساتھ فالتو توقعات وابستہ نہیں کی جاتیں۔ توقعات جتنی زیادہ ہوں ان کے پورا نہ ہونے پر اتنی ہی مایوسی اور شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہر شخص اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کے مطابق چلے تو ان کا آپس میں قریب قریب ویسا ہی خوشگوار تعلق پیدا ہو جاتا اور برقرار رہتا ہے جیسے نظامِ شمسی کے سیاروں میں پایا جاتا ہے جن کا مقصد تو ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ سورج کے گرد گھومیں لیکن جن کا مدار (Orbit) الگ الگ ہوتا ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے سے بچ جاتے ہیں۔

(ہ) شک وشبہہ سے بالا دیانت داری

ہماری ذاتی دیانت داری سے دوسروں میں اعتماد پیدا ہوتا ہے جو جذباتی بنک اکاؤنٹ میں گراں قدر اضافے کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ ذاتی دیانت داری کے بغیر یہ اکاؤنٹ اکثر و بیشتر ''جمع'' (Credit) کے بجائے ''اخراج'' (Debit) کی حالت میں رہتا ہے۔ ہم لاکھ کوشش کریں کہ اپنے ساجھے داروں، رفقائے کار اور ماتحتوں کو سمجھیں اور پہچانیں، ان کی دلداری کے لیے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا خیال رکھیں، وعدہ خلافی اور عہد شکنی سے بچیں اور اپنے حقوق سے تجاوز اور اپنی ذمہ داریوں سے گریز نہ کریں لیکن پھر بھی جب تک ہمارے بارے میں یہ تاثر موجود ہو کہ ہم دیانت دار نہیں بلکہ دوغلے ہیں، ہم اعتماد کا خزانہ کبھی نہ بھر پائیں گے۔

یہ بیان تھوڑی وضاحت چاہتا ہے:

فرض کیجیے ہمیں ایک شخص کے بارے میں شبہہ ہو کہ وہ چور ہے۔ جب کوئی چیز چوری ہو جائے اور وہ شخص کہے کہ میں نے چوری نہیں کی اور وہ سچ کہہ رہا ہو پھر بھی ہم اس پر اعتماد کرتے ہوئے ایک جھجک محسوس کریں گے اور یوں اس کے جذباتی بنک اکاؤنٹ میں خواہ مخواہ کمی واقع ہو جائے گی۔ اس کے برعکس وہ شخص، جسے ہم نے دیانت داری کا عادی پایا ہو اور دیانت داری جس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہو، اس سے اوّل تو پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جائے گی کہ اس نے چوری کی ہے یا نہیں اور اگر رسماً یا قانونی تقاضا پورا کرنے کے لیے پوچھ ہی لیا جائے اور وہ چوری سے انکار کرے تو ہم پورے اعتماد سے اس کی بات پر یقین کر لیں گے۔ اِس طرح اُس کے جذباتی بنک اکاؤنٹ میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی حالانکہ ہوسکتا ہے اس نے چوری کی ہو۔ دراصل دائمی دیانت داری (Integrity) اور وقتی دیانت داری (Honesty) میں بہت فرق ہے اور اس فرق کو لفظی جامہ پہنایا جائے یا نہ پہنایا جائے، یہ نادانستہ طور پر ہمارے انسانی تعلقات میں اہم کردار ادا کرتا رہتا ہے۔

Marfat.com

(و) مخلصانہ معافی

جب ہماری کسی غلطی سے ہمارے جذباتی نیک اکاؤنٹ میں کمی ہو جائے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اُس فریق سے معافی چاہیں جس کے دل میں ہماری غلطی سے ہمارے بارے میں بداعتمادی پیدا ہوئی ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں سو فیصد مخلص ہونا چاہیے۔ نیم دلانہ لہجے اور پھوکے لفظوں میں نہیں، فراخ دلی اور مخلصانہ الفاظ میں معافی مانگنی چاہیے۔ مثلاً:

''میری غلطی تھی۔ میں قصوروار ہوں''۔

''میں نے بہت بدتمیزی کی تھی، میں بے حد شرمندہ ہوں''۔

''مجھے آپ سے یوں پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں، مجھے چھوٹا سمجھ کر معاف کر دیں''۔

''میں نے دوسروں کی موجودگی میں آپ پر تنقید کی۔ مجھے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کا دل دُکھایا۔ ازراہِ کرم میری کوتاہی معاف کر دیجیے''۔

یہ عام انسانی رویہ ہے کہ ہم دوسروں پر بے جا الزام دھرنے میں تو شیر ہیں لیکن اپنی غلطی ثابت ہونے پر چپ سادھ لیتے ہیں۔ صاحب کردار شخص کسی پر الزام دھرتے ہوئے سو بار سوچتا ہے کہ کہیں میں خود تو غلطی نہیں کر رہا۔ کسی کی کردار کُشی ایک طرح سے اس کا قتل ہوتی ہے۔ کُشی کے لفظ میں قتل کے معنی صاف موجود محسوس کیے جا سکتے ہیں جو انگریزی اصطلاح Character Assassination میں مزید کُھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اوّل تو ہمیں الزام تراشی سے اجتناب کرنا چاہیے، ورنہ اپنی غلطی ثابت ہونے پر کھلے دل اور واضح الفاظ میں معافی مانگنی چاہیے۔ اس معاملے میں ہمارا رویہ اُن اخبارات اور ٹیلی وژن کمپنیوں جیسا نہیں ہونا چاہیے جو الزام تو شہ سرخیوں میں لگاتی ہیں اور اپنی غلطی دبے لفظوں میں تسلیم کرتی ہیں۔

کردار سے عاری شخصیت رکھنے والے لوگ معافی مانگنے کو اپنی کمزوری سمجھتے ہیں۔ سیاست، خصوصاً پاکستان جیسے ملکوں کی سیاست میں شرافت، نرم گوئی اور انکسار کو کمزوری اور اس کے برعکس بدتمیزی، بڑھک بازی اور ڈھٹائی کو طاقت سمجھا جاتا ہے۔ ان نام نہاد طاقتور قائدین سے لوگ اپنی غلطیوں پر شرمسار ہونے کے بجائے اُن پر اصرار ہی کی توقع رکھتے ہیں۔ نتیجہ: اوپر سے طاقتور اور اندر سے کھوکھلے قائدین ظلم پر ظلم، بدلگامی پر بدلگامی اور غلطی پر غلطی کیے چلے جاتے ہیں۔ محبت، اخلاق، تہذیب اور نیک جذبات کا اظہار اور اپنی غلطیوں کا صاف دلی اور کھلے لفظوں میں اقرار صرف اُن قائدین کا خاصہ ہوتا ہے جو اندر سے مضبوط ہوتے ہیں، خواہ اُوپر سے نرم مزاج ہی نظر آتے ہوں۔ مخلصانہ معافی سے جذباتی اکاؤنٹ میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبانی طور پر معافی مانگنے اور عملی طور پر اس غلطی پر اصرار کرنے سے جذباتی اکاؤنٹ میں گھاٹا پڑتا رہتا ہے۔

غلطی ہو جانا ایک بات ہے، اور اسے تسلیم نہ کرنا یا اس پر اصرار کرنا دوسری بات ہے۔ لوگ ہماری غلطیاں

معاف کر دیتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انسان سے غلطی کا ارتکاب ہو ہی جاتا ہے۔ غلطی کا تعلق عموماً ہماری عقل سے ہوتا ہے۔ ہم اس لیے غلطی کر جاتے ہیں کہ کسی مقام پر ہماری عقل دھوکا کھا جاتی ہے۔ لیکن جس غلطی کا تعلق ہمارے دل سے ہو وہ ناقابلِ معافی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر، اپنے کسی ناجائز مقصد کی خاطر ایسا کیا ہے۔ جب کوئی اپنی سوچی سمجھی اور بدنیتی پر مبنی غلطی کا ڈھیٹ بن کر جواز پیش کرنے لگتا ہے تو اس کا جذباتی اکاؤنٹ نہایت تیزی کے ساتھ خالی ہونے لگتا ہے۔

Marfat.com

تیسواں باب

سب کی جیت

ہم دنیا بھر کے بلند پایہ اصول زبانی یاد کرلیں اور ان پر عمل نہ کریں تو حاصل حصول صفر ہی ہوسکتا ہے۔ خدا کی محفوظ ترین وحی، قرآنِ حکیم کی صورت میں، ہمارے ہر گھر میں موجود ہے لیکن اسے خوبصورت جزدان میں بند کر کے کسی اونچے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے تو کیا ہوگا؟ وہی ہوگا جو عالمِ اسلام اور ایک ارب اور بیس کروڑ مسلمانوں کی افسوسناک، شرمناک اور عبرت ناک حالت کی صورت میں اہلِ دِل کو خون کے آنسو رُلا رہا ہے۔

اسلام میں فرد کی اہمیت سے کوئی کافر بھی انکار نہیں کرسکتا۔ کسی ایک فرد کے ناحق قتل کو خدا نے تمام انسانیت کا قتل قرار دیا ہے۔ پھر اس حقیقت کی طرف بھی بار بار توجہ دلائی ہے کہ آخرت میں کوئی کسی کی غلطیوں اور گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہر شخص کو اپنے ہی اعمال کی سزا وجزا دی جائے گی۔ لیکن مسلمانوں نے اس واضح ترین صورتِ حال پر کم ہی غور کیا ہے بلکہ اسے جانتے بوجھتے فراموش کیا ہے کہ قرآنِ حکیم میں محفوظ کردہ اکثر و بیشتر دعائیں انفرادی نہیں، اجتماعی ہیں۔ تمام نمازوں کی ہر رکعت میں پڑھی جانے والی سورہ فاتحہ ہی کو دیکھ لیں۔ ''اے رب العالمین ''ہم'' تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور ''ہم'' تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ ''ہمیں'' صحیح اور سیدھا راستہ دِکھا''۔ قرآنِ حکیم میں جہاں سڑسٹھ (67) آیات ایسی ہیں جن میں ''اے میرے رب''! (رب یا ربّی) کہہ کر دعا کی گئی ہے، وہاں ایک سو گیارہ (111) آیات ایسی ہیں جن کا آغاز ''اے ہمارے رب'' (ربّنا) سے ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کو جہاں ''ربِّ زِدنی عِلما'' یاد ہے، وہاں ربّنا آتِنا فِی الدُّنیا حَسَنَۃ ...... بھی یاد ہوگی۔ لیکن ان اجتماعی دعاؤں کے پیچھے جو حکمت موجزن ہے ہم اس سے غافل ہو چکے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک صرف اپنی کامیابی اور اپنی نجات کی فکر میں پڑ کر اجتماعی، قومی اور ملّی کامیابی اور نجات سے بے پروا اور لاتعلق ہو چکا ہے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ ہمارے ہادیِ برحق، رسُولِ خدا نے ہمیں باہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہونے کی تلقین کی تھی اور خدا نے مسلمانوں کی پہچان سورہ فتح کے ان یادگار الفاظ میں بتائی تھی کہ محمد رسول اللہ والذینَ معہٗ اشِدّ آ ءُ علَی الکُفّارِ و رُحماۗءُ بینھُم (محمدؐ رسول اللہ اور آپؐ کے ساتھیوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے دین کا انکار کرنے والوں کے لیے تو سخت گیر ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے لیے سراپا رحمت)۔ اور تو اور ہمیں یہ معمولی سی بات یاد نہیں رہی کہ ہم جس تالاب کی مچھلی ہوتے ہوئے باقی مچھلیوں کو کھا جانا چاہتے ہیں، اگر ہم اسی کی حفاظت اور دیکھ بھال سے لاتعلق ہو گئے تو ایک دن آئے گا کہ ہم بھی زندہ نہ رہ سکیں گے۔ یہ وہ بات تھی جسے آج مغرب کے سیاسی، کاروباری اور روحانی گرو Win-Win Policy ''سب کی جیت کی حکمت عملی'' کے نام سے پائیدار کامیابی کے نسخے کے طور پر ''بیچ'' رہے ہیں اور جسے ہم اپنی مغرب دشمنی کے باوجود، مغرب سے مرعوبیت کے باعث، بالآخر مہنگے داموں خریدنے پر تیار ہو جائیں گے لیکن شاید اس وقت تک

Marfat.com

باہمی بے رحمی کے ہاتھوں بُری طرح زخمی اور کمزور بھی ہو چکے ہوں گے۔

چلیے آپ اگر کسی وجہ سے خدا اور رسول کا کلمہ پڑھنے کے باوجود اُن کی بات پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں تو اجتماعی کامیابی کے لیے ''سب کی جیت'' کا مغربی فارمولا ہی اپنا لیں۔ ''ون ون'' یا ''سب کی جیت'' کوئی حربہ، ہتھکنڈا یا طریق کار نہیں، انسانی تعلقات کا ایک بھرپور فلسفہ ہے۔ یہ انسانی تعلقات کی چھ امکانی صورتوں میں سے ایک ہے جو دوسری پانچ صورتوں سے بہر صورت بہتر ہے۔ یہ چھ صورتیں یہ ہیں: 1۔سب جیت جائیں، 2۔سب ہار جائیں، 3۔ہم جیت جائیں، دوسرے ہار جائیں، 4۔دوسرے جیت جائیں، ہم ہار جائیں، 5۔ہم جیت جائیں، دوسرے جیتیں یا ہاریں، 6۔جس کام میں سب نہ جیت سکیں وہ کام ہی نہ کیا جائے۔

1۔سب جیت جائیں

یہ دل و دماغ کا ایک رویہ ہے جو تمام انسانی معاملات میں ہمیشہ سب کی مشترکہ بھلائی چاہتا ہے۔ یہ رویہ ایسے معاہدے اور حل تلاش کرتا ہے جن سے تمام متعلقہ فریقوں کو یکساں فائدہ اور اطمینان حاصل ہو۔ اپنی جیت اور دوسروں کی ہار وہ لوگ چاہتے ہیں جو اصولوں کے بجائے اقتدار اور سماجی درجہ بندی کے حوالے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ انسانی اور روحانی قدروں کو نظر انداز کر کے صرف مادی فائدے کے پیچھے بھاگتے ہیں اور یوں وقتی فائدوں پر دائمی فائدے قربان کر دیتے ہیں۔ سب کی جیت کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کے لیے تمام متعلقہ فریقوں کا رویہ مشترکہ بھلائی پر مبنی ہونا چاہیے۔ کوئی ایک فریق اکیلا سب کی جیت کا ہدف حاصل نہیں کر سکتا۔

2۔سب ہار جائیں

جب تمام فریق صرف اپنی جیت اور دوسروں کی ہار چاہتے ہوں تو اکثر نتیجہ ''سب کی ہار'' کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے فائدے کے لیے دوسرے فریق کو نقصان پہنچانے ہی پر تلے بیٹھے ہوں تو ہماری حالت اُس قاتل کی ہوتی ہے جو قتل کے بعد پھانسی چڑھ جاتا ہے۔ غور فرمایئے کہ قتل کس طرح خودکشی میں بدل جاتا ہے۔ افسوس کہ روحانیت کو نظر انداز کر کے انسانوں نے خدا تعالیٰ کا یہ فرمان اپنا مقدر بنا لیا ہے کہ بے شک انسان خسارے میں ہے (103:2)۔ اس مقدر سے بچنے کا صرف ایک راستہ ہے کہ انسان اس آیت کے اگلے حصے پر عمل کرتے ہوئے اچھائی اور صداقت ہی کو وتیرہ بنائے اور اسی کی تلقین کرے۔

3۔ہم جیت جائیں، دوسرے ہار جائیں

اس صورت میں ہمارا رویہ یہ ہوتا ہے کہ ہم نہ صرف اپنی جیت چاہتے ہیں، ہم دوسرے کی ہار بھی چاہتے ہیں۔ بہت سے کھیلوں میں ایک کھلاڑی یا ایک ٹیم جیت جاتی ہے اور دوسرا کھلاڑی یا دوسری ٹیم ہار جاتی ہے۔ لیکن دوسروں کی ہار

Marfat.com

چاہنے والے اکثر ناجائز اور پُر فریب حربوں اور ہتھکنڈوں پر بھی اُتر آتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اپنا سیاسی، سماجی اور اقتصادی مرتبہ اور مقام استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مشہورِ زمانہ فلم Ben Hur (بن حُر) میں رَتھوں کی دوڑ میں ہر قیمت پر جیتنے کے لیے ایک فریق اپنی رَتھ کے پہیوں کے ساتھ ایسے تیز دھار آلات باندھ لیتا ہے جن سے دوسروں کی رتھوں کے پہیے کٹ کر رہ جاتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ شخص نہ صرف جیت نہیں پاتا بلکہ اپنی جان بھی ہار جاتا ہے۔

4۔ دوسرے جیت جائیں، ہم ہار جائیں

یہ ایک مریضانہ رویّہ ہے جس میں عزتِ نفس سے محروم مُردہ دِل اور افسردہ مزاج لوگ یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ وہ بھی جیت سکتے ہیں۔ ''میری قسمت میں تو خدا نے ہارنا ہی لکھا ہے''۔ ''ہاں، ہاں! تم بھی میرے اُوپر چڑھائی کردو، میرے ساتھ ہر کوئی یہی کرتا ہے''۔ یہ رویہ ''ہم جیت جائیں، دوسرے ہار جائیں'' سے بھی بُرا اور خطرناک ہے کیونکہ اس میں انسان خدا کی عطا کردہ وہ عظیم روحانی نعمت سے بھی غفلت برتتا ہے جسے ہم امید کہتے ہیں۔ اس رویے میں نہ امید ہوتی ہے، نہ کوئی توقع اور نہ کوئی دیدہ دری۔ ایسے لوگ اگر ابتداء میں کامیاب بھی ہو رہے ہوں تو معاملے، سودے یا معاہدے کے آخری مرحلوں میں کوئی نہ کوئی ایسی غلطی یا گھپلا کر جاتے ہیں جو اُن کی ہار کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ شطرنج کے اس کھلاڑی کی طرح ہوتے ہیں جو تمام چالیں درست چلنے کے بعد آخری ایک دو چالیں (End Game) بہرصورت غلط چل جاتا ہے۔

5۔ ہم جیت جائیں، دوسرے جیتیں یا ہاریں

اصل میں بہت سے معاملات اور کھیلوں میں ہم اپنی جیت کی فکر میں اس بات سے لاتعلق ہو جاتے ہیں کہ دوسرے جیت رہے ہیں یا ہار رہے ہیں۔ ہمیں صرف اپنی جیت یا کامیابی سے سروکار ہوتا ہے اور ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی جیت اور کامیابی کے لیے حتی الامکان تیاری، محنت، سلیقہ مندی اور مہارت سے کام لیں۔ مہذب معاشروں میں عموماً یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس رویے کے حامل شخص کے سامنے صرف اپنے خواب اور ہدف ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے لیے وہ تن من دھن سے مصروفِ عمل رہتا ہے۔ بس، قرآنِ حکیم کی ایک مثل کے مطابق وہ حضرت سلیمانؑ کے لشکروں کی طرح یہ نہیں دیکھتا کہ ان کی راہ میں پڑی چیونٹیوں کی بستیوں پر کیا بیت جائے گی۔

6۔ جس کام میں سب نہ جیت سکیں وہ کام ہی نہ کیا جائے

یہ ''سب کی جیت'' ہی کا اعلیٰ تر مظاہرہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم مسئلے یا معاملے کا ایسا حل تلاش نہ کر سکیں جس میں ''ہم اور وہ'' دونوں یا سب کا فائدہ ہو تو ''ہم اور وہ'' اتفاقِ رائے سے، اختلافِ رائے پر رضامند ہو جائیں اور اُس مسئلے یا معاملے سے ہاتھ کھینچ لیں یا اُسے ملتوی کر دیں۔ بین الاقوامی سیاست اور کاروبار میں یہ رویّہ بہت کام آتا

Marfat.com

ہے اور ' میں جنلوں اور '' گلا کاٹ مقابلے'' (Cut-throat Competition) سے بچاتا ہے۔ اہم بین الاقوامی تنازعات میں التواء سے یہ فائدہ ہوسکتا ہے کہ اس دوران متعلقہ فریق ایک دوسرے کے موقف، ضرورتوں اور مجبوریوں کا بہتر اندازہ کرسکیں۔ یہی اندازہ دراصل ''سب کی جیت'' کے رویے کی جان ہے۔

انسانی زندگی میں اتنی زیادہ رنگارنگی اور بوقلمونی ہے کہ بعض اوقات خواہش کے باوجود ہم ''سب کی جیت'' یا ''جس کام میں سب نہ جیت سکیں وہ کام ہی نہ کیا جائے'' کا رویہ نہیں اپنا سکتے۔ اس لیے ہمیں ایسے موقعوں پر ''سب کی جیت'' کے اصول پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ سادہ سی مثال: چند کھلاڑیوں میں کشتی، دوڑ یا باکسنگ ہو رہی ہو تو یہ بہت کم ہوتا ہے کہ ہر کوئی برابر رہ جائے۔ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ ایک جیت جاتا ہے اور دوسرے ہار جاتے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ برابر رہنے کی صورت میں ٹیموں کو فالتو وقت دے دیا جاتا ہے تاکہ ہار جیت کا فیصلہ ہو جائے۔

یہی صورتِ حال کاروبار اور تعلیم کی ہے۔ دو بڑی کمپنیاں یا دو ملک اقتصادی ترقی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے دور اور بے نیاز اپنے اپنے ہدف حاصل کرنے کا جتن کرتے چلے جاتے ہیں اور ہر سال ہمیں پتا چلتا ہے کہ کس کمپنی یا ملک نے زیادہ ترقی کی۔ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے درمیان بھی اسی نوعیت کا غیر ارادی مقابلہ جاری رہتا ہے۔ دوسروں کو ناکام کرنے کے بجائے یہ ادارے اپنی کامیابی کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

انسانی زندگی میں کچھ مقامات ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں کسی طرح کا مقابلہ ہونا ہی نہیں چاہیے لیکن انسان غیر شعوری طور پر مقابلے پر اُتر آتا ہے اور پھر محبت اور دوستی جیسے روحانی، جذباتی اور غیر کاروباری رشتے مقابلے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ محبت اور دوستی انسانی زندگی کے وہ شعبے ہیں جہاں انسان جیت کر ہار جاتا اور ہار کر جیت جاتا ہے۔ اپنی تمام تر پائیداری کے باوجود یہ رشتے بے حد نازک ہوتے ہیں۔ جونہی اِن میں ہار اور جیت کے تصور کو دخل حاصل ہو جائے، یہ رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمارے عہد کے عظیم صوفی، نوروالے بابا فضل شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے، محبت اور دوستی صرف ایک صورت میں قائم رہ سکتی ہے، اگر آپ کے 'یار' اور آپ میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے تو آپ کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ آپ پیار کے ساتھ یار سے اپنی بات منوالیں اور اگر یار نہ مانے تو آپ یار کی بات مان لیں''۔ (''یار'' ہمارے دیسی تصوف کی وہ خوبصورت اور جامع اصطلاح ہے جو خدا، رسولؐ، محبوب اور دوست، سب پر محیط ہے۔)

''سب کی جیت'' کی پانچ سمتیں

''سب کی جیت'' ان لوگوں کا طرزِ فکر و عمل ہوتی ہے جو انسانی تعلقات میں قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ طرزِ فکر و عمل خودشناسی، تخیل، ضمیر اور قوتِ فیصلہ جیسی اُن تمام انسانی صلاحیتوں کے گھال میل سے وجود میں آتا ہے جو انسان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اس میں ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ سکیں، ایک دوسرے کو متاثر کرسکیں اور ایک دوسرے کو فائدہ پہنچا سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ مادی نہیں، روحانی ہے۔

اپنی ذات یا ذاتی فائدے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو سمجھنے اور فائدہ پہنچانے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت

Marfat.com

ہوتی ہے، خصوصاً جب ہم ایسے لوگوں سے معاملت کر رہے ہوں جو 'اپنی جیت اور دوسروں کی ہار' جیسے روایتی رویے کے عادی ہوں۔ اس صورتِ حال میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے زندگی کی پانچ "باہم منحصر" (interdependent) سمتوں (Dimension) کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے: 1- کردار، 2- تعلقات، 3- معاہدے، 4- مددگار نظام، 5- مقاصد اور طریق کار کی ہم آہنگی۔ آیئے، اِن پانچوں سمتوں کا مختصر جائزہ لیں:

کردار

کردار وہ بنیاد ہے جس پر "سب کی جیت" کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ صاحبِ کردار ہونے کے لیے شک و شبہہ سے بالا دیانتداری، بلوغت اور کشادہ دلی چاہیے۔

شک و شبہہ سے بالا دیانتداری خدا اور آخرت پر ایمان لائے بغیر مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ بے شک کچھ لوگ صرف انسان پرستی (Humanism) اور اخلاقی قدروں پر ایمان رکھنے کی بناء پر بھی شک و شبہہ سے بالا دیانتداری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اُس "عظمتِ آدم" کا عشرِ عشیر بھی نہیں جانتے جو خدا نے انسان کو اُس کے اندر اپنی روح پھونک کر، ہر لحظہ پھیلتی ہوئی کائنات کے رازوں کا علم سکھا کر اور مسجودِ ملائک بنا کر عطا کی تھی۔ جھوٹے خداؤں کو پوجنے والوں کی طرح انسان کو پوجنے والے سب کچھ بھی حاصل کر لیں لیکن انھیں وہ اطمینانِ قلب نصیب نہیں ہوتا جو صرف اور صرف سچے خدا کو پوجنے والوں کو ملتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو بظاہر خدا پرست ہیں اور ان کا طرزِ فکر و عمل بددیانتی پر منحصر ہوتا ہے بہرصورت ان انسان پرستوں سے کمتر ہیں جو شک و شبہہ سے بالا دیانتداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کا فیصلہ ہے کہ منافق کافروں سے بدتر ہیں۔ نور والے بابا فضل شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے، "کافر مٹی کی طرح ہے جس میں ایمان کا پودا اُگ سکتا ہے، منافق راکھ کی طرح ہے جس میں کچھ نہیں اُگ سکتا"۔

یہ وضاحت اِس لیے کی گئی ہے کیونکہ ہمیشہ اور ہر حالت میں دیانتداری ہی سے انسانوں کے درمیان وہ اعتماد پیدا ہوتا ہے جو کبھی کبھار کی وقتی دیانتداری سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا اور اعتماد ہی وہ دولت ہے جس سے نہ صرف محبت اور دوستی جیسے انسانی رشتے سیراب ہوتے ہیں بلکہ کاروباری روابط اور تعلقات بھی پروان چڑھتے ہیں۔

بچپن اور لڑکپن کے مقابلے میں **بلوغت** انسان کی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جب وہ اپنے حوصلے اور دوسروں کی پروا کے درمیان صحیح توازن پیدا کر لیتا ہے۔ جب انسان اپنے جذبات اور عقائد کا پوری حوصلہ مندی سے اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے جذبات اور عقائد کا بھی پورا پورا پاس کرنے لگے تو گویا وہ بالغ (Mature) ہو جاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں بلوغت = اپنے اوپر اعتماد + دوسروں کی عزت۔

"سب کی جیت" اسی طرح ممکن ہوتی ہے کہ ہمارے رویّے میں یہ توازن ہر وقت کارفرما رہے۔ اگر ہم حوصلہ مندی یا ذاتی اعتماد میں مضبوط لیکن دوسروں کی پروا میں کمزور ہوں گے تو ہم اپنی جیت اور دوسروں کی ہار کے چکر

Marfat.com

میں پڑ جائیں گے۔اسی طرح اگر ہم حوصلہ مندی اور ذاتی اعتماد میں کمزور لیکن دوسروں کی بہت زیادہ پروا کرتے ہوں تو ہم اپنی ہار اور دوسروں کی جیت کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔سب کی جیت کے لیے اعتماد اور عزت دونوں کی ضرورت ہے۔

وہ لوگ جنھیں بے حد و حساب خزانوں کے مالک خدا، بے حد و حساب خوبیاں رکھنے والی کائنات اور بے حد و حساب امکانات کے حامل انسان پر اعتماد نہ ہو کشادہ دِلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔ وہ اِس وہم میں پڑ جاتے ہیں کہ ہر چیز بہت محدود مقدار اور تعداد میں موجود ہے لہٰذا ہمیں خِسّت اور کنجوسی سے کام لیتے ہوئے جیسے بھی ممکن ہو اپنے لیے یہ محدود چیزیں زیادہ سے زیادہ مقدار اور تعداد میں حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔اس رویے کو ہم تنگ دلی اور تنگ نظری کا نام دے سکتے ہیں۔

تنگ دل اور تنگ نظر لوگ دوسروں کا فائدہ سوچنا تو بعد کی بات ہے، ان کی تعریف سُن کر بھی دُکھی ہو جاتے ہیں جیسے روپے پیسے کی طرح تعریف بھی کوئی محدود سی چیز ہے اور اس میں سے کچھ منہا ہو گیا تو ان کے لیے شاید کچھ نہ بچے گا۔ وہ ہر وقت دوسروں کی کامیابی، تعریف اور اعلیٰ کارکردگی کا صرف ایک مطلب لیتے ہیں کہ وہ دوسروں سے چھوٹے ہو گئے ہیں۔وہ اندر ہی اندر دوسروں کی ناکامی، بدنامی اور نقصان کی امید لگائے رکھتے ہیں اور ان سے آگے نکلنے کی خاطر دنیا کا مال جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔انھیں پہچاننا زیادہ مشکل نہیں ہوتا، ان کے گرد ''ہاں گو'' لوگوں (Yes Men) کا ایک ٹولا ہر وقت موجود ہوتا ہے جو انھیں اُن کے برابر کے لوگوں سے برتر قرار دیتا رہتا ہے۔یہی نہیں، وہ اپنے ماتحتوں میں بھی ایسے لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کے غلط فیصلوں پر بھی ان کا ہاتھ نہ روک سکیں۔دُور جانے کی ضرورت نہیں۔اگر ہم عالم اسلام کے،خصوصاً پاکستان کے سیاسی، مذہبی، کاروباری اور فوجی قائدین پر ایک ہلکی سی نظر ڈالیں تو ہمیں اس رویے کی بیسیوں چلتی پھرتی مثالیں مل جائیں گی۔

کشادہ دِل اور وسیع النظر لوگوں کا رویہ اور ہی ہوتا ہے۔انھیں خدا کے فضل و کرم، کائنات کی فراوانی اور سخاوت اور اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔وہ ایمان کی حد تک یہ سمجھتے ہیں کہ نہ صرف آخرت بلکہ اس دنیا میں بھی، جسے خدائے رحمان نے تمام ذی حیات مخلوق کی پرورش کا سامان دے رکھا ہے، سب کے لیے بہت کچھ ہے۔وہ اپنی جیت اور دوسروں کی ہار یا دوسروں کی جیت اور اپنی ہار کی فکر میں مبتلا ہوئے بغیر ''ایک اکیلا اور دو گیارہ'' کے اصول کے مطابق اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ اکیلے اکیلے کام کرنے کے مقابلے میں مل کر کام کرنے سے انسان ذاتی سطح پر بھی فائدے میں رہتا ہے۔مثال: دس آدمی اکیلے اکیلے اگر سو روپیہ فی آدمی کمائیں تو کل آمدنی ایک ہزار روپے ہوگی۔اس کے برعکس اگر وہی دس آدمی مل کر کام کریں تو ایک ہزار کے بجائے دو ہزار روپے کما سکتے ہیں۔اس طرح ہر آدمی کو سو کی جگہ دو سو روپے مل سکیں گے۔یہ حقیقت ہے کہ بڑے کاموں میں کسی ایک مہارت کی نہیں، کئی مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔اکیلا آدمی عموماً ایک ہی مہارت رکھتا ہے۔کام کی تکمیل میں جن دوسری مہارتوں کی ضرورت پڑتی ہے اُن کے ماہرین اگر آپ کے رفیقِ کار بن جائیں تو کام جلدی، سستا اور بہتر ہو جائے گا۔

Marfat.com

۔ قصہ مختصر، وہ صاحب کردار شخص جو شک وشبہ سے بالا دیانتداری، بلوغت اور کشادہ دلی کا مظاہرہ کرے، انسانی تعلقات اور اجتماعی کامیابی کے لیے نہ صرف موزوں ترین ہوتا ہے بلکہ دوسرے بھی اسے موزوں ترین سمجھتے ہوئے قیادت کا اعزاز دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

تعلقات

وہ تعلق، جس میں فریقین کے جذباتی بنک اکاؤنٹ اچھے خاصے ہوں اور وہ "سب کی جیت" کے لیے مخلص بھی ہوں، اجتماعی کامیابی کے لیے بہترین ہوتا ہے۔ ایسے تعلق میں توجہ طلب امور کو نظر انداز کیے بغیر اور فریقین کے مؤقف کی اہمیت سے انکار کیے بغیر آگے بڑھا جاتا ہے۔ بس، وہ زور جو منفی انداز سے دوسروں کو غلط ثابت کرنے پر لگ رہا تھا اب مثبت انداز سے معاملات کو سلجھانے اور اختلافات کا کوئی مشترکہ حل ڈھونڈنے میں صَرف ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب فریقین میں سے ایک یا زیادہ ایسے ہوں جو "سب کی جیت" کے بجائے "کسی کی جیت اور کسی کی ہار" کے رویّے کے عادی ہوں تو معاملات سلجھنے کے بجائے الجھنے لگتے ہیں اور موقفوں کا اختلاف کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں "سب کی جیت" کے قائل فریق کو بہت صبر اور برداشت سے تادیر محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایسے فریق کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ جہاں وہ دوسروں کا موقف پوری طرح سمجھنے کے لیے انھیں کھُل کر بولنے دے وہاں جب وہ خود بولے تو اپنا موقف بھی پوری حوصلہ مندی سے بیان کرے۔ ایک طرف اس کی برداشت اور دوسری طرف اُس کا حوصلہ آہستہ آہستہ دوسروں کو یقین دلانا شروع کر دے گا کہ وہ واقعی صرف اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمام فریقوں کے فائدے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔

"سب کی جیت" چاہنے والے فریق کا کردار جتنا زیادہ مضبوط ہوگا اور اس کی دیانت داری جتنی زیادہ شک وشبہ سے بالا ہوگی، وہ اتنا ہی زیادہ دوسرے فریق کو متاثر کر سکے گا۔ اس طرح وہ لوگ جو پہلے "ایک کی ہار، دوسرے کی جیت" کے مفروضے کو حرفِ آخر سمجھ کر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مصروف تھے، ایک دوسرے سے مثبت تعاون کی راہ پر آجائیں گے اور یوں وہ معاملت جو پہلے محض ایک سوداکاری (Bargaining) تھی، اب دل ودماغ کے گھسے پٹے رویوں کو خیرباد کہہ کر ایک سراسر نئے طرزِ فکر وعمل کی شکل اختیار کر لے گی۔

معاہدے

جب ایک مرتبہ دل کا احساس اور دماغ کی سوچ بدل جائے گی تو معاہدے بھی بدل جائیں گے۔ اب معاہدے کے فریق، ایک دوسرے کو فریقِ مخالف قرار دینے کے بجائے "رفقائے کامیابی" کی حیثیت سے پہچاننے لگیں گے۔

"سب کی جیت" کے اصول پر ہونے والے ہر معاہدے کے یہ پانچ واضح عناصر ہوں گے:

(الف) کب اور کیا کرنا مقصود ہے، اس سلسلے میں مطلوبہ نتائج کا تعین تو کیا جائے گا لیکن طریق کار میں حالات اور

ضروریات کے پیشِ نظر تبدیلی کی گنجائش رکھی جائے گی۔

(ب) وہ رہنما اصول اور حکمت عملی واضح کردی جائے گی جس کے مطابق مطلوبہ نتائج حاصل کیے جائیں گے۔

(ج) وسائل کے سلسلے میں اُس افرادی، مالی، تکنیکی یا انتظامی امداد کی وضاحت کردی جائے گی جو مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے مہیا کی جائے گی۔

(د) جواب دہی یا احتساب (Accountability) کی خاطر کارکردگی کے معیار اور اس کی جانچ پرکھ کے اوقات طے کردیے جائیں گے۔

(ہ) یہ طے کردیا جائے گا کہ جانچ پرکھ اور احتساب کے ذریعے سے سامنے آنے والی صورتِ حال میں جس کسی کی کارکردگی صحیح اور اچھی ثابت ہوگی اسے کیا اجر ملے گا اور جس کسی کی کارکردگی غلط اور بُری ثابت ہوگی اسے کیا سزا ملے گی۔

یہ پانچ عناصر ''سب کی جیت'' کے تحت ہونے والے معاہدوں کو ایک نئی اور جداگانہ زندگی دے دیتے ہیں۔ باہمی افہام و تفہیم اور ان عناصر پر اتفاقِ رائے سے ایک معیار یا کسوٹی وجود میں آجاتی ہے جس کے حوالے سے تمام متعلقہ فریق اپنی اپنی کامیابی کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ یہ بات انسانی روح سے قریب تر اور اس کے لیے باعثِ اطمینان ہوتی ہے کہ دوسروں کے محاسبے کی جگہ ہم اپنا محاسبہ خود ہی کرلیا کریں۔ ہماری روح اور ہمارا ضمیر جاگ رہے ہوں تو کسی دوسرے کے مقابلے میں ہم خود کہیں بہتر جانتے ہیں کہ ہم نے کہاں غلطی یا کوتاہی کی ہے۔ تمام باصلاحیت اور باکمال لوگ دوسروں کے بتانے یا انگلی اٹھانے سے پہلے یہ جان لیتے ہیں کہ انھوں نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ روحانی تربیت کا پہلا نتیجہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ہم خود اپنے سب سے بڑے اور کڑے نقاد بن جاتے ہیں۔

جیسے جیسے ہم خود احتسابی کے عادی ہوتے جاتے ہیں ہمارا اعتبار بڑھتا جاتا ہے اور یہ اعتبار اور اعتماد ہی تو ہے جس سے انسانی تعلقات اور معاملات میں جذباتی بنک اکاؤنٹ بھرا رہتا ہے اور ہم ایک دوسرے کی کھلی نگرانی اور در پردہ جاسوسی سے بے نیاز ہوکر ایک دوسرے کی عزتِ نفس میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ یاد رہے کہ خداوند کریم نے قرآنِ حکیم میں زبردست تاکید کی ہے کہ معاہدوں کی شرائط کو نہ صرف واضح کرنا چاہیے بلکہ انھیں لکھ لینا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاہدوں کو تحریری شکل دینے اور شرائط کی وضاحت سے معاشرے اور معیشت میں جھگڑے کی جگہ امن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

اگر ہم سیاسی اور سماجی کارکنوں، اور سرکاری اور کاروباری عملے کو ''سب کی جیت'' کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں تو پہلا اہم ترین کام یہ کرنا چاہیے کہ زیرِ تربیت لوگوں کو واضح طور پر بتایا جائے کہ ہم اس تربیت سے حاصل کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں انھیں ''ہدف کو ہمیشہ ذہن میں رکھنے'' (Maintenance of Aim) کا عادی بنانا چاہیے۔ اس ایک بات سے تربیت بامقصد ہوجاتی ہے۔ جب زیرِ تربیت فرد کو یہ معلوم اور یاد ہو کہ تربیت کی تکمیل سے کیا فوائد حاصل ہوں

Marfat.com

گے تو اس کے اندر ایک نیا جذبہ بلکہ ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ کہیں بہتر اور کہیں کم مدت میں تربیت مکمل کر لیتا ہے۔ اگرچہ رابعہؒ العدویہ جیسی عاشقِ الٰہی صوفی نے روحانی ریاضت کے فوائد کے بجائے صرف اور صرف خدا کی محبت ہی کو اپنا اوّل و آخر مقصد بنانے کی تلقین کی ہے لیکن خود خدا نے، جو ہمارے دلوں کا حال ہم سے بھی بہتر جانتا ہے، اہلِ ایمان کے لیے جنت کی واضح تصویر کشی کر کے ہمارے اندر روحانی تربیت کے لیے جذبہ اور ولولہ پیدا کرنا ضروری سمجھا ہے۔

''سب کی جیت'' کے حوالے سے دوسرا اہم ترین کام یہ کرنا چاہیے کہ زیرِ تربیت افراد کو اپنا محاسبہ خود کرنے کا عادی بنا دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ ان کے کام میں کوئی دوسرا غلطیاں ڈھونڈے، ان میں یہ حوصلہ اور جرأت پیدا کرنی چاہیے کہ جو کام ان سے ٹھیک نہیں ہو رہا اُس کی بابت وہ اپنے استاد یا کسی بہتر جاننے والے سے ہدایت اور اصلاح کی درخواست کرے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، علوم و فنون ہوں، حکومت ہو، کاروبار ہو یا تصوف، مقصد پر نظر رکھنے اور اپنا محاسبہ خود کرنے سے تربیت کے کہیں بہتر نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مددگار نظام

''سب کی جیت'' کا اصول اُنھی اداروں میں پروان چڑھ سکتا ہے جن کے مختلف نظام اس اُصول سے ہم آہنگ اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے مددگار ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم مُنہ سے تو ''سب کی جیت'' کی ہمنوائی کریں اور عزت افزائی اور ترقی ان لوگوں کے لیے مخصوص رکھیں جو ''ہر قیمت پر اپنی جیت'' کے اصول پر کاربند ہوں۔ دُنیوی زبان میں اس صورتِ حال کو دوغلہ پن اور روحانیت کی زبان میں منافقت کہیں گے۔

اگر ہم ''سب کی جیت'' کے اصول کو واقعی بہتر سمجھتے ہیں تو ہمارے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ سیاسی سطح پر اس کی مثال یہ ہے کہ ہم مُنہ سے تو کہتے ہیں کہ ہماری پالیسی غربت و افلاس کو دُور کرنا ہے تاکہ ملک کی دولت سے ''سب کی جیت'' ہو مگر ہمارا عمل یہ ہے کہ غریب لوگ غریب سے غریب تر اور امیر لوگ امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں ہر سالانہ بجٹ کے موقع پر ہر وزیرِ خزانہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی تقریر تو ''سب کی جیت'' کے اصول کی روشنی میں کرتا ہے لیکن اس کے پیش کردہ بجٹ سے عملاً یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ غریبوں کی تعداد میں اضافہ اور ان کی قوتِ خرید میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

کہنے کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر وزیرِ خزانہ کی نیت میں فتور ہوتا ہے اور وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایسا بجٹ بناتا ہے جس سے غریب کو فائدہ نہ ہو۔ لیکن یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ خرابی نیت میں نہیں، اس تضاد میں ہے کہ ہم چاہتے تو یہ ہیں کہ حالات میں مثبت تبدیلی آ جائے لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ اگر سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام وہی رہیں گے جو پہلے تھے تو تبدیلی کیسے آ سکتی ہے؟ مقاصد بدل جائیں تو مقاصد کے حصول کے لیے نظام بھی بدلنے پڑتے ہیں۔ ہمارے عہد میں سوویت یونین کے ٹوٹ پھوٹ جانے اور وہاں کمیونزم کے ختم ہو جانے سے ''دوقطبی دنیا'' (Bi-polar World)

Marfat.com

بھی ختم ہوگئی ہے اور امریکہ واحد سپر پاور بن گیا ہے۔ اسی طرح سویٹ یونین میں کمیونزم کے خاتمے اور چین میں سوشلسٹ معیشت کی جگہ ''کھلی منڈی'' (Free Market) آ جانے سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اقتصادی سطح پر ساری دنیا میں کیپٹلزم (سرمایہ داری نظام) کا سکہ چل نکلا ہے اور دُنیا کا ایک نیا عالمی نظام (A New World Order) قائم ہو گیا ہے۔ بظاہر تو سرمایہ داری پر مبنی اس نئے عالمی نظام سے ہر ملک کو فائدہ پہنچنا چاہیے تھا لیکن حقیقت یہ ہے سرمایہ داری نظام مغرب (امریکہ اور یورپ) میں تو کامیاب ہے لیکن دوسری ہر جگہ پر ناکام ہے۔

دورِ حاضر کے ایک اہم ترین ماہرِ اقتصادیات، ہرنانڈو ڈی سوٹو (Hernando De Soto) نے اس تضاد کو اپنی بے حد لائق توجہ کتاب The Mystery of Capitalism (سرمایہ داری نظام کا راز) میں واضح ترین الفاظ میں کچھ یوں بیان کیا ہے: ''غریب ملکوں کو کیپٹلزم کا درس دینے والے بھول جاتے ہیں کہ جب تک اِن ملکوں میں کروڑوں لوگ اپنے گھر اور کروڑوں کاشتکار اپنی زمین اور اپنی ملکیت سے محروم رہیں گے یہ ملک کبھی غربت کے پنجے سے نہیں نکل سکتے''۔ یہی وہ تضاد ہے جو ہمارے ہر وزیرِ خزانہ کی بجٹ تقریر کو جھوٹا ثابت کرتا رہتا ہے۔ اگر ہم واقعی ''سب کی جیت'' کے اصول کے تحت غربت ختم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں موجودہ فرسودہ اقتصادی نظام کو بدل کر ہر بے گھر کو گھر، ہر بے زمین کاشتکار کو زمین اور کچی آبادیوں کے ہر مکین کو زیرِ استعمال پلاٹ کے مالکانہ حقوق دینے ہوں گے۔ اس کے بغیر ہمارے بے گھر، بے زمین اور بے ملکیت عوام وہ آزادانہ فیصلے کر ہی نہیں سکتے جن کے باعث اہلِ مغرب نے سرمایہ داری نظام کے تحت ترقی کی ہے۔ سیدھی سی بات ہے، جب غریب ملکوں کے کروڑوں انسانوں کے پاس سرمایہ ہی نہ ہوگا تو وہاں سرمایہ داری نظام کیا خاک کامیاب ہوگا؟ ترقی اور کامیابی نہیں، وہاں یہ نظام وہی مایوس کن صورتِ حال پیدا کرے گا جو آج اس نے پیدا کر رکھی ہے۔

اگرچہ روایتی اقتصادیات دان انسانی آبادی کو سرمایے کے بجائے محنت میں شمار کرتے ہیں لیکن پاکستان کی نیم بے کار اور بے روزگار آبادی کو تعلیم اور ہنر سے لیس کر دیا جائے تو یہی آبادی پاکستان کے لیے سب سے بڑا اور قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سرمایے کو جدید ماہرینِ اقتصادیات انسانی سرمایہ (Human Capital) کا نام دیتے ہیں۔

مقاصد اور طریقِ کار کی ہم آہنگی

''سب کی جیت'' کے مقاصد صرف ایسے طریقِ کار سے حاصل ہو سکتے ہیں جو اُن مقاصد سے الٹ نہیں، ان کے موافق ہو۔ اس سلسلے میں ان چار مرحلوں پر مشتمل طریقِ کار اختیار کرنا چاہیے:

(الف) مسئلے کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے۔ حق تو یہ ہے کہ دوسرے فریق کی ضروریات، خواہشات اور خدشات کو اتنی وضاحت سے پہچانا اور سمجھا

Marfat.com

جائے کہ وہ خود بھی ایسا نہ کر سکے۔

مثال: حضرت امام حسنؓ کی محفل میں ایک غریب شخص نے مالی امداد کی درخواست کی۔ آپ کو تھوڑی ہی دیر پہلے حکومتِ وقت کی جانب سے کچھ رقم ملی تھی جو ایک تھیلی کی صورت میں آپ کے قریب پڑی تھی۔ آپؓ نے وہ تھیلی اٹھا کر اُس غریب شخص کو دے دی۔ حاضرین آپ کی غریب نوازی اور بے نیازی پر عش عش کر رہے تھے مگر آپ زار و قطار رو رہے تھے۔ کسی نے پوچھا، حضور! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا، میں شرمندہ ہو رہا ہوں کہ مجھے اس غریب شخص کی ضرورت مندی کا از خود اندازہ کیوں نہ ہُوا اور میں نے اس کے مانگنے سے پہلے ہی اسے وہ تھیلی کیوں نہ دے دی تا کہ وہ مانگنے کی شرمندگی سے بچ جاتا''۔

(ب) اپنے اپنے موقف پر اصرار کرنے کے بجائے اس بات پر اتفاقِ رائے پیدا کیا جائے کہ زیرِ بحث مسئلے کے کلیدی یا اہم ترین پہلو کون کون سے ہیں۔

(ج) یہ طے کیا جائے کہ کون سے نتائج ایک ایسا حل پیش کر سکتے ہیں جو سب کے لیے پوری طرح قابلِ قبول ہو۔

(د) اُن متبادل حلوں کی نشاندہی کی جائے جو ایسے نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔

بہر حال، ''سب کی جیت'' اپنی انا کی قیدی شخصیات کا نہیں، ایسے با کردار لوگوں کا کام ہے جن کی دیانتداری شک و شبہ سے بالا ہو، جو جذباتی اور ذہنی بلوغت کو پہنچ چکے ہوں اور جو خدا، کائنات اور انسانی زندگی کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہوں کہ ان کے خزانوں کی کوئی حد نہیں۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہاں انھی لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو روحانی قدروں سے مالا مال اور خدا کی رحمت کے امیدوار ہوں۔

Marfat.com

Marfat.com

چوبیسواں باب

پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ

مؤثر ترین لوگوں کی اس پانچویں عادت کا تعلق بھی روحانیت ہی سے ہے۔صرف وہی لوگ دوسروں کا مؤقف، حالت اور ضروریات و خواہشات کو سمجھے بغیر ان کے بارے میں اپنا فیصلہ یا محاکمہ سناتے ہیں جو اپنی ذات کے پنجرے میں بند ہوتے ہیں۔یہ لوگ اپنی خود پسندی کے باعث حقیقت کے اُسی پہلو کو تمام تر حقیقت تصور کر لیتے ہیں جو اُن کے مقامِ نظر (Vantage Point) سے دیکھی جا سکتی ہے۔یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔نُور والے بابا، فضل شاہ صاحب" فرمایا کرتے تھے،"سخی کی سخاوت اور سائل کے سوال کا آپس میں گہرا تعلق ہے، جو شخص دودھ مانگنے آیا ہے، آپ اُسے مرچیں دے کر نہیں بھیج سکتے"۔

روزمرہ کی ایک مثال: آپ کا بیٹا بہت پریشان نظر آ رہا ہے۔وہ گھٹنوں میں سر دیے، گُم سُم بیٹھا ہے۔آپ اس سے پوچھتے ہیں،" پیارے بیٹے، خیر تو ہے، کیوں پریشان ہو، کیا سوچ رہے ہو؟

بیٹا کہتا ہے، کچھ نہیں ابا جی! بس ویسے ہی پریشان ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔

آپ: جانِ من، مجھے نہیں بتاؤ گے تو کس کو بتاؤ گے؟ مجھ سے نہ چھپاؤ، بتاؤ تمھیں کیا پریشانی لاحق ہے۔تمھیں یوں گُم سُم بیٹھا دیکھ کر میں خود پریشان ہو رہا ہوں۔

بیٹا: میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔آپ سنیں گے تو اور پریشان ہو جائیں گے۔

آپ: نہیں، نہیں، تم کھل کر بتاؤ، بتاؤ گے نہیں تو پریشانی کا حل کیسے نکلے گا؟

بیٹا: ابا جی، بات یہ ہے کہ میں اس سکول سے تنگ آ گیا ہوں۔

آپ: ہیں؟ کیا کہا تم نے؟ سکول سے تنگ آ گئے ہو؟ شرم نہیں آئی تمھیں یہ کہتے ہوئے؟ ہم نے تمھاری تعلیم کے لیے اپنا پیٹ کاٹ کر تمھیں اتنے مہنگے سکول میں بھیجا۔لوگ ترستے ہیں کہ ان کے بچے ایسے سکول میں جا سکیں۔بیوقوف! تعلیم کے بغیر تم دنیا میں کیا کرو گے؟ دیکھا ہے اپنے چچا کے بچوں کو، بیچارے چھوٹی موٹی نوکری کے لیے جُوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور تم ہو کہ تمھارا پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا۔اور اب تم نیا بہانہ کھڑا کر رہے ہو کہ تمھیں سکول ہی پسند نہیں۔نالائق کہیں کے، تمھیں پتا ہے، ہمارے کتنے صدر، وزیراعظم، وزیراعلیٰ اور جرنیل اسی سکول سے نکلے ہیں؟ تھوڑی محنت کرو، دل لگا کر پڑھو، یہی سکول خود بخود اچھا لگنے لگے گا۔چلو، اُٹھو، کتاب نکالو اور پڑھو!

بیٹا: (خاموشی، خاموشی، خاموشی)

آپ: کیا اب بھی پریشان ہو؟ یہ سب تمھاری ماں کے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے، مجھے اس کی بھی خبر

Marfat.com

لینی پڑے گی!

صبر، برداشت اور دوسروں کی ضروریات، خواہشات اور مجبوریوں کو نہ صرف سمجھ کر بلکہ اپنے آپ کو دوسروں کی پوزیشن میں رکھ کر ان کی تکلیفوں کو محسوس کرنے جیسے روحانی رویّے کے بغیر ہر دوسرے گھر، دفتر، دکان، کارخانے، سکول، کالج، یونیورسٹی اور حکومت کے محکمے میں آئے دن اسی طرح کی گفتگو اور معاملت ہو رہی ہوتی ہے۔ نتیجہ: تعلقات خراب سے خراب تر اور معاملات پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی تعلقات اور باہمی معاملات کو خوش اسلوبی سے آگے بڑھانے کا ایک ہی اصول ہے: پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ۔ باپ اور بیٹے کی جو گفتگو آپ نے ابھی ابھی سُنی ہے اس میں اسی اصول کی کمی ہے۔ باپ نے یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ بیٹا سکول سے کیوں تنگ آ گیا ہے۔ اُس نے اُلٹا اُسے سمجھانا شروع کر دیا ہے کہ وہ کتنا ناشکرگزار، نالائق اور سُست لڑکا ہے۔

کردار اور ابلاغ

پڑھنا اور لکھنا ابلاغ (Communication) کے دو اہم ذریعے ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور ذریعے، سننا اور بولنا ہیں۔ پڑھنے، لکھنے، سننے اور بولنے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم دن کا بیشتر حصہ انھی میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان چاروں ذرائع ابلاغ میں مہارت ہمیں مؤثر ترین لوگوں میں شامل کرنے کے لیے بے حد اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچانا یا سمجھنا سمجھانا انسانی زندگی کی ایک انتہائی اہم صلاحیت ہے۔ لیکن ذرا غور کریں، ہم برسوں کی محنت سے پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں۔ اسی طرح بولنے پر بھی کئی سال خرچ ہو جاتے ہیں۔ لیکن کتنی افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہم دوسروں کی بات ڈھنگ سے سننے اور اسے مناسب طور پر سمجھنے کے لیے کسی تربیت کا اہتمام نہیں کرتے۔ وجہ؟ ہم اُسی کام کی تربیت حاصل کرتے ہیں، جسے ہم اہمیت دیں۔ سننے اور سمجھنے کو اہمیت دیتے تو ظاہر ہے کہ ہم اس پر بھی توجہ دیتے اور اس کی اہلیت حاصل کرتے۔ عجیب تربات یہ ہے کہ ہمیں عمر بھر دوسروں سے شکایت رہتی ہے کہ وہ ہماری بات دھیان سے نہیں سنتے اور ہمیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ شاید وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ ہم خود کس حد تک دوسروں کی بات سننے اور انھیں سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور ہم نے اس مقصد کے لیے کتنی محنت کی ہے اور تربیت حاصل کی ہے۔

یہ ایک بہت ہی نظر انداز کردہ حقیقت ہے کہ ہم سمجھنے سے پہلے سمجھانے کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ وجہ: انسانی معاشروں میں روحانی قدروں کا شعور مٹتا جا رہا ہے۔ دوسروں کی خواہشوں، خوابوں، خوفوں، مجبوریوں اور ضرورتوں کا احساس کرنا روحانیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ہمیں ہر مذہب میں ہمسایوں کی دِلداری کا خصوصی درس ملے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں قرآنِ حکیم کی کچھ ایسی آیات اور رسولِ خدا کی بعض احادیث زبانی یاد ہوں جن میں دوست اور دشمن،

Marfat.com

مومن اور کافر کی تفریق کے بغیر ہر بندۂ خدا کے ساتھ محبت اور مروّت سے پیش آنے کی تلقین کی گئی ہو۔لیکن ہم دوسروں کے لیے خواہ اور بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں، ان کی بات دھیان سے سننے اور انھیں سمجھنے کی شاید ہی زحمت کرتے ہیں۔ ہمسایوں کی بات چھوڑیے، ہم خاوند ہوں تو بیوی کی، بیوی ہوں تو خاوند کی، ماں باپ ہوں تو اولاد کی، اولاد ہوں تو ماں باپ کی، ساتھی ہوں تو ساتھیوں کی، افسر ہوں تو ماتحتوں کی، ماتحت ہوں تو افسروں کی، لیڈر ہوں تو کارکنوں کی، کارکن ہوں تو لیڈروں کی، دوست ہوں تو دوستوں کی، اور محبّ ہوں تو محبوب کی، اور محبوب ہوں تو محبّ کی بات سننے اور انھیں سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ہم میں سے ہر ایک کی نہیں تو ہر دوسرے کی زبان کی نوک پر یہ گِنا چُنا جملہ دھرا رہتا ہے، ''تم میری بات نہیں سنتے، "You don't understand me"۔ جیسے ہم تو اس کی بات سن کر اسے بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ نتیجہ: ہماری شکایت بالآخر اس دھمکی پر جا ختم ہوتی ہے، ''میں تمھیں سمجھ لوں گا''۔اس کے باوجود ہمیں یہ وہم لاحق رہتا ہے کہ ہم ابلاغ کے ماہر ہیں۔

جب تک ہم دوسروں کی انفرادیت کی تہ تک نہیں پہنچتے جس کے لیے ان کی بات دھیان سے سننا اور ان کی ضرورتوں، خواہشوں، خدشوں اور مجبوریوں کا ہمدردانہ احساس ضروری ہے، ہم انھیں متاثر نہیں کر سکتے۔یہ کام ہم کسی خاص جنتر منتر یا ہتھکنڈے سے نہیں کر سکتے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا کردار قابلِ اعتماد ہو جس کے باعث دوسرے ہم سے کھل کر بات کر سکیں اور ہم اپنے آپ کو ان کی جگہ رکھ کر ان کے موقف کو سمجھ سکیں۔

ابلاغ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اگر ہمیں کسی شخص کے کسی عمل پر تنقید کرنی ہو تو اُس خاص عمل ہی پر تنقید کرنی چاہیے، اس شخص کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے اور اس کی عزتِ نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہیے۔فرض کیجیے، ہمارے کسی ملازم سے کوئی برتن ٹوٹ گیا ہے۔ کہنے کو تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''مجھے پتا تھا، تم یہی کرو گے، تم ہو ہی نالائق''۔لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ہم یہ کہیں: ''اتنے سمجھدار ہو کر تم نے یہ قیمتی برتن توڑ دیا ہے۔ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی''۔ ہمارے اس رویّے سے نقصان پر اظہارِ ناراضگی تو بخوبی ہو گیا البتہ برتن کے ساتھ ساتھ ملازم کی عزتِ نفس ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ گئی۔

ہم نفس سماعت

ہمدردی (Sympathy) بہت اہم انسانی اور روحانی جذبہ ہے۔لیکن ہمدمی یا ہم نفسی (Empathy) ہمدردی کے مقابلے میں کہیں زیادہ نایاب اور قیمتی جذبہ ہے۔ہمیں کوئی دکھ بھرا صدمہ پہنچ جائے تو دوست احباب ہم سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن ہمارے دکھ کو ہماری طرح نہیں سہتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ ''ہمارے لیے'' رو دیتے ہیں۔ ہمدردی کی یہی انتہا ہے۔اس کے برعکس ہمارے ہم دم اور ہم نفس ہمارے لیے نہیں، ''ہمارے ساتھ'' کچھ اس طرح ہمارا دکھ سہتے ہیں جیسے وہ دکھ بھرا صدمہ خود انھیں پیش آیا ہو۔ایک مرتبہ پھر سنیے: وہ ہمارے لیے نہیں، ''ہمارے ساتھ'' روتے ہیں۔

Marfat.com

ہم نفسی اتنا اہم تصور ہے کہ اس کی وضاحت کے لیے تھوڑا پٹری سے اتر جانا بھی جائز ہے۔ پنجابی زبان میں وارث شاہ کی تصنیف ''ہیر'' کو قریب قریب وہی مقام حاصل ہے جو اردو میں دیوانِ غالب کو ہے۔ وارث شاہ نے اپنے کرداروں کو نام دیتے ہوئے بھی گہری رمزیت (Symbolism) سے کام لیا ہے۔ مثلاً ہیر کے ماموں ''کیدو'' ہی کو لے لیں، سورہ یوسف میں عزیزِ مصر کی بیوی (زلیخا) کے مکر یا چال کے لیے ''کید'' کا لفظ استعمال ہُوا ہے، وارث شاہ نے اسی حوالے سے ہیر کے چالباز ماموں کو ''کیدو'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ اسی داستان کا ایک زندۂ جاوید کردار ہیر کی بھابی ''سہتی'' بھی ہے۔ جب ہیر کی مرضی کے خلاف اس کی شادی رانجھے کے بجائے سید کھیڑے سے کر دی جاتی ہے تو اس کے سسرال میں ''سہتی'' ہی ہے جو ہیر کے درد کو اسی طرح ''سہتی'' ہے جیسے خود ہیر۔ چنانچہ سہتی ہی ہے جو اُسے گاؤں میں جوگی کے بھیس میں آئے ہوئے رانجھے کے ساتھ فرار ہونے میں مدد دیتی ہے۔ آپ نے ہم دمی اور ہم نفسی کی مثال کے طور پر پنجابی زبان کی یہ بولی ضرور سُنی ہوگی:

تیری میری اک جندڑی
تینوں تاپ چڑھے میں ہُونگاں
(تیری اور میری زندگی ایک ہے۔ بخار تمھیں چڑھے تو ہائے ہائے میں کرتا ہوں)

ہمدردی اور ہم نفسی روحانی اور جذباتی طور پر زندہ و بیدار افراد کا ایک مستقل رویّہ ہے۔ یہی رویّہ دوسروں کی بات سننے کے سلسلے میں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ ایسے سننے کو ''ہمدم سماعت'' یا ''ہم نفس سماعت'' کہہ سکتے ہیں۔ دم اور نفس دونوں کا مطلب سانس ہے۔ ایک دوسرے کے سانس کے ساتھ سانس لینے والوں کو ہم دم یا ہم نفس کہتے ہیں۔ ہم نفس سماعت کا مطلب ہے کہ ہم جس کی بات سن رہے ہیں اُس کے سانس کے ساتھ سانس بھی لے رہے ہیں گویا یہ سوچ رہے ہیں کہ اُس کی جگہ ہم ہوتے تو کیا محسوس کرتے۔

عام انسانی رویّہ یہ ہے کہ ہم اپنی کہنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ بڑی سے بڑی کانفرنسوں اور میٹنگوں میں شامل مندوبین دوسروں کی سننے کے بجائے اپنے دل و دماغ میں اپنی کہنے کی ریہرسل کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی گھر یا دفتر سے اپنی کہنے کی تیاری کر کے چلتا ہے اور واپس آ کر اپنے رفقائے کار اور افسرانِ بالا یا ہم وطنوں کو یہی بتاتا ہے کہ اُس نے کیا کہا۔ اس بات کا کم ہی ذکر آتا ہے کہ دوسروں نے کیا کہا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف کاروباری بلکہ قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجلاسوں کا نتیجہ بھی اکثر و بیشتر نشستند، گفتند، برخاستند (بیٹھے، بولے، اٹھے) سے زیادہ کچھ نہیں نکلتا۔ شریکِ گفتگو بس یہ چاہتا ہے کہ کانفرنس کا ہر مندوب حالات کو اُس کی عینک سے دیکھے اور جو کچھ نظر آئے اس کے بارے میں اس کے ذہن سے فیصلہ کرے۔ یہی حال گھریلو زندگی میں ہونے والی گفتگوؤں اور بحثوں کا ہے۔ مثال کے طور پر دو دوستوں کی گفتگو سنیے۔ فرض کر لیں کہ ان میں ایک آپ ہیں:

دوست: میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرا بیٹا چاہتا کیا ہے، میری تو وہ بات ہی نہیں سنتا۔

Marfat.com

آپ: مجھے اجازت دو کہ تم نے جو کہا ہے اُسے اپنے الفاظ میں دہرادوں۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اپنے بیٹے کو سمجھ نہیں پارہے کیونکہ وہ تمھاری بات نہیں سنتا۔

دوست: بالکل!

آپ: تکرار معاف، میں ایک مرتبہ پھر پوچھ رہا ہوں، کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم اپنے بیٹے کو اس لیے سمجھ نہیں پاتے کیونکہ وہ ''تمھاری'' بات نہیں سنتا؟

دوست: یار، یہی تو میں کہہ رہا ہوں، تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟

آپ: میں آج تک یہی سمجھتا تھا کہ جب ہم کسی کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اپنی نہیں کہتے، اُس کی سنتے ہیں۔

دوست: اچھا! (طویل خاموشی)، ہاں تو (جیسے اندھیرا روشنی میں بدلنے لگا ہو)، اچھا تو یہ بات ہے! لیکن میں اس کا باپ ہوں، اُسے پہلے دن سے اندر باہر سے جانتا ہوں۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ وہ میری کیوں نہیں سنتا۔ اور اب تم بھی نہیں سُن رہے۔

آپ: نہیں نہیں، میں تمھاری بات بڑے غور سے سُن رہا ہوں لیکن تم بھی سُن لو کہ جب تک تم اپنی سناتے رہو گے اور یہ سمجھ کر بیٹے کی نہیں سنو گے کہ تم تو پہلے ہی اسے اندر باہر سے جانتے ہو، تم اُسے کبھی سمجھ نہ پاؤ گے۔ تمھارا ہمارا زمانہ اور تھا، مسائل اور تھے، دُنیا بہت بدل چکی ہے۔ جو باتیں ہمیں عرصۂ دراز بعد پیش آئیں اور جو معلومات ہمیں بلوغت کو پہنچ کر حاصل ہوئیں، ہمارے بچوں کی رسائی ہماری عمروں سے بہت پہلے ان تک ہو رہی ہے۔ آج کا بچہ کچی عمر میں اتنا کچھ سن، دیکھ اور پڑھ رہا ہے جس تک ہماری پہنچ بالغ ہو کر بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جذباتی طور پر تو وہ بچہ ہی ہے۔ ہم اس کی سنے بغیر جان ہی نہیں سکتے کہ اس کے اندر کیسے عجیب و غریب سوال اٹھ رہے ہیں۔ گھر جاؤ، ٹھنڈے دماغ سے اپنی کہے بغیر، پہلے اس کی سنو۔ پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ۔

آپ نے اپنے دوست کو جو مشورہ دیا ہے وہ سنہری لفظوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ کی اسی تلقین کا دوسرا نام ہے: ''ہم نفس سماعت'' اور اس کا طریقہ ہے: ''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ''۔ ہم نفس سماعت یہی ہے کہ ہم اپنی کہتے چلے جانے کے بجائے دوسرے کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کی بات پوری یکسوئی کے ساتھ سنیں۔ ہم نفس سماعت کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں بہرصورت دوسرے کا موقف تسلیم کر لینا چاہیے۔ نہیں، اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ دوسرے کی بات ماننے یا رد کرنے سے پہلے اُس کی بات کو دھیان سے سن کر پوری طرح سمجھنا چاہیے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کس مقامِ نظر سے اور کس وجہ سے کہہ رہا ہے۔ عزیزوں، دوستوں اور اپنوں کے سلسلے میں تو ہمارا یہ رویہ ہونا ہی چاہیے لیکن یہ حقیقت ہے کہ رقیبوں، دشمنوں اور بیگانوں سے اپنی بات منوانے یا کسی باعزت سمجھوتے تک پہنچنے کے لیے بھی یہ انتہائی

Marfat.com

ضروری ہے کہ ہم نہ صرف ان کی بات سمجھتے ہوں بلکہ خود انھیں، اوران کی عادتوں، رویوں، خوفوں، خواہشوں اور خوابوں کو بھی پوری طرح جانتے ہوں۔ مثال: قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مسلمان عوام کی امیدوں اور خدشوں کے علاوہ انگریزوں اور ہندوؤں کو اندر اور باہر سے پوری طرح سمجھ کر ہی پاکستان حاصل کیا تھا۔

تشخیص کے بعد تجویز

''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ'' ہی کا ایک اور پہلو ''تشخیص کے بعد تجویز'' ہے۔ انسانی زندگی کے بہت سے شعبوں میں بہترین طرزِ عمل یا طریقۂ کار یہی ہے کہ حل تجویز کرنے سے پہلے واضح طور پر معلوم کیا جائے کہ بیماری کیا ہے۔ لاکھوں انسان ہر سال اس وجہ سے موت کے مُنہ میں دھکیل دیے جاتے ہیں کہ ان کی بیماری کچھ اور ہوتی ہے اور علاج کسی اور بیماری کا ہوتا رہتا ہے۔ ایسا امرت دھارا ابھی ایجاد نہیں ہُوا جو ہر مرض کا علاج ہو۔ کاروبار میں پہلے لوگوں کی ضروریات کا اندازہ کیا جاتا ہے، پھر اُن کے مطابق کارخانوں میں چیزیں بنائی جاتی ہیں اور دکانوں میں سامان بھرا جاتا ہے۔ ہر سال لوگ لاکھوں کاروبار شروع کرتے ہیں لیکن کامیاب صرف وہ ہوتے ہیں جو کسی ایسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں جو پوری نہیں ہورہی تھی۔ یہی حال سیاست کا ہے۔ کامیاب سیاست دان پہلے یہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کا کونسا مسئلہ حل نہیں ہورہا۔ پھر وہ ایک ایسا منشور یا پروگرام لوگوں کے سامنے رکھتا ہے جس سے وہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہوتا نظر آئے۔

یہ بظاہر کاروباری لیکن درحقیقت روحانی رویّہ ہے جس میں ضرورت مند کی ضرورت پہلے پوری کی جاتی ہے اور اُسے تلقین بعد میں کی جاتی ہے۔ نوروالے بابا، فضل شاہ صاحبؒ کے ڈیرے پر روحانی فیض کے لیے آنے والے ہر امیر غریب، مرد و عورت کی خدمت میں پہلے پانی، چائے اور کھانا پیش کیا جاتا تھا، اس کے بعد اُس کی بات، مسئلہ یا الجھن پورے دھیان سے سنی جاتی تھی۔ تلقین کی باری سب سے آخر میں آتی تھی۔ تلقین کے سلسلے میں بھی ''دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر'' کا اصول ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ علم کے پیاسے کو علم دیا جاتا تھا، دولت کے ضرورت مند کو دولت دی جاتی تھی۔ لیکن سیر کی ہانڈی میں سوا سیر نہیں ڈالا جاتا تھا۔ بس ایک محبت تھی جو سب کو عطا ہوتی تھی اور ہوتی بھی بے حساب تھی۔

آیئے تشخیص کی اوّلین اہمیت کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ گرمیوں کے دن ہیں، آپ ایک ایسے کمرے میں بیٹھے حساب کتاب کر رہے ہیں جو ایئر کنڈیشنڈ نہیں۔ ایک بڑی سی میز پر طرح طرح کے کاغذ چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کی صورت میں ترتیب سے پڑے ہیں۔ ایک بہت بڑی ڈھیری ایسی ہے جو بے ترتیب کاغذوں پر مشتمل ہے۔ آپ اس میں سے ایک ایک کرکے کاغذ اٹھاتے ہیں اور اس کی نوعیت کے مطابق اُسے چھوٹی ڈھیریوں میں سے کسی نہ کسی پر رکھتے جاتے ہیں۔ کئی گھنٹوں کی محنت سے کام تقریباً آدھا ہو چکا ہے۔ اچانک آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی میز کے پیچھے کی ادھ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آتا ہے۔ آپ باہر جھانکتے ہیں، بادل گھرے چلے آرہے ہیں۔ آپ ادھ کھلی کھڑکی کو پورا کھول دیتے ہیں۔ پھر اٹھ کر میز کے سامنے کی کھڑکی کھول

کر ہوا کے داخلے اور نکاس کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ آپ دوبارہ کام میں جُت جاتے ہیں۔ کمرے کا درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔ کام تیزی سے مکمل ہونے لگتا ہے۔ آپ فیضؔ کے شعر گنگنا رہے ہیں:

نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

مگر دستِ صبا آپ سے مشورہ کیے بغیر آندھی کے تھپیڑوں میں بدل جاتا ہے۔ میز پر دن بھر کی محنت سے چھانٹے ہوئے کاغذ اُڑ اُڑ کر کمرے میں بکھرنے لگ جاتے ہیں۔ اس خیال سے کہ وہ کہیں سامنے کی کھڑکی سے باہر نہ نکل جائیں، آپ دیوانہ واران کے پیچھے کمرے میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ اگر دو کاغذ ہاتھ میں آتے ہیں تو میز سے دس بیس اور کاغذ اُڑ کر کمرے میں پھیل جاتے ہیں۔ دن بھر کی محنت اکارت جاتی دیکھ کر آپ پر جھنجلاہٹ طاری ہو گئی ہے۔ آپ اپنے حواس پر قابو پانے کے لیے ایک لحظہ رُکتے ہیں۔ بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال آپ کے ذہن کے افق پر جلوہ گر ہوتا ہے اور اگلے لمحے آپ میز سے پیچھے کی وہ کھڑکی بند کر دیتے ہیں جس سے آندھی کے تھپیڑے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ طوفان باہر تو جولانی پر آتا جا رہا ہے لیکن کمرے کے اندر تھم گیا ہے۔

وجہ؟

آپ نے تشخیص کر لی ہے کہ کاغذ اُڑنے کا سبب کیا ہے۔ تشخیص چونکہ صحیح ہے اور جب اس کے مطابق آپ پیچھے کی کھڑکی بند کر دیتے ہیں تو تجویز بھی درست ثابت ہو جاتی ہے۔

سمجھ اور ادراک

جب کوئی چیز، مسئلہ یا انسان پہلے پہلے ہمارے سامنے آتا ہے اور ابھی ہم اسے پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہوتے تو اس کے بارے میں ہمارا پہلا تاثر اِدراک یا perception کہلاتا ہے۔ اِدراک گویا سمجھ کی پہلی منزل ہے۔ ادراک کی بنیاد ہمارے ذاتی تجربے، مطالعے، تصورات، تخیلات اور عقائد پر ہوتی ہے۔ گویا ہم ہر نئی چیز، نئے مسئلے یا نئے انسان کو اپنی ذاتی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ذاتی عینک کا دوسرا نام ہے: ہمارے تعصبات۔ سمجھ اُس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم چیزوں، مسائل اور انسانوں کو اپنے تعصبات کی عینک اتار کر دیکھتے ہیں۔ ہمارا ادراک ہمیں بتاتا ہے کہ ریل کی لمبی پٹریاں دور افق کے پاس آپس میں مل گئی ہیں۔ ہماری سمجھ ہمیں بتاتی ہے کہ نہیں، یہ پٹریاں متوازی ہیں اور یکساں فاصلے کے باعث کہیں اور کبھی باہم نہیں ملتیں۔ سمجھ یہ ثابت کرتی ہے کہ گو کانوں سنی کے مقابلے میں آنکھوں دیکھی بہتر ہوتی ہے لیکن اب پتا چلتا ہے کہ آنکھوں دیکھی بھی غلط ہو سکتی ہے۔

Marfat.com

انسانوں کے درمیان بہترین ابلاغ اور خوبصورت تعلقات کے لیے یہ بات نہایت اہم ہے کہ ہم ادراک سے زیادہ سمجھ (Understanding) پر زور دیں۔ البتہ سمجھ کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ دوسرے کس مقامِ نظر اور کس نقطۂ نظر سے چیزوں اور مسئلوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جس طرح ہم نظر کے دھوکے کا شکار ہوتے ہوئے فریبِ نظر کو حقیقت سمجھ سکتے ہیں اُسی طرح دوسرے بھی کئی معاملوں میں فریبِ نظر کا شکار ہو سکتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے فریبِ نظر کی نشاندہی سے پہلے ہمیں اپنے فریبِ نظر کا بھی پورا پورا محاسبہ کر لینا چاہیے ورنہ ہم پر یہ کہاوت صادق آئے گی کہ ہمیں دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ ہماری عزتِ نفس ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ پیشتر اس کے کہ دوسرے ہماری جہالت پر انگلی اٹھائیں، ہم از خود اس جہالت سے نجات پا جائیں۔ یہ خود احتسابی بھی دراصل ایک روحانی صلاحیت ہے جو تمام دُنیوی معاملات میں ہماری عزت اور کامیابی کی ایک اہم ترین ضمانت ثابت ہوتی ہے۔

مؤثر ترین لوگوں کی پانچویں عادت ''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ'' کے سلسلے میں ہم نے ''پہلے سمجھو'' کی حد تک تو کچھ غور کر لیا ہے، بہتر ہے کہ اب ''پھر سمجھاؤ'' والے حصے پر بھی کچھ بات کر لی جائے۔ یہ حصہ بھی ''سب کی جیت'' کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ''پہلے سمجھو'' کا حصہ۔ ''پہلے سمجھو'' پر زیادہ زور صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ عموماً ہم اپنی کہنے کے جوش میں اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ آپ بلوغت کے سلسلے میں ''دوسروں کی پروا'' اور ''اپنے حوصلے'' کے درمیان توازن کا ذکر بھی پڑھ چکے ہیں۔ جس طرح ''پہلے سمجھو'' کے لیے ''دوسروں کی پروا'' ضروری ہے اسی طرح ''پھر سمجھاؤ'' کے لیے ''اپنے حوصلے'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروا اور حوصلہ ''سب کی جیت'' کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ہم حوصلے کے معاملے میں کمزوری دکھائیں تو نتیجہ ''سب کی جیت'' نہیں، ''دوسروں کی جیت، ہماری ہار'' کی صورت اختیار کر لے گا۔

حوصلہ بھی دراصل ایک روحانی اور اخلاقی قدر ہے بلکہ یہ قدر روحانیت کی جان ہے اور روحانی جواں مردی کہلاتی ہے۔ اسی لیے روحانی مرشد اور اخلاقی گرو اس حقیقت پر زور دیتے ہیں کہ بدی اُتنی ہی پھیلتی ہے، نیک لوگ جس قدر بے حوصلہ ہوتے ہیں۔ جب نیک لوگ حوصلہ مندی سے نیکی کی حمایت کرنے کے بجائے بدی کے سامنے دُم دبا کر بیٹھ جاتے ہیں تو نیکی کی جگہ بدی پَر پھیلا لیتی ہے اور یوں نیک لوگ بدی کے فروغ کا باعث بن جاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں خداوند کریم نے نیکی (معروف) کا حکم دینے اور بدی (منکر) سے منع کرنے کو اُمتِ مسلمہ کا بنیادی فریضہ ٹھہرایا تھا (3:110)۔ مگر ہمارے علماء نے دین کی چند ظاہری رسوم (Ritual) کو دین کے ستونوں کا نام دے کر اس عالی شان انسانی، اخلاقی اور روحانی عمارت ہی کو نظر انداز کر دیا جو اُن ستونوں پر کھڑی تھی۔

سمجھنے اور سمجھانے ہی کے سلسلے میں پرانے یونانی مفکروں کی یہ تین اصطلاحیں بھی خصوصی توجہ کے لائق ہیں:
ایتھاس (Ethos)، پیتھاس (Pathos) اور لوگاس (Logas)۔ غور سے دیکھیں تو ان تینوں اصطلاحوں میں ''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ'' کے تمام پہلو سمٹ آتے ہیں۔

ایتھاس آپ کی وہ دیانتداری ہے جو ہر طرح کے شک و شبہہ سے بالا ہوتی ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جو

دوسرے آپ کی دیانتداری اور اہلیت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہ وہ اعتماد ہے جو آپ کا کردار دوسروں میں ابھارتا ہے۔ یہ آپ کا وہ جذباتی بنک اکاؤنٹ ہے جو ہر وقت بھرا رہتا ہے۔

پیتھاس وہ جذبہ اور احساس ہے جو آپ میں اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ دوسروں کے جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ ہو چکے ہیں اور انھیں نہ صرف باہر سے بلکہ اندر سے بھی پہچان اور جان چکے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ ان کے دلائل کے پیچھے موجزن ان کی دِلی کیفیات، ضرورتوں، مجبوریوں، خدشوں اور خواہشوں کو بھی خاطر میں لا رہے ہیں۔

لوگاس کا مطلب ہے منطق یا وہ دلائل جو ہم اور دوسرے لوگ اپنے موقف کی حمایت میں دیتے ہیں۔

اب ذرا ان تینوں کی ترتیب پر غور کریں۔ پہلے اِتھاس، پھر پیتھاس اور آخر میں لوگاس۔ پہلے آپ کا کردار، پھر آپ کے تعلقات اور آخر میں منطق اور دلائل۔ زیادہ تر لوگ دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں پہل ہی منطق اور دلائل سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ دماغ کے بائیں حصے سے بات شروع کرتے ہیں جس کا تعلق 2+2 سے یا حساب کتاب اور نفع نقصان سے ہوتا ہے۔ دوسروں کو منطق، دلائل اور اعداد و شمار سے قائل کرنے کی کوشش (لوگاس) جو سب سے آخر میں ہونی چاہیے تھی، ہم سب سے پہلے شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسروں کو اپنے کردار، اپنی بے لاگ دیانتداری اور اپنے قابلِ اعتماد ہونے کا یقین دلانے اور اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر ان کا ہمدم و ہم نفس ہونے کو اوّلیت دینے کے بجائے ہم اُسے پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

اگر ہم رسُولِ خدا کی سیرت کو پیشِ نظر رکھیں تو یہ بات کھُل کر سامنے آجاتی ہے کہ آپؐ نے سمجھانے سے بہت پہلے اپنے کردار کو اس حد تک بلند کیا کہ آپ کا لقب ہی ''امین'' پڑ گیا اور آپ کی دیانتداری شک و شبہہ سے یکسر پاک تسلیم کر لی گئی۔ سمجھانا تو آپ نے اللہ کے حکم سے چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر شروع کیا۔

دوسروں کو قائل کرنے کے سلسلے میں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس کا موقع اسی منظر و پس منظر میں آتا ہے کہ وہ ہماری دیانتداری پر اعتماد کریں اور ہم ان کی ضرورتوں، مجبوریوں، خدشوں اور خواہشوں کا پاس کریں۔ لیکن جب یہ موقع آجائے تو ہمیں پورے حوصلے سے اور پوری وضاحت کے ساتھ اپنا موقف پیش کرنا چاہیے۔ چونکہ لوگ سُنی سُنائی سے زیادہ آنکھوں دیکھی پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے آج کے دور میں اپنا موقِف بیان کرتے ہوئے جہاں مناسب ہو نقشوں، تصویروں، گرافوں (Graphs) اور ڈاکومنٹری فلموں (Documentary Films) سے بھی پوری پوری مدد لینی چاہیے۔

اسی طرح ہوسکتا ہے کہ جب آپ دوسروں سے معاملت کے لیے گھر یا دفتر سے چلے ہوں تو آپ نے اپنا ایک بیان یا brief تیار کیا ہو۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، عام لوگ دوسروں کی بات پوری طرح سننے اور انھیں پوری طرح سمجھنے

Marfat.com

کے بجائے اپنے بیان یا بریف کی پیشکش ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔نہیں، یہ رویہ صحیح نہیں۔ہمیں اپنے موقف کی حمایت کے لیے تو ضرور بالضرور پوری ذہنی تیاری کرنی چاہیے لیکن دوسروں کو سمجھنے کے عمل سے جو نئی باتیں ہمیں پتا چلیں ان کی روشنی میں ہمیں اپنے تیار کردہ بیان میں مناسب ترمیم کے لیے بھی ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

ہر اچھا مقرر اپنی تقریر کے لیے ضروری اور مناسب مواد جمع کرتا ہے۔کچھ لوگ تو پوری کی پوری تقریر رٹ لیتے ہیں اور معاملت یا مباحثے میں دوسروں نے کیا کہا ہے، اسے خاطر میں لائے بغیر یہ رٹی ہوئی تقریر دہرا دیتے ہیں۔ونسٹن چرچل جیسا عظیم مدبر اور صاحب طرز ادیب اور مقرر بھی شروع میں ایسا ہی کیا کرتا تھا۔لیکن پھر یوں ہُوا کہ ایک اہم ترین تقریر کے دوران وہ رٹی ہوئی تقریر بھول گیا اور اس کی اتنی سبکی ہوئی کہ پھر اس نے کبھی اپنی تقریر کو رٹنے کی کوشش نہ کی البتہ اس کی تیاری کے لیے پہلے سے بھی زیادہ محنت کی۔رٹی ہوئی تقریر فوراً پہچانی جاتی ہے۔اُس کا صرف یہ نقصان نہیں ہوتا کہ بیچ میں بھُول جانے سے مقرر کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، اس کا زیادہ بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ یہ اکثر و بیشتر موقع کی نزاکت اور عین وقت پر نئے حالات یا دلائل پیدا ہو جانے کا احاطہ نہ کرنے کی وجہ سے غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔گھر یا دفتر سے تیار کیے ہوئے بیان یا بریف کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔یہ بیان یا بریف اپنی جگہ بے حد ضروری ہے لیکن حسب ضرورت اور حسب موقع اس میں مناسب تبدیلی کے لیے تیار رہنا اس سے بھی ضروری ہے۔

اس صورت حال کی بدترین مثال یہ ہے کہ ہماری مسجدوں میں جمعے کے اجتماع کے موقع پر جو خطبے پڑھے جاتے ہیں، اکثر و بیشتر ان کا دورِ حاضر کے مسائل سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔بے شک کچھ سیاسی مولوی صاحبان سیاسی تقریریں بھی کرتے ہیں مگر وہ اس لیے غیر مؤثر ہو جاتی ہیں کیونکہ سننے والوں کو سنانے والوں کے کردار، مقاصد اور دیانت داری پر شک وشبہ ہوتا ہے۔

براہِ راست ملاقات

''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ'' کی عادت کا زندگی کے مختلف معاملات کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے جن میں دوسروں کے رویے، مسائل کی پیچیدگیاں اور بدلتے اور بدلے ہوئے حالات کے نئے تقاضے شامل ہیں۔اگر یہ حالات آپ کی توجہ کا مرکز بن جائیں تو آپ کی تمام تر توانائی انھی پر خرچ ہو سکتی ہے اور معاملات سلجھنے کے بجائے الجھنے لگتے ہیں۔آپ کی توجہ دوسروں کو سمجھنے ہی پر مرکوز رہنی چاہیے البتہ حالات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔حالات کو پیشِ نظر رکھنے سے ایسی بہت سی اہم معلومات آپ کے ہاتھ آجاتی ہیں جن سے معاملات کی تہہ تک پہنچ کر انھیں حل کیا جا سکتا ہے۔اِس طرح آپ اپنے جذباتی بنک اکاؤنٹ میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر لیتے ہیں اور ایسی مثبت نفسیاتی فضا بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس میں دوسرا فریق، گفتگو یا معاملت کو ''سب کی جیت'' کی طرف لے جانے میں آسانی محسوس کرتا ہے۔بین الاقوامی سیاست میں اس مثبت نفسیاتی فضا کے لیے جن باتوں کی ضرورت سمجھی جاتی ہے انھیں ''اعتماد بڑھانے والے اقدامات''

Marfat.com

(Confidence Building Measures) کہا جاتا ہے۔

پاکستان، بھارت اور کشمیری قیادت کے درمیان کشمیر کے دیرینہ اور پیچیدہ مسئلے کے حل کے لیے آج کل اسی طرح کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔ جب ایسے اقدامات کیے جارہے ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کی بات سننے کے لیے آمادہ ہوگئے ہیں۔ اور اُنھیں اعتماد ہوتا جاتا ہے کہ دوسرے ان کے موقف کو اہمیت دینے لگے ہیں۔ ہر فریق کا متاثر ہونا اس کی متاثر کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتا جاتا ہے۔ اب اتفاق رائے کا دائرہ پھیلنے لگتا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک فریق دوسروں کی جتنی زیادہ پرواکرتا ہے اس کا حوصلہ اتنا ہی بڑھ جاتا ہے۔ غور فرمایئے کہ ہوتا کیا ہے؟ جیسے جیسے ایک فریق دوسروں کو بہتر سے بہتر سمجھتا جاتا ہے اور ان کے موقف کے قابلِ قبول پہلوؤں پر اظہار پسندیدگی کرتا ہے، وہ اتنا ہی دوسروں کی روح سے قریب ہوجاتا ہے اور جب روحوں کا روحوں سے ملاپ ہونے لگے تو یوں سمجھیے کہ اب ہر فریق نے ہمدمی اور ہم نفسی کی مقدس سرزمین میں قدم دھر دیے ہیں۔

جب یہ مقدس سرزمین آجائے تو گویا مسائل حل ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات انفرادی (One to One) ملاقاتوں کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ لمبی چوڑی بحثوں کے بعد عین آخری وقت کوئی ایک بات ایسی رہ جاتی ہے جس پر اتفاقِ رائے نہیں ہو پاتا۔ پاکستان کی قومی تاریخ میں ایسا موقع ''شملہ معاہدہ'' کے وقت آیا تھا۔ کئی روز کی گفتگو کے آخر میں پاکستان اور بھارت کے شرکائے اجلاس یہ سوچ کر گفتگو کی میز سے اٹھ گئے تھے کہ سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔ پاکستان کے وفد نے واپسی کے لیے سامان تک باندھ لیا تھا۔ اُس لمحے وزیرِاعظم پاکستان، ذوالفقار علی بھٹو ذاتی طور پر وزیرِاعظم بھارت، مسز اندرا گاندھی کو الوداع کہنے اور دورانِ قیام خاطر مدارات پر شکریہ ادا کرنے گئے۔ اِس مختصر ترین ملاقات میں دونوں نے سمجھانے کے بجائے سمجھنے کی کوشش کی تو ایک معجزہ ہوگیا، بندھا ہُوا سامان کُھل گیا، شملہ معاہدے کا نیا ڈرافٹ تیار ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست ناکامی ایک شاندار کامیابی میں بدل گئی۔

یہی کچھ ہمیں ذاتی تعلقات کے سلسلے میں بھی کرنا چاہیے۔ میاں بیوی، والدین اور اولاد، دوست احباب، عزیز واقارب، اہلِ محبت، رفقائے کار، افسر اور ماتحت، لیڈر اور کارکن اور سب سے اہم ''آپ اور آپ'' کی انفرادی ملاقات اور براہِ راست معاملت اتنی ہی ضروری ہے جتنی کسی اہم مسئلے پر دست وگریباں ہونے والے دو ملکوں کے سربراہوں کے درمیان ملاقات۔ انفرادی معاملات اور تعلقات میں تو حفظِ ماتقدم کے طور پر معاملے کے بگڑنے سے پہلے بھی ایسی وَن ٹُو وَن ملاقاتیں کی جاسکتی ہیں۔ اگر آپ مؤثر ترین لوگوں کی پہلی عادت، باعمل دیدہ وری کو اپنی فطرتِ ثانیہ بناچکے ہوں تو ذاتی تعلقات میں ذراسی خرابی آجانے پر آپ فوری طور پر براہ راست ملاقات کے ذریعے انھیں مزید بگڑنے سے بچاسکتے ہیں۔

پاکستان کے تربیلا ڈیم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا مٹی کا ڈیم ہے۔ اگر ایک چوہا اس میں باہر سے اندر تک ایک سوراخ کردے اور کوئی فوری طور پر اس سوراخ کو بند نہ کرے تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ سوراخ اتنا بڑا ہو

سکتا ہے کہ ڈیم کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔

وجہ؟

چوہے کے بنائے ہوئے سوراخ سے جو پانی نکلتا ہے وہ اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ مٹی بھی بہا لے جاتا ہے اور یوں سوراخ لحظہ بہ لحظہ بڑے سے بڑا ہوتا جاتا ہے۔ تعلقات میں خرابی کا بھی یہی حال ہے۔ اسے شروع ہی میں دور کر لیا جائے تو بہتر بھی ہے اور آسان بھی، ورنہ بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذاتی تعلقات میں خرابی کو پہلی فرصت سے بھی پہلے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے سنہری نسخہ یہی ہے کہ ''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ''۔

Marfat.com

پچیسواں باب

تخلیقی تعاون

تعاون انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے اہم ہے لیکن تعاون اگر تخلیقی اور متوازن ہو تو نتیجہ ایک جمع ایک = دو نہیں، ایک جمع ایک = گیارہ ہو جاتا ہے۔ (ایک ایک اور دو گیارہ)۔ ایسے تخلیقی اور متوازن تعاون کو انگریزی میں Synergy کہتے ہیں۔ دور حاضر میں سیاسیات، اقتصادیات اور سماجیات میں یہ لفظ، اصطلاح یا تصور عام استعمال ہو رہا ہے۔ یوں کہیے کہ مؤثر ترین لوگوں کی دوسری تمام عادات گویا انھیں اسی تخلیقی اور متوازن تعاون کے لیے تیار کر رہی ہوتی ہیں۔

تخلیقی تعاون کی بہترین صورت اس وقت وجود میں آتی ہے جب ہم ''سب کی جیت'' اور اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر انھیں سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اب ہماری زندگی میں معجزاتی نتائج پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اور مسائل کے حل کے لیے ایسے نئے نئے متبادلات سامنے آ جاتے ہیں جن کا پہلے ہم نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

تخلیقی تعاون اصولی قیادت کی جان ہے۔ جو والدین اپنی اولاد کو روحانی اصولوں اور اخلاقی قدروں پر مبنی تربیت دینا چاہتے ہیں، تخلیقی تعاون ان کا بہترین معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے، لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کے کردار کی تشکیل اور تکمیل کرتا ہے۔ مغرب میں ایک ایک اور دو گیارہ کا تصور نہیں۔ البتہ وہاں تخلیقی تعاون کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کی مکمل صورت (Whole) اس کے حصوں کے حاصل جمع سے بڑھ جاتی ہے۔ یعنی 3+2+1 کا حاصل جمع تو 6 ہے لیکن جب یہ تینوں حصے باہم تخلیقی تعاون کر رہے ہوں تو ان کی مکمل صورت 6 کے بجائے 9 یا 15 بھی ہو سکتی ہے۔

آیئے ہم اسے ایک گراف کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چھ حصوں کو ہم اس طرح ترتیب دے کر دیکھتے ہیں کہ ان کے درمیان تعاون کی کتنی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں اور کیا وہ چھ ہی رہتی ہیں یا بڑھ جاتی ہیں؟ اس گراف سے باہمی تعاون کے مندرجہ ذیل رشتے سامنے آتے ہیں:

اس گراف سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ چھ لوگوں میں تعاون کی صرف چھ صورتیں نہیں (دیکھیے، غیر تخلیقی تعاون) بلکہ 15 صورتیں وجود میں آ گئی ہیں (دیکھیے، تخلیقی تعاون)۔

تخلیقی تعاون ایک لحاظ سے بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کسی خاص موقع پر کیا نتیجہ نکلے گا۔ مثلاً کیا ''الف'' اور ''د'' آپس میں تعاون کریں گے یا نہیں؟

Marfat.com

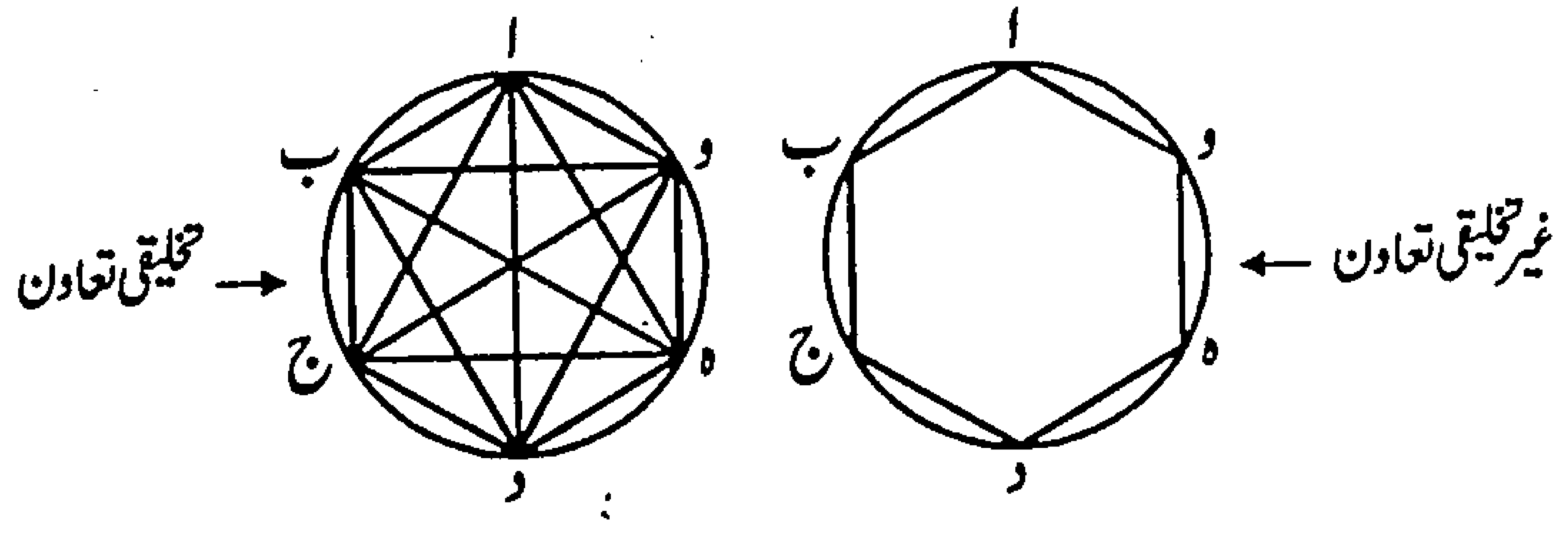

1-اب، 2-اج، 3-اد، 4-اہ، 5-او، 6-ب ج، 7-ب د، 8-ب ہ
9-ب و، 10-ج د، 11-ج ہ، 12-ج و، 13-د ہ، 14-د و، 15-ہ و،

با اختیار انسان ہونے کے ناتے وہ آپس میں تعاون کر بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کر سکتے۔ تخلیقی قیادت کا دراصل یہی کام ہے کہ وہ اپنے زیرِ اثر لوگوں کے درمیان تعاون کے ہر امکان سے بخوبی واقف ہو اور جن لوگوں کے درمیان تعاون کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں انھیں تعاون کے لیے آمادہ کرے اور جن کے تعاون سے منفی نتائج کا خطرہ ہو انھیں ایک دوسرے سے دُور رکھے۔

اصل میں تخلیقی تعاون سے مثبت نتائج حاصل کرنے کی اہلیت ہوتی ہی ان لوگوں میں ہے جو مؤثر ترین لوگوں کی پہلی پانچ عادتوں کو اپنا چکے ہوتے ہیں۔ جب سر ونسٹن چرچل کو 45-1939ء کی دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی تو اس نے کہا، ''میری آج تک کی ساری زندگی مجھے اس لمحے کے لیے تیار کر رہی تھی''۔ یوں سمجھ لیں کہ پہلی پانچ عادتیں بھی ہمیں تخلیقی تعاون ہی کے لیے تیار کر رہی ہوتی ہیں۔ ان عادتوں کے بغیر تخلیقی تعاون ''کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد'' کے بجائے ''ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں'' کی مثال بن کر رہ جاتا ہے۔

فطرت میں تخلیقی تعاون کو جگہ جگہ کارفرما دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر لوہے یا لکڑی کا ایک شہتیر ایک سو من وزن برداشت کر سکتا ہو اور آپ ایک کے بجائے دو شہتیر لگا دیں تو وہ 100+100 کے حساب سے 200 من کے بجائے 250 یا 300 من وزن اٹھا لیں گے۔ باغات میں دور دور لگے ہوئے درختوں کے مقابلے میں جنگلات میں قریب قریب اُگے درخت کہیں بڑے ہو جاتے ہیں۔ تخلیقی تعاون کی اس صلاحیت کی تصدیق قرآنِ حکیم نے اپنے مخصوص طریقے سے یہ کہہ کر کی ہے کہ خدا کے حکم سے ایک چھوٹا گروہ یا چھوٹی فوج بڑے گروہ یا بڑی فوج پر غالب آ جاتی ہے (2:249)۔ اس چھوٹے گروہ کی کیا خصوصیت ہے؟ وہ کونسی بات ہے جو چھوٹے گروہ کو بڑے گروہ پر غالب کر دیتی ہے؟ وہ اس چھوٹے گروہ کے افراد میں تخلیقی تعاون اور اس گروہ کے قائد کی تخلیقی قیادت ہے۔ رسُولِ خدا نے اس چھوٹے گروہ

کی طاقت کا راز ان خوبصورت لفظوں میں کھولا تھا جو اَب زبان زدِ عام ہو چکے ہیں: ''خدا پر ایمان رکھنے والے آپس میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہوتے ہیں''۔ قرآنِ حکیم اور رسولؐ خدا کے انھی الفاظ کے آئینے میں آج کے 57 ''اسلامی'' ملکوں اور ایک ارب بیس کروڑ ''مسلمانوں'' کی بدبختی کو بسورتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ نہ تو ان کے درمیان تخلیقی تعاون ہے اور نہ ہی انھیں تخلیقی قیادت میسر ہے۔

آج کے انسان نے زندگی کو خوشی، خوشحالی اور امن کا گھوارہ بنانے کے بجائے دکھ، بھوک ننگ اور بدامنی کا جہنم بنا کر رکھ دیا ہے۔ کروڑوں، بلکہ اربوں انسان اس جہنم میں جل رہے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ ہر وہ شخص یا قوم جو ہم سے مختلف ہے ہم اسے ''دوسرا'' یا ''غیر'' سمجھتے ہوئے اس سے تخلیقی تعاون کرنے کے بجائے دشمنی پال لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا باہمی فرق (Diversity) دنیا کو کہیں زیادہ پُررونق اور دلچسپ بنا سکتا تھا اور ہمیں طرح طرح کے رنگا رنگ پھولوں کے ایک گلدستے کی سی وحدت (Unity) میں پرو سکتا تھا۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکا؟

ایسا اس لیے نہیں ہو سکا کہ کثرت میں وحدت (Unity in Diversity) آپس میں تخلیقی تعاون اور تخلیقی قیادت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آیئے ہم سب جو آج کے ان حالات سے ناخوش ہیں کہ افریقہ بیماری سے مر رہا ہے اور کروڑوں ایشیائی عوام غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں، ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ آج صرف چند ملکوں کو چھوڑ کر دنیا کا ہر امیر اور غریب ملک اپنے اپنے بجٹ کا بہت بڑا حصہ تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری یا خرید پر خرچ کر رہا ہے۔ آیئے، ہم آواز اٹھائیں کہ یہی خطیر رقم جنگ، بیماری اور بھوک ختم کرنے پر صرف کر کے دنیا کو امن، صحت اور خوشحالی کا گھوارہ بنایا جائے۔

کیا ہماری اس آواز کا کچھ اثر ہوگا؟

پہلے اپنے وسائل کا بڑا حصہ ہتھیاروں پر خرچ کرنے والی قوموں کی تقدیر کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ سن لیں:

> اگر ملکی دولت کا بہت بڑا حصہ پیداواری کاموں کے بجائے فوجی مقاصد پر خرچ کیا جائے گا تو بالآخر یہ بات قومی طاقت کے زوال کا باعث ثابت ہوگی۔
>
> ''بڑی طاقتوں کا عروج و زوال'' از پال کینیڈی

رہا ہماری آواز کا پُرتاثیر ہونا، تو اس کا اثر ضرور ہوگا بشرطیکہ ہم سب آواز اٹھانے والے پہلے اپنا محاسبہ کرنے کے لیے اپنے اپنے گریبان میں جھانکیں اور دیکھیں کہ خود ہم نے اپنے آپ کو کس حد تک ''شک و شبہ سے بالا دیانتداری''، ''سب کی جیت'' کے اصول اور ''پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ'' کا عادی بنایا ہے۔ پھر جیسے جیسے ہم خود ایک دوسرے کے ساتھ تخلیقی تعاون اور تخلیقی قیادت کا مظاہرہ کریں گے، ہماری آواز ایک مؤثر طاقت بن جائے گی اور ہماری دُنیوی اور

Marfat.com

اُخروی زندگی "سلام" قولاً من رّبٍ رّحیم" کے نعرۂ خداوندی سے گونجنے لگے گی۔

تخلیقی تعاون کے دوران ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ کر مسائل کے ایسے حل بھی تلاش کر سکتے ہیں جو روایتی حلوں سے بہتر ہوں۔ مسئلہ کشمیر ہی کو لے لیجیے۔ روایتی حل یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ کشمیر یا تو پاکستان کا ہے یا پھر بھارت کا۔ لیکن پاکستان اور بھارت کے درمیان تخلیقی تعاون انھیں کسی ایسے حل پر بھی پہنچا سکتا ہے جو ان دونوں نے پہلے سوچا بھی نہ ہو۔ اس سلسلے میں یہ اہم اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس طرح تو ہم مؤثر ترین لوگوں کی دوسری عادت..... آخرت کے پیش نظر آغاز یا "ہدف کی برقراری" سے الٹ چل دیے ہیں۔ درحقیقت ہم چھٹی عادت کی بدولت دوسری عادت سے الٹ نہیں بلکہ ہدف کی بہتر تکمیل کی طرف چل رہے ہیں۔ جن لوگوں کے کردار میں پختگی ہو اور ان کی دیانتداری بے لاگ ہو وہ نئے امکانات اور بہتر حلوں کی تلاش کرتے ہوئے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ وہ اپنے ربّ سے امید رکھتے ہیں کہ "سب کی جیت" کے اصول کے تحت تمام بندگانِ خدا کی بہتری کی کوشش کرنے پر وہ ان کی مدد اور رہنمائی فرمائے گا۔

بین الاقوامی امور تو رہے ایک طرف، اکثر لوگ تو اپنے خاندان اور کنبے میں بھی تخلیقی توازن کو زیرِ عمل نہیں لاتے۔ وہ حفاظتی اور دفاعی رویئے میں اتنے پختہ ہو چکے ہوتے ہیں کہ خدا کے فضل و کرم، کائنات کے لامحدود امکانات اور اچھے انسانوں کی فراخ دلی پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کے عمل کا محرک خوف ہوتا ہے، محبت نہیں۔ اور خوف تو محبت کی نفی کا نام ہے۔ اسی طرح زیادہ تر لوگ اپنے جوہر کی تکمیل کے لیے حوصلہ مندی کو بروئے عمل لائے بغیر ہی ادھورے آدمیوں کی طرح زندگی کے دن کاٹتے رہتے ہیں۔ ان کی ذات ان کے حصوں سے زیادہ ہونے کے بجائے کم رہ جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے خوف، اپنی احتیاط پسندی اور اپنے دفاعی رویے کے باعث اپنی ذات کے بیشتر حصوں یا صلاحیتوں کو سرے سے استعمال ہی نہیں کرتے۔ ان کے عمل سے نئی بستیاں تو آباد نہیں ہوتیں البتہ پرانی بستیوں کے قبرستانوں کی آبادی ضرور بڑھ جاتی ہے۔

یہاں ایک اہم بصیرت کا ذکر ضروری ہے۔ جن ملکوں، حکومتوں، دفتروں، کارخانوں، کاروباروں اور گھروں میں مکمل نظم و ضبط ہوتا ہے اور ہر شخص اور شے میکانکی انداز سے کام کر رہی ہوتی ہے وہ تخلیقی تعاون اور تخلیقی قیادت کی بنیادی صفت..... نئے امکانات کی تلاش..... سے محروم ہوتے ہیں۔ جس طرح جمہوری نظام حکومت اور آمریت کا فرق یہ ہے جمہوریت میں تھوڑا شور و غوغا (The Din of Democracy) ضرور ہوتا ہے جبکہ آمریت میں قبرستان جیسی خاموشی۔ اسی طرح تخلیقی تعاون میں بھی تھوڑی بے نظمی پائی جاتی ہے کیونکہ اس میں تخلیقی قیادت اختلاف رائے کو نظر انداز کر کے نہیں بلکہ لوگوں کی رضا کارانہ رضامندی سے فیصلے کرتی ہے۔ یہی حال یونیورسٹیوں، کالجوں اور سکولوں کا ہے۔ تخلیقی تعاون کا تقاضا ہے کہ ان کے کلاس روموں میں بھی بحث مباحثے کا تھوڑا شور و غوغا نظر آئے۔ تخلیق کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ خدا سے بڑا خالق کون ہے، ذرا اس کی بنائی اور سجائی ہوئی کائنات اور دنیا ہی کو دیکھ لیں، ہر وقت کچھ بنتا چلا جاتا ہے تو کچھ توڑ پھوڑ بھی جاری رہتی ہے۔ اور تو اور آئن سٹائن کے بکھرے ہوئے بالوں سے لے کر ہمارے عہد کے خوش نوا صوفی،

Marfat.com

واصف علی واصفؒ کے سر کے بالوں تک آپ کو بے ترتیبی کے اندر سے ایک نئی اور انوکھی ترتیب نمودار ہوتی دکھائی دے سکتی ہے۔ موقع ملے تو انسان کے بچے کو پیدائش کے وقت دیکھیے، کس کس طرح کے مواد سے لبڑا اور لتھڑا ہُوا پیدا ہوتا ہے۔

فرق کی قدر

لوگوں کے درمیان ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی فرق کی قدر کرنا تخلیقی تعاون کی خصوصیت ہے۔ کچھ لوگ دنیا اور زندگی کو جس مقامِ نظر (Vantage Point) اور نقطۂ نظر (Point of View) سے دیکھتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا اور زندگی وہی ہے جو انھیں نظر آ رہی ہے۔ وہ اِن کے بارے میں اپنے تصور کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ اُن کا ذاتی یا Subjective تصور نہیں بلکہ معروضی یا Objective حقیقت ہوتا ہے۔ معروضی حقیقتیں 2+2=4 کی طرح ہر کسی کے لیے ایک ہی ہوتی ہیں۔ یہ رویہ رکھنے والے لوگ تخلیقی تعاون تو کیا، کسی طرح کے باہمی تعاون کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ وہ اس وہم کے قیدی بن کر رہ جاتے ہیں کہ حقیقت جاننے کے لیے انھیں دوسروں کی ضرورت نہیں اور یہی وہم ان کے غیر مؤثر ہونے کی بنیاد بن جاتا ہے۔

ان لوگوں کے برعکس صحیح معنوں میں مؤثر لوگوں میں انکسار ہوتا ہے۔ وہ ایک فردِ واحد ہوتے ہوئے یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ ان کا فہم و ادراک بہت محدود ہے۔ دوسرے لوگوں کے دل و دماغ کے ساتھ رابطے اور تعلق کی بدولت انھیں جو علم اور شعور حاصل ہوتا ہے وہ اس کے قدردان ہوتے ہیں۔ حقیقت کی پہچان کے لیے اپنے علم کے علاوہ انھیں دوسروں سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہمارے علم میں اضافہ ہی اس وقت ہوتا ہے جب ہمیں وہ علم حاصل ہو جو ہمارے پاس پہلے موجود نہیں تھا۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اگر آپ درست ہیں تو دوسرا ضرور غلط ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی معاملے میں دو شخصوں کی مختلف رائیں بیک وقت کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ کیوں نہیں ہو سکتیں؟ ضرور ہو سکتی ہیں۔

آیئے ایک ڈرائنگ پر نظر ڈالتے ہیں۔ وہ شخص جو اپنے انفرادی رجحان کے باعث کالے رنگ پر توجہ مرکوز کرتا ہے، کہے گا: یہ ایک شمع دان ہے یا ٹیبل لیمپ کا نچلا حصہ ہے۔ دوسرا شخص جس کا انفرادی رجحان کچھ اور ہے، سفید رنگ پر توجہ مرکوز کرے گا تو اسے دو شخص ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ دونوں کی رائے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر دونوں صحیح کہہ رہے ہیں۔

ایک اور مثال: دو شخص آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنی مٹھی کھول کر اپنا ہاتھ دوسرے کے چہرے کے سامنے کر دیتا ہے اور پوچھتا ہے، تمھیں اس ہاتھ پر کیا نظر آ رہا ہے؟ دوسرا کہتا ہے، مجھے اس پر لکیریں نظر آ رہی ہیں۔ پہلا پھر پوچھتا ہے، ہاتھ کا رنگ کیا ہے؟ دوسرا کہتا ہے، گلابی۔ کیا ہاتھ کا مالک بھی یہی کچھ دیکھ رہا ہے؟ نہیں، اسے

Marfat.com

ہاتھ کی دوسری طرف ناخن نظر آ رہے ہیں، بال نظر آ رہے ہیں اور ہاتھ کا رنگ بھی گلابی کے بجائے گندمی دکھائی دے رہا ہے۔ دونوں کی ایک ہی ہاتھ کے بارے میں الگ الگ رائے ہے۔ کون درست اور کون غلط ہے؟ دونوں ہی درست ہیں اور دونوں کی متفرق رائیں مل کر ہی ہاتھ کی پوری حقیقت واضح کرتی ہیں۔

اپنی رائے پر اَڑنے والا شخص کبھی پوری حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ رائے کے فرق کی قدر کرنے والا ہی پوری حقیقت کو پا سکتا ہے۔ ادھوری حقیقت کو پوری حقیقت سمجھنے والا ہمیشہ غیر مؤثر رہے گا۔ فرق کی قدر کر کے پوری حقیقت تک پہنچنے والا ہی مؤثر انسان بن سکتا ہے۔ فرق کے سلسلے میں روحانیت کے حاملوں اور متلاشیوں کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خدا چاہتا تو آدم وحوا کی تمام تر اولاد کو ایک ہی گروہ بنا سکتا تھا البتہ اب تو وہ انسانی سطح پر ایک ہوتے ہوئے بھی مختلف راستوں کے مسافر ہیں (11:118) اس لیے انھیں اس حکمتِ خداوندی کو دل سے قبول کرتے ہوئے انسانوں کے فرق اور اختلاف کی قدر کرنی چاہیے۔ اسی فرق کو دل سے قبول فرما کر رسولِؐ خدا نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''میری امت کے اندر اختلاف رائے باعث رحمت ہے''۔ یہ حقیقت ہے کہ مخلصانہ اختلاف رائے ہی سے ہم حقیقت کے ان پہلوؤں تک پہنچ سکتے ہیں جو ہماری اپنی نظر سے پوشیدہ تھے اور اختلاف رائے کے مخلصانہ احترام ہی سے اس روحانی جمہوریت کو عالمِ اسلام میں استحکام ملے گا جس کا دعویٰ تو ہم بڑے زور شور سے کرتے آئے ہیں لیکن جو ہمیشہ ہمارے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل جاتی رہی ہے۔

چھبیسواں باب

روحانی تازگی

فرض کیجیے آپ ایک جنگل میں سے گزر رہے ہیں۔ وہاں آپ کو ایک شخص ملتا ہے جو اپنی کند کلہاڑی سے ایک خاصا بڑا درخت کاٹ رہا ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہے اور صاف نظر آ رہا ہے کہ مسلسل کلہاڑی چلانے سے اس کے بازو شل ہو چکے ہیں۔

آپ: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

وہ: آپ دیکھ نہیں رہے؟ میں یہ درخت کاٹ رہا ہوں۔

آپ: آپ بے حد تھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کب سے کلہاڑی چلا رہے ہیں؟

وہ: پانچ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ میں ہلکان ہو رہا ہوں۔ لکڑی بے حد سخت ہے۔

آپ: آپ تھوڑا آرام کیوں نہیں کر لیتے۔ اس دوران آپ کلہاڑی بھی تیز کر سکتے ہیں جس سے کام پہلے سے تیز ہو جائے گا۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ کلہاڑی کند ہو چکی ہے۔

وہ: میرے پاس آرام کرنے اور کلہاڑی تیز کرنے کا وقت کہاں ہے، اتنا تو کام پڑا ہے۔ اوپر سے شام ہو رہی ہے۔

مؤثر ترین لوگوں کی ساتویں عادت یہ ہے کہ وہ فرصت نکال کر اپنی کلہاڑی تیز کرتے رہتے ہیں۔ یہ ساتویں عادت دوسری چھ عادتوں کو جلا بخشتی رہتی ہے۔ اس عادت کے چار دائرہ کار ہیں: جسمانی، ذہنی، جذباتی اور روحانی صلاحیتوں کی تازگی اور تجدید۔ الفاظ خواہ مختلف ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے بیشتر فلسفے واضح طور پر یا درپردہ انھی چار دائروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کلہاڑی تیز کرنے یا اپنی صلاحیتوں کی تجدید (Renewal) کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کے ان چاروں حصوں کو کبھی کبھار نہیں، بلکہ ہمیشہ اپنی بہترین حالت میں رکھیں اور انھیں دانشمندانہ اور متوازن طور پر استعمال میں لائیں۔

اپنی صلاحیتوں کی تجدید یا حیاتِ نو ہماری وہ سب سے زبردست سرمایہ کاری ہے جو ہم اپنے آپ کو ہمیشہ بہترین حالت میں رکھنے کے لیے کر سکتے ہیں۔ جب ہم جسمانی، ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر بہترین حالت میں ہوں تو ہماری کارکردگی بھی بہترین ہوگی اور ہم اپنے آپ سے، اپنی زندگی سے اور زندگی عطا کرنے والے خداوند تعالیٰ سے بھی پوری طرح راضی ہونگے۔ دوسرے لفظوں میں آخرت کے ساتھ ساتھ ہماری دنیا بھی "سلام" قولاً مِن رّبٍ رّحیم"

Marfat.com

کی حقدار ہو جائے گی۔

جسمانی طور پر بہترین حالت میں ہونے کے لیے ہمیں صحیح قسم کی غذا، مناسب آرام اور باقاعدہ ورزش کی ضرورت ہوگی۔ اور ان تینوں کاموں میں اعتدال ملحوظ رکھنا ہوگا۔ جس طرح پودوں کو پانی اور کھاد کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ضرورت سے زائد پانی اور کھاد سے پودے مر بھی جاتے ہیں، اسی طرح بہت زیادہ خوراک، ہر وقت آرام اور بے تحاشا ورزش بھی نقصان دہ ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی دیکھیے کہ رسولِ خدا نے ہر کام میں اعتدال کی تلقین کی ہے لیکن ہماری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ ہم اعتدال ہی سے گریز کرتے ہیں۔

ہمارے بہت زیادہ مصروف لوگ عموماً ورزش اور آرام سے ''پرہیز'' کرتے اور ضرورت سے زیادہ کھاتے ہیں۔ ان کے پاس کلہاڑی تیز کرنے کا وقت نہیں ہوتا۔ نتیجہ: بہت زیادہ کام انھیں تھکاتا چلا جاتا ہے اور جو کام ایک گھنٹے میں ہو سکتا تھا وہ اس پر دو گھنٹے صرف کرنے لگتے ہیں۔ کارکردگی آدھی ہو جاتی ہے، صحت خراب ہو جاتی ہے، وزن بڑھ جاتا ہے اور کارکردگی کم ہو جانے سے عزت اور رُتبے میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ورزش اور خاطر خواہ آرام پر توجہ دیتے اور رسولِ خدا کی تلقین کے مطابق بھوک رکھ کر کھاتے تو ان تینوں خرابیوں سے بچ سکتے تھے۔

ذہنی نشوونما کے لیے تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ربّ العزت نے آدمؑ کو چیزوں کی حقیقت کا علم سکھا کر اور رسولِ خدا نے ''علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین جانا پڑے'' جیسے ارشادات سے حصولِ علم کی جتنی بھرپور تاکید کی تھی آج مسلمان اس سلسلے میں اتنی ہی پسماندگی کا شکار ہیں۔ تعلیم سکول اور کالج تک محدود نہیں ہوتی۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ طالب علم تو رہے ایک طرف، ہمارے زیادہ تر استاد بھی اپنے علم کی تجدید کا اہتمام نہیں کرتے۔ وہ اپنے بیس پچیس سال پرانے Notes کی مدد سے آج کی نئی نسل کو پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ علم اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے کہ بہت سی باتیں جو کل تک محض مفروضے اور تصورات تھیں آج حقیقت بن چکی ہیں۔ جب تک ہم اپنے علم کو ہر لحظہ بدلتی ہوئی دنیا اور ہر لحظہ آشکارا ہونے والی حقیقتوں سے ہم آہنگ نہیں کرتے، ہمارا مقدر صرف اور صرف پسماندگی ہی ہو سکتا ہے۔ آپ اچھے بھلے پڑھے لکھے اور خوشحال لوگوں کے گھروں میں بھی گنتی کی چند کتابوں سے زائد نہیں دیکھتے۔ حالاتِ حاضرہ، ادب، شاعری یا تاریخ کو چھوڑیے، وہ مذہب جس سے وابستگی کا بہت دعویٰ کیا جاتا ہے، اس کا خانہ بھی تقریباً خالی ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ اخبارات اور ٹیلی وژن ہی کے ذریعے سے نئی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن معلومات اور علم میں بہت فرق ہے۔ پھر علم سے آگے دانشمندی کا دائرہ ہے جہاں تک رسائی کے لیے اخبارات اور ٹیلی ویژن کے بجائے اہلِ علم و دانش کی صحبت اور اہم موضوعات پر تازہ شائع ہونے والی اہم کتابوں کا مطالعہ درکار ہے۔ کئی لوگ مطالعے کو ''فرصت نہ ملنے'' کے نام پر ٹالتے رہتے ہیں اور یوں اپنی ذہنی کلہاڑی تیز کرنے کے بجائے اسے زنگ آلودہ ہو جانے دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر وہ کئی بیکار قسم کی مصروفیتوں کو ترک کر کے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا اہتمام کرتے تو ان کی عزت، شہرت اور کامیابی کو چار چاند لگ جاتے۔

Marfat.com

ہماری جذباتی زندگی کا ہماری معاشرتی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اس کا ذاتی پہلو بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ہمیں کوئی جذباتی صدمہ پہنچ جائے تو ہم جسمانی طور پر پژمردہ اور ذہنی سطح پر کند ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ ہماری جذباتی تربیت پر منحصر ہے کہ بے چین اور اعصاب زدہ (Nervous) نظر آئیں یا مسکراتے ہوئے اور مطمئن دکھائی دیں۔ جذبات کی تربیت تو ذہن کی تربیت سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ جذبات ہماری ذاتی زندگی اور معاشرتی تعلقات میں سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جذبات کی تربیت ہمیں سب سے پہلے گھر میں والدین اور بھائی بہنوں سے ملتی ہے۔ پھر جیسے جیسے ہمارے تعلقات بڑھتے ہیں، ہمیں طرح طرح کے جذباتی تجربات حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ جن خوش قسمت لوگوں کی جذباتی زندگی کی بنیاد محبت پر رکھی جاتی ہے وہ انسانی تعلقات اور معاشرتی میل جول کی کہیں بہتر صلاحیت کے مالک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ زندگی کی ابتدا میں پیش آنے والے افسوسناک، دردناک اور بعض اوقات خوفناک حالات سے گزرنے کے باوجود اپنی جذباتی تربیت اس طرح کرلے کہ ان حالات کے نتائج اس کی ذاتی زندگی اور معاشرتی تعلقات کو منفی طور پر متاثر نہ کریں۔ اس کے لیے بے حد ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر صحت مندرویوں کا عادی بنائیں۔

زندگی میں، خصوصاً اس کے آغاز میں، پیش آنے والے افسوس ناک، دردناک اور خوفناک حالات بعض اوقات ہماری جذباتی اور نفسیاتی زندگی پر اس حد تک بُرا اثر ڈالتے ہیں کہ ہم خدا کے فضل وکرم، کائنات کی ہمدردی اور انسان کی انسانیت سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس مایوسی سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی جذباتی صلاحیت بڑھانی پڑتی ہے۔ اگر ہمیں گھر والوں سے محبت نہ ملی ہو تو یہ محبت دوستیوں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اگر ہم مرد ہیں تو کوئی عورت اور اگر ہم عورت ہیں تو کوئی مرد شادی کے حوالے سے ہماری اس ضرورت کو پورا کرسکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے اندر دوستی اور محبت کے تجربات کی گنجائش رکھنی چاہیے۔ فنونِ لطیفہ، ادب، شاعری، موسیقی اور مصوری بھی ہماری جذباتی تربیت میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ہمیں ان کے ذریعے سے کشادہ دلی اور وسیع النظری نصیب ہوسکتی ہے۔ ہم ان سے ''لینے کی حرص'' کے بجائے ''دینے کی خوشی'' سیکھ سکتے ہیں۔

جذباتی تربیت کے بغیر انسان اپنے ساتھ ہونے والی بدسلوکی کے نتیجے میں دوسروں کے ساتھ بدسلوکی کا راستہ بھی اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن جذباتی تربیت ہمیں یہ راستہ دکھاتی ہے کہ دوسروں کی بدسلوکی سے ہمیں جو دکھ پہنچا تھا ویسا دکھ ہم کسی کو نہ پہنچائیں۔ جذباتی تربیت نہ صرف ہمارا عملی رویہ بدل کر رکھ دیتی ہے بلکہ یہ ہمارے قول اور کلام کو بھی بدل ڈالتی ہے۔ جیسا کہ ابلاغ کے حوالے سے پہلے بھی بیان ہو چکا ہے، جذباتی تربیت کا حامل شخص دوسروں کی کسی غلطی پر انھیں ٹوکتا بھی ہے تو یہ احتیاط کرتا ہے کہ غلطی کی نشاندہی اور اس پر اپنے ملال کا ذکر بے شک ضرور کرے لیکن غلطی کرنے والے کی عزتِ نفس پر حرف نہ لائے۔ جذباتی تربیت یا جذباتی صلاحیتوں کی مسلسل آبیاری سے صرف ہماری اپنی زندگی ہی میں

Marfat.com

مسرت، اطمینان اور امن، پیدا نہیں ہوتا، اس کی بدولت ہم یہ نعمتیں اپنے پورے کنبے، خاندان، معاشرے اور انسانیت کو اپنی طرف سے تحفتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔

روحانی تازگی اور روحانیت کی مسلسل تربیت سے ہماری زندگی میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمارے جدِ امجد آدمؑ میں اپنی روح پھونک کر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ ہر انسان کا جسم تو اس کا اپنا ہوگا، دل تو اس کا اپنا ہوگا، ذہن تو اس کا اپنا ہوگا، لیکن روح اس میں خدا کی ہوگی۔ اس اعتبار سے انسان کی سب سے زیادہ قابلِ قدر بلکہ مقدس شے اس کی روح ہے کیونکہ روح ہی وہ پُل ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنی جسمانی، جذباتی اور ذہنی محدودیت (Limitation) کے حصار سے نکل کر خداوند تعالیٰ کی لامحدودیت (Limitlessness) سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ انسان اکثر و بیشتر اپنے تمام فیصلے اپنے جسم یا جبلت، دل یا احساس، ذہن یا عقل سے کرتا ہے اور نہایت بے احتیاطی، بدتمیزی اور ناشکر گزاری سے اپنے اندر موجود اور موجزن روحِ خداوندی سے مشورہ کرنے کا تکلف بھی نہیں کرتا۔ اور جب اس کے جسمانی جذباتی اور ذہنی فیصلوں کے نتیجے میں اس کی ذاتی زندگی ناخوشی، عدم اطمینان اور بدامنی سے اور اجتماعی زندگی سیاسی انتشار، اقتصادی ناہمواریوں اور معاشرتی بیماریوں سے لبالب بھر جاتی ہے تو اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے وہ دامنِ یزداں چاک کرنے چل دیتا ہے۔

اس کے باوجود انسانوں کی ایک اقلیت آج بھی اپنی روحانی تربیت کے لیے کچھ نہ کچھ کوشش کرتی رہتی ہے۔ صدیوں سے مشرق کو روحانیت میں اوّلیت اور برتری حاصل رہی ہے۔ لیکن اب اپنی مادی ترقی کے منفی نتائج دیکھنے کے بعد مغرب بھی روحانیت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے۔ اپنی روحانی میراث سے ناواقفیت کی بناء پر اہلِ مشرق، جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، پیرویِ مغرب کے جوش و جنون میں ایسی روحانی تحریکوں اور تنظیموں کے رکن بن رہے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر ہم دینی لحاظ سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ علم مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم اپنے کردار کی ناپختگی کے باعث پیرویِ مغرب کے نتیجے میں نہ اِدھر کے رہتے ہیں نہ اُدھر کے۔ بظاہر خوشی کی بات ہے کہ روحانیت کی بابت لوگوں میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ لیکن اب دنیا بھر میں خود دہشت گردی کرنے والا امریکہ، القاعدہ کے ہاتھوں ستائے جانے کے بعد، اسلامی دنیا میں تصوف اور روحانیت کے نام پر اپنے مطلب کی ''خانقاہیت'' پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لیے ہم مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ قرآنِ حکیم، سیرتِ رسولؐ اور تصوف کی عظیم روایت سے ابھرنے والی روحانیت کو اپنے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ جانچیں، پرکھیں اور اپنائیں۔ اس کتاب میں تصوف کی مختصر تاریخ بیان کرنے اور روحانی جواں مردی کے تفصیلی تذکرے کا یہی مقصد تھا۔

روحانیت ہمارے وجود کی جان ہے۔ ہماری زندگی روحانیت کے محور کے گرد تعمیر ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر ہم

Marfat.com

ان انسانی قدروں کے ساتھ اپنی وابستگی اور وفاداری نہیں نباہ سکتے جو ہمارے پورے وجود کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ روحانی تربیت کے بغیر انسان ہمیشہ ادھورا رہ جاتا ہے...... خواہ وہ ساری دنیا فتح کر لے اور ساری دنیا کی دولت جمع کر لے۔ روحانیت کی بدولت ہمیں آگے بڑھنے اور اوپر اٹھنے کی توفیق اور جرأتِ رندانہ نصیب ہو جاتی ہے اور ہم انسانیت کی معراج اور ازلی و ابدی صداقتوں تک پہنچنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

روحانی تربیت کا کوئی ایک بندھا ٹکا طریقہ نہیں ہے۔ اس کے لیے تصوف کے مختلف سلسلوں اور مختلف روحانی تحریکوں اور تنظیموں میں طرح طرح کے طریقے استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح عبادت کی مختلف صورتیں.... ذکر، دعا، نماز، روزہ، مراقبہ، مجاہدہ، مشاہدہ، خیرات، قربانی.... مختلف طریقوں سے اپنائی اور مختلف نظامِ اوقات کے تحت زیرِ عمل لائی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ عبادات تو عبادت گاہوں مثلاً مساجد، گرجاؤں، مندروں، درگاہوں، خانقاہوں سے مخصوص ہیں اور کچھ انفرادی طور پر انجام دی جاتی ہیں۔ مذہبی عبادات میں عموماً اجتماع کو ترجیح دی جاتی ہے اور روحانی عبادات میں خلوت کو۔ لیکن روحانی تربیت کے لیے گروہ یا اجتماع کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیونکہ روحانیت کا مقصد معاشرے سے کٹ جانا نہیں، معاشرے کے اندر خوشبو کی طرح پھیل جانا ہے تاکہ مادیت اور دنیا داری نے فضا میں جو بدبو اور آلودگی پیدا کر رکھی ہو اُس کا ازالہ ہو جائے۔

ذہنی اور جذباتی تربیت کی طرح روحانی تربیت میں بھی فنونِ لطیفہ، ادبِ عالیہ، عظیم شاعری، کلامِ خداوندی اور صوفیانہ شاعری، اور روح پرور کلاسیکی موسیقی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ فطرت کے مظاہر اور مناظر، کھلے سمندروں کا سکوت اور اس کے اندر مچلتے ہوئے طوفان، سرسبز میدان، سر بفلک پہاڑ، بے آب و گیاہ صحرا اور صحراؤں میں گونجتی ہوئی بادِ سموم اور اس بادِ سموم میں ریت کے ٹیلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہمیں روحِ کائنات ''خداوند تعالیٰ'' کی شان (Majesty) سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی خوبصورت چہرہ، کسی چہرے کی جھیلوں جیسی گہری آنکھیں، ایک مسکراتا ہُوا پھول، تتلیوں کی صورت میں اڑتے ہوئے رنگ، دھوپ اور بارش کے میل سے پیدا ہونے والی دھنک، اندھیرے میں جگمگاتا ہُوا ایک جگنو، آم کے درخت میں چھپی کسی کوئل کی کوک یا تپتی دوپہروں میں فاختہ کی ہُوک ہمیں خدا کی رحمت (Mercy) سے متعارف کرا سکتی ہے۔

ایسے ہی کسی لمحے میں ہم پر یہ حقیقت بھی کھل سکتی ہے کہ ہماری خداداد صلاحیتوں کی روشنی میں ہماری زندگی کا محور کیا ہونا چاہیے۔ جب ہم اپنے وجود کے مرکز و محور، اپنی روح کے مطابق اپنی زندگی کا محور طے کر لیتے ہیں اور اس حقیقت کو پا جاتے ہیں کہ ہماری کون کون سی مصروفیات، دلچسپیاں اور خواہشیں ہمیں ہمارے مقصدِ حیات سے قریب کرنے کے بجائے لحظہ بہ لحظہ دور لے جا رہی ہیں تو ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنی ترجیحات میں تبدیلی کر لیں۔ یہ کام نظر تو آسان ہی آتا ہے لیکن اس کے لیے بڑے دل گُردے کی ضرورت ہے۔ کنبے، خاندان اور معاشرے کے بنائے معیاروں سے ہٹ کر اپنی روح سے ابھرنے والے مقصدِ حیات کے مطابق ایک نئی زندگی تعمیر کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ صرف روحانی تربیت

Marfat.com

ہی اس مشکل کام کو آسان بنا سکتی ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ رسُولِ خدا جنھیں خود خدا نے ایک عظیم ترین مقصدِ حیات سونپ دیا تھا، دن بھر اہم ترین کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود رات کا بیشتر حصہ جاگ کر اتنی عبادت کیوں کرتے تھے؟ وقت نکال کر قرآنِ حکیم میں سورہ المزمّل ضرور پڑھیے گا جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ رسُولِ خدا فجر سے عشاء تک کی نمازیں پڑھنے کے علاوہ راتوں کو اس حد تک عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ خدا کو کہنا پڑا کہ اے میرے پیارے کملی والے! دن بھر کی شدید مصروفیت کے بعد رات کو کچھ آرام بھی کر لیا کرو۔

رسُولِ خدا کو اس اضافی عبادت کی ضرورت دو وجہوں سے محسوس ہوتی تھی کیونکہ ایک تو آپ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے رب کی حضوری میں گزار کر روحانی سطح پر تازہ دم ہو جاتے تھے، دوسرے یہ روحانی تازگی آپ کو اُن گراں بار اور گراں قدر ذمہ داریوں کو بلند ترین انسانی اور اخلاقی قدروں کے مطابق ادا کرنے کے لیے تیار کرتی رہتی تھی جو ریاستِ مدینہ کے بانی، اس کے سپہ سالار اور چیف جسٹس کے طور پر آپ کو ادا کرنی پڑتی تھیں۔

یہی نہیں، نبوت کی ذمہ داری ان سب ذمہ داریوں سے زیادہ اہم تھی۔ دن بھر کئی افراد اور کئی وفود اسلام کے بارے میں رسُولِ خدا سے براہِ راست معلومات اور ہدایات کے خواہش مند ہوتے تھے۔ روحانی تازگی کی بدولت آپ جسمانی، جذباتی اور ذہنی اعتبار سے بلند ترین قول و فکر و عمل کا ایسا جیتا جاگتا نمونہ بن گئے تھے جس سے کوئی صاحبِ دل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ رسُولِ خدا کی مثال سے ہمیں اس اصول تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے کہ جس انسان کی جتنی زیادہ دُنیوی اہمیت اور ذمہ داری ہو اُسے اتنی ہی زیادہ روحانی تازگی اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج دنیا عموماً اور عالمِ اسلام خصوصاً ذمہ دار اور دیانتدار قیادت سے اسی لیے محروم نظر آتا ہے کہ ہمارے قائدین اقتدار، دولت اور شہرت کی خواہش کو تو اَنا کے غبارے کی طرح پھلاتے چلے جاتے ہیں لیکن اخلاقی قدروں اور کرداری صلاحیتوں کو مستحکم کرنے اور فروغ بخشنے کے لیے رُوحانی تازگی اور تربیت کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔

یہاں اس وضاحت کی شدید ضرورت ہے کہ جس عبادت میں انسان کا دل نہ پسیجے اور جس کے نتیجے میں وہ بُرائی، کنجوسی اور فحاشی سے نہ بچے اور ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے صراطِ مستقیم پر نہ چل نکلے وہ اس میں روحانی تازگی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ دکھاوے کی عبادت ہوتی ہے اور خدا نے ایسی عبادت کرنے والوں پر تباہی بھیجی ہے (107:1-7)۔ اسی طرح وہ وظیفے جو خالصتاً دُنیوی مقاصد کے لیے کیے جاتے ہیں، مذہب اور روحانیت کے نام کو داغدار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ طوطے کی طرح رٹے جانے والے وظیفے مذہب کو جادو ٹونے کے گھٹیا مقام پر لے آتے ہیں۔ ان کا ''ذکر'' یا یادِ خدا سے ہرگز ہرگز کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مؤثر ترین انسانوں کی سات عادتوں:

1) باعمل دیدہ وری،

Marfat.com

2) آخرت کے پیشِ نظر آغاز،

3) ترجیحات کا تعین،

4) سب کی جیت،

5) پہلے سمجھو، پھر سمجھاؤ،

6) تخلیقی تعاون،

7) روحانی تازگی

کے اس بیان کے آخر میں، جو اس کتاب کا بھی آخر ہے، ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ مختصراً یہ ہے:

دُنیوی کامیابی کے لیے بھی ہمارے وہی اصول صحیح ہیں جو فطرت کے مطابق ہیں۔ ان اصولوں کا ماخذ خداوندتعالیٰ ہے جس نے فطرت اور دین کو یکساں اصولوں پر ترتیب دیا ہے۔ انسانی زندگی کو ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے اصولوں پر قائم کرنے اور رواں دواں رکھنے کے لیے ہمیں اپنے ضمیر اور اپنی روح سے قریب تر رہنا چاہیے۔ ہمارا ضمیر ہمارے دل و دماغ کی روح ہے۔ ہمارے ضمیر کو معاشرے کے گھسے پٹے معیاروں کے بجائے خداوندکریم کے مقرر کردہ معیار، رسُولِ خدا کے شِعار اور ہماری روح کے منفرد تقاضوں کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ ہماری روح ہمارے وجود کا مرکز و محور ہے۔

ہماری روح ہی ہمارے اور ہمارے خالق کے درمیان پُل کا کام دیتی ہے کیونکہ وہ بیک وقت ہماری بھی ہے اور خدا کی بھی۔ اپنی روح کے منفرد تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہم گویا اُس زندگی کی بنیاد رکھ دیتے ہیں جو ہمیں بھی پوری طرح پسند آتی ہے اور خدا کو بھی۔ یہ وہ مقام ہے جو اُن خوش قسمت ہستیوں کو نصیب ہوتا ہے جنھیں ہم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ جب ہم اپنے ربّ سے اور ہمارا ربّ ہم سے راضی ہو جائے تو ہم نہ صرف مرنے کے بعد خدا کی خاص الخاص جنت کے حقدار ہو جاتے ہیں بلکہ ہماری دُنیوی زندگی بھی جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔

جنت کا دوسرا نام سلامتی ہے اور سلامتی اسلام کی حقیقت ہے۔ سلامتی موت نہیں، زندگی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام بھی موت نہیں زندگی ہے۔ اسلام دُنیا کو جس جنت میں بدلنا چاہتا ہے اس میں ظلم، تشدد اور دہشت گردی کی گنجائش نہیں ہوتی، اس میں وہ زندہ و متحرک اور تخلیقی امن ہوتا ہے جو ایمان کی روشنی سے جگمگاتا ہے، محبت کی گرمی سے دغدغاتا ہے، خیر کی طاقت سے دندناتا ہے، صداقت کے حُسن سے مسکراتا ہے، آزادیٔ رائے سے چہچہاتا ہے اور رزق کی فراوانی سے لہلہاتا ہے۔ آپ سُن ہی رہے ہوں گے، سلامتی کی اِس جنت سے آتی ہوئی سلام'' قولاً مِن رَّبِ رَّحِیم کی گونج کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

آیئے، اب کتاب کے اختتام پر دستِ دعا اٹھائیں:

Marfat.com

دُعا

اے خداوند کریم! ہمیں پورا انسان اور پورا مسلمان بننے کا شرف دے اور ہمارا شمار روحانی جواں مردوں میں کر۔ اے ربّ العزت! ہمیں شرف دے کہ ہم اپنی روحانی تربیت کے اُس درجے کو پا جائیں جہاں تُو ہم سے اور ہم تجھ سے مکمل طور پر راضی ہو جائیں اور انسانیت اور اسلام کی عظمت کی راہ میں تیرے رفیق بن جائیں۔

اے خداوند کریم! ہمیں شرف دے کہ ہم اُس رُوح کو جگا کر جو تُو نے ہم میں پھونک رکھی ہے اور اُس علم سے بہرہ ور ہو کر جو حقائق کو بے نقاب کرنے کے لیے تو نے ہمیں عطا کر رکھا ہے، پاکستان کو اور عالمِ اسلام کو تیرے نور سے اس طرح منور کر دیں کہ تمام تر انسانیت کے لیے ایمان، محبت، خیر، صداقت اور امن کے صراطِ مستقیم کی جگمگاتی مثال بن جائیں۔

اے خداوند کریم! رحمۃ للعالمین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے ہماری عاجزانہ دعا قبول فرما!

﴿ وآخِرُ دَعوانا اَنِ الحمدُ لِلّٰہِ ربِّ العالَمین ۝ وَالصَّلوٰۃُ والسَّلامُ علیٰ رَسُولہِ الکرِیم ﴾

Marfat.com

اسلام کی روحانی قدریں

موت نہیں زندگی

محمد حنیف رامے

Marfat.com